ماہنامہ

جامعہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ
جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ جنوری ۱۹۹۲ء | شمارہ ۱

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

مجلس مشاورت

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲

شذرات

سیّد جمال الدین

قارئین جامعہ کو نیا سال مبارک ہو۔

سالِ نو کا آغاز ایک طرف ہمیں مستقبل کو خوش آمدید کہنے اور دوسری جانب ایّامِ گزشتہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی دعوت دیتا ہے۔ پچھلے بارہ ماہ کے عرصہ میں قومی اور عالمی افق پر قابلِ ر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ملک میں کانگریسی حکومت کی تشکیلِ نو اس اعتبار سے فال نیک بت ہوئی ہے کہ اس دوران ہندوستان سے قریب ترین پڑوسی ملکوں یعنی نیپال اور چین سے دستانہ تعلقات کے قیام میں پیش رفت ہوئی ہے اور دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کا حالیہ ورۂ ہند اس کی ایک کڑی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سفارتی سطح پر ہند پاک مذاکرات کے بھی خوش آئند ائج مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن ندی کے پانی پر اختلاف اور اس جیسے دوسرے مسائل پر جب ظر پڑتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم قومیت کے صحیح اور صالح جذبے کو اپنے اندر سمونے میں کام رہے ہیں۔

بین الاقوامی خلیجی جنگ کے بحران سے پیدا شدہ عالمی اقتصادی عدم توازن کے نتیجہ میں سوشلسٹ بلاک کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے۔ سوویت یونین کا دنیا کے نقشہ سے محو ہو جانا برطانوی سامراج کے ٹوٹنے کے بعد موجودہ صدی کا دوسرا واقعہ ہے جس کے نتیجے میں ۱۲ خود مختار ریاستوں کی دولت مشترکہ وجود میں آئی۔ اور ان کی آزادانہ حیثیت کو اقوام عالم کی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ آزادی و خود مختاری کا حصول جتنا شکل ہے اتنا ہی مشکل اسے برقرار رکھنا بھی ہے۔ آنے والا وقت ہی بتا سکے گا کہ یہ نو آزاد ریاستیں اپنی مختاری کو قائم رکھنے میں کس حد تک کامیاب ہوں گی۔ یوروپی حلقوں میں بھی اتحاد کی کوششیں تیز تر ہو رہی ہیں۔ یشیا میں بھی تناؤ کم ہو رہا ہے جو بڑی حد تک فلسطین اور اسرائیل کے درمیان امن کے قیام پر منحصر ہو گا۔

ر احمد جائسی

سُرور صاحب

سرور صاحب کی شخصیت میرے لیے ایک ایسے چھتنار درخت کی سی رہی ہے جس کے سائے ں دم لے لے کر میں نے حالات کے تپتے ہوئے صحرا کو اس انداز سے پار کیا ہے کہ آج اپنے آپ کو کسی رسا مرہون منت نہیں پاتا۔ میں ان کا شاگرد بھی رہا ہوں، ماتحت بھی اور رفیق کار و نائب بھی۔ درج یل سطور میں میں ان پروفیسر آل احمد سرور کی شخصیت کے بارے میں اپنے کچھ تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں جن سے میں آشنا ہی نہیں تھوڑا بہت آگاہ بھی ہوں۔

میں نے سرور صاحب کو پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ میں اس وقت یکھا تھا جب وہ مرحوم پروفیسر احتشام حسین کے ساتھ 'یوم شبلی' تقریبات میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا اقبال سہیل دونوں ہی بقید حیات تھے۔ مذکورہ تقریب کو دو حصوں یعنی مجلس مذاکرہ اور مشاعرہ میں تقسیم کیا گیا تھا۔ احتشام صاحب اور سرور صاحب دونوں نے مقالہ پڑھنے کے بجائے تقریر کی تھی۔ احتشام صاحب کی تقریر تو ہم طالب علموں کے سروں پر سے گزر گئی مگر سرور صاحب کی تقریر سے ہم بھی اتنا ہی مستفید ہوئے جتنے ہمارے بڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ کا ایک سیلِ رواں ہے جو تصورات و خیالات کو اپنے ساتھ بہائے چلا جا رہا ہے اور مقرر کے تجربے میں سامعین بھی برابر کے شریک ہیں۔ یوم شبلی کے اس مشاعرے میں مولانا اقبال سہیل بھی شریک ہوئے تھے مگر اپنی بیماری اور ضعیفی

پروفیسر کبیر احمد جائسی، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کے سبب خود اپنی غزل نہ پڑھ سکے تھے۔ یہ فریضہ ایک خوش گلو نوجوان نے ادا کیا تھا۔ مولانا اقبال سہیل کے درج ذیل دو اشعار کی گونج آج بھی سامعوں کو محسوس ہوتی ہے:

کی ہے شبِ غم کس طرح بسر بھلا وہ فسانہ کیا کہیے
کانوں میں ہو جب گلبانگ سحر رودادِ شبانہ کیا کہیے
اے بزم طرب کے صدر نشیں پائیں کے بھی اب ہم اہل نہیں
کل وادیٔ غم میں ہم دونوں تھے شانہ بہ شانہ کیا کہیے

اس وقت ہندوستان کو آزاد ہوئے چھ سات برس ہو چکے تھے مگر عام لوگوں بالخصوص مسلمانوں کے مسائل کسی عفریت کی طرح ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ مولانا سہیل کے اشعار میں ان ہی مسائل کی گونج تھی اور لوگ اس بات سے آگاہ تھے کہ لالہ و گل کے پردے میں کیا بات کہی جا رہی ہے۔ اس لیے ان اشعار نے وہ دھوم مچائی کہ دوسرے شعراء کے اشعار ماند پڑ گئے۔ سرور صاحب دوسرے دن واپس لکھنؤ واپس چلے گئے۔ اس لیے ہم طلبہ ان کی صحبت سے مستفید نہ ہو سکے۔

علی گڑھ آنے کے بعد ۱۹۶۲ء۔ ۱۹۶۳ء کے تعلیمی سال میں مجھے سرور صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ اس سال سرور صاحب بی۔ اے فائنل کے طلبہ کو تاریخ ادب پڑھا رہے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جذبی صاحب کے کلاس ہی کی طرح اس سال اردو کا یہ پیریڈ کھانے کے وقفے کے بعد یعنی دن کے ڈھائی بجے سے ہوتا تھا۔ سرور صاحب اگرچہ صدر شعبہ تھے مگر وہ پیریڈ شروع ہوتے ہی کلاس میں آجاتے اور حاضری لینے کے بعد تاریخ ادب اردو پر اپنا لکچر شروع کر دیتے۔ وہ نہ تو نوٹ لکھاتے اور نہ ہی اپنے لکھے ہوئے نوٹ کلاس میں پڑھتے بلکہ زبانی لکچر دیتے۔ ان کے لکچر کا انداز دلچسپ اور زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ہوتی جس کی وجہ سے ہم لوگ نہ تو کبھی ان کا کلاس چھوڑتے اور نہ ہی دن کے ڈھائی بجے کلاس میں آنا ہم کو ناگوار گزرتا۔ ہمارے عہد کے جو لوگ اس وقت برصغیر کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ہم کو سرور صاحب کے لکچروں کے بعض اجزاء آج تیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی یاد ہیں۔ لکچر کے دوران بیچ میں سوال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں نے ایک بار اس کی جسارت کی تو نرمی سے سمجھا دیا کہ لکچر ختم ہونے کے بعد جو کچھ پوچھنا

چھا جائے۔ وہ عموماً دس پندرہ منٹ پہلے اپنا لکچر ختم کر دیتے پھر سوالات کرنے کی اجازت تھی۔ بعض اوقات طفلانہ سوالات بھی بڑے صبر و تحمل سے سنتے۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں جواب دے کر ے کلاس کو مطمئن کر دیتے۔

پندرہ بیس دن کے وقفے سے وہ ہمارا امتحان لیا کرتے اور ان موضوعات پر سوالات پوچھتے ،کو وہ پڑھا چکے ہوتے۔ تقریباً تیس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد اب غالباً یہ خودستائی نہ ہوگی رمیں یہ بھی لکھتا چلوں کہ اسی طرح کے ایک امتحان میں میں نے سرور صاحب سے پندرہ میں سے رہ نمبر حاصل کیے تھے۔ ابن نشاطی کے بجائے غواصی لکھ دینے کی وجہ سے میرے دو نمبر کٹ گئے ئے ورنہ شاید وہ ایک نمبر اور عطا فرما دیتے۔

افسوس ہے کہ ہماری جماعت کو سرور صاحب نے متن نہیں پڑھایا تھا اس لیے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ نظم اور نثر کس طرح اور کس انداز سے پڑھایا کرتے تھے ہم کو تو انھوں نے نسبتاً ایک خشک موضوع پڑھایا تھا لیکن اس انداز سے کہ ہم کو اس خشک موضوع سے خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس وقت سرور صاحب پچاس، اکاون سال کے ہو چکے تھے اور سر کے سارے بال تقریباً سفید تھے۔ وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا جب وہ برقی پنکھے کے نیچے بیٹھ کر لکچر دیتے تو ان کے چاندی کے تار جیسے بال اُڑا کرتے۔ سفید بال جتنے میں نے سرور صاحب پر پھبتے اور کھلتے دیکھے اتنے کسی اور پر نہ دیکھے۔ ان کے بالوں کی سفیدی ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کا وقار پیدا کرتی۔ غالباً اسی وجہ سے ان کے کلاس میں مکمل خاموشی رہتی اور صرف ان ہی کی آواز گونجا کرتی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ایم۔ اے میں سرور صاحب کی شاگردی کے شرف سے محروم رہا یعنی ایم اے میں میرا مضمون اردو نہیں فارسی تھا لیکن اس کے باوجود مجھے اسی زمانے سے سرور صاحب کی شفقت حاصل رہی۔ وجہ یہ تھی کہ سرور صاحب اپنے طلباء اور نوجوانوں کو بڑھانے کے عادی تھے۔ کسی میں بھی کسی قسم کی کوئی ادبی یا علمی رمق دیکھتے تو اس کی پذیرائی اور دلدہی کرتے اور جب وہ نوجوان اپنی علمی یا ادبی راہ منتخب کر کے اس پر گامزن ہو جاتا تو اپنے افکار و نظریات اس پر لادے بغیر اس کو آزاد فضا میں سانس لینے اور اپنی منزل اور مقام خود متعین کرنے کے لیے چھوڑ دیتے مگر شتر بے مہار

نہ ہونے دیتے بلکہ ان پر گہری نگاہ رکھتے۔

ڈرتے ڈرتے یہاں یہ بات کہنا چاہوں کہ سرور صاحب کو سیمینار، کانفرنس اور مشاعرے منعقد کرنے کا شوق ہے جب تک وہ علی گڑھ میں صدر شعبۂ اردو رہے۔ ان کا یہ "کاروبارِ شوق" روز افزوں رہا اور جب علی گڑھ سے سبکدوش ہو کر شملہ ہوتے ہوئے سری نگر پہنچے تو ان کے اس "شوق" کو وہ مہمیز لگی کہ ان کے ساتھ چلنا دشوار تر ہو گیا۔ بہرحال اس زمانے میں ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کی شعبۂ اردو کی شعری نشستیں بڑی جاندار ہوتیں۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں اس زمانے میں شعبۂ اردو کی شعری نشستوں کی ابتدا اس ترتیب سے ہوتی۔ امیر عارفی، صبا جائسی، شہریار۔ یہ ترتیب کئی سال تک برقرار رہی۔ سرور صاحب ان شعری نشستوں کی خود صدارت کرتے، سارے اشعار خوب توجہ سے سنتے، نوجوانوں کے اچھے اشعار پر دل کھول کر ان کی تعریف کرتے بلکہ بعض بعض اوقات دوبارہ پڑھوا کر بھی سنتے۔ علمی مذاکروں کا بھی یہی حال تھا۔ عام طور سے ان مذاکروں کی صدارت بھی وہ خود ہی کرتے۔ اگر مذاکرے کی کئی نشستیں ہوتیں تو پہلی مجلس کی صدارت کے بعد وہ دوسرے حضرات کی صدارت میں نشستیں کرتے لیکن افتتاحی اور اختتامی تقریر یں ان ہی کی ہوتی۔ افسوس ہے کہ ان تقریروں کو نہ تو قلم بند کیا گیا۔ اور نہ ہی ریکارڈ کیا گیا۔ اگر یہ تقریریں محفوظ ہوتیں تو ان ہی کے مطالعے سے سرور صاحب کے ذہن کے بہت سے گوشوں کا بھرپور مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔

سرور صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروردہ بھی ہیں اور یہاں کی کئی نسلوں کے تربیت دہندہ بھی۔ ۱۹۳۲ء میں وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ آئے اور انھوں نے ایم۔ اے (انگریزی) کے سال اول میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی میں کل بارہ تیرہ سو طلبہ ہوتے۔ اس لیے اس زمانے کے اساتذہ تقریباً ہر طالب علم سے آشنا ہوتے اور ان پر وہ توجہ دیتے جو ہمارے زمانے میں دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ بہرحال سرور صاحب نے اس درسگاہ میں صرف دو سال کا عرصہ ایک طالب علم کی حیثیت سے گزارا مگر ان ہی دو برسوں میں انھوں نے وہ کچھ حاصل کر لیا۔ جو کہ کئی برس کے مقیم طلبہ حاصل کیا کرتے تھے جب وہ ایم۔ اے سال اول میں تھے تو وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور جب سال دوم میں آئے تو یونین کے الکشن میں حصہ لیا اور اس کے نائب صدر منتخب ہوئے (اس زمانے میں یونین کے

صدر پرو وائس چانسلر ہوتے تھے) یہ وہ اعزاز تھا جو صرف سینیئر طلبہ ہی کو حاصل ہوتا مگر سرور صاحب کی تحریر و تقریر نے یونین کا وہ عہدہ بھی دلوا دیا جس کی تمنا صرف سینیئر طلبہ کیا کرتے۔ یونین کی تمام مصروفیات کے باوجود انھوں نے ایم۔اے (انگریزی) کا امتحان اول درجے میں پاس کیا پھر پہلی اکتوبر ۱۹۳۴ء کو دو سال کے لیے ان کا تقرر شعبۂ انگریزی میں بہ حیثیت لکچرر ہو گیا۔ جہاں انھوں نے ۱۹۳۶ء تک کام کیا، اسی سال انھوں نے اردو میں بھی ایم۔اے کیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ شعبۂ انگریزی کی مدت ملازمت ختم ہونے سے پہلے شعبۂ اردو میں ایک اسامی مشتہر ہوئی، سرور صاحب نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دی اور جب انٹرویو ہوا تو اس جگہ پر ان ہی کا انتخاب ہوا اس طرح وہ شعبۂ انگریزی سے شعبۂ اردو میں آگئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۴۵ء تک کام کیا۔ مارچ ۱۹۴۵ء میں رام پور کے رضا انٹر کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا اور وہ علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر رام پور چلے گئے جہاں اگست ۱۹۴۶ء تک ان کا قیام رہا، اسی مہینے کی ۱۲ر تاریخ کو انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر کے عہدے کا چارج لیا اور نومبر ۱۹۵۵ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔ لکھنؤ کی فضا سرور صاحب کو بہت راس آئی۔ یہیں سے ان کی شہرت بھی روز افزوں ہوئی۔ تقریباً دس برسوں تک لکھنؤ یونیورسٹی کی خدمت کرنے کے بعد اپنی حق تلفی پر احتجاج کرتے ہوئے انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنا جہاز جلا کر علی گڑھ آگئے۔

علی گڑھ آکر انھوں نے سید حسین ریسرچ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ ۳۰ر اپریل ۱۹۵۸ء کو پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی مدت ملازمت ختم ہو گئی، یکم مئی ۱۹۵۸ء کو سرور صاحب نے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے اپنے نئے عہدے کا چارج لیا اور ۶ر اکتوبر ۱۹۷۳ء تک اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۷۲ء میں سرور صاحب ساٹھ سال کے ہو چکے تھے۔ یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق ان کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کی گئی تھی۔ اگر یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد چاہتے تو سرور صاحب کو مزید توسیع مل سکتی تھی مگر چونکہ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۷۲ء کی کھل کر مخالفت کی تھی اس لیے اس زمانے کی یونیورسٹی انتظامیہ سرور صاحب

کو برداشت نہ کرسکی اوران کو مزید توسیع نہ ملی۔ اگر ماہ وسال کے حساب سے دیکھا جائے توسرور صاحب نے ۲ مرحلوں میں اس یونیورسٹی کی انتیس سال تک خدمت کی اور اپنی بساط بھر اپنے طلبہ کو خوب سے خوب تر بنانے کے عمل میں مصروف رہے۔

اکتوبر ۷۳ء سے مارچ ۷۴ء تک کا زمانہ سرور صاحب کی "آزادی" کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ یکم اپریل ۷۴ء سے انھوں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ میں وزیٹنگ فیلو کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور تقریباً تین برس تک وہاں کام کرنے کے بعد مارچ ۷۷ء میں کشمیر یونیورسٹی سری نگر چلے گئے جہاں پہلے ان کا تقرر اقبال چیئر پروفیسر کی حیثیت سے ہوا بعد ازاں جب ۷۹ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا توسرور صاحب اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور ۸۷ء تک کشمیر یونیورسٹی میں اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سرور صاحب کی زندگی کا یہ گوشوارہ صرف اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ نئی نسل کو معلوم ہوسکے کہ انھوں نے ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک مسلسل فعّال ملازمت Active service کی ہے۔ ترپن سال کی عمر تک باون سالہ فعال کارکردگی کے ریکارڈ میں ان کا کوئی ہم عصر ان کا شریک وسہیم نہیں ہے۔

میں نے اس تحریر کی ابتدا میں لکھا ہے کہ "آج اپنے آپ کو کسی اور کا مرہون منت نہیں پاتا ہوں۔" اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں میری یو۔جی سی کی جونیئر ریسرچ فیلوشپ ختم ہوگئی۔ اس کے چند ماہ کے اندر ہی اندر شعبۂ فارسی میں ایک لکچرر کی جگہ کا انٹرویو ہوا جس میں میں بھی شریک ہوا۔ اس وقت میری چار کتابیں اور ۳۵ مقالات شائع ہو چکے تھے لیکن اس جگہ پر بعض تعصبات و تأملات کی وجہ سے میرا تقرر نہ ہوسکا۔ یہ یکم نومبر ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد سے میری پریشانیوں کا وہ دور شروع ہوا جو ستمبر ۷۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دلی میں لکچرر ہونے کے بعد قابو میں آیا۔ اس دور ابتلا میں سرور صاحب میرے لیے شجر سایہ دار بنے رہے۔

سرور صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا کہ میرا تقرر شعبۂ فارسی میں نہیں ہوسکا ہے تو انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا کر دلدہی کی اور برابر علمی و ادبی کام کرتے رہنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے بعض دوسرے اساتذہ کے برخلاف نہ تو فارسی کے صدر شعبہ کے خلاف مجھ کو بھڑکایا نہ ہی ان کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہوئے کوئی نا ملائم لفظ استعمال کیا صرف مجھ کو

برا ور حوصلے سے کام کرتے رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد انھوں نے مجھ
دوبارہ بلواکر میرے سپرد یہ کام کیا کہ میں ان کے نشان لگائے ہوئے "ہماری زبان" کے اداریوں کو
نقل کروں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس کام کا معاوضہ بھی مجھے دیں گے مفت کام نہ لیں گے
میں نے تقریباً چھ سو صفحات ان کے لیے نقل کیے جس کا معاوضہ وہ مجھ کو آٹھ آنے فی صفحہ
کے حساب سے دیتے رہے (خیال رہے کہ یہ آٹھ آنہ ۱۹۶۹-۱۹۷۰ء کا ہے ۱۹۹۱ء کا نہیں)
علاوہ بریں انھوں نے "اردو ادب" اور "فکر و نظر" کے ذریعے مجھ کو علمی دنیا سے مزید روشناس
کرایا۔ ان دونوں رسالوں کے مقالہ نگاروں کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک زمانے میں اردو ادب
کا شاید ہی کوئی ایسا شمارہ ملے جس میں سرور صاحب نے میری کوئی نہ کوئی تحریر نہ شائع کی
ہو، جس شمارے میں میری کوئی نثری تحریر نہ ہوتی اس میں وہ میری دو غزلیں شائع کر کے
ان کا معاوضہ دلواتے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غالب صدی تقریبات کا دور دورہ تھا۔ عرفان غالب
کے نام سے سرور صاحب نے خطوطِ غالب کا جو انتخاب اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا اس
کی کچی کتابت بھی میری کی ہوئی ہے جس کا یک مشت معاوضہ بھی انھوں نے دیا تھا۔ یہاں
اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ سرور صاحب کے اداریوں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا
ہے۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اداریوں کو صرف اس لیے مجھ سے نقل کروایا تھا
کہ میری مالی مدد ہو جائے۔ غالباً ان کا مقصد اداریوں کے مجموعے یا مجموعوں کو شائع کرنا نہ تھا۔
ان کی یہ مالی مدد اس انداز کی تھی کہ میری انا بھی مجروح نہ ہوتی اور میرا ذوقِ شام و سحر
بھی برقرار رہتا۔ اپریل ۱۹۷۱ء تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر غالباً دس اپریل ۱۹۷۱ء سے انھوں
نے مجھے انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسٹاف پر لے لیا اور تین انکریمنٹ دے کر میرا تقرر کیا۔ انجمن سے
میرا یہ تعلق ان کے شملہ جانے تک برقرار رہا۔

اب میں سرور صاحب کا ماتحت تھا۔ پہلے انھوں نے انجمن کے بک ڈپو کا مجھے انچارج
بنایا پھر بعد میں نگراں مطبوعات بھی۔ ان تین برسوں میں مجھ کو سرور صاحب کا اعتماد برابر حاصل
رہا۔ اور انھوں نے مجھ کو ایک لمحے کے لیے یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ میں ان کی ماتحتی میں کام کرنے
والا ایک کلرک ہوں۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ ان کو کچھ دیر کے لیے ناگواری ہوئی تھی۔

ہوا یوں کہ انھوں نے کسی کام سے مجھ کو اپنی رہائش گاہ پر بلوایا میں جب پہنچا تو وہ کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کو نشست کے کمرے میں آنے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے، اس زمانے میں میری ہیکڑی شباب پر تھی میں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا مگر دوسرے دن ان کو لکھا کہ "آپ مجھ کو شعبہ میں بلا لیا کیجیے۔" سرور صاحب نے دوسرے ہی دن پھر گھر پر بلایا اور قدرے کبیدگی سے کہا کہ "آپ کو یہاں آنے میں کیا قباحت ہے؟" اب یہ تو یاد نہیں کہ میں نے کس طرح بات "برابر" کی مگر سرور صاحب کی ناگواری بخوبی ظاہر ہو رہی تھی لیکن یہ ناگواری وقتی رہی اور اسی دن کافور ہوگئی۔

میرے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تقرر میں تو سرور صاحب کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ وہ اس وقت شملہ میں تھے۔ چونکہ میں نے ان کے انجمن سے سبکدوش ہونے کے چند ہی ماہ بعد استعفیٰ دے دیا تھا اور ان کو اس کی وجہ بھی لکھ دی تھی اس لیے وہ میری طرف سے فکرمند رہتے اور خطوط لکھ لکھ کر دریافت حال کرتے۔ جب میرا جامعہ میں تقرر ہو گیا تو اس کے ایک ہی دو ماہ بعد سرور صاحب ایک انٹرویو کے سلسلے میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ تشریف لائے۔ میں ان سے ملنے کے لیے دفتر شیخ الجامعہ گیا، اس وقت انٹرویو ختم کر کے وہ اور شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین خاں دفتر سے باہر نکل رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سرور صاحب نے مسعود صاحب کو میرا تقرر کرنے پر مبارکباد دی بعد ازاں مجھ سے ہم کلام ہوئے۔

میں ابھی جامعہ میں چھ سال ہی کام کر پایا تھا کہ سرور صاحب کا خط ملا جس میں یہ جملہ بھی تھا کہ میں نے تمھارے لیے ایک کام سوچا ہے۔ اگر میں وہ کام تمھارے سپرد کروں تو انکار مت کرنا۔ اس کے چند ہی دنوں بعد ایک صاحب کشمیر یونیورسٹی کا درخواست فارم دے گئے کہ اس کو پُر کر کے بھیج دوں۔ میں "اشارۂ غیبی" سمجھ چکا تھا اور چونکہ زبان دے چکا تھا اس لیے فارم کی خانہ پُری کر کے اس کو بھیج دیا۔ جون ۱۹۸۰ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر سری نگر کے ریڈر کا انٹرویو ہوا۔ اسی دن بعد مغرب میں ڈاکٹر آصف نعیم کے ہمراہ سرور صاحب سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گیا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھتے ہی پدرانہ شفقت سے اپنے سینے سے لگا یا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا تقرر ہو گیا ہے۔ سرور صاحب نے اس بات کو زیادہ دیر تک راز میں نہ رکھا اور مجھ کو بتلا دیا کہ "تمھارا تقرر ہو گیا ہے" کشمیر کے تجربات

میں بعد میں تحریر کروں گا۔ یہاں صرف اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ تین سال کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ادارۂ علوم اسلامیہ میں ایرانین اسٹڈیز کے ریڈر کی جگہ مشتہر ہوئی تو مجھے پھر علی گڑھ کی یاد آنے لگی۔ میری ہمت سرور صاحب سے کچھ کہنے کی نہ پڑی میں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ وہ مجھ کو علی گڑھ میں درخواست دینے کی اجازت دلوا دیں۔ بیگم صاحبہ نے نہ جانے کس انداز سے میری سفارش کی کہ دوسرے دن اقبال انسٹی ٹیوٹ آتے ہی سرور صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں علی گڑھ کی جگہ کے لیے درخواست دے دیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ علی گڑھ میں میرا تقرر ہو گیا۔ اور میں سرور صاحب کی اجازت سے دسمبر ۱۹۸۳ء کے اواخر میں علی گڑھ آ گیا۔ ان ہی تمام باتوں کی وجہ سے میں نے تحریر کیا ہے کہ "آج میں اپنے آپ کو کسی اور کا مرہون منت نہیں پاتا ہوں" اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے اپنے دوسرے اساتذہ سے فیض نہیں اٹھایا، ان سے اکتساب علم نہیں کیا، ان کے چراغ سے اپنا چراغ نہیں جلایا۔ ع

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

یہ سب اپنی جگہ ایک واضح و روشن حقیقت ہے لیکن یہ بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ واضح و روشن حقیقت ہے کہ جس کو مرہون منت ہونا کہتے ہیں وہ میں صرف سرور صاحب کا ہوں۔

سری نگر میں تین برس سے کچھ اوپر ہی میرا اور سرور صاحب کا ساتھ رہا۔ یہاں آکر اس بات کا احساس ہوا کہ سرور صاحب صرف کام کرنا ہی نہیں کام لینا بھی جانتے ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۸۰ء کو میں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۷؍ نومبر کو حسرت موہانی پر ایک روزہ سیمینار تھا، سرور صاحب نے وادی کشمیر کے اہل علم سے مجھے روشناس کرانے کے لیے حکم دیا کہ "تم بھی حسرت پر کوئی مقالہ پڑھو" اس وقت میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہ تھا مگر سرور صاحب کے حکم کو ٹال بھی نہ سکتا تھا۔ کئی دن ادھیڑ بن میں رہا کہ کیا لکھوں اور کس طرح اس ہفت خواں کو طے کروں؟ جب اعصابی تناؤ ہو تو آدمی کو جو سوجھتی ہے دور کی سوجھتی ہے۔ میں نے "محشر عمل حسرت" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا اور سرور صاحب کو دکھلائے بغیر سیمینار میں پیش کیا۔ چونکہ زیادہ تر مقالے حسرت کی شاعری پر تھے اس لیے سیمینار کے شرکاء نے میرے مقالے کو غور اور توجہ سے سنا اور بعد میں اپنی اپنی پسندیدگی کا بھی

اظہار کیا۔ سرور صاحب نے بھی اِس مقالے کو پسند کیا مگر دوسری ہی سانس میں یہ حکم بھی دیا "اب تم بیدؔل پر ایک مقالہ لکھ ڈالو۔ میں اہل علم کے ایک منتخب مجمع میں تمھارے مقالے پیش کروانا چاہتا ہوں۔" چار و ناچار میں نے ان کی اس خواہش کو بھی پورا کیا اور وہ طویل مقالہ جو بہت بعد میں رسالہ جامعہ دہلی (جنوری ۱۹۸۴ء) میں شائع ہوا تھا ایک جلسہ میں پیش کیا۔

صرف یہی نہیں بلکہ سرور صاحب سری نگر کے مختلف کالجوں میں تقریری اور بیت بازی کے مقابلے بھی کرواتے۔ ان مقابلوں میں وہ خود تو تشریف نہ لے جاتے ان کی نمائندگی مجھ کو کرنی پڑتی اور میری ڈھارس بندھانے کے لیے ڈاکٹر امین اندرابی ساتھ ہوتے۔ ان مقابلوں میں مجھے تقریریں بھی کرنی پڑتیں، شروع شروع میں تو اس سے ایک گونہ اس سے الجھن رہی مگر بعد میں طبیعت اِن "ستم ظریفیوں" کی عادی ہو گئی۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۴ء تک اقبال انسٹی ٹیوٹ میں جتنے بھی سمینار ہوئے ان سب کا انتظام میرے سر تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ سرور صاحب مجھ سے ہر سمینار میں مقالہ ضرور پڑھواتے شاید ہی کوئی سمینار ایسا ہوا ہو جس میں انھوں نے میری "جاں بخشی" کر دی ہو۔ اس موقع پر خاص طور سے اس ہفت روزہ سمینار کا ذکر کروں گا جو پندرھویں صدی ہجری کے آغاز پر سرور صاحب نے سری نگر میں کیا تھا۔ اس سمینار میں علماء بھی تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے نمائندے بھی، جہاں مندوب بہت ہوں اور کارکن کے نام پر فرد واحد رہاں بعض مسائل کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ میں بھی بعض مسائل سے دوچار ہوا اور نوبت بدمزگی تک کی آنے لگی مگر سرور صاحب نے میری غلطی کو اپنی غلطی بتلاتے ہوئے معاملے کو سلجھا لیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ سرور صاحب رخصت پر چلے گئے اور انسٹی ٹیوٹ کا چارج میرے ہاتھ میں رہا۔ میں نے بعض وہ فیصلے کیے جو اگر سرور صاحب ہوتے تو کبھی نہ کرتے، مگر جب واپسی پر ان کو میرے فیصلوں کا علم ہوا تو انھوں نے میرے تمام فیصلوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی، کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے میرے کسی فیصلے کے خلاف ناراضگی ظاہر کی ہو یا اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہو۔ ہمیشہ یہی ہوا انھوں نے میرے فیصلے کو اپنا فیصلہ قرار دیا اور اسی کو سختی سے نافذ بھی کروایا۔ یہ تو رہا

ن کا مجھ سے کام لینے کا طریقہ۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے جتنے بھی ریسرچ اسکالر تھے سرور صاحب ان سب سے جم کر کام کرواتے اور طالب علم جب تک ہر ممکنہ ماخذ کا مطالعہ نہ کر لیتا اس کو لکھنے کی اجازت نہ دیتے۔ ریسرچ کے طلبہ جب اپنا ایک باب مرتب کر لیتے تو سرور صاحب اس کو بلاناغہ روز ایک مقررہ وقت پر دیکھتے۔ ان کا طریق اصلاح یہ ہوتا کہ چند الفاظ کو ادھر سے ادھر کر دیتے یا کسی فاحش غلطی کو درست کر دیتے۔ میرے سامنے اقبال انسٹی ٹیوٹ کے جتنے طلبہ نے ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ہے ان میں سے کوئی ایک طالب علم بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس تحقیقی مقالے میں سرور صاحب کا پورا ایک جملہ بطور "عطیہ" شامل ہے۔

کشمیر میں سرور صاحب کا ایک وصف اور نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آیا۔ ممکن ہے یہ وصف ان میں پہلے سے موجود رہا ہو اور میری ہی نگاہ اس پر نہ پڑ سکی ہو۔ میں جس وصف کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ خوشی خوشی جینے اور بھر پور زندگی گزارنے کے گُر سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ اس کے عارف بھی ہیں۔ جس زمانے سے میں سرور صاحب کو تھوڑا بہت جانتا ہوں اس زمانے سے لے کر آج تک سرور صاحب نہ تو کبھی کسی مخالفت سے گھبرائے، نہ ہی کبھی طیش میں آ کر کفِ درد ہاں ہوئے۔ وہ اپنے مخالفین کے منھ بھی کبھی نہیں لگے اور نہ ہی انھوں نے کبھی اپنے مخالفین کے بارے میں ہم چھوٹوں کے سامنے کوئی نا ملائم کلمہ کہا۔ ایک بار میں نے ایک مضمون کے سلسلے میں ان سے درخواست کی کہ وہ اس کا جواب لکھ کر صحیح صورت حال سے لوگوں کو آگاہ کر دیں تو انھوں نے اُس بحث میں پڑنے سے انکار کر دیا اور کہا "میں حاسد نہیں محسود ہونا پسند کرتا ہوں۔"

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جلسوں میں بڑے بڑے "چغادری" شریک ہوتے، وہاں اختلاف رائے کو مخالفت کا رنگ اختیار کرتے ہوئے بھی میں نے دیکھا ہے۔ ایک سال جلسے میں (غالباً یہ بات ۱۹۷۳ء کی ہے) سرور صاحب نے مجھ کو جلسے کی کارروائی ریکارڈ کرنے کے لیے جلسہ گاہ میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس زمانے میں ایک مخصوص "ٹولہ" سرور صاحب سے بہت خفا تھا۔ ایک بزرگ نے کسی بات پر سرور صاحب کے لیے بھونکنے کا لفظ استعمال کیا

سرورصاحب کی جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو ہنگامہ ہو جاتا مگر یہ "کوہ وقار" بڑے تحمل کے ساتھ ان حضرت کی تقریر سنتا رہا۔ جب سرور صاحب جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو مسکراتے ہوئے کہا کہ "میں بھونکتا بھی ہوں اور بھونکراتا بھی ہوں۔" یہ بات انھوں نے کچھ اس انداز سے کہی تھی کہ بس مزا آگیا تھا۔ کشمیر میں بھی کئی "چھُٹ بھیّے" ان کے مخالف ہو گئے تھے جن کو انھوں نے کبھی منھ نہیں لگایا اور نہ ہی ان کی بے سروپا باتوں پر الجھ الجھ کر یا سوچ سوچ کر اپنے سینے میں کسی ناسور کو پلنے دیا۔ ان کے ساتھ سرور صاحب کا رویہ ایسا ہی تھا جیسا ہم آپ کا منھ پر آجانے والی مکھی کے ساتھ ہوتا ہے۔

زندگی گزارنے کے اِسی گُر کو جاننے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شدائد و مصائب سے گھبراتے نہیں بلکہ ان کا خاموشی اور یکسوئی سے مقابلہ کرتے ہیں اور جب ان کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو گذرے ہوئے اعصاب شکن حالات سے لطف اندوز ہونے کا فن بھی جانتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت صرف ایک واقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ جب وہ کشمیر میں تھے تعطیلات سرما بالعموم علی گڑھ میں گزارتے اور کشمیر یونیورسٹی کھلنے سے ایک دن پہلے زیادہ تر ہوائی جہاز سے سری نگر جاتے جس سال کا ذکر ہے اس سال بیگم صاحبہ کے کانوں میں کچھ ایسی تکلیف ہو گئی تھی کہ ہوائی جہاز سے ان کا سفر کرنا ممکن نہ تھا اس لیے علی گڑھ سے جمّوں تک کا سفر ریل گاڑی سے کیا گیا اور جمّوں سے سری نگر تک بس کے ذریعے اس سال کشمیر میں بڑی زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ جمّوں سے بس اپنے وقت سے روانہ ہوئی۔ مگر ٹنل Tunnel پر اس کو روک دیا گیا۔ کیوں کہ ٹنل برف سے بھری ہوئی تھی۔ سرور صاحب رات بھر اسی بس میں بیٹھے رہے۔ وہ رات انھوں نے کیسے کاٹی یہ تو وہی جانتے ہوں گے مگر جب سری نگر آئے تو اس "واقعے" کی اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے ہم لوگوں سے یہ بھی کہا کہ "جب صبح کے وقت ہر طرف برف ہی برف اور حد نگاہ تک برف پوش چوٹیوں پر نظر پڑی تو وہ منظر اتنا دلکش تھا کہ سارا تکدر دور ہو گیا اور جسم و جان نے ایک عجیب طرح کی فرحت محسوس کی۔" اس وقت سرور صاحب کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ جب اس عمر میں بھی غیر معمولی حالات سے مقابل ہونے کا ان کا یہ طریق

تھا تو جوانی میں کیا رہا ہوگا اِس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
آج جب کہ ان کی عمر اسّی برس کی ہو چکی ہے زندگی بسر کرنے کا ان کا یہی طریقہ برقرار ہے۔ اس عمر میں بھی نہ تو وہ ضعیفی کے عوارض کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی اپنی گرتی ہوئی صحت اور تنہائی کا۔ اب بھی وہ شاداں و فرحاں رہنے کے لیے سفر کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، مذاکرات اور مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں۔ نئی سے نئی کتاب حاصل کرنے اور اس کا مطالعہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ان کا حافظہ اب بھی قابلِ رشک ہے اور قلم رواں دواں۔ آج بھی ان کی فکر مرتب ہے اور وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں ان کا اندازِ گفتگو مربوط و مدلل ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ حالاتِ زمانہ پر بڑی گہری اور ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اور اس پر بھی اظہارِ خیال کیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا وہ خطبہ قابلِ ذکر ہی نہیں قابلِ مطالعہ ہے جو "ہندوستان کدھر" کے عنوان سے شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔
سرور صاحب نے بڑی فعّال، متحرک اور سرگرم زندگی گزاری ہے۔ انھوں نے اس کارگاہ ہستی میں بقول مجاز تیغیں بھی کھینچی ہوں گی اور ساغر بھی توڑے ہوں گے، نیزے بھی پھینکے ہوں گے اور خنجر بھی چومے ہوں گے، گر کر تڑپے بھی ہوں گے اور مست سے جھومے بھی ہوں گے، کبھی آگ لگائی ہوگی تو کبھی آگ بجھائی بھی ہوگی، اس عمل میں وہ مجروح بھی ہوئے ہوں گے اور انھوں نے دوسروں کو مجروح کیا بھی ہوگا۔ انھوں نے اگر ایک طرف دوسروں کے ساغر توڑے ہوں گے تو دوسری طرف ان کا ساغر لذت شکست و ریخت سے آشنا بھی ہوا ہوگا اگر ایک طرف ان کے نیزے سے کوئی زخمی ہوا ہوگا تو دوسری طرف ان کا جسم بھی نیزے کے زخموں سے محفوظ نہ رہا ہوگا۔ اگر ایک طرف ان کی وجہ سے کوئی گر کر تڑپا ہوگا تو دوسری طرف وہ بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ضرور اس مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ یہ سب کوئی غیر معمولی بات نہیں لازمۂ زندگی ہے اور ان باتوں کے بغیر زندگی اجاڑ، سپاٹ اور ادھوری ہے۔ اگر میں سرور صاحب کا معاصر ہوتا، کسی میدان میں ان کا مدِ مقابل ہوتا، ان کے وجود سے میرے وجود کی بقا کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا تو شاید میں ان کی شخصیت کے اس طلسم خانہ سے واقف ہوتا اور اس کی طرف کچھ اشارے کر سکتا لیکن میرا اور سرور صاحب کا رشتہ عمر کے لحاظ سے

باپ اور بیٹے کا ہے اور جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میں ان کا شاگرد، ماتحت اور رفیق کار بھی رہا ہوں اس لیے اس تحریر میں سرور صاحب کی کسی کمی، کوتاہی یا کجی کا ذکر نہیں ہے، شاگرد کے لیے تو استاد کی شخصیت ایک آئیڈیل ہوتی ہے اور آئیڈیل تو وہی ہوتا ہے جو حسن ہی حسن اور خیر ہی خیر ہو۔

انسانی خواہشات بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اس عمر میں بھی جب کہ میری عمر پچاس سال سے متجاوز ہو چکی ہے جی چاہتا ہے کہ میں ایک بار پھر سے طالب علم بن جاؤں اور سرور صاحب استاد اور ایک بار پھر وہ ہلکے سے میرا کان پکڑ کر کہیں "غواصی نہیں ابن نشاطی۔"

بقیہ:۔ طاہر علی صاحب: ایک تاثر

" He died unwept, unhonoured unsung "

طاہر صاحب نے جامعہ کے قیام کے دوران، ان عناصر سے جو جامعہ کے ہمدرد نہ تھے بلکہ ذاتی مفادات میں سرگرم تھے، تنہا جنگ لڑی۔ گویا ان کی زندگی مسلسل حق و باطل کی جنگ تھی۔ ایک دیوانہ، ایک مجنوں صبح و شام، تنہا سر راہ یا سر محفل سچ بولتا رہا، اور حق گوئی کے ذریعہ برسرپیکار رہا اور پھر بقول معصوم رضا راہی

رفتہ رفتہ وہ بکھرتا رہا ہر سانس کے ساتھ
اب بچا کیا ہے نہ مطرب ہے نہ مضراب نہ لے

جامعہ کی ملازمت سے فروری ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہونے والے تھے۔ جامعہ چھوڑنے کا انھیں ملال بھی تھا اس لیے کہ وہ ادارے کو بیحد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی ریٹائرمنٹ سے قبل اچانک رحلت پر کسی کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

ہم نے بلبل سے جو پوچھا درد فرقت کا علاج شاخ گل سے گر پڑی، تڑپی، تڑپ کر مر گئی

ڈاکٹر اجمل اجملی

سوویتی تاجیکی ادبیات کے بانی پر ایک نظر

۱۹۶۹ء میں سوویت لینڈ نہرو انعامات کے لیے جن کتابوں کو چنا گیا تھا ان میں اردو کتاب سوویتی تاجیکی ادبیات کے بانی بھی شامل تھی، اس کتاب کے مصنف فارسی ادبیات کے ممتاز عالم پروفیسر کبیر احمد جائسی ہیں جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی کے ادارۂ علوم اسلامیہ میں پروفیسر اور ڈائرکٹر ہیں۔ پروفیسر جائسی غالباً ہندوستان کے فارسی زبان کے علماء میں وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے فارسی ادبیات کے خاص دھارے "سبک ایرانی" کے مطالعے تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی ایک اور اتنی ہی اہم شاخ "سبک تاجیکی" کی قدر و قیمت بھی محسوس کی جو ہندوستان میں قرون وسطی میں رائج فارسی زبان سے بہت قریب ہے۔ یوں بھی سرزمین تاجکستان اور ہندوستان کے رشتے قرون وسطی میں بے حد قریبی رہ چکے ہیں اور فارسی کے جن ادیبوں اور عالموں نے ہماری مشترکہ تہذیب کے ارتقا پر اثر ڈالا ان میں سے بیشتر کا تعلق اسی سرزمین سے تھا مگر یہاں نہ اتنی گنجائش ہے اور نہ اس کا موقع کہ اس اہم موضوع پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کی جا سکے

پروفیسر جائسی نے اپنی لگ بھگ دو سو صفحات کی کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب پس منظر ہے جس میں تاجکستان کے حدود اربعہ، تاجیکیوں کی قومیت اور ان کے تاریخی اسیاسی حالات سے متعلق ایک عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ بعد کے دو ابواب سوویتی تاجیکی ادبیات کے دو بنیادی ستون صدرالدین عینی اور ابوالقاسم لاہوتی کی حیات و نگارشات کے مطالعے کے لیے

ڈاکٹر اجمل اجملی، نزد چوپال، او کھلا، نئی دہلی ۲۵

وقف ہیں۔ بحثوں کے دوران انھوں نے ایرانی فارسی اور تاجیکی کا فرق بھی چند جملوں میں بڑی خوبی سے واضح کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آج کی تاجیکی اور فارسی زبان میں سب سے بڑا فرق اختلاف واصطلاحات کا ہے تاجیکوں نے علوم جدیدہ کی بیشتر اصطلاحات روسی زبان کی مدد سے وضع کی ہیں اس کے برعکس ایرانیوں نے علوم جدیدہ کی بیشتر اصطلاحات فرانسیسی زبان کی مدد سے وضع کی ہیں اور بعض فرانسیسی الفاظ کو مفرّس کر کے اپنی زبان کا جزو بنالیا ہے۔" (صفحہ ۲۹)

پروفیسر جالشی نے عینی اور لاہوتی کو جدید تاجیک ادب کا بانی قرار دیتے ہوئے ان کی تخلیقات سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ عینی کے معاملے میں بوجوہ ان کی داستان حیات زیادہ طویل ہے مگر ان کے سب ہی ناولوں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔ لاہوتی پر لکھتے ہوئے انھوں نے اس کے شعری سرمائے کا محاکمہ کیا ہے اور اس کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس نے فردوسی، خاقانی، ظہیر فاریابی، نظیری اور دوسرے عظیم فارسی شعراء کے تہذیبی تسلسل کو برقرار رکھا۔ وہ صدیوں پرانی کلاسیکی روایت میں جدت اور ترقی پسندی کے پیوند لگاتا رہا اور اس طرح کہ نئے اور پرانے کا فرق مٹ گیا۔ پروفیسر جالشی سے پورا اتفاق کرتے ہوئے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی وسعت، اہمیت اور اثر آفرینی کے لحاظ سے تورسون زادہ بھی اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جو عمر میں چھوٹے ہونے کے باوجود اہمیت میں کسی سے کم نہیں ہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے لکھا تھا "ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی"۔ چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن کا جاری رکھنا بھی ہر چند کہ بڑے دل گردے کا کام ہے لیکن ضعیف والدین کی خدمت کرتے ہوئے، بن ماں کے چھے معصوم بچوں کی پرورش کرتے ہوئے، صبح سے شام تک گھر کے ہر طرح کے فرائض اور تعلیمی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بھی خود کو تخلیق و تحقیق کے میدان میں زندہ ہی نہیں بلکہ بڑی آن بان سے زندہ رکھنا وہ کارنامہ ہے جسے دیکھ کر کبیر احمد جالشی کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے کہ وقت اور حالات انھیں ذہنی سکون عطا کریں تاکہ وہ اس طرح کی اہم اور مفید نگارشات کا سلسلہ یکسوئی کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

یہ تحریر یہاں تک لکھی جا چکی تھی کہ اس کتاب پر ایک طویل تبصرہ نظر سے گزرا جو ہمارے دور کے ممتاز قلم کار پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ ہر چند کہ کسی تبصرہ پر اظہار خیال کرنا ہمارے ادب کی کوئی صالح روایت نہیں اور پھر جب بات پروفیسر اسلوب احمد انصاری جیسے بزرگ صاحب قلم کی ہو تو وہ واقعی اس کے لیے خاصی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا یہ طویل تبصرہ بہت ساری ایسی کمزوریوں کی آماجگاہ ہے جن کا دور کیا جانا مسائل کو واضح کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے ذہن میں تاجیکستان کے جغرافیائی حدود اربعہ کا کوئی واضح نقشہ نہیں ہے۔ انھوں نے بخارا، تاشقند اور ازبکستان کو تاجیکستان کے اجزاء قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ وسط ایشیا میں بخارا اور تاشقند جیسی کسی سوویت ریاست کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تاشقند سوویتی جمہوریہ ازبکستان کی راجدھانی اور بخارا اس کا ایک اہم اور قدیم شہر ہے جسے امام بخاری علیہ الرحمہ کے نام نامی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے دنیائے اسلام میں ایک خصوصی مقام حاصل رہا ہے۔ ازبکستان، فارسی یا تاجیکی زبان کا علاقہ نہیں بلکہ وہاں ایک دوسری زبان ازبکی بولی جاتی ہے جو ترکی زبان کی ایک شاخ ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ترکستان اور توران کو بھی تاجیک علاقہ قرار دیا ہے۔ ترکستان یعنی خالص ترکی زبان کا علاقہ وہ ہے جس پر سوویت یونین کی ایک جمہوریہ ترکمانیہ قائم ہے اور آج بھی قائم ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے تاجیکستان کے واضح تصور کی غیر موجودگی کی وجہ سے بخارا، تاشقند، ازبکستان، ترکستان، توران اور ماوراء النہر جیسے مختلف جغرافیائی اشاریوں کے استعمال کے ذریعے خاصا خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔

صاحب موصوف نے صدر الدین عینی اور ابو القاسم لاہوتی کے بارے میں کبیر احمد جائسی کے معروضات پر بھی رائے دینے کی زحمت گوارا کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اردو تنقید میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری ایک خاص نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہیں اس لیے اگر وہ صدر الدین عینی اور لاہوتی کی ان چند غزلوں اور نظموں کو پڑھنے کے بعد جن کے حوالے جائسی صاحب نے دیے ہیں، اس نتیجے پر پہنچے ہیں تو کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ "یہ سب غزلیں اور نظمیں کچھ زیادہ وقعت اور اہمیت

کی حامل نہیں ہیں"۔ بات دراصل یہ ہے کہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری جس کا فلسفۂ شعر کے قائل ہیں اس کی نظر میں کوئی ایسی نظم قابلِ قدر ہو ہی نہیں سکتی جس کا عنوان "در شرف انقلاب اکتوبر" اسی لیے انھیں نہ عینی کا کوئی کلام پسند آیا اور نہ آنا ہوتی کا اور یہی نہیں جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے انھیں مخدوم محی الدین کے "سرخ سویرا" میں بھی "معدودے چند اشعار کے علاوہ کہیں شاعری کی رمق نظر نہیں آتی۔"

عینی کے کلام پر جس کے بارے میں خود جالبی کا کہنا ہے کہ اس کا کوئی مجموعہ دستیاب نہیں ہے، پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے بڑی روا روی میں کچھ نادر شاہی فرمان سا صادر کر دیا ہے۔ اول تو کسی ادبی شخصیت کو بارے میں رائے دیتے ہوئے اس کے پورے کارنامے کو مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، اسلوب صاحب کے سامنے عینی کی شاعری اور ان کی نثر کا معتد بہ حصّہ تھا ہی نہیں۔ اس کے مشہور ناول "آدینہ" سے ان کا تعارف برائے نام رہا جس کے لیے انھیں جالبی صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ پروفیسر کبیر احمد جالبی نے عینی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں عینی کی دو معرکۃ الآراء تحریروں یعنی "یادداشتها" کی چار ضخیم جلدوں اور مختصر ترجمۂ حال خودم کو پیش نظر رکھا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ان میں سے کسی کے مطالعے کی بات تو دور رہی اس کا سرسری ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا ہے اس طرح وہ عینی کی ادبی کائنات سے پوری طرح واقف بھی نہیں ہیں۔ ناواقفیت کے باوجود عینی کے بارے میں ان کے ارشادات کس قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ اس کا فیصلہ میں خود پروفیسر اسلوب احمد انصاری پر چھوڑتا ہوں۔

دوسری بات یہ بھی قابل غور ہے کہ عینی کی زندگی جن حالات میں گزری، صبر آزما اور جانکاہ واقعات و حادثات جس طرح ان کی زندگی کا سائے کی طرح پیچھا کرتے رہے، اس میں ان سے یہ توقع کرنا کہ بیان حقیقت کے ساتھ ساتھ وہ نغمگی اور خوش آہنگی بھی ان کے کلام کا حصّہ ہوگی جو کلاسیکی شاعری کی روایت رہی ہے، یقیناً انصاف کا تقاضہ نہیں ہے۔ عینی، نظیر اکبرآبادی کی طرح عوام کے شاعر تھے، انھوں نے اپنے دور کے تاریخی منظر نامے کو عوام کی طرح دیکھا اور عوامی لب و لہجہ کے ساتھ اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا اب بھلے ہی اسلوب صاحب جیسے "نفیس اور پاکیزہ مزاج" ناقد جو اردو ادب میں عام قاری کی نہیں بلکہ اشرافیہ کی نمائندگی کرتے ہیں اسے

پسند کریں یا ناپسند۔

تقریباً یہی رویہ اسلوب صاحب نے ابوالقاسم لاہوتی کے بارے میں اپنایا ہے۔ لاہوتی کی شاعری دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان کی غزلوں پر ان کے ادبی ورثے اور قدیم تہذیبی روایات کی چھاپ بڑی گہری ہے لیکن یہ بات صرف لاہوتی کے طرزِ شعر گوئی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کیوں کہ ان غزلوں میں جو مسائل اور جو فکر پروئی گئی ہے وہ قطعی روایتی نہیں ہے بلکہ ان غزلوں کو پڑھتے ہوئے فکر کی تازگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے صحیح لکھا ہے کہ "لاہوتی بھی ایک انقلابی ذہن اور مزاج رکھتے تھے۔" لاہوتی کی شاعری کا دوسرا حصہ ان کی پابند اور آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ لاہوتی غالباً فارسی کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے اصناف کے لحاظ سے فارسی شاعری کا دامن نت نئے تجربوں کے ذریعے وسیع کیا ہے۔ ان نظموں میں منظوم ترجمے بھی ہیں۔ منظوم ڈرامے بھی اور رپیرا بھی اور رزمیہ و بزمیہ داستانیں بھی۔ لاہوتی کی تخلیقات کی اس وسعت اور اس کی غزلوں میں تغزل کی چاشنی کو دیکھنے کے بعد اسلوب صاحب کا یہ قول محض عصبیت کا آئینہ دار لگتا ہے کہ "لاہوتی بہرصورت کوئی قد آور شخصیت نہیں۔"

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اس طرح کے فتوے صادر کرنے میں ان مولویوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے جو رات دن سرسید کی تکفیر کے فتوے جاری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اردو شاعری کی ایک محبوب شخصیت مخدوم محی الدین بھی ان کے فتوے کی زد سے نہیں بچ پائے ہیں۔ موصوف نے مخدوم کے بارے میں بڑے مزے کی بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں :-

> "تقریباً تیس سال قبل مخدوم محی الدین نے سرخ سویرا کا ایک نسخہ راقم الحروف کو ازراہ کرم تحفتہً بھیجا تھا جس میں معدودے چند اشعار کے علاوہ کہیں شاعری کی رمق نظر نہیں آتی بلکہ وہی فریاد و للکار اور گونج جو ترقی پسند شاعروں کا بالعموم وتیرہ رہی ہے۔"

اسلوب صاحب نے مخدوم کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ تیس سال پرانی ہے اس کے بعد انھوں نے مخدوم کو پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی جب کہ اس بیچ مخدوم کی شاعری

نے بڑا لمبا سفر طے کیا ہے اور گلِ تر سے گذرتے ہوئے بساطِ رقص کی منزل تک جا پہنچی ہے۔ کسی شاعر کے بارے میں محض تیس سال پہلے کی ابتدائی شاعری کے بل پر کوئی رائے قائم کر لینے کی یہ روش بھی اردو تنقید میں اسلوب صاحب کی دی ہوئی ایک نئی روایت ہے اور اگر اس روایت کی کسوٹی پر غالب کو کسا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی شاعری "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اقبال اسلوب صاحب کے بڑے پسندیدہ شاعر ہیں اور محترم یقیناً ان لوگوں میں ہیں جو وحی اور حدیث کے بعد کلام اقبال ہی کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں، اگر بانگِ درا کے اقبال پر کوئی فیصلہ صادر کیا جائے تو ان کی عظمت کا وہ مینار کہاں جائے گا جس کے آگے اسلوب صاحب جیسے ناقد سجدہ کرتے ہیں۔

ناقد کے لیے سب سے بڑی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پسند اور ناپسند کے بارے میں معروضی انداز اختیار کرے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے طویل تبصرہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انھوں نے ہر جگہ معروضیت پر ذاتی پسند اور ناپسند کو ترجیح دی ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے والوں کو قائل کرنے میں یکسر ناکام ہے۔ جالبی نے لاہوتی کے مشہور قصیدے "کریملن" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خاقانی کے شہرہ آفاق قصیدے "خرابۂ مدائن" سے اس کا موازنہ کیا تھا۔ یہ موازنہ اس لحاظ سے قطعی مناسب تھا کہ خاقانی اور لاہوتی دونوں نے مطلق العنان حکومتوں کے سیاسی اور معاشی ظلم و استبداد کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے اور ان کی شان و شوکت کی نشانیوں کے سرنگوں ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسلوب صاحب نے جالبی کی اس رائے سے اتفاق کے باوجود اس موازنہ کا بُرا مانا ہے۔ ان کا ارشاد یہ ہے کہ "ادبی حیثیت سے خاقانی کے قصیدے میں جو زورِ اثر اور جو فنی گرفت اور جو عزم و تیور ہیں، وہ لاہوتی کے ہاں اس درجے نظر نہیں آتے۔ لاہوتی کے لہجے میں سیاسی منشا بڑی حد تک سطح پر نظر آتا ہے۔ لاہوتی کا بھلا خاقانی سے کیا مقابلہ؟" یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی کہے کہ لاہور کا بھلا دلّی سے کیا مقابلہ، ماسکو کا بھلا لندن سے کیا مقابلہ، نیویارک کا بھلا ٹوکیو سے کیا مقابلہ؟ جناب عالی ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کس جگہ آپ کو خاقانی کے قصیدے میں وہ اثر اور وہ فنی گرفت اور وہ عزم و تیور نظر آئے جس سے لاہوتی کا دامن

الی ہے جب کہ ایک ہی سطر پہلے پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب جائسی کی اس رائے سے اظہار اتفاق کر چکے ہیں کہ لاہوتی نے جس شدومد کے ساتھ عوام کے استحصال پر زور دیا اور اسے نمایاں کیا ہے وہ حالات کے فرق کی وجہ سے خاقانی کے ہاں موجود نہیں ہیں۔ "خرابۂ مدائن" اور "قصیدۂ کریمل" میں ایک اور فرق ہے جسے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے نظرانداز کیا ہے اور جس کی وجہ سے یقیناً قصیدۂ کریمل میں خرابۂ مدائن سے زیادہ زور اور طنطنہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ خرابۂ مدائن میں مرثیہ کا انداز ہے، ایک تباہی اور بربادی پر حزینہ لے ہے جو پورے قصیدے پر چھائی محسوس ہوتی ہے جب کہ قصیدۂ کریمل ایک ابھرتی ہوئی قوم کا اور ایک بنتی ہوئی دنیا کا رزمیہ ہے جس کا طربیہ آہنگ شاعر کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کو بھی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا وہ صرف چند طالبعلمانہ معروضات ہیں میرے ذہن میں انصاری صاحب کا تبصرہ پڑھنے کے بعد یہ سوالات اٹھے تھے اور جن کے بارے میں سمجھتا تھا کہ ان کا واضح ہونا بہت ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس تحریر سے کم از کم تاجیکستان کے محل وقوع اور شعرائے تاجیکستان کے بارے میں وہ الجھنیں کسی حد تک دور ہو گئی ہوں گی جو پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی تحریر پڑھ کر پیدا ہوتی ہیں۔

وفیات

۳؍دسمبر ۱۹۹۱ء کو محمد یعقوب صاحب نے (چپراسی، شعبۂ سوشل ورک) نے اچانک داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم اپنی خوش اخلاقی کی بنا پر یعقوب بھائی کے نام سے معروف تھے۔

۲۴؍دسمبر ۱۹۹۱ء کی شب میں جناب اخلاق احمد (کارکن دفتر جامعہ پالی ٹیکنک) کے والد جناب آفاق احمد عرف اچھن صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ادارہ مرحومین کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے اور پسماندگان کے غم میں شریک ہے۔

ڈاکٹر ریحانہ خاتون

دیوانِ سراجی میں علمِ نجوم کا اثر

اسلامی معاشرے میں علم فلکیات خصوصاً علم نجوم وہیئت کا بڑا اثر ملتا ہے۔ چنانچہ مختلف ادوار میں ستارہ شناسی کا علم بڑا مورد توجہ رہا ہے۔ فارسی شعرا کے کلام میں بھی ان علوم کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ فارسی قصیدوں میں ان کی کارفرمائی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔ زائچہ سازی وغیرہ اسی سے متعلق ہیں۔ چنانچہ شاعروں نے اپنے ممدوحین کے بارے میں ان زائچوں سے بڑا کام لیا ہے۔ غرض نجوم وہیئت کا مطالعہ فارسی زبان اور اس کے ادب کے پرکھنے میں بہت مفید ہے۔ لیکن آج کل اس کی طرف بہت کم توجہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے بعض شعرا کے کلام کی تفہیم بہت مشکل ہے۔ خصوصاً ایسے شاعر جو اس علم کے ماہر تھے۔ اس سلسلے میں انوری ابیوردی اور امیر خسرو دہلوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان کے عہد مملوک کا پہلا صاحب دیوان شاعر بھی نجوم اور ہیئت کے مسائل سے کافی واقف معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے مقالے میں اس کے کلام کا تجزیہ اسی نہج سے کیا جارہا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر آؤں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کے بعض ابتدائی امور کا ذکر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کی تفہیم کے بغیر ہماری گفتگو قابل توجہ قرار نہیں پائے گی۔

بارہ آسمانی بروج

حمل Aries

ڈاکٹر ریحانہ خاتون شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی دہلی۔

ثور	Taurus
جوزا	Gemini
سرطان	Cancer
اسد	Leo
سنبلہ	Virgo
میزان	Libra
عقرب	Scorpio
قوس	Sagittarius
جدی	Capricorn
دلو	Acquarious
حوت	Pisces

نام سیارگان

عربی	فارسی	انگریزی
قمر	ماہ	Moon (Luna)
عطارد	تیر	Mercury
زھرہ	ناہید	Venus
شمس	آفتاب	Appollo
مریخ	بہرام	Mars
مشتری	برجیس	Jupiter
زحل	کیوان	Saturn

ان میں سے ہر سیارہ کسی نہ کسی آسمان کا مالک ہے۔

قمر: فلک اول کا مالک ہے۔

عطارد: فلک دوم کا مالک ہے

زھرہ : فلک سوم کی مالک ہے۔
شمس : فلک چہارم کا مالک ہے۔
مریخ : فلک پنجم کا مالک ہے۔
مشتری : فلک ششم کی مالک ہے۔
زحل : فلک ہفتم کا مالک ہے۔

یہ سیارے گردش کی حالت میں مختلف برجوں میں پہنچتے ہیں۔ انھیں سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ سیاروں میں بعض کی رفتار زیادہ ہے اور بعض کی کم۔ تو کبھی کبھی دو سیارے ایک برج میں آجاتے ہیں تو ان کی خاص تاثیر ہوتی ہے ان کو قران کہتے ہیں۔ انھیں کے تعلق سے سیاروں میں بعض خصوصیت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ان کا شرف، ان کا ھبوط، ان کا عروج اور ان کا زوال انھیں برجوں کے تعلق سے ہوتا ہے۔ ذیل میں ایک نقشہ درج کیا جاتا ہے جس میں شرف، ھبوط، عروج اور زوال کی کیفیت درج ہوگی۔

سیارگان	قمر	عطارد	زھرہ	شمس	مریخ	مشتری	زحل
شرف	ثور	سنبلہ	حوت	حمل	جدی	سرطان	میزان
ھبوط	عقرب	حوت	سنبلہ	میزان	سرطان	جدی	حمل
عروج	سرطان	جوزا، سنبلہ	ثور، میزان	اسد	حمل، عقرب	قوس، حوت	جدی، دلو
زوال	جدی	قوس، حوت	حمل، عقرب	دلو	ثور، میزان	جوزا، سنبلہ	سرطان، اسد

ساتوں سیاروں کے درجے :

قمر : شہزادۂ فلک، صباغ الاثمار (اس سے پھلوں میں رنگ پیدا ہوتا ہے)۔
عطارد۔ دبیر یا منشیٔ فلک
زھرہ : رقاصہ یا قوالۂ فلک
شمس : سلطان الکواکب

مریخ : جلاد فلک۔

مشتری: قاضیِ فلک

زحل : پاسبانِ فلک

سراجی اپنے ایک قصیدے میں جوامیر سابق الدین سعد ان بن محمود کی مدح میں ہے، اس میں ساتوں سیاروں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

زحل نا پاسباں جاہ او شد ‏ ‏ ‏ ‏ زھشتم چرخ برتر بنیم اورا
مگر برجیس سعد از طالعش برد ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دایم سعد اکبر بینم اورا
مگر جلادؔ خصمش گشت مریخ ‏ ‏ ‏ ‏ ازآن با تیغ و خنجر بنیم اورا
مگر نینا گر ش ناہید چرخش ‏ ‏ ‏ ‏ ازآن باچنگ و میزھر بنیم اورا
عطارد چون سراجی مادح اوست ‏ ‏ ‏ ‏ ازآن با کلک و دفتر بنیم اورا
وشان او قمر شد ز آنکہ ہر ماہ ‏ ‏ ‏ ‏ کمان دارد سپر در بنیم اورا

شاعر نے پہلے شعر میں زحل کو اپنے ممدوح کی جاہ وحشمت کا پاسبان بتایا ہے اور اس کو آٹھویں آسمان پر بتایا ہے۔ یا تو شاعر کو آٹھویں آسمان کا اشتباہ ہوا ہے جب کہ زحل فلک ھفتم کا مالک ہے یا یہاں پر ھفتم کی جگہ غلطی سے ھشتم لکھا گیا ہے۔ مشتری سعد سیارہ ہے اس کو سراجی سعد اکبر کہتے ہیں چنانچہ اپنے ممدوح کو انھوں نے برجیس یا سعد بتایا ہے۔ مریخ جلاد فلک ہے ممدوح کی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے اس کو جلاؔد صفت بتایا ہے اور تیغ وخنجر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ ناہید کو رقاصہ فلک کہا ہے اور اس کے ہاتھ میں چنگ اور مزھر (آلہ موسیقی) بتایا ہے۔ عطارد دبیر یا منشی فلک ہے اس کے ہاتھ میں قلم اور اس کے پاس دفتر ہے۔ قمر شہزادہ ہے جس کے ہاتھ میں کمانؔ اور سپر ہے۔

ان اشعار سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہاں پر ایک اور شعر ہونا چاہیے جس میں شمس کا ذکر ہوتا۔ یقیناً دیوان میں اس جگہ سے ایک شعر غائب ہے۔

اب ایک دوسرے قصیدے کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو تاج الدین ابوالمکارم خسرو کی مدح میں ہے:

پاسبان رفعتش کیوان شدست از بهر آن   دارد اندر طاق هفتم چرخ منظر یافته
مشتری تا خطبهٔ دولت بنام او کند   خویشتن بر ذروهٔ ششم پایه منبر یافته
ترک پنجم صف که کهتر هندوی درگاه اوست   پیش خصمت در کف از الماس خنجر یافته
خسرو یارم عزن آن شرف هر صبحدم   بر سر از خاک درش مقدار افسر یافته
مطرب بزم سوم در آرزوی بزم شاه   ناله های ارغن از او تا رمز یافته
دفتر اشعار در کف صاحب صدر دوم   بوالمکارم بو رخسرو نقش دفتر یافته
از برای آنکه شه را روز رزم ایک بکار   ماه خود رائی کمان و گاه اسپر[3] یافته

ان ساتوں اشعار میں ساتوں سیاروں کا آسمان پر ان کے منصب کے اعتبار سے ذکر ہوا ہے۔ مثلاً زحل یا کیوان پاسبان فلک ساتویں آسمان پر ہے۔ مشتری یا برجیس قاضی فلک چھٹے آسمان پر، مریخ یا بہرام جلاد فلک پانچویں آسمان پر، شمس یا خورشید سلطان الکواکب چوتھے آسمان پر، زهره یا ناهید رقاصہ فلک تیسرے آسمان پر، عطارد یا تر منشی فلک دوسرے آسمان پر، قمر یا ماہ شہزادہ فلک پہلے آسمان پر۔

ایک اور قصیدے کے چند اشعار جو شاعر نے "قطب الدین شاہ بن تاج الدین ابو المکارم کی مدح میں لکھے ہیں ملاحظہ ہوں:

پیر هندوئی که کیوانست نامش بر فلک   پاسبان اوست چون چوبک زنی بر منظری
مشتری را در ادای خطبهٔ ملکش مدام   معتکف بینم نشسته سال و مه بر منبری
ترک پنجم صف که مریخست چوں جاندار خاص   بر در ما هش بهر دستی کشیده خنجری
از برای زینت حسن عروس ملک او   آفتاب اندر دل کان زر زند چون زرگری
زهره را در دل هوس تا بید اندر بزم او   آستین عشرت اندر دامن خنیاگری
در پی مدح و ثنای او عطارد می کشد   چون سراجی خویشتن در سلک بر مدحت گری
ماه از بهر نشان تا در او سال و ماه   گاه باشد چون کمانی که بود چون اسپری[5]

شاعر نے کیوان کو پیر ہندو کہا ہے اور اس کو ہی پاسبان اور چوبک زن بتایا ہے۔ نجیب جرباد قانی نے بھی مندرجہ ذیل بیت میں اس کو چوبک زن کہا ہے:

چونک زنان بام تو ہر شب بوقت پاس شوریدہ ساکنان فلک را بہای ھای

اعر نے دوسری بیت میں مشتری کو قاضی فلک بنایا ہے جو منبر پر خطبہ دے رہا ہے۔ مریخ پانچویں ان کا ترک ہے ہر وقت خنجر کشیدہ اپنے ہاتھوں میں رکھتا ہے۔ چوتھے شعر میں آفتاب کی ایک میت کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے چمکنے سے کان میں سونا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی خیال ہ کہ سورج کی مسلسل روشنی پڑنے سے پتھر ہیرا ہو جاتا ہے۔ سنائی کا شعر ہے:

سالہا باید تا یک سنگ اصلی ز آفتاب لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

ہرہ اس کے بزم کی رقاصہ ہے۔ عطارد پیر فلک ہے جو اس کی مدح میں قصیدے لکھ رہا ہے اند برابر کمربستہ ہے جس کے ہاتھ میں کمان ہے تو کبھی سپر۔ یہی خصوصیت اور قصیدوں میں بتائی ئی ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو سلطان نصرت الدین ابو الخطاب خسرو ی مدح میں ہے:

چرخ اسباب زحل از پاسبانی تو ساخت
پایگاہ برتری اینک بدان اسباب یافت

مشتری بر طالع ایام تو موقوف کرد
ھر سعادت کاندرین شش خانہ اصطرلاب یافت

تا زند مریخ بر دل بر جگر گاہ عدوت
رمح الماسیش از دست اجل زھراب یافت

شاہ انجم نصرت الدین یافت القاب ترا
در سرای ضرب کان زرھم بدین القاب یافت

بربط اندر بر ز تاب آز وبی تاب ماند
زھرہ از عکس قرابت بر فلک چون تاب یافت

بیسر و منشی دیوان تو شد تیر فلک
در ازل زان پیشوائی بر ہمہ کتاب یافت

چرخ اسپر وش ہدف کرد از چہ از جرم قمر
محور تیرت چو از ج کمان پرتاپ یا فتند[6]

اس قصیدہ میں بھی بطور سابق زحل کو پاسبان فلک کہا ہے اور اس کے سب سے بلند مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مشتری سعد سیارہ ہے جو چھٹے آسمان پہ ہے۔ مریخ دشمن کے جگر پر خنجر مار رہا ہے۔ آفتاب کے سونے بنانے کی خاصیت بیان کرتا ہے۔ زہرہ کی بربط نوازی اور عطارد کی تمام کاتبوں پر فوقیت کے ذکر کے ساتھ اس کی کمان اندازی کا ذکر ہے۔

ایک اور قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو بدرالدین عیسٰی کی مدح میں ہیں۔

منتہی ہفتم فلک یعنی زحل چون پاسبان
از پی چوبک زدن ہندری بام و در تراست

ترک پنجم صف کہ مریخست نامش روز و شب
از پی قتل صودت آفتہ خنجر تراست

تخت چارم آنکہ خورشید ست سلطانش بنام
پیش ایوان جلالت غرفۂ منظر تراست

مطرب بزم سوم ناہید دستان آزمای
کردہ ہر ہفت اندرین پیروزہ گون چادر تراست

کاتب صدر دوم آنکش عطارد کینت است
چون سراج مدح خوان با خامہ و دفتر تراست

ماہ دور اولین کاندر مرور کرد فر بشبہ
کہ گمان باشد بشبہ دگر بشکل اسپر تراست[7]

اس سلسلے میں ایک شعر یہاں سے اصل دیوان سے غائب ہے جس میں فلک ششم کا ذکر ہونا چاہیے تھا جو مشتری کی ملکیت ہے۔ پہلے شعر میں زحل حسب دستور منتہی فلک اور پاسبان بتایا گیا ہے اور اس کی صفت چوبک زنی بتائی گئی ہے۔ مریخ ترک پنجم کہا گیا ہے۔ خورشید کو چہارم فلک کا مالک اور زہرہ کو بزم سوم کی مطرب، عطارد کاتب صدر دوم اور ممدوح کی مدح میں مشغول ہے۔ ماہ پہلے دور کا مالک

ہے۔ اس کے ہاتھ میں حسب دستور کمان اور سپر ہے۔

ایک اور قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو "سلطان نصرت الدین ابوالخطاب خسرو کی مدح میں ہے۔ درج ذیل قصیدے میں بھی سب سیاروں کی خاصیت کا ذکر ملتا ہے :

تا بیارا ید جمال نوعروس ملک را
آسمان چون حلقہ گشت وماہ و انجم چاکرش

گر نبودی پاسبان جاہ لو جرم زحل
منظر ھفتم نبودی جایگاہ مخبرش

مشتری گر خطبۂ ملکش نخواندی درازل
ذروۂ ششم پایۂ گردون نبودی منبرش

نام فہمش بستر دمریخ ارتاریخ عمر
زآن ھمی خواند فلک جلاد ترک اشقرش

آفتاب ار بر در بارش نکردی چاکری
کی شدی سلطان چرخ چہارم درخورش

ناظم اشعار دولت کش عطارد کنیت است
نیست جز مدح شہنشاہ بر کتب سر دفترش

گر نبودی ماہ بر درگاہ شہ جاندار خاص
درکف فطرت ندادندی کمان واسپرش[۵۰]

یہاں ایک شعر دیوان سے غائب ہے جس کی وجہ سے زھرہ کا ذکر نہیں ہو سکا ہے۔ چوتھے شعر میں مریخ کو ترک اشقر کہا گیا ہے۔ اشقر سرخ رنگ ہے اور مریخ کا رنگ بھی سرخ بتایا گیا ہے۔

شاعر نے انھیں اصطلاحات کی مدد سے اپنے ممدوح کا دسترخوان اور دربار سجایا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں جو سلطان قطب الدین سلطان شاہ" کی مدح میں ہیں :-

حمل وجدی را سزاست اگر — بر سرِ خوان نہی چو بریانی
قرصِ خورشید و ماہ را زیبد — کز تنور اثیر بستانی
کاسۂ چرخ گر کند شاید — بر سرِ خوان تو نمکدانی
زھرہ بر چنگ خویش بنوازد — پردہ ھای ھزار دستانی
تیر گردون بفخر بر دارد — چون سراجی رہ ثنا خوانی
منہی دور آسمان ھردم — گوید از لفظ لطف ربانی[۱۱]

ایک اور جگہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو سلطان معزالدین سنجر شاہ کی مدح میں ہیں:۔

خداوندا چنین شد با بزرگان — ترا امروز مہمان می نماید
فلک خوان دو قرص ماہ و خورشید — با قبالش ترا نان می نماید
غلط گفتم کہ چرخ گند ناگون — ترا چون ترہ بر خوان می نماید
حمل بر آتش خورشید امروز — بھانیت بریان می نماید
سپہر نیلو فراز شغل پروین — چو دستہ بستہ ریحان می نماید
زبہر این طرب ناھید بر چنگ — چہ گویم تا چہ دستان می نماید
عطارد بر نشاط این سعادت — سراجی ثنا خوان می نماید[۱۱]

ایک اور جگہ ملاحظہ ہو:

با دو قرص دریزہ چندی کہ دارد آسمان
ھر شبی قدر ترا بر خوان خود مہمان برد[۱۲]

حسب ذیل بیت میں جو شہنشاہ سیف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مرثیے کے ذیل میں ہے سراجی نے اس علم کی دو اہم اصطلاحات کا استعمال کیا ہے جن کی تشریح ضروری ہے۔

مشتری ھنگام تثلیث نظر ایام را[۱۳]
در شقاوت را تربیع کیوان آمدست

تثلیث :۔ منجموں کی اصطلاح میں قمر کا سات ستاروں کے ساتھ اس طرح رہنا کہ ان میں پانچ یا نو برج کا فاصلہ ہو جیسے قمر حمل میں ہو اور مشتری اسد میں یا مشتری قوس میں ہو

اس صورت میں حمل سے اسد تک پانچ خانے ہیں اور حمل سے قوس تک نو خانے ہیں اور یہ نظر پوری دوستی ہے اور یہ سات سیارہ (مشتری ساتواں سیارہ) قمر کا خادم اور ناظر ہوتا ہے اور اس کو تثلیث اس وجہ سے کہتے ہیں کیوں کہ قمر اور سعد کے بیچ میں آسمان کے حصّے کا ایک تہائی حصّہ بحساب درجات ہے اور یہ چار برج ہیں۔ اگر ان کے درمیان برجوں کا فاصلہ زیادہ ہے تو اس کو تسدیس نظر کہتے ہیں یعنی چھٹا اور یہ نیم دوستی ہوتی ہے[۱۴]:-

تربیع :- چاند اور دوسرے سیاروں کے درمیان چار برج یا دس برج کا فرق ہوتا ہے مثلاً قمر اگر حمل میں ہو اور زھرہ سرطان میں یا قمر جوزا میں ہو اور زھرہ حوت میں تو یہ نظر دشمنی کی دلیل ہے۔ اور اس کو تربیع اس لیے کہتے ہیں کیونکہ قمر اور دوسرے سیاروں کے درمیان درجات کے حساب سے نوے درجے کا فاصلہ ہے جو حصّہ فلک کا چوتھائی ہے یعنی فلک تین سو ساٹھ درجے کا ہوتا ہے[۱۵]۔ بغیر ان اصطلاحات کو جانے ہوئے اس شعر کا مطلب سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ذیل میں چند شعر درج کیے جاتے ہیں جو "صاحب صدر الملک تکین" کی مدح میں ہیں اور علم نجوم کی اصطلاح سے واقفیت کے بغیر ان کا سمجھانا اور سمجھنا ناممکن ہے۔

دارد اندر سر نش شمع سرای چرخ را
شمع رخشارش کہ از عنبر دخان می افکند
مشتری را با زحل امسال می گوید حکیم
آن قرآن باشد کہ در عالم زیان می افکند
آن ندانم این همین دانم کہ رو بش مشتریست
دور گردون چوں زحل خطی بر آن می افکند
پس قرآن افتاد اینک مشتری را با زحل
گرچہ یارم فتنہ از آن درجہان می افکند
جز بخوبی ننگرد کین خوش قرآن تا بر جبین
پیش صدر صاحب صاحبقران می افکند[۳۶]

اس کے پہلے شعر میں آفتاب کا ذکر ہے جو چوتھے آسمان پر ہے اور پورے عالم کو منور کرنے کی ذمہ دا

ں کے سپرد ہے۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے پانچویں شعر میں مشتری اور زحل کا قران (ملن) بتایا ہے۔ یہ قران عالم اور علم کا زیان ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قاری کو سیاروں کے قران کے تعلق ابتدائی معلومات ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ذیل میں ایک نقشہ دیا جاتا ہے۔ جس میں سیارگان ے قران کا نتیجہ درج ہے:

۱۔ قمر اور مریخ : یہ دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ہے۔
۲۔ قمر اور عطارد : یہ اہل قلم کی ملاقات کے لیے ہے۔
۳۔ قمر اور زہرہ : یہ محبت اور شادی کرنے کے لیے ہے۔
۴۔ قمر اور مشتری : یہ حصول زر، ترقی اور تجارت کے لیے اچھا ہے۔
۵۔ قمر اور زحل : یہ دشمن کی بربادی کے لیے ہے۔
۶۔ مریخ اور عطارد : یہ دشمنی کے لیے مفید ہے۔
۷۔ مریخ اور زہرہ : یہ اہل نشاط کے غلبے کے لیے ہے۔
۸۔ مریخ اور مشتری : یہ لڑائی میں فتح پانے کے لیے ہے۔
۹۔ عطارد اور زحل : یہ دوستوں کی ملاقات کے لیے مفید ہے۔
۱۰۔ عطارد اور مشتری : یہ حصول علم کے لیے ہے۔
۱۱۔ زہرہ اور مشتری : یہ مطیع کرنے کے لیے ہے۔
۱۲۔ زہرہ اور زحل : یہ عورتوں کے لیے اچھا ہے۔
۱۳۔ مشتری اور زحل : یہ اہل علم کی عقلیں زائل کرنے کے لیے ہے۔

شاعر بعض اوقات سیاروں کے رنگ کا ذکر کرتے ہیں مثلاً سراجی بہرام یعنی مریخ کے رنگ شقر کا ذکر اس بیت میں کرتا ہے:

گر ببیند تیغ تو بہرام اشقر بعد ازیں
چادر اندر سر کنند بر چرخ اخضر بعد ازیں[۱۷]

شقر سرخ رنگ کے معنی میں آتا ہے اور مریخ کا رنگ (بہرام) سرخ مثل خون ہے۔ عنصری کے شعر اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:

زعکس خون مخالف کہ شاہ ریخت ھنوز
درآن دیار ھوا ابرش است وخاک اشقر[۱۸]

سراجی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

مریخ اشقر است زحل دار باذنب
درخط زمن کہ نور دلم ماہ ومشتریست[۱۹]

سراجی پھر کہتا ہے:

نام خصمش بسترد مریخ از تاریخ عمر
زآن ھمی خواند فلک جلآ د ترک اشقرش

یہاں بھی اشقر مریخ کے لیے ہے جس کا رنگ سرخ ہے۔ سیاروں کے رنگ کا نقشہ ملاحظہ ہو۔

قمر: سفید مائل بہ زردی
عطارد: سبز مائل بہ سیاہی
زھرہ: سفید گندمی
شمس: سرخ مائل بہ زردی
مریخ: سرخ مثل خون
مشتری: زرد، سفید مائل بہ سبز
زحل: سیاہ

سیاروں کے دنوں کی نسبت بھی قابل ذکر ہے۔ اگرچہ فی الحال دیوان سراجی سے اس کی مثالیں نہیں مل سکی ہیں۔

شمس:	مالک یک شنبہ	Sunday	رویوار
قمر:	دوشنبہ کا مالک ہے	Monday	سوموار
مریخ:	سہ شنبہ کا مالک ہے۔	Tuesday	منگل وار
عطارد:	چہار شنبہ کا مالک ہے۔	Wednesday	بدھوار (بودھ عقل کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)
مشتری:	پنج شنبہ کا مالک ہے۔	Thursday	برھسپت وار

زھرہ: جمعہ کی مالک ہے Friday شکروار

زحل: سنیچر کا مالک ہے Saturday سنیچر وار

شاعروں کے کلام میں سیاروں کے سعد و نحس کا برابر ذکر ملتا ہے۔ منجمین کے بموجب بعض سیارے سعد ہیں اور بعض نحس۔ ان کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

قمر: سعد اکبر

عطارد: سعد و نحس دونوں ہی

زھرہ: سعد اکبر

شمس: سعد اکبر

مریخ: نحس اصغر، سعد و نحس دونوں ہی۔

مشتری: سعد اکبر

زحل: نحس اکبر

سعدین سے مراد مشتری اور زھرہ ہوتے ہیں۔ اور دو نحس سے مراد۔ زحل اور مریخ ہیں۔

منجمین کا عقیدہ ہے کہ سیارے جب برج میں پہنچتے ہیں تو ان میں شرف، ھبوط، عروج اور وبال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً سراجی کہتا ہے

چو مشتری بکمان و چو ماہ در سرطان

در آمد از درم آن آفتاب زھرہ جبین[۳۰]

کمان سے مراد برج قوس ہے۔ برج قوس خانۂ مشتری ہے اور اس حالت میں وہ بڑا قوی ہوتا ہے اور برج سرطان خانۂ ماہ ہے اور وہ اس کی قوت پر دلالت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سنائی غزنوی اور مختاری غزنوی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

بودی آن روز بکردار چو خورشید بثور

ھستی امروز بمقدار چو مہ در فرچنگ[۳۱]

خرچنگ برج سرطان کو کہتے ہیں۔ خورشید جب برج ثور میں ہوتا ہے تو وہ بڑا قوی ہوتا ہے:-

زهی بستند دولت چو مشتری در قوس
زهی بصد وزارت چو شمس در جوزا[۲۲]

برجیس بقوس است چو در صدر بزرگیست
خورشید بجوز است چو بر مرکب تازیست

یکی نوش است در شکر دوم زهر است در بهر
سوم ماه است در جوزا چهارم سرو بستان
یکی سبزه است بر لاله دوم ماه است در عقرب
سوم شکست در چنبر چهارم زهره در میزان[۲۴]

سعد احبابش بود چون زهره در میزان رسد
نحس بدخواهش بود چون وه ز میزان بگذرد[۲۵]

ناصحت را طالع مردود از مادر بزاد
مشتری در قوس حد زهره بمیزان در رسید
حاسدت را طالع مردود از مادر بزاد
نحس اصغر در دل عقرب بکیوان در رسید[۲۶]

زهره کا خانہ میزان ہے اور وہ اپنے خانے میں بہت قوی ہے۔ مہر کا شرف برج حمل میں ہوتا ہے اور یہ اس کی قوت کی دلالت کرتا ہے:

رای تو چون زهره در میزان و مهر اندر حمل
حاسدانت چون شیاطین، جملہ لا بل هم اضل[۲۷]

سعد و نحس و قوی و کمزور کے اعتبار سے یہ شعر نہایت بہترین مثال ہے:

دوستانت کہ میلاد میمون بر فلک

سعد اکبر همره زهره بمیزان می رسد[۲۸]

امیر معزی نے بھی کئی بار اپنے اشعار میں زھرہ کو میزان کے برج میں بیان کیا ہے:

رشک آید از رکابت ناهید را بمیزان[۲۹]

چو همر مزنوس و ماهی را چو زهره ثور و میزان را[۳۰]

تا نور فزاید از مه و زهره برج سرطان و برج میزان را[۳۱]

تا که همی برج زهره باشد میزان[۳۲]

اصغر: مراد مریخ یعنی بہرام۔ قران نحس اصغر کیوان کے ساتھ (زحل) یعنی نحس اکبر برج عقرب میں جو کہ مریخ کا خانہ ہے بہت نحس ہوتا ہے۔

ان اشعار کی صحیح تفہیم کے لیے وہ نقشہ پیش نظر رکھنا چاہیے جس میں سیاروں کی چاروں خاصیت کا ذکر ہے یعنی کہاں ان کو شرف حاصل ہوتا ہے اور کہاں وہ هبوط کے درجے پر پہنچے، کہاں ان کو عروج ملتا ہے اور کون سا خانہ ہے جو ان کے لیے وبال کا باعث ہوتا ہے۔ یہ نقشہ شروع میں درج کیا جا چکا ہے۔

سراجی کے دیوان میں نجوم کے اثرات کی متعدد مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن فی الحال انھیں مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف سراجی بلکہ فارسی کے اور شعراء کے کلام کا مطالعہ اسی انداز سے ہو۔ بلکہ یہ موضوع کافی وسیع ہے اس کو تحقیق کا موضوع قرار دینا چاہیے۔ اور اس کام سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو جدید علم نجوم سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

دیوان سراجی کے اس نہج سے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دیوان

میں بعض اشعار غائب ہیں اور بعض جگہ غلط کتابت کی وجہ سے آسمانوں کے تعین میں غلطی ہوگئی ہے
اس مقالے میں جو تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے اس سے بعض غلطیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اس
مقالے کا مقصد اس مخصوص امر کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ نجوم اور ہیئت سے کسی قدر آشنائی کے
بغیر فارسی اشعار بالخصوص قصائد کی تفہیم تقریباً ناممکن ہے۔

حوالے:

۱ ملاحظہ ہو دیوان سراجی، باہتمام ڈاکٹر نذیر احمد، باب اول، ۱۹۷۲ء/ ۱۳۵۱ شمسی صفحہ ۸۔

۲ سراجی نے مختلف قصیدوں میں قمر کی یہی خصوصیت لکھی ہے۔

۳ اسپر یعنی سپر

۴ دیوان سراجی، صفحہ ۲۸۰–۲۷۹۔

۵ ایضاً صفحہ ۲۹۲۔ ۲۹۱

۶ ایضاً، صفحہ ۶۸۔

۷ ایضاً، صفحہ ۲۹۔

۸ مشتری کو وصاف بارگاہ بھی کہا ہے د وصاف بارگاہ بمعنی زبان گرفتہ اور عاجز

۹ ایضاً، صفحہ ۱۹۹۔

۱۰ دیوان سراجی صفحات ۲۹۹–۲۹۸

۱۱ ایضاً، صفحات ۱۴۱–۱۴۰۔

۱۲ ایضاً، صفحہ ۸۰۔

۱۳ ایضاً، صفحہ ۳۴۔

۱۴ غیاث اللغات صفحہ ۱۰۹۔

۱۵ ایضاً، صفحہ ۱۱۳۔

۱۶؎ ملاحظہ ہو دیوان سراجی صفحات ۱۱۱-۱۱۰

۱۷؎ ایضاً، صفحہ ۲۲۰

۱۸؎ ملاحظہ ہو دیوان عنصری، صفحہ ۱۰۸

۱۹؎ دیوان سراجی، صفحہ ۵۵

۲۰؎ ایضاً صفحہ ۲۵۸

۲۱؎ دیوان سنائی صفحہ ۱۸۸۔

۲۲؎ دیوان مختاری غزنوی، صفحہ ۱۴۔

۲۳؎ دیوان سنائی صفحہ ۲۴۱

۲۴؎ دیوان مختاری غزنوی، صفحہ ۵۵۔

۲۵؎ دیوان سنائی، صفحہ ۲۴۱۔

۲۶؎ ایضاً، صفحہ ۱۵۰۔

۲۷؎ ایضاً، صفحہ ۳۳۰۔

۲۸؎ دیوان سنائی، صفحہ ۹۳۔

۲۹؎ دیوان معزی، صفحہ ۸۔

۳۰؎ ایضاً، صفحہ ۱۱۔

۳۱؎ ایضاً، صفحہ ۲۸۔

۳۲؎ ایضاً صفحہ ۴۱۔

افضال الرحمٰن

طاہر علی صاحب: ایک تاثر

طاہر علی صاحب، پراپرٹی گارڈ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ۱۳؍نومبر ۱۹۹۱ء کو ایک بس حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ بظاہر دلّی کی زندگی میں یہ ایک معمولی سی خبر ہے۔ تقریباً روز ہی دلّی میں پانچ دس حادثاتی اموات ہوتی رہتی ہیں جن میں سے بعض کی اطلاع خبرناموں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے اور بعض کے متعلق پولیس کی اپیل "برائے شناخت" اخباروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

طاہر علی صاحب اپنے دفتری فرائض پورے کرنے کے بعد تین بجے اوکھلا بس اسٹینڈ پر گئے۔ وہ غالباً جامع مسجد کے لیے عازم سفر تھے۔ ایک بس میں سوار ہونا چاہتے تھے۔ بس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اندازے کی غلطی کے سبب گرے اور انتقال کر گئے۔ اسی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ جیب سے شناختی کارڈ برآمد ہوا جس سے نام و دفتر کا پتہ چلا۔ دفتر کے کارکن پہنچے طاہر علی صاحب کو پہچان لیا لیکن وہ رحلت فرما چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جنازہ مرحوم کے وطن ضلع بارہ بنکی بھیج دیا گیا جہاں ان کے پسماندگان (بیوہ، بیٹا اور بیٹیاں) رہتے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں انور جمال قدوائی صاحب شیخ الجامعہ مقرر ہوئے تھے۔ اس وقت جامعہ شدید بحران سے گزر رہی تھی۔ مجیب صاحب کا دور ختم ہو چکا تھا اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے عہدے سے قبل از وقت سبکدوش ہو چکے تھے۔ جامعہ کے تدریسی اور انتظامی امور کے علاوہ آراضیات و املاک کے معاملات بھی زلفِ محبوب کی طرح پریشان اور الجھے ہوئے تھے جس

جناب افضال الرحمٰن، دفتر کنٹرولر آف اکزامینیشنز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

بٹنا آسان کام نہ تھا انور جمال قدوائی صاحب نے اپنے تدبر اور تجربہ کی بناء پر جلد ہی تمام خرابیوں
سمجھ لیا اور نہایت برق رفتاری اور چابک دستی سے انھیں سلجھانا شروع کیا اور بڑی حد تک
م تر معاملات اُن کے قابو میں آگئے۔ جامعہ کی املاک کو قابو میں رکھنا، نا جائز قبضوں اور تسلط
بچائے رکھنا آسان کام نہ تھا۔ اس کام کے لیے دوسری تدابیر کے علاوہ ان کی نظر انتخاب
ہر علی صاحب پر پڑی جو قدوائی صاحب کے وطن کی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔

اہر علی صاحب ۴ رجنوری ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کا قدوائی صاحب کے گھرانے سے
انا تعلق تھا۔ قصباتی زندگی میں ایک دوسرے سے تعلق اچانک اور کم وقتی نہیں ہوتا۔ اس
علق کے تانے بانے کئی نسلوں پرانے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اعتماد، ایمان کے بعد دوسرا
رجہ رکھتا ہے۔ ۲۰ رمئی ۱۹۸۶ء کو طاہر علی صاحب کو قدوائی صاحب جامعہ کی اراضیات کی دیکھ بھال
غرض سے بارہ بنکی سے لائے اور جامعہ کے شعبۂ اراضیات و املاک سے متعلق کیا۔ اسی عرصے میں جامعہ
اراضیات کی باقاعدہ طور سے حد بندی ہوئی اور جامعہ کیمپس متعین کرنے کی غرض سے دیوار
نادی گئی۔ طاہر صاحب جامعہ کی اراضیات کی حفاظت میں تن من دھن سے لگ گئے وہ دن میں
بھی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور رات کو بھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ رات کو غافل سوتے ہوئے چوکیداروں
کے جوتے، لاٹھیاں، ٹارچ اور ٹوپیاں اٹھا لاتے اور دفتر شیخ الجامعہ میں جمع کر دیتے۔ رات کی
تاریکی میں خاموشی سے چوری چھپے ناجائز تعمیرات کی اطلاع اپنے افسران بالا کو کرتے اور خوب
شور مچاتے۔ برسوں تک موصوف نے ایک دن کی چھٹی لی اور عید بقرعید میں بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی
نہیں کی۔ ان کے نزدیک فرائض کی ادائیگی، ایمان داری اور حاکم کے حکم کی تعمیل ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔

انور جمال قدوائی صاحب خود بھی اراضیات کے تحفظ سے خصوصی دلچسپی رکھتے تھے اور رات
املاک پر ناجائز قبضوں کے سلسلے میں چوکنا رہتے تھے۔ دوسری طرف طاہر صاحب جیسے مخلص
بن انھیں میسّر تھے۔ چنانچہ بڑی حد تک وہ تحفظ اراضیات میں کامیاب رہے۔

قدوائی صاحب کے شیخ الجامعہ کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد، ان لوگوں کی، جو
ہر صاحب کی ایمان داری اور بے لاگ تبصروں سے عاجز تھے، بن آئی۔ پہلے تو ان پر حملہ ہوا
س سے وہ بچ گئے اس کے بعد بدلی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر طاہر صاحب نے اپنا تبادلہ

خود ہی دفتر مستجل کے اسٹیبلشمنٹ برانچ میں کرالیا اور وہ بظاہر جامعہ کی آراضیات و املاک کی نگرانی سے سبکدوش ہو گئے لیکن بباطن انھیں سب حال معلوم رہتا تھا اور چپہ چپہ کی خبر رہتی تھی

جس زمانے میں موصوف شعبۂ آراضیات سے متعلق تھے اس وقت مستجل صاحب اور ناظم شعبہ کے حکم سے دیگر پراپرٹی گارڈ کے ہمراہ ایک ناجائز تعمیر کو گرانے کے لیے گئے۔ جب انھوں نے دیوار گرادی تو اس شخص نے (جس نے تعمیر کر رکھی ہے) پولیس کو رپورٹ کردی۔ اور دو پراپرٹی گارڈ کے نام لکھوائے۔ مقدمہ شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ایک پراپرٹی گارڈ مقدمہ لڑتے لڑتے اللہ کو پیارے ہو گئے، اب طاہر صاحب بچے، وہ جامعہ کے اکثر شعبہ جات کی کارکردگی سے ناخوش رہتے تھے، انھوں نے طے کیا کہ مقدمہ اپنے ذاتی خرچ سے لڑائیں گے چنانچہ وکیل کیا اور ہر پیشی کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کے وقت تک وہ اس مقدمہ پر ہزاروں روپیہ خرچ کر چکے تھے۔ اُن کا اندازِ زندگی کچھ اس طرح تھا کہ

سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں

جامعہ کی آراضیات اور ان سے متعلق معاملات کے سلسلے میں بڑے سے بڑے افسر سے ملنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے اور گفتگو کے دوران کبھی ہراساں، یا خائف نہ ہوتے تھے۔ اقبال کے تصورِ خودی کا پرتو ان میں بدرجۂ اتم نظر آتا تھا۔

حق گوئی و بیباکی آئینِ جواں مردی

دفتر مستجل کے اسٹیبلشمنٹ برانچ میں جناب ضمیر حسن صاحب، مددگار مستجل کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور طاہر علی صاحب بحیثیت چپراسی وہاں کام کرتے تھے۔ موصوف جب دیکھتے کہ ضمیر صاحب کام میں منہمک ہیں اور میز پر فائلوں کا انبار ہے تو ان کا کمرہ باہر سے بند کر دیتے اور خود کرسی بچھا کر دروازہ پر بیٹھ جاتے اور کسی ملنے والے کو اندر نہ جانے دیتے۔ اس میں اکثر باہر سے آنے والوں سے جھڑپ بھی ہو جاتی مگر لوگ ان کے خلوص کے پیشِ نظر معاف کر دیتے تھے۔ ضمیر حسن صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد جناب منظور سعید صاحب مرحوم نے اس کام کو انجام دینا شروع کیا۔ انھیں بھی اسی قسم کی دشواریاں پیش آئیں کہ لوگ آفس میں آکر بیٹھ جاتے اور دفتر کے اوقات کا زیادہ وقت گفتگو میں گزر جاتا۔ منظور سعید صاحب کو رات گئے تک دفتری امور

مٹانے پڑتے۔ یہاں تک کہ موصوف پیٹ کے السر میں مبتلا ہوئے۔ کام کا بوجھ اور انہماک بڑھتا گیا۔ طاہر صاحب متعین وقت پر دوا اور گلاس میں پانی لیے منظور صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے۔ بہت دیر کے بعد منظور سعید صاحب نظر اٹھا کر دیکھتے اور بالاکراہ دوا پی لیتے۔ بالآخر کچھ عرصے کے بعد السر نے کینسر کی شکل اختیار کرلی اور منظور سعید صاحب راہی جنت ہوئے۔

دفتر مسجل کے اراکین اکثر ان سے چائے اور دوسرے لوازمات دفتری اوقات میں منگاتے تھے وہ بخوشی لادیتے۔ لیکن فرمائش کے طور پر لائی ہوئی چیزوں میں شرکت سے گریز کرتے نہ اس کی توقع رکھتے کہ منگانے والا انھیں بھی شریک کرلے گا۔ اکثر دس دس بارہ بارہ پیالیاں اپنے ہاتھ سے چائے کی بنا کر پلاتے اور خود کبھی اس کا اظہار بھی نہ کرتے کہ وہ محروم رہ گئے یا انھیں شریک نہ کیا گیا۔

جامعہ سے انھیں دلی لگاؤ تھا، وہ ادارے کے بہی خواہ تھے۔ ادارے سے متعلق جب کبھی بھی سنتے کہ فلاں نے زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا فلاں جامعہ کا مکان خالی نہیں کر رہے یا کسی نے ادارے کی کوئی چیز چرالی تڑپ جاتے۔ صحیح صورت حال جان لینے کے بعد بلند آواز سے ہر جگہ اور ہر ایک کے سامنے اپنی ناراضگی وناپسندیدگی کا اظہار کرتے اور یہی ان کے پختہ ایمان کی علامت تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ادارہ کو بدنامی سے بچانا بھی چاہتے تھے۔ اکثر لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ادارے کے انتظامیہ کی خرابیوں کو مضامین کے ذریعے اخبارات تک پہنچا دیں۔ اس سلسلے میں ان کے پاس مختلف اخباروں کے نامہ نگار پہنچے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ ایسا کرنے سے احتراز کیا، محض اس وجہ سے کہ ایسا کرنے سے ہوا خیزی ہوگی اور ادارہ بدنام ہوگا۔

طاہر صاحب نے اپنے بچپن میں جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں ایمان کی پختگی، وفائی وسچائی آقا کے حکم کی تعمیل اولین درجہ رکھتے تھے۔ طاہر صاحب تمام عمر اس پر کاربند رہے، وہ ان اصولوں کو زندگی کی اساس بنائے ہوئے تھے جن کا آج کے دور میں کوئی تصور نہیں، اسی لیے ایسے فکر وخیال کے لوگ موجودہ معاشرہ میں کوئی مقام حاصل نہیں کر پاتے ہیں کی موت بالکل اسی طرح ہوئی کہ

باقی صفحہ ۱۷ پر

سہیل احمد فاروقی

احوال وکوائف

جامعہ میں ایرانی پارلیمانی وفد کی آمد

ایرانی پارلیمنٹ کی عدلیہ کمیشن کے سربراہ حضرت آیۃ اللہ عمید زنجانی کی قیادت میں ہندوستان آئے ہوئے ایرانی پارلیمانی وفد کے اعزاز میں ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو جامعہ کی جانب سے انصاری آڈیٹوریم میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب حسنین رضوی صاحب نے فرمائی۔ ایرانی سفیر عزت مآب ابراہیم رحیم پور نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا جس کے بعد ایک طالب علم نے نعت رسولؐ مقبول پیش کی۔ پروفیسر ماجد علی خاں نے مہمانوں کو جامعہ کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ توسیع و ترقی سے متعارف کرایا۔

پارلیمانی وفد کے قائد حضرت آیت اللہ عمید زنجانی نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ ایرانی وفد کا دورۂ ہندوستان ہند ایران دوستی کی ایک کڑی ہے اور بتایا کہ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد حضرت امام خمینی نے عالم اسلام کو جو پیغام دیا اس میں ہر شعبہ میں علمی کام کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے کیوں کہ ہمارے لیے دین اور علم لازم و ملزوم ہیں۔ ایران میں قومی تعمیر و ترقی کی رفتار کے حوالے سے موصوف نے فرمایا کہ انقلاب اسلامی، تہذیبی، سیاسی اقتصادی و ثقافتی تمام پہلوؤں پر محیط ہے جس کی بدولت آج ایران کے عوام میں مغربی طاقتوں کے مقابلے میں ایک اسلامی معاشرہ قائم کرنے کا جذبہ بیدار ہو رہا ہے اور اس سمت میں روز افزوں کامیابی حاصل ہو رہی ہے اور اس ضمن میں ایک خوش آئند امر یہ ہے کہ ملک سے باہر مقیم ایرانی دانشور اب اپنے وطن کا رخ کر رہے ہیں اور ملک کی خدمت کر کے خود کو زیادہ خوش اور مطمئن محسوس کر رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ایران کے تمام ترجبٹ میں علمی شعبوں میں تحقیق اور ثقافتی و اصلاحی امور کے لیے کثیر رقوم مخصوص

لئے ہیں اور مستقبل میں ہمارا منصوبہ ایک ایسا مکمل شہر بسانے کا ہے جو دانشوروں، محققوں اور عالموں کا گہوارہ
جس کا مقصد تیسری دنیا کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے اور جس میں ہندوستانی حکومت ہمارے ساتھ
ی و فنی سطح پر بڑی حد تک تعاون کر سکتی ہے۔ خصوصاً انسانی حقوق بشمول حقوق نسواں کے میدان
ہماری حالیہ تحقیق کے مثبت نتائج سامنے آئے ہیں جو بڑی طاقتیں اسلامی جمہوریہ ایران کے پروپیگنڈہ
اپنا شعار بنائے ہوئے تھیں انھوں نے جب ایرانی حکومت کی دعوت پر وہاں کی علمی، ثقافتی اور فنی
وششوں کا مشاہدہ کیا تو ان کے رویّہ میں خاصی تبدیلی آئی۔

تقریر کے اختتام پر موصوف نے یہ امید ظاہر کی کہ تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً ہندوستان اور ایران
درمیان علمی و فنی تعاون کا دائرہ وسیع ہوگا

شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب حسین رضوی صاحب نے حضرت آیت اللہ عمید زنجانی اور ارکان وفد کی جامعہ
آمد پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلامی جمہوریہ ایران اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک قدر
شترک یہ ہے کہ دونوں ہی سامراج مخالف انقلاب کے زائیدہ ہیں اس لیے اہل جامعہ نہ صرف تاریخی اعتبار
بلکہ اس انقلابی رشتہ کی بنا پر اہل ایران سے خاص قربت محسوس کرتے ہیں۔ رضوی صاحب نے فرمایا کہ
ری خواہش رہی ہے کہ ثقافتی اور علمی سطح پر ہندوستان اور ایران کے درمیان تعاون کو فروغ
صل ہو اور دونوں ممالک کی دانش گاہوں کے علماء اور محققین کے درمیان تبادلۂ خیال کے مواقع
م ہوں۔ جناب شیخ الجامعہ نے وفد کو اس جانب بھی متوجہ کیا کہ جامعہ میں ہر سال سیکڑوں ایرانی طلبا
ہوتے ہیں اور ان کی خاصی تعداد فارغ التحصیل ہوتی ہے لیکن جامعہ کی تعلیمی اسناد ہنوز
ن میں منظور شدہ نہیں ہیں جس سے خود ان طلباء کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حضرت آیت اللہ
زنجانی نے حکومتی سطح پر اس مسئلہ کو حل کرنے کا وعدہ فرمایا۔

جامعہ کی جانب سے ڈاکٹر قمر غفار صاحبہ (ریڈر شعبۂ فارسی) نے حضرت آیت اللہ عمید زنجانی، اراکین
سفیر ایران عزت مآب ابراہیم رحیم پور اور ان کے رفقا کار اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

دور یفریشر کورس — اساتذۂ جامعہ کی شرکت

اکیڈمک اسٹاف کالج کشمیر یونیورسٹی سری نگر کا چار
ہ کا ریفریشر کورس ۱۱ر نومبر سے ۷ر دسمبر ۱۹۹۱ء تک جموں میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر شہناز انجم

پر شعبۂ اردو نے شرکت کی۔ اس تربیتی کورس نے شرکاء کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے دہلی اور
رون دہلی کی یونیورسٹیوں سے تشریف لانے والے اساتذہ کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے
و فیسر شمیم حنفی اور پروفیسر حنیف کیفی (صدر شعبہ) نے بالترتیب جدید افسانہ و ڈراما اور نظم معری
پر لکچر دیے۔

آسٹریائی اسکالر کا لکچر

آسٹریائی تاریخ داں محترمہ ایباکوخ جو حال ہی میں ہندوستان کے دورہ پر تھیں ۲۸ نومبر کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور شعبۂ تاریخ کی دعوت پر جامعہ تشریف لائیں۔ ان کا خصوصی میدان فن تعمیر اور آثار قدیمہ کا مطالعہ ہے
اس کمیونیکیشن ریسرچ سنٹر کے اسٹوڈیو میں انھوں نے قطب مینار کے نمونہ پر ہندوستان میں
پائے گئے میناروں اور عمارتوں پر ایک لکچر دیا جس میں شعبۂ تاریخ کے اساتذہ و طلبا نے شرکت کی۔

پروفیسر ماجد حسین انڈین نیشنل کارٹوگرافک ایسوسی ایشن کے صدر منتخب

نقشہ نویسوں، سروے کاروں اور جغرافیہ دانوں کی ملک گیر تنظیم انڈین نیشنل کارٹوگرافک
ایسوسی ایشن کی حیدرآباد میں منعقد گیارہویں پانچ روزہ بین الاقوامی کانفرنس ۸ دسمبر کو اختتام پذیر
ہوئی۔ پروفیسر ماجد حسین نے جامعہ کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کانفرنس میں اس کی نیشنل آرگنائزنگ
کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے بھی شرکت کی۔ کانفرنس میں پروفیسر ماجد صاحب کو سال ۹۲-۱۹۹۱ کے لیے
اس ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا اور یہ بھی طے پایا کہ ایسوسی ایشن کی بارھویں عالمی کانفرنس
دسمبر ۱۹۹۲ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوگی۔ پروفیسر موصوف کے خصوصی تحقیق و مطالعہ کا
میدان نباتاتی و حیوانیاتی معیشت ہے جس کی مناسبت سے مجوزہ کانفرنس کا مرکزی موضوع ماحولیات
ہوگا جس میں کارٹوگرافی کی مدد سے آلودگی پر قابو پانے کے ذرائع سے بحث کی جائے گی۔

ہنگیرین اسکالر کی آمد

پچھلے دنوں انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی، نئی دہلی کے باہمی تبادلہ جاتی پروگرام کے تحت ہنگیرین اکیڈمی آف سائنس، بداپسٹ کے انسٹی ٹیوٹ آف ورلڈ اکنامکس میں چیف سائنٹفک
ریسرچر کے عہدہ پر فائز ڈاکٹر ماجدہ نسرین کٹونا جامعہ تشریف لائیں۔ انھوں نے شعبہ ہائے تاریخ و ثقافت، عربی، فارسی،
اسلامک اسٹڈیز اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اساتذہ و سربراہان سے تبادلہ خیال کیا۔

ماہنامہ
جامعہ

قیمت فی شمارہ ۳ روپے | الاؤنس قیمت ۲ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ فروری ۱۹۹۲ء | شمارہ ۲۵

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲

شذرات

سید جمال الدین

رتھ یاترا کے بعد ایکتا یاترا بھی آخر جاں بلب حالت میں اپنی منزلِ مقصود کو پہنچی۔ ہر چند کہ یہ یاترا اتحاد و یکجہتی کے نام پر کی گئی تھی مختلف سمتوں سے اس کے بعض اہم پہلوؤں پر اظہارِ خیال اور اختلاف رائے نے ثابت کر دیا کہ ملک کی سالمیت کی طرف کوئی خوش آئند قدم نہیں ہے۔ اس سے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس یاترا کے علم برداروں کو اپنے منشور کے تحت خود کو متحد کرنا ہوگا اور اپنے ضمیر سے سوال کرنا ہوگا کہ کیا وہ بلا تفریق مذہب و ملت عوام و خواص کے دلوں میں نہ صرف اعتماد پیدا کر سکے ہیں بلکہ اس اعتماد کو مستحکم کرنے میں کامیاب رہے ہیں!۔

سیاست جس افراتفری کا شکار ہے وہ روز روشن کی طرح واضح ہے۔ سیاست داں جو کچھ کرتے ہیں اس کا دائرۂ اثر بہت محدود ہوتا ہے۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت جیسے سنگین مسائل سے دوچار ہوتے ہوئے اس طرح کی لاحاصل یاترائیں منظم کرنا اسی محدود فکر کی علامت ہے۔ ایسے نازک لمحے میں ہماری پُر امید نگاہیں ہندوستان کے ادیبوں اور دانشوروں کی جانب اُٹھتی ہیں کہ وہ ایک مشترک ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے کے لیے صف آرا ہوں۔ اُن سے ہماری یہ امید بے سبب نہیں ہے کیونکہ ادیب و دانشور مذہب و عقیدہ، نسل و ذات، اور زبان و لہجہ کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

---

۲۵ جنوری ۱۹۹۱ء کو روزنامہ "جنگ" کراچی کے بانی و مدیر جناب میر خلیل الرحمٰن کا عارضۂ قلب کے سبب لندن میں انتقال ہوگیا۔ ۲۷ جنوری کو کراچی میں تدفین عمل میں آئی۔ "جنگ" کے علاوہ وہ دیگر جرائد کے بھی مدیر تھے جن میں اخبارِ جہاں اور انگریزی دی نیوز اور میگ قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے ایک عمر صحافت کی خدمت میں گزاری۔ ان کی ناگہانی موت نے یقیناً ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جو مشکل سے پُر ہو سکے گا۔

عنوان چشتی

فنِ اصلاحِ سخن: عملی تنقید کا قدیم دبستاں

"اصلاحِ سخن" کا عمل بنیادی طور پر تنقید بلکہ عملی تنقید کا عمل ہے۔ تخلیقی عمل باطن سے خارج کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی حسی وادراکی عناصر، جذباتی اور تخیلی فضا سے گزر کر تکنیکی یا لسانی پیکر اختیار کرتے ہیں۔ تنقید کا عمل اس کے برعکس یعنی خارج سے باطن یا باہر سے بطون کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی نقاد کسی تخلیق کو ایک نامیاتی کل Organic Whole کی حیثیت سے قبول کر کے خارج پرت سے اس کے تجزیہ کا آغاز کرتا ہے۔ فن پارے کی ہیئت، تکنیک، اسلوب اور زبان کا تجزیہ کرتا ہے خارجی ہئیت کے عناصر اور ان کے فنی اور جمالیاتی رشتوں پر غور کرتا ہے۔ وہ الفاظ سے معانی، معانی کے معانی، تلازموں اور محرکات تک رسائی حاصل کرتا ہے اور فن پارے کی روح میں اتر کر تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت، قدر یا کیفیت تک پہنچتا ہے، اور تخلیق کی تحلیل وتشریح کرتا ہے۔ نقاد کو تنقید کے عمل میں ہر سطح پر کھرے کھوٹے کی پرکھ کرنی پڑتی ہے۔

تنقید کے اصول ادب اور تخلیق سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ اور پھر ادب وفن کی تفہیم، تجزیے اور قدر شناسی کے لیے ان ہی پر آزمائے جاتے ہیں۔ اس لیے کسی نے سچ کہا ہے کہ ادب کے لیے تنقید سانس کی طرح ناگزیر ہے۔ زندگی کی طرح ادب میں، تنقید کی ناگزیریت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اسی کے ساتھ تنقید تلوار کی دھار پہ چلنے کا فن ہے اور سچ بولنے اور حق کر دکھانے کا ہنر ہے۔ تنقید کے ایک طرف تنقیص اور دوسری طرف تحسین ہے اور تنقید ان کے درمیان، دونوں

پروفیسر عنوان چشتی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

میں شریک مگر دونوں سے الگ ہے۔ یہاں تعصب اور تاثر کا گزر نہیں۔ اس راہ میں توازن اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ تنقید کے سچ کی گرمی سے کبھی کبھی اعتدال اور احتیاط کا آبگینہ پگھلنے لگتا ہے اس کو بھی نگاہ میں رکھنا پڑتا ہے۔ تنقید نئے سوالوں کو جنم دیتی ہے جو زخم کھاتی ہے مگر ادب اور تخلیق کو نئی توانائی اور نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ اصلاح سخن بھی عملی تنقید کا ایک رخ ہے۔ اس لیے اس کو بھی اسی پیچیدہ اور سنگلاخ عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تنقید اور اصلاح سخن سچائیوں کا زہر پی کر ادب اور زندگی کو نئی معنویت عطا کرتی ہے۔ نئی معنویت کا لطف اٹھانے کے لیے فنکار اور قاری دونوں کو اپنے ذہن اور ضمیر کے دریچے تازہ ہوا کے لیے وا رکھنے پڑتے ہیں۔ اور انا کے شور میں سچائی کی روح پرور سرگوشیوں کو سننے کے لیے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اصلاح سخن، تنقید کے میدان میں تمنا کا دوسرا قدم ہے۔ تنقید تجزیہ کرتی ہے، مگر اصلاحِ سخن عملِ جراحی سے کام لیتی ہے۔ فاسد مادے کو نکالتی اور سرجری کرتی ہے۔ یہ بدن ہی کو نہیں، روح کو بھی سنوارتی ہے۔ اصلاحِ سخن عیوب، اسقام اور نقائص کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کو قلم زد کرتی ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں نئی جمال آفریں پیوندکاری کرتی ہے۔

اصلاحِ سخن پر جا بجا اشارے ملتے ہیں، وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ اصلاحِ سخن کا دائرہ شعر کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے۔ مُصلحِ شعر معائب و محاسن شعر کا جائزہ لیتا ہے۔ محاسن کو باقی رکھ کر، مزید محاسن پیدا کرنے کے لیے عیوب و اسقام پر نشتر زنی کرتا ہے اور انھیں فاسد مادے کی طرح نکال باہر کرتا ہے۔ ابو الحسنی کا خیال ہے کہ مصلحِ شعر "زبان" کے نکات اور "فن کے رموز" کا معلم ہے[۱۱]۔ مالک رام کے خیال میں مصلحِ شعر کا کام "معنوی اور لسانی اعتبار سے شعر کو درست کرنا ہے[۱۲]۔" جوش ملسیانی کے الفاظ میں مصلحِ شعر، "شعر کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن پر گہری نظر رکھتا ہے اور دونوں کے عیوب کو دور کرتا ہے۔ اور دونوں کے اوصاف کو باقی رکھتا ہے[۱۳]۔" سلطان حیدر جوش کی رائے ہے کہ اصلاحِ سخن کا "مقصود محض عیوب و نقائص رفع کرنا، کمی کو پورا کرنا یا مائند رنگ کو اجالنا ہے۔ عیوب و نقائص خواہ تخیّل و مطالعۂ فطرت کے متعلق ہوں یا زبان کے یقیناً قابلِ اصلاح ہیں[۱۴]۔" خلیل قدوائی کا خیال ہے کہ "زبان اور محاورات نیز شعر کے ظاہری محاسن ایسی چیزیں ہیں، جو شعر میں نہ صرف آراستگی، بے ساختگی اور ایک خاص بیدا شان کرنے میں معاون ہوتی ہیں بلکہ شعر کی معنوی حیثیت کو بھی بلند کرتی ہیں[۱۵]۔" سیماب اکبرآبادی کا خیال ہے کہ اصلاح سے لسانی، فنی اور علمی معلومات

ں اضافہ ہوتا ہے۔[۵۵] اصلاح سخن پر یہ تمام انشا سے عمومیت لیے ہوئے ہیں، اور تفصیل طلب ہیں۔ اس
سن میں خود غالب نے بھی مجمل بات کہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "کلام کا حسن و قبح میری نظر میں رہتا ہے
در کلام میں اغلاط و اسقام کو دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں۔"[۵۶]

یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں، اصلاح سخن کی طرف پیش رفت کی نوید تو سناتی ہیں مگر اصلاح سخن کی جامع تعریف نہیں کرتیں۔ تنقید کی طرح اصلاح سخن کے اصول بھی شاعری سے اخذ کیے جاتے ہیں اس لیے بقول عزیز لکھنوی

"شاعری صرف موزونیت طبع کا نام نہیں۔ کم از کم علوم رسمیہ اور مصائب و محاسن شعر پر عبور ہونا شاعر کا پہلا فرض ہے۔ علمائے معانی و بیان کے نزدیک معنی روح ہے اور الفاظ جسد۔ محاسن لفظی زیور۔ شعر پر تینوں حیثیتوں سے نظر کرنا چاہیے۔ اگر معنی نہیں تو شعر بے روح۔ اگر حسن بندش نہیں تو حسن ظاہری سے معرا۔"[۵۷]

یہ تعریف اگرچہ عربی و فارسی کے قدیم تصور شعریات پر مبنی ہے۔ جس کی بنیاد لفظ و معانی کی دُوئی پر ہے اور جس کو ہیئت کے نامیاتی تصور نے کلیتًا مسترد کر تا ہے۔ میکس مولر کا خیال ہے کہ ہر خیال اپنے ساتھ الفاظ کا جامہ لاتا ہے اس لیے لفظ خیال ہے اور خیال لفظ۔ پھر بھی عزیز لکھنوی نے یہاں شاعری کے داخلی، خارجی پہلوؤں نیز معائب و محاسن سخن کی طرف اشارہ کر کے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ اسکاٹ جیمس نے شاعری کے چار عناصر (ادراکی، جذباتی، تخئیلی اور تکنیکی عناصر) کا ذکر کیا ہے، پہلے تین عناصر یعنی ادراکی، جذباتی اور تخئیلی شاعری کے داخلی پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ اس میں معنویت کی ہر تہہ اور فکر و خیال کی ہر جہت اور زندگی کی ہر قدر شامل ہے۔ خارجی پہلو میں ذریعہ اظہار کی تینوں پرتیں (یعنی لسانی، فنی اور عروضی) شامل ہیں۔ لسانی دائرے میں وہ ضابطے شامل ہیں جو زبان کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ اور شاعری میں ہیئت کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس اصول کو اصلاح سخن کی اصطلاح میں "عدول از جادۂ صواب" کہا جاتا ہے۔ اگر شاعر زبان کے استعمال میں بے راہ رو ہوتا ہے اور حرکت، سکون، تخفیف، تطویل اور دیگر صرف و نحو کے اصولوں سے انحراف کرتا ہے تو "عدول از جادۂ صواب" کا مرتکب ہوتا ہے۔ شاعر کو زبان کی سطح پر قواعد صرف و نحو کے اصولوں کا احترام ہے جن کو وصل، قطع، تخفیف، تشدید، قصر، مد، اسکان، تحریک، منع صرف اور منع نحو وغیرہ

یا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہ اصول بڑے شاعروں کے تخلیقی طوفان کی زد پر آجاتے ہیں۔ لیکن یہ استثنائی صورت ہے، کلیہ نہیں۔ فنی دائرے میں وہ طریقے شامل ہیں، جو شعر کی ہیئت کو جمال آفریں بناتے ہیں۔ اس میں فصاحت و بلاغت کے عنصر کو بڑھاتے ہیں۔ فنی دائرے میں ایسے عیوب سے اجتناب کرنا ضروری ہے جو شعر کو معیوب اور داغدار بناتے ہیں۔ ان میں تعقیدؔ ضعفِ تالیف، غرابت، اخلال، تکلف، حشو، تطویل، اتّصال، انتقال، اور تنافر کے اسقام شامل ہیں۔ اصلاحِ سخن میں مصلحِ شعر ان عیوب کو دور کرکے شعر کو فصاحت و بلاغت کی منزل تک لے جاتا ہے۔ عروضی دائرے میں عروض کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ اور ان کمزوریوں کو دور کیا جاتا ہے جو شاعری میں عروضی پہلو کو کمزور کرتی ہیں اور آہنگ کے تاثر پر منفی انداز سے اثر انداز ہوتی ہیں۔ عروضی دائرے میں تین عیوب بطور خاص داخل ہیں (۱) ناموزونیت یعنی اختلاف بحور سقوط حروفِ صحیح اور خارج از بحر صورتیں۔ (۲) سقوط حروف علت (۳) شکست ناروا۔ اصلاحِ سخن میں مصلحِ شعر ان تینوں قسموں کے عیوب نکال کر شعر کو عروضی چابک دستی کا مظہر بناتا ہے[9]
یہاں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اصلاحِ سخن میں بیک وقت منفی اور مثبت دو لہریں موجزن رہتی ہیں۔ منفی لہر عیوب و اسقام کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کو شعر سے خارج کرتی ہے اور مثبت لہر محاسن کو برقرار رکھتی بلکہ ان میں اضافہ کرتی ہے۔ شعریت، تخلیقی حسن اور تاثر کو بڑھاتی ہے یعنی شعر کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کو حسین سے حسین تر بناتی ہے اس لیے اصلاحِ سخن تنقید ہوتے ہوئے بھی تنقید کی اگلی منزل ہے۔ یعنی یہ ادب و تخلیق کے میدان میں تمنّا کا دوسرا قدم ہے اس لیے ہر وہ شعری ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ اصولاً اصلاحِ سخن کے زمرے میں شامل ہے، جو شعر کو بدصورتی سے بچاتا اور اس کو بہتر بناتا ہے۔ یہ عمل شاعری کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر محیط ہے۔ لسانی، فنی، عروضی اور معنوی نقطۂ نظر سے شاعری کے اسقام اور معائب کو دور کرکے اس کے اوصاف و محاسن میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کی تین جہات ہیں جن کو خلّاقانہ استادانہ اور معاونانہ کہا جا سکتا ہے۔ جب شاعر، اس کو بہتر بنانے کے ارادہ سے اپنے کلام پر نظرثانی کرتا ہے، ترمیم و تنسیخ کرتا ہے یا حذف و اضافہ کرتا ہے، تو اس کو خلّاقانہ اصلاح کہا جا سکتا ہے۔ جب شاعر، اپنے شاگرد کی خواہش اور رغبت سے اس کے کلام میں تغیر و تبدیل اور حک و اضافہ کرتا ہے تو اس کو "استادانہ اصلاح

کہا جا سکتا ہے۔ جب ایک شاعر کسی دوسرے شاعر کو نیچا دکھانے کی غرض سے، اس کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی شاعری میں لفظی ردّ و بدل کرتا یا قطع و برید سے کام لیتا ہے تو ایسی اصلاح کو "معاندانہ اصلاح" کہا جا سکتا ہے۔

غالب اپنے کلام کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اس پر مسلسل نظرِ ثانی کرتے رہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے:

> "نسخۂ حمیدیہ نے پہلی بار ہمیں بتایا کہ مرزا غالب نے اپنے قدیم اشعار میں سے نسبتاً آسان اور اچھے اشعار کا انتخاب کرنے سے پہلے ان میں اصلاح بھی کی تھی اور موجودہ دیوان کے وہ شعر، جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی موجود ہیں، خاصی قطع برید کے بعد منظرِ عام پر آئے ہیں"[۱۰]

غالب نے اپنے ابتدائی کلام پر نظرِ ثانی کے بعد نسخۂ حمیدیہ مرتب کیا۔ نسخۂ حمیدیہ پر نظرِ ثانی کے بعد متداول دیوان مرتب کیا۔ پھر اس پر بھی نظرِ ثانی کی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ متداول دیوان کی اشاعت کے بعد جتنی مرتبہ قلمی دیوان مرتب کرنے یا دیوان کا نیا اڈیشن شائع کرنے کا موقع آیا۔ ہر مرتبہ مرزا غالب نے اپنے کلام پر نظرِ ثانی کی، اس میں ترمیم و تنسیخ کی۔ غالب کی زندگی میں ان کے دیوان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔ اصلاح کا عمل ان کے تقابلی مطالعہ سے پوری طرح معلوم کیا جا سکتا ہے[۱۱]

ذیل میں مرزا غالب کی خلّاقانہ اور استادانہ اصلاحوں کا مختصر سا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

خلّاقانہ اصلاح:۔

"نسخۂ حمیدیہ" میں مرزا غالب کا ایک مقطع ہے۔

مر گیا صدمۂ آواز سے قم کی، غالبؔ   ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

لیکن "گلِ رعنا" میں اصلاح کے بعد اس طرح نظر آتا ہے۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ   ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا[۱۲]

غالب کے زیرِ نظر شعر (نسخۂ حمیدیہ) میں مندرجہ ذیل عیوب ہیں (۱) پہلا مصرع خلافِ عقل و علم ہے۔ آوازِ قم سے مردے زندہ ہوتے ہیں۔ اس لیے قم کی آواز سے مرنے کا تصور درست نہیں۔ (۲) مصرع سراسر آورد ہے۔ غالبؔ کا اسلوبِ شعر یہی ہے کہ ان کی غزلوں کے اکثر اشعار تا بحریر دو رنگ

لی طرح ہیں۔ یعنی ان میں وجدان و شعور اور آمد و آورد ایک دوسرے سے گتھم گتھا نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کیفیت ہے۔ مگر پہلا مصرع آورد ہی آورد ہے۔ اس لیے سراسر تکلف ہے۔ جو ذوق و وجدان پر گراں گزرتا ہے۔ (۳) اگرچہ مرزا غالب کے دونوں مصرعوں (نسخۂ حمیدیہ اور گل رعنا) میں تعقید ہے مگر الفاظ کی ترتیب اور نشست کی وجہ سے "مصرعِ نسخۂ حمیدیہ" میں تعقید کا رنگ زیادہ گہرا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ کے مقابلے میں گل رعنا کا اصلاح شدہ مصرع زیادہ صاف، سلیس اور شگفتہ ہے ــــ اصلاح سے یہ تینوں عیب دور ہو گئے۔ پہلا عیب داخلی پہلو سے متعلق ہے اور دوسرے دونوں عیوب خارجی پہلو سے متعلق ہیں۔ اصلاح کے بعد شعر خلاف عقل و علم باتوں سے نہ صرف یہ کہ پاک ہو گیا بلکہ شعر سے نقصِ روانی، تعقید اور بندش کی خرابی بھی دور ہو گئی۔ اصلاح سے شعر کا تخلیقی اور جمالیاتی رنگ اور زیادہ نکھر گیا ہے اور مفہوم بھی واضح ہو گیا ہے۔

تعقید کے لغوی معنی گانٹھ باندھنے یا گرہ پڑ جانے کے ہیں۔ اصطلاحِ شاعری میں تعقید ایک عیب ہے جس میں الفاظ کا در و بست بگڑ جاتا ہے اور ترتیب الفاظ بگڑنے سے عبارت یا مصرعے میں گتھی سی پڑ جاتی ہے۔ تعقید شاعر کے عجز علم و بیان کی مظہر ہوتی ہے اور اس کی فنی بصیرت نیز تخلیقی قوت کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ تعقید مقصد کے نقطۂ نظر سے دو طرح کی ہوتی ہے۔ اگر تعقید اظہار خیال میں مزاحم نہیں ہوتی اور کلام کا حسن بھی بڑھاتی ہے تو وہ تعقیدِ حسنہ یا مستحسن تعقید ہے۔ اگر الفاظ کا تغیّر و تبدّل، شعر کو مہمل اور کلام کو بدنما بناتا ہے تو وہ بدترین تعقید ہے۔ ایسی تعقید کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) تعقید لفظی، جو عام طور پر نحوی اصولوں سے انحراف کرنے، عجز علم اور عجز بیان سے پیدا ہوتی ہے (۲) تعقید معنوی، جو عام طور پر حسن بیان سے صرف نظر کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ تعقید لفظی فعل کے دو ٹکڑے ہو کر ایک دوسرے سے دور جا پڑنے یا متصل الفاظ کے دور ہو جانے سے پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے شاعر کا مفہوم "فی بطن شاعر" بھی ہوتا ہے اور شعر کا حسن ظاہر د خارجی ہئیت بھی متاثر ہوتا ہے۔ غالب بھی تعقید کو عیب خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک خط بنام عبدالجلیل جنوں میں لکھا "عربی میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے" (۱۳) لیکن غالب نے جواز کا حوالہ فراہم نہیں کیا۔ نسخۂ حمیدیہ میں غالب کا جو شعر ہے، اس پر تعقید لفظی کا گہرا سایہ ہے جس کی وجہ سے مصرع بدہئیت معلوم ہوتا ہے اور مفہوم بھی الجھا ہوا سا

لگتا ہے۔ اصلاح کے بعد نہ صرف یہ کہ تعقید دور ہوگئی بلکہ شعر کی خارجی اور داخلی ہئیت کا حسن دوبالا ہوگیا اور شعر زیادہ جمال آفریں، اثر انگیز اور ترسیلی قوت کا مظہر ہوگیا۔ یہ ترمیم غالب کے اعجازِ اصلاح کا آئینہ ہے۔

اُستادانہ اصلاح

صاحب زادہ سید محمد عباس علی خاں بیتاب رام پوری کا شعر ہے ؎

دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے — سب پکار اُٹھے کہ لو مرشد کامل آئے[۱۴]

مرزا غالب کی اصلاح ہے۔

ہم جو کل دیکھنے عشاق کی محفل آئے — سب پکارا ٹھے کہ لو مرشد کامل آئے

حاشیے میں لکھا کہ "جو ہم عشاق" میں "عین" تقطیع سے گر جاتا ہے۔

بیتاب رامپوری کے شعر میں دو عیب تھے۔ ایک سقوطِ حرف (یعنی عین کا سقوط) جس کی وجہ سے مصرع ناموزوں تھا۔ دوسرے تعقید۔ غالب کے کلام میں سقوط حروفِ علّت (عربی و فارسی) کی مثالیں تو ملتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حروف علت کے سقوط کی طرح عربی و فارسی الفاظ کے حروف علت کے سقوط کو روا سمجھتے تھے لیکن حروف صحیح کے سقوط کی مثال نہیں ملتی۔ بیتاب کے شعر میں انھوں نے "عین" کے سقوط کو گوارا نہیں کیا۔ اور اصلاح سے اس عیب کو دور کیا۔ بیتاب کے مصرعے میں فعل "دیکھنے آئے" دو ٹکڑے ہوگیا اور دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے دور ہوگئے۔ دونوں ٹکڑوں کے درمیان ایک فقرہ "جو ہم عشاق کی محفل" موجود ہے جس کی بدولت مصرع "تعقید لفظی" کا اشتہار نظر آتا ہے۔ ان دونوں عیوب کے علاوہ مصرع بیتاب میں لفظ "کو" بھی "حشو" ہے۔ اصلاح سے یہ تینوں عیب دور ہوگئے۔ اصلاح شدہ مصرع میں صحتِ بیان اور حسن بیان کے عنصر میں اضافہ ہوا ہے۔ بیتاب رامپوری کا شعر ہے ؎

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد لیکن — ذرا اور کی بھی سُنا چاہیے

مرزا غالب کی اصلاح ہے۔

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد پر — ذرا اور کی بھی سُنا چاہیے

مرزا غالب نے اصلاح میں "لیکن" کی جگہ "پر" بنایا ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے تو یہ لفظ "لیکن" کے لگ بھگ ہم معنی ہے، لیکن وزن کے نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔ بیتاب رام پوری کی زیر نظر غزل بحر متقارب مثمن میں ہے۔ لیکن یہ بحر سالم نہیں ہے۔ اس میں صرف دو اوزان کا اجتماع جائز ہے۔

(۱) بحرِ متقارب مثمن محذوف الآخر جس کا وزن ہے۔ فعولن فعولن فعولن فعَل
(۲) بحرِ متقارب مثمن مقصور الآخر جس کا وزن ہے۔ فعولن فعولن فعولن فعول

یہ دونوں اوزان ایک غزل یا ایک نظم میں آ سکتے ہیں۔ اِن دونوں کا اجتماع ازروئے اصول درست ہے۔ لیکن بیتاب رامپوری کا مصرعِ اولیٰ بحرِ متقارب مثمن سالم میں تھا۔ جس کا وزن ہے فعولن فعولن فعولن فعولن۔ یہ وزن بحرِ متقارب کے محذوف الآخر اور مقصور الآخر کے ساتھ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے غالب نے مصرع میں معمولی سی تبدیلی کرکے عروضی عیب دور کر دیا ہے۔ آج کل ثقہ اساتذہ "لیکن" کے محل پر "پہ" کا استعمال متروک کر چکے ہیں۔ لیکن غالب نے اپنی شاعری میں لیکن کی جگہ "پر" "پہ" دونوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے "پر" ہمیں معلوم نہیں

یا

غم اگرچہ جاں گسل ہے "پہ" کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

دیوان غالب (مرتبہ مالک رام) کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے کل آٹھ بحروں، ۱۹ اوزان میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے بحرِ رمل میں ۵۴۴، بحرِ ہزج میں ۲۸۹، بحرِ مجتث میں ۱۴، بحرِ خفیف میں ۴۸، بحرِ رجز میں ۱۹، بحرِ متقارب میں ۱۲، اور بحرِ منسرح میں ۷ اشعار کہے ہیں۔ غالب کی زیادہ تر غزلیں رمل، ہزج، مجتث اور بحرِ خفیف چار بحروں میں ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ مرزا غالب نے چند رائج اور چلتے ہوئے اوزان کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور عروضی تجربوں یا امکانات کی طرف توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ مرزا غالب کی شاعری میں شکستِ ناروا، عربی و فارسی حروفِ علّت کا سقوط اور غلط زحافات کا استعمال بھی نظر آتا ہے[15]۔ مرزا غالب نے رباعی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی محلِ نظر ہے۔ غالب کے ایک خط میں یہ عبارت موجود ہے:

"رباعی کے باب میں بیان مختصر یہ ہے کہ اس کا ایک وزن متعین ہے۔ عرب میں دستور نہ تھا سوائے عجم کے۔ یہ بحر ہزج سے نکالی ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن۔ ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور۔ اِس وزن پر "فعلن" بڑھا دیا ہے۔ مفعول مفاعلن فعولن فعلن۔ زحاف اس (رباعی) میں بعض کے نزدیک ۱۸، اور بعض کے نزدیک ۲۴ ہیں اور سب جائز ہیں[16]۔"

غالب کے نظریۂ رباعی کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) رباعی کا وزن متعین ہے اور بنیادی وزن مفعول مفاعلن فعولن فعلن ہے۔

(۲) رباعی کے اوزان بحرِ ہزج سے ماخوذ ہیں۔

(۳) رباعی میں بعض کے نزدیک اٹھارہ اور بعض کے نزدیک چوبیس زحافات کا استعمال ہوتا ہے۔

(۴) اس بحر کا نام بحرِ رباعی ہے۔

غالب کی یہ بات درست ہے کہ رباعی کے جملہ اوزان بحرِ ہزج سے ماخوذ ہیں۔ لیکن یہ بات سراسر غلط ہے کہ یہ بحر "بحرِ رباعی" ہے۔ جہاں تک غالب کے تجویز کردہ وزن کا تعلق ہے اس پر نجم الغنی نے گرفت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہاں غالب نے "دھوکا" کھایا ہے[۳۳]۔ اور اس وزن پر تبصرہ کرتے ہوئے مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے لکھا ہے کہ "مرزا غالب کو عروض میں دخل" نہ تھا[۳۴]۔ نجم الغنی نے اس اصول کی تشریح کی جس کی بنیاد پر غالب نے رباعی کا نیا وزن ایجاد کیا اور اسی کو غلط ٹھہرایا۔ مرزا یاس یگانہ نے اصولی بات کہی کہ رباعی کے اوزان میں "فعولن فعلن" آ ہی نہیں سکتا۔ مرزا غالب کی یہ بات بھی درست نہیں رباعی میں ۱۸ یا ۲۴، اوزان کا استعمال ہوتا ہے۔ اگر رباعی کے زحافات کے دائرۂ عمل اور تخصیص کو ذہن میں رکھا جائے تو رباعی کے اوزان پر صرف چھ زحافات یعنی تخنیق، خرب، کف، جب، قبض اور ہتم کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک رباعی کے بنیادی اوزان کا تعلق ہے، وہ ایک نہیں (جیسا کہ غالب نے لکھا ہے) بلکہ چار ہیں جن کے ارکان پر عمل تخنیق کرنے سے ۲۴، اوزان برآمد ہوتے ہیں اس لیے ضمناً یہ بات بھی غلط ٹھہرتی ہے کہ رباعی کے اوزان دائرہ اخرب اور اخرم سے ماخوذ ہیں میں نے اپنے ایک مضمون "رباعی کے اصول اور نئے اوزان" میں تحقیقی تجزیے کے بعد مندرجہ ذیل نتیجے نکالے ہیں۔

(۱) رباعی کے جملہ اوزان بحرِ ہزج سے ماخوذ ہیں۔ یہ اوزان ۲۴ نہیں بلکہ ۳۶ ہیں۔

(۲) رباعی کے بنیادی اصول تین ہیں (الف) سبب پئے سبب است اور وتد پئے وتد است (ب) عمل معاقبہ اور (ج) زحافات کا مخصوص عمل۔

(۳) رباعی کے اوزان میں صرف چھ زحافات یعنی خرب، قبض، کف، جب، ہتم اور تخنیق کا استعمال ہوتا ہے۔

(۴) رکن "مفعولن" کو اخرم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ رباعی کے اوزان میں "زحاف خرم" کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ رکن (مفعولن) تخنیق کے عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے رباعی کو دائرۂ احزب و اخرم سے وابستہ کرنا درست نہیں ہے۔

(۵) تسکینِ اوسط اور تخنیق دونوں کا عمل اگرچہ ایک ہے، لیکن تسکینِ اوسط کا عمل رکنِ واحد پر اور تخنیق کا عمل دو متواتر ارکان پر ہوتا ہے۔ اوزان رباعی میں تسکینِ اوسط کا نہیں بلکہ تخنیق کا عمل ہوتا ہے۔

(۶) رباعی کے اوزان کے رکن دوم میں "مفاعلن" آتا ہے۔ یہ رکن اصولاً "مقبوض" ہے۔ یہی رکن (مفاعلن مقبوض) رکنِ سوم میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ جس کی بدولت چار نئے اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ ان پر عمل تخنیق کرنے سے آٹھ نئے اوزان حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح رباعی کے کل ۳۶ اوزان قرار پاتے ہیں[۱۹]

تجزیے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ مرزا غالب کی عروضی معلومات محض واجبی تھیں۔ انھیں ں پر کامل دستگاہ نہ تھی۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی خلاقانہ اصلاحوں نے اُن کے کلام میں تخلیقی جوہر کا اضافہ ہے۔ اس میں تاثر کیفیت اور جمال آفرینی کے عناصر بڑھے ہیں۔ مرزا غالب کے تخلیقی عمل میں وجدان ر اور آمد و آورد تارِ حریر دو رنگ کی طرح پہچانے جاتے رہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کا انداز گنجلک بیتانی ہو گیا ہے جس کو انھوں نے اپنی اصطلاحوں سے صاف واضح اور سلیس بنانے کی شش کی ہے ــــ مرزا غالب نے استادانہ اصلاحوں میں جیسا کلام ویسی اصلاح کے اُصول پر کیا ہے۔ پھر بھی انھوں نے شاگرد کے کلام سے فنّی، لسانی اور عروضی عیوب کو نکال کر کو بہتر بنایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا تکلف نہیں کہ اصلاحِ سخن کی روایت میں مرزا غالب صلاحوں کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ــــ اور یہ اردو کی عملی تنقید کا قدیم دبستان ہے۔

حوالے

۱ اصلاح الاصلاح (رام پور) صفحہ ۱۱

۲ غالب کا فنکارانہ شعور (از محمد مشتاق شارق) میرٹھ صفحہ ۸

۳ آئینۂ اصلاح (نکودر ضلع جالندھر) صفحہ ۸۔

۴ اصلاح سخن ۱۹۸۶ء (لکھنؤ) صفحہ۔ ۱۰۵ ی

۵ مشاطۂ سخن (جلد دوم) لاہور۔ صفحہ ۵۔

۶ دستور الاصلاح ۱۹۴۴ء (آگرہ) صفحہ ۴۳۔

۷ اردوئے معلیٰ، صفحہ ۲۳۵، اور صفحہ ۹۔

۸ مشاطۂ سخن (جلد اول) لکھنؤ، صفحہ ۶۔

۹ ان نکات کی تفصیل میری کتاب "ابر احسنی اور اصلاح سخن" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۰ آئینۂ غالب (۱۹۶۶ء) دہلی صفحہ ۶۶۔

۱۱ ماہنامہ نقوش لاہور (غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء) غالب کی اصلاحیں از کسری منہاس، صفحہ ۴

۱۲ غالب کا فن کارانہ شعور (۱۹۸۹ء) میرٹھ، صفحہ ۸۲۔

۱۳ خطوط غالب (از غلام رسول مہر) صفحہ ۵۲۳۔

۱۴ نقوش، لاہور (غالب نمبر۔ فروری ۱۹۶۹ء) صفحہ ۲۲۵ (غالب کی اصلاحیں از کسری منہاس)

۱۵ عروضی اور فنی مسائل (۱۹۸۵ء) نئی دہلی، صفحہ

۱۶ ادبی خطوط غالب صفحہ ۵۶۔

۱۷ بحر الفصاحت (۱۹۲۶ء) لکھنؤ صفحہ ۲۸۱۔

۱۸ گلدستۂ چراغ سخن (۱۹۲۱ء) لکھنؤ صفحہ ۷۷۔

۱۹ عروضی اور فنی مسائل، صفحہ ۵۸ تا ۷۱۔

غلام ربانی تاباںؔ

کچھ اپنے متعلق

زندگی بڑا پیچیدہ عمل ہے۔ راستہ ناہموار بھی ہے اور دشوار گزار بھی۔ انسان کو کامیابیوں کے ساتھ ناکامیوں کا بھی منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ میں جب اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو کئی دلچسپ گوشے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً میں بہت اچھا طالب علم نہیں تھا۔ مشکل سے تھرڈ کلاس میں ہائی اسکول اور دوسرے امتحانات پاس کیے۔ میٹرک اور بی اے میں فیل بھی ہوا۔ وضعداری کے خلاف ایل ایل بی میں ضرور سیکنڈ ڈویژن لانی پڑی۔ مجبوری یہ تھی کہ اس زمانے میں ایل ایل بی میں صرف دو ڈویژن یعنی فسٹ اور سیکنڈ ہوتی تھیں عام طور سے جو طالب علم پڑھنے لکھنے میں اچھے نہیں ہوتے ہیں وہ دوسرے شعبوں یعنی کھیلوں یا تقریری مقابلوں وغیرہ میں اپنا مقام بنالیتے ہیں۔ لیکن میں ان میں بھی محض صفر رہا۔ کسی کھیل میں کبھی حصّہ نہیں لیا۔ رہ گئے تقریری مقابلے تو ان کی خود میں صلاحیت نہ پائی۔ آج بھی اپنی اس کمی کو پورا نہیں کرسکا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے ضبط تحریر میں لے آتا ہوں۔ تقریر سے گھبراتا ہوں۔ کالج میں ایک دفعہ ڈرامے میں حصّہ لیا لیکن اسٹیج پر پہنچ کر مکالمے بھول گیا اور ہدایت کار کی جھڑکیاں سننی پڑیں۔

شروع سے مجھے محض ٹہلنے سے دلچسپی تھی اسکول میں تھا یا کالج میں شام کے وقت جب دوسرے طالب علم کھیل کے میدانوں کا رخ کرتے میں تن تنہا کھیتوں اور باغوں سے گزرتا میلوں چلا جاتا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ ۷۸ سال کی عمر میں میلوں چلنے کی تو سکت ہے نہیں پھر

جناب غلام ربانی تاباں، ۲۲۰، ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵۔

بھی ڈھائی تین کلومیٹر چلتا ہوں اور شاید اسی کی وجہ سے ابھی تک صحت بنی ہوئی ہے۔ بہرحال اس تنہا روی نے میری نفسیات کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ شاید میری کم آمیزی اسی کی دین ہے جس نے لوگوں میں میرے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے کوئی مجھے مدمغ سمجھتا ہے تو کوئی مردم بیزار۔ حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں خاموش گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کا عادی ہوں عام طور سے میں گفتگو میں پہل نہیں کرتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے یہ بتانا مشکل ہے۔ بس ایک بری عادت سمجھیے۔ بہت دن کی بات ہے میں بنگلور سے آرہا تھا۔ لوگ راستے میں گاڑی میں چڑھتے اترتے رہے۔ لیکن ایک صاحب دہلی تک میرے ہم سفر تھے۔ ہم دونوں راستے بھر خاموش رہے۔ دہلی کے اسٹیشن پر اترنے کے بعد انھوں نے کہا سفر تو ختم ہوگیا۔ اب تعارف ہو جائے تو اچھا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں۔ میری زندگی میں کچھ ایسی کمیاں ہیں جنھیں ہزار کوشش کے باوجود نہ سدھار سکا۔ مثلاً میری زندگی میں بڑا نظم وضبط ہے لیکن سلیقے کی کمی کا ہر قدم پر احساس ہوتا ہے۔ میں اپنی بات کی وضاحت ایک مثال دے کر کروں۔ میری جو چیز جہاں رکھی جاتی ہے ہمیشہ وہیں ملے گی اور اس کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا لیکن اس پر گرد کی ایک موٹی سی تہہ جمی ہوگی۔ کاغذات ہوں گے تو اپنی جگہ مگر بکھرے ہوئے، بے ترتیب گڈمڈ۔

عام طور سے میں بہت غور و فکر کے بعد فیصلے کرتا ہوں کہ جلدی میں فیصلہ کرنے کے بعد انسان کو مدتوں پچھتانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے کئی اہم فیصلے سوچے سمجھے بغیر کر ڈالے جن کا دوررس اثر میری زندگی پر پڑا۔ مثلاً بی۔ اے کرنے کے بعد محض چند دوستوں کے اصرار پر میں نے ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ ایل ایل بی کی سند تو کسی نہ کسی طرح حاصل کرلی لیکن میری طبیعت کو وکالت سے بالکل لگاؤ نہیں تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو اس قسم کے فیصلوں کا عام طور سے ہوتا ہے۔ ایک ناکام وکیل کی حیثیت سے تقریباً دس سال کچہریوں کی خاک چھاننے کے بعد مجھے اس پیشے کو خیرباد کہنا پڑا۔ وکالت کا مجھ سے یا میرا وکالت سے پیچھا کیسے کٹا اس کا ذکر آئندہ سطور میں کروں گا۔

۱۹۳۸ء میں کالج چھوڑا۔ کالج جانے کے لیے بھی مجھے خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ بات یہ

ہے کہ ہمارے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا۔ سمجھا جاتا تھا کہ جس نے میٹرک کر لیا وہ عالم فاضل ہو گیا۔ اس زمانے میں دیہات میں بڑی کم عمری میں شادی کر دی جاتی تھی۔ دسویں جماعت کا امتحان دینے کے بعد میری بھی شادی کر دی گئی۔ بہر حال کسی طرح لڑ جھگڑ کر میں کالج چلا گیا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جسے کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانا چاہتا تھا۔ میرے والد اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر جدوجہد کا آغاز ہوا۔ خدا خدا کر کے کچھ امید بندھی۔ میرے بھانجے امتیاز حسین خاں مرحوم اس زمانے میں انگلستان میں زیر تعلیم تھے۔ میں نے انھیں لکھا کہ میں بھی آرہا ہوں۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ۱۹۳۹ء میں یورپ میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی اور میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مجھے کتنی مایوسی ہوئی اسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس حادثے کے بعد میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا اور ۱۹۴۰ء سے یوپی کے مقام فتح گڑھ میں وکالت شروع کر دی۔ مجھے وکالت کے پیشے سے یک گونہ نفرت سی تھی۔ موکل یوں بھی کم آتے تھے۔ جو ایک دفعہ گیا کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ ضلع کی ماتحت عدالتوں میں وکیلوں کی نشست گاہوں کو بستہ کہتے تھے۔ میرے بستہ کے مرکزی کردار تھے منشی پنولال جو موکلوں کو میری مصروفیت کی فرضی داستانیں سناتے رہتے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ موکلوں پر ان کہانیوں کا کیا اثر ہوتا تھا لیکن میرے بیکاری کے لمحے ان کے سہارے گزر جاتے تھے۔ وکالت سے زیادہ میں سیاست میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ گھر سے پیسے مل جاتے جس سے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ ۱۹۴۲ء میں چھ مہینے کے لیے نظربند کر دیا گیا یہ میری زندگی کا اہم موڑ تھا۔ جیل سے رہا ہوا تو والد اور گھر کے دوسرے لوگ بہت ناراض تھے۔ کشیدگی اتنی بڑھی کہ میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ادھر ادھر گھومتا پھرتا دہلی پہنچا جہاں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ میں ایک کلرک کی حیثیت سے میرا تقرر ہو گیا۔

میری ادبی زندگی میں بھی بعض اہم موڑ آئے جن کے اچھے یا برے اثرات آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ کالج میں نئے اور پرانے شاعروں کی غزلوں اور نظموں کی پیروڈی لکھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن کبھی سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنے کی کوشش نہیں کی۔ کالج چھوڑنے کے ساتھ پیروڈی گوئی کا دور بھی ختم ہو گیا۔ میں نے سمجھا تھا کہ ادب سے میرا رشتہ ٹوٹ گیا۔ لیکن یہ خیال

غلط ثابت ہوا۔ ۱۹۴۱ء سے میں نے سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنا شروع کر دیا۔ یہ موڑ میری زندگی میں
کیوں آیا۔ اس کے پیچھے کون سے عوامل و محرکات کارفرما تھے۔ وہ کون سا حادثہ یا واقعہ تھا
جس نے مجھے شعر کہنے پر اکسایا۔ اس سوال کا جواب کوشش کے باوجود کبھی نہیں دے سکا۔
فتح گڑھ بہت چھوٹا سا صاف ستھرا شہر اور اہم فوجی چھاؤنی ہے۔ اس زمانے میں فتح گڑھ
کی سویلین آبادی تقریباً دس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تر حکام، وکیل، تاجر اور
چھوٹی موٹی ملازمت کرنے والے لوگ تھے۔ ادبی سرگرمی صرف سال دو سال میں منعقد ہونے
والے مشاعروں تک محدود تھی۔ بیرونی ادبی دنیا سے میرا رابطہ محض رسائل کے ذریعے قائم تھا
میں نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی آٹھ نو سال ایک کنوئیں کے مینڈک کی طرح فتح گڑھ میں
گزارے۔ پھر بھی ادب کی ترقی پسند تحریک کے اثرات قبول کیے اور اس کے زیر اثر نظمیں کہنے لگا
جس کا سلسلہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۵۰ء میں نظموں کا انتخاب سازِ لرزاں شائع ہوا۔ ایک
کی بات یہ ہے کہ میں اپنی نظموں سے مطمئن نہیں تھا۔ میری ادبی زندگی کا دوسرا بڑا موڑ وہ تھا
جب میں نے نظم کے بجائے غزل کہنی شروع کی۔ غزلوں کے کئی انتخاب شائع ہو چکے ہیں لیکن آج
بھی مجھے اس غزل کا انتظار ہے جو میرے معیارِ انتخاب پر پوری اترے۔ میں کبھی وہ غزل کہہ
سکوں گا یا نہیں یہ بتانا مشکل ہے۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ غزل کہے بغیر اگر میں مر گیا تو
یہ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہو گا۔

منزلوں سے بیگانہ آج بھی سفر میرا — رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا

دورِ کم عیاری ہے کچھ پتا نہیں چلتا — کون میرا قاتل ہے کون چارہ گر میرا

کچھ بتاؤ تو آخر کیا جواب دوں اس کو — اک سوال کرتا ہے روز مجھ سے گھر میرا

دل کی بے قراری نے سرکشی کھو دی تھی آپ — ورنہ آستانوں پر کب جھکا تھا سر میرا

ڈاکٹر سید حامد حسین

سر راس مسعود اور ای ایم فارسٹر

جب ۱۹۲۴ء میں انگریز ناول نگار ای، ایم فارسٹر نے اپنے شہرۂ آفاق ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا" A Passage to India شائع کی تو اسے سر راس مسعود کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کیا تھا:

"سید راس مسعود اور ہماری دوستی کے سترہ سالوں کے نام"

دراصل نومبر ۱۹۰۶ء میں یا اس کے تھوڑے قبل فارسٹر کا سید راس مسعود سے تعارف ہوا تھا۔ مسعود کی عمر اس وقت سولہ سال کی تھی اور وہ انگلستان اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گئے ہوئے تھے اُن کا قیام ان کے مقامی سرپرست سر تھیوڈور اور لیڈی ماریسن کے ساتھ تھا جن کی رہائش ایش لے سینٹ جارج روڈ وے برج میں تھی۔ قریب ہی ہرن ہم، مانومنٹ گرین میں فارسٹر اپنی والدہ کے ساتھ رہتے تھے۔ فارسٹر کی والدہ للی اور لیڈی ماریسن اچھی دوست تھیں۔ آکسفرڈ جانے کے لیے مسعود کو لاطینی زبان میں کوچنگ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ فارسٹر مسعود کو لاطینی پڑھا دیا کریں گے۔ جلد ہی یہ استادی اور شاگردی ایک گہری دوستی میں بدل گئی اور مسعود فارسٹر کے مہمان ہی نہیں بن گئے بلکہ انھوں نے فارسٹر کی والدہ اور خالہ کا بھی دل جیت لیا۔

فارسٹر، مسعود سے عمر میں دس سال بڑے تھے۔ ان کے ناول جہاں فرشتوں کے پر جلتے ہیں Where Angels Fear to Tread شائع ہو چکی تھی اور

ڈاکٹر سید حامد حسین ای ۲/۱۸۴ پروفیسرز کالونی بھوپال ۴۶۲۰۰۲

وہ دوسری دو ناولوں کھلے منظر والا کمرہ A Room with A View ۱۹۰۸

طویل ترین سفر The Longest Journey پر کام کر رہے تھے۔ ان ناولوں کے ساتھ ساتھ اپنی چند کہانیوں میں فارسٹر نے جہاں انگریز متوسط طبقے کی رسم پسندی اور تصنع سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا تھا وہیں مضافات شہر میں بسنے والے انگریزوں کی بے جان زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے کی غرض سے دوسری تہذیبوں سے متعلق افراد کے انداز زندگی میں (جیسا کہ انھوں نے اٹلی میں قیام کے دوران اطالویوں میں پایا تھا) ان کی دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا چنانچہ مسعود سے ان کا ربط ایک ایسے موقع پر ہوا جب کہ فارسٹر ذہنی طور پر دوسری قوموں کے طریق زندگی اور انداز فکر کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ پھر راس مسعود کی زبردست خوداعتمادی اور دوسروں کو مسخر کر لینے والی بے تکلفی نے فارسٹر کو گویا مجبور کر دیا کہ وہ انھیں ایک نئی تہذیب کے نقیب وسفیر کی حیثیت سے قبول کرلیں۔

راس مسعود کے اس وقت سے ہی مارلین اور ان کی بیوی سے گہرے مراسم تھے جب یہ لوگ علی گڑھ میں تھے چنانچہ ان کے درمیان اس قسم کی کوئی جھجک نہیں تھی جو اکثر ہندوستانیوں کو حاکم قوم کے افراد سے ربط ضبط پیدا کرنے میں حائل ہوتی تھی۔ اس طرح انگلستان پہنچنے پر بھی راس مسعود کے انگریزوں کے ساتھ سیدھے صاف اور بے تکلفانہ مراسم رہے لیکن انھوں نے اپنی تہذیبی خصوصیات کو بڑی توجہ سے برقرار رکھا اور ان کا بڑے اعتماد اور بھرپور شدت کے ساتھ اظہار کیا۔ انھوں نے رسم پسند اور اصول بند مغربی انداز زندگی کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بلکہ پرخلوص جذبات اور محسوسات سے شدت اور معنی پانے والی زندگی پر اپنے یقین کا انگریزوں کے سامنے برملا اظہار کرکے انھیں پرلطف حیرانی میں مبتلا کیا۔

فارسٹر نے اپنے مضمون "انگریز کیریکٹر پر نوٹس" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جو کہ دراصل راس مسعود سے تعلق رکھتا ہے۔ فارسٹر اس موقع کا ذکر کرتے ہیں جب راس مسعود کے ساتھ براعظم یورپ میں ایک ہفتہ کی چھٹیاں گزارنے کے بعد جدا ہونے کا وقت آتا ہے تو مسعود اپنے جذبات سے مغلوب نظر آتے ہیں اور بیحد مغموم ہیں۔ بعد میں فارسٹر جب مسعود سے یہ کہتے ہیں کہ ان کے جذبات موقع سے مناسبت نہیں رکھتے تھے تو مسعود فوری جواب دیتے ہیں کہ

"آپ کا جذبات کے معاملے میں پورا رویہ غلط ہے۔ جذبات کا مناسبت سے کچھ لینا دینا نہیں جو اکیلی بات اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جذبہ صادق ہو۔ یہ رویّہ مغرب کے سرد، سوداگرانہ رویّے سے یکسر مختلف ہے۔ اس کے پس پشت فارسٹر کے الفاظ میں ایک ایسی روایت ہے جو متوسط طبقے کی تنگ دلانہ کفایت شعاری کی نہیں بلکہ شاہانہ شان وشوکت کی پروردہ ہے اور اس طرح جیسا کہ فارسٹر نے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سہ ماہی رسالے "اردو" کے راس مسعود نمبر میں شامل اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے راس مسعود نے "مجھے اپنی مضافاتی، کتابی زندگی سے بیدار کیا، مجھے نئے آفاق اور ایک نئی تہذیب سے روشناس کیا اور ایک براعظم کو سمجھنے میں میری مدد کی۔"

فارسٹر نے بھی راس مسعود کے دوستی کے بارے میں پرخلوص اور شدید جذبات کا فوری طور پر بطور ردعمل اظہار کیا۔ مسعود اکثر فارسٹر کی سردمہری اور ان کے پرتکلف لہجے پر چوٹ کرتے اور انھیں اس طرح کے دبے دبے رہنے کے رجحان کو ترک کرنے کی ترغیب دلاتے۔ فارسٹر بھی بعض اوقات مسعود کے محسوسات کے حصہ دار بنتے اور ان کے جذبات کے سیلاب میں بہ جاتے۔

فارسٹر خاص طور پر مسعود کے جمالیاتی احساس سے متاثر تھے جو مسعود کو کسی بھی غیر فنکارانہ شے کو قبول کر لینے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مسعود کے سینے میں ایک فنکار کا دل تھا اور ان میں روپے پیسے کے معاملے میں فنکاروں جیسا لاأبالی پن تھا۔ انھیں مغل بادشاہوں جیسی فیاضی کا نمونہ پیش کرنے میں لطف آتا تھا۔ اور اس طرح اپنے مزاج اور دل کے معاملات میں وہ امراء کے اس چنیدہ گروہ سے تعلق رکھتے تھے جس کو بالآخر فارسٹر نے اپنا پیشوا مانا تھا اور جس کے بارے میں فارسٹر نے لکھا تھا کہ وہ "سچی انسانی روایت" کی نمائندگی کرتا ہے، ایک ایسی روایت کی جو "ہماری عجیب نسل کی ظلم اور انتشار پر تنہا دائم کامیابی" کو ظاہر کرتی ہے۔

لیکن انگریز سامراج پرستوں کی اس دنیا میں راس مسعود ایک دور دراز کی تہذیب کے تنہا نمائندے نہ تھے۔ جب وہ انگلستان میں تھے تو ان کے گرد، ان کے چاہنے والے چند دوسرے ہندوستانی دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا تھا جو ان کی ہی طرح انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے ان میں ابو سعید مرزا (جو بعد میں حیدرآباد کے چیف جسٹس ہوئے) ہارون خاں شیروانی (جو بعد میں نظام کالج حیدرآباد کے پرنسپل ہوئے) احمد مرزا (جو بعد میں حیدرآباد کے چیف انجینیر

بنے) عبدالرشید (جو ریاست اندور کے وزیر داخلہ بنے) شیخ محمد میر (جو میرٹھ میں ڈسٹرکٹ جج رہے) اور سید محمود (جو حکومت ہند میں وزارتِ خارجہ کے وزیر مملکت بنے) شامل تھے۔ راس مسعود کے توسط سے فارسٹر کو ان نوجوان ہندوستانیوں سے بھی تعارف حاصل ہوا اور ان میں سے اکثر سے ان کے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے۔ ان کی ملاقاتوں نے فارسٹر میں ہندوستانی زندگی ادب اور ثقافت میں دلچسپی پیدا کی اور ان میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں اور زیادہ جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ فارسٹر نے سر سید احمد خاں کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا اور لائل Lyall جیسے ہندوستان میں کام کرنے والے انگریزوں کی سرگزشت پڑھی۔ ہندوستان کے قدیم آرٹ پر ای۔ بی ہیول E.B.Havell اور دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی انھوں نے دلچسپی لی۔

فارسٹر، راس مسعود اور ان کے ہندوستانی دوستوں سے اکثر ملتے۔ بعض اوقات وہ مسعود سے ملنے آکسفرڈ جاتے۔ کبھی مسعود فارسٹر کے پاس آجاتے۔ بعض اوقات دونوں فرانس یا سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں ساتھ چھٹیاں گزارتے ساتھ نہ ہوتے تو ایک دوسرے کو دلچسپ خط لکھتے۔

وسط ۱۹۱۲ء میں راس مسعود ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے لیکن فارسٹر سے وعدہ لیا کہ وہ ہندوستان آئیں گے چنانچہ اسی سال موسم سرما میں فارسٹر اپنے دو دوستوں گولڈ سورردی لوئس ڈکنسن Goldsworthy Lowes Dickinson اور آر سی ٹریویلین R.C.Trevelyan کے ساتھ ہندوستان پہنچے۔ بمبئی پر اترنے کے بعد دونوں انگریز دوست تو اجنتا اور ایلورا دیکھنے چلے گئے لیکن فارسٹر سیدھے علی گڑھ پہنچے جہاں راس مسعود پٹنہ سے ان سے ملنے کے لیے آگئے تھے۔ فارسٹر کا انھوں نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا اور مسعود نے انھیں ہندوستانی لباس پہنا کر یہاں کی سواریوں میں گلی کوچوں کی سیر کرائی۔ فارسٹر نے ہندوستانی دعوتوں میں شرکت کی اور دیہات دیکھے۔ راس مسعود فارسٹر کو دہلی لے گئے جہاں وہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مہمان رہے۔ انگلستان واپس جانے سے پہلے فارسٹر راس مسعود سے ملنے پٹنہ گئے جہاں وہ اس وقت کالجیٹ اسکول کے پرنسپل تھے۔ نواب امداد امام اثر کی معرفت راس مسعود نے فارسٹر کو گیا کے پاس ''برابر گپھائیں'' دکھلانے کا بندوبست کیا۔ فارسٹر کا پٹنہ میں قیام اور ان گپھاؤں کا سفر بعد میں فارسٹر کی ناول ''اے پیسیج ٹو انڈیا'' کے لیے بنیادی مواد

بنا جیسے فارسٹر نے غالباً راس مسعود کی تحریک پر شروع کیا۔

انگلستان واپسی کے بعد فارسٹر نے یہ ناول شروع کیا لیکن اسے بڑھا نہ پائے۔ اسی درمیان جنگ شروع ہو گئی اور فارسٹر کو مصر جانا پڑا۔ ایک بار پھر ان پر کئی طرح سے مشرق حاوی ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء کے موسم خزاں میں راس مسعود پھر انگلستان گئے۔ وہ بیمار تھے اور اچھے ڈاکٹروں کو دکھانا چاہتے تھے وہ فارسٹر سے ملے اور ان کے ساتھ قیام کیا۔

۱۹۲۱ء میں فارسٹر کو بڑے دیواس کے مہاراجہ سر تکوجی راؤ سوم کا دعوت نامہ ملا کہ وہ ان کے پرائیویٹ سکریٹری کی حیثیت سے دیواس (جو کہ اب مدھیہ پردیش کا ایک ضلع ہے) آئیں۔ فارسٹر نے اس دعوت نامے کو اس خیال سے قبول کر لیا کہ انھیں راس مسعود سے ملنے کا موقع ملے گا۔ فارسٹر ہندوستان مارچ ۱۹۲۱ء میں پہنچے۔ اس وقت مسعود حیدرآباد میں ڈائرکٹر تعلیمات تھے۔ وہ دوڑ کر فارسٹر کے پاس پہنچے اور تین دن ان کے ساتھ دیواس میں قیام کیا۔ نومبر میں فارسٹر نے دیواس کو خیرآباد کہا اور حیدرآباد کا قصد کیا جہاں انھیں راس مسعود کے علاوہ ابو سعید مرزا، احمد مرزا، ہارون خاں شیروانی جیسے پرانے دوست ہی نہیں ملے بلکہ سر اکبر حیدری اور سید علی اکبر جیسے ان کے کئی نئے دوست بھی بنے۔ راس مسعود نے فارسٹر کے لیے جنوبی ہندوستان کی سیاحت کا تین دن کا پروگرام بھی بنایا اور خود اُن کے ساتھ رہے۔

انگلستان لوٹنے کے بعد فارسٹر نے پھر اپنے ناول کا کام سنبھالا اور اسے مکمل کیا لیکن اس کو آخری شکل دینے سے پہلے وہ یہ چاہتے تھے کہ راس مسعود اس پر ایک نظر ڈال لیں اور یہ دیکھ لیں کہ کوئی تفصیل خلاف موقع تو نہیں ہے خاص طور پر وہ حصّہ جس میں پولیس کی کارروائی کی بات ہے۔ وہ ناول کو راس مسعود کے نام معنون کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لیے الفاظ کے انتخاب نے ایک بار پھر فارسٹر کو الجھن میں ڈالا۔ فارسٹر یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ ایک رسمی انتساب لگے اور نہ ہی ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ راس مسعود کے ساتھ ان کے خلوص کی محض نمائش بن جائے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اس کے ذریعے ان کے تعلق کی طوالت اور پختگی کا اندازہ ہو۔ اس معاملے میں انھوں نے راس مسعود سے بھی مدد چاہی اور بالآخر طے کیا کہ وہ ”سید راس مسعود اور ہماری دوستی کے سترہ سالوں کے نام“ ہو۔

۱۹۱۸ء کے موسم خزاں میں راس مسعود ایک بار پھر انگلستان گئے۔ ان کے صاحبزادگان، انور اور اکبر، ان کے ساتھ تھے اور وہ ان کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کچھ عرصہ فارسٹر کے ہاں قیام کیا اور انھیں کے مشورہ سے اپنے بیٹوں کا داخلہ اسکول میں کیا۔ انگلستان سے راس مسعود پیرس گئے جہاں سے وہ فرنیکفرٹ پہنچے۔ وہاں وہ ڈاکٹر بابر مرزا کے ساتھ مقیم ہوئے۔ وہاں وہ بیمار پڑ گئے اور انھیں دیکھنے کے لیے فارسٹر فرنیکفرٹ آئے۔

کچھ عرصہ بعد راس مسعود کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلرشپ کی پیش کش کی گئی جسے انھوں نے منظور کیا۔ راس مسعود اپنے بیٹوں کو فارسٹر کی خبرگیری میں چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے۔ فارسٹر انگلستان میں ان صاحبزادگان کے سرپرست رہے۔

۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کا بھوپال میں انتقال ہوا جہاں وہ تعلیمات اور امور عامّہ کے وزیر تھے۔ جب فارسٹر کو ان کی موت کی اطلاع ملی تو انھوں نے چاہا کہ وہ لندن کے اخبار ٹائمز کے لیے کچھ لکھیں لیکن ایسا نہ کر سکے۔ کیوں کہ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اس خبر سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ بہر حال جب مولوی عبدالحق نے رسالہ "اردو" کے اس نمبر کے بارے میں فارسٹر کو لکھا جو انجمن ترقی اردو سر راس مسعود کی یاد میں نکالنا چاہتی تھی تو فارسٹر نے اس کے لیے ایک اثر انگیز خراج عقیدت ارسال کیا جس میں انھوں نے لکھا "ان جیسا نہ کوئی تھا نہ ہی ان جیسا کوئی ہوگا۔ اُن کے بارے میں ہم اس طرح کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے جیسا عام آدمیوں کے لیے کرتے ہیں۔" راس مسعود سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "جب تک میں اُن سے نہیں ملا تھا" ہندوستان میرے لیے راجاؤں، ہاتھیوں، یا یوڑوں اور صاحبوں کا ایک گورکھ دھندا تھا اور مجھے ایسے گورکھ دھندے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور کیسے ہو سکتی ہے۔ انھوں نے جب بولنا شروع کیا تو ہر چیز کو حقیقی اور شوق انگیز بنا دیا اور سترہ سال بعد جب میں نے اپنی ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا" لکھی تو میں نے اپنی شکر گزاری کے جذبے کے تحت اور ان کے لیے اپنی محبت کے جذبے کے اثر سے ان کے نام معنون کیا۔ کیوں کہ بغیر ان کے وہ کبھی نہ لکھی جاتی۔"

جب ۱۹۴۵ء میں فارسٹر ہندوستان تیسری اور آخری بار آئے تو وہ علی گڑھ بھی گئے حالانکہ صرف بارہ گھنٹے کے لیے۔ ڈاکٹر بابر مرزا کے ساتھ وہ سر راس مسعود کی قبر پر گئے۔ ڈاکٹر بابر

بتاتے ہیں کہ جب تک وہ فاتحہ پڑھتے رہے، فارسٹر سر جھکائے پُرنم آنکھوں کے ساتھ وہاں کھڑے رہے۔

فارسٹر کی سرراس مسعود کے ساتھ دوستی تقریباً تیس سال پر پھیلی تھی لیکن ۱۹۷۰ء میں فارسٹر اپنی موت تک کوئی تینتیس سال اور وہ اسں دوستی کی یاد کو اپنے سینے سے لگائے رہے اور اس کا جب بھی ذکر کرتے اس میں ان کی جذباتیت کی جھلک ہوتی۔ جب ان کے ایک ہندوستانی دوست سجاد مرزا نے حیدرآباد میں اردو ہال کی تعمیر کے بارے میں انھیں لکھا تو فارسٹر نے فوراً ایک ہزار پونڈ کا ایک چیک ان الفاظ کے ساتھ ان کو روانہ کیا "یہ میرے لیے خوشی اور عزت دونوں کا باعث ہے کہ میں ایک ایسے منصوبے میں ہاتھ بٹاؤں جو میرے عزیز مسعود کے دل کے اتنے قریب ہوتا... میں نے کبھی اردو نہیں بولی لیکن وہ میری اپنی زبان ہے کیوں کہ میں نے ایسے لوگوں کے ہونٹوں سے ادا ہوتے اکثر سنا ہے جو مجھے عزیز تھے۔" فارسٹر نے پروفیسر ہارون خاں شیروانی کو اپنے خط میں لکھا کہ یہ وہ ساری رقم ہے جو براڈوے پر "پیسیج" کو (بطور ڈراما) پیش کرنے سے مجھے حاصل ہوئی ہے میں اسے اپنے عزیز مسعود کی یاد میں دے رہا ہوں جس نے اس کیفیت کو تحریک بخشی تھی جس کے تحت یہ ڈراما پیش کیا گیا۔" فارسٹر دراصل اپنے ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا" پر مبنی اس ڈرامے کا ذکر کر رہے تھے جس کو شناسنتا راما راؤ نے تحریر کیا تھا اور جسے اس وقت نیویارک میں اسٹیج پر پیش کیا جارہا تھا بعد میں پروفیسر شیروانی نے تجویز رکھی کہ اردو ہال کی دوسری منزل پر بنائے جانے والے اسٹیج کو "فارسٹر اسٹیج" کا نام دیا جائے اس پر فارسٹر نے جواب دیا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ فارسٹر اسٹیج اچھا نام ہوگا۔ لیکن راس مسعود اسٹیج بہت ہی اچھا رہے گا۔"

فارسٹر نے بار بار راس مسعود کے لیے اپنی احسان مندی کا اظہار کیا ہے اور ہندوستان کے بارے میں ان کی تحریریں خاص کر ان کے ناول "اے پیسیج ٹو انڈیا" میں جا بجا ایسے حوالے ہیں جو اس تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ناول میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی جس معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا اتنی خوبصورتی کے ساتھ نقشہ پیش کیا ہے وہ، وہ زندگی ہے جس سے فارسٹر نے اپنے ہندوستان کے پہلے دو سفروں کے دوران راس مسعود کے توسط سے تعارف حاصل کیا تھا۔ راس مسعود نے انھیں فارسی اور اردو کے شہ پاروں سے بھی واقف کیا تھا اور فارسٹر کے ناول اور دیگر تحریروں میں رومی، غالب، اقبال، حافظ اور حالی کی جو گونج سنائی دیتی ہے وہ یقیناً راس مسعود

کا فیضان ہے۔ حالانکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فارسٹر کے ہندوستانی ناول کا مرکزی کردار اور ڈاکٹر عزیز راس مسعود کا چربہ ہے، پھر بھی اس میں راس مسعود کی خوش مزاجی، شعر و شاعری میں دلچسپی، حیرت انگیز یادداشت، اختراع کے زبردست مادے، دوستی کے جذبے میں یقین، جذبات و محسوسات کی قدر، فیاضی کے جذبے اور کھیلوں میں دلچسپی میں سر راس کی جھلک نظر آتی ہے۔

سر راس مسعود نے نہ صرف فارسٹر کو تجربات کی ایک نئی دنیا سے متعارف کرایا بلکہ انھوں نے فارسٹر کو بلا جھجک ان کا اثر قبول کرنا بھی سکھایا۔ انھوں نے فارسٹر کو خلوص کی قدر کرنا اور جذبات کی سچائی کو تسلیم کرنا سکھایا اور بعد میں فارسٹر نے اسے اپنی زندگی کی بڑی کامیابیوں میں شمار کیا۔ جب فارسٹر سر راس مسعود کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ "انھیں ایسے لوگوں کی محبت اور عزت حاصل تھی جو ان سے مختلف نظریے، نسل اور زبان سے تعلق رکھتے تھے جو اُن کی یگانۂ روزگار ذہانت اور دل کی وسعت کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے" تو وہ یقیناً سر راس کے لیے خود اپنی محبت اور عزت کا اعتراف کرتے ہیں۔ فارسٹر اور سر راس مسعود کے تعلقات یقیناً اپنے وقت کے دو نہایت ذہین اور حساس افراد کے تعلقات کی ہی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ انسانی فکر و احساس کی قابل قدر وسعتوں کا بھی پتہ دیتے ہیں۔

يوسف ناظم

ادب کے موجودہ رجحانات

عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی اجازت سے میں اپنی بات کسی تمہید کے بغیر شروع کروں۔ تمہید اصل میں ان موقعوں پر درکار ہوتی ہے جب سامعین کا وقت ضائع کرنا ضروری ہوتا ہے، انتظامی امور کی بنا پر۔ لیکن مصروف لوگوں کی اس محفل میں تمہید جو ہمارے معمولات میں داخل ہے بے موقع سمجھی جائے گی۔ اس لیے اردو میں موجودہ ادبی رجحانات کے بارے میں گفتگو یوں کیوں نہ شروع کی جائے کہ اچھے شعر کی تعریف کیا ہے۔ شعر کو میں نے نثر سے اس لیے پہلے رکھا کہ ہمارے یہاں شاعری کی ولادت پہلے عمل میں آئی۔ نثر تو اس سے عمر میں بہت چھوٹی ہے حالانکہ دو ولادتوں کے درمیان اتنا فصل ہونا نہیں چاہیے۔ شعر کی جڑیں بھی مضبوط ہیں اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر شخص بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر کس و ناکس شعر سے مانوس ہے۔ شعر کا آہنگ، خواہ وہ شعر تک بندی ہی کی پیداوار کیوں نہ ہو، عام آدمی کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور اگر شعر واقعی شعر ہوا تو اہل ذوق تو اسے وردِ زبان کر لیتے ہیں یا خود ہی یاد ہو جاتا ہے اس لیے ہمارے اساتذہ نے اچھے شعر کی تعریف جیسا کہ مجھے یاد ہے یہ کی تھی کہ وہ شعر جو ذہن میں محفوظ ہو جائے اور دورانِ گفتگو برموقع زبان پر آ جائے اچھا شعر ہوتا ہے۔ ہمارے اساتذہ جب بھی کسی بات کی تفہیم یا وضاحت کرنا چاہتے اس قسم کے معمولی الفاظ استعمال کرتے کیونکہ وہ سیدھے سادے لوگ تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں تھا اور ان کی لفظیات کمزور تھی لیکن انھیں یہ فن کبھی نہیں آیا کہ وہ الفاظ کے طوطا مینا

جناب یوسف ناظم ۱۹ ہلال ۱۳ کرشن چندر روڈ، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰۔

بنا کر اپنے مخاطب کو حیران و ششدر کر دیں ــــ یہ بھی ممکن ہے کہ اچھے شعر کی مندرجہ بالا تعریف خاص طور پر مجھ جیسے کم فہم لوگوں کے لیے وضع کی گئی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اچھے شعر کی اس توجیہہ میں لگی لپٹی کچھ نہیں ہے۔ یہ اچھے شعر کی مکمل تعریف ہو یا نہ ہو اتنا ضرور ہے کہ شعر کی اہم بلکہ سب سے بڑی خوبی کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو ہو جاتا ہے۔ اس توجیہہ میں ذم کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے یعنی اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شعر یاد نہ ہو جائے اچھا نہیں ہوتا۔ بڑے سے بڑے شاعر کا پورا کلام تو ایک طرف رہا اس کا منتخب کلام بھی کسی کو یاد نہیں ہو سکتا۔ بجز اس کے کہ کوئی شخص بیٹھ کر خضوع و خشوع کے ساتھ اس سلسلے میں مسلسل ریاض کرے۔ لیکن ایک شعر جو زبان زدِ خاص و عام ہو جائے یقیناً اچھا شعر مانا جائے گا ضرب الامثال اسی طرح بنتے رہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ ادبی رجحانات کے زیر اثر جو شعری تخلیقات وجود میں آئی ہیں ان میں ضرب الامثال بننے کی یا حافظے میں محفوظ رہ جانے کی خصوصیت کتنے اشعار میں ہے او ان اشعار کی نوعیت کیا ہے؟ میرے لیے یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ کوئی بھی شاعر اس خواہش کے تحت شعر نہیں کہتا کہ اس کا شعر ضرب المثل بن جائے۔ لیکن وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ اس کا شعر اس کے سننے اور پڑھنے والوں کے ذہن پر اثر انداز ہو۔ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ادب میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں ان کے متعلق یہ کہہ دینا کہ وہ سرے سے نقصان دہ تھیں سراسر زیادتی ہو گی لیکن جب ان تبدیلیوں کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کا غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے گا تو شاید یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہو گا کہ شعر خواہ گئے زمانے کا ہو یا نئے زمانے کا، فارم کے بغیر سو فی صد کھرا شعر نہیں بنتا۔ شعر کسی نہ کسی زمین میں ضرور کہا جاتا ہے لیکن یہ زمین بحر میں ہوتی ہے۔ یہ بات نظام قدرت کے بھی عین مطابق ہے کیوں کہ اس کرۂ زمین پر تری کا حصّہ خشکی کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ شاعری میں بھی بحر وا کی اہمیت سے صرف نظر کرنا کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔ میرا اشارہ ان شعری تخلیقات کی طرف ہے جو بطور نثر لکھی جاتی ہیں۔ شعری تخلیقات کی ترکیب بھی میں نے مروتاً استعمال کی ہے۔ ایسی تحریر جو نظم ہو نہ نثر مطالب و معانی سے پر ہونے کے باوصف، ادب کے خانے میں رکھی بھی جائے تو وہ سرد خانے ہی میں رہے گی۔ شعری سانچے کی بات کرتے ہوئے میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ اگر ہماری مثنوی، مثنوی ہی کی شکل میں رہتی ہے، رباعی ۴ مصرعوں سے گھٹ کر دو مصرعوں کی نہیں ہوتی ہے تو ہماری غزل

غزل کیوں نہیں رہ سکتی۔ یہ آزاد غزل کیا بات ہوئی۔ غزل کراکری نہیں ہے کہ ٹوٹ جائے۔ شروع شروع میں تو لوگوں کو شبہ ہوا تھا کہ ہماری دیرینہ غزل شاید ہماری ہی طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور چند جیالوں اور سرفروشوں کی قربانیوں نے اسے طوق وسلاسل سے آزاد کیا۔ یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوئی جب آزاد غزل کی تائید میں مضامین، مقالے اور بعد میں تاریخ وار رجسٹر چھاپے گئے۔ آزاد غزل کی تائید میں یہ کہنا کہ آزاد غزل گائی بھی جا سکتی ہے۔ مزاحیہ اور فکاہیہ بات تو ہوگی اور شاید دل پر بھی اثر کرے گی لیکن پارٹ ٹائیک کی طرح۔ فرحت یا تقویت کا عنصر اس میں نہیں ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک گانے کا تعلق ہے گانا تو الفاظ کے بغیر بھی گایا جا سکتا ہے۔ شعر اور خاص طور پر غزل تو زیور کی طرح کی چیز ہے۔ بیش قیمت بھی اور کاریگری کا نمونہ بھی۔ آزاد غزل میں گہنے کی خصوصیت نہیں پیدا ہوتی یہ صرف سہنے کی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔

ہماری شاعری میں ہئیت کے تجربوں اور زبان کی شکست وریخت کے نتیجے میں جو کچھ ہوا ہے اسے مئوقت کہنا مناسب ہوگا۔ ہر عبوری دور میں ایسا ہوتا ہے۔ کسی بھی نئی تحریک یا تبدیلی کو مصفّا و مجلاّ ہونے میں دیر لگتی ہے۔ تاہم جدید رجحانات کے تحت جو شاعری ہوئی ہے اس میں نفیس اور عمدہ غزلیں بھی ہیں کیونکہ غزل اپنی ساری روایتوں کے ساتھ نودمیدہ پھولوں کی مہک کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ناصر کاظمی نے کیا اچھا شعر کہا ہے

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ! یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

غزل صرف سخن نہیں ماورائے سخن بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین کے غزلیہ اشعار ہوں یا آج کے شاعروں کی غزلوں کے شعر بلا تفریق سنہ و تاریخ لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ میر تقی میرؔ کا یہ شعر ہو

پتا پتا، بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

یا شکیبؔ جلالی کا یہ شعر کہ

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

شاعر کا نام جانے بغیر بھی لوگوں کو حفظ ہے۔ یہ سب پابند اشعار ہیں۔ عوام کا وہ طبقہ جو شعر کے معائب ومحاسن سے بے نیاز ہے پابند اشعار سے نہ صرف محظوظ ہوتا ہے بلکہ انھیں کسی نہ کسی طرح، نہیں نہ کہیں محفوظ بھی کروا لیتا ہے۔ سڑک پر دوڑنے والی گاڑیوں ٹرک لاری اور کتنی ہی رکشاؤں کی

پشت پر کوئی نہ کوئی شعر لکھا نظر آتا ہے مثلاً

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے ۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کسی بھی ٹرک یا رکشا پر کیا آپ نے کوئی خارج از بحر مصرع لکھا دیکھا ہے یا کبھی نثری نظم کا اقتباس آپ کے مطالعے میں آیا۔

اچھے شعر کسی مخصوص زمانے یا دور کی ملکیت نہیں ہوتے نہ کسی تحریک اور رجحان کے تابع ہوتے ہیں ۔ جدید ادبی رجحانات میں استقدامی اثر بھی ہوتا ہے بالکل اس طرح جیسے کہ روایتیں دیرپا ہوتی ہیں نئے رجحانات غیر محسوس طریقے پر پرانے شاعروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اچھے شعر کی جو تعریف میں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں نقل کی ہے اس کا اطلاق مندرجہ ذیل اشعار پر بھی ہوتا ہے جو حال حال میں کہے گئے ہیں۔

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی ۔ یاروں نے درمیان میں رستہ بنا لیا

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے ۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے

جب شام اترتی ہے کیا دل پہ گزرتی ہے ۔ ساحل نے بہت پوچھا خاموش رہا پانی

دوستو کیا ہوئے وہ لوگ جو کٹتے جاتے ۔ مرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے ۔ تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں سے ۔ کوئی سایہ مکان سے نکلا

اور

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی ۔ وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا

ایسے کتنے ہی شعر ہیں جو لوگوں کو ازبر ہیں۔ اچھے شعر کا سنہ پیدائش غیر اہم ہے بلکہ ایک عام آدمی کے لیے تو شاعر کا نام بھی غیر اہم ہے جو شعر اپنی صفات کی بنا پر اسے پسند آگیا وہ اس کا ذاتی شعر ہو گیا۔ اس لیے یہ بات طے ہو گئی کہ کسی بھی دور کا پورے کا پورا ادبی سرمایہ بالکلیہ طور پر نہ تو قبول کیا جا سکتا ہے نہ رد کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ سخت گیر بھی ہے لیکن منصف مزاج بھی۔ اچھے اور برے کی تمیز ایک فطری عمل ہے اور یہ بھی طے ہے کہ ادبی ذوق کے بھی مدارج ہوتے ہیں جن سے احساس کی نفی نہیں ہوتی۔

غیر پابند نظمیں بھی سرے سے رد نہیں کی گئی ہیں جن میں طویل نظمیں بھی ہیں جو لوگوں کو مصرع بہ مصرع حفظ ہیں۔ مخدوم کی نظم " چاند تاروں کا بن " اس کی عمدہ مثال ہے۔ احمد ندیم قاسمی جیسے کہنہ مشق

شاعر نے بھی غیر پابند نظمیں کہی ہیں لیکن ان نظموں کے مصرعے خارج از بحر نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ارکان کی کمی بیشی کے ساتھ کہے ہوئے مصرعوں پر مشتمل نظم ایک پابند نظم سے بھی آگے نکل جائے۔ یہ شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ہوگا عجز بیان کا نہیں۔ ادب میں دو ٹوک فیصلے صادر نہیں کیے جا سکتے۔

جہاں تک خواتین کی شعری کاوشوں کا تعلق ہے اُن کے کلام میں اب مردانہ لب ولہجہ نہیں ہے' حسن ذاتی پوری صفات کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہ ایک اہم تبدیلی ہے۔

نثر ان دنوں زیادہ مقبول ہو رہی ہے۔ شعراء کی تعداد کم تو نہیں ہوئی ہے لیکن نثر نگاروں کے ہاں افزائش نسل خاصی مقدار میں ہوئی ہے۔ نثر بھی ہئیت کے تجربوں سے گزری ہے۔ وہ تجربے علامتی ہوں یا تجریدی اور آخر کار بات اس نقطے پر آکر ٹھہری کہ ابہام کے مقابلے میں ایہام بہتر ہے اور یہ کہ عجز کو ایجاز میں بدلا جا سکتا ہے۔ جدید ترین ادبی رجحان یہ ہے کہ کہرا اگر ہو بھی تو اتنا دبیز اور گہرا نہ ہو کہ کوئی چیز نظر ہی نہ آئے خفیہ ادب بہتوں کی دسترس سے باہر ہوتا ہے

ایک بات البتہ یہ بھی ہوئی ہے کہ انشاء پردازی کی جگہ انشائیے نے لی لی۔ ہر دور میں زبردستی کا کوئی نہ کوئی واقعہ ہوتا ہی رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اب انشائیے کے تعلق سے یہ اصرار بھی ہو رہا ہے کہ اسے ایک صنف کے طور پر قبول کیا جائے۔ زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔ اصناف ادب کوئی مقدس چیزیں نہیں ہیں کہ انھیں چھُوا ہی نہ جا سکے۔ لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اصناف ادب کی فہرست میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں ادب میں اضافہ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ ویسے انشائیے کا موضوع تضیع اوقات کے لیے بہت کارآمد موضوع ہے۔

پچھلے چار پانچ دہوں میں تنقید بھی بہت لکھی گئی ہے۔ ادبی رسائل میں تنقیدی مضامین تو شائع ہوتے ہی ہیں لیکن اب تنقید کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات کا بندوبست ہو رہا ہے وہ اس طرح کہ ہمارے مدیران جرائد اپنی نشستیں بھی خالی کر دیتے ہیں۔ مہمان اداریے جدید رجحانات میں سے ایک رجحان ہے اور اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ جتنی تنقید لکھی گئی ہے اس پر اتنی ہی مقدار میں تنقید ہوئی ہے۔ چونکہ ادب کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ متحرک ہے اس لیے ہمارے تنقید نگاروں کی رائے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ جو لوگ نقادوں کی رائے کا برا مانتے ہیں وہ خواہ مخواہ اپنی صحت خراب کرتے ہیں۔ تنقید میں جو جدید رجحانات وقوع پذیر ہوئے ہیں ان میں ایک نمایاں رجحان یہ ہے

کہ تنقید میں اب تنقیدی زبان نہیں لکھی جاتی۔ یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ آدمی کب تک پرانے ڈھرے پر چلتا رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دنیائے ادب میں آج سے پہلے کیچڑ نہیں اچھالا گیا۔ پہلے بھی یہ ہوا ہے لیکن جب یہ پتہ چلا کہ کیچڑ تو دھل جاتا ہے تو تیزاب پھینکے جانے کی خوش گوار رسم شروع ہوئی۔ تنقید نگار کے ایک ہاتھ میں قلم ہوتا ہے تو دوسرے ہاتھ میں کسی ادیب کے عیبوں کی پوٹلی۔۔۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ زندہ رہنے والی چیز صرف ادب ہے۔ باقی سب چیزیں رفتنی اور گزشتنی ہیں۔۔۔ ادب میں کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے آواز کافی ہوتی ہے۔ آوازہ درکار نہیں ہوتا۔

ادیبوں اور شاعروں کے مناقشے بھی مشہور ہوئے ہیں معرکے بھی مشہور ہوئے ہیں اور معاشقے بھی لیکن یہ سب ان لوگوں کی تفریح کا باعث ہیں جو انٹرٹینمنٹ کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ادب کے میدان میں معرکہ آرائی کا مطلب جنگ و جدال کا ماحول پیدا کرنا نہیں بلکہ صحیح قسم کی معرکہ آرائی وہ ہوگی کہ کسی معرکۃ الآراء ادبی شہ پارے کی تخلیق کی کوشش کی جائے۔۔۔ شعرو ادب کے شائق اور عاشق اسی ادبی رجحان کے منتظر اور متمنی ہیں۔

ادب کی دنیا میں ایک تبدیلی یہ بھی عمل میں آئی ہے کہ اب قاری اپنی سوجھ بوجھ پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ تنقید پڑھی ضرور جاتی ہے لیکن صرف کیوریاسٹی کی خاطر اور قاری کا مقصد اکتساب نہیں احتساب ہوتا ہے۔ ہمارے قاری تعداد میں ضرور گھٹے ہیں لیکن قاریوں کی اہمیت ان کے اعداد سے نہیں ان کی استعداد سے جانچی جانی چاہیے۔ اگر کسی قاری کا قد کسی ادیب سے اونچا ہو جائے تو اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔۔۔ ادیب کی طالب علمی کا دور کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اب قاریوں کا ذکر آیا ہے تو کتابوں کی فروخت کے بارے میں بھی ایک آدھ جملہ کہہ دینے میں کیا حرج ہے۔ میرے حساب سے مجموعی طور پر کتابیں اب زیادہ بک رہی ہیں۔ اب مصنفین کی تعداد بیس سال پہلے کے مصنفین کی تعداد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے بلکہ کثیر ہے۔ ان سارے مصنفین کی چند کتابوں کا بک جانا بھی ایک باعث تشویش نہیں باعث اطمینان امر ہونا چاہیے۔ آج سے بیس سال پہلے اگر کوئی شخص ایک دو کتابیں ہاتھ میں لے کر کسی کافی ہاؤس میں داخل ہوتا تھا تو لوگ طنز کرتے تھے کہ موصوف کو دانشور بننے کا شوق ہو گیا ہے۔ اب ادب سے دلچسپی رکھنے والے تقریباً ہر شخص کے ہاتھ میں کتاب ضرور نظر آتی ہے۔ خود اس کی ملکیت نہ بھی ہو تو یہ کتاب کسی نہ

باقی صفحہ

شمس الحق عثمانی

ٹیڑھی لکیروں کا اذیّت نامہ

وہ فنکار جو جیتے جی لیجنڈ بن جائیں ——— اور ایک نوع کا دعوٰی کا دینے والے جداگانہ اور بڑی حد تک ناقابلِ تقلید اسلوب کے حامل ہوں؛ ان کے ساتھ یہ ستم ظریفی چلی آتی ہے کہ عام پرستاروں کی نظر ان کے قول و فعل اور فن پاروں کے آر پار سفر نہیں کر پاتی ——— کیوں کہ عام پرستار اس شخصیت اور اسلوب سے وابستہ متعینہ تصوّرات کو ہاتھ لگانے کے خیال سے بھی جھجکتا ہے ——— وہ معیّنہ تصوّرات، اُس پرستار کو (اور بعض حالات میں فنکار کو بھی) خواہ کتنے ہی عالی شان محسوس ہوں، دراصل ان کی حیثیت، موانعات سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنی اٹل حقیقت پر اصرار کے باعث، فن پاروں کی معنویت کو جامد بنا لیتے ہیں؛ دونوں ہی ایک طرح کے گُل محمد خاں۔

عصمت چغتائی جیتے جی لیجنڈ بن گئی تھیں اور ادبی زندگی کے آغاز ہی میں صاحبِ اسلوب تسلیم کی گئیں ——— اُن کی شخصیت اور فن کا اگر کوئی واحد عنوان ممکن ہے تو وہ ——— انحراف ——— ہی ہو سکتا ہے۔ ہر سیدھی لکیر کے مقابلے پر انحراف کی ٹیڑھی لکیر جو زندگی کے سیدھے سپاٹ تجربوں اور رکلیوں کے درمیان سے یوں گزرتی ہے جیسے کارڈیوگراف اسکرین پر آڑی، ترچھی دوڑتی لکیر ——— سیدھی سادی لکیروں کو کاٹتی چھانٹتی اور انھیں ایک نئے ٹیڑھے وجود میں ڈھالتی ہوئی۔

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، استاد شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

عصمت کی جسمانی اور ادبی زندگی کا سفر تکمیل کو پہنچا اور یہ سوال پیدا کر گیا کہ آیا وہ لکیر بہ ذات خود ٹیڑھی تھی؟ یا دیگر لکیروں کے مقابلے ٹیڑھی محسوس ہوتی تھی؟ یا اس کا "مقابلتا" ٹیڑھا پن صرف اس لیے تھا کہ خود کو ٹیڑھا ثابت کرنے کا افتخار حاصل کر لیا جائے؟ یا اس علانیہ ٹیڑھ کے پردے میں کچھ ایسا سیدھا بھی پوشیدہ تھا جو سادہ ذہنوں کی گرفت میں نہ آسکا؟

کسی برسات میں گاؤں کی کچی سڑک سے گزرتی بیل گاڑیوں نے اس پر جو لیک ڈال دی تھی وہ ہر برسات میں اتنی ہی گہری اور موجود ہو جاتی ہے جتنی کہ برسات ختم ہونے پر، دیگر موسموں کا بھراؤ اُس لیک کو یکسر مٹا نہیں پاتا ـــــ اور برسات پھر آجاتی ہے۔

عصمت کے ذہن نے برسات کی بجائے وہ موسم خلق کرنے چاہے جو لیک کو بھر سکیں تاکہ زندگی کی گاڑی کچھ نئے راستوں کا بھی منھ دیکھ سکے۔ افسانہ 'لحاف' ہو یا ناول 'ٹیڑھی لکیر'؛ آج پڑھے جائیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس صدی کی پانچویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں یہ فن پارے چھوٹے ذہنوں کے لیے بڑا مسئلہ اس باعث بن گئے تھے کہ یہ کسی ظاہری طمطراق کے بجائے انسانی وجود کی ان گہرائیوں کی خبر دیتے ہیں جو اُس عہد کے عام ذہن کے نزدیک لاوجود کا درجہ رکھتی تھیں۔

ٹیڑھی لکیر پر اظہار خیال کرنے والوں نے بالعموم یہ بات کہی کہ یہ ناول عصمت کی آپ بیتی ہے ـــــ یہ خیال کیوں پیدا ہوا؟ ـــــ کیا اس باعث کہ ناول کی مصنفہ ایک بے باک اور غیر رسمی شخصیت کی مالک تھی؟ اور قارئین کی بڑی تعداد اُس کی اِن صفات سے (بہ وجوہ) واقف تھی۔ تو کیا کسی فنکار کی شخصی اور فنی زندگی میں ایسی مطابقت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے فن پارے صرف اس کی زندگی کا چھروسکا درشن ہوتے ہیں؟ ـــــ اس سوال کا جواب اگر اثبات میں ہے تو مطلب یہ ہوا کہ عصمت چغتائی کا کوئی ادبی اسلوب نہ تھا اور ان کی تمام تحریریں، بہ لحاظ معنویت، اکہری ہیں کیوں کہ عصمت اپنی روزمرہ زندگی میں جیسی دکھائی دیتی تھیں اور جس طرح لوگوں کے ساتھ پیش آتی تھیں، وہ بباطن بھی بالکل ویسی ہی تھیں: بے باک، بے لاگ اور غیر رسمی ـــــ یعنی عصمت کے فن پاروں میں جو واقعات اور کردار نظر آتے ہیں ان کے باطن و ظاہر میں کوئی فرق نہیں، وہ اندر بھی بالکل ویسے ہی ہیں جیسے باہر؛ کوئی کردار ہنس رہا ہے وہ خوش ہی ہے؛ اور اگر رو رہا ہے تو بس دُکھی ہے؛

ٹیڑھی لکیر کے بارے میں بہت سی نیلی اور کالی روشنائی صرف کی گئی مگر عصمت کے ذہن اور خلیقی تراقی کو، ایک حد تک، سمجھنے والوں نے اس پہلو پر شاید غور ہی نہیں کیا کہ عصمت نے ۱۹۴۴ء میں ٹیڑھی لکیر جیسا ضخیم و فہیم ناول لکھا تھا ــــ یعنی انسانی ذہن کا یہ فہم نامہ ایسے عہد میں وقوع پذیر ہوا جو سراسر خارج شناس اور آدمی کو نرے ہاتھوں پیروں اور معدے کا مجموعہ تصوّر کر رہا تھا۔

ادبی حلقوں میں ٹیڑھی لکیر کی پذیرائی کے مقابلے میں، دیکھا جائے تو عصمت کا ناول معصومہ گویا ہمارے ادب شناسوں کے سر سے ہی گزر گیا تھا۔ اس ناول کے بارے میں بالعموم جو رائے زنی کی گئی اس کا لبّ لباب کچھ یوں ہے کہ عصمت نے بمبئی کی فلمی دنیا پر ویسا ہی چالو سا ناول لکھ مارا ہے جیسے پانچویں چھٹے درجے کے فیشن باز ناول نگار بہ آسانی لکھ سکتے ہیں ــــ مگر آج جب ہم "معصومہ" پڑھتے ہیں تو یہ سوال بار بار ذہن میں گردش کرتا ہے کہ کہیں "ٹیڑھی لکیر" کی آدم شناس فن کارہ نے ایک تجارت زدہ شہر میں لُٹتے پٹتے، مردوں، عورتوں، کے نوحے کو تو "معصومہ" نام نہیں دے دیا تھا؟ ــــ اُس برّاق ذہن نے، کئی ہم عصر فن کاروں سے بہت پہلے، یہ محسوس کرلیا تھا کہ دولت و شہرت کی ترازو میں وہ افراد بھی کھلم کھلا مالِ تجارت بن جائیں گے جو ناموس و عزّت کی حویلیوں میں چین سکون کے جھولے جھولتے ہیں۔

معروف و ممتاز مزاح نگار اور اپنے سگے بڑے بھائی، عظیم بیگ چغتائی کے بارے میں عصمت کی خاکہ نما تحریر "دوزخی" ان کے چند بہترین فن پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ "دوزخی" کا خیال آتے ہی محمد حسن عسکری کی ایک رائے یاد آتی ہے (واضح رہے کہ عسکری مرحوم، عامی ترقی پسند ادب کے سخت نکتہ چیں تھے) انھوں نے لکھا تھا کہ پورے ترقی پسند ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے والی تحریریں صرف دو ہیں: فیض کی نظم "تنہائی" اور عصمت کا "دوزخی" ــــ عسکری صاحب کی یہ رائے آج بھی برحق محسوس ہوتی ہے، بلکہ عصمت چغتائی کی رحلت کے بعد، اب تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عسکری صاحب کی اس توصیف کے پس پشت اُن کی وہ بھرپور ادب فہمی کارفرما تھی جس نے "دوزخی" سے جھلکتی عصمت کی جملہ فنّی صفات کو شناخت کرلیا تھا۔ اگر "دوزخی" کو بار بار پڑھ کر عصمت کے تمام فن پاروں پر نظر ڈالی جائے تو صاف محسوس ہوجاتا ہے کہ اس مختصر سے پرزم میں وہ تمام رنگ جھلک رہے ہیں جو عصمت کے فن پاروں میں دکھائی دیتے ہیں۔

"دوزخی" میں عصمت کی وہ بیباک نظر قدم قدم پر نمایاں ہے جو کبھی کبھی سفاک بھی محسوس ہونے لگتی ہے اور یہی وہ نظر ہے جو بعد کے تقریباً تمام فن پاروں میں ان ایکس شعاعوں کی مانند روبہ عمل رہی جو دبیز سے دبیز تہوں کو پار کر کے ہڈیوں تک جا پہنچتی ہے اور باطن کی وہ کیفیات طشت از بام کرتی ہے جو اگر باہر نہ آسکیں تو صرف انسانی وجود کو ہی نہیں بلکہ اس کے دم قدم سے قائم معاشرے کو بھی گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ عصمت کی ان ایکس شعاعوں نے ہی غالباً ان کی تحریروں کو وہ استہزائی سالب ولہجہ دیا جو ان کے مخصوص اسلوب کا جزوِ اعظم قرار پایا۔ یہاں یہ وضاحت بھی لازم ہے کہ عصمت کی اس برچھی سی نظر کا مقصود و منتہا کرداروں کا صرف باطن ہی نہ تھا؛ اس آر پار نظر کا میدانِ عمل، کرداروں کے باطن کے ساتھ ان کے خارج اور اطراف و جوانب میں رواں زندگی بھی تھی ــــ یا یوں کہیے کہ یہ اِک نگاہ، اپنی مخصوص ادا کے باعث، مذکورہ تینوں جہات کو یکساں طور سے دیکھتی، پرکھتی اور نمایاں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے "دوزخی" کا یہ پارہ:

> اُن کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں ــ اُن کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ اُن کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں۔ دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی۔ گویا دل لگانے کی بھی ضرورت تھی! دل خود بخود کھنچنے لگا۔ اُفوہ! تو یہ کچھ لکھا ہے اِن رُلنے والی کتابوں میں۔ ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں۔ وہ اندوہ ناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح اُمڈ چھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال۔ وہ پیلی نیلاہٹ لیے ہوئے بلند پیشانی۔ پژمردہ اودے ہونٹ۔ جن کے اندر قبل از وقت ٹوٹے ہوئے دانت اور وہ لاغر سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسے انگلیوں والے ہاتھ، اور پھر اُن ہاتھوں پر ورم آگیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں، جن کے سرے پر ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر؛ جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف سے جایا کرتے تھے۔ اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا، کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی تہیں اور اُس سینے میں ایسا بھڑکتا ہوا چلبلا

[redacted]

دل! یا اللہ یہ شخص کیوں کر ہنستا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کوئی بھوت ہے یا جن، جو بہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے ۔ نہیں مانتا، مسکرائے جاتا ہے ۔ خدا قہّار و جبّار چڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کے عذاب نازل کر رہا ہے ۔ اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا ۔ کون سا دنیا اور دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا ۔ مگر پھر بھی رلا نہ سکا ۔ اس دکھ میں، اس جلن میں ہنستے ہی نہیں ہنساتے رہنا کسی انسان کا کام نہیں ۔ ماموں کہتے تھے ۔ "زندہ لاش"۔ خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار، بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی ۔

یہ اُس خاکے کا طویل ترین پارہ ہے ۔ اِس میں عصمت نے عظیم بیگ کے حلیے کے ساتھ ہی ساتھ ن کے مزاج اور پھر دیگر لوگوں پر اُس مزاج و کردار کا ردِّ عمل نہایت عمدگی سے بیان کر دیا ہے ۔ اِس کے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اِس میں عصمت نے عظیم بیگ کے زمانۂ علالت کو مرکزی نقطہ بنا لیا ہے ۔ اِسی طے سے وہ تمام کرنیں پھوٹی ہیں جو عظیم بیگ کی شخصیت مرتّب کرتی ہیں ۔

عظیم بیگ کے تئیں، اپنے سمیت، تمام اہلِ خاندان کے رویّے کو، جس طور عصمت نے بیان کیا ہے وہ صرف اس لیے قابلِ تحسین نہیں کہ بے لاگ ہے بلکہ اس بیان کے پردے پر عصمت نے جس طرح ایک ظاہر لیب گور کردار کو زندگی و توانائی کا مرقع بنایا ہے وہ غالباً کہیں زیادہ ستائش کا مستحق ہے ۔ اِس کے سے متعلق سعادت حسن منٹو نے لکھا ہے

> "ساقی" میں "دوزخی" چھپا، میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا: سعادت! یہ عصمت کتنی بے ہودہ ہے، اپنے موئے بھائی کو بھی نہ چھوڑا ۔ کمبخت نے کیسی کیسی فضول باتیں لکھی ہیں ۔
>
> میں نے کہا: اقبال! اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کو تیار ہوں ۔

شاہجہاں نے اپنی محبوبہ کی یاد قائم رکھنے کے لیے تاج محل بنوایا ۔ عصمت نے اپنے محبوب بھائی کی یاد میں "دوزخی"، لکھا ۔ شاہجہاں نے دوسروں سے پتھر اٹھوائے،

انھیں ترشوایا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی۔ عصمت نے خود اپنے ہاتھوں سے، اپنے خواہرانہ جذبات چُن چُن کر، ایک اونچا مچان تیار کیا اور اس پر، نرم نرم ہاتھوں سے، اپنے بھائی کی نعش رکھ دی۔ 'تاج' شاہجہاں کی محبت کا برہنہ مرمریں اشتہار معلوم ہوتا ہے لیکن "دوزخی" عصمت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے۔ وہ جنت جو اس مضمون میں آباد ہے؛ عنوان، اُس کا اشتہار نہیں دیتا۔

اوّل اوّل افسانہ نگار: محمد حسن عسکری کی مذکورہ رائے اور پورم پٹ افسانہ نگار: سعادت حسن منٹو کی یہ تحریر، کئی سوال پیدا کرتی ہے: کیا ہماری تنقید عصمت کے اسلوب کے ہمراہ سفر کرنے میں کامیاب ہو سکی؟ —— اگر ہاں، تو عصمت کے فن پاروں کی معنویت کو کس حد تک سمجھا گیا؟ —— کیا کچھ ناقدوں نے پورے خلوص اور عدم عصبیت کی مدد سے عصمت کے فن پاروں کو سمجھنا چاہا؟ —— یا ناقدوں کی بڑی تعداد اُن آراء کو دُہرا کر ہی مطمئن ہو گئی جو عصمت کے بارے میں اوّل اوّل عام ہو گئی تھیں؟ —— اور کیا اب تک کی اردو تنقید ایسے کچھ نکات بیان کر سکی ہے جن کی مدلل توسیع و توضیح کے ذریعے عصمت کے فن کا Nualeus دریافت کیا جا سکے؟ —— وغیرہ وغیرہ۔

عصمت چغتائی کے ہم عصر و ہم فکر ناقدین اگر ایسی کوئی راہ نہ پا سکے کہ جو ان کے فن کے Nucleus تک لے جاتی ہو تو مجھے خوف ہے کہ اس دور کا ناقد بھی شاید ہی عصمت چغتائی کی شناخت کا محوری نقطہ تلاش کر سکے —— کیونکہ اس بے چارے کو زبان نہیں آتی، ہکلا میں تو ہکلا ہی پیدا ہوتا ہے۔

ابوالحسنات

عربی زبان: ایک تعارف اور تاریخی پس منظر

ماہرینِ لسانیات کے خیال کے مطابق عربی زبان ان سامی زبانوں کی ایک شاخ ہے، جسے حضرت نوحؑ کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد کسی زمانے میں اپنی بستیوں میں بولا کرتے تھے اور اسی طرح زبان کا آریائی زبانوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ان سے بالکل مختلف ایک الگ زبان ہے۔

ماہرلسانیات نے پرانی زبانوں کو مختلف گروہوں اور حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کی تقسیم کے مطابق آریائی زبانوں کے تین حصّے یا تین بولیاں ہیں: لاطینی، یونانی اور سنسکرت۔ اسی طرح انھوں نے سامی زبانوں کو بھی تین مختلف حصّوں میں بانٹ دیا ہے: آرامی، کنعانی اور عربی۔ کہتے ہیں کہ آرامی زبان سے کلدانی اشوری اور سریانی زبانیں پیدا ہوئیں، اور کنعانی سے عبرانی اور فینیقی۔ عربی سے مطر کی خوبصورت اور فصیح زبان کے علاوہ دوسری بولیاں جنھیں یمنی اور بعض حبشی قبائل بولتے ہیں، وجود میں آئیں۔

جب جگہ کی تنگی اور حالات کے نا قابل برداشت ہوجانے کی وجہ سے سامی اقوام ہجرت کرکے مختلف خطّوں میں گئیں اور دوسری قوموں سے اور دوسری زبانوں سے ان کا میل جول بڑھا تو ان کی زبان میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا حالات بدلتے گئے سامی اقوام کی جائے رہائش اور مرکز بھی بدلتے گئے اور اسی حساب سے ان کی زبانوں میں

جناب ابوالحسنات، لکچرر، شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

کبھی اختلاف اور دوری پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف لہجوں میں پوری مغائرت پیدا ہوگئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مختلف لہجے بذاتِ خود مستقل زبانیں بن گئیں۔ مگر چونکہ اصل سرچشمہ ایک تھا اس لیے ان کے اکثر الفاظ میں بڑی حد تک مشابہت اور قرب باقی رہا اس کی مثال ہمیں عربی اور عبرانی زبان کے الفاظ میں پوری طرح ملتی ہے۔ چنانچہ بعض ایسے الفاظ جو عربی میں "شین" سے بولے جاتے ہیں، عبری میں "سین" سے بولے جاتے ہیں۔ عربی میں جو "الف" ہوتا ہے وہ عبری میں "واو" بن جاتا ہے جیسے عربی کا "سلام" عبری "شلوم" بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کا "ت" عبری "ش" ہو جاتا ہے۔ جیسے عربی کا "تور" عبری میں "شور" لکھا جاتا ہے۔ "ضاد" سے عربی کے جو الفاظ بولے جاتے ہیں وہ عبری میں "صاد" سے ادا کیے جاتے ہیں۔ جیسے عربی کا لفظ "أرض" عبری میں "أرص" کہا جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ قوم تھی۔ قوموں اور گروہوں میں تعلقات اور ربط ضبط قائم کرنے کی ساری بنیادیں، مثلاً دین، تجارت یا حکومت، ان میں سے کوئی چیز ان میں ایسا میل جول اور تعلق پیدا نہ کر سکی جس سے آپس میں گہرا تہذیبی اور لسانی لین دین پیدا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قبائل ایک ہی چیز کو مختلف ناموں سے پکارنے لگے اور ایک ہی مقصد کو ادا کرنے کے لیے الگ الگ طریقۂ اظہار اختیار کرنے لگے، زندگی چونکہ خانہ بدوشانہ تھی، اس لیے شروع میں دوسروں سے اخذ کرنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ مگر جب ان کا تعلق دوسروں سے ہوا تو ان کی زبان پر بھی ان قبیلوں کے الفاظ آنے شروع ہوئے اور اس طرح ان کی زبان میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور ایک ہی معنی کے لیے مختلف قبائل میں مختلف الفاظ اور تعبیریں آئیں اور اس سے مترادفات کی کثرت ہوئی۔

عربی زبان اپنی اصل شکل میں کس طرح وجود میں آئی اس کا یقینی پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جس وقت اس کی تاریخ واضح شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے وہ اسلامی زمانہ ہے اور اس وقت عربی زبان اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جن مرحلوں سے یہ زبان گزری ہے اس کے متعلق کوئی بات اب تک یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی، مگر اب مستشرقین اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے یمن، شام اور شمالی حجاز میں دریافت شدہ ان کتبوں

دستیوں، لاٹوں، چہاردیواریوں گنبدوں اور قلعوں میں ملے ہیں، عربی زبان سے متعلق بہت سی اہم نیں معلوم کرلی ہیں۔ چنانچہ ان کتبوں اور نقوش کو ان علماء نے تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے جن سے مندرجہ ذیل تین لہجوں کا پتہ چلتا ہے :۔

(۱) جنوبی عربی لہجے : اس زبان کے کتبے یمن کے علاقہ قتبان، معین اور سبا وغیرہ میں ملے ہیں جہاں اس لہجہ کا رواج تھا۔

(۲) شمالی عربی لہجے : اس زبان کے کتبے حجاز کے شمال میں ثمود کے رہنے کی جگہوں میں ملے ہیں۔

(۳) آرامی بنطی لہجے :۔ یہ لہجے، مذکورہ بالا لہجوں کے مقابلہ میں پسے ہیں۔

قبائل کے مختلف لہجات میں مذکورہ اختلاف کی وجہ سے علمائے لغت نے عربی زبان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔

۱۔ جنوبی عربی زبان جو یمن میں رائج تھی۔

۲۔ شمالی عربی زبان جو حجاز میں رائج تھی۔

جنوبی عربی زبان میں جو یمن میں بولی جاتی تھی، سبا اور حمیر کی زبان شامل تھی، مگر فوقیت حمیر کی زبان کو حاصل تھی اس لیے اس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں۔ اور یہ شمالی زبان یعنی حجازی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم زبان ہے، کیوں کہ یہ یمنیوں کی اصل زبان تھی اور شمالی علاقہ حجاز میں جو عربی بولی جاتی تھی، وہ عدنانیوں کی زبان تھی اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ یمنی زبان کے مقابلہ میں نئی زبان تھی۔ جنوب میں یمنیوں کی یہ زبان شمال میں عدنانیوں کی زبان سے بہت مختلف تھی۔ یمن میں جو کتبے وغیرہ ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنوبی یمنی زبان، شمال کی عدنانی زبان سے نہ صرف صیغوں، تنوین، جمع مذکر سالم اور ضمیروں وغیرہ میں مختلف تھی بلکہ اس کے حروف تہجی بھی بڑی حد تک مختلف تھے۔ یعنی ان لہجوں کے لکھنے میں بھی بڑا اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب زبانوں کے لکھنے اور بولنے میں بڑا اختلاف تھا، مگر بعد میں حالات کے تقاضوں سے لہجوں کا یہ اختلاف مٹ گیا اور سب کے میل جول اور خاص طور سے دینی تقاضوں کے تحت ایک خوبصورت صاف ستھری اور شیریں زبان وجود میں آئی۔

ہمارے پاس جاہلی شاعری کا جو سرمایہ پہنچا ہے وہ عدنانی لہجے میں ہے، کیونکہ یہ جن شعراء کا کلام ہے وہ یا تو قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے جیسے الاعشیٰ اور طرفہ بن العبد جو قبیلہ تغلب سے تعلق رکھتے تھے یا مضر سے جیسے النابغہ الذبیانی اور عنترہ بن شداد العبسی جن کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا۔ اور یہ دونوں قبیلے عدنان کی شاخیں ہیں یا اگر کوئی نسلاً یمنی ہے بھی تو وہ ان قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے جو شمال کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے جیسے قبیلہ طئ، کندہ اور تنوخ۔ کہتے ہیں کہ شمال کی یہ عدنانی زبان اپنی اصل زبان سامی سے، دوسری زبانوں کے مقابلے میں، بہت قریب تھی۔ کیونکہ ان عدنانی قبائل کا دوسری قوموں سے بہت کم میل جول ہوا۔ اسی طرح یہ قبائل دوسری سامی قوموں جیسے عبرانی، بابلی، اور اشوری کی طرح دوسری قوموں کے کبھی غلام نہیں رہے کیونکہ صحرا میں رہنے کی وجہ سے حملہ آوروں کی دست برد سے یہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

مذکورہ بالا سطور سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ عربی زبان کا تعلق کن زبانوں سے ہے اور اسے کون لوگ بولا کرتے تھے؟ اب ہم عربی زبان کی اہمیت اور اس کی امتیازی خصوصیت کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ ہمیں اور زبانوں کے مقابلہ میں اس کی فوقیت کا اندازہ ہو سکے۔

کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرہ عمل زمین کے کتنے لمبے اور چوڑے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے یا اسے دنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے اور اس میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی اور کے ساتھ کتنی وضاحت ہے اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایۂ بیان کتنا دلکش اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقے کتنے سہل اور آسان ہیں۔ جس زبان میں دائرہ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دلکش اور اسلوب بیان جتنا مؤثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں اور اسی وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ

میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والے عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتے تھے کہ مبادا اس کے اعجاز بیان کی وجہ سے اسلام لے آئیں۔ اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں، جنھوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قائم رکھا ہے بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی و فنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے اور اس کے بدلنے یا کمزور کرنے کی مختلف کوششوں کے باوجود اس کے اثر و رسوخ اور ہمہ گیری میں کوئی کمی نہیں آئی، کیوں کہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے، زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ سائنٹفک، مربوط، منضبط اور اصول و قواعد کے اعتبار سے منظم زبان ہے جن کی وجہ سے اس میں چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عام طور سے دوسری زبانوں میں کمیاب ہیں۔ ان خصوصیات میں سے چند درج ذیل ہیں۔

عربی زبان کو لکھنے، بولنے اور اس میں ما فی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے جو نحوی اور صرفی قاعدے وضع کیے گئے ہیں ان کی بنیاد قرآن و حدیث کے لسانی شواہد خالص عربی قبائل میں مروج طریقوں، اور مستند علماء و ادبا کے طریق استعمال پر ہے اور ان کے وضع کرنے میں علمائے لغت نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مدتوں کی تحقیق و جستجو، جہاں بینی اور غور و فکر کے بعد ان کو آخری شکل دی ہے اس لیے ان میں ایسا استحکام ایسی پختگی اور تیقن کی شان پیدا ہوگئی ہے کہ تغیر و تبدل، حذف و اضافہ کی مطلقاً گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ زبان کے قاعدوں کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیکھنے سکھانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ کیونکہ جو قاعدہ ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے اور اگر استثنا کی شکل ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی اس جگہ کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان قاعدوں کو یاد کر کے برتنا بہت آسان ہوگیا ہے۔

دوسرے یہ کہ عربی زبان دنیا کی شاید ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں الفاظ کی آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے اور یہ اس زبان کے وسیع، متمدن اور صاف

ستھرے ہونے کی دلیل ہے چنانچہ عربی میں الفاظ کے صوتی شکلوں کو دیکھ کر نہیں بلکہ چند اشاروں کے
ذریعہ جنھیں اعراب Vowel Signs کہا جاتا ہے، ظاہر کیا جاتا ہے اور اس کے لیے
زیر، زبر اور پیش کی علامتیں ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے
حروف کم ہو جاتے ہیں اور اس سے وقت کی بچت کے علاوہ ادبی ذوق کی آبیاری
پوری ہوتی ہے کہ اگر گرامر کے قاعدے اور اصول ذہن نشین ہیں تو عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے
میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

تیسرے یہ کہ عربی الفاظ کی نزاکت بیانی کا یہ عالم ہے کہ معانی کے جزئیات بھی پور
طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا جیسے دن کے ہر گھنٹے اور پہر کے لیے
الگ ایک مخصوص نام کا پایا جانا اسی طرح اس زبان میں بعض ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں ج
کے معانی میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس کا ترجمہ کئی سطروں میں آتا ہے، یہی حال مص
Roots اور ان کے مشتقات Derivatives کا ہے کہ ایک ہی مصدر کی جڑ
مختلف معانی دینے والے مختلف قسم کے افعال مشتق ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال میں ایک حرف
بڑھا دینے یا گھٹا دینے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ جیسے "طعم" (کھایا) "اطعم" (کھا
اسی طرح "صلات" کے بدلنے سے ... کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے "رغب الی" (کسی کی
مائل ہونا) اور "رغب عن" (کسی سے منہ موڑ لینا، نفرت کرنا)۔ عربی ادب میں "صلات" کے علم کو ا
اہمیت حاصل ہے کہ بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان دانی صرف "صلات" کا علم ہے

چوتھے یہ کہ عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعے کثیر معانی پیدا کرنے
طریقہ رائج ہے جسے اصطلاح میں "اعجاز و ایجاز" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان اعجاز کے معا
منفرد زبان ہے۔ اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک
چاہیئے مثلاً لفظ "الحمد" کو لے لیجیے جس سے قرآن عظیم کی سورۂ فاتحہ شروع ہوتی ہے ج
کے معانی علماء یہ بتاتے ہیں کہ انعامات و احسانات کے اعتراف کے جذبہ کے ساتھ انسان نے
ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کیے ہیں یا ایجاد کرے گا یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے وہ سب
اس خدائے منعم و محسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس ایک لفظ میں ایسی جامعیت اور شمو

[redacted]

ہے کہ دفتر کے دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں اور الفاظ کی یہ صفت جامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے بات کو اشاروں کے ذریعے پر لطف بنانے کے لیے کنایہ، مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی و بدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

پانچویں یہ کہ دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ایک معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی الفاظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ ان الفاظ کو مترادفات یا "مرادف الفاظ" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملے میں بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ علماء لغت نے صرف سال کے لیے ۲۴ نام اور روشنی کے لیے ۲۱، تاریکی کے لیے ۵۲، کنویں کے لیے ۸۸، پانی کے لیے ۱۷۰، شیر کے لیے ۳۵۰، اور اونٹنی کے لیے ۲۵۵ نام لکھے ہیں۔ اسی طرح انسانی حلیہ کے لیے اور اوصاف کے لیے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ اوصاف میں بخل، سخاوت، شرافت اور ذلت وغیرہ کے الفاظ کے لیے بھی مختلف الفاظ آتے ہیں۔

الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلے میں عربی زبان کو دوسری زبان کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معانی دیتے ہیں جیسے "دون" کا لفظ ہے کہ اس کے معنی کم، زیادہ، قریب، دور اور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

اس کے علاوہ غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ علماء لغت نے دو سو سے زائد الفاظ ایسے جمع کیے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار اور پانچ معنی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض الفاظ ۲۵ معنی دینے والے بھی ہیں چنانچہ "خال" کا لفظ ۲۷ مفاہیم کو ظاہر کرتا ہے اور "عین" کا لفظ ۳۵ معانی کو اور عجوز کا لفظ ۶۰ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اسی طرح کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو دلنشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم وبیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے جسے مثل یا کہاوت کہتے ہیں مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور اس میں بڑا تنوع ہے۔ عربوں کو اپنے مخصوص طرز زندگی کی

وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کیے، ان نتائج کو حکمت و فلسفہ کی صورت میں، الفاظ کے ایسے خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا جو صوتی اثرات کے حسن و جمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بحرِ بیکراں تھے اور یہی قالب "ضرب الامثال"، یا کہاوتیں کہلائیں۔

غرض کہ عربی زبان ان گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے مختلف زمانوں کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی، مختلف قوموں اور ملکوں سے تعلق پیدا کرتی ہوئی، کبھی ان سے چھٹتی ہوئی، کبھی ان سے جڑتی ہوئی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اپنا دائرۂ اثر و عمل بڑھا رہی ہے۔

بقیہ: ادب کے موجودہ رجحانات

تو خریدی ہی ہوگی۔ جو لوگ واقعی کتابیں پڑھتے ہیں کوئی مصنف انھیں تحفہ نہیں دیتا۔

کتابوں کی فروخت میں کتابوں کے معیار کا مسئلہ بھی درمیان میں آجاتا ہے۔ کتابوں کا معیار اگر گر رہا ہے تو اس میں مصنف اور قاری دونوں کی کوششوں کو دخل ہے۔ مصنفین اور قارئین میں اس سے پہلے اتنی ہم آہنگی کبھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔

آخر میں آپ کی اجازت سے اپنے اس مضمون کے نقائص خود ہی بیان کردوں تو آپ مزید زحمت سے بچ جائیں گے۔ اس مضمون میں سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ اس میں اقتباسات نہیں ہیں۔ اقتباسات اور ان کا غلط ترجمہ بہت ضروری چیزیں ہوتی ہیں۔ بدیسی مال تو اس میں ہے ہی نہیں۔ یہ میرے مطالعے کے فقدان اور علم کی کوتاہی کا ثبوت ہے۔ اس مضمون کو میں دیسی مٹھائی بھی نہیں کہہ سکتا۔ پتہ نہیں اس میں کچھ ذائقہ ہے بھی یا نہیں۔ لیکن کبھی کبھی با میٹھے سے بھی شوق کرنا چاہیے۔ لذیذ نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ثقیل تو نہیں ہوگا۔

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

یادِ وجیہہ

وجیہہ الدین احمد خاں کے احوال، افکار اور آثار

مرتبہ: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں

سائز: ۱۸×۲۲/۸ حجم: ۲۱۸ صفحات

مطبوعہ: رام پور ۱۹۹۱ء

قیمت: قسم اول پچاس روپے قسم دوم تیس روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ نشر واشاعت مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ مسٹن گنج رام پور (یوپی) ۲۴۴۹۰۱

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں مرحوم سابق ریاست رام پور کے ایک مشہور و معروف عالم و مفکر اور ایک ہر دلعزیز و مقبول عوام و خواص واعظ و خطیب تھے۔ مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر ۱۲ رجون ۱۹۸۸ کو ان کے قائم کردہ مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ رام پور میں، ان کی یاد میں ایک سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں کہ مشاہیر نے مقالے پڑھے تھے۔ نیز ان کے انتقال کے موقع پر ان کے عقیدت مندوں نے جو تعزیت نامے بھیجے تھے اور نثر و نظم میں جو خراج عقیدت پیش کیا تھا، ان سب کو ان کے لائق نواسے ڈاکٹر شعائر اللہ خاں صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں شائع کر کے، نہ صرف یہ کہ اپنے خاندانی بزرگ، بلکہ ملک کی ایک برگزیدہ شخصیت کی یاد تازہ کر کے بزرگان دین اور کاملین کے عقیدت مندوں پر احسان کیا ہے، بلکہ اس کتاب کی اشاعت سے اردو کے خزانے میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

حضرت مولانا ۱۳ رجولائی ۱۸۹۹ء مطابق ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کو رام پور کے ایک مذہبی اور علمی خاندان میں پیدا ہوئے اور سنہ عیسوی کے لحاظ سے تقریباً ۸۸ سال اور سنہ ہجری کے مطابق لگ بھگ ۹۰ سال کی عمر میں، ۲۵ رجون ۱۹۸۷ء کو بروز جمعرات اپنے وطن مالوف میں انتقال فرمایا۔

مرحوم نے ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ اورینٹل کالج (مدرسہ عالیہ) رام پور سے فضیلت کی اور ۱۹۲۳ء میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلتِ حدیث کی سند حاصل کی۔ انھوں نے متعدد مدارس میں بحیثیت استاد اور مہتمم کے تدریسی اور مذہبی خدمات انجام دیں۔ نیز تقریباً آٹھ کتابیں اور تقریباً ۳۰ مضامین ان کی علمی یادگار ہیں جو اپنی عالمانہ

اور انفرادی خصوصیات کی وجہ سے قابلِ قدر اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ حضرت مولانا مرحوم کے ایک شاگردِ رشید مولانا عبدالباری خاں صاحب کے الفاظ میں " نہ صرف اردو بلکہ عربی اور فارسی میں بھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھلائے ہیں اور اصنافِ سخن نظم، غزل، قطعہ، رباعی، قصیدہ، نعت منقبت وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن آپ اپنی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے آپ نے اپنا کلام محفوظ نہیں رکھا" (صفحہ ۱۶۷)

حضرت مولانا مرحوم کو جماعتِ اسلامی ہند کی روش اور اس کے بعض خیالات سے اختلاف تھا لیکن طبیعت میں رواداری اور مزاج میں اعتدال تھا، اس لیے اس معاملے میں متشدد نہیں تھے۔ چنانچہ اس اختلاف کے باوجود جماعتِ اسلامی کے اس وقت کے امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سے ان کے بے تکلفانہ اور شگفتہ تعلقات تھے۔ چنانچہ مرحوم کے بارے میں سابق امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم اپنے مضمون میں جو زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

> " رام پور میں مولانا عام طور پر جماعتِ اسلامی کے ایک مخالف کی حیثیت سے متعارف رہے ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ ان کو جماعت سے بہت کچھ اختلاف رہا ہے، لیکن ہم نے ان میں ایک نمایاں فرق یہ محسوس کیا کہ جماعت پر ان کی تنقید (تنقیص نہیں) ہمیشہ پوری طرح سنجیدگی، شائستگی، اور حدودِ اعتدال کی پابند رہا کرتی تھی اور اس میں تنقیص یا بغض و عناد کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا اور ہم نے یہ بات صرف اپنے سلسلے میں محسوس نہیں کی ہے بلکہ ہمارے اپنے علم و اندازہ کے مطابق مولانا نے اپنے طریقۂ فکر سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ کبھی وہ انداز اختیار نہیں کیا، جس کو وقار اور شرافت کے خلاف سمجھا۔ اور اہلِ رام پور کے دلوں میں ان کے لیے جو عمومی جذبۂ عقیدت و محبت پایا جاتا ہے، میرے نزدیک اس میں بڑا دخل مولانا کے اسی شریفانہ اور پُر وقار رویے کا رہا ہے۔" (صفحہ ۴۳)

مولانا وجیہ الدین مرحوم جیسی ہمہ جہت اور اعلیٰ صفات کی شخصیتیں اس دورِ قحط الرجال میں بمشکل ملتی ہیں۔ اس لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ کتاب کی کتابت و طباعت اور کاغذ بہت اچھا ہے۔ اس لحاظ سے نیز حجم کے پیشِ نظر اس کی قیمت خاصی کم ہے جب کہ آج کل زیادہ قیمتیں مقرر کرنے کا رجحان بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔

(عبداللطیف اعظمی)

سالانہ قیمت
۳ روپے

ماہنامہ جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ مارچ ۱۹۹۲ء | شمارہ ۳

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کاتب: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

کئی ماہ تک جامعہ میں قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم کے پلاننگ کمیشن کے ممبر منتخب ہونے کے بعد شیخ الجامعہ کے منصب پر کون فائز ہو سکتا ہے! بالآخر یہ پُراسرار عقدہ فروری کے پہلے ہفتہ میں کھلا اور ۱۶ر فروری کو بشیرالدین احمد نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی قیادت سنبھال لی۔

پروفیسر بشیرالدین احمد کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ وہیں وہ پیدا ہوئے اور وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ درس و تحقیق میں ان کا خاص شغف رہا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تدریسی عملہ سے وہ وابستہ ہوئے اور چونکہ انھوں نے پولیٹیکل سائنس ہی میں تخصص حاصل کیا تھا لہٰذا اسی مضمون سے متعلق تدریس و تحقیق ان کا مشغلہ بن گیا۔ کچھ عرصہ بعد دکنی تہذیب کا یہ نمائندہ گنگا جمن کی وادی میں منتقل ہو گیا اور ہندوستان کا قلب دہلی ان کی علمی و تحقیقی جستجو کا مرکز بنا۔ دہلی میں وہ سنٹر فار اسٹڈی آف ڈیولپنگ سوسائٹیز سے منسلک ہوئے اور کچھ عرصے بعد اس سنٹر کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ جامعہ میں آنے سے قبل وہ دہلی میں ہی سنٹر فار پالیسی ریسرچ میں ریسرچ پروفیسر تھے۔ بشیر صاحب کا خاص دائرۂ تحقیق بین الاقوامی روابط ہیں، اس کے علاوہ ہندوستانی سیاست اور نسلی مطالعات سے متعلق عنوانات بھی ان کی تحقیقات کے موضوع رہے ہیں۔ وہ ایک باقاعدہ مصنف کی حیثیت سے ممتاز ہیں، ان کی کتابیں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں، ان کے مضامین بین الاقوامی شہرت کے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بعض غیر ملکی یونیورسٹیوں نے انھیں اپنی تعلیمی فیکلٹیوں سے وابستگی کا اعزاز دیا۔ مثلاً ایموری یونیورسٹیاں اور انسٹی ٹیوٹ آف پولیٹیکل اسٹڈیز اسٹنفورڈ اسی طرح کے ادارے ہیں جن سے بشیر صاحب وابستہ ہوئے۔

بشیر صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اول تا آخر عالم و محقق ہیں۔ اس لیے جامعہ میں ان کی آمد ایک اچھا شگون ہے

جامعہ کو کچھ برس پہلے ہی مرکزی یونیورسٹی کا درجہ ملا تھا۔ توقع کی جا رہی تھی کہ اب کوئی نیا علمی انقلاب بپا ہوگا او پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کی علمی روایت کا احیاء ہوگا۔ لیکن اس باب میں تشنگی رہی۔ بشیر صاحب چونکہ بنیادی طور پر دانشور ہیں اور جدید تحقیقات میں انھیں بیحد دلچسپی ہے۔ لہٰذا امید پھر بن رہی ہے کہ جامعہ میں علمی و تحقیقی انقلاب رونما ہوگا اور یونیورسٹی کی علمی، تحقیقی و تہذیبی زندگی میں عالم و محقق پیش پیش ہوں گے اور جامعہ کو علم و تحقیق کی دنیا میں پروقار جگہ ملے گی۔

بشیر صاحب ایک مصمم عزم کے ساتھ جامعہ میں داخل ہوئے ہیں۔ وہ اس کے شاندار ماضی سے واقف ہیں، اس کے سیکولر مزاج سے وہ مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں اور ساتھ ہی قوم و ملت کو اس ادارہ کے ذریعہ کیا دیا جا سکتا ہے اس کے بارے میں بھی ان کا ذہن بہت صاف ہے۔ وہ پرانے شعبوں کو مزید مستحکم کرنے او نئی سمتوں میں تحقیق و جستجو کو فروغ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بشیر صاحب کا نصب العین ہے ادارہ کو ایسی حیثیت دینا کہ وہ واقعی حقیقی معنی میں ادارہ لگے۔ ادارہ اسی وقت ادارہ بنے گا جب اس کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہوگی۔ کسی بھی درس گاہ میں استاد اور طلباء ہی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں او اسی لیے ان ہی سے تعلیمی اداروں میں اہم ترین رول ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ اسی لیے بشیر صاحب جامعہ کے اساتذہ کو اچھا استاد اور معیاری محقق دیکھنا چاہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک شخص اچھا استاد بھی ہو اور معیاری محقق بھی۔ لیکن اسے کم سے کم دونوں میں سے ایک ضرور ہونا چاہیے۔ آدرش صورت یہ ہوگی کہ وہ اچھا استاد ہو۔ یعنی پابندی سے اور محنت کرکے پڑھائے اور ہمہ وقت ریسرچ میں لگا رہے۔ اگر طلباء کو ایسا علمی ماحول مل جائے تو ان کی تمام پوشیدہ تعبیری صلاحیتیں اور تخلیقی قوتیں ابھر سامنے آئیں گی اور ان کی شخصیتوں میں چار چاند لگ جائیں گے۔ استاد اور طلباء اپنا رول صحیح طرح سے ادا کرتے رہے تو پورا ادارہ حقیقی معنی میں ادارہ ہی نظر آئے گا۔

ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے جامعہ کی ساکھ کو بحال کرنے اور مستحکم کرنے کے سلسلے میں شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد کے ہر اقدام کو جامعہ میں تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا اور تعمیری کوشش میں امید ہے انھیں جامعہ میں اور جامعہ کے باہر بھی اس ادارہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے وسیع حلقہ

سے تعاون ملے گا۔

ہم پروفیسر بشیر الدین احمد کو شیخ الجامعہ کا منصب سنبھالنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ادارہ کے لیے اُن کا خلوص ان کی کامیابی کا ضامن بنے۔

ہندوستانی مؤرخین کی ایک قدیم علمی انجمن ہے انڈین ہسٹری کانگریس۔ ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے تاریخ کے بیشتر اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز اس سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اور بھی بہت سے دانشور ہیں جو اس انجمن سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اس کا ایک سالانہ اجلاس ہوتا ہے جس میں افتتاحی جلسے کے بعد علیحدہ نشستوں میں قدیم، وسطی اور جدید عہد سے متعلق اپنی تحقیقات اہل علم پیش کرتے ہیں۔ انڈین ہسٹری کانگریس کا سال ۱۹۹۱ء کا اجلاس اجین (مدھیہ پردیش) میں ہونا تھا لیکن یہ اجلاس اُجین میں منعقد نہیں کیا جا سکا۔ اجین کے شعبۂ تاریخ کی صدر اور انڈین ہسٹری کانگریس کی انتظامیہ کے سربرآوردہ اراکین کی تمام کوششیں وہاں اجلاس کے انعقاد کرانے میں ناکام ہو گئیں۔ اجین ہندوستان کا ایک قدیم یادگار شہر ہے اس کے سینہ میں تاریخ کے گنجہائے گرانمایہ مدفون ہیں۔ اس لیے تاریخ کے حوالے سے علمی بحث کے لیے اجین سے زیادہ موزوں فضا کہاں ہو سکتی تھی لیکن جارحانہ فرقہ پرستی نے جدید مورخین کو اس قدیم تاریخی شہر میں علمی مجالس سجانے کے لیے خیمہ زن ہونے سے محروم رکھا لیکن جب مندوبین کو یہ معلوم ہوا کہ راجدھانی دہلی میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ غیاث پور کے قرب وجوار صوفی منش مغل شہنشاہ ہمایوں کے مقبرہ کے نزدیک اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے نمائندہ عبدالرحیم خانخاناں کی آخری آرام گاہ کے قریب بھارتیہ گرام میں انڈین ہسٹری کانگریس کا ۵۲ واں اجلاس ۲۱ تا ۲۳ فروری منعقد ہو گا تو ایسا محسوس ہوا کہ جس آلودگی سے مورخین کی اس انجمن کو محفوظ رکھنے کی ضرورت پیش آئی تھی اسے اب نہایت موزوں فضا مل گئی ہے۔

انڈین ہسٹری کانگریس کے اس اجلاس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے انعقاد اور میزبانی کا شرف جامعہ ملیہ اسلامیہ سمیت دہلی کی پانچ یونیورسٹیوں دہلی یونیورسٹی، جواہرلال نہرو یونیورسٹی،

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی اور جامعہ ہمدرد کو حاصل رہا۔ پہلی مرتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ انڈین ہسٹری کانگرس کے انعقاد میں سرگرمی سے عملی حصہ لے۔ صدر شعبہ پروفیسر رفاقت علی خاں کی قیادت میں شعبہ کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کے طلبا نے انتظامیہ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا اور میزبانی کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیے۔

۲۱ر فروری بروز جمعہ انڈین ہسٹری کانگرس کے ۵۲ ویں اجلاس کا افتتاح بھارتیہ گرام میں ہوا۔ افتتاحیہ اجلاسِ عام کی صدارت پروفیسر اے۔ آر کلکرنی نے فرمائی اور مہمان خصوصی تھے انسانی وسائل کے وزیر شری ارجن سنگھ۔ شری ارجن سنگھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ سیکولر اور آزاد ہندوستان کی تعمیرِ نو کے لیے ضروری ہے کہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تاریخ کی نئی توضیح پیش کی جائے اور تاریخ سے انسانوں کو جوڑنے کا کام لیا جائے۔ پروفیسر کلکرنی نے جو عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے ممتاز اسکالر شمار کیے جاتے ہیں، عہد وسطیٰ کے دکن میں دیہی برادری کے حوالے سے خطبۂ صدارت پیش کیا۔ یہ خطبہ نہایت جامع، علمی اور معلوماتی تھا۔ قومی ترانہ پر اس افتتاحی اجلاس عام کا اختتام ہوا۔

تاریخ کا سماجی رشتوں کو جوڑنے اور استوار کرنے میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ نوآبادیاتی عہد میں اور بعد ازاں منقسم ہندوستان میں تاریخ کو بانٹنے اور توڑنے کے لیے بھی باضابطہ ایک حربے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی اور سماجی فضا کو دیکھتے ہوئے ہم یہ بات پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ کی طرف اسکالرز کا سائنسی رجحان ہونا چاہیے جس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ ایسے معروضی طریقے سے سمجھی اور لکھی جائے کہ ہر قاری اس سے مطمئن ہو۔ انڈین ہسٹری کانگرس نے ہندوستانی تاریخ کے اس سائنسی مطالعہ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اس طرح اس علمی انجمن نے نہ صرف یہ کہ علم و تحقیق کی خدمت کی بلکہ سائنسی تاریخ نگاری کو فروغ دے کر مثبت اندازِ فکر اور طرزِ زندگی کو فروغ دینے میں بھی نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ انجمن تاریخی تحقیق کے حوالہ سے صرف علمی خدمت ہی انجام نہیں دے رہی ہے

سماجی ذمہ داری بھی نبھا رہی ہے۔

ملک و قوم کو ہمیشہ سے زیادہ اس وقت علمی جستجو میں سائنسی رجحان کی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت
۔ فسطائی قوتیں سیاست کے میدان میں فرقہ پرستی کا حربہ استعمال کر کے متحدہ ہندوستان کی شکل مسخ
نے کی طرف مائل ہیں۔ مذہبی احیائیت کو منفی سمت میں موڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فرقہ پرور
دں کو اپنی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تاریخ میں سائنسی طرز فکر اور معروضی انداز تحقیق میں نظر
ہی ہے۔ اسی لیے ان کی پوری کوشش ہے کہ انڈین ہسٹری کانگریس جیسے سائنسی اور معروضی علمی و
نیقی ادارہ پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ تاریخ کو مسخ کر کے اسے اپنے سیاسی عزائم اور مفادات کے تابع کیا جا
ہ۔ ایک متوازی ادارہ قائم کرنے کی ان کی کوششیں بے ثمر ثابت ہوئیں، سیاست کے مقابلہ میں علم
ا وسیع شعبہ ہے جہاں غیر علمی رویہ کا مظاہرہ کرنے والوں کی دال نہیں گل سکتی۔ علم معروضی رویہ
متقاضی ہے، یہی وہ حقیقت ہے جو تاسیس کے وقت سے ہی انڈین ہسٹری کانگریس میں موجود
اور مستقبل میں بھی اس کی بقا اسی علمی اور معروضی امتیاز میں مضمر ہے۔ موجودہ حالات میں انڈین
ری کانگریس کی ذمہ داری نہایت اہم اور نازک ہے۔ سیکولر اور متحدہ ہندوستان کی ہمہ جہت تعمیر
مت میں اسے اپنی سرگرمیاں تیز تر کرنی ہیں۔ فرقہ وارانہ منافرت، باہمی تصادم، مذہبی اور علاقائی
دگی پسندی کی جو آگ تاریخ اور علم تاریخ کے نام پر لگائی جا رہی ہے اس کی روک تھام کا فریضہ
خوش اسلوبی سے انجام دینا ہے۔ اس انجمن سے وابستہ اہل علم اور دانشور اس بات سے پوری
واقف ہیں کہ ٹھوس علمی اور معروضی تحقیقات کے ذریعہ ہی وہ اپنی اس ذمہ داری کو بہتر طریقے
نجام دے سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے میدان میں ٹھوس علمی تحقیقات میں
الا ثبات تاکہ غیر علمی اور بے بنیاد باتوں کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے۔

محمد بدیع الزماں

حاملِ قرآن ہونے کی ذمہ داریاں

حامل قرآن ہونے کی ذمہ داریوں سے بے توجہی برتنے پر ایک موقع پر رب کریم نے فرمایا ہے:۔

"اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر کبھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جارہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی حالت پر غور کریں" (سورۃ الحشر ۵۹ آیت ۲۱)

اس مثال سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی کبریائی اور اس کے حضور بندے کی ذمہ داری اور فرائض کو واضح طور پر بیان کر رہا ہے اس کا ادراک اگر پہاڑ جیسی عظیم مخلوق کو بھی نصیب ہوتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کو کس رب قدیر کے سامنے اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہونا ہے تو وہ بھی خوف سے کانپ اٹھتا۔ لیکن حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جو قرآنی تعلیمات کو سمجھتے ہیں پھر بھی ان پر کوئی خوف طاری نہیں ہوتا۔ اور نہ کبھی انھیں یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جو ذمہ داریاں ان پر عائد کی گئی ہیں ان کے بارے میں وہ اپنے خدا کو کیا جواب دیں گے۔

حامل قرآن کی حیثیت سے انسان کو بار امانت کا احساس دلاتے ہوئے ایک موقع پر اس طرح آگاہ کیا گیا ہے:۔

"ہم نے اس بار امانت کو آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا، بے شک

جناب محمد بدیع الزماں، ہارون نگر، فرسٹ سیکٹر، پھلواری شریف۔ پٹنہ، ۸۰۱۵۰۵۔

وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے (اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا) (اس بار امانت کو اٹھانے
کا لازمی نتیجہ ہے) "تاکہ اللہ منافق مردوں اور عورتوں، اور مشرک مردوں اور عورتوں
کو سزا دے اور مومن مردوں اور عورتوں کی توبہ قبول کرے، اللہ درگذر فرمانے
والا اور رحیم ہے"۔ (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ رکوع ۹)

ان آیات سے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے اور اس حیثیت میں ہوتے ہوئے اگر وہ دنیا کی زندگی کو محض ایک کھیل سمجھ کر بے فکری کے ساتھ غلط رویّہ اختیار کرتا ہے تو کس طرح اپنے ہاتھوں خود اپنا مستقبل خراب کرتا ہے۔

اس جگہ "امانت" سے مراد "خلافت" ہے جو قرآن مجید کی رو سے انسان کو زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طاعت ومعصیت کی جو آزادی بخشی ہے اور اس آزادی کو استعمال کرنے کے لیے اسے اپنی بے شمار مخلوقات پر تصرّف کے جو اختیارات عطا کیے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے اختیاری عمل کا ذمہ دار قرار پائے اور اسی لیے قرآن نازل کیا گیا تاکہ وہ اس "امانت" کے معاملے میں اپنے صحیح طرزِ عمل پر اجر کا اور غلط طرزِ عمل پر سزا کا مستحق بنے۔ جس شخص کو اس امتحان گاہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں وہ اپنی اور اپنے ساتھ بہت سے دوسرے لوگوں کی تباہی کا سامان کر رہا ہے۔

جس بار امانت کو زمین اور آسمان نے اٹھانے سے انکار کر دیا اسے اشرف المخلوقات انسان نے قبول کر لیا۔ اقبال نے اپنی نظم "انسان اور بزمِ قدرت" میں اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے

میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے　　بار مجھ سے جو نہ اٹھا، وہ اٹھایا تو نے

"بانگِ درا" ہی کی غزلیات حصّہ اوّل کی ایک غزل کے درج ذیل شعر میں "ظَلُوْمًا جَهُوْلًا" کی تلمیح کی گئی ہے ؎

سختیاں کرتا ہوں دل پر، غیر سے غافل ہوں میں
ہائے کیا اچھی کہی، ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

وحدہٗ لاشریک نے کل کائنات میں مسلمانوں کو اور خصوصاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم

مرتبہ عطا کیا اور قرآن جیسی عظیم کتاب نازل کی اور مسلمانوں کو اس کتاب کا وارث بنایا۔

"پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنا دیا ان لوگوں کو جنھیں ہم نے (اس وراثت کے لیے) اپنے بندوں میں چن لیا۔" (سورۃ فاطر ۳۵ - رکوع ۴)

اپنے بندوں میں یہ وراثت مسلمانوں کو سونپنے کے لیے منتخب کیے جانے کی وجہ بھی بتائی گئی ہے:-

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ (خَیْرَ اُمَّۃٍ) تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (سورۃ آل عمران ۳ - رکوع ۱۲)

حاملِ قرآن سے خدا تعالیٰ کا مقصد قرآن کے الفاظ کی محض قرأت نہیں بلکہ اس طرح اس کی تلاوت کرنا ہے کہ اس کا حق ادا کیا جا سکے۔ ربّ کریم نے قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا ہے:-

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب (یعنی قرآن) دی ہے وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے (یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ) وہ اس پر سچے دل سے ایمان لے آتے ہیں، اور جو اس کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کریں، وہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲ - آیت ۱۲۱)

جس نے قرآن کی اس طرح تلاوت کی جیسا کہ اس کا حق ہے وہی دراصل حاملِ قرآن ہے اور وہی صحیح معنوں میں مومن ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے لیے اعتقاد کی پختگی کے ساتھ ژرف نگاہی کا ہونا ضروری ہے۔

"دراصل یہ (قرآن) روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنھیں علم بخشا گیا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔"

(سورۃ العنکبوت ۲۹ - آیت ۴۹)

اقبالؔ نے اسی مفہوم کو "بالِ جبریل" کی غزل نمبر ۶۰ میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

[redacted]

ان آیات سے رسول اللہؐ کو یہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ قرآن اپنی دعوت سے انسان کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹتا جو دنیا پرست اور خواہشِ نفس کے بندے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گرد جمع کرتا ہے جن کی نظریات دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے اور حاملِ قرآن ہونے کی بنا پر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوتا ہے اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز رہتے ہیں۔

اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانے کا نتیجہ ہے کہ آدمی کے دل پر قفل پڑھ جائیں اور اس کے کان اس دعوت کے لیے بند ہو جائیں جو قرآن پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی تو دعوت ہی اس بنیاد پر ہے کہ دنیا کی زندگی کے ظاہری پہلو سے انسان دھوکہ نہ کھائے۔ یہ بالکل ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو شخص سرے سے آخرت ہی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے اور جس کا سارا اعتماد اسی دنیا کے مظاہر اور محسوسات و تجربات پر ہے، وہ کبھی قرآن کی دعوت کو قابلِ التفات نہیں سمجھ سکتا۔ ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ:۔

"جب تم قرآن پڑھتے ہو تو ہم تمھارے اور آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کے درمیان ایک پردہ حائل کر دیتے ہیں اور اُن کے دلوں پر ایسا غلاف چڑھا دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں"۔
(سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ رکوع ۵)

حاملِ قرآن بن کر اس پر عامل بہ عمل ہونے والوں اور اس سے مُنہ موڑنے والوں کو علی الترتیب اس کے فوائد اور نقصانات سے ایک موقع پر اس طرح آگاہ کیا گیا ہے:۔

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا"۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۸۲)

یعنی جو لوگ اس قرآن کو اپنا رہنما اور اپنے لیے کتابِ آئین مان لیں ان کے لیے تو یہ خدا کی رحمت اور ان کے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی اور تمدنی امراض کا علاج ہے، مگر جو ظالم اسے رد کر کے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر آپ ظلم کریں اُن کو یہ قرآن

اس حالت پر نہیں رہنے دیتا جس پر وہ اس کے نزول سے پہلے، یا اس کے جاننے سے پہلے تھے بلکہ یہ الٹا انھیں اس سے زیادہ خسارے میں ڈال دیتا ہے اس لیے کہ جب قرآن اُن کے سامنے آگیا اور اس نے حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا تو ان پر خدا کی حجّت تمام ہوگئی۔ یہی بات ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک نہایت مختصر سے بلیغ جملے میں بیان فرمائی ہے کہ:

"قرآن یا تو تیرے حق میں حجّت ہے یا پھر تیرے خلاف حجت"

خدائے تعالےٰ نے جنّت کی بشارت صرف اس کتاب پر ایمان لانے کی وجہ سے نہیں دی ہے بلکہ اس کے مطابق اپنے اعمال درست کرنے کی بنا پر۔ لہٰذا فرمایا گیا:۔

"اور اے پیغمبر، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کرلیں، انھیں خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی" (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳)

اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدّنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آہی نہیں سکتے اور وہ حامل قرآن ہونے کی ذمہ داریاں ادا نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ کوئی فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہوسکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بتائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔ قرآن کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں وہ بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہوجانا، اللہ کی کتاب تک ہماری رسائی اور ہمارے حاملِ قرآن ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ حاملِ قرآن کہلانے کا مستحق وہ ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔

حاملِ قرآن ہونے کی ذمہ داریاں خود اپنی ذات پر ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے واجبات کو دوسروں کو بھی بتلائے جانے کی ذمہ داری ان پر عائد کی گئی

"تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"
(سورۃ آل عمران ۳۔ آیت ۱۰۴)

حجۃ الوداع ۱۰ھ کے موقع پر رسول اللہ نے میدان عرفات میں ۱۰ ذی الحجہ کو فرمایا:۔

"لوگو سنو، میرا خیال ہے کہ ہم اور تم پھر کبھی اس جگہ جمع نہ ہو سکیں گے ..... میں تم میں وہ چیز چھوڑ جاتا ہوں کہ اگر تم اسے مضبوط پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ قرآن ہے، اللہ کی کتاب ..... قیامت کے دن تم سے میرے بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم کیا جواب دو گے۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ: "ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیے آپ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔" (اس گواہی کے وقت) خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت کی انگلی کو آسمان کی طرف اٹھایا اور پھر لوگوں کی طرف جھکایا اور فرمایا: "اے اللہ تو سن لے، تیرے بندے کیا کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ تو گواہ رہنا کہ یہ لوگ کس بات کی گواہی دے رہے ہیں۔ اے اللہ تو شاہد رہ کہ یہ سب کس بات کا اقرار کر رہے ہیں۔" اور فرمایا: "تم لوگ جو حاضر ہو وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں ان کی تبلیغ کرتے رہو، ممکن ہے کہ بعض سننے والے لوگوں سے زیادہ تر وہ اس کلام کو یاد رکھنے والے اور حفاظت کرنے والے ہوں جن پر تبلیغ کی جائے۔"

حامل قرآن ہونے کے سلسلے میں شیطان کی شیطنت کی طرف بھی توجہ ضروری ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

"پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان رجیم سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ اُسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔ اُس کا زور تو انھیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو اپنا سرپرست بناتے اور اس کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں۔" (سورۃ النحل ۱۶۔ رکوع ۱۳)

مسلمانوں کی روحانی کمزوریوں اور شیطان کی گمراہی کے پیشِ نظر اقبال نے "ارمغان حجاز" میں نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اُمت کو متنبّہ کیا ہے کہ ابلیس کے اس عزم کو ہمیشہ سامنے رکھا جائے کیوں کہ اس مجلس میں جب ایک مشیر نے کہا ؎

میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

تو ابلیس پر نہ کوئی خوف طاری ہوا اور نہ اس نے امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑا بلکہ اس نے یہ کہہ کر اپنے مشیروں کی ہمت بڑھائی ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

مومن کی پہچان قرآن میں مختلف طریقوں سے مختلف مواقع پر بیان فرمائی گئی ہے اور ان ارشادات کے پیشِ نظر رسول اللہ نے ایک مومن کی پہچان صرف اس کا "حامل قرآن" ہونا بتایا ہے چنانچہ فرمانِ نبوی ہے کہ

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔"

قرآنی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل پیرا ہونا اور صراطِ مستقیم پر چلنا ہی دراصل حاملِ قرآن ہونا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔"

[redacted]

عبدالوحید حسینی

میر خلیل الرحمٰن، دہلی اور پرانی یادیں

ہر بڑے آدمی کی چند کمزوریاں ہوتی ہیں، میر خلیل الرحمٰن صاحب کی کمزوری دہلی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی منتقل ہوگئے لیکن ان کا دل دہلی میں اٹکا رہ گیا۔ لال کنواں، حوض قاضی، بلی ماران، مدرسہ مسجد فتحپوری اور دریا گنج کی وہ گلیاں جہاں کھیل کود کر وہ جوان ہوئے کبھی ان کے دل سے فراموش نہ ہوسکیں۔

۱۹۸۲ء میں جب دہلی میں ایشیائی کھیل منعقد ہونے لگے تو میر صاحب نے مجھے بلایا۔ میں اس وقت کراچی میں کھیلوں کے شعبہ کا انچارج تھا۔ میر صاحب کا ایک مخصوص جملہ تھا "میاں کچھ کام کرلو یار" اس دن بھی انھوں نے گفتگو کی ابتدا اسی جملے سے کی پھر کہا "بھائی دہلی میں ایشین گیمز ہو رہے ہیں وہاں چلے جاؤ لیکن بھائی ذرا یہ پتہ کرتے آنا وہاں اگر ہم اپنا نمائندہ مقرر کریں تو کیا کرنا ہوگا اور اخراجات کتنے ہوں گے۔"

تین سال کی بھاگ دوڑ اور تگ و دو کے بعد میر صاحب مختلف وزارتوں اور محکموں سے بالآخر یہ اجازت لینے میں کامیاب ہوگئے کہ روزنامہ جنگ اپنا نمائندہ دہلی بھیج سکتا ہے جس وقت میں دہلی کے لیے روانہ ہو رہا تھا میر صاحب کی خوشی قابل دید تھی۔ جانے کے تمام انتظامات انھوں نے اپنی نگرانی میں مکمل کرائے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود نمائندہ خصوصی بن کر دہلی جا رہے ہوں۔

دہلی میرے لیے اجنبی شہر تو نہیں تھا لیکن پاکستان بھارت کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور گرانبار

جناب عبدالوحید حسینی، نمائندہ خصوصی، روزنامہ جنگ، ۱۵۳ ذاکر باغ، اوکھلا روڈ نئی دہلی ۲۵

ذمہ داریوں کے احساس نے مجھے قدرے خوفزدہ کر رکھا تھا تاہم چند ہی روز میں معلوم ہو گیا کہ یہاں تو ہر شخص میر صاحب سے واقف ہے۔ ان کے دوستوں، بہی خواہوں اور چاہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے درمیان رہتے ہوئے مجھے یہ احساس کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ میں دیارِ غیر میں ہوں۔

میر صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ دہلی سے بھی روزنامہ جنگ کا دوبارہ اجرا ہو۔ اکثر ٹیلی فون پر بات ہوتی تو وہ پوچھتے "بھائی دہلی کا کیا حال ہے؟ میاں وہاں سے اخبار نکل سکتا ہے یا نہیں؟" میں نے کہا میر صاحب دہلی سے جنگ دوبارہ نکلے گا تو اس کی اشاعت پاکستان سے کہیں زیادہ ہو گی، یہاں تو لوگ اردو کے نام پر جان بھی دینے کے لیے تیار ہیں۔ کوشش تو بہت کی گئی لیکن دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کا اتار چڑھاؤ دہلی سے جنگ نکالنے کے راستے میں ہمیشہ آڑے آگیا، جب اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی تو میر صاحب نے چاہا کہ دونوں ممالک کے درمیان اخبار و رسائل کا تبادلہ ہو سکے تاکہ پاکستان سے جنگ بھارت بھیجا جا سکے۔ ۱۹۸۸ء میں دونوں حکومتوں کے مابین اصولی طور پر طے ہو گیا کہ اخبارات و رسائل کا تبادلہ ہو گا۔ افسوس کہ اس معاہدے کی فائلیں آہستہ آہستہ حکام کی میزوں پر کاغذ کے انبار تلے دب گئیں۔

دہلی سے میر صاحب کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ باوجود شدید مصروفیات کے وہ دہلی سے بھیجی جانے والی تمام خبریں خود دیکھتے اور ایڈیٹوریل کے عملے کو تاکید کرتے کہ دیکھو بھائی دہلی سے خبر آئی ہیں یار اخبار میں ذرا اچھی طرح لگانا۔ میں جب بھی دہلی سے کراچی آتا تو میر صاحب اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر دہلی کا تذکرہ سنتے اور اپنے دوستوں کے بارے میں استفسار کرتے۔ میں ان سے کہتا میر صاحب آپ ایک بار دہلی آئیں نا... وہاں اتنے سارے لوگ آپ کے منتظر ہیں، وہ کہتے ہاں بھائی ذرا یہاں کے سے چھٹکارا ملے تو ضرور آؤں گا۔ میر صاحب کو دہلی بلوانے کا سہرا اردو کانفرنس کے بانی جناب علی صدیقی کے سر بندھا۔ علی صدیقی نے انھیں اس کانفرنس میں اردو صحافت کی خدمات انجام دینے پر "قلمی قط ایوارڈ" دینے کا اعلان کیا۔

میر صاحب اپنی اہلیہ کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ فروری کا مہینہ تھا اور سال تھا ۱۹۸۸ء۔ دہلی ایر پر جب منتظمین کے ہمراہ نمائندہ جنگ نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھیں کہا کہ میر صاحب آ دہلی کی محبت آپ کو کھینچ ہی لائی تو بے ساختہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر زور سے ہنسنے کہنے لگے

[redacted]

"دیکھو بھائی، اللہ نے آخر یہاں پہنچا ہی دیا" اردو کانفرنس میں میر صاحب کے دہلی کے پرانے تمام ہی احباب ان سے ملنے آئے۔ میر صاحب انتہائی گرمجوشی اور والہانہ انداز میں ہر ایک سے گلے ملتے اور بات کچھ یوں شروع ہوتی "کہو بھائی خلیل کیا حال ہے، یار تم تو ویسے ہی جوان ہو جیسے ۴۷ء میں تھے۔ پاکستان کی ہوا تمھیں خوب راس آئی ہے۔"

میر صاحب کے دوست یوں تو دہلی میں بے شمار تھے لیکن نئی دہلی کی جامع مسجد کے قاری ادریس صاحب ان کے محلے کے پڑوسی مولانا انیس الحسن ہاشمی، صحافی عزیز حسن بقائی سے ماضی کا تذکرہ چھیڑا تو میر صاحب دنیا و ما فیہا سے بیگانہ ہو گئے، انھیں یہ خیال ہی نہیں رہا کہ اہلیہ برابر میں کھڑی ہیں اور کانفرنس کے مندوبین شرکاء اور منتظمین اس انتظار میں ہیں کہ یہ حضرات ماضی سے لوٹیں تو انھیں حال اور مستقبل کا احساس دلایا جائے۔

دہلی میں قیام کے دوران ایک صبح ایک مہتا صاحب اپنی اہلیہ پروین کے ہمراہ تشریف لائے اور انھوں نے میر صاحب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ پروین کے والد مسٹر سکھدیو پرشاد اور میر صاحب طالب علمی کے دوران لال کنویں کے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔ سکھدیو پرشاد گورنمنٹ کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر ان دنوں چندی گڑھ میں مقیم تھے۔ میر صاحب نے اپنے دوست کی بیٹی سے ان کے والد کی خیریت دریافت کی جب ہم مہتہ صاحب کے گھر پہنچے تو دروازہ کھولنے والا شخص قد میں میر صاحب سے بھی سے کچھ نکلتا ہوا، رنگت سرخ و سپید اور جاذب نقوش کا مالک تھا۔ میر صاحب اس کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ دونوں کے منہ سے چند لمحات تک کچھ نہ نکلا، دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے دروازے میں ہی بغل گیر ہو گئے۔ مسز پروین نے بتایا یہ ہیں میرے والد سکھدیو پرشاد۔ یہ بیمار ہیں انھیں شوگر ہے چارپائی پر لیٹے رہتے ہیں لیکن جب پتہ چلا کہ میر صاحب دہلی آئے ہوئے ہیں تو بضد ہو گئے کہ چندی گڑھ سے دہلی چلیں گے۔ اس موقع پر میر صاحب نے ایک دلچسپ قصہ سنایا۔ میر صاحب اور سکھدیو پرشاد صاحب کی مشترکہ ملکیت ایک سائیکل اور کوٹ ہوا کرتا تھا۔ طے یہ تھا کہ جو شخص کوٹ پہنے گا وہ سائیکل نہیں لے جائے گا۔ سکھدیو پرشاد صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے مداخلت کی اور کہا "خلیل تم بڑے شرارتی تھے تم ہمیشہ کوٹ پہن جاتے تھے اور سائیکل بھی لے جاتے تھے۔"

دہلی سے میر صاحب کو لگاؤ بے حد تھا لیکن اس لگاؤ کی خاطر انھوں نے اصولوں سے سمجھوتہ کبھی

نہیں کیا۔ ایک بار میر صاحب دہلی آئے تو بھارت کی وزارت خارجہ کے ترجمان مسٹر پارتھا سارتھی نے
ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا۔ پارتھا سارتھی دہلی میں پوسٹنگ سے پیشتر کراچی میں قونصل جنرل رہ
چکے تھے۔ گفتگو کے دوران مسٹر پارتھا سارتھی نے جب مرحوم صدر ضیاء الحق پر الزام لگایا کہ وہ بھارت
میں تخریبی سرگرمیوں کی پشت پناہی کرتے تھے تو میر صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انھوں نے کہا
پارتھا سارتھی صاحب آپ بھی ان انتہا پسند لوگوں میں شامل ہو گئے جو انڈیا میں بیٹھ کر پاکستانی لیڈروں کو
گالیاں دیتے ہیں" اس پر پارتھا سارتھی نے کچھ اس قسم کی بات کی کہ آپ کا بھی تعلق دہلی سے رہا
ہے۔ آپ حکومت ہند کے موقف کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں" تو میر صاحب نے کہا "میرا وطن اب
پاکستان ہے، اللہ نے جو کچھ مجھے دیا ہے وہ سب پاکستان کا ہے۔ دہلی سے مجھے بے شک محبت ہے
لیکن دہلی میں بیٹھ کر کوئی پاکستان کو برا بھلا کہے یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میں اپنی بساط کے
مطابق اپنے اخبار کے ذریعے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانے اور ایک دوسرے کو قریب تر لانے
کی جدوجہد کر رہا ہوں، اسی جدوجہد میں مجھے بڑی کامیابی اس وقت ملے گی جب میں آپ جیسے حضرات کا
پاکستان کے بارے میں رویہ تھوڑا سا بھی بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں" یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا
اعتراف بھارت کے موجودہ سکریٹری خارجہ مسٹر جوتیندر ناتھ ڈکشٹ، فلم اسٹار شترو گھن سنہا، دہلی کی جامع
کے شاہی امام جناب عبداللہ بخاری، سابق وزیر اعظم مسٹر وشوا ناتھ پرتاپ سنگھ اور دیگر سیاست دانوں نے
میر صاحب کے انتقال پر اپنے تعزیتی پیغامات میں کیا۔ خارجہ سکریٹری مسٹر ڈکشٹ نے کہا کہ میر صاحب بھارت
پاک دوستی کے ایک بڑے علم بردار تھے۔ بھارت کے سیاسی، صحافتی اور عوامی حلقوں نے دہلی میں جنگ کے
دفتر ٹیلی فون کر کے کہا کہ دیگر اخبارات کے برعکس جنگ نے بھارت کے بارے میں کبھی بھی مبالغہ آمیز خبریں شا
نہیں کیں۔ اس اخبار کا رویہ ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا۔

دہلی میں تقرر کے بعد روانگی کے موقع پر میں جب میر صاحب سے بریفنگ لینے کے لیے گیا تو انھوں نے
کہا "بھائی بریفنگ کیا کرنی بس یہ خیال رکھنا کہ تم پاکستانی ہو اور پاکستان کا مفاد سب سے مقدم اور برتر
ہے۔ یہ قطعی ضروری نہیں کہ تمہاری رپورٹوں سے اینٹی انڈیا رویہ جھلکے، بھائی جو سچ ہو وہ لکھنا اور اس
معاملے میں کسی کے بھی دباؤ میں نہ آنا۔"

دہلی کے باسی بڑے ہی روایت پرست اور تہذیبی اقدار پر جان دینے والے ہیں۔ شیخی یا شیر پلاؤ

کا شیوہ نہیں، تکلف وتصنع کا غلاف اپنے اوپر نہیں چڑھاتے، سادہ رہتے ہیں اور سادگی پسند کرتے ہیں۔ دہلی میں قیام کے دوران ایک محفل میں جب میر صاحب کی اہلیہ نے کہا کہ ان کے بڑے صاحبزادے جاوید رحمٰن کو گرمی بہت لگتی تھی اس لیے انھوں نے ایرکنڈیشنر لگوا رکھا تھا تو حاضرین کو حیرت ہوئی بھلا قیام پاکستان سے قبل دہلی کی قدیم بستیوں میں کس کے گھر ایرکنڈیشنر لگا ہوا ہوگا۔ میر صاحب کی اہلیہ نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا کہ سخت گرمیوں کے موسم میں فرش پر پانی چھڑک کر خرفہ کے ساگ کی پتیاں بچھا دیتی تھیں اس پر اپنا دوپٹہ گیلا کرکے اڑھا دیتی تھیں اس پر پنکھا جھل لیتیں، بس ایرکنڈیشنر تیار ہوجاتا تھا۔

روزنامہ جنگ دہلی سے کب اور کن حالات میں شروع ہوا اس کے بارے میں متضاد بیانات موجود ہیں خود میر صاحب نے ہم لوگوں کو بتایا کہ جنگ دہلی سے ۱۹۳۹ء میں شروع ہوا۔ اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوچکی تھی۔ اردو میں اس وقت کوئی اخبار شام کا ایسا نہ تھا جس میں لڑائی کی تازہ ترین خبریں موجود ہوں۔ میر صاحب نے عشرت وارثی اور چند دیگر احباب کی مدد سے اخبار نکالنے کا پروگرام بنایا۔ نیوز ایجنسی سے خبریں لینا ممکن نہ تھا کیونکہ اس کے لیے رقم درکار تھی۔ میر صاحب کہیں سے ایک پرانا مرفی ریڈیو لے آئے۔ اس پر دنیا کے تمام بڑے بڑے اسٹیشنوں کو ٹیون کرکے خبریں سنی جاتی تھیں۔ خبروں کی ایڈیٹنگ، کانٹ چھانٹ، ترتیب وتدوین، حتیٰ کہ کتابت بھی میر صاحب ہی کرتے تھے۔ سہ ورقہ اخبار چھپتا تھا اور قیمت تھی صرف ایک پیسہ ... لگن سچی ہو تو پھر خدا کی مدد شامل حال ہوجاتی ہے۔ جنگ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس وقت دہلی میں روزنامہ انجام کا طوطی بولتا تھا میر صاحب اور ان کے احباب کی محنت رنگ لائی اور جلد ہی جنگ دہلی کا صفِ اول کا اخبار بن گیا۔

دہلی کے جن قدیم خاندانوں سے میر صاحب کے مراسم تھے ان میں شمع میگزین کے بانی جناب یوسف دہلوی اور ان کے صاحبزادگان یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی شامل تھے۔ یوسف دہلوی صاحب کے انتقال پر میر صاحب دہلی آئے۔ ان کے گھر جا کر تعزیت کی اور یوسف صاحب کے بارے میں جتنا مواد اور معلومات مہیا ہوسکتی تھیں وہ فراہم کیں۔ میر صاحب نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ جو معلومات ان کے پاس ہیں وہ کسی دوسرے اخبار یا میگزین کو نہ ملیں۔ ہمدرد دواخانہ کے حکیم سعید کے برادرِ بزرگ حکیم عبدالحمید وضع داری اور روایات پرستی میں دہلی میں ایک انسٹی ٹیوشن تصور کیے جاتے ہیں لیکن حکیم عبدالحمید صاحب

تسلیم کرتے ہیں کہ میر صاحب نے وضعداری میں دہلی کے بڑے بڑے بزرگوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔

جگدیش آنند دہلی کے ایک بڑے فلم ڈسٹری بیوٹر تھے۔ قیام پاکستان سے قبل ان کا وہاں لاکھوں کا بزنس تھا۔ اخبارات کو فلم کے اشتہار دیا کرتے تھے۔ میر صاحب بھی اشتہار لینے کے لیے ان کے دفتر جایا کرتے تھے۔ اکثر مرتبہ ایسا ہوا کہ جگدیش آنند کی مصروفیت کے سبب میر صاحب کو گھنٹوں انتظار کرنا پڑا۔ پاکستان آنے کے بعد جنگ کی اشاعت بفضل تعالیٰ لاکھوں میں پہنچ گئی لیکن میر صاحب کی وضعداری میں فرق نہیں آیا وہ تب بھی جگدیش آنند کے لڑکوں سے ملنے کے لیے کراچی میں ان کے دفتر خود جاتے تھے۔

دہلی میں جن لوگوں سے ایک بار تعلق قائم ہوا میر صاحب نے دہلی چھوڑنے کے بعد بھی ان سے مراسم برقرار رکھے۔ ویسٹن ٹی وی کے مالکان کی فیملی میں شادی ہوئی تو میر صاحب نے مع اپنی اہلیہ اور بچی کے دہلی آ کر اس تقریب میں شرکت کی۔

میر صاحب سے ان کے احباب کو کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انڈیا کی ایڈورٹائزنگ ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر وشوا ناتھ نے دہلی میں ہونے والی ایک ایڈورٹائزنگ کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں دیا جانے والا استقبالیہ اس وقت تک شروع نہیں کیا جب تک میر صاحب اس میں شرکت کے لیے دہلی ایئرپورٹ سے براہ راست فنکشن میں نہیں پہنچے۔ کراچی سے دہلی پہنچنے والی فلائٹ اس روز دو گھنٹے تاخیر سے آئی لیکن ڈاکٹر وشوا ناتھ نے کہا ہم یہ فنکشن اسی وقت شروع کریں گے جب میر صاحب یہاں آ جائیں۔

میر صاحب اپنے پرانے دوستوں کے سامنے سراپا عجز و انکسار تھے تو اپنے عملے سے بھی انھیں اتنی ہی محبت تھی جتنی غالباً اپنے بچوں سے، اپنے اسٹاف کے دکھ سکھ میں وہ اپنی طبیعت کی ناسازی کے باوجود شریک ہوتے تھے لیکن کام کے معاملے میں ان سے رعایت کا حصول ممکن نہ تھا وہ اگر یہ سمجھتے کہ کوئی شخص کسی خاص کام کے لیے موزوں ہے تو پھر اپنا فیصلہ بدلتے نہ تھے۔ دہلی میں ناوابستہ ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس تھی۔ میر صاحب نے نمائندہ جنگ کا نام اس کانفرنس کی کوریج کے لیے متعلقہ وزارت کو بھیج دیا اس کے بعد ان کی صاحبزادی گل افشاں کا نیویارک سے ٹیلی فون آیا انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ چونکہ اس سے پہلے ہوانا میں ہونے والی سربراہ کانفرنس کی رپورٹنگ وہ کر چکی ہیں۔ لہٰذا دہلی کانفرنس

کے لیے بھی انھیں نامزد کر دیا جائے میر صاحب نے جواب دیا "میں نے اپنے دفتر کے ایک صاحب کا نام بھیج دیا ہے۔ وہی اس کانفرنس کی کوریج کریں گے اگر آپ کو دہلی جانا ہو تو چلی جاؤ لیکن بحیثیت رپورٹر تو نہیں۔"

میر صاحب کو غالباً اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تا دیر ہمارے ساتھ نہیں رہیں گے۔ انھوں نے کام سمیٹنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ انتقال سے دو ماہ پیشتر کراچی میں ہونے والی ایک ملاقات میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا "بھائی اب میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی میں چاہتا ہوں دہلی میں اپنے دوستوں سے مل لوں" انھیں اپنی جوانی کے دوست سکھدیو پرشاد سے دوبارہ ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ میر صاحب کی اہلیہ نے کہا یہ ایسے خود سے نہیں جائیں گے آپ انھیں زور زبردستی لے جائیں۔ افسوس کہ دست اجل نے انھیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ ایک بار پھر اس شہر کی گلیوں میں جاتے جن کی یاد انھیں ناموافق حالات میں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتی تھی۔

میر صاحب کی مغفرت کے لیے دعا کی خاطر اٹھنے والے ہاتھوں میں ان کے دہلی کے ان دوستوں اور احباب کے ہاتھ بھی شامل ہیں جنھیں مقدرات نے جسمانی طور پر تو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا لیکن ہزاروں میل کی یہ دوری ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکی۔

عظیم الشان صدیقی

نیا معاشرہ — نیا اردو افسانہ

نیا اردو افسانہ اپنے آغاز سے ہی متنازع فیہ رہا ہے اور اسے متنازع فیہ ہونا بھی چاہیے۔ ادب میں فکر و احساس، اظہار اور اسلوب کی سطح پر اختلاف اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ہمارا سماج جمود میں مبتلا نہیں ہے اور تغیر و تبدیلی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ فرد کے تجربے اور احساس کی سطحیں مختلف ہو گئی ہیں ایسی صورت میں فکر و نظر اور اظہار کی سطح پر اختلاف کوئی تعجب کی بات نہیں ہے البتہ اردو افسانے کے پس منظر میں تعجب کا ایک پہلو ضرور موجود ہے۔ افسانے میں جس عجلت سے اور جتنی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں، افسانے کی تنقید نے اسی شدت سے سرد مہری کا اظہار کیا ہے۔ آخر اس غفلت کا سبب کیا ہے۔ کیا نیا اردو افسانہ توقعات اور معیار سے کم تر ہے کیا اس میں فرد اور سماج کا عکس واضح نہیں ہے یا پھر افسانے اور قاری کے درمیان کوئی گہری خلیج حائل ہے۔

جہاں تک عام قاری کا سوال ہے وہ افسانہ کو لائٹ لٹریچر اور ہلکا پھلکا ادب تصور کرتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول کے حوالے سے زندگی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے وہ افسانہ کے ساتھ طویل اور پُرخار وادیوں کا سفر کرنے کے لیے بھی تیار ہے لیکن اس کا محدود وقت اور فرصت کے چند لمحات خشک فلسفیانہ گتھیوں، وجود اور عدم وجود کی تلاش، لاشعور بھول بھلیوں، گنجلک خوابوں اور ژولیدہ بیانی کے متحمل نہیں ہو سکتے ہیں اس لیے وہ افسانہ کو بھاری پتھر یا غیر افسانوی شے سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

قاری کی اس عدم دلچسپی کے بارے میں عام افسانہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ محض افسانہ تخلیق کرتا ہے۔ قاری کے مذاق کی تربیت تنقید کا کام ہے۔ لیکن افسانے کے بارے میں تنقید کا رویہ واضح نہیں ہے۔ وہ افسانہ کو مردہ یا کلاسیکل ادب کی محض ایک صنف یا اس سے بھی کم تر شے تصور کرتی ہے جب کہ افسانہ ادب کی زندہ اور متحرک صنف ہے جو زیادہ توجہ محنت اور ذہانت کا مطالبہ کرتا ہے لیکن تنقید حقیقی پس منظر میں افسانہ کی تفہیم سے محروم ہے اور مفروضہ و مستعار تصورات و نظریات کو اس پر نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ ادب ایک وسیع عمل ہے جس کی تخلیق میں دریافت شدہ اور غیر دریافت شدہ وہ جملہ علوم شامل ہیں جو انسانی زندگی کو متاثر کرتے ہیں لیکن افسانے کی تنقید صرف نفسیات تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ افسانہ میں اگرچہ فرد اور سماج کی ہر دھڑکن ہر آہٹ اور ہر حرکت دیکھی سنی اور محسوس کی جا سکتی ہے لیکن تنقید کو افسانہ صرف تنہائی، کرب، خوف اور بے چہرگی کا مرکب ہی نظر آتا ہے جس کی کثرت تکرار نے تنقید کو مہمل بنا دیا ہے۔ احساس کے یہ پہلو اگرچہ زندگی کا حصہ تو ہیں لیکن افسانہ اتنی محدود سمتی اور سکڑی ہوئی صنف نہیں ہے کہ زندگی کے منفی اظہار کے دائرہ میں ہی اسیر ہو کر رہ جائے۔

افسانے کی تنقید کے بارے میں عام قاری بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید کا رویہ اس شتر مرغ کا سا ہوتا جا رہا ہے جو ریت میں منہ چھپا کر خود کو محفوظ تصور کرنے لگتا ہے۔ اسے افسانے میں احساس کی محدود سطحوں کے علاوہ کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ہے۔

تنقید کے بارے میں ان اعتراضات میں صداقت ہو سکتی ہے لیکن اس کے بھی کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ تنقید کی معروضیت وقت اور فاصلہ چاہتی ہے جب کہ افسانے کا سفر مسلسل جاری ہے۔ ایسی صورت میں تنقید میں وقتی طور پر ٹھہراؤ کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ افسانے کا ایک اور پہلو بھی ہے جس نے تنقید کے نشتر کو کند کر دیا ہے اور وہ ہے افسانہ میں مسلّمہ تصورات اور زندگی کی بنیادی حقیقتوں کی مجرد پیش کش جس کے بارے میں کسی اظہار سے تنقید خود کو قاصر پاتی ہے۔

تخلیق اور تنقید میں اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن ادب میں کسی ایک صنف

کے ٹھہر جانے کی وجہ سے قافلہ رکتا نہیں ہے۔ اردو افسانے کا سفر نہ صرف جاری ہے بلکہ نئے معاشرے کی طرح اس کا دامن بھی وسیع ہوا ہے اور اس نے فکر و احساس، موضوع، مواد اور اظہار کی سطح پر ارتقا کی منازل طے کی ہیں البتہ اس میں مختلف نظریات و تصورات، ذہنی اور جذباتی رویے کچھ اس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو گئے ہیں کہ نئے افسانے پر کوئی مخصوص لیبل آسانی سے چسپاں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ میں اگرچہ نئے موضوعات کا اضافہ ہوا ہے لیکن عام زندگی سے تعلق رکھنے والے بعض سماجی مسائل مثلاً بھوک، بیماری، غربت، مہنگائی، سماجی اور معاشی عدم مساوات فرقہ پرستی، مظلومیت اور استحصال زدگی وغیرہ سے افسانے کا رشتہ کمزور ہوا ہے۔ اس نے نچلے اور نچلے متوسط طبقہ کی ان ابھرتی امنڈتی اور بپھرتی امنگوں اور آرزوؤں کو نظرانداز کر دیا ہے جن کے ساتھ اردو افسانے کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس میں انسان اور فطرت کے رشتے اور مبہم جویانہ انسانی فطرت کے نقوش بھی دھندلے نظر آنے ہیں جو زندگی میں مسائل سے الجھنے اور ان پر قدرت پانے کی جدوجہد میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

نئے افسانے کو اگرچہ مریضانہ جنس زدگی سے نجات مل گئی ہے لیکن صحت مند جنسی جذبوں کے بالواسطہ اظہار کے فقدان نے اردو افسانے کو باہمی کشش اور حسن و عشق کی اس دھیمی دھیمی آنچ سے محروم کر دیا ہے جو تلخ موضوعات کو خوش گوار بنانے اور ایک دوسرے کو قریب لانے میں معاون ثابت ہوتی ہے جس کی وجہ سے افسانے میں جنس مخالف کے بارے میں سرد مہری اور ان کے مسائل سے بے توجہی کے رجحان کو تقویت ملی ہے۔ نئے افسانے میں اگرچہ بین الاقوامی سماج کا تصور موجود ہے لیکن مختلف طبقوں، تہذیبوں اور پیشوں کی فطرت، نفسیات، ان کا اور اقدار کے تقابلی مطالعے کو افسانے نے فراموش کر دیا ہے جو قومی اور سماجی یک جہتی میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔ اسی طرح افسانہ میں انسان دوستی اور اخلاق کی آواز بھی کچھ دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی ہے۔ البتہ سیاسی و سماجی زندگی کے تضادات، ہر طرف بڑھتے ہوئے کرپشن اور انسانی ضمیر کے زوال پر طنز و تنقید اور احتجاج کی آواز زیادہ بلند نظر آتی ہے۔ لیکن تحفظ کے نام پر غریب عوام پر بڑھتے ہوئے بوجھ پر اردو میں صرف ایک افسانہ بجٹ ہی لکھا گیا ہے۔

[redacted]

نئے اردو افسانے میں معزول شدہ اعلیٰ متوسط طبقہ کے مرثیہ خوانی کے لیے اگرچہ کمزور ہو گئی ہے لیکن یہ افسانہ اب بھی متوسط طبقہ اور اس کے مسائل کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن یہ آزادی سے قبل اس متوسط طبقہ سے قطعی مختلف ہے جو اپنی حیثیت منوانے اور اقدار کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ یہ اس نئے حرکت پذیر معاشرہ کا وہ نوزائیدہ متوسط طبقہ ہے جو اپنی موجودہ حیثیت پر قانع نہ رہ کر اوپر اٹھنا چاہتا ہے اس لیے اس کے مسائل اور مخالف قوتوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ اس کے لیے اقدار کی تلاش کے مقابلہ میں عصری تقاضوں کے مطابق جڑوں کی تلاش کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ اردو افسانہ اسی طبقہ کی حسرتوں، آرزوؤں، خوابوں، محرومیوں، مایوسیوں، اور ذہنی و جذباتی رغبتوں کا آئینہ دار ہے جس کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے یہاں فکر و احساس کی سطح تو خاصی بلند ہے لیکن عمل اور حکمت عملی کا تانا بانا اتنا کمزور ہے کہ جذبہ تعبیر اور تخلیقی اظہار دونوں میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔

اردو کے نئے افسانے میں اس نئے معاشرے کے نقش و نگار بھی واضح طور پر نظر آتے ہیں جو آزادی کے بعد تیزی سے شہری تہذیب کی طرف بڑھ رہا ہے جس نے دماغی محنت اور جسمانی محنت کرنے والوں کو اس طرح الگ الگ گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے کہ فکر اور عمل کے درمیان رشتے کمزور ہو گئے ہیں۔ اردو کے بیشتر نئے افسانے اسی افسر شاہی اور ڈرائنگ روم کلچر کی پیداوار ہیں جن میں فکر و احساس کی شدت، موضوعات کا تنوع اور فنی تجربے تو موجود ہیں لیکن مواد اور عمل محدود ہے۔ جز وقتی افسانہ نگاری کو اتنی فرصت ہی نہیں ہے کہ خیال کو حقیقی زندگی پر پھیلا کر تجربے اور مشاہدے کی بصیرت حاصل کر سکے جس نے ان کی تخلیقی قوتوں کا رخ باطن کی طرف موڑ دیا ہے جہاں ذات کی پنہائیوں میں غوطہ زنی، ذہن کے کونے کھدروں میں جھانکنے، نفسیاتی گتھیوں میں الجھنے، زخموں کو کریدنے اور ناآسودہ منتشر خوابوں کی نوحہ گری کے زیادہ مواقع حاصل تھے جس کی وجہ سے اندر کے آدمی کو باہر لانے کی کوشش ناکام رہ جاتی ہے اور افسانہ خیالات کے الجھاؤ، تصورات کے دھندلے پن، کیفیات کی بے ثباتی، انا کے تصادم اور ژولیدہ بیانی کا شکار ہو جاتا ہے جسے مواد اور تجربے کی قلت اور خود کلامی، شعور کی رو، علامتی اور تجریدی طرز اظہار نے مزید بے کیف اور دھندلا بنا دیا ہے۔

اس چہار دیواری کے افسانوں میں موضوعات عموماً اخبار اور ٹی وی کی سرخیوں اور کتابوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ افسانے بظاہر دنیا کے غم میں مبتلا بھی نظر آتے ہیں لیکن جب عملی زندگی میں

عدم شرکت کے باعث تخیل کی یہ کاری واقعات کو واردات میں تبدیل کرنے میں ناکام رہتی ہے تو یہ عامیانہ فارمہا ورعالمانہ فارم کی اصطلاحات، پیاز اور موزے کی تشبیہات میں قاری کو الجھا کر افسانہ کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہو جانا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ افسانہ کی تخلیق فرد کا ذاتی معاملہ ہے لیکن افسانے کی اشاعت ایک سماجی عمل ہے اور جب تک ذات کا رشتہ غیر ذات سے استوار نہیں ہوتا۔ افسانہ حسن وتاثیر سے محروم رہتا ہے۔ وہ اگر قاری کو فراموش کرنا چاہتا ہے تو قاری بھی اس کو فراموش کرنے کا حق رکھتا ہے۔ البتہ اعتراف نہ کرنا حق ناشناسی ہو گا کہ ڈرائنگ روم کلچر نے افسانے کو نئی جہت کے امکانات سے ضرور روشناس کرایا ہے جس میں مستعار روشنی بھی شامل ہے لیکن ان امکانات سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جاسکے گا جب اس گروہ کی پیدا کی ہوئی دلدل سے افسانہ نجات پاسکے گا۔

جز وقتی افسانہ نگاری کوئی عیب نہیں ہے اگرچہ وہ کل وقتی افسانہ نگاری کا نعم البدل نہیں ہوسکتی ہے۔ پھر بھی اس فاصلہ کو کم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے کہ حواس کی کھڑکیاں کو ہمہ وقت کھلا رکھا جائے اور اپنے پیشوں اور قریب ترین ماحول سے حاصل شدہ صادق تجربات اور مشاہدات کو ہی موضوع بنایا جائے۔ چنانچہ وہ افسانہ نگار جنھوں نے اس راز کو پا لیا ہے ان کے افسانوں میں فکر و عمل، جذبہ و خیال کا توازن، تجربہ اور مشاہدے کی بصیرت نیز روشن جزئیات موجود ہیں جس نے نہ صرف افسانے کے حسن وتاثیر میں اضافہ کر دیا ہے بلکہ کردار نگاری اور حقیقت نگاری کے نئے امکانات کا احساس بھی دلایا ہے۔

افسانہ کا موضوع اگرچہ ابتدا ہی سے انسان اور زندگی کی حقیقتیں رہا ہے لیکن ان کے بارے میں فن کار کا نقطۂ نظر سماجی زندگی میں تصادم وتضاد کی نوعیت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ سماج میں تصادم کی نوعیت اگر مادی اور تضاد کی نوعیت غیر مادی ہوتی ہے تو فن کار کی توجہ کا مرکز انسان، زندگی اور حقیقت کے خارجی مظاہر اور اس کے غیر مادی نتائج ہوتے ہیں لیکن جب تصادم خود کو غیر مادی اور تضاد مادی نوعیت میں تبدیل کر لیتا ہے تو فن کار کے لیے مطالعہ کا موضوع انسان اور حقیقت کے داخلی پہلو اور اس کے مادی نتائج بن جاتے ہیں۔ ہمارے سماج میں تصادم وتضاد کی نہ صرف مختلف نوعیتیں موجود ہیں بلکہ ان رشتوں کو شعوری اور غیر شعوری طور پر بدلنے کی کوشش بھی کی جاتی رہی ہے جس نے تصادم تفہیم اور ان کے نتائج کے تجزیے میں دشواریاں پیدا کر دی ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ جہاں تک

مادی نوعیت سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں لوٹ مار، قتل و غارت گری کو تقویت ملتی ہے اور جہاں غیر مادی تصادم کا غیر مادی تضاد سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں زندگی بے معنی، مہمل اور پژمردہ نظر آنے لگتی ہے۔

اردو کے وہ افسانہ نگار جن کا سائنسی شعور بالغ تو ہے لیکن ان کی نظر تصادم کی غیر مادی نوعیت تک ہی محدود ہے وہ حقیقت کو سیال تصوّر کرتے ہیں اور انسان کو خیر و شر کا ایسا مجموعہ خیال کرتے ہیں جس کے وجود کی شناخت شر کے اظہار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انسان کے بارے میں یہ نقطۂ نظر نہ صرف گناہ کی ترغیب دیتا ہے بلکہ انسانوں کے درمیان نفرت کو بھی فروغ دیتا ہے جو صدیوں کی انسانی تہذیب اور عالمی مذاہب کے بھی منافی ہے۔ یہ خود بھی ایسا ادھورا اور نامکمل فلسفہ ہے جو تصادم کو تضاد سے الگ کرکے زندگی کی تفسیر پیش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ افسانہ نگار بھی جو غیر مادی تصادم کو غیر مادی تضاد سے وابستہ کرتے ہیں۔ زندگی کی کوئی صحت مند اور توانا تصویر نہیں پیش کرپاتے ہیں جہاں غیر مادی عمل اپنے مادّی انجام سے محروم رہ کر زندگی کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ ادب اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس فلسفہ کی تبلیغ مخصوص طبقاتی شعور کا نتیجہ ہے جس کو بعض افسانہ نگاروں نے بغیر سوچے سمجھے اپنا لیا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے برعکس وہ افسانہ نگار جنھوں نے تصادم کی غیر مادی اور تضاد کی مادی نوعیت کے پس منظر میں زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان کے یہاں حقیقت منقلب صورت گری تو ہوسکتی ہے لیکن سیال نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کی قوت کا سرچشمہ اگر باطن میں پوشیدہ ہے تو وہ اپنی غذا خارجی زندگی سے ہی حاصل کرتا ہے یہاں باطنی عمل کے خارجی ظواہر اور مادی نتائج کا عام شعور ہی نظم و ضبط کا ذمہ دار قرار پاتا ہے جس کی وجہ سے افسانہ انسان کے ظاہر و باطن، اس کے داخلی و خارجی روابط، اسباب و نتائج کی ایسی مبسوط و مربوط اکائی بن کر سامنے آتا ہے کہ افسانہ اپنے حسن اور تاثیر سے دلوں کی تسخیر کرلیتا ہے۔

نیا اردو افسانہ اگرچہ مذکورہ متوازن رویّوں کی دھوپ چھاؤں میں اپنے ارتقاء کی منازل طے کر سکتا تھا لیکن انفرادی سطح پر جزوی خیال، جزوی احساس اور جزوی تجربے اور جزوی مشاہدے نے اس کی راہ میں مسائل پیدا کردیے ہیں۔ نئے معاشرے کی تنوع پسندی، واقعات، حادثات اور احساسات [illegible] اتنا موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ جملہ حواس یا مکمل تجربے کا حصہ بن سکیں جس کی وجہ سے فن کار کی [illegible] مضبوط ہونے سے قبل ہی ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ لیکن یہ لمحاتی عمل دل و دماغ پر ایسا نقش چھوڑ [illegible]

جاتا ہے کہ اظہار ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن جب تخیل کی پرکاری بھی ادھورے پن کے احساس کو زائل نہیں کر پاتی تو حقیقی تجربہ خود کو ہی جھٹلانے لگتا ہے۔

تخلیقی تجربہ کے بھی اپنے تقاضے ہوتے ہیں وہ اپنی تکمیل کے لیے صبر و استقامت کا مطالبہ کرتا ہے لیکن جو فن کار اس کے متحمل نہیں ہو پاتے ان کے لیے مونتاژ کی تکنیک سہارا بن جاتی ہے جہاں ایک ہی ماخذ سے قریب ترین تجربوں کی ایسی محفل آراستہ کی جاتی ہے کہ نقش اگر نامکمل اور تصویر ادھوری بھی رہے تب بھی تجربے کی صداقت پر آنچ نہ آپائے۔

جزوی تجربے کے علاوہ اقدار کی شکست و ریخت نے بھی افسانے کو مسائل سے آشنا کرایا ہے۔ آزادی کے بعد بڑے پیمانہ پر شہروں کی طرف انتقال آبادی، روایتی، مادی وسائل سے محرومی اور پیداواری رشتوں کی تبدیلی نے جہاں اقدار کے خارجی اور معروضی پہلوؤں کو نمایاں کرکے ان کے روحانی اور جذباتی رشتوں کو کمزور کردیا ہے وہاں معاشرتی انتشار نے انھیں تحفظ سے بھی محروم کردیا ہے جس کی وجہ سے افکار و اقدار کے تمام مروجہ سانچے مشکوک نظر آنے لگے ہیں۔ نئے سماج کی طرف نیا اردو افسانہ بھی افکار و اقدار کی اسی کش مکش اور بحران میں مبتلا ہے جس نے تخلیقی صلاحیتوں کا رخ احیاء پرستی کی طرف موڑ دیا ہے اور ماضی کے آزمائے ہوئے سانچوں اور جاگیردارانہ تہذیبی اقدار میں کشش پیدا کردی ہے اور کچھ افسانہ نگار اس تلاش میں داستان، حکایات، اساطیر سے ہوتے ہوئے دیومالاؤں تک پہنچ گئے ہیں جہاں ان کی معصومیت کو اس حیرت سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ان کے عہد اور ماضی قریب و بعید میں کیسی مماثلتیں موجود ہیں لیکن ان کی چشم بینا اس بصیرت سے محروم رہتی ہے کہ یہ مماثلتیں ابتدائی صنعتی تہذیب کی قبائلی اقدار اور ان قبائلی تہذیبی اقدار تک ہی محدود ہیں جن کو جمہوریت کے فروغ اور سیاسی مصلحتوں نے آدی باسیوں کے مچانوں سے نکال کر لوک کلچر کے نام پر مہذب سماج کی مسند پر بٹھا دیا ہے اور ان میں بھی اکثر ایسی جھوٹی مماثلتیں موجود ہیں جو کچھ دور چل کر دم توڑ دیتی ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بعض مسلمہ تصورات اور بنیادی حقیقتیں ہر دور میں یکساں رہتی ہیں اور عمل کی شکل اختیار کرنے پر تصادم کو جنم بھی دیتی ہیں لیکن ان میں کوئی نیا پن اور تازگی نہیں ہوتی اس لیے افسانوں میں ان کی مجرد پیش کش اور تمثیلی انداز کوئی حسن اور تاثیر پیدا نہیں کرتا ہے البتہ عصری تناظر فراہم کرکے یا Juxta position اور متوازی حیثیت میں رکھ کر ان میں

[redacted]

کشمش اور معنویت پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ افسانے اس تخلیقی کاوش کو تخلیقی عمل میں تبدیل کرنے یا ماضی کو حال سے ملانے کی کوشش میں ناکام نظر آتے ہیں۔

ماضی کی زندہ اور صحت مند اقدار تو خود بخود حال کا حصہ بن جاتی ہیں اور مردہ لاشوں کو وقت کا سمندر خود ہی باہر پھینک دیتا ہے اس لیے ماضی کی واپسی کے خواب صرف تخیلی بازیافت تک ہی محدود رہتے ہیں۔ حال کے بطن سے صرف مستقبل ہی جنم لے سکتا ہے، ماضی نہیں۔ اور تخلیق کار بھی وہی کہلاتا ہے جو نئی دنیا تخلیق کرتا ہے یا زندگی میں نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ صنعتی تہذیب افسانے کا مقدر بن چکی ہے جس کی دھوپ چھاؤں بھی افسانے میں نظر آنے لگی ہے لیکن یہ نقوش ابھی دھندلے ہیں جس کی وجہ سے افسانہ عوام کے بالغ شعور کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے اور شمع راہ بننے کے بجائے سماج کے پیچھے چلنے والی حقیقت بن کر رہ گیا ہے۔

اردو افسانے نے اگر صنعتی تہذیب کے امکانات کا شعوری طور پر جائزہ لیا ہوتا اور آمد و رفت اور ابلاغ کے جدید وسائل کے پڑنے والے اثرات کا ادراک کیا ہوتا تو اردو افسانے میں غیر شعوری طور پر در آنے والے اثرات کا بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بیشتر افسانہ نگار الٹی منطق کے شکار ہیں انھیں جدید ذرائع ابلاغ اور افسانے میں صرف تصادم ہی نظر آتا ہے۔ حالانکہ جدید ذرائع ابلاغ نے انسان کے ذہن اور تصور کو اس حد تک وسیع کر دیا ہے کہ افسانے میں زمان و مکان کے تعین کے لیے اب معاشرت کی عکاسی اور منظر نگاری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے بلکہ یہ کام علامت اور استعارے سے لیا جانے لگا ہے جس نے افسانے کو ایجاز و اختصار کے حسن سے مالا مال کر دیا ہے البتہ اس وجہ سے جزئیات نگاری، معاشرت کی عکاسی اور تحلیل نفسی کے عمل کو ضرور نقصان پہنچا ہے اور چعل دینے کے منفی رجحان کو بھی افسانہ میں سرایت کرنے کا موقع دیا ہے جس کی وجہ سے فن کار افسانہ کو تہہ دار بنانے کے لیے کہانی کو بننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا ہے بلکہ مختلف نظریات اور تصورات کو استعاراتی انداز میں اس طرح افسانہ میں بکھیرتا چلتا ہے کہ اصل قصہ اور پلاٹ سے تعلق نہ ہونے کے باوجود قاری پہلی نظر میں دھوکا کھا جاتا ہے اور افسانہ پڑھتے وقت اسے اپنے شعور کو زیادہ بیدار رکھنا پڑتا ہے جس نے افسانہ اور افسانہ نگار دونوں کی ہی سالمیت اور وقار کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

افسانہ میں تجُعل دینے کے اس منفی رجحان کو اگرچہ کمٹ منٹ کے گریز سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے لیکن مرکزی کردار اور اس کے عمل کی موجودگی میں یہ گریز کم اور تجُعل سازی کا عمل زیادہ ہے جو ادب کی بوطیقا میں قابل مذمت فعل ہے۔

نیا افسانہ سماجی تبدیلیوں کی وجہ سے زبان و بیان کے مسائل سے بھی دوچار ہے۔ اردو زبان کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ علاقائی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ زبان کی توسیع کا عمل ہے جسے جاری رہنا ہی چاہیے لیکن زبان کے مسائل وہاں پیدا ہوئے ہیں جہاں لفظ و معنی کا روایتی رشتہ کمزور ہوا ہے اردو کے مروجہ اور اگلی صف کے بیشتر الفاظ جاگیردارانہ تہذیب اور اس کے وسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور معنی کے ایک مخصوص تصور کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ تصور اب بھی چھوٹے شہروں اور قصبات میں موجود ہے۔ لیکن بڑے شہروں اور صنعتی مراکز میں لفظ و معنی کے درمیان روایتی رشتہ تیزی سے منتشر ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ترسیل کے مسائل کے ساتھ جھنجھلاہٹ کو بھی سر اٹھانے کا موقع ملا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ افسانہ میں لفظ کا استعمال تخلیقی ہوتا ہے لیکن کوئی بھی تخلیقی عمل اسم کو فعل اور فعل کو صفت میں یا اس کے برعکس تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس کو متضاد معنی میں استعمال نہیں کر سکتا۔ ہمارے تخلیق کاروں کو بھی اس دشواری کا احساس ہے جس نے افسانے میں لغت کی زبان اور عوام کی زبان کے رجحان کو تقویت پہنچائی ہے لیکن اس کی وجہ سے افسانہ کی زبان مصنوعی یا عامیانہ پن کا شکار ہو گئی ہے حالانکہ افسانہ نگاروں کو تیسرے راستہ کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔ اور عوامی زبان کو تراش خراش کر ادبی حسن کے ساتھ اس طرح پیش کرنا چاہیے تھا کہ معنی کی توسیع کے ساتھ الفاظ زندہ اور متحرک حقیقت بن جائیں اور افسانہ حسن و تاثیر کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ یہی وہ واحد راستہ بھی ہے جو سماجی تبدیلیوں سائنسی شعور اور روزمرہ کی زندگی میں صنعتی اشیاء کے کثرت استعمال سے پیدا ہونے والے زبان کے ان مسائل کو حل کر سکتا ہے جو تجربے اور احساس کی سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے اظہار کے لیے نئے الفاظ یا الفاظ و معنی کے نئے رشتہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اردو افسانے کے یہ وہ مسائل ہیں جن کا شعوری یا غیر شعوری حل نہ صرف فکر و احساس کی سطح پر بلکہ زبان و بیان کی سطح پر بھی اردو افسانے کو نئے دور سے روشناس کرا سکتا ہے۔

صغرا مہدی

چلتے ہو تو موریشس چلیے

(۱)

موریشس ایک انوکھا ملک ہے، بہت خوبصورت وحسین جزیرہ، وہاں کافی تعداد میں ہندنژاد لوگ رہتے ہیں، وہاں اردو ہندی بولی جاتی ہے، پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ وہاں سے طالب علم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور لکھنؤ اردو، ہندی پڑھنے آتے ہیں۔ ہندی شعبے کے کئی رفیق موریشس جاچکے ہیں، اطہر پرویز مرحوم جن کا تعلق مکتبہ جامعہ اور علی گڑھ سے تھا وہاں اردو پڑھانے کے لیے ایک عرصے تک رہے تھے۔ ہماری ایک طالب علم یاسمین بودھی بھی ماریشس کی تھیں۔ جب وہ تعلیم ختم کر کے جانے لگیں انھوں نے ہمیں موریشس آنے کی پرزور دعوت دی۔ "آپ موریشس کو بہت پسند کریں گی ضرور کبھی آئیے۔" "ضرور" ہم نے فوراً وعدہ کرلیا اور اب جن ملکوں کی سیر کا ارادہ ہے ان میں موریشس کا اضافہ بھی کرلیا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ یاسمین پچھلے سال میں ہندوستان آئیں اور انھوں نے موریشس آنے کا وعدہ لیا۔ ہم نے کہا "ضرور جلد ہی آئیں گے" یہ کہتے ہوئے یقیناً ہمارے لاشعور میں یہ بات ہوگی کہ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ سو نومبر کے مہینے میں یہ خبریں آنی شروع ہوئیں کہ موریشس میں عالمی اردو کانفرنس ہو رہی ہے اور آئی، سی۔ سی آر کی طرف سے ہندوستان سے ایک وفد جا رہا ہے "کاش ہم بھی اس میں ہوتے" ہم نے دل میں سوچا۔ پھر تقریباً ایک مہینے تک یہ وفد اور اس میں جانے والے لوگوں کے نام نیوز میں رہے اور پھر دسمبر کی ۲۰ کو مسٹر باسو کے فون سے یہ مژدہ ملا کہ ہمارا

ڈاکٹر صغرا مہدی، ریڈر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

نام بھی اس میں ہے۔ ہم نے جی بھر کے ان لوگوں کو دعائیں دیں جنھوں نے یہ کام کیا کہ آج کل لوگوں کو سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔ سارے کام تو آئی۔ سی۔ سی آر نے کر دیے۔ پاسپورٹ ہمارا ہر دم تیار ہی رہتا ہے۔ بس فورن ایکسچینج لینے کے لیے تھامس کک کے یہاں جانا پڑا۔ وہاں رضا زیدی مشہور آرٹسٹ سے ملاقات ہوئی جو اپنی کیلی گرافی کی نمائش لے کر جا رہے تھے۔ جامعہ میں ہی رہتے ہیں ان سے ہم نے طے کر لیا کہ ایرپورٹ ساتھ ہی چلیں گے اور شام کو پانچ بجے ہم پھر اندرا گاندھی ایرپورٹ کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک خوبصورت جزیرے کی طرف۔

ایرپورٹ پر انیس احمد صاحب کیلی گرافر موجود تھے۔ پھر گلزار نقوی جو آزاد بھون میں چیف لائبریرین ہیں، بھی وفد کے ساتھ کوآرڈی نیٹر کی حیثیت سے جا رہے تھے۔ آئے لدے پھندے ایک بڑے سے کتابوں کے بنڈل کے ساتھ۔ معلوم ہوا کہ اشتیاق عابدی صاحب سکریٹری اردو اکادمی دہلی بھی آچکے ہیں، ہم لوگ ایرانڈیا کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوگئے۔ ایرپورٹ پہنچ کر فوراً سیر جی چاہتا ہے کہ سامان کا بوجھ فوراً اترنا چاہیے۔ اس دوران ایک ایک کر کے اراکین وفد آنے شروع ہوئے۔ فہمیدہ بیگم نپے تلے قدموں کے ساتھ، نہایت اعتماد اور وقار کے ساتھ۔

سید حامد اپنی مخصوص مسکراہٹ اور نیچی نظروں کے ساتھ مگر چہرے پر تشویش ایک طرف الگ کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا تشویش کا سبب خلیق انجم صاحب کا نہ ہونا ہے کہ ان کے سب کاغذات پاسپورٹ وغیرہ ان ہی کے پاس تھے۔ تشویش بجا تھی۔

پھر ایک طرح دار خاتون سفید سلک کی ساڑھی میں ملبوس، چہرے پر غضب کی طمانیت، ہاتھ میں وینٹی بیگ بیگم حامدہ حبیب اللہ۔ دل نے کہا لطفِ سفر ہے ان ہی کے ساتھ۔ پھر اخلاق اثر صاحب حضرت بیکل اتساہی نورانی چہرے کے ساتھ مسکرا مسکرا کر سلاموں کا جواب دیتے فرسٹ کلاس کے کاونٹر پر۔ ہمارا کام ختم ہوگیا کہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نظر آئے جنھیں دیکھ کر نہ جانے مولوی اسمٰعیل کا یہ شعر کیوں یاد آجاتا ہے ؎

نہر پر چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے بات کی پکی

موریشس کے پورے سفر کے دوران ان کا یہی عالم رہا اور پھر پروفیسر گوپی چند نارنگ اس شان کے ساتھ چلو موریشس بھی نمٹا دیں۔ موصوف ابھی چین کے سفر سے واپس آئے تھے

[redacted]

ور پھر آخر میں انجمن صاحب۔ اوہ میرا مطلب ہے خلیق انجم صاحب، ساتھ میں ان کے پروفیسر وہاب اشرفی جو واقعی مسافروں والی کیفیت اپنے چہرے پر طاری کیے ہوئے تھے۔ موصوف کو ہم بس پروفیسر ہی سمجھتے تھے۔ سنجیدہ، بارعب، اور ذرا بات کرتے جھجکتے تھے مگر مورشیس کے سفر کے دوران معلوم ہوا کہ آپ میں احساسِ مزاح بھی ہے اور کبھی کبھی اس کو بروقت کام میں لاکر لوگوں کے بڑے مسئلے حل کردیتے ہیں۔

ایر انڈیا کی فلائٹ گیارہ بجے کے قریب بمبئی پہنچنے والی تھی اور موریشس کی فلائٹ تین بجے تھی سوچ رہے تھے کہ اتنی دیر کیا کریں گے۔ مگر خدا نے ایسا انتظام کیا کہ بجائے اس کے کہ ہم فلائٹ کا انتظار کرتے، فلائٹ کو ہمارا انتظار کرنا پڑا۔ ہوا یوں کہ ایر انڈیا پر بیٹھ کر تین گھنٹے بعد یہ راز کھلا کہ جہاز میں خرابی ہے اور سب مسافر نیچے اترے۔ اور پھر بھاگ دوڑ، کوفت پریشانی۔ پھر ارکان ایر انڈیا کی کارکردگی۔ ایر موریشس کو روکنے کی ہدایت۔ غیر ملکی سفر کی سب کارروائی دہلی میں۔ ایک بجے پھر ایر انڈیا پر سب کا سوار ہونا۔ سوتے جاگتے دہلی سے بمبئی کا سفر۔ بمبئی پہنچ کر فوراً ایر موریشس میں اور ولی محمد شاہین جو کنیڈا سے آئے تھے، پروفیسر شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی بھی موجود تھے۔ جہاز نے اڑان بھری تو اب سمجھو کہ ماریشس پہنچ ہی گئے۔ ماریشس کا سفر بمبئی سے چھے گھنٹہ کا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا فرق وقت میں ہے۔ پھر ناشتہ، سونا، قلم اور گیارہ بجے جہاز نے موریشس پر لینڈ کیا۔ بہت سے لوگ ہمیں لینے آئے تھے۔ پروفیسر شمیم حنفی، اخلاق اشرف اور ابوالکلام سب سے گھل مل کر مل رہے تھے کہ یہ ان لوگوں کا دوسرا پھیرا تھا۔ عنایت حسین عیدن، صابر گودڑ، مریم گودڑ، نصیب صاحب، قاسم صاحب ہمارے میزبان تھے۔ ہمارے ساتھ لکھنؤ کے میئر گپتا جی اور ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں۔

گپتا جی بہت باغ وبہار انسان ہیں، اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے کانفرنس میں جو پرچہ پڑھا اس کا موضوع تھا اردو اور سیکولرازم۔ اور مشاعرہ تو انھوں نے لوٹ لیا۔ بہت خوبصورت عاشقانہ غزلیں لکھتے ہیں۔

پھر ایک بڑی سی وین میں بیٹھ کر ہم لوگ ہرے بھرے علاقوں سے گزرتے، پرسکون سڑکوں سے ہوتے۔ تر وتازہ ہوا کے ساتھ، اور ایک خاص طرح کی بھینی بھینی خوشبو کے احساس کے ساتھ ہم Curepipe شہر کے continental ہوٹل پہنچے۔ سب کو کمروں کی

چابیاں دے دی گئیں۔ اور سب اپنے کمروں میں ۔

ارے ہاں بمبئی سے جناب جاوید خاں منسٹر آف ہاؤسنگ گورنمنٹ آف مہاراشٹر بھی وفد میں تھے۔ جناب شفیع قریشی گورنر آف بہار وفد کے لیڈر تھے اور ریکل انساہی صاحب ایم پی تو تھے ہی۔ یہ الگ ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔

ہمارے میزبان حضرات نے اطلاع دی تھی کہ اسلامک انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چار بجے گارڈن پارٹی ہے چنانچہ کمروں میں جاکر تھوڑی دیر دم لے کر کھانا کھا کر تیار ہوئے اور پارٹی کے لیے روانہ ہو گئے جہاں عمائدین ملک بھی تھے اور اکابرین ملک بھی۔ ملک کے خادم بھی اور حاکم بھی۔ خواتین بھی اور بچے بھی۔ بس پارٹی موسم کی خرابی کی وجہ سے گارڈن سے ہال میں منتقل ہو گئی تھی۔ سب لوگ بہت خوش تھے، چہرے اس طرح کھلے ہوئے تھے کہ زبان سے خوش آمدید کہے بغیر ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ ہمارے میزبان واقعی ہمارے آنے سے خوش ہیں۔ خواتین گجراتی لباس میں بھی تھیں۔ بعض مغربی لباس میں تھیں۔ زیادہ تر شلوار قمیص میں غرض اس مجمع میں سب اپنے لگ رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی نے پہلی ہی تقریر میں موریشس کے لوگوں کے دل جیت لیے۔ جناب بیکل نے بھی تقریر کی اور بھوجپوری میں اشعار سنائے۔ یہاں کے لوگ آپ سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ خواتین کی نمائندگی بیگم حبیب اللہ نے کی اور اندرا گاندھی کی تقریر کی یاد دلادی اور اس طرح پہلی تقریب میں ہندوستانی وفد کو موریشس کو اور موریشس نے ہندوستانی وفد کو اپنا لیا۔ا۔ موسم کھل گیا تھا۔ ذرا بلندی پر ایک وسیع لان میں چائے کا انتظام تھا۔ خواتین ہندوستان کے بار- میں طرح طرح کے سوال کر رہی تھیں، جس میں اشتیاق بھی تھا۔ تجسس اور اپنائیت بھی اور یہ انداز کہ ؎

کس حال میں ہیں یارانِ وطن،

موریشس کی بول چال کی زبان کریول ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے، فرانسیسی بھی سمجھی جاتی ہے۔ ہندی، اردو بھی سبھی تھوڑی بہت بول لیتے ہیں۔ خواتین ہندی ہی میں یا یوں کہیے کہ اردو ہی میں بات کر رہی تھیں۔ اس پارٹی میں دو چار نوجوان خواتین آگے بڑھیں اور ہم سے پوچھنے لگیں کہ "یوسف بھائی کیوں نہیں آئے۔ چند لمحوں کو تو ہم چکرائے کہ مطلب دلیپ کمار سے ہے،

یاد آیا کہ موصوف سے متعلق ایک کتابچہ بھی اس تقریب میں تقسیم ہوا تھا۔ اخبار میں یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ بھی ورلڈ کانفرنس میں جا رہے ہیں اور پھر بیماری کی خبر بھی آئی تھی۔ ہم فوراً سنبھل گئے بولے "جی وہ تو بہت آنا چاہتے تھے بہت شوق تھا ان کو یہاں آنے کا مگر ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا اس لیے ....،،
اور سائرہ بھابی "وہ کیسے آتیں ان کو چھوڑ کر" ہم نے فوراً کہا۔ "اور کیا بھلا ان کو کون دیکھتا" ایک معتبر خاتون نے ہماری ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر جو ہم مڑے تو ہم نے دیکھا کہ اردو ترقی بورڈ کی فہمیدہ بیگم ہندوستان میں اردو کے فروغ اور ہر دلعزیزی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ ہندوستان کی تہذیب و کلچر پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ولی محمد شاہین سے کنیڈا میں اردو کی صورت حال پر گفتگو کر رہے تھے، عابد رضا بیدار اس مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے کہ موریشس میں کس طرح کتابیں بھجوائی جائیں اور موریشس میں اردو کے فروغ میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ گلزار نقوی بتا رہے تھے کہ ہندوستان میں آئی۔ سی۔ سی۔ آر تہذیب و ثقافت کے میدان میں کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اشتیاق عابدی صاحب، گورنر صاحب، منسٹر صاحب، ہمارے وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی صاحب، بیکل اتساہی صاحب اور جاوید احمد صاحب منسٹر کے ساتھ بہت اہم لوگوں سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ خدا کا شکر ہے کہ وفد میں ہم موجود ہیں جو "یوسف بھائی،، اور "سائرہ بھابی" کے متعلق استفسارات کا جواب دے سکتے ہیں۔

وہاں سے آ کر پھر کسی ڈنر میں جانا تھا جو مسٹر عبداللہ احمد نے دیا تھا جو اس کانفرنس کے روح رواں تھے اور انٹرنیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے صدر بھی۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی بہت متواضع خاتون ہیں۔ احمد صاحب کا گھر اس طرح سے روشنیوں سے سجا ہوا تھا کہ جیسے ہمارے یہاں شادیوں میں سجایا جاتا ہے۔ کھانے کا انتظام شامیانے میں تھا۔ اس سے پہلے سب لوگ ایک بڑے سے ہال میں جمع ہوئے تھے وہیں ہندوستان کے ہائی کمشنر مسٹر ریناسے ملاقات ہوئی جو گجرات کے ہیں اور ان کی بیوی راجستھان کی ہیں۔ دونوں خوش شکل خوش ادا اور بیحد کلچرڈ ہیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں ان کی کوششوں کا بھی بہت حصہ تھا وہاں رئیس احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو ان دنوں وہاں کے تعلیمی معاملات کے سلسلے میں صلاح و مشورے کے لیے گئے ہیں۔ سلطان سرور صاحب جو پہلے سے ہی پاکستان میں مقیم تھے پاکستان کی

نمائندگی کر رہے تھے۔ ابھی اور جگہ سے لوگ نہیں آئے تھے۔ سوائے کنیڈا کے شاہین صاحب کے۔ ہاں کھانے پر گئے تو دیکھا طلعت عزیز بھی مع اپنی بیگم صاحبہ کے "بہت اہم لوگوں" کی میز پر تھے اور ان کی آمد سے لوگ خوش نظر آرہے تھے۔ کھانا مزے کا تھا اور اس کے بعد مسٹر چرنی منسٹر آف کلچر کی تقریر جنھوں نے اردو سے اپنی وابستگی کا حال بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ انھیں اردو نہیں آتی ہے مگر غزلیں سننا اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک دوست کو غزل سرائی کی محفل میں لے گئے اور محفل کے بعد انھوں نے اپنی دوست سے پوچھا "کیسا لگتا ہے" انھوں نے جواب دیا "اچھا لگتا ہے" اس کے بعد موصوف نے ان سے شادی کر لی۔ یہ انھوں نے اس انداز سے کہا کہ سب کو یہ فقرہ بہت پسند آیا اور ہم سب باری باری اسے دُہراتے رہے اور یہی فقرہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نثری نظم کا عنوان تھا۔

مو ریشس ہم کو اچھا لگتا ہے"۔ (باقی آئندہ)

سید اطہر رضا بلگرامی

ایک ماہ ماسکو میں

(یادِ رفتگاں)

(۱)

ستمبر ۱۹۸۹ء میں انڈو یو۔ایس۔ایس۔آر کلچرل ایکسچینج پروگرام کے تحت ایک ماہ ماسکو میں قیام اور روس کے چند دیگر مقامات دیکھنے کا موقعہ ملا۔ میں زرعی تعلیمی سفر کے تحت روس کی اکاڈمی آف سائنس سے وابستہ تھا جس نے وہاں قیام کے دوران میرے تمام تعلیمی پروگرام طے کیے تھے۔ میرا مقصد روس کے زرعی مشینی نظام کا مطالعہ و مشاہدہ کرنا تھا اور یہ معلوم کرنا تھا کہ روس کی زرعی معیشت میں مشینوں کی بڑھتی ہوئی مداخلت نے زراعت کی پیداواری صلاحیتوں کو کس حد تک فروغ دیا ہے، اور وہ کون سے منفی اثرات ہیں جو مشینوں کی کثرتِ استعمال کے سبب شعوری یا غیر شعوری طور پر رونما ہوئے ہیں۔ چونکہ موجودہ دور میں ہندوستان کے زرعی نظام میں مشینوں کے استعمال پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے اور بہت سے صوبے ایسے ہیں جہاں مشینوں کے استعمال نے زرعی پس ماندگی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے، اس لیے میرا روس کا یہ تعلیمی سفر کارآمد و مفید مشاہدات اور احتیاطی اقدامات دونوں پہلوؤں سے بہت کامیاب رہا جس کی مفصل رپورٹ داخل کی جا چکی ہے۔ اس سفر میں کافی دلچسپ انکشافات ہوئے جن کا ذکر بعد میں کروں گا۔ پہلے ماسکو کی سیر کا حال بیان کرتا ہوں۔

روس کے بارے میں بچپن سے بہت کچھ سنتا، پڑھتا اور دیکھتا آ رہا ہوں۔ کتابوں، رسالوں، تصویروں، فلموں اور وہاں سے ہو کر آئے ہوئے لوگوں کی زبانی بڑی پرکشش اور دلچسپ باتیں

ڈاکٹر سید اطہر رضا بلگرامی، ریڈر شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

معلوم ہوتی رہی ہیں شاید دنیا میں روس اور ماسکو کے بارے میں جتنا لکھا گیا ہے کسی دوسرے ملک و شہر کے بارے میں اتنا نہ لکھا گیا ہوگا۔ عوام کو اتنی معلومات فراہم کی جاچکی ہیں کہ اب مجھے اس میں مزید اضافہ کی کوئی گنجایش نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ میں اپنے ذاتی مشاہدات کے ذریعہ ایک نئے پن کا احساس پیدا کر دوں۔ ماسکو جانے سے قبل جو کچھ پڑھا اور تصویروں میں دیکھا تھا وہاں پہنچ کر پتہ نہیں کیوں وہ سب ادھورا اور تشنہ سا لگا۔ اس کا احساس شدت سے ہوا کہ لکھنے والوں نے سب کچھ لکھنے کے باوجود بہت کچھ چھوڑ دیا ہے اور تحریر کے ادبی رنگ میں ماسکو کا فطری رنگ و روپ گم کر دیا ہے۔

یہ بھی عجیب ذہنی کیفیت ہے کہ اگر کسی مقام کو آپ نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو بلکہ صرف پڑھا ہو اور تصویریں دیکھی ہوں تو آپ کا ذہن ان تحریروں و تصویروں کے ذریعہ ایک ایسا جامع تخیلی خاکہ تیار کر لیتا ہے کہ آپ یہی سوچتے ہیں کہ یہ مقام بس ہوگا تو ایسا ہی ہوگا' عوام ہوں گے تو بس اسی طرح کے ہوں گے اور زندگی کی رونق و گہما گہمی اگر ہوگی تو اس طرح کی ہوگی۔ یہ خیالی تصور اس قدر مستند و پائدار ہوتا ہے کہ عرصہ تک اس میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا اور پھر ایک مقام وہ آتا ہے جہاں آپ کے ذہن کے ذریعہ بنایا ہوا یہ تخیلی خاکہ حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ خواب اس وقت ٹوٹتا ہے جب آپ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ ماسکو پہنچ کر میرا بھی یہ خواب ٹوٹا۔ ذہن نے جو خیالی تصویر مرتب کی تھی، ماسکو کو اس سے مختلف پایا۔ کئی معنوں میں خیالی تصویر سے کہیں زیادہ پرکشش اور خوبصورت اور کئی معنوں میں کہیں زیادہ پست و بے جان سا۔

۷ ستمبر کو صبح ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر ایر انڈیا کی ماسکو کی فلائٹ کے ذریعہ سفر شروع ہوا۔ مشکل سے ایک گھنٹے کے اندر اندر ہندوستان کی مانوس فضا دھیرے دھیرے معدوم ہونا شروع ہوگئی۔ جہاز کی باہری فضا میں اجنبیت کا احساس پیدا ہونے لگا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم ہندوستان کی فضا میں پرواز نہیں کر رہے ہیں۔

دہلی سے ماسکو تقریباً ۶ گھنٹے کی پرواز ہے۔ بیشتر وقت مختلف مشروبات' ناشتہ و کھانا میں گزر گیا اور پھر سارے ہنگامے سرد پڑ گئے سوائے انجن کی مخصوص گھوں گھوں کے۔ پورے جہاز میں خاموشی سی چھا گئی۔ کھڑکی سے باہر بدلتے ہوئے قدرتی مناظر نے ٹبا سا تھ دیا۔ کبھی سمہ

فضا انتہائی دلکش ہری بھری سی ملتی تو کبھی بنجر اور سنگلاخ سی جس کو دیکھ کر ہی الجھن ہو۔ پھر چاروں طرف پھیلا ہوا بنجر و سنگلاخ پہاڑوں کا سلسلہ دھیرے دھیرے ختم ہوتا محسوس ہوا اور چاروں طرف فضا میں نکھار سا آ گیا۔ بنجر پہاڑی سلسلہ ہرے بھرے میدانوں و پہاڑوں میں تبدیل ہو گیا۔ فضا اس قدر صاف و شفاف ہو گئی کہ ہزاروں فٹ کی بلندی کے باوجود چھوٹی سی چھوٹی شئے چمکتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے قریب میں بیٹھے اپنے ہم سفر سے دریافت کیا کہ ہمارا جہاز کس ملک کی فضا میں پرواز کر رہا ہے انھوں نے میری کھڑکی کے قریب جھک کر تھوڑی دیر دیکھا اور کہا شاید افغانستان سے گزر کر ہم سوویت یونین کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسی وقت جہاز میں مائیک پر اعلان سنائی دیا: "ہم روس کی فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آپ ماسکو کی سرحد میں داخل ہوں گے، دوسرے اعلان کا انتظار کیجیے۔" سوئے ہوئے مسافر جاگ سے گئے۔ خاموشی و سکوت میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میری طبیعت میں اچانک ایک خاص قسم کی گھبراہٹ اور بےچینی نے گھر کر لیا۔ ایک ایسا اجنبی ملک آنے والا ہے جہاں کی نہ زبان سے مجھے واقفیت اور نہ قواعد و ضوابط سے، پتہ نہیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ یہی سوچ کر کچھ طبیعت بےچین ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد اعلان ہوا کہ اب ہم ماسکو کی فضا میں ہیں تھوڑی ہی دیر میں ہم لینڈ کر جائیں گے برائے مہربانی آپ اپنی حفاظتی پیٹیاں کس لیں۔

میرا فطری و فوری ردّ عمل یہی ہوا کہ میں نے جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سوائے ہرے ہرے گھنے درختوں کے قطعات کے کچھ نظر نہ آیا۔ ابھی جہاز کی بلندی اتنی تھی کہ درختوں کی شکل بھی واضح نہ ہوتی تھی۔ بلندی کم ہونا شروع ہوئی تو ان کے خد و خال نمایاں ہوئے۔ سرو جیسے نوک دار بلند و بالا درخت، کچھ وادیٔ کشمیر کے درختوں سے ملتے جلتے، نظر آنے لگے اور پھر ان میں درختوں کے درمیان باریک سڑکیں اور چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے اور نکھرے نکھرے مکانوں کی قطاریں بھی نظر آنے لگیں۔ کہیں کہیں درختوں کی گھنی ہریالی کے درمیان مکانوں کی سرخ چھتیں بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھیں۔ جہاز ایرپورٹ پر آ گیا۔ لیکن شہر کا نضائی منظر سوائے ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ اور ان کے درمیان سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ٹریفک سے کچھ واضح نہ ہو سکا۔

جہاز سے نکل کر ہم بڑے ہال میں پہنچے جہاں قطار میں کھڑے ہو کر پاسپورٹ دکھلانا تھا۔

شیشے کے کیبن کے اندر بیٹھا سُرخ و سفید روسی افسر ہر مسافر کے پاسپورٹ کو کھول کر دیکھتا پھر آنکھیں بند کر کے سرعت سے مسافر کے چہرہ پر نظر ڈالتا' ایک بار پھر پاسپورٹ میں لگے فوٹو پر نظر ڈالتا اور پھر آنکھ بند کر کے مسافر کے چہرہ کو دیکھتا اور یہ عمل تین بار دہراتا اور کچھ نوٹ کر کے مسافر کو آگے بڑھ جانے کا اشارہ کر دیتا۔ مشکل سے پندرہ بیس منٹ میں اِس انوکھے عمل سے گزر گیا جو بہت دلچسپ تھا۔ دوسرے ہال میں ایک فارم بھر کر یہ تحریری بیان دینا تھا کہ کتنے ڈالر لے جا رہا ہوں۔ فارم انگریزی اور روسی دونوں زبان میں تھے اس لیے کوئی دشواری نہ ہوئی اور یہ مرحلہ بھی بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ اب سامان لینے گردشی بیلٹ پر جا کر کھڑا ہو گیا اور چند منٹوں میں میرا سامان بھی سامنے تھا۔ اٹیچی اٹھائی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ باہری دروازہ کی طرف بڑھا جس کی دوسری طرف مختلف استقبالیہ کمیٹیوں کے رکن ہاتھوں میں ناموں کی تختیاں اُٹھائے آنے والے مسافروں کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے بےچینی سے اُن تمام تختیوں پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر یکلخت دل و دماغ کو سکون ہوا کہ ایک صاحب کی تختی پر نیچے کچھ بگڑی بگڑی انگریزی میں میرا نام موجود تھا۔ یہ روسی محترم روس کی اکاڈمی آف سائنس کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

بڑی عجلت میں ان کے پاس پہنچا۔ تعارف ہوا اور "ہلو" کی مشترک ہنسی بھری آواز کے ساتھ ہاتھ مل گئے۔ تھوڑا انتظار کرنے کی گزارش ہوئی کیونکہ ابھی ان کی تحویل میں چار افراد کو اور آنا تھا۔ یہ بھی ایک بڑا ہال تھا۔ جہاں کافی وغیرہ کا معقول انتظام تھا۔ میں نے اپنے رہبر سے ایک کافی پی لینے کی اجازت مانگی جو گردن کی ہلکی سی جنبش سے دے دی گئی۔ میں کافی کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی کو ایک کافی دینے کا اشارہ کیا' اس نے روسی زبان میں پتہ نہیں کتنے پیسے بتائے۔ پھر یکدم خیال آیا کہ میرے پاس تو روسی کرنسی ہے ہی نہیں۔ گھبراہٹ میں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں کہ پشت سے کسی نے "کوپک" (روسی سکہ) کاؤنٹر پر رکھ دیا اور کافی کی پیالی میرے آگے بڑھا دی۔ گھوم کر دیکھا تو میرا رہبر ہاتھ میں ناموں کی تختی اٹھائے کھڑا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا فوراً ایک مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گردن کو ہلکا خم دیکر گویا کافی پی لینے کی طرف اشارہ کرتا ہوا اپنے مقام پر واپس گیا اور آنے والے مسافروں کا انتظار کرنے لگا اور میں تشکر سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

تھوڑی دیر میں تین اور مسافر آگئے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے آئے تھے۔ اب مزید انتظار کی گنجائش نہ تھی۔ میرے رہبر نے اپنے ساتھ ہمیں کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور ہم سب ایرپورٹ کے آخری دروازہ کے باہر آگئے تو گویا اب ماسکو میں داخل ہو گئے۔ گیٹ سے نکلتے ہی دو باتوں کا بیک وقت احساس ہوا۔ ایک تو شدید سرد ہوا اور ٹھنڈک اور دوسرے انتہائی کھلی اور صاف ستھری فضا۔ رہبر نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سامان ڈکی میں رکھنے کی ہدایت کی۔ سامان، ٹیکسی ڈرائیور، رہبر اور ہم لوگوں نے مل کر رکھا۔ ڈرائیور کے ساتھ رہبر بیٹھا اور ہم سب پچھلی سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ایر کنڈیشنڈ تھی اس لیے ایک بار پھر ہم لوگ گرم و گداز ماحول میں آگئے۔ میری منزل کہاں تھی۔ یہ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم تھا۔ ٹیکسی ایرپورٹ کے احاطہ سے جیسے ہی باہر نکلی تو گرد وپیش پر نظر ڈالتے ہی سب سے پہلا جو تاثر ذہن میں اُبھرا وہ یہ کہ قدرت نے اس مقام کو اپنے بیش قیمت خزانوں سے مالامال کیا ہے اور انسان نے بھی اس کے اچھوتے اور فطری حسن کو حتی الامکان اپنے کوتاہ و مصنوعی منصوبوں کے ذریعہ داغدار ہونے سے بچایا ہے اور جہاں دخل اندازی کی بھی ہے تو اس احتیاط کے ساتھ کہ فطرت کا کوراپن میلا نہ ہونے پائے۔ چاروں طرف کا ماحول انتہائی کشادہ پایا۔ چاروں طرف قدرتی جنگلات اور رنگ برنگے پیڑ پودوں و پھولوں کے درمیان صاف ستھری اور انتہائی چوڑی شاہراہ اس خوبصورتی سے نکالی گئی ہے کہ وہ بھی انہیں قدرتی مناظر کا جز بن گئی ہے۔

ٹیکسی تقریباً آدھ گھنٹہ تک انتہائی تیز رفتاری سے انہیں قدرتی مناظر سے گزرتی رہی اور سوائے چند فارم ہاؤس قسم کے مکانوں کے شہر کے آثار دکھائی نہ دیے۔ پھر ایک موڑ کے بعد جب ٹیکسی ایک پل سے گزری تو عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے دھوکا ہوا کہ شاید میں کلکتہ میں داخل ہو رہا ہوں۔ کچھ رومن اور اطالوی طرز کی محل نما پر شکوہ عمارتوں کا سلسلہ وسیع شاہراہ کے دونوں طرف پھیلا ہوا تھا۔ چوراہوں کی وسعت اور درمیان میں یا کسی مخصوص گوشہ میں نصب بلند قامت مجسموں نے ذہن میں خود بخود ایک پھیلاؤ و وسعت کا احساس پیدا کر دیا۔ یقیناً اب تک میرے زاویۂ نگاہ میں چوراہوں کی یہ وسعت نہ تھی جو پہلی بار ان کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کم لیکن رفتار انتہائی تیز تھی۔ دہلی بمبئی و کلکتہ کی طرح بھیڑ بھاڑ نظر نہ آئی۔

تقریباً ۲ بجے ٹیکسی ایک شاہراہ سے گزرتے ہوئے بڑے سے گیٹ کے اندر داخل ہوئی جس کے چاروں طرف باغ تھا اور درمیان میں محل نما قدیم عمارت۔ یہ عمارت روس کی اکاڈمی آف سائنس کی عمارت تھی۔ یہ ادارہ اگر کسی دوسرے ملک کا ہوتا تو اس کی شان وشوکت کا اندازہ اور ہی ہوتا۔ لیکن یہاں نہ کوئی دربان، نہ کوئی چپراسی، نہ کوئی گھنٹی، نہ آفس کے کمروں کے سامنے کوئی چپراسی، نہ کوئی پرائیویٹ سکریٹری نہ آفیسر کا طمطراق، نہ فائلوں کا ڈھیر۔ ایک ایسا ادارہ جہاں دنیا کے تمام اعلیٰ سائنسداں آکر جمع ہوں جہاں روس کی سائنسی ترقیاتی اسکیمیں وضع کی جاتی ہوں وہاں سادگی کا یہ عالم کہ آپ ہر کمرہ میں ہر جگہ بغیر کسی روک ٹوک کے، بغیر کاغذوں اور فائلوں کے انبار میں دبے ہر چھوٹے بڑے افسر کے بغیر لائنوں اور شناختی کارڈوں کے ہر کام بخوبی و پرسکون انداز میں انجام دے سکتے ہیں۔

آفس کا ہر کمرہ انتہائی سادہ، نہ بھاگ دوڑ نہ لائن، نہ انتظار نہ رکاوٹیں اور نتیجتاً نہ کوئی ذہنی بوجھ، نہ کوئی الجھن۔ دفتری کارروائیوں کو کس قدر آسان اور سادہ بنادیا گیا ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو روس کے اداروں کا جائزہ لیجیے۔

تقریباً دو گھنٹہ میں ساری کارروائی مکمل ہوگئی اور میرے رہبر نے ایک کاؤنٹر سے ایک ماہ کے قیام کے لیے تقریباً پانچ سو روبل دلوا کر اسی ادارہ کے ہوٹل اکیڈمی میں ٹھہرنے کا بندوبست کیا جو قریب ہی تھا۔ ۴ بجے لینن اسکوائر پر بنے ۱۲ منزلہ "ہوٹل اکیڈمی" میں پہنچا۔ پاس ہی پاس دو ہوٹل ہیں جو اکیڈمی اے اور اکیڈمی بی کے نام سے مشہور ہیں۔ میرا قیام اکیڈمی ہوٹل "اے" ۹ ویں منزل پر کمرہ نمبر ۱ میں تھا۔ ہوٹل کی ہر منزل کا انتظامی دفتر اسی منزل پر تھا جو اپنی منزل کے تمام کمروں اور ان میں قیام کرنے والوں کی ہر سہولت کا ذمہ دار تھا۔ میرے رہبر نے میری منزل کے دفتر میں میرا اندراج کرواکر "فلور لیڈی" کے سپرد کیا تو فلور لیڈی نے میرے ساتھ آکر میرے کمرہ کی ہر چیز چیک کی، بستر کی چادر، تکیہ غلاف، کھڑکیوں و دروازوں کے پردے، سسٹم، باتھ روم اور کپ بورڈ میں ضرورت کی رکھی اشیاء، ٹیلی فون، ٹی۔ وی سب کچھ چیک سامنے میز پر رکھے ہدایت نامہ کی طرف اشارہ کیا جو میں نے اٹھا کر پڑھا تو اس میں ٹھہرنے مختلف خدمات کے متعلق تفصیلات درج تھیں۔ جہاں آپ ٹھہرے ہیں وہاں سے ہسپتال، ٹو

[redacted]

ڈپارٹمنٹل اسٹورس، لانڈری، پارک و دیگر گھومنے اور دیکھنے کے لائق مقامات کتنی دور ہیں اور وہاں کیسے پہنچا جاسکتا ہے، کسی ہنگامی صورت میں آپ کو کیا کرنا ہے، ہوٹل میں کھانے اور ناشتہ کے اوقات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہوٹل کے کمرہ انتہائی آرام دہ تھے جہاں ضرورت کی ہر شئے مہیّا تھی لیکن عیش و عشرت اور فضول خرچی کا احساس مطلق نہیں ہوتا تھا۔

ہوٹل میں ناشتہ، کھانا، شام کی چائے اور رات کے کھانے کا انتظام بڑا دلچسپ ملا۔ یہ تو میرے ہندوستانی ذہن کی اپج تھی جس نے خورد و نوش کے معمول کو ناشتہ، دوپہر کے کھانے، سہ پہر کی چائے اور رات کے کھانے میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ورنہ وہاں کوئی ایسی تقسیم نہیں۔ پورے ہوٹل میں ۲ منزلوں پر ریسٹورنٹ تھے جو چھ چھ منزلوں کے مسافروں کے لیے تھے۔ صبح ۷ بجے سے لے کر ۱۲½ بجے دن تک کھلتے تھے۔ پھر ۴ بجے سے لے کر ۹ بجے رات تک کھلے رہتے تھے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ تبدیلیوں کے ساتھ کھانے پینے کی اشیاء موجود رہتی تھیں۔ اب اس میں سے آپ خود طے کر لیجیے کہ بطور ناشتہ صبح کو کیا لینا ہے۔ دوپہر اور شام کے کھانے میں کیا لینا ہے۔ کوئی بیرا نہیں، کوئی روم سروس نہیں۔ کاؤنٹر پر لائن میں کھڑے ہو جائیے۔ لگی ہوئی پلیٹوں سے ایک پلیٹ اٹھا لیجیے۔ جب آپ کی باری آئے تو پیچھے کھڑی لڑکی کو شوکیس میں بطور نمونہ رکھی ہوئی اشیاء کی طرف اشارہ کرتے جائیے۔ ہر اشارہ کے ساتھ تخمینی مشین پر سرعت سے انگلیاں چلتی جائیں گی اور آخر میں کل میزان کی پرچی آپ کی طرف بڑھا دی جائے گی۔ ادائیگی پاس بیٹھی ہوئی دوسری لڑکی کو ہوگی جو سلپ لے کر پیچھے کھڑی تیسری لڑکی کو پکڑا دے گی اور پھر وہ تیسری لڑکی آپ کی پلیٹ لے کر مطلوبہ اشیاء اس میں رکھ کر آپ کو دے دے گی۔ آپ پلیٹ لے کر کسی خالی میز پر بیٹھ کر کھائیے۔ پلیٹ کو خود اٹھا کر صفائی کے حوض کی طرف لے جانے والی خود کار بلٹ پر رکھنا نہ بھولیے ورنہ ریسٹورنٹ کا عملہ میز پر پلیٹ چھوڑ دینے کی حرکت کو انتہائی معیوب اور نازیبا سمجھے گا۔ جتنے دن قیام رہا کھانے پینے کی اشیاء میں مکھن انواع و اقسام کے دیگر بسکٹ (سب میٹھے کوئی نمکین نہیں)، پنیر کی بہت سی اقسام، یخ بستہ روسٹ کیا ہوا مرغ، کئی طرح کی مچھلی، اُبلا انڈا، آملیٹ، سلاد کی سیکڑوں قسمیں بکرے و بھیڑ کے تلے ہوئے ٹکڑے، سادی و لیموں کے قتلوں والی چائے، ہر طرح کی ملائی آئس کریم مہیا رہتی تھیں۔ اس طرح انڈوں کے آملیٹ کو چھوڑ کر کوئی شئے گرم

نہیں ملتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی بھیڑ نہ ہو تو آپ سے تھوڑی بہت صورت آشنائی ہو جانے کی بنا پر مرغ یا مچھلی کو گرم کر کے بھی دیا جا سکتا ہے، جس کو وہ آملیٹ کہتے ہیں۔ ہندوستان میں فرائی انڈا ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ اس میں یہاں کی طرح پیاز وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ صرف پھینٹ کر دونوں رخ سے تل دینے کو وہ آملیٹ کہتے ہیں اور ثابت زردی کے ساتھ ایک طرفہ تلے ہوئے کو فرائی۔ نمک مرچ یا دیگر مسالوں کا کوئی تصور نہیں، ہاں میز پر گول مرچ اور نمک رکھا مل جائے گا جو آپ استعمال کر سکتے ہیں۔ کھانا انتہائی سستا۔ سب کچھ لینے کے بعد بھی کبھی بل ۲ یا ۳ روبل سے زیادہ نہ ہوا اور یہی حال پورے ماسکو کے ہر بڑے سے بڑے ہوٹل اور ریسٹورنٹ کا ہے جہاں کا بل ۵ تا ۱۰ روبل سے زیادہ نہ ہوا۔

ماسکو میں دیکھنے اور گھومنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ ماسکو میں جس مقام کو مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ کریملن ہے جس کو عرف عام میں ریڈ اسکوائر (لال چوک) کہتے ہیں۔ ایک بہت بڑے چوراہے کے کنارے، جس کی وسعت کو دیکھ کر چوراہا کہنا غلط اور بہت بڑا میدان کہنا زیادہ مناسب ہے، دو پرشکوہ قدیم عمارتوں کے درمیان سے چڑھائی لیتا ہوا راستہ جاتا ہے جو اینٹوں کا بنا ہے۔ چڑھائی ختم ہوتے ہی آپ کی آنکھوں کے سامنے اینٹوں کی جڑائی کیا ہوا عظیم میدان ہوگا جس کے ایک طرف وہاں کی پارلیمنٹ کی وسیع عمارت کی پشت نظر آئے گی اور جس کے درمیان گنبد پر سوویت یونین کا لال جھنڈا لہراتا دکھائی دے گا۔ یہ عقبی دیوار دیودار جیسے خوبصورت درختوں کی لمبی قطار سے سجی ہوئی ہے۔ اس عمارت کے ایک کنارے پر انتہائی خوبصورت اور بلند و بالا گھنٹہ گھر کا مینار ہے۔ اسی دیوار سے منسلک درمیان میں لینن کا مزار ہے جس کی زیارت کے لیے لوگ صبح سے قطاریں باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ مزار ایک کھلی کتاب کی شکل کی سنگِ موسٰی کی عمارت ہے۔ اگر آپ "لال چوک" کے سامنے کھڑے ہوں تو آپ کے داہنے طرف یہ ساری عمارتیں نظر آئیں گی اور بالکل سامنے کچھ ڈھال کی طرف نشیب میں وہ مشہور و معروف قدیم چرچ ہے جو دنیا میں روس کی پہچان ہے۔ یہ چرچ چھوٹے بڑے متعدد رنگ برنگی گنبدوں سے سجی عمارت ہے جو اگر ہر جز کو الگ کر کے دیکھا جائے تو کوئی خاص کشش نظر نہ آئے گی اور اگر اوپر نیچے، دائیں بائیں متعدد رنگ برنگی چھوٹے بڑے گنبدوں کو یکجا کر کے پوری عمارت کو ایک 'وحدت' کی شکل میں دیکھیں تو انتہائی

[redacted]

جاذب نظر اور پرکشش لگے گی۔ بائیں ہاتھ کی طرف بھی ایک محل نما عمارت ہے جو قدیم بادشاہی دور کا محل ہے جس میں "گوم" کے نام سے معروف اب ایک مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹور قائم ہے۔ اس تین منزلہ عمارت کی چھت شیشے کی ہے اور درمیان میں کشادہ راستہ اور دونوں طرف بڑی بڑی بارونق دکانیں ہیں۔ یہ اسٹور ہزاروں آدمیوں سے ہر وقت بھرا رہتا ہے۔

لینن کے مزار کو دیکھنے کے لیے عوام کی لمبی قطار دیکھی تو خود بھی خواہش ہوئی کہ چل کر دیکھا جائے۔ صبح اپنے ہوٹل سے بس پکڑ کر لال چوک پہنچا اور لائن میں لگ گیا۔ لائن دھیرے دھیرے آگے بڑھتی گئی اور میں بھی دھیرے دھیرے آگے کھسکتا رہا۔ لال چوک میں داخلی دروازے کے پاس جب پہنچا تو ایک سپاہی نے سیٹی بجا کر ہمارے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ ہاتھ میں چمڑے کا پورٹ فولیو تھا، اشارہ دوسری طرف کیبن میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف تھا۔ میں بھاگ کر اس کے پاس گیا اس نے بیگ جمع کرنے کا اشارہ کیا۔ بیگ اس کو تھمایا، ٹوکن لیا اور بھاگ کر لائن کے پاس پہنچا تو بھول گیا کہ کس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ سپاہی جس نے اشارہ کیا تھا سمجھ گیا۔ اپنی جگہ سے بھاگ کر آیا اور ٹھیک اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں پہلے تھا اور مجھے بھی فوراً یاد آگیا۔ جب ـ مزار دور تھا لائن میں دھیمی دھیمی باتوں، کبھی کبھی نوجوانوں کے ہنسنے اور مذاق کی دازیں آرہی تھیں لیکن جیسے جیسے مزار قریب آتا گیا ساری آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ رمزار کے بالکل قریب پہنچ کر تو ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سیکڑوں آدمی بالکل خاموش بت بنے ڑے تھے اور آہستہ سے جوتے اتار کر چبوترے پر چڑھ کر لائن لگائے آگے بڑھ رہے تھے۔

جب میری باری آئی تو میں نے بھی جوتے اتارے اور کالے چمک دار پتھر پر پیر رکھ کر گے بڑھا۔ سامنے تھوڑے فاصلے پر مزار میں داخلے کا دروازہ تھا۔ دروازہ کے دونوں طرف نگینیں تانے دو دراز قد سپاہی مجسموں کی طرح آمنے سامنے کھڑے تھے اور میری آنکھیں اس قت تک دھوکا کھاتی رہیں جب تک میں ان کے قریب نہ پہنچ گیا۔ گوشت پوست کا سانس لیتا ہوا، آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا ہوا انسان پتھر کے مجسموں کی ایسی ہو بہو نقل رے کہ سانس کے زیر و بم کا احساس تک نہ ہو، پلک نہ جھپکے ہاتھوں، انگلیوں اور پیروں میں خفیف سی جنبش بھی نہ ہو، نگاہوں اور پتلیوں کے زاویوں میں مطلق تبدیلی نہ ہو اور

؛اور جہاں ذہنی سوچ کو بھی منجمد کر لیا جائے اس کو آرٹ کہوں، عقیدت کہوں یا ریاضت کا کمال جو میرے سامنے تھا۔ میں ان کے درمیان سے ہو کر گزرا لیکن وہ پورے ماحول سے بے بہرہ اور بے پروا ایک مرکز پر نگاہیں ٹھہرائے اور پورے جسم کو بت سنگ بنائے کھڑے رہے۔ مزار کے اندر کا ماحول عجیب طلسمی پایا۔ میرے ذہن میں تھا کہ لینن کا حنوط شدہ جسم سامنے نظر آئے گا لیکن وہاں سیاہ اندھیرے دماحول میں گیلری کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اتنا پرپیچ تھا کہ کوئی شخص اپنے طور پر باہر نکلنے سے قاصر تھا۔ ہر قدم اور ہر موڑ پر ایک رہبر کھڑا گزرنے والوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے جاتا اور ہم سب کی لائن اندھیری گلی سے گزرتی جاتی۔ اور پھر ایک موڑ پر جیسے ہی آگے بڑھے تو اچانک تیز روشنی کا جھما کا سا ہوا۔ یہ ایک کمرہ تھا جس کے ایک در میں کھڑا ہوا تھا۔ سامنے کٹہرے میں لینن کی حنوط شدہ لاش مکمل لباس میں ابدی نیند سو رہی تھی۔ اندھیرے سے اچانک اُجالے کا جھماکا۔ لینن کا اچانک سامنے آنا اور سیکڑوں انسانوں کا طواف دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ مزار کے عقب سے نکلنے کا راستہ ہے جو اسی قدر پیچ پیچ ہے مزار سے نکل کر سامنے کریملن کی دیوار ہے جس کے نیچے ان سیکڑوں جاں نثاروں کی قبریں ہیں جو انقلاب روس میں کام آئے۔ یہ قبریں کریملن کی دیوار کی لمبائی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سب کو جو احترام دیا گیا ہے وہ حقیقتاً قابل قدر ہے۔

(باقی آئندہ)

طارق جمیل فلاحی

مصر میں جدید عربی زبان و ادب کا آغاز

۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں اسلامی افکار و علوم کا عظیم مرکز، اور اپنے دور کا عروس البلاد بغداد ہلاکو خاں کے ہاتھوں تاراج و تباہ ہو کر رہ گیا۔ سقوط بغداد کے ساتھ سطوت اسلامیہ کی چولیں ہل گئیں اور بالآخر اس زوال کا سبب اسلام کے ایک زریں عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ ۷ ویں صدی عیسوی میں سرزمین حجاز میں اسلام کا نور چمکا اور دیکھتے دیکھتے اس کا دائرہ اثر اتنا بڑھ گیا کہ انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جو اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ عرب اسلامی تہذیب کا سیل رواں وسط ایشیا سے بحر اوقیانوس تک پھیل گیا۔ عربوں کے عروج کا یہ دور تقریباً پانچ صدی تک جاری رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اسلامی ریاستوں کی مذہبی، سماجی اور ثقافتی وحدت میں خلل پڑنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ سلطنتِ عباسیہ کے خاتمے کے ساتھ ساتھ باقی ماندہ اسلامی معاشرے کا شیرازہ بھی بکھر کر رہ گیا، اس کے بعد عرب ممالک پر غیر ملکیوں کے تسلّط کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ ۹۲۳ھ میں مصر و شام کے علاقے خاندانِ غلامان سے نکل کر ترک عثمانی حکومت کے زیر اثر آ گئے۔ یہ گویا اعلانِ عام تھا کہ اب عربوں کی قوت و اقتدار کا شیرازہ منتشر ہونے والا ہے۔ عالم اسلام پر تقریباً پانچ سو ساٹھ برس کا طویل عرصہ ایسا گزرا جس میں عربوں کا جھنڈا نصب ہوا اور نہ دخل اندازی کی کوئی شکل قائم رہی بلکہ اس خطے میں داخلی و خارجی حالات روز افزوں بگڑتے ہی گئے، نیز ان پر مشرق کی

جناب طارق جمیل فلاحی، شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کی طرف سے مغلوں، اہل فارس، ترکوں، کُردوں اور مملوک خانوادوں کی حکومتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔
۱۳ ویں صدی ہجری سے وہ دور شروع ہوا جسے مجموعی طور پر دور انحطاط کہا جاتا ہے، یہ دور ۲۰ ویں صدی تک محیط ہے۔ بلاد عربیہ کی حالت انتہائی فساد و انحطاط سے دوچار تھی اس فساد و انحطاط کا تانا بانا حکومت و سلطنت، اخلاق و عادات، اور لغت و ادب سبھی سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ دریں اثناء معاصر فکر عربی گوناگوں عوامل، بیداری اور تبدیلیوں کی عظیم معرکہ آرائی سے دوچار رہی، جس کے اثرات فکر و ادب کے جملہ شعبوں پر بہت دوررس ثابت ہوئے۔ جہاں تک مصر کا تعلق ہے تو وہ سلطنت عثمانیہ کے ماتحت تھا، اور اس کی حالت بھی ان دیگر بلاد عربیہ ہی جیسی تھی جن کی فکری، علمی اور ادبی سرگرمیوں کو سلطنت عثمانیہ کے استیلاء نے میٹھی نیند سلا دیا تھا اور شاید بے راہ رویوں، اور تباہیوں میں انہی افراد و ممالیک (سلاطین غلامان) کے باقی رہ جانے کا زیادہ ہاتھ تھا، جو اس کے سرکردہ زعماء بنے ہوئے تھے۔
۱۲ ویں صدی ہجری اور ۱۸ ویں صدی عیسوی میں پرتگالیوں نے عربوں کے خلاف ایک اقتصادی جنگ چھیڑ دی، جس میں پوری کوشش یہ تھی کہ عربوں کو ان کی مشرق کی تجارت سے محروم کر دیں۔ پرتگالی اپنی کوشش میں کامیاب رہے۔ چنانچہ جنوبی افریقہ میں راس امید Cape Of Good hope کی کھوج سے، جو ایک بحری راستہ تھا، یہ تجارت عربوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اس کے بعد یورپ اور ایشیا کی باہمی تجارت ساری کی ساری اس نئے راستے سے ہونے لگی، اور جزیرہ نما عرب جو عالم عرب کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا، نہ صرف معاشی کساد بازاری بلکہ ذہنی و علاقائی علیحدگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور یہ حادثہ اس وقت پیش آیا جب قسطنطنیہ سے یونانی علماء نے اپنے بیش بہا علمی، تہذیبی میراث کے ساتھ مغرب کی طرف ہجرت کی تھی۔ اس ذہنی و فکری خزانے سے پہلے اہل اطالیہ اور پھر مغربی یورپ کے لوگوں کو مالامال کر دیا تھا، اور ان میں تہذیبی ترقی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ اس اہم تہذیبی تحریک نے جو نشاۃ ثانیہ کے نام سے موسوم ہے مغربی دل و دماغ کو عربی اسلامی اثرات سے جو قرون وسطیٰ میں ان کے ذہن پر غالب رہے تھے، بے نیاز کر دیا اور انھیں سائنس، صنعت، اور برقیہ کے میدان میں فکری اور مادّی ترقی کی ایک نئی راہ پر لگا دیا جس پر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے عالم اسلام

کو پیچھے چھوڑ گئے۔ چونکہ اب اسلامی ملکوں کا جنھوں نے قرونِ وسطیٰ میں مہذب دنیا کی تہذیبی قیادت کی تھی، برق رفتاری سے ترقی کرنے والے مغربی ملکوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا، اس لیے وہ طبیعی علوم کے اس خزانے اور صنعتی مہارت کی اس بیش بہا پیش رفت میں مغربی نشاۃ ثانیہ کے بعد کئی سو سال کے دوران بھی کوئی حصہ نہ بٹا سکے۔ اس کا نتیجہ، عرب دنیا، خاص کر مصر میں جو بغداد کے بعد علم و تمدن کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، تعلیمی پسماندگی کی شکل میں نمایاں ہوا۔

رفتہ رفتہ عالم عرب کے ہر خطّے پر استعماری قوت کی دخل اندازی کی شکلیں بڑھتی رہیں۔ ۱۱ویں تا ۱۲ویں صدی ہجری (۱۷ویں تا ۱۸ویں صدی عیسوی) تک تعلیمی، تمدنی، اور خاص کر سیاسی سطح پر جمود و تعطّل کی سی کیفیت طاری رہی، اس کے بعد اس علاقے پر مغرب کی یلغار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ حملہ اس وقت اور بھی تیز اور شدید ہوگیا جب عثمانی سلطنت میں کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے، یورپ نے اپنے اس حملے میں انھیں افکار و علوم کے نتائج سے کام لیا جنھیں اس نے عربوں ہی کے فیضان سے حاصل کیا تھا۔ عرب دنیا خوابِ غفلت سے اس وقت جاگی جب اس حملے کی شدت حد سے بڑھ چکی تھی، اور اس کی چوٹ اتنی سخت اور گہری ہو چکی تھی کہ عربوں میں مزاحمت کی سکت نہ رہ گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استعماری قوم کی فکری یلغار وقفہ وقفہ سے حقیقی جنگ و جدال اور ملکوں پر تسلّط کی شکل میں بدل گئی۔ بالآخر ۱۷۹۸ء میں مصر پر حملہ اس سمت کی ایک بڑی کڑی اور مصریوں کے لیے تازیانۂ عبرت ثابت ہوا۔ حتّٰی کہ ۱۹۱۸ء تک عالم عربی کلیتہً مغربی استعمار (فرانس، برطانیہ) کے زیرنگین ہوگیا۔ اس سلسلے کا ۱۸۳۰ء میں الجزائر پر فرانسیسی استعمار کے تسلّط سے آغاز ہوا، پھر برطانوی سامراج نے عدن پر ۱۸۳۸ء میں قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد فرانس نے تیونس پر اپنا خونی پنجہ گاڑ دیا۔ دوسری طرف ۱۸۸۲ء میں مصر پر برطانوی سامراج نے تہذیب و ثقافت کا خوشنما لبادہ اوڑھ کر شب خون مارا، اور ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے لیبیا پر مکمّل قبضہ کر کے آخری کیل ٹھونک دی۔

کوئی بھی تہذیب و ثقافت اس وقت ہی جملہ سرو سامان کے ساتھ ترقی کے منازل طے کرتی رہتی ہے جب تک اس کے در و بام باہر کی تر و تازہ ہوا کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ عثمانی ترکوں کے زمانے میں علوم و فنون کے تقریباً سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دی گئی

تھیں، جس کی وجہ سے صدیوں تک عربی زبان انحطاط کا شکار رہی۔

یوں مصر میں ترقی و تجدد کے آثار ۱۵۱۷ء بمطابق ۹۲۳ھ سے شروع ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں، جب سلطان سلیم اوّل نے اس ملک پر قبضہ کرلیا تھا۔ جغرافیائی لحاظ سے مصر کی اہمیت بہت اہم تھی، اس لیے اغیار کی حریصانہ نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ فرانسیسی اقوام نے اپنی قوت اور توسیع پسندی کے زعم میں اشیاء تجارت اور علوم و فنون کو فروغ دے کر اس اعلان کے ساتھ مداخلت شروع کردی کہ جو اس کی راہ میں مزاحم ہوگا، جواباً ان سے ٹکر لی جائے گی۔ چنانچہ اس کی ابتداء مصر و شام پر فوجی یلغار سے ہوتی ہے۔

•عرب فضلاء کی نگاہ میں یورپ کی دخل اندازی جرنیل نپولین بونا پارٹ کی مصری مہم سے ہوتی ہے۔ یہ مہم جوئی مشرق و مغرب کے مابین ثقافتی یلغار کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ اس اشتراک کی وجہ سے مغربی تمدن کے بے شمار عناصر اپنا لینے سے عرب طرزِ فکر پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ۱۹ویں صدی عیسوی میں تجدید و احیاء کی تحریک ایک نئے ادب کے ظہور کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس تحریک کے علمبرداروں کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عربی زبان کو اس کے گذشتہ صدیوں کے انحطاط سے نجات دلائی جائے۔ اور کلاسیکی ادب کی میراث کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔ ابتدائی دور میں فصیح زبان کے علمبرداروں میں ناصف الیازجی بلادشام میں، نصر الہورینی اور علی پاشا مبارک مصر میں، اور عراق میں محمود شکری آلوسی نمائندہ شخصیات ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اہل قلم شعوری طور پر اپنی درسی اور نئی تصانیف میں کلاسیکی روایت کے خواہاں تھے۔

دریں اثنا مصر سیاسی، اقتصادی اور فکری طور پر اتھل پتھل کی آماجگاہ بنا رہا۔ لیکن قدرت عثمانیوں کی حامی تھی۔ اس لیے جرنیل نپولین مصر میں زیادہ دنوں تک قبضہ کرکے دیرینہ خواب پورا نہ کرسکا۔ تین سال (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۱ء) کے اپنے قیام کے مختصر عرصے میں فرانسیسیوں کے علمی، فکری، سیاسی، غرضیکہ ہر شعبۂ حیات پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے۔ سیاسی زور آزمائی اور عرب قوم پرستی کے پرزور نعروں نے نئی نسل کے قلب و ذہن کو ان نئے رجحانات سے آراستہ کرنے میں مہمیز کا کام کیا، جن سے اس وقت کی مصری سوسائٹی درآمد شدہ علوم و فنون کے

بر تنے سے ہر محاذ پر معرکہ آرائی سے دوچار تھی، رفتہ رفتہ اس کشمکش کی صدائے بازگشت خطابت وصحافت میں بکثرت سنائی دینے لگی۔ اس علمی، سماجی، اور فکری آگہی کے فروغ سے عربی زبان وادب کے لیے جدید خطوط پر ترقی کرنے کے واضح آثار اور نئی بنیادیں فراہم ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ اس کی پیش رفت محمد علی پاشا کے ہاتھوں فرانسیسیوں کے اخراج کے بعد شروع ہوئی۔ یہاں سے مصر ایک نئی سمت کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ البانوی نژاد فوجی جرنیل محمد علی پاشا مصری افق پر نجات دہندہ بن کر نمودار ہوا۔ اس نے اپنی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں سے جدید مصر کو نئی قوت، نیا عزم اور ایک نئی جہت فراہم کی۔ اس طرح اس کے اختیارات نے مستقل نوعیت اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنی تمام تر توجہ مصر کی علمی، ادبی، فنی، سیاسی اقتصادی، الغرض ہمہ جہت ترقی واستحکام کی طرف مبذول کر دی۔

محمد علی پاشا کے عہد سے ترقی کی طرف مصر کی تیز گامی، نیز عربی زبان وادب کے اندر ایک نئی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہاں صدیوں سے عربی کی جگہ غیر ملکی زبان مسلط تھی جس کے باعث عربی زبان وادب پر جمود طاری تھا۔ قدامت پرستی کے دبیز پردے اس پر اتنے تہہ در تہہ چڑھے ہوئے تھے کہ ارباب علم ودانش ان پردوں کو چاک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف روایت پرستی کا سلسلہ اتنا طویل تھا کہ عربی ادب کی روح اس کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ محمد علی نے اصلاحات کے لائحہ عمل میں بالارادہ مغربی اسلوب اختیار کرنا شروع کیا جس کا مرکز توجہ فرانس تھا، اور جو ہر جگہ عالمگیر جنگ کے بعد ایک مثالی نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں محمد علی نے اپنی حکومت کو استحکام بخشنے کے لیے یورپ کے ماہر علماء وفضلاء سے مکمل تعاون حاصل کیا۔

یورپ کے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے حکومت کے تمام شعبوں میں صحت مندرول ادا کیا۔ فرانس میں درس وتعلّم کے لیے طلبہ کی روانگی، یورپی اصولوں پر مدارس کی تاسیس، اور عربی مطبع کا قیام، اور سب سے بڑھ کر یورپی کتب کے تراجم کے نتیجے میں بے شمار مغربی خیالات کے اظہار کے لیے تعبیرات کے عربی سانچے کی ضرورت پہلے مصر میں اور پھر دوسرے ملکوں میں محسوس کی جانے لگی۔

اس دور کی علمی شخصیتوں میں شیخ عبدالرحمٰن الجبرتی (۱۷۵۳ - ۱۸۲۹ء) اور شیخ رفاعۃ الطہطاوی (۱۸۰۱ - ۱۸۷۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ ادباء و انشاء پردازوں کی بڑی تعداد زبان کی محافظت و سالمیت کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب بیان میں جدت کے لیے برابر کوشاں رہی۔ اس تحریک میں شیخ حسن العطار، شیخ حسن قویدر، سید علی الدرویش، معلم بطرس کرامہ اور رفاعہ الطہطاوی، وغیرہم نمایاں اور سرکردہ حضرات میں سے ہیں۔ ان کی سرپرستی میں غیر معمولی لسانی و علمی خدمات انجام پائیں، نیز اس کے پہلو بہ پہلو مغرب کے علمی و ادبی سرمائے کو عربی میں منتقل کرنے کی خاطر ۱۸۳۶ء میں "مدرسۃ الادارۃ والالسن" قائم کیا گیا۔ یہ سب کچھ غیر ملکی زبان کے مقابلے میں عربی زبان و ادب کے احیا اور جدید علوم کے فکر و اسلوب سے وابستگی کی راہیں کھلنے میں واضح پیش رفت کی شکلیں تھیں۔ ملک کی طبعی مناسبت اور اس کے فطری رجحان کا لحاظ کرتے ہوئے محمد علی نے جملہ انتظامی شعبوں میں ترکی اور دیگر یورپی زبانوں کے مقابلے عربی زبان کو فوقیت دی اور اس کا لکھنا پڑھنا لازمی قرار

اس دور کے ہم عصر مصنفین کی ایک جماعت نے موجودہ حالات کے تقاضے سے مغربی ادب اور خیالات سے قریب تر تعلق پیدا کرنے کی جانب ایک بنیادی کوشش کی۔ واضح رہے کہ اس سمت پہلا بڑا محرک فوجی اور شہری اداروں کی تنظیم نو کی اہم ترین ضروریات تھیں۔ مصر و شام کے سرکاری و نیم سرکاری مدارس، مشنری تعلیم گاہوں میں فرانسیسی و انگریزی زبان کی جبری تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ فرانسیسی اور انگریزی جرائد و مجلات مصر، شام اور لبنان کے اندر قبولِ عام حاصل کر گئے۔ یورپی زبانوں سے فنی تصانیف کی منتقلی ایک عصری ضرورت تھی۔ اس لیے سیکڑوں علمی، وغیر علمی، سیاسی مقالات نیز ڈراموں، قصّوں اور ناولوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ تاہم زبان و بیان اور اسلوب کا وہ اعلیٰ معیار قائم نہ ہو سکا بلکہ زیادہ تر حصّہ عامیہ زبان پر مشتمل تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ وافر علم و فن اور بہت سے فوائد ادبی ان افراد کو حاصل ہوئے جو اجنبی لغات و اسالیب سے ناواقف تھے۔ یورپ و مشرق کے مستعربین کی کثرت تعداد، علوم عربیہ کی طباعت و اشاعت کی غرض سے مطابع اور اداروں کی تاسیس عمل میں آجانے کے بعد زبان و ادب کے حق میں فضا ہموار ہوتی چلی گئی۔ مغرب سے اختلاط نے عرب فضلاء کے اندر صدیوں بعد اپنی لسانی اور ادبی روایات پر نظرِ ثانی کرنے کا شعور بیدار

کیا۔ قدیم عربی سرمایہ بالخصوص عربی لغات، اور کتب صرف و نحو کی طباعت سے بہت سی قدیم روایات کے احیاء میں سہولت پیدا ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت ہے کہ منفی رجحانات کے سبب تجدید و احیاء کی کاوش مخصوص نظریے یا فکری انداز پر ہوئی۔ مغربی استعمار نے اپنے مقصد برآری کی خاطر ایسے فرعونی ہتھکنڈے استعمال کیے کہ عرب فضلاء و علماء ان کی مزاحمت و مقاومت میں عرصے تک مشغول رہے۔ ان محرکات کے پس پردہ معاصر ادباء، فضلاء، خطباء اور سیاست دانوں کے مابین متضاد نظریات و افکار کی کشمکش نے علم و ادب کی فضا کو نہ صرف بہت زیادہ متاثر کیا، بلکہ لوگ گروہوں اور جمعیتوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک طبقہ جدت پسندی کو زہر سمجھ کر قدیم موروثی روایات کا ترجمان تھا۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ درآمد کردہ فکر و نظر کو ترقی و نجات کا اصل سرچشمہ قرار دے رہا تھا۔ قابل ذکر امر یہ کہ اس کے دوش بدوش حریت پسندی اور وطنطیت کے گیت گائے جا رہے تھے۔ گویا اس طرح اندرون خانہ مختلف قسم کی ادبی و سیاسی تحریکیں جنم لیتی رہیں۔

یہ امر لائق بحث و نقد ضرور ہے کہ اس عہد کی مترجمہ فنی تصانیف کی اشاعت کتنی تھی یا کس حد تک انھوں نے ادباء اور رائے عامہ کو متاثر کیا؟ لیکن اس کے علاوہ رفاعہ الطہطاوی اور ان کے معاصرین کے نزدیک وہ مغربی مواد جو وہ ادبی تصانیف میں استعمال کرتے تھے، وہ محض الحاقات یا اس نوع کے ضمیمے نہیں تھے جنھیں جدید عربی ادب کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا، بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ترجمہ و تالیف کا میلان مغربی ادبیات کی طرف زیادہ اور طبع زاد تخلیقات کی طرف کم تھا۔ مزید برآں ۱۹ویں صدی کے مترجمین و مؤلفین کا عربی ادب کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصہ ہے۔ جس طرح عباسی عہد کے مترجمین و انشاء پردازوں کے بغیر ابن المقفع اور الجاحظ کی تصانیف کا منظر عام پر آنا ممکن نہ تھا۔ اسی طرح عربی ادب میں نئے رنگ و روپ کا پیدا ہونا اور اس کی ترقی پذیری ۱۹ویں صدی کی کوششوں کے بغیر ممکن نہ تھی۔ انداز بیان کو وسعت دینے کے لیے یہ ابتدائی کوششیں محض تجربے ہی نہ تھے بلکہ انھوں نے نمونوں کا بھی کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ملکیوں کے نفوذ کے آغاز ہی سے بہت سے مترجمین نے اس نوعیت کی جدید تصانیف تیار کرنے میں حسب استطاعت طبع آزمائی کی، اور کئی لوگوں کو نئی تالیف

وتحریر کا حوصلہ بھی انھیں کی بدولت ملا۔

ترجمہ و تالیف کے ضمن میں ملکی الفاظ کے پہلو بہ پہلو مغربی تصوّرات کو ادا کرنے کے لیے خالص جدید عربی (نوساختہ) کے الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ تاہم زائد از ضرورت غیر ملکی الفاظ کے بکثرت استعمال میں نئی تعبیرات کی روز افزوں ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے فکری زندگی کا ایک اہم ترین اور بنیادی مسئلہ بن گیا۔ جدید طبقہ ان نئے افکار و مفاہیم کو مروّج ہوتا دیکھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف قدیم افکار و روایات کے علمبردار جدّت پسندی اور تنوع پسندی کے شدید مخالف تھے۔ اس ثقافتی اور فکری معرکہ آرائی کے نتیجے میں "قدیم و جدید"، "فصحیٰ و عامیہ" جیسی نئی نئی ادبی بحثیں منظر عام پر آتی ہیں۔ لہٰذا اس قضیے پر باہم متصادم افکار و خیالات نے عربی اسلوب اور روایات پر غیر معمولی نقوش ثبت کیے۔

تجدد پسندی کے آثار اس وقت ایک اہم اور مستقل رنگ، و روپ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جب فرانسیسی و انگریزی کے علاوہ نئے عربی رسائل و مجلّات نے جو ابتدا میں زیادہ تر شامی و لبنانی اہل قلم کے مرہون منّت رہے۔ آگے چل کر جلد ہی طاقتور مصری صحافت اور جدید عربی رسائل کی نشوونما کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ عامیہ زبان کی مخالفت اور فصیح زبان کی اشاعت میں صحافت کا کردار متوازن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی، علمی، تاریخی، اور مذہبی اور ادبی کاوشوں کی اشاعت کے لیے صحافتی ادب ایک وسیع جولان گاہ ثابت ہوئی۔ مختصر عرصے کے اندر صحافتی انشاء نے زبان کے قدیم قیود و بندشوں سے نجات حاصل کر لی اور نئے اسلوب اور جدید طرز استدلال کے زیور سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ چنانچہ مصر کا پہلا عربی اخبار "الوقائع المصریۃ" اس سمت میں پہلی کامیاب کوشش تھی۔ اس وقت کے انشاء پردازوں نے علامہ ابن خلدون کے اسلوب کو ترجیحی حیثیت دی۔ عصری ادب کے ارتقائی مراحل کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ محمد علی اور اسماعیل پاشا کے ادوار کے نثری اسلوب میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ فکری و علمی بیداری کے بنیادی رجحان نے مصری ذہن و دماغ کو جلا بخشا۔ فن و اسلوب کی بہتری کے دوش بدوش رکاکت اور صنعت لفظی کے گورکھ دھندوں سے پاک سہل نگارشات کا اظہار ہونے

نگار نحو و بلاغت کے تنگ حلقے میں محصور صحافت گلو خلاصی پا کر ایک جدید آفاق کی سیر کرنے لگی۔

ہم عصر فکر کی تشکیل میں مدارس اور تعلیم کا نمایاں اثر ہے۔ تعلیم کی ترویج و ترقی اس فکری بیداری کی علامت ہے جو وطن عربی پر محیط ہے۔ علاوہ ازیں یہاں پر متعدد عوامل طبیعی اس کی انجام دہی کی راہ میں حائل ہوتے رہے، جن میں استبداد، جاگیرداری، اور غیر ملکی نفوذ شامل ہیں۔ محمد علی کے عہد میں جدید مدارس عسکری قوت کے حصول کی خاطر عمل میں ضرور آئے، لیکن عربی زبان و ادب اپنوں اور اغیار کی ریشہ دوانیوں سے سخت مزاحمت سے دوچار ہوئی، جب سامراجی قوتوں نے خاص حکمت عملی کے تحت فرانسیسی اور انگریزی زبان کو بطور جبری ذریعہ تعلیم نافذ کرنے کی کوشش کی۔ فرنگی نظام تعلیم کا واحد مقصد عربی شخصیت اور اس کی امتیازی خصوصیات کو مٹا کر ایک ایسی شخصیت کی تعمیر تھا جس کا قالب تو عرب ہو لیکن قلب و جگر استعماری، اور اپنے کردار میں غیر ملکی آقاؤں کے تابع و فرماں بردار ہوں۔ اس پالیسی کے تحت تعلیم کو محدود اور اس کے جامے کو اتنا تنگ کر دیا جائے کہ اس کے ذریعہ صرف سرکاری ملازمین پیدا ہوں جو صنعت و حرفت جیسے علوم و فنون سے عاری ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے دین و مذہب کی روح سے متنفر ہو جائیں مگر اہل مغرب کی یہ کوشش ناکام رہی۔ عربی زبان نے اپنے تشخص و عظمت کی پوری مدافعت کی۔ اس معرکہ آرائی کے سبب عربی ادب کے جلو میں مختلف اصناف سخن، اسالیب اور فکر و فن کو توانائیوں اور رعنائیوں سے بھرپور مناسب غذا فراہم ہوتی رہی۔

اس ادبی و فکری ارتقاء کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جامعہ ازہر اور دوسری درسگاہوں نے ان نازک حالات میں موثر رول ادا کیا۔ تعلیم کی تنظیم نو کے ساتھ ساتھ بہت سے علوم و فنون جدیدہ کو ان تعلیم گاہوں کے نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ اس میدان کی اصلاحات کی تجاویز و مساعی میں علامہ افغانیؒ اور بالخصوص شیخ محمد عبدہؒ کی کاوشوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ دراصل وہ جامعہ ازہر کی روایتی تعلیم سے مطمئن نہ تھے۔ منطق، فلسفہ، اور علوم ریاضی کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کو نظام اور نصاب میں داخل کرنے کے کوشاں رہے۔ لیکن یہ تحریک عمل کچھ وقفے کے بعد سرد مہری کا شکار ہو گئی۔ چنانچہ ایک طرف مشرق و مغرب کے مابین ادبی، لسانی، فکری اور تہذیبی کشمکش اپنے عروج پر قائم تھی، تو دوسری طرف ذہنی جمود کا وہ طلسم تھا جس میں مسلمانوں کے

ذہن عصر جدید کی ابتدائی صدیوں میں مقید تھے۔ رفتہ رفتہ مغرب کے سیاسی و تہذیبی تصادم کے نتیجے میں عالم عرب خصوصاً مصر میں تجدد پسندی اور دوسری طرف احیائے ماضی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس باہمی رسا کشی کا لازمی نتیجہ انگریز سامراج کا ۱۸۸۲ء میں مصر پر غاصبانہ تسلط کی شکل میں ظاہر ہوا۔ برطانوی سامراج نے فرانسیسیوں کی حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھا کر انگریزی کو جبراً نافذ کر دیا تاکہ مصری حکومت کو داخلی طور پر آسانی سے استحکام اور دوام نصیب نہ ہو سکے۔ سامراج کے طریق کار تعلیمی نظم و ضبط، لسانی اور تہذیبی سیاست کے عمل دخل سے عربی فکر و عمل کی تحریک رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگی۔ لیکن اتنی حقیقت ضرور ہے کہ اس اختلاط سے قومی، ملّی، دینی اور سیاسی شعور کو برانگیختہ کرنے میں ہمہ گیر رجحان کو بڑی تقویت ملی۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹ ویں صدی میں جدید عربی نثر و انشاء پردازی مرحلہ بہ مرحلہ تجربے اور تقلید کے زیر سایہ نشو و نما پاتی رہی، جس کے آثار ۱۸ ویں صدی کے آخری عشرے سے ظاہر ہونے لگے تھے، اور پھر آگے چل کر ایک مضبوط، ترقی یافتہ شکل اور پورے رنگ و آہنگ میں نظر آتی ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

سرسید کی تعزیتی تحریریں

(ریویو آرٹکل)

سرسید مرحوم کی شخصیت جامع اور مختلف علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی رجحانات کی حامل تھی، اس لیے ان کی شخصیت کا اثر زندگی کے مختلف گوشوں میں نمایاں ہے۔ وہ روایتی طرزِ فکر میں تبدیلی کے علمبردار تھے، اور خاص اس وجہ سے کوئی ان کے افکار و خیالات سے صرف نظر نہیں کر سکتا تھا، اور اسی لیے ان کی موافقت بھی ہوئی اور مخالفت بھی، مخالفت میں شدت اس لیے تھی کہ وہ جسے حق سمجھتے تھے برملا کہتے تھے اور کسی صلے کی تمنّا یا کسی ملامت کے خوف سے بالاتر ہو کر کہتے تھے۔ قدامت پرست ان کی حق گوئی کے بارِ گراں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے مخالفت میں یہی لوگ پیش پیش تھے۔ لیکن سرسیّد نے مخالفوں کے اچھے کاموں کو سراہا اور ان کی قدر کی۔

جامع شخصیتوں کے روابط بھی مختلف الخیال لوگوں سے ہوتے ہیں اور نوعیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ سرسید تعلقات کا بڑا پاس کرتے تھے اور دوستی کو ایک اعلیٰ اور شریفانہ قدر سمجھتے تھے، درحقیقت بقول حالیؔ، ان کی طبیعت میں "محبّت اور الفت کا مادہ . . . معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے ان کے تمام تعلقات میں محبّت کا ظہور بدرجۂ غایت

٭ سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۸۹ء قیمت تیس روپے۔

پایا جاتا ہے۔" ان کے رفقاء ان کے عزیز دوست تھے، اور دوستی و تعلق کو خدا کا انعام سمجھتے تھے، سر سید نے ایک جگہ خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ "اس نے انھیں ایسے دوست دیے، جو اس زمانے میں عجائبات سے ہیں۔" (سر سید کی تعزیتی تحریریں، صفحہ ۸)

فاضل مرتب نے جو سر سید شناسوں کی صف میں ایک بڑا مرتبہ رکھتے ہیں، اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ سر سید کے دوستوں میں جب "کسی دوست کی وفات ہو جاتی تو وہ اپنے حافظ کی قیمتی یادداشت کو تاثرات کی شکل میں اس طرح پیش کرتے کہ اس کی سیرت کے اہم خطوط اور اس کی شخصیت کے نمایاں اکتسابات، اس کی وضع قطع اور عادات و اطوار کی ایک جھلک ہمارے سامنے آجاتی" اپنے اس دوست کی "شخصیت کی تعبیر" میں جن اخلاقی فضائل کا ہاتھ ہوتا انھیں وہ خاص طور پر نمایاں کرتے تھے۔

ڈاکٹر اصغر عباس نے سر سید کی تعزیتی تحریریں مرتب کر کے آج کی نسل کی توجہ سر سید کی اس خصوصیت کی طرف مبذول کرائی ہے۔ جن اہم شخصیتوں پر انھوں نے وفیات قلمبند کیں، ان میں علماء اور مبلغین بھی ہیں اور اہل علم و فن اور اہل صحافت بھی، ان کے علاوہ کالج کے طلبہ، ملازمین، رؤسا و اہل کارانِ حکومت اور ان کے ممتاز احباب و معاصرین بھی ہیں۔ کل ستاون ۵۷ لوگ ہیں جن سے متعلق ان کے خیالات اور تاثرات ہمیں اس کتاب میں ملتے ہیں۔

ڈاکٹر اصغر عباس کی اس رائے سے ہر وہ شخص متفق ہوگا جو زیر نظر کتاب کو کھلے ذہن سے پڑھے گا: "سر سید نے جن مرحوم معاصرین پر قلم اٹھایا ہے اس سے نہ صرف مرحومین کی زندگی کے بعض نقوش واضح ہوتے ہیں بلکہ خود سر سید کی افتادِ طبع تک ہماری رسائی ہوتی ہے۔ یہ تحریریں ان کی کشادہ ذہنی، وسعت قلب رواداری اور ہر قسم کی عصبیت سے ان کی کنارہ کشی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ان کی یادرفتگاں میں متعدد ایسی شخصیتیں شامل ہیں، مثلاً دیانند سرسوتی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مفتی میر عباس، راجہ شیو پرشاد، پنڈت گورودت، دیوان کرپارام، نواب عبداللطیف جو ایک دوسرے سے خیالات اور اقدار کے لحاظ سے متضاد تھیں، مگر سر سید نے ہر شخصیت سے ان عناصر کو چن لیا جن سے انسانیت اور رواداری کو فروغ ملتا ہے اور جنھیں ہر زمانے میں تاریخ کے الٹ پھیر کے باوجود قابلِ قدر تسلیم کیا جائے گا۔"

زیر نظر کتاب میں سرسید کا وہ مضمون بھی شامل ہے جو انھوں نے "زندگی اور موت" کے عنوان سے اپنے بڑے بیٹے سید حامد کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھا تھا اور اس میں سید یحییٰ قرطبی کے اس عربی مرثیہ کا اردو ترجمہ بھی "مرثیۂ مصائب اندلس" کے عنوان سے ہے جو سرسید نے خود کیا تھا۔ یہی مرثیہ ہے جسے دیکھ کر سرسید نے حالی سے مسدس کی فرمائش کی تھی۔

اس مرثیہ کی اشاعت کے وقت سرسید نے ایک بہت اچھا نوٹ بھی لکھا تھا۔ یحییٰ قرطبی اندلسی ایک عالم اور بڑا شاعر تھا۔ اسپین میں مسلمانوں کی تباہی پر اس کے ایک زخمی دل کی فریاد نے ایک پر درد مرثیے کی شکل اختیار کرلی۔ سرسید نے لکھا کہ اس دلدوز نظم کی "بے نظیر فصاحت اور بلاغت اور سادگی الفاظ اور مضامین درد انگیز سے ہم کو اس واقعے سے عبرت پکڑنی چاہیے جو اس میں مذکور ہے اور ہماری قوم کو غور کرنا چاہیے کہ یحییٰ قرطبی نے کیا کیا اور ہم کیا کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں اپنے ہمعصروں کو روتا تھا، ہم اس زمانے میں اپنی قوم پر روتے ہیں۔ ہم میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہ اس بات کو روتا تھا جو ہو چکی تھی اور ہم اس بات کو روتے ہیں جو ہماری قوم پر ہونے والی ہے۔ وہ مُردوں پر روتا ہے، ہم زندوں پر روتے ہیں۔ وہ بے جان لاشوں کا مرثیہ پڑھتا تھا ہم ان لاشوں پر مرثیہ پڑھتے ہیں جو جاندار ہو کر بے جان ہیں۔۔۔"

کتاب کے آخر میں فاضل مرتب نے جو حواشی دیے ہیں وہ بڑے گراں قدر اور معلوماتی ہیں، آخر میں مصادر و مآخذ کی بھی ایک وقیع فہرست ہے۔

ہم فاضل مرتب کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے سرسید کی تعزیتی تحریروں کو مرتب کر کے پڑھنے والوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے، اچھوں کی اچھی باتیں بڑی اخلاقی قدر و اہمیت کی حامل ہوتی ہیں، انھیں پڑھیے تو اچھے کام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے، اور پھر جب سرسید جیسا لکھنے والا ہو جس کے ہر لفظ اور جملے میں ایک تاثیر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اصغر عباس صاحب کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ ایک خاص دلآویزی ہے۔ ان کے قلم سے کتاب کا مقدمہ اور اس کے حواشی اپنی جگہ خود ایک اثر رکھتے ہیں۔

سہیل احمد فاروقی

احوال وکوائف

شامِ افسانہ بیادِ ڈاکٹر ذاکر حسین

۸ر فروری ۱۹۹۲ء کو محسن جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ۹۵ ویں یوم پیدائش کے موقع پر کانفرنس ہال میں ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام اردو اکادمی دہلی کے اشتراک و تعاون سے ایک شام افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس کے مہمان خصوصی محترم شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد تھے اور صدارت محترمہ سعیدہ خورشید صاحبہ نے کی۔ پروگرام کا آغاز ڈاکٹر سید جمال الدین کے خیر مقدمی کلمات سے ہوا انھوں نے ذاکر صاحب کی تحریروں میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور قصباتی سادگی کی عکاسی کے حوالے سے انھیں ایک ایسا کہانی کار قرار دیا جو فن کو زندگی کی بنیادی اقدار اور اس کی حقیقتوں سے ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ شام افسانہ کا آغاز ذاکر صاحب کی کہانی "گل عباس" سے ہوا جو ڈاکٹر صغرا مہدی صاحبہ نے پڑھی۔ اس بزم کے شرکا اور پیش کیے گئے افسانوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

پروفیسر قرۃ العین حیدر	دریں گرد سوارے باشد
جناب طارق چھتاری	وہ
جناب قمر احسن	شیر آہو خانہ
ڈاکٹر افتخار عالم خاں	نجس
جناب پیغام آفاقی	سفر کی کہانی

ڈاکٹر محمد طالب — رام کی مسجد

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی لکچرر شعبۂ اردو نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

شیخ الجامعہ صاحب نے اختتامی تقریر کے دوران یہ انکشاف فرمایا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وہ پہلی بار یہاں کے اردو رسالے پیام تعلیم کے ذریعے متعارف ہوتے تھے۔ انھوں نے اس شام افسانہ کے اہتمام میں اردو اکادمی دہلی کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اکادمی نے اپنی گزشتہ سال کی ریت کو قائم رکھا

اساتذہ جامعہ کی شرکت عصمت چغتائی سمینار میں

اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام جنوری کے پہلے عشرہ میں عصمت چغتائی اور جدید افسانہ پر منعقد سہ روزہ کل ہند سمینار میں محترمہ قرۃ العین حیدر، خان عبدالغفار خاں چیئر پروفیسر (مہمان خصوصی)، ڈاکٹر صغرا مہدی اور ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے شرکت کی۔ موخر الذکر دو شرکاء نے دوران سمینار عصمت چغتائی کے فن پر اپنے مقالے پیش کیے۔ عصمت چغتائی کے ادبی ورثے سے متعلق مخصوص اجلاس میں ڈاکٹر صغرا مہدی نے "عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری اور افسانہ نگار خواتین" کے عنوان سے اپنے مقالے میں انگارے کی اشاعت کو سنگِ میل قرار دیتے ہوئے عصمت پر اہم اثرات کی نشاندہی کی اور ان کے بعد کی افسانہ نگار خواتین کی نسل میں سے ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں اور واجدہ تبسم کی تحریروں میں عصمت کے اثرات کا جائزہ بھی لیا۔ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اپنا مقالہ "نیا افسانہ۔ تجزیہ اور مسائل" کے عنوان پر پڑھا۔

صلاح الدین و نینا چودھری کا استقبال

کار سے دنیا کا چکر لگانے کا ریکارڈ قائم کرنے والے دو مہم جو جناب صلاح الدین چودھری اور ان کی بیگم نینا چودھری کے اعزاز میں ایک تہنیتی تقریب پچھلے دنوں جامعہ کے کانفرنس ہال میں جامعہ گیمس اینڈ اسپورٹس کلب کی جانب سے منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں پروفیسر مجیب حسین رضوی، قائم مقام شیخ الجامعہ نے دونوں مہمانوں کو یونیورسٹی کلر پیش کیا۔ صلاح الدین چودھری

کار کے ذریعے ۶۸ دن میں دنیا کا چکر لگانے والے پہلے شخص ہیں جس کا اعتراف گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں کیا گیا ہے۔ اس ریکارڈ کو دو برطانوی فوجی افسروں نے اس طرح توڑا کہ انھوں نے دو کاریں استعمال کیں اور چالیس دن کا عرصہ لگایا۔ اس سے چودھری ٹیم کو دوبارہ تحریک ہوئی اور ۳۹ دن میں ۵۷۰۰۰ کلو میٹر کی مسافت طے کر کے انھوں نے ایک بار دنیا کا چکر لگایا۔ پروفیسر رضوی صاحب نے صلاح الدین صاحب اور نینا چودھری صاحبہ کی مہم جویانہ جذبہ کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے دنیا کی تاریخ میں ہندوستان کا نام اونچا کیا ہے۔ رضوی صاحب نے مزید کہا کہ مقابلہ کی موجودہ دنیا میں جہاں ناخن بڑھانے اور بسیار خوری میں تمغے ملتے ہوں یہ کامیابی صحیح معنوں میں یادگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جناب محمد ساجد لکچرر شعبۂ سوشل ورک نے مہمانوں اور حاضرین کا گیمس اینڈ اسپورٹس کلب کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔

الوداعی تقریب اسلامک اسٹڈیز ریفریشر کورس بہ اشتراک اکیڈمک اسٹاف کالج

۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کو صبح ساڑھے دس بجے جامعہ کے کانفرنس ہال میں قائم مقام شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب حسین رضوی کی صدارت میں شعبہ دراسات اسلامی اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے اشتراک سے منعقدہ ۲۱ روزہ ریفریشر کورس کی الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں اسلامی جمہوریہ ایران کے کلچرل ہاؤس "خانہ فرہنگ" کے تعلیمی مشیر جناب مولانا نجات مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ پروفیسر ماجد علی خاں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے اس ریفریشر کورس کے کنوینر کے فرائض انجام دیئے۔ اس ریفریشر کورس کی افادیت و اہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عماد الحسن آزاد فاروقی صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز نے اس امر کی خصوصی تاکید کی کہ ہم عصر عالمی محرکات ہم سے اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم اپنے ماضی کے تہذیبی و علمی ورثہ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے اپنے حال کا جائزہ لیں اور مستقبل کے لیے اپنے کو اس طرح تیار کریں کہ آئندہ آنے والی عالمی تہذیب میں بھرپور طریقے سے حصہ لے سکیں۔ پروگرام کنوینر پروفیسر ماجد علی خاں نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں کورس کے دوران پڑھے گئے مقالے تقاریر اور شرکاء کی تفصیل کا ذکر کیا گیا۔ کورس میں شرکت کرنے والے ۱۸ یونیورسٹیوں سے آئے ہوئے اسا میں سے عبدالرشید بھٹ، حمید اللہ مرازی اور ڈاکٹر عائشہ فاروقی نے جامعہ میں اس پروگرام کے انعقاد پر خوشی

اظہار کیا۔ یہاں پیران کی پذیرائی اور مہمان نوازی کی ستائش کی۔ سب نے متفقہ طور پر اسے تسلیم کیا کہ قابل اور معروف اساتذہ کی نگرانی میں اسلامک اسٹڈیز کے بعض ایسے اہم گوشے ان کے سامنے آسکے جن پیران کے یہاں نہ آنے کی صورت میں پردہ ہی پڑا رہتا۔ مہمانِ خصوصی مولانا نجات نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ چونکہ ان کا تعلق بھی تہران یونیورسٹی میں درس و تدریس سے رہا ہے اس لیے اساتذہ کو نئے رجحانات اور تحقیقات سے روشناس کرانے کی غرض اس طرح کے ریفریشر کورسوں کی افادیت سے وہ آگاہ ہیں موصوف نے اسلامک اسٹڈیز کے میدان میں علمی تحقیق کی ضرورت پر خصوصی توجہ دلائی۔

کورس کے شرکاء کو شرکت کی اسناد کے علاوہ نہج البلاغہ کے نسخے پیش کیے گئے جو سفیر ایران کی جانب سے ہدیتہً بھیجے گئے تھے۔

جناب شیخ الجامعہ نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ علمی تحقیق میں وہم و گمان سے حقیقت تک پہنچنے کا رجحان بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس سے بعض ایسے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے جو تاریخ کے اوراق میں مذکور نہیں ہوتے۔

پروفیسر مشیر الحسن کا تقرر بحیثیت نائب شیخ الجامعہ

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے ۲۵/ فروری ۱۹۹۲ء سے شعبۂ تاریخ و ثقافت کے پروفیسر و ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لنگویجز پروفیسر مشیر الحسن صاحب کا بہ امید منظوری مجلس منتظمہ نائب شیخ الجامعہ کے عہدہ پر تقرر فرمایا ہے۔ پروفیسر مشیر الحسن اس عہدہ پر موجودہ شیخ الجامعہ کے عہدہ کی مدت کے اختتام یا ان کے ۶۵ سال کی عمر پوری کرنے تک (جو صورت بھی پہلے واقع ہو) برقرار رہیں گے۔ اس سے قبل ۱۲/ فروری ۹۲ء کو دفتر مسجل سے جاری کردہ اعلان کے مطابق پروفیسر مشیر الحسن صاحب کو اکیڈمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز کے ڈائرکٹر کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری بھی تا حکم ثانی سونپی گئی ہے۔

اہم اعزازی عہدوں پر تقررات

طلباء کے ہوسٹلوں کے پرووسٹ کی حیثیت سے شعبۂ اقتصادیات کے پروفیسر محمد سلطان صاحب کے

عہدہ کی مدت کے خاتمہ پر جناب شیخ الجامعہ نے پروفیسر عبدالمبین، صدر شعبۂ میکنکل انجینئرنگ (فیکلٹی آف انجینئرنگ) کو مورخہ ۱۲ر فروری ۹۲ء سے طلباء کے ہوسٹل کا پرووسٹ مقرر فرمایا ہے۔

جناب شیخ الجامعہ نے شعبۂ جغرافیہ پروفیسر قاضی محمد احمد صاحب کا ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیر کے عہدہ سے استعفیٰ منظور کرتے ہوئے شعبۂ سوشل ورک کے پروفیسر حسین یٰسین صدیقی صاحب کو ۲۱ر فروری ۱۹۹۲ء سے ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیر کے عہدہ پر مقرر فرمایا ہے۔ پروفیسر موصوف شعبۂ مذکور میں تدریسی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اس نئے عہدہ کی ذمہ داری تاریخ اعلان سے تین سال کے عرصہ یا ۶۰ سال کی عمر کو پہنچنے تک (جو صورت بھی پہلے واقع ہو) سنبھالیں گے

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے پروفیسر انور رضا رضوی صاحب کا تقرر بحیثیت صدر شعبۂ اقتصادیات، فیکلٹی آف سوشل سائنسز منظور فرمایا ہے جس کا نفاذ ۲ر فروری ۱۹۹۲ء سے تین سال تک کے لیے ہوگا۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے شعبۂ سوشل ورک کے لکچرر جناب نعمت اللہ خاں کو ۱۲ر فروری ۱۹۹۲ء سے تاحکم ثانی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پراکٹر کے عہدہ پر متعین فرمایا ہے۔

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ || بابت ماہ اپریل ۱۹۹۲ء || شمارہ ۴

فہرست مضامین

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵-

---

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی —— مطبوعہ: برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

کرنل بشیر حسین زیدی ۳۰ مارچ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے مستقل طور پر جامعہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یوں تو جامعہ سے ان کی وابستگی اُس وقت سے شروع ہو گئی تھی جب جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز تھے لیکن دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد یہ وابستگی بھی مستقل ہو گئی۔ وہ جامعہ کے خازن کے منصب پر فائز رہے، اس ادارہ کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے، کورٹ کے رکن بھی رہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جامعہ کے سچے ہمدرد تھے۔ انھوں نے جامعہ کے انتظامی ڈھانچے سے باہر رہ کر بھی اس ادارہ کی ترقی و فروغ کے لیے بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ادارہ کے سامنے کبھی دشواری آتی تو ان سے ضرور رجوع کیا جاتا اور وہ ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے۔ جامعہ کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں میں وہ بیحد دلچسپی لیتے تھے اور جب تک صحت نے اجازت دی وہ ان سرگرمیوں میں حصّہ لیتے رہے بلکہ انھیں مزید رونق بخشتے رہے۔

کرنل زیدی صاحب سچّے قوم پرست تھے۔ جامعہ کے سیکولر مزاج میں انھوں نے اس قدر کشش محسوس کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس ادارہ کے ہو کر رہ گئے اور وصیت کے مطابق ان کی آخری آرام گاہ بھی اسی ادارہ میں بنی۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کو سیکولر نظام سے جوڑنے کی جامعہ میں جو کوششیں ہوئیں ان میں ذاکر صاحب کے عزیز ترین رفقاء پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے شانہ بشانہ اگر کوئی اور قدآور شخصیت نظر آتی تھی تو وہ کرنل بشیر حسین زیدی ہی کی مؤثر شخصیت تھی۔

کرنل بشیر حسین زیدی نے ملازمتیں بھی کیں لیکن صحیح معنوں میں وہ سماجی خدمت گار تھے۔

طالب علمی کے دور ہی سے سماجی خدمت کا عزم ان کے دل میں تھا۔ ابھی سنٹ اسٹیفنس کالج کے طالب علم ہی تھے کہ ناخواندگان کی تعلیم کے لیے منصوبہ بنا ڈالا اور اسے عملی جامہ پہنایا۔ اسی خدمت کے جذبہ نے انھیں منکسرالمزاج بنا دیا تھا۔ ان کے انکسار کی پشت پر ایک قوی تہذیب کارفرما تھی جو انھیں باوجود ایک معزز و باثروت گھرانے کا فرد ہونے کے کام کرنے کے لیے مجبور کرتی رہتی تھی۔ انھوں نے یہ راز جان لیا تھا کہ ملک وقوم کی ترقی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کمزور طبقوں کو سہارا نہ دیا جائے اور ان کے درمیان کام کرنے کے لیے مزاج میں انکساری پیدا کی جائے۔

کرنل بشیر حسین زیدی کے ہاں سماجی بصیرت کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ ان کی بصیرت علمی مجالس تک محدود نہیں تھی بلکہ اس نے سماجی عمل کی شکل اختیار کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں خاص وعام میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ سماجی عمل کا جہاں تک سوال ہے زیدی صاحب نے ایک قابل تقلید مثال چھوڑی ہے۔ سماج کے تئیں وابستگی ان کی زندگی کا اہم ترین مشن تھا۔ افسوس وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن سماجی وابستگی، سماجی خدمت، سماجی عمل کی جو راہ وہ روشن کر گئے ہیں اُن پر چل کر نئی نسلیں سماجی انصاف و مساوات کی منزل پالیں گی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

دسمبر ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کا شیرازہ بکھرا۔ اس میں شامل ریاستیں خود مختار ہو گئیں۔ وسط ایشیا جمہوریتیں بھی خود مختار ریاستوں کی شکل میں قائم ہو گئیں۔ تب ہی سے فضا میں ایک سوال گونج رہا ہے کہ کیا یہ ریاستیں (ازبکستان راجدھانی تاشقند) تاجیکستان (راجدھانی دوشنبے) ترکمانستان (راجدھانی اشق آباد) قزاقستان، (راجدھانی الماآتا) اور کرغستان (راجدھانی بشکیک) متحد ہو کر کوئی اسلامی بلاک بنائیں گی۔ امریکی حکمت عملی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسا بلاک بنے لیکن اسی کی جانب سے سب سے زیادہ شور و غوغا اٹھا ہے کہ وسط ایشیائی جمہوریتیں خود مختار ہو کر اسلامی بلاک بنانے والی ہیں۔ لہٰذا اس بلاک کی طرف سے جس میں افغانستان، ایران اور پاکستان کے اضافے کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کیا جا رہا ہے۔ اس ممکنہ اسلامی بلاک کی سرحدوں کو چھونے والے ممالک جن میں چین اور ہندوستان خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں، بے بنیاد بدگمانیاں پیدا کی جا رہی ہیں۔ اسلامی بلاک کے قیام کے تصور

ساتھ اسلامی بم زوردار طریقے سے اُدھم کیا ہے۔ جنوری میں ایک امریکی سینیٹر ہندوستان کے دورے پر تھے بس انھوں نے اپنے بعض اخباری بیانات میں ایک شوشا چھوڑ دیا اور تبصرہ نگار اسے لے اڑے۔ اسلامی بلاک نہ تو بننا تھا، نہ بنا لیکن امریکی ڈپلومیسی کو ایک نمایاں کامیابی مل گئی کہ اسلامی بلاک اور اسلامی بم کا ہَوّا دکھا کر اسرائیل کا مسئلہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ فلسطینیوں کے حق خود اختیاری کے سلسلے میں اور عربوں کے مقبوضہ علاقوں کو خالی کرنے کے سلسلے میں تو اقوام متحدہ کی قرار دادوں اور سفارشوں پر اسرائیل نے عمل درآمد کرنے کی نیت کا ذرہ برابر بھی اظہار نہیں کیا لیکن فلسطینیوں کے موقف کے حامی ملکوں نے امریکہ کے دام میں آکر اسرائیل کے قیام کو مکمل طور پر تسلیم کرتے ہوئے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ خلیجی جنگ کے بعد مغربی ایشیا کی سیاست میں بُش کی یہ دوسری اہم کامیابی ہے۔

جب سے سوویت یونین سے وسط ایشیائی جمہوریتیں علیحدہ ہوئی ہیں، ابھی تک دو ریاستوں قزاقستان اور کرغستان کے وزرائے اعظم ہندوستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ان سے ہندوستان کے کسی گوشہ یا حلقہ سے فرمائش کی گئی تھی یا نہیں۔ لیکن انھوں نے بالخصوص اپنے بیانات میں اس بات کی تردید کی کہ وہ کوئی اسلامی بلاک بنا رہے ہیں، باقی تین ریاستیں رہ جاتی ہیں۔ مستقبل میں ہم دیکھیں گے کہ وہاں کے سربراہان مملکت بھی ان ہی بیانات کی توثیق کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ امریکی ڈپلومیسی کے لیے اگر اسلامی بلاک کا ہَوّا کھڑا کرنا ضروری تھا تو کیا یہ ضروری ہے کہ امام امریکہ کے پیچھے سب مقتدی بن کر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اس ضمن میں امریکہ کی اقتدا ضروری تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امریکہ اب واحد بڑی طاقت بن کر ابھرا ہے اور ترقی پذیر ممالک اس کے دستِ نگر ہوتے جا رہے ہیں، اب جب متموّل ملکوں نے ہی بالکل ہتھیار ڈال دیے ہیں تو ترقی پذیر ممالک کس گنتی میں ہیں۔ دوسری وجہ شاید یہ ہے کہ اسلامی بلاک اور اسلامی بم کے تصور میں بہہ جانے والوں نے وسط ایشیائی جمہوریتوں کی تاریخ، ان کی معاشرتی تنظیم، تہذیبی، لسانی، عقائدی اختلافات کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ پانچ وسط ایشیائی جمہوریتیں ایک مخصوص خطۂ زمین میں ہیں، وسط ایشیا ان میں قدر مشترک ہے، باقی سب کچھ الگ الگ ہے۔ یہاں ہم ہرگز یہ تجویز پیش

نہیں کر رہے کہ وسط ایشیائی ریاستیں ایسی اتحاد و اتفاق قائم نہیں کر سکتیں۔ معاشی ترقی کے لیے ان کے درمیان باہمی تعاون کو ضرور فروغ ملنا چاہیے۔ ایک ریاست کے پاس زیادہ پیدا کر رہی ہے تو دوسری ریاست گیہوں۔ دونوں میں اشیاء کا باہمی تبادلہ ضرور ہوگا لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی تہذیبیں ایک دوسرے سے جدا ہیں اور یہ ریاستیں اپنے تہذیبی تشخص کو برقرار رکھیں گی اسلام ان ریاستوں میں دوسری اہم قدر مشترک ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قدر مشترک کو پڑوسی ریاستوں یا ملکوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا' یہ قدر مشترک تو قدروں میں عالمی بحران کے دور میں ایک نظام اخلاق پیدا کرنے کے لیے استعمال کی جانا چاہیے اور ایسا ہی وسط ایشیا میں سوچا جا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کا نظام اخلاق کس طرح وہاں پیش کیا جاتا ہے، اس کی کیا تعبیرات کی جاتی ہیں کیونکہ وسط ایشیائی عوام اور ان کے ایمان و عقیدہ کے درمیان ایک طویل مدت تک اشتراکیت کا تصور حائل رہا ہے اور وہ بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں جس کی انھیں بازیافت کرنا ہے، ہم اس بازیافت میں کیا رول ادا کر سکتے ہیں، یہ ایک اہم سوال ہے۔

ہندوستان سے تو وسط ایشیا کے قدیم تعلقات ہیں جو کئی ہزار سالوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ہند آریائی تہذیب ہو یا ترک و مغل تہذیب سب کے تانے بانے وسط ایشیا سے جا کر مل جاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان وسط ایشیائی جمہوریتوں کی اقتصادیات کو مضبوط کرنے میں مؤثر رول ادا کر سکتا ہے، لہٰذا اسلامی بلاک اور اسلامی بم کو ذہن سے نکال کر ہمیں وسط ایشیائی جمہوریتوں کی تعمیر نو کے کام میں وہاں کے عوام اور حکومتوں کی پوری مدد کرنا چاہیے۔

صغرا مہدی

چلتے ہو تو موریشس چلیے

(۲)

صاحبو ہے یوں کہ خاکسار کو دوران سفر مقامات اور مناظر سے کہیں زیادہ انسانوں اور ان کے
دیوں سے دلچسپی ہے۔ دنیا اب سمٹ کر اتنی چھوٹی ہو گئی ہے کہ ملکوں کے عام حالات اور کوائف
ایک جگہ بیٹھ کر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ جغرافیائی اور تاریخی معلومات کہیں فراہم ہونا مشکل نہیں
ے بقول پروفیسر شمیم حنفی کہ وہ کہا کرتے ہیں جس جگہ کا سفرنامہ آپ لکھوائیں ہم سے لکھوالیں
مگر ہم نے یہ ہمت اب تک نہیں کی۔ اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس میدان میں نہ آئیں۔ اب
رجن یہ ہے کہ اب تک جو سفر اس خاکسار نے کیے وہ سب ذاتی نوعیت کے تھے۔ اس کے احوال
ں ہم نے جو چاہا لکھا جو چاہا چھوڑا مگر یہ سفر ٹھہرا سرکاری گورنر، منسٹر، ایم پی، ادیب، نقاد، محقق
م سرکاری اور نیم ادبی، نیم علمی لوگوں کا ساتھ۔ قدم قدم پر پکڑے جانے کا ڈر لاحق ہے۔ سو
احبان انسان سرکاری سفر نہ کرے اور اگر کرے تو پھر سفرنامہ نہ لکھے یعنی ہم جیسا انسان
مگر ایک بات ہے کہ پروفیسر اشتیاق عابدی کا سرکاری علمی اور معلوماتی سفرنامہ تو قارئین پڑھ
ی چکے ہیں، جنھوں نے اخبار میں نہیں پڑھا ہوگا تو اس کی وہ نقول پڑھ لی ہوں گی جو موصوف
ے مختلف لوگوں کو از راہِ عنایت ارسال کی ہیں۔ سو ہمارے اس سفر کے احوال کو آپ اس کا دوسرا
حصہ سمجھیں۔

ہاں تو موریشس ہم کو اچھا لگتا ہے" اس کا اظہار و اقرار ہمارے گلزار نقوی نے مختلف انداز

ڈاکٹر صغرا مہدی، ریڈر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

میں جس طرح کیا ویسا کسی نے نہیں کیا۔ گارڈن عالی پارٹی میں شہر کی ایک متمول اور طرح دار خاتون سے فہمیدہ کی شناسائی ہوگئی تھی ان کا نام شاہدہ اور کام بزنس تھا۔ موریشس آنے والے ادیبوں، فن کاروں کی میزبانی کرنا ان کی ہابی تھی۔ چنانچہ سات تاریخ کو جب لنچ سے پہلے ہمارے ہوٹل میں گورنر صاحب اور کمشنر صاحب آنے والے تھے اور ایک میٹنگ ہونی تھی۔ ہم ناشتے کے بعد مع فہمیدہ بیگم اور گلزار نقوی کے شاہدہ کے ساتھ نکل گئے۔ خلیق انجم، شمیم حنفی اور ابوالکلام قاسمی نے ہمارا ارادہ بھانپ لیا تھا اور پوچھا بھی کہ "کہاں چلیں" شمیم حنفی جانتے تھے کہ ہمیں ذرا موقع ملے گا تو ہم شاپنگ کو نکل جائیں گے۔ مگر فہمیدہ بیگم ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ دیکھ کر انھیں یقین آگیا کہ یقیناً ہم کوئی اہم اور سنجیدہ کام کرنے جا رہے ہیں۔ اس دن بازار بند تھے اس حصے میں بلکہ اس شہر میں جہاں شاہدہ ہم کو لے گئی تھیں بہت پوش علاقہ تھا موسم خوشگوار تھا۔ سڑکیں صاف ستھری، لوگ آجا رہے تھے مگر بھیڑ بھڑکا نہیں تھا۔ دھکم پیل نہیں تھی۔ ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ خوبصورت صاف ستھرے بنگلے ٹائپ کے گھر تھے۔ ایک بڑی سی دکان کھلی تھی نہ جانے کیوں اس کے آگے پٹری پر بھی کچھ سامان کپڑا ٹائپ بک رہا تھا۔ ہم دکان میں تھے تو ایک ادھیڑ عمر کے حضرت نے جو کوٹ پتلون میں ملبوس تھے ہم سے پوچھا "آپ اردو کی ورلڈ کانفرنس میں انڈیا سے آئی ہیں؟" ہمارا مارے خوشی کے بُرا حال ہوگیا تو یہاں کے کاروباری لوگ بھی اردو ورلڈ کانفرنس اور انڈیا سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر وہ ہم سے پوچھنے لگے کہ "انڈیا میں لوگ موریشس کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں"۔ ہم نے کہا بہت اچھے نہایت دوستانہ۔ ہم کو تو یہاں سب کچھ اپنا سا لگتا ہے۔ پھر تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور وہ جلدی جلدی ہمیں طرح طرح کے کپڑے دکھانے لگے جو زیادہ تر باہر کے تھے۔ کچھ شاہدہ کے مشورے سے ہم نے خریدا بھی اور چلتے وقت ہم نے دوکان کے مالک سے کہا "اچھا شکریہ اب تو آپ سے کانفرنس میں ملاقات ہوگی" بولے "جی کانفرنس میں آنا تو مشکل ہے مگر طلعت عزیز کے پروگرام میں آئیں گے۔ غزلیں بہت اچھی لگتی ہیں۔"!

شاہدہ چاہتی تھیں کہ ہم ان کے گھر جائیں کافی پئیں۔ مگر ہمیں ہوٹل پہنچنے کی جلدی تھی جہاں گورنر صاحب اور ہائی کمشنر صاحب پہنچنے والے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ اپنے ہوٹل کی طرف

روانہ ہوگئے۔ کار شاہدہ کے بھائی ڈرائیو کر رہے تھے راستے میں گلزار نقوی رطب اللسان تھے موریشس کے حسن کے 'میرا مطلب ہے قدرتی مناظر کے 'بہت اہم لوگوں'' کی سادگی کے عام لوگوں کی گرمجوشی کے ادران کا خیال تھا کہ جہاں گیر کا وہ زبان زد خاص و عام شعر موریشس پر صادق آتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمیں است و ہمیں است

فہمیدہ بیگم کی حب الوطنی کو ٹھیس لگی تو انھوں نے کہا کہ ایسے سب مناظر ہندوستان اور خاص طور سے ساؤتھ میں موجود ہیں گلزار صاحب! شاہدہ نے موقع کو بھانپ لیا اور انھوں نے اونچے سروں میں ہندوستان کی تعریف شروع کردی اور کہا بھائی ہمارا اور آپ کا کیا مقابلہ! میں باہر دیکھ رہی تھی ہم اب جہاں سے گزر رہے تھے ایک طرف تو کچھ جھونپڑی ٹائپ کے گھر تھے۔ کبھی کبھی ہرے بھرے گنے کے کھیت آجاتے تھے دوسری طرف لیچی کے باغ تھے۔ گھنے گھنے پیڑوں پر سرخ سرخ لیچیوں کے گچھے لٹک رہے تھے اور باغ سے باہر سڑک کے کنارے عورتیں اور بچے بیچنے کے لیے لیچیاں لیے بیٹھے تھے جیسے دہرہ دون میں لیچی کے باغوں کے باہر بیٹھے ہوتے ہیں یا کشمیر میں سیبوں کے باغوں کے سامنے۔ ہم نے لیچیوں کی تعریف شروع کردی اور شاہدہ حسنِ طلب کو سمجھ گئیں اور کریول میں بھائی صاحب سے گاڑی روکنے اور لیچی خریدنے کی فرمائش کی۔ لیچی کافی تندرست بھی تھیں میٹھی بھی۔ ہوٹل پہنچے تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی ہائی کمشنر صاحب موریشس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا رہے تھے جسے اشتیاق عابدی صاحب ڈائری میں نوٹ کر رہے تھے۔ باقی سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ ہم بھی پیچھے کی کرسی پر ٹک گئے۔

اس دوران رضا زیدی صاحب انیس احمد صاحب کے ساتھ نمائش لگانے کی تیاری میں رہے۔ ان سے صبح تو نہیں مگر رات کو کھانے پر ملاقات ہوتی جس میں وہ موریشس کے لوگوں کی اردو سے دلچسپی کیلی گرافی سے لگاؤ کا ذکر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کرتے جس میں گلزار نقوی زور پیدا کرتے رہتے۔

سات تاریخ کو چار بجے گورنمنٹ کے چیف وھپ The Government Chief Whip مسٹر شوکت اللہ سودہان Shaukatullah Soodhun کی طرف سے وہاں کے ہیرالال ویکیچی ہال میں کانفرنس کے مندوبین کا استقبالیہ تھا۔ یہ پورٹ لوئس میں واقع ہے۔ یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے۔ اس کے بہت بڑے ہال میں لوگوں کا مجمع تھا۔ خواتین حضرات، بچے نوجوان لڑکے لڑکیاں، انگلش میوزک آرکسٹرا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اب بہت سے چہرے جانے پہچانے لگ رہے تھے سب سے سلام دعا ہوئی۔ اتنے میں جامعہ کے قمرالدین صاحب نظر آئے انھوں نے چائے پر مدعو کیا اتنے میں چیف وھپ صاحب اور ہمارے گورنر منسٹر او ایم پی صاحب آئے تقریریں ہوئیں۔ اور بہت اہم لوگوں کو تحفے بھی ملے۔ اس محفل میں رو اسی لیے زیادہ تھی کہ اس میں طلعت عزیز بھی موجود تھے۔

کانفرنس ۹ دسمبر کو شروع ہونا تھی اور ہم لوگ تین دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ کانفرنس منتظمین نے پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کو بھی خالی نہ رہیں اور یہ محسوس کریں کہ ہمارا کوئی پرسان حال نہیں ہے اور ہم دیارِ غیر میں ہیں۔ پارٹیاں، لنچ، ڈنر سرکاری نیم سرکاری ایک سے ایک پر فضا مقام پر مناظرِ فطرت کا لطف بھی، جذبات سے بھری ہوئی گرم جوش خطابت بھی، جنت نگاہ سامان بھی اور فردوس گوش کا بندوبست بھی۔ ۸ تاریخ کو دوپہر کا کھانا بھی چیف وھپ مسٹر سودھان اور مسٹر اور مسز حیدر جورودان کی طرف سے Pereybere گراؤنڈ بے پر تھا۔ موریس اپنے خوبصورت بیچوں کے لیے مشہور ہے دو ایک بیچ ہم نے بھی دیکھے۔ چوڑے چوڑے ساحل اور دور تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، سمندر میں بوٹنگ کرتے جوڑے، اس دن اتوار کی وجہ سے کافی چہل پہل تھی۔ واپسی میں ہم اس بیچ پر اترے جہاں خواتین و حضرات بیچ کے روایتی لباس میں ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ زیادہ تر غیر ملکی تھے اور لگتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں زیادہ تر انگریز اور فرانسیسی لوگ رہتے ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے ان مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے کا بندوبست کر لیا۔ فہمیدہ بیگم ساحل سے موجوں کا نظارہ کرنے کے بجائے پانی میں اتر گئیں۔ شمیم حنفی صاحب نے ایک الگ کونا تلاش کیا اور فکرِ شعر میں بیٹھ گئے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی وہ مشاعرے کے لیے نئی غزل کہنے کی فکر میں تھے۔ نارنگ صاحب بھی اس وقت سب علمی اور ادبی مسائل

کر بھول کر ساحل سمندر کی تر و تازہ ہوا سے محظوظ ہو رہے تھے۔ سید حامد صاحب بیگم حبیب اللہ سے محو گفتگو تھے۔ وہاب اشرفی صاحب نہ اے نکہت باد بہاری راہ الگ اپنی والی کیفیت میں کھڑے رہے۔ عابد رضا بیدار صاحب کو مجمع میں رہ کر خلوت کا لطف اٹھانے کا گُر آتا ہے وہ ایک فلسفیانہ استغراق کے ساتھ کھڑے تھے۔ غرض سوائے اشتیاق عابدی صاحب کے جو پھلوں کا عرق پی کر وین میں نیم غنودگی کے عالم میں تھے۔ سبھی اس فضا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انداز اپنا اپنا تھا۔ وہاں سے واپسی میں بوٹینیکل گارڈن گئے جہاں ہندوستانی لیڈروں کے ہاتھ کے لگائے پودے بھی تھے۔ وہاں ایک پیڑ ایسا تھا جس میں سو سال میں ایک دفعہ پھول آتا ہے اور خوش قسمتی سے ایک درخت پر بہت بڑا پھول لگا ہوا تھا۔ ایک حوض میں بڑے بڑے کنول کے ہرے ہرے پتے تھے اتنے بڑے جیسے ایک بڑی سی سینی یا پرات ہو۔

ہمارے وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی نے ہر فنکشن میں تقریر کی بعض بعض دن تو ان کو ایک دن میں تین تین بار بولنا پڑا۔ مگر کمال تھا کہ ہر دفعہ انھوں نے اپنی تقریر میں ایک نئی بات پیدا کی۔ ہر وہ بات اپنی تقریر میں لائے کہ موریشس کے لوگ ہندوستان سے خود کو بہت قریب محسوس کریں۔ دو تین دفعہ بیکل صاحب بھی بولے اور جاوید صاحب نے بھی دو ایک مرتبہ تقریر کی۔ بلکہ کانفرنس میں مقالہ بھی پڑھا۔ اب اور مندوبین بھی آ گئے تھے مثلاً ڈربن ساؤتھ افریقہ سے حبیب الحق انصاری، سعودی عربیہ سے نسیم اقبال صاحب، پاکستان سے جناب جمیل جالبی اور حسن عسکری صاحب جو وہاں کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔

۹ دسمبر کو کانفرنس کا افتتاح ہوا اس دن وزیر اعظم جلدی میں تھے اس لیے کہ پارلیمنٹ میں موریشس کو ری پبلک بنانے کا بل پیش ہونے والا تھا۔ جمیل جالبی صاحب نے افتتاحیہ جلسے میں بہت اچھا خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد کانفرنس تین دن تک جاری رہی۔ زیادہ تر مقالوں میں اس کا بیورا پیش کیا گیا کہ اردو کہاں کہاں بولی پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے اور اپنے اپنے ملکوں میں جہاں کی نمائندگی مندوبین کر رہے تھے وہاں اردو کی کیا صورت حال ہے۔ ادبی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ ساختیات اور تنقید پر بھی آزادی کے بعد اردو ادب کی صورت حال بھی اور اردو

کے سیکولر ہونے کا ذکر بھی رہا اور اس کی بین الاقوامی حیثیت بھی زیر بحث آئی۔ اردو کی ادبی روایات کی کلچرل بنیاد پر بھی اظہار خیال ہوا اور نئی غزل پر بھی۔ برصغیر سے باہر ادب کی صورت حال کیا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی۔ اردو کا اسٹیج ٹی وی اور ریڈیو سے کیا رشتہ ہے۔ یہ بھی بتایا گیا اردو اور ہندوستانی میوزک کے تعلق پر بھی مباحثہ ہوا۔ اردو ادب کی صورت حال ماریشس میں کیا ہے اس پر وہاں کے نوجوان شاعر صابر گودڑ نے روشنی ڈالی۔ اردو اکیڈمیوں کا اردو کے فروغ میں کیا رول ہے اس کا خاکہ جناب اشتیاق عابدی نے پیش کیا۔ فرانس کے پروفیسر ایلین نے فارسی کی ان کہاوتوں پر دلچسپ گفتگو کی جن کا رشتہ مذہب سے ہے اور جو آج کل اردو میں بولی جاتی ہیں پروفیسر شاہین نے کنیڈا میں اور پروفیسر نسیم اقبال نے سعودی عرب میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر حبیب الحق انصاری جو ڈربن (جنوبی افریقہ) سے آئے تھے اور ڈربن یونیورسٹی میں شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے نہ صرف جنوبی افریقہ میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لیا بلکہ اس کے اعداد و شمار رجوع کیے کہ دنیا میں کہاں کہاں اردو بولی سمجھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ تین دن کانفرنس کے سارے سیشن بہت کامیاب رہے اس معنی میں کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کا وسیع و عریض ہال لوگوں سے بھرا رہا ان میں وہ اساتذہ بھی تھے جو اردو پڑھاتے ہیں وہ بھی جو اردو پڑھانا سکھاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ موریشس میں زیادہ سے زیادہ اسے فروغ ہو۔

حبیب الحق انصاری کے والد جامعہ کے پرانے طالب علم نکلے یہ ارشاد الحق صاحب اور پروفیسر عبدالعلیم کے کلاس فیلو تھے۔ ان کا نام منصور الحق تھا اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ کام بھی کیا تھا ان سے جامعہ کے بارے میں گفتگو رہی۔ کانفرنس کے دوران چائے اور کھانے کے دوران لوگ الگ الگ باہر سے آئے مہمانوں سے گفتگو کر کے ان سے اپنے مسائل بیان کرتے۔ پروفیسر ایلین بہت دلچسپ انسان ہیں۔ پیرس یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ بہت شستہ اور بامحاورہ گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے سیریل دیکھے جو غالب اور ٹیپو سلطان پر بنے ہیں جو آئی۔ سی۔ سی۔ آر نے یہاں بھیجے ہیں اور یہاں کے ٹی وی پر دکھائے جا رہے ہیں بولے "جی ہاں آپ کا مطلب سلسلے وار کہانی سے ہے" انھوں نے

میرے لیے جگہ خالی کی۔ میں نے کہا ٹھیک ہو۔ جواب ملا "جی اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ خواتین کا احترام کریں۔" میں نے ایک دن رات کو کھانے سے واپسی پر کہا۔ موسم کس قدر Pleasent ہے۔ بولے "جی ہاں" بجا فرمایا۔ نہایت خوشگوار موسم ہے" اور دس تاریخ کو رات کو کھانے پر ایک دم روس کی گُدمیلا آئیں تو ایسا لگا بہار آگئی۔ دوسرے دن انھوں نے روس میں اردو کی صورتِ حال پر جب فصیح و بلیغ انداز میں گفتگو کی تو لوگ متحیّر رہ گئے۔

مسٹر چونی نے جوڈنر دیا تھا اس میں پاکستان کے حامد علی نے غزل خوانی کی۔ ان کی غزلیں سن کر استاد امانت علی یاد آگئے اور جب انھوں نے وہ غزل گائی ــ "انشاجی اٹھو اب کوچ کرو" تو سننے والوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں محترمہ گرجا ویاس منسٹر آف انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ بھی آگئیں اور انھوں نے بہت اچھی اردو اور شاعرانہ زبان میں پُر اثر تقریر کی اس شام ابوالکلام قاسمی سب مندوبین سے یہ پوچھتے ہوئے پائے گئے کہ "مجھے معلوم ہے آپ شعر کہتے ہیں۔" پہلے تو ہم کچھ نہ سمجھے کہ یہ کیا قصّہ ہے جب انھوں نے یہ سوال کیا ہم سے بھی تو معلوم ہوا کہ انھیں رات کے مشاعرے کے لیے شاعر چاہئیں کیونکہ ہمارے ساتھ مستند اور مشاعرے لوٹنے والے ایک ہی شاعر تھے جناب بیکل۔ مگر رات کو جب ہم مشاعرے میں پہنچے تو ہال سامعین اور اسٹیج شاعروں سے بھرا تھا۔ صدارت محترمہ گرجا ویاس کی تھی اس کے علاوہ مسٹر چونی اور گورنر صاحب بھی تھے۔ ہندوستان کے شاعروں میں بیکل صاحب کے علاوہ سید حامد، پروفیسر نارنگ، شمیم حنفی، صغیر احسن اور گپتا جی تھے۔ کنیڈا کی نمائندگی شاہین صاحب کر رہے تھے جو ایک مشہور شاعر ہیں اور کنیڈا میں اردو کے فروغ کے لیے ان تھک محنت کرتے ہیں۔ مقامی شاعروں میں قاسم ہیرا اور صابر گوڈر تھے۔ داد دینے کا کام حسبِ معمول بغیر کسی کی ہدایت یا فرمائش کے ہم نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اسے سب سے زیادہ اہمیت گپتا جی نے دی کہ زیادہ سے زیادہ شعر سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ایک خاتون جو ہمارے پیچھے بیٹھی تھیں بولیں "مجھے اردو کم آتی ہے مگر ان کی شاعری میں سمجھ گئی اور بہت ہنسی آئی۔!"

بارہ کی دوپہر کو ہماری روانگی تھی۔ اس دن پورٹ لوئس میں واقع اردو انسٹی ٹیوٹ جانا تھا جو ایک طرح سے اردو کا مرکز ہے۔ اس کے سرپرست جناب احمد صاحب ہیں اور اس کی روح رواں جناب عنایت حسین عیدن ہیں جو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں اور اچھے ڈرامے اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ مورشیس میں شاعری اور ڈرامے دونوں کا بہت زور ہے۔ عنایت حسین عیدن تفصیل سے ہمیں یہاں اردو کے فروغ میں جو الجھنیں ہیں اور وہ ان سے کس طرح نمٹتے ہیں بہت انکسار سے بتا رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ابوالکلام قاسمی صاحب شمیم حنفی صاحب اور انیس احمد صاحب رک رہے ہیں۔ انھیں مورشس میں کچھ اور کام نمٹانے تھے۔ ہوٹل آکر جلدی جلدی سامان سمیٹا اور ایرپورٹ کی طرف چل دیے۔ اب دل میں اشتیاق اور تجسس کے بجائے لوگوں کی محبت کا احساس تھا اور مورشس کے حسین مناظر دل پر نقش تھے۔ یہاں اردو زبان کے وسیلے سے جو رشتے قائم ہوئے تھے اس کی مسرت سے دل مالامال تھا۔ اپنے ہی ملک کے لوگوں کے ساتھ وقت گزار کر ان کو قریب سے جاننے کا جو موقع ملا تھا اور ان سے ایک نئی شناسائی کا احساس تھا وہاں جاکر ہمیں یہ معلوم ہوا تھا کہ پروفیسر نارنگ صاحب جب چاہیں یا موقع ہو تو ایسے خاموش اور الگ تھلگ رہ سکتے ہیں جیسے وہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ خلیق انجم صاحب کو اپنی صحت اور انجمن کی فکر کہیں نہیں چھوڑتی۔ علاوہ علمی اور ادبی مسئلوں پر گفتگو کے (جو وہ کرتے ہی رہتے ہیں) وہ انجمن کے لیے لوگوں کی تنہا تصویر کھینچتے رہے اور رٹائرمنٹ کے فوائد اور پھلوں کے استعمال پر گفتگو کرتے رہے۔ شمیم حنفی صاحب کس طرح غیر ملک کے لوگوں سے گھل مل کر ان کا حصہ بن سکتے ہیں۔ بیدار صاحب میں دانشوری کے ساتھ حسِ مزاح بھی ہے جو اپنی ساری لاتعلقی کے باوجود آس پاس ہونے والے مضحک واقعات پر محظوظ بھی ہو سکتے ہیں اور اس کا اظہار دبی زبان سے ایک آدھ فقرے سے کر دیتے ہیں بیگم حبیب اللہ جن کا صرف نام سنا تھا ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ان کی نفاست و ذہانت اور فراست کے نمونے دیکھنے کو ملے۔ سید حامد صاحب میں ہر وقت یہاں تک کہ ناگوار واقعات پر بھی زیر لب مسکرانے کی غضب کی صلاحیت ہے۔ خیال خاطر احباب اس درجہ ہے کہ جب بھی بیگم حبیب اللہ ان کو اپنے ساتھ کھانے کی میز پر لکھنوی انداز میں بلاتیں تو

اپنے ساتھیوں اور ضروری گفتگو کو چھوڑ کر مسکرانے آجاتے کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیگم صاحبہ اس دوران بہت اہم لوگوں کی میز پر چلی گئیں تب بھی حامد صاحب ہم جیسے چھُٹ بھیّوں کے ساتھ خلیق انجم صاحب کو چھوڑ کر بیٹھے رہے ان میں کس قدر صبر کس قدر وقار ہے اور ان سے مل کر بھلا کون ہے جو یہ شعر نہیں پڑھے گا کہ ؎

بہت جی خوش ہوا حامدؔ[1] سے مل کر

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ہمیں موریشس ہی اتنے دن میں قدم قدم پر وہاب اشرفی صاحب کی حبّ الوطنی کا اندازہ ہوا کہ وہ وہاں ایک منٹ کو ہندوستان کو نہیں بھولے اور اپنے بچّوں اور بیوی کو بھی یاد کرتے رہے۔

رضا صاحب بہت سنجیدہ آدمی ہیں کم گو یہ ہم جانتے تھے مگر معلوم ہوا کہ نہیں، یہ کبھی کبھی سنجیدگی سے غیر سنجیدہ باتیں دیر تک کر لیتے ہیں اور اس کا اعتراف ہم کر لیں کہ ابوالکلام قاسمی صاحب کے بارے میں ہمیں کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی اور ہاں۔ ہمیں وہاں جاکر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فہمیدہ بیگم سب سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہیں اور وہ اتنی سنجیدہ نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس بھی سکتی ہیں اور کئی مرتبہ انھوں نے ہمارے ساتھ قہقہے لگائے!

تو حضرت جب ہم ہوٹل سے چلے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔ پھول کھلے تھے پات ہرے تھے اور ہم سب اپنے وطن ہندوستاں جنّت نشاں کی طرف رواں دواں تھے۔

نوٹ:۔ اس کانفرنس میں جناب ہرچرن چاولہ بھی تھے اور ناروے سے آئے تھے اور وہاں اردو کی کیا حالت ہے اس پر مقالہ بھی پڑھا تھا۔

---

[1] یعنی وی۔ وی۔ آئی۔ پی۔

[2] حالیؔ کی جگہ حامدؔ ہم نے کردیا کہ لوگ موریشس جاکر باقاعدہ شاعر بن گئے ہم تصرّف بھی نہ کریں۔

اطہر رضا بلگرامی

ایک ماہ ماسکو میں

یادِ رفتگاں

(۲)

کریملن کے میدان کے دوسری طرف ایک پُر شکوہ قدیم عمارت نظر آئی جو زار کے دور کا کوئی محل تھا۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ماسکو کا یہ سب سے بڑا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے جس کو "گوم" کہا جاتا ہے۔ داخل ہوا تو سب سے پہلے جو چیز کشش کا باعث بنی وہ اس کی شیشے کی چھت تھی۔ یہ عمارت تین منزلہ ہے۔ درمیان میں گول کشادہ جگہ ہے جس کے وسط میں ایک خوبصورت فوارہ چلتا رہتا ہے اور جہاں لوگ خریداری کر کے تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔ دونوں طرف دکانوں کی قطاریں ہیں۔ درمیان میں کئی جگہ پہلی دوسری منزل پر جانے کے لیے زینے ہیں۔ میں اپنے دوران قیام کئی بار یہاں آیا لیکن شعبوں کی تقسیم کا نظام نہ سمجھ سکا۔ اس میں شاید میری عجلت اور سب کچھ دیکھ لینے کی شدید خواہش کو زیادہ دخل تھا۔ تمام دکانیں سامان اور خریداروں سے بھری نظر آئیں۔ سب سے زیادہ بھیڑ الیکٹرانک کے سامان والی دکانوں پر تھی۔

یہاں گوم کے علاوہ دوسرے بڑے اسٹورس میں بھی گیا۔ گوم کی طرح "سوم" بھی بہت بڑا اسٹور ہے جس کی عمارت جدید ہے اور کچھ سہولتیں بھی جدید ہیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ چھوٹے بڑے اسٹور ہیں جو آپ کو ہر موڑ پر مل جائیں گے۔ ماسکووا نام کا بڑا اسٹور ہے جس کی شہرت جدید ترین

٭ڈاکٹر اطہر رضا بلگرامی، ریڈر شعبۂ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

اشیاء دستیاب کرنے کے لیے بہت ہے۔ کچھ مخصوص اسٹور بڑے دلچسپ ہیں جس میں گڑیوں کا مخصوص اسٹور ہے اور ایک اسٹور بچوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اسٹور اتنا بڑا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس کا انتظام کس طرح کیا جاتا ہوگا۔ نوزائیدہ بچے سے لے کر ۱۴، ۱۵ سال کی عمر کے بچوں کی ہر وہ ضرورت جو آپ کا ذہن سوچ سکتا ہے طلب کیجیے فوراً مل جائے گی اس کا نام "ڈیٹ اسکائی میر (Det Sky Mir(Children's world) یعنی "بچوں کی دنیا" ہے

ماسکو کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہاں خواتین کی ضرورتوں کی اشیاء مرد نہیں خرید سکتے۔ خواتین کی جملہ ضرورتوں کی اشیاء صرف خواتین ہی خریدتی ہیں۔ ہم ہندوستانیوں میں شاید یہ عادت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب لپسٹک، لیڈیز رومال، نیل پالش اور جوڑے کی جالی وہیر پن خریدنے ایک اسٹور میں گھسا تو وہاں کسی مرد کو نہ دیکھ کر کچھ اٹپٹاہٹ سی ہوئی۔ لیکن پھر بھی جبر کر کے چند اشیاء چن لیں اور ان کو لے کر کاؤنٹر پہ پہنچا تو خدمت پر مامور لڑکیاں سر جھکا کر ہنسنے لگیں۔ میں چیزیں لیے کاؤنٹر پر حیرت سے کھڑا رہا کہ ایک بزرگ خاتون نے میری مشکل حل کر دی۔ تمام چیزیں میرے ہاتھ سے لے کر مجھے دوکان کے باہر جانے کا اشارہ کیا سلپ کاٹ کر انھوں نے پیسے ادا کیے اور باہر نکل کر میری اشیاء میرے حوالے کر دیں اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ اس واقعہ کے بعد پھر میری ہمت نہ پڑی کہ میں کسی اسٹور سے خواتین کی اشیاء خریدوں۔ اور یوں بھی میری فلور لیڈی نے بعد میں مجھے سمجھایا کہ یہاں لیڈیز ہی اپنی اشیاء خریدتی ہیں۔

یوں تو ماسکو کیا پورے روس کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں نوادرات کے ذخیروں، عجائب گھروں، تھیٹروں کی بھرمار نظر آتی ہے لیکن ان میں لینن گراڈ کے میوزیموں کا شاید دنیا میں جواب نہ ہو۔ ان عجائب گھروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ میں یہاں چند جدید میوزیموں کا ذکر کروں گا جن کا تعلق سائنس، ٹکنالوجی اور خلائی سفر کے متعلق اہم معلومات سے ہے۔ ان میں ایک میوزیم جس سے میں بے ساختہ متاثر ہوا اس کا ذکر پہلے کر رہا ہوں کیونکہ اس میں سہ جہتی پینٹنگ، اسکلپچر (مجسمہ سازی) اور روشنی کا ایک خوبصورت امتزاج ملا کر نگاہیں اور عقل یہ فیصلہ ہی نہ کر سکیں کہ کہاں پر پینٹنگ ختم ہوئی اور کہاں سے اسکلپچر شروع ہوا اس کا نام "بیٹل آف بوروڈینو پنورامیوزیم Battle of Borodino Panorma-Museum

ہے۔ یہ دراصل نپولین کے روس پر حملہ کی منظر کشی کا میوزیم ہے جس میں نپولین کی فوجوں کی روس کے گاؤں اور قصبات میں تباہی کا انتہائی اثر انگیز منظر پیش کیا گیا ہے۔ میوزیم کی عمارت گول ہے جو شیشے اور میٹل فریم کی ہے۔ میوزیم میں داخل ہونے پر صدر دروازہ کے سامنے استقبالیہ کاؤنٹر پر میوزیم کے سلسلے کا لٹریچر، کتابچہ وغیرہ مل جاتا ہے۔ نیچے کی گیلری میں ایک گائیڈ خاتون دس دس پندرہ پندرہ سیاحوں کا گروہ بنا کر پہلے گیلری میں لگی تصاویر کو سمجھانے لے چلتی ہے۔ یہ شاید اس لیے کیا جاتا ہے کہ اوپری منزل میں جہاں اصل میوزیم ہے وہاں پہلے سے موجود سیاح پہلے باہر نکل جائیں تو دوسرا گروہ پہنچے۔ نیچے میوزیم کی تاریخ کے ساتھ جنگ کی باتصویر تفصیلات دی گئی ہیں جن کو دیکھ کر اصل میوزیم دیکھنے کی خواہش اور بھڑک جاتی ہے۔

اب ایک مقام پر چکر دار زینہ کی طرف اوپر چلنے کا اشارہ ملتا ہے اور جب آپ آخری زینہ پر قدم رکھتے ہیں تو سامنے اور اطراف کا منظر آپ کو ایک لمحہ کے لیے حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ آپ مطلق بھول جاتے ہیں کہ میوزیم کی ایک گول عمارت ہے جہاں اس وقت آپ کھڑے ہیں عمارت کی مادی شکل ذہن سے محو ہو جاتی ہے اور جو آنکھیں دیکھتی ہیں وہ صرف افق جیسی وسعت لیے ہوئے پھیلاؤ ہوتا ہے جہاں اونچی نیچی زمین بلندیوں کا مکمل احساس دلاتے ہوئے پہاڑ، ہرے بھرے وسیع میدان، چراگاہیں اور زندگی کی تمام علامتوں کے ہمراہ گاؤں و قصبات نظر آتے ہیں۔ گاؤں و قصبات ایسی اصل شکل میں جہاں نگاہیں بار بار ہر چھوٹی سی چھوٹی تفصیلات پہ دھوکا کھائیں مکانوں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کو دیکھیں اور ذہن کو جھٹلا نہ پائیں کہ اصل نہیں ہے۔ سلگتی ہوئی لکڑیوں کو دیکھیں اور راکھ میں چھپی آگ کی تپش کو محسوس کریں اور دھوکا کھائیں۔ پانی سے بھرے گھڑے دیکھیں اور نگاہیں پانی کا احساس کرتی رہیں۔ الگنی پر ٹنگے کپڑوں کو دیکھ کر کچھ سوکھے، کچھ نم اور کچھ مکمل گیلے ہونے کا دھوکا کھاتے رہیں اور پھر ہواؤں کے چلنے پر کپڑوں کے اڑنے کا مکمل احساس کریں۔ آگ کے جلتے ہوئے لکڑی کے ٹہرے ٹہرے کندے پھوس کے ڈھیر میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم آگ جو کہیں کہیں سے دھواں بھی دے رہی ہے، راکھ میں لپٹے ٹہرے بڑے کوئلے جو اندر سے سلگ رہے ہیں۔ اتنے حقیقت کے قریب کہ آگ کی دھمک کا احسا پیدا کریں۔ یہ سارے منظر آپ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں آنکھ بند کر کے کھولیے

دھوکا کھائیے کہ جو کچھ سامنے ہے وہ حقیقی ہے۔

ان مناظر کے درمیان نپولین کی فوج کی چڑھائی کا منظر انتہائی ہیبت ناک ہے۔ ایک طرف دیکھیے تو گھڑ سواروں کے دستے ایسی برق رفتاری کے ساتھ سامنے سے دوڑتے نظر آرہے ہیں کہ گھوڑوں کے سموں سے اُڑتی ہوئی دھول، گھوڑوں کے تیور، اور گھڑ سواروں کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے نیزوں اور بھالوں کے زاویہ پل بھر میں بربادی اور بربریت کے کن حدود کو پار کر جائیں گے، پورا احساس دلا دیتے ہیں۔ ذرا گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھیے تو احساس ہوتا ہے کہ گاؤں والوں نے شاید ان کی آوازیں سن لی ہیں۔ گاؤں کے افراد کے چہروں پر پھیلی ہوئی سراسیمگی، افراتفری اور بے چینی کی ایسی حقیقی تصویر کشی ملتی ہے کہ دیکھنے والوں کا دل بیٹھنے لگے۔ گردن کو پھر تھوڑا موڑ کر دیکھیے تو وہی فوج اس گاؤں میں در آئی ہے اور فوجی گھروں میں گھس رہے ہیں۔ اس منظر میں فوجیوں کے زاویہ، ایکشن اور جذبات ایسے نظر آرہے ہیں کہ بس ابھی ابھی آپ کے سامنے سارا گاؤں تاراج ہو جائے گا اور ایک ایک فرد قتل کر دیا جائے گا۔ پھر چند میٹر ہٹ کر دوسری طرف اور آگے نظر ڈالیے تو پتہ چلتا ہے کہ فوجیوں نے گاؤں کے ایک ایک گھر کو تاراج کرنا شروع کر دیا ہے۔ گھر کے ٹوٹے برتن اور برتنوں سے پھیلا ہوا اناج تک نظر آئے گا۔ قتل کیے جانے والوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک پیش کیا ہے اس کے مناظر رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ جاں کنی کی کیفیت، شدید تکلیف سے بھرے چہرے کا تاثر، چہروں پر موت کا خوف، گھر والوں کی طرف حسرت بھری نگاہیں ایک ایک تفصیل آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ بہتا ہوا خون اتنا حقیقی کہ تازگی، چمک اور گرماہٹ کا احساس پیدا کر دے۔

آپ میوزیم کی گولائی میں ریلنگ سے لگے گھومتے رہیے اور نپولین کی فوج کی چڑھائی اور بستیوں کو تاراج کرنے کے مختلف مناظر دیکھتے رہیے۔ بتلایا یہ گیا کہ اس میوزیم میں تھری ڈائمنشنل پینٹنگ، اسکلپچر اور ماڈلوں کو اس خوبصورتی سے ملا دیا گیا ہے کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ کہاں پر پینٹنگ ختم ہوئی اور کہاں سے اسکلپچر شروع ہوا۔ تقریباً میں وہاں ایک گھنٹہ رہا اور جب باہر آیا تو نگاہیں اور عقل لڑتی رہیں کہ انسان کو ایسا خوبصورت دھوکا بھی دیا جا سکتا ہے۔

ماسکو میں اور بھی میوزیم ہیں جو روایتی میوزیموں سے ہٹ کر ہیں۔ میں ان کا تفصیلی ذکر یوں

نہیں کروں گا کہ وہ سائنس ٹیکنالوجی کے میوزیم ہیں جس سے لطف اندوز ایک سائنس داں ہی ہو سکتا ہے۔ میں سوشل سائنس کا طالب علم اس کی تفصیلات و گہرائیوں کو سمجھے بنا متاثر نہیں ہوں گا ایک بہت بڑے کامپلکس میں چاروں طرف خوبصورت عمارتوں میں یہ سائنس میوزیم پھیلا ہوا ہے اس میں خلائی سفر میں استعمال ہونے والی مختلف گاڑیاں، ملبوسات آلات و دیگر سامان کا شعبہ دلچسپی کا باعث ہے۔ خلا میں جانے والے تمام خلائی جہاز رکھے ہیں۔ یوری گاگرین کا جہاز، اس کے کپڑے، کھانے کا سامان سب محفوظ رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات جس نے بہت متاثر کیا وہ یہ کہ روسیوں میں حسنِ انتخاب کا معیار بہت بلند نظر آیا۔ اس میوزیم کامپلکس میں جب داخل ہوئے تو زراعت کے متعلق بہت کچھ شروع کی عمارتوں میں دکھلایا گیا ہے۔ اب چونکہ زراعت کے متعلق چاروں طرف معلومات کو پھیلایا گیا ہے اس لیے درمیان سڑک پر خوبصورت نہر کے کنارے جو مائشی روشنیوں کا انتظام ہے وہاں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ زراعت سے بات ہٹنے نہ پائے۔ روشنی کے جھاڑ فانوسوں کو گیہوں کی بالیوں کی شکل دے دی گئی جو اس پورے ماحول میں کھپ کے رہ گئی۔

ماسکو آیا تو ذہن میں روسی سرکس کلبلایا۔ اپنے ساتھیوں سے ذکر کیا۔ ہوٹل کے معلوماتی کاؤنٹر سے تفصیلات لیں تو پتہ چلا کہ ماسکو یونیورسٹی کامپلکس میں ہی باقاعدہ اس کی ایک عمارت ہے، جہاں روزانہ دو شو ہوتے ہیں۔ لیکن عین وقت پر ٹکٹ مشکل سے ملتا ہے۔ اس لیے ٹکٹوں کا انتظام پہلے سے بکنگ کر کے کرنا ہوگا۔ تقریباً ۴ بجے یونیورسٹی کی طرف گیا تو ماسکو یونیورسٹی کی عمارتیں پھیلاؤ اور خوبصورت پلاننگ دیکھ کر مبہوت ہوگیا۔ عمارت کے صدر دروازہ کے دائیں طرف ایک پہاڑی سلسلہ ہے جس کو لینین ہل کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک صاف ستھری سڑک نکالی گئی ہے جو ایک طرف لمبائی میں پشتہ سے ڈھکی ہے۔ یہ مقام پکنک اسپاٹ ہے اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں نئے شادی شدہ جوڑے ضرور آتے ہیں۔ سجی ہوئی کاروں پر، ماں، باپ بھائی بہنوں کے ہمراہ اور اس طرح یہ پوری سڑک شام تک نئے شادی شدہ جوڑوں سے بھری رہتی ہے۔ پشتہ کے نیچے دور تک جنگلوں کا ڈھلواں سلسلہ ہے اور دور چاروں طرف ماسکو شہر روشنی میں نہایا نظر آتا ہے۔ شام ہوتے ہوتے منظر انتہائی دلکش ہو جاتا ہے۔

یونیورسٹی کامپلکس میں ہی ایک طرف سرکس کی خوبصورت اور وسیع عمارت۔

ایک کمرکھی گولائی لیے ہوئے مرکزی گنبد ہے جس کے چاروں طرف نازک کھمبوں کی گیلری ہے جس میں دکانیں و بازار ہیں۔ نیچے بھی اس طرح کی گیلری ہے جہاں ٹکٹ، ٹائیلٹ، رسٹ ہاؤس بنے ہیں۔ پہلے نیچے سے ٹکٹ خریدیے پھر اوپر کی گیلری میں جا کر شاپنگ کیجیے، کچھ کھائیے مشروب و آئس کریم سے لطف اندوز ہوئیے اور وقت پر اسی کمرکھی گنبد نما ہال میں داخل ہو کر تین گھنٹہ کا شو دیکھیے۔

سرکس کا دلچسپ ماحول سرکس کے باہر ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ عمارت کے چاروں طرف پھیلے ہوئے لان پر لوگ شو سے قبل ٹکٹ حاصل کرنے آ رہے ہیں بھیڑ جمع ہو رہی ہے اور اسی بھیڑ کے درمیان سرکس کے کلاؤن (جوکر) بھی ٹہل رہا ہے۔ وہ اچانک طور پر مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آپ کی طرف بڑھاتا ہے اور آپ فطری انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتے ہیں۔ وہ ہاتھ ملائے گا اور دوسرے لمحے آپ کو احساس ہو گا کہ وہ آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ چھوڑ کر پیٹھ موڑ کر بے نیازی سے چلا جا رہا ہے اور آپ بھیڑ کے درمیان کہنی سے بنا ہوا ربڑ کا ہلکا پھلکا ہاتھ لیے سب کے ساتھ ہنس رہے ہیں۔ یہ شرارتیں باہری ممالک سے آئے ہوئے مسافروں اور سمجھ دار بچوں کے ساتھ بہت ہوتی ہیں۔

روس کا سرکس بھی سائنس ٹکنالوجی کے بلند مقام پر پہنچ چکا ہے۔ ہال کے اندر لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ مدھم مدھم آواز سے آرکسٹرا بج رہا ہے اور بیٹھے ہوئے عوام کو کلاؤن انتہائی شائستہ اور خوبصورت انداز سے بہلا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا پیڈ ہے اور جیبوں میں مختلف رنگوں کی بتیاں۔ وہ آپ کے پاس پہنچتا ہے اور دو منٹ سکون سے ایک ہی زاویہ سے بیٹھنے کی درخواست کرتا ہے اور پھر انتہائی برق رفتاری سے پیڈ پر مختلف رنگوں کی بتیاں جلنے کی آوازیں آنی لگتی ہیں۔ ادھر ۲ منٹ ختم ہوا۔ ادھر آپ کا خوبصورت پورٹریٹ تیار کے دائرہ میں بیٹھے ہوئے عوام کو دکھلا رہا ہے اور داد تحسین گڑگڑاتی ہوئی تالیوں کے ساتھ حاصل کر رہا ہے۔ بعد میں آپ کا پورٹریٹ انتہائی احترام سے آپ کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس میں جو قابل قدر پہلو ہے وہ یہ کہ اس کا حسن انتخاب بڑا قیامت کا ہوتا ہے۔ بیٹھے ہوئے عوام میں وہ ایسا چہرہ و انداز تلاش کر لیتا ہے جو سب کو ہنسانے پر مجبور کر دے۔ پھر پھرتی اور مہارت قیامت کا ہوتا ہے۔ یہ کھیل پورے ہال میں جگہ جگہ ہوتے رہتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے تالیاں

گونجتی رہتی ہیں۔

لائٹ وساؤنڈ، سامان کو سمیٹنے، بچھانے، رستوں کو کسنے، سیڑھیاں لگانے وغیرہ جیسے تمام کام جدید مشینوں کے ذریعے انجام پاتے ہیں۔ برف پر اسکیٹ کا پروگرام ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہال کے درمیان جو سرکل ہے وہ زمین دوز ہوتا ہے۔ یہ سرکل دوہرہ ہے۔ یعنی ایک سرکل جب زمین دوز ہوتا ہے تو اسی وقت برف سے جمع ہوا دوسرا سرکل اُبھرتا ہے اور کھیل کے اختتام پر وہ نیچے چلا جاتا ہے۔ شاید نیچے برف جمانے کا پلانٹ لگا رکھا ہو۔ کھیل کا اختتام انتہائی خوبصورت ہوتا ہے پورا ہال پانی کے رنگ برنگے فوّاروں سے بھر جاتا ہے اس پر روشنی کے زاویے اور قیامت ڈھاتے ہیں اور عوام انھیں کے درمیان سرشاری و شادمانی کی کیفیت میں ڈوبے ہوئے ہال سے باہر نکلنا شروع کر دیتے ہیں۔

ماسکو کے ریکریشن پارک، امیوزنگ پارک بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سبھی کے لیے کشش کا باعث ہیں جہاں شام کے وقت میلا سا لگا رہتا ہے۔ آئس کریم، سیخوں پر لگے بھنے گوشت کے پارچے اور کولڈ ڈرنک جگہ جگہ بکتے ہیں۔ یہاں بھی پنسل سے پورٹریٹ تیار کرنے والے آرٹسٹ اپنی فولڈنگ چیر اور دیگر ساز و سامان سجائے جگہ جگہ بیٹھے ملتے ہیں اور منٹوں میں آپ کا پورٹریٹ تیار کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی بڑی بھیڑ رہتی ہے اور یہ لوگ بہت کماتے ہیں۔

ماسکو کی زمین دوز ریلوں اور اسٹیشنوں کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو سب کچھ ادھورا سا لگتا ہے۔ یہ ریلیں جن کو میٹرو کہا جاتا ہے۔ پورے ماسکو میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی مجموعی لمبائی ۲۸۰ کلو میٹر بتلائی جاتی ہے۔ صبح ۶ بجے سے رات ۲ بجے تک ایک لمحہ کو ٹھہرے بغیر چلتی رہتی ہیں اور کسی اسٹیشن پر ۲ تا ۵ سکنڈ کے وقفہ سے مسلسل آتی رہتی ہیں۔ [illegible] تو یہاں کے سول انجینیرینگ، ڈیزائنرز اور محنت کش طبقہ کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ اسٹیشنوں کی [illegible] چھتوں، خوبصورت کھمبوں، دروں اور ان پر مینا کاری یا دیگر نقاشوں کے جو پرکشش نمونے [illegible] ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ارشا ہال کے محلوں کو صحیح کے استعمال کے لیے اٹھا لایا گیا [illegible] [illegible] سجاوٹ، ڈیزائن [illegible]

[illegible]

نقاشی اور روشنی کے اعتبار سے قطعی منفرد ہے۔ انتظامیہ کا اعلیٰ معیار تو یہ ہے کہ دوران قیام مسلسل سفر کیا لیکن کسی اسٹیشن پر کسی گاڑی کو اپنے مقررہ وقت سے، منٹوں کی بات چھوڑیے سکنڈوں میں بھی آگے پیچھے ہوتے نہ دیکھا۔ کسی اسٹیشن پر کسی مقام پر کوئی لائٹ، کوئی قندیل خراب نہ دیکھی اور صفائی کا یہ حال کہ اسٹیشنوں کو چھوڑیے ریلوے ٹریفک پر بھی سوائے کالی گریس اور چکنی ہوئی پٹریوں کے کوئی کاغذ کا چھوٹا سا پرزہ، پلاسٹک کا تھیلا یا سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا تک نظر نہ آیا۔ اسٹیشنوں کے رکھ رکھاؤ کا یہ عالم کہ ۵ برس گزر جانے کے بعد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ابھی ابھی افتتاح کیا گیا ہو۔

ماسکو میں ریلوے کا نظام دوہرے درجہ کا ہے۔ ایک نظام [سرکل] گولائی میں ہے اور پھر گولائی میں ہر اسٹیشن سے مختلف سمتوں میں جانے کے لیے پٹریاں بچھائی گئی ہیں جن کو نقشہ میں مختلف رنگوں سے دکھلایا گیا ہے۔ اگر ایک بار نقشہ کو سمجھ لیا جائے تو پھر منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گولائی سے باہر نکلے ہوتے جتنے اسٹیشن ہیں وہ یا تو اس گولائی کی سطح سے مزید نیچے ہیں یا پھر اس سے بلند ہیں۔ ماسکو میٹرو دنیا کی سستی ترین میٹرو ہے جہاں صرف ۵ "کوپک"، یعنی ۵ پیسے میں صبح سے رات کے دو بجے تک گھومتے رہیے بشرطیکہ اسٹیشن سے باہر نہ نکلیں۔ بس میٹرو میں کہیں بھی جائیے آپ کو کسی اسٹیشن پر ٹکٹ فروخت کرنے والے کاؤنٹر نہیں ملیں گے بلکہ پورے شہر میں ہر ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں سڑکوں، چوراہوں پر، چھوٹی موٹی دکانوں، کولڈ ڈرنک، آئس کریم شاپ پر ہر جگہ دستیاب ہیں۔ آپ گڈی کی گڈی خرید کر جیب میں رکھ لیجیے۔ ہفتہ، دو ہفتہ اور ایک ماہ کی مدت کے الگ الگ ٹکٹ ملتے رہتے ہیں۔ یہ ذمہ داری سفر کرنے والے کی ہے کہ جب وہ بس میں یا میٹرو میں سفر کرے تو ٹکٹ کو پنچ خود کرے۔ میٹرو میں ٹکٹ نہیں بلکہ ۵ کوپک کا سکہ چلتا ہے جس کو اسٹیشن میں داخل ہونے سے قبل مشین میں ڈالنا ہوتا ہے اور گرین سگنل ہونے پر داخل ہونا ہوتا ہے ورنہ اگر بغیر سکہ ڈالے داخل ہونے کی کوشش کی تو داخل ہونے سے قبل لوہے کا بیریر کھٹاک سے سامنے گرتا ہے جس سے آپ کو چوٹ بھی آسکتی ہے۔ میں نے ٹیسٹ کر کے دیکھا ہے اور جب ایک کھٹاک کی آواز کے ساتھ بیریر کو گھٹنے کے سامنے گرتے دیکھا تو پاس شیشہ کے کیبن میں بیٹھی ہوئی عورت مسکرا دی اور ہاتھ کے اشارہ سے کبھی نہ کرنے کی تنبیہہ بعد ۱۵ یومیہ یا ماہانہ ٹکٹ ہوتے ہیں وہ اسی کیبن میں بیٹھی عورت کو دکھلا کر پاس ہو جاتے ہیں۔

دانش اختر

مولانا حافظ شاہ محمد جان ادیب بحری آبادی

(۱۲۸۳-۸۴ھ / ۱۸۶۷-۶۸ء — ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء)

بحری آباد کا تاریخی اور علمی پس منظر

ہندوستان کے متعدد شہر و قصبات اپنی مردم خیزی اور علم وفن کے مرکز کی حیثیت سے بڑی اہمیت و شہرت رکھتے ہیں۔ ان ہی مردم خیز قصبات میں مشرقی اتر پردیش کے ضلع غازی پور تحصیل سید پور کا ایک قصبہ بحری آباد بھی ہے جو شہر غازی پور سے تقریباً ۲۴ میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف ضلع اعظم گڑھ کی مشرقی سرحد کے قریب واقع ہے۔ یہ ایک قدیم قصبہ ہے جس کی کہنگی اس کے در و دیوار سے اور قدامت تاریخ کے اوراق سے عیاں ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ

"جس زمانہ میں ملک السادات سید مسعود غازی نے شہر غازی پور کی بنیاد رکھی، تقریباً اسی زمانہ میں مخدوم ملک بحری نے جو دربار شاہی کے امراء میں سے تھے اس علاقہ کو فتح کیا اور ان ہی کے نام پر اس قصبہ کا نام بحری آباد پڑا۔[1]"

آئین اکبری میں بھی اس کا شایانِ شان ذکر ملتا ہے۔

بحری آباد کا شمار ہندوستان کے مردم خیز خطوں میں ہوتا ہے جہاں ہر زمانہ میں مختلف علوم فنون کے اصحاب کمال اور ارباب علم وفضل پیدا ہوئے جنھوں نے دین وادب، حفظ قرآن، دعوت وارشاد طبابت و وکالت، ملازمت اور سیاست غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی پر اپنے کمال وہنر، تفوق و برتری اور عظمت وانفرادیت کے لافانی نقوش مرتسم کیے ہیں۔

جناب دانش اختر، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی لکھنؤ یونی ورسٹی لکھنؤ۔

حفظ قرآن کسی زمانہ میں بحری آباد کا ایک امتیازی وصف تھا۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس سعادت سے بہرہ ور تھیں۔ پروفیسر مشیر الحق بحری آبادیؒ کا مندرجہ ذیل بیان اس امر پر شاہد عدل ہے:۔

"حفظ قرآن کسی زمانہ میں بحری آباد کی خصوصیت تھی۔ مردوں کے علاوہ میرے بچپن تک پورے قرآن کی کئی حافظ عورتیں خود میرے اپنے خاندان میں موجود تھیں"

وطن وخاندان اس قصبہ کی جلیل القدر اور عظیم المرتبت شخصیتوں میں مولانا حافظ شاہ محمد جان ادیب بحری آبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو اپنے دور کے جید علماء نادرۂ روزگار ادباء اور ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک ایسے علمی و دینی خانوادے کے چشم وچراغ تھے جو اپنی شرافت و نجابت، زہد و قناعت، صبر و استقامت، عزت وعظمت اور علم وفضل کی بناء پر دور ونزدیک مشہور وممتاز تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک منتہی ہوتا ہے جیسا کہ ان کے خلف الرشید مولانا شاہ ابو قاسم صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا حافظ شاہ محمد جان ابن شاہ محمد یعقوب کا سلسلۂ نسب باب الدنیا بہاء اللہ عرف شیخ اڈھن جونپوری اور وہاں سے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے اس طرح کہ شاہ محمد یعقوب ولد شاہ علیم اللہ عرف گھورن صاحب ولد شاہ غلام غوث صاحب ولد شاہ حمید الدین صاحب ولد شاہ اسد الدین عرف بھیکا صاحب ولد حضرت مولانا محمد تابع صاحب ولد حضرت مولانا خضر محمد ولد حضرت شیخ ہدایت اللہ صاحب ولد حضرت شیخ احمد صاحب ولد حضرت شیخ قیام الدین صاحب ولد حضرت شیخ قطب الدین صاحب ولد حضرت خواجہ مخدوم الہند شیخ اڈھن صاحب بن اولاد مخدوم شیخ بہاء الدین بن اولاد حضرت فاروق عمر بن الخطابؓ"

بحری آباد کے اسی اعلیٰ معزز اور شریف النسب خاندان میں مولانا شاہ محمد جان کی پیدائش تیرھویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ وہیں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی اور مولانا سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی کے مندرجہ ذیل بیانات بالترتیب ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "بحری آباد کے جید علماء میں مولانا عبدالعزیز کے بعد مولانا شاہ محمد جان کا نام آتا ہے جو مولانا عبدالعزیز کے چچا شاہ محمد یعقوب کے صاحبزادے تھے۔ شاہ محمد جان کا تاریخی نام غلام ہادی

تھا جس سے سن پیدائش ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷/۶۸ء) نکلتا ہے۔"[۴]

(۲) "الشیخ الفاضل محمد جان بن یعقوب العمری الحنفی البجری آبادی، أحد العلماء المبرزین فی الفنون الأدبیۃ، ولد ونشأ بقریۃ بجری آباد من أعمال اعظم گڑھ۔"[۵]

(شیخ فاضل محمد جان بن یعقوب عمری حنفی بجری آبادی جو فنون ادبیہ کے ممتاز علماء میں سے تھے اعظم گڑھ کے موضع بجری آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی)

یہاں مولانا حسنی سے کچھ سہو ہوگیا ہے جس کی نشاندہی کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے بجری آباد کو ضلع اعظم گڑھ کا موضع تحریر فرمایا ہے جب کہ وہ ضلع غازی پور میں واقع ہے غالباً انھیں یہ غلط فہمی اس بنا پر ہوئی کہ یہ قصبہ ضلع اعظم گڑھ کی مشرقی سرحد کے قریب واقع ہے اور مولانا محمد جان کے خاندان کی قرابت و عزیز داری اس ضلع کے شرفائے نجیب الطرفین اور سادات و شیوخ سے بکثرت ہے۔

شاہ محمد جان صاحب کے فرزند ارجمند شاہ ابوالقاسم صاحب اپنے خاندانی حالات پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"مولانا شاہ محمد جان رحمۃ اللہ علیہ شاہ محمد یعقوب مرحوم کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ شاہ محمد یعقوب کے چار بھائی تھے۔ بڑے شاہ محمد عیسیٰ، دوسرے خود شاہ محمد یعقوب، تیسرے شاہ عبدالرحمٰن جو بھیرہ ضلع اعظم گڑھ ہی میں رہ گئے۔ چھوٹے شاہ محمد فصاحت جن کے پوتے مشیر الحق[۶] (جامعہ ملیہ) ہیں زمینداری و جائداد وغیرہ کا آپسی بٹوارہ اس طرح ہوا کہ بجری آباد کی زمینداری تین بھائیوں کے حصے میں آئی اور بھیرہ اور اطراف بھیرہ کے جائیداد شاہ عبدالرحمٰن کو دے دی گئی جو ان کے حصے سے بہت زیادہ تھی۔ شاہ محمد یعقوب کی اولاد تو آٹھ دس ہوئیں لیکن صرف تین اولاد زندہ رہیں اور عمر طبعی تک پہنچیں۔ اوّل شاہ عبدالجلیل جن کی شادی شاہ عبدالرحمٰن کی لڑکی سے ہوئی۔ دوسرے شاہ محمد صالح صاحب جن کی شادی شاہ محمد عیسیٰ کی لڑکی سے ہوئی۔ تیسرے شاہ محمد جان جن کی پہلی شادی شاہ عبدالرحمٰن کی دوسری لڑکی سے ہوئی جن کا انتقال ایک لڑکی کی ولادت کے سلسلے میں ہوا۔"

[redacted]

شاہ محمد جان بحری آبادی نے دو شادیاں کی تھیں۔ ان کی دوسری شادی بھی موضع بھیرہ ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی جیسا کہ ایک فوٹو اسٹیٹ ورق میں جو مولانا کے موصوف کے حالات زندگی سے متعلق بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہے، درج ہے کہ:۔

"ان کے دونوں نکاح یکے بعد دیگرے مقام بھیرہ ولید پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئے"۔

تعلیم و تربیت مولانا محمد جان بحری آبادی نے جس خاندان میں آنکھیں کھولیں وہ دینی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے مشہور و ممتاز تھا۔ لہٰذا شرفاء کے دستور کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت اور تہذیب و ثقافت پر خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں وطن ہی میں پڑھیں۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہونے کا شوق سر میں سمایا تو اپنے وطن سے باہر قدم نکالا اور ہندوستان کے مشہور مراکز علمیہ اور شہر و قصبات کا سفر اختیار کیا اور اپنے عصر کے باکمال اور یگانۂ روزگار علماء و فضلاء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ان سے مختلف علوم و فنون کا اکتساب کیا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

"انھوں نے پہلے گھر کے مدرسہ میں حافظ شیخ عبدالشکور صاحب ساکن پواڑی ضلع اعظم گڑھ اور حافظ محمد جعفر صاحب ساکن مصرانواں ضلع غازی پور سے صغر سنی میں قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کی اکثر و بیشتر کتابیں مکان ہی پر بالخصوص میر خادم حسین صاحب سے پڑھیں اس کے بعد چند روز غازی پور میں رہ کر عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ تکمیل علوم کے لیے سکندر پور (بلیا) مولانا محمد فاروق بن علی اکبر عباسی چریا کوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی، فارسی کی انتہائی کتابیں پڑھیں اور عربی ادب اور شعر و شاعری میں کمال پیدا کیا۔ اس کے بعد تقریباً بیس بائیس برس کی عمر میں مرکز علم و فن لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہاں کے نامور اساتذہ علامہ ابوالحسنات عبدالحیؒ فرنگی محلی اور مولانا محمد عین القضاۃ بن محمد وزیر حیدرآبادی کے حلقہ ہائے درس میں شرکت کی۔ یہ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی کا آخری زمانہ تھا۔ مولانا بحری آبادی نے ان سے معقولات کی تعلیم حاصل کی اور شرح وقایہ کے چند اسباق پڑھے اور مولانا محمد عین القضاۃ

سے درسیات میں فقہ، اصول اور کلام وغیرہ کی تحصیل کی۔ پھر ممدوح کی تحریک سے مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث کی تکمیل کی۔ چند کتب درسیہ امروہہ ضلع مراد آباد میں مولانا احمد حسن صاحب امروہوی سے بھی پڑھیں۔"

آسی پریس میں

حصول علم سے فراغت پائی تو فکر معاش دامن گیر ہوئی۔ لہٰذا فَامْشُوا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (آیت قرآنی) کے مطابق بھوپال کی طرف رخت سفر باندھا جس کی علم پروری کا غلغلہ ہر سو بلند تھا اور جو اس زمانہ میں علم و ثقافت کا گہوارہ اور علماء وفضلاء کا ملجأ و ماویٰ تھا۔ کچھ وہاں قیام کے بعد لکھنؤ تشریف لے گئے اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے مطبع اصح المطابع میں جو آسی پریس کے نام سے مشہور تھا تصحیح کتب کی خدمت پر مامور ہوئے۔ مولانا آسی کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں کہ

"مولانا آسی نے لکھنؤ میں محمود نگر کے محلہ میں سکونت اختیار کی اور اصح المطابع کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ بعد کو اس کا نام ان کے صاحبزادہ قاری عبدالولی مرحوم نے آسی پریس رکھ دیا تھا۔ اس مطبع سے عربی کی بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ مولانا آسی کو کتابوں کی تصحیح میں بڑی مہارت اور دقت نظر حاصل تھی۔ عربی متوسطات کے طالب علموں کو وہ با اجرت تصحیح کے کام پر رکھ لیتے تھے اور مولانا کی صحبت میں وہ کچھ نہ کچھ بن جاتے تھے۔"[1]

مولانا بحری آبادی بھی ان ہی خوش قسمت طالب علموں میں تھے جنھوں نے اپنی خداداد ذہانت و استعداد سے مولانا آسی کی صحبت سے بہرۂ وافر حاصل کیا۔

مولانا بحری آبادی نے آسی پریس میں اپنی ملازمت کے دوران تصحیح کتب کے علاوہ یہاں سے طبع ہونے والی متعدد کتابوں پر عربی، فارسی اور اردو میں منظوم تقریظیں بھی لکھیں۔ نیز اسی سے شائع ہونے والے مشہور عربی اردو ماہنامہ "البیان" کے اوراق بھی ان کے رشحات قلم مزین ہوا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر شبیر الحق بحری آبادی کا مندرجہ ذیل بیان پیش خدمت

"فراغت کے بعد چند روز بھوپال رہے۔ آخرش لکھنؤ میں مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے مطبع اصح المطابع میں جو آسی پریس کے نام سے معروف تھا تصحیح کتب کے کام پر ملازم

ہوئے۔ اس مطبع سے شائع ہونے والی اکثر کتابوں پر عربی اور اردو میں لکھی ہوئی ان کی منظوم تقریظیں ملتی ہیں۔ اسی پریس سے مولانا عبداللہ العمادی جونپوری کی ادارت میں ایک ماہوار عربی رسالہ "البیان" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ مولانا عمادی جو بعد میں دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد جاکر مترجم کی حیثیت سے مشہور ہوئے مولانا شاہ محمد جان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ اسی دوستی کے باعث انھیں "البیان" کے لیے برابر کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا۔[۱]

تدریسی ذمہ داریاں

مولانا بحری آبادی اسی پریس میں جو علمی خدمات انجام دے رہے تھے اس سے ان کی تشفی نہیں ہورہی تھی۔ ان کی دیرینہ خواہش تھی کہ کوئی ایسا مشغلہ اختیار کریں جس سے ان کے ذوق مطالعہ وکتب بینی کو تسکین ہو اور دوسرے لوگ بھی لذت علم سے آشنا ہوسکیں۔ اس کے لیے درس وتدریس سے بہتر اور کون سا شغل ہوسکتا تھا۔ چنانچہ ان کی اس آرزو کی تکمیل کی صورت یوں پیدا ہوئی کہ والیٔ ریاست جوناگڑھ نے ان کے علم وفضل اور صلاحیتوں سے اثر پذیر ہوکر انھیں مدرسہ بہاء الدین جوناگڑھ کی صدر مدرسی کے اعلیٰ منصب کی پیش کش کی جسے مولانا موصوف نے بخوشی منظور فرمالیا۔ اس سلسلے میں وہاں ان کا قیام عرصۂ دراز تک رہا۔ بعد ازاں اپنے استاد وشیخ مولانا محمد عین القضاۃ صاحب کی حسب خواہش وفرمائش لکھنؤ تشریف لے گئے اور استاذ محترم کے قائم کردہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں مسند تدریس وافتاء کو زینت ورونق بخشی۔ چنانچہ اس سلسلے میں پروفیسر مشیر الحق صاحب[۲] رقم طراز ہیں:۔

> "والی ریاست جوناگڑھ نے انھیں مدرسہ بہاء الدین* جوناگڑھ کی صدر مدرسی پیش کی، جسے انھوں نے قبول کرلیا۔ دراصل مولانا کے علمی شباب کا یہی زمانہ تھا۔ وہاں جن لوگوں نے مولانا سے اکتساب علم کیا ان میں قاضی میاں اختر جوناگڑھی (مرحوم) اور قاضی حبیب اللہ مظفر نگری ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کرگئے۔ ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء) میں مولانا شاہ محمد جان کے پاس ان کے استاد مولانا محمد عین القضاۃ کا پیغام

* صاحب نزہۃ الخواطر ج ۸، صفحہ ۱۴۰ کے بموجب اس مدرسہ کا نام مدرسہ مہابت خانی جوناگڑھ تھا۔

پہنچا کر وہ لکھنؤ واپس آجائیں۔ وہ واپس آگئے اور مولانا نے انھیں اپنے قائم کردہ مدرسہ
عالیہ فرقانیہ کا صدر مدرس مقرر کر دیا۔"[۱۱]

مولانا شاہ ابو القاسم صاحب تحریر کرتے ہیں:

"راحقر کے والد حضرت مولانا و مولوی حافظ شاہ محمد جان صاحب ریاست جونا گڑھ میں
بحیثیت صدر مدرس عربی و فارسی ملازم تھے چنانچہ موجودہ والئ ریاست شاگرد بھی ہے
بعدہ لکھنؤ مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں ملازمت اختیار کی۔
جب کہ فرنگی محلی لکھنؤ میں بعہد مولانا عبدالحی صاحبؒ دونوں حضرات کا قیام تھا اس
لیے باصرار مولانا عین القضاۃ صاحبؒ نے جونا گڑھ سے بلوا کر اپنے مدرسہ میں بمشاہرہ
۱۰۰ روپیہ ماہوار صدر مدرس و مہتمم اوّل کا عہدہ سپرد فرمایا۔"[۱۲]

مولانا بحری آبادی اپنے عہد کے ممتاز، باکمال اور ہر دلعزیز اساتذہ میں سے تھے۔ علم و دین اور شعر و ادب کی خدمت ہی ان کا مطمح نظر تھا۔ دولت و شہرت سے دور بھاگتے تھے۔ طلباء ان کے بے حد عقیدت مند اور گرویدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جونا گڑھ کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ تشریف لے گئے تو طلبائے جونا گڑھ کو ان کی جدائی نہایت شاق گزری۔ اس ضمن میں مولانا شاہ ابو القاسم مرحوم کا مندرجہ ذیل بیان ملاحظہ ہو:

"... پھر جب مولانا سید عین القضاۃ نے اپنے مدرسہ میں بلایا تو (جونا گڑھ) چلے آئے وہاں کے ذی اثر شاگردوں نے واپس بلانے کی بہت کوشش کی۔ جب کسی طرح تیار نہ ہوئے تو کہا کہ آپ اپنی آنکھ کی شکایت کو بہانہ بنا کر ایک درخواست بھیج دیں۔ ہم لوگ تا حیات پنشن مقرر کرا دیں گے۔ اس کو بھی منظور نہ فرمایا۔ وہاں کے زمانۂ قیام میں جونا گڑھ کے ولی عہد کو بھی کتابیں پڑھائی تھیں۔ ان کے خسر بھی مولانا کے بہت گرویدہ تھے۔ ان کی کوٹھی بھی شاہ صاحب کے مکان کے سامنے تھی اور وہ برابر اپنی کوٹھی بلاتے لیکن کبھی نہیں گئے۔"

تلامذہ

شاہ محمد جان صاحب کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرنے اور ان کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والوں میں یوں تو بہت سے حضرات کے نام شامل ہیں لیکن

[redacted]

"ان کے براہ راست شاگرد علماء میں قاضی میاں اختر جونا گڑھی مرحوم*

اور قاضی حبیب اللہ مظفر نگری (متوطن لاہور) کے علاوہ بجری آباد کے مومن انصار خاندان

کے دو نمایاں نام بھی ہیں۔ ایک مولانا قاری محمد ریاست علی بجری آبادی اور دوسرے مولانا

حافظ محمد ضمیر بجری آبادی۔"[۱۶]

شاہ محمد جان صاحبؒ کے پوتے اور شاہ ابوالقاسم صاحبؒ کے فرزند رشید ڈاکٹر شاہ عبدالسلام صاحب

مدظلہ العالی سینیر لکچرر شعبہ عربی و عرب کالچر لکھنؤ یونیورسٹی کے بقول: مولانا اسباط صاحب کو بھی مولانا بجری آبادی

سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ مولانا اسباط صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حدیث و فقہ کے

مشہور و ممتاز استاد تھے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

سفر آخرت مولانا بجری آبادی نے بھرپور علمی زندگی گزار کر اور تشنگان علوم کو فیوض پہنچا کر بالآخر ایک روز جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔

مؤلف نزہۃ الخواطر کی حسب روایت :۔

"مولانائے موصوف نے ۲ رشعبان المعظم ۱۳۳۶ھ کو داعیِ اجل کو لبیک کہا"[۱۷]

ان کے انتقال سے عربی، فارسی اور اردو علوم و ادبیات کے آسمان پر نصف صدی تک درخشاں

رہنے والا ایک ستارہ غروب ہو گیا اور علمی و ادبی محفلوں میں ضوافشانی کرنے والی ایک شمع بجھ گئی

جس سے بزم عالم ویران و تاریک ہو گئی ؎

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد   من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

پروفیسر مشیر الحق بجری آبادی مولانا مرحوم کے مرض الموت، سن وفات، جائے تدفین نیز دیگر

امور پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"لکھنؤ آئے ہوئے چند ہی برس گزرے تھے کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور اسی مرض میں آپ

نے ۲ ر شعبان ۱۳۳۸ھ (۲۱ راپریل ۱۹۲۰ء) کو وفات پائی اور لکھنؤ کے مشہور قبرستان عیش

باغ میں دفن کیے گئے۔ مولانا سید علی زینبی مرحوم نے فارسی میں ایک مرثیہ لکھا اور لوحِ مزار

---

* شاہ ابوالقاسم صاحبؒ کی حسب روایت : قاضی احمد میاں جونا گڑھی۔

کے لیے ایک تاریخ وفات بھی کہی ہے مولانا محمد شفیق القضاۃ نے سنگ مرمر پر کندہ کرا کے قبر پر لگوا دیا تھا۔ لیکن اب نہ وہ کتبہ رہ گیا ہے اور نہ ہی قبر کا نشان ملتا ہے۔ ہاں کتبہ کے اشعار خاندانی کاغذات میں محفوظ رہ گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

فاضل دانا ادیب نکتہ داں — درجوار رحمت رحمان برفت
سال فوتش ایں چنیں گفتا سروش — "عالم دیں شہ محمد جان برفت"

۱۳۳۸ھ

مولانا کے مرحوم کی سوانح حیات پر مشتمل سابق الذکر فوٹو اسٹیٹ ورق میں قدرے مختلف تاریخ وفات درج ہے نیز اس سے جائے تدفین کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

"الغرض ایک زمانہ تک اپنے علوم سے فیوض پہنچا کر بتاریخ ۳ رشعبان شب جمعہ ۱۳۳۶ھ کو دار فانی سے رحلت فرمایا اور مقام عیش باغ کے قبرستان میں دروازے سے تھوڑا آگے بڑھ کر مدفون ہوئے ہیں۔"

اولاد و احفاد

مولانا کے مرحوم نے اپنے پیچھے اپنی معنوی یادگاروں کے علاوہ چند ظاہری اولادیں بھی چھوڑیں۔ اوپر گزر چکا ہے کہ موصوف نے دو شادیاں کی تھیں، اور دونوں نکاح موضع ولید پور بھیرہ ضلع اعظم گڑھ میں ہوئے۔ شاہ ابوالقاسم صاحب مرحوم کے بموجب:۔

"شاہ محمد جان کی پہلی شادی شاہ عبدالرحمٰن کی دوسری لڑکی سے ہوئی جن کا انتقال ایک لڑکی کی ولادت کے سلسلے میں ہوا۔"

شاہ محمد جان کی ان صاحبزادی کا نام سلمیٰ بی بی تھا۔ اپنی پہلی زوجہ اور صاحبزادی کے انتقال پر ملال پر انھوں نے بالترتیب اردو اور فارسی میں دو قطعات تاریخ لکھے تھے جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

زوجۂ ثانیہ کے بطن سے ایک لڑکی مصطفیہ بیگم اور دو لڑکے محمد اور ابوالقاسم پیدا ہوئے تھے جیسا کہ پروفیسر مظہر الحق مرحوم کے مندرجہ ذیل بیان سے ظاہر ہے:

"معنوی اولاد کے علاوہ مولانا محمد جان کے ایک لڑکی اور دو لڑکے ہوئے تھے۔ بڑا لڑکا جس کا نام محمد تھا پانچ برس کا ہو کر فوت ہو گیا۔ لڑکی کو انھوں نے ضروری دینی تعلیم کے علاوہ قرآن بھی حفظ کرایا تھا اور اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ مولانا کے

چھوٹے صاحبزادے مولانا شاہ ابوالقاسم صاحب ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ (۱۹۱۶ء) میں پیدا ہوئے۔ ابھی بچہ ہی تھے کہ
تھے کہ سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا۔[۱۶]

مولانا شاہ ابوالقاسم صاحب علم و فن اور دین و ملت کی خدمت میں اپنے پدر بزرگوار کے جانشین ہوئے۔
ہ ایک فاضل یگانہ، عالم یکتائے زمانہ اور استاذ نامور تھے۔ درس و افادۂ طلبہ سے انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔
نانچہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عرصہ دراز تک (تقریباً ۳۴ برس) تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں اور
پنے دریائے فیض سے تشنگان علم اور شائقین ادب کو سیراب و شادکام کیا۔ ان کے فیض تربیت سے بہت
ے طلباء علماء بن کر نکلے جنھوں نے علمی دنیا میں اپنا اور اپنے استاذ گرامی قدر کا نام روشن کیا۔ راقم سطور کو بھی
ن سے شرف تلمذ حاصل ہے اور اسے اپنے لیے موجب فخر و اعزاز سمجھتا ہے۔

مولانا ممدوح نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے سبکدوشی کے بعد اپنے استاذ و مربی مولانا محمد معین القضاۃ کے
ائم کردہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ کے مہتمم کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں لیکن ضعف پیری اور مسلسل
لالت کے باعث تقریباً ڈیڑھ برس تک ہی خدمت انجام دے سکے۔ بالآخر استعفیٰ دے کر اپنی قیام گاہ
حاطہ سنگی بیگ شاہ گنج لکھنؤ میں عزلت گزیں اور گوشہ نشین ہو گئے اور وہیں ایک طویل علالت کے
بعد مورخہ ۱۵ر جون ۱۹۹۰ء مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ کو تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا
ور عیش باغ کے قبرستان میں آسودۂ خواب ہوئے (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ وأدخلہ فسیح جناتہ)[۱۸]

شاہ ابوالقاسم مرحوم کے پس ماندگان میں ایک صاحبزادے ڈاکٹر شاہ عبدالسلام صاحب اور دو صاحبزادیاں
رشیدہ پروین صاحبہ اور فریدہ پروین صاحبہ ہیں۔ ڈاکٹر شاہ عبدالسلام صاحب مدظلہ العالی دنیائے علم
و ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ اپنے نامور اور جلیل القدر آباء و اجداد کی شمع علم و ادب
فروزاں کیے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ کے شعبۂ عربی
عرب کلچر میں سینیئر لکچرر کے منصب پر فائز ہیں اور گراں قدر تعلیمی و تدریسی اور تصنیفی خدمات سرانجام
ے رہے ہیں۔

حواشی

۱۔ مضمون: بحری آباد اور علمائے بحری آبادی مرحوم ماہنامہ جامعہ دہلی سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۲۲

۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۱۔

۳۔ شاہ محمد جان بحری آبادی کے بارے میں شاہ ابوالقاسم صاحب کے جملہ بیانات ان سے تحریری طور پر اخذ کیے گئے ہیں۔

۴۔ ماہنامہ جامعہ دہلی، سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۵

۵۔ نزہۃ الخواطر، ج ۸، طبع دوم سنہ ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۱ء، حیدرآباد دکن، صفحہ ۴۱۶۔

۶۔ پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ایک ماہر اسلامیات کی حیثیت سے وہ بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ دیگر علوم و فنون بھی ان کے حیطۂ علم میں داخل تھے۔ موصوف ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ اپنی متعدد گرانقدر تصانیف اور علمی کارناموں کی بدولت علمی و ادبی حلقوں میں مشہور و مقبول ہوئے۔ کئی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں عرصے تک پروفیسر رہے اور گرانقدر تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ مدت عہدہ پوری ہونے سے چند ماہ قبل یہ آفتاب علم و فضل ظلم و بربریت کا شکار ہو کر مورخہ ۱۰ر اپریل سنہ ۱۹۹۰ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً وأدخلہ فسیح جناتہ، آمین

۷۔ یہ فوٹو اسٹیٹ ورق مولانائے ممدوح کے اہل خاندان کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے اختتام پر تحریر ہے کہ:

"جناب حفظ اللہ صاحب مولوی فاضل مددگار گورنمنٹ ہائی اسکول چادر گھاٹ، سرکار عالی حیدرآباد دکن کے پاس یہ حالات گئے۔ ۱۳ر محرم سنہ [illegible]ھ۔"

۸۔ ماہنامہ جامعہ دہلی سنہ ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۵؛ نزہۃ الخواطر ج ۸، طبع دوم، صفحہ ۴۱۶؛ مذکرہ

فوٹو اسٹیٹ ورق۔ اور ایک مکتوب بنام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، مکتوب نگار: مولانا شاہ ابوالقاسم ہجری آبادی، مورخہ ۳۰ دسمبر ۶۲ء بروز دوشنبہ۔

۹ سید سلیمان ندوی: یادِ رفتگاں، مطبوعہ کراچی ۱۹۸۳ء، تذکرہ مولانا عبداللہ العمادی، صفحہ ۳۵۱۔

۱۰ ماہنامہ جامعہ دہلی ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۵۔

۱۱ ایضاً، صفحہ ۳۵

۱۲ مکتوب بنام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ، مورخہ ۳۰ دسمبر ۶۲ء (غیر مطبوعہ)

۱۳ ماہنامہ جامعہ دہلی، صفحہ ۳۸۔

۱۴ نزہۃ الخواطر، ج ۸، طبع دوم، صفحہ ۳۱۷۔

۱۵ مجلہ جامعہ دہلی، بابت ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۷

۱۶ مذکورہ فوٹو اسٹیٹ ورق۔

۱۷ مجلہ جامعہ دہلی، ۸۴-۱۹۸۳ء، صفحہ ۳۷۔

۱۸ روزنامہ قومی آواز، لکھنؤ۔ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۹۰ء / ۲۲ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ۔

نعیم الدین رضوی

ادبی مکالمے کا فن

پروفیسر عنوان چشتی سے ادبی مکالمے کے فن پر ایک موضوعی انٹرویو

ان دنوں ہر آدمی کو بے تحاشا مصروفیت رہتی ہے۔ وہ لوگ تو اور بھی زیادہ مصروف ہیں جو ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ اپنے منصبی اور فنی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی بھی ان ہی معدودے چند فن کاروں میں شامل ہیں۔ جو اپنے ہر کام کو نہایت سلیقے، اہتمام اور ذمے داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ میں گزشتہ پانچ سال سے سائے کی طرح ان کے ساتھ ہوں۔ میں نے اس دوران انھیں ایک لمحے کے لیے بھی خالی نہیں دیکھا۔ وہ خود بھی کاموں میں لگے رہتے ہیں اور اپنے متعلقین متوسلین اور گرد و پیش کے ہر فرد کو اس کی صلاحیت، استعداد اور خصوصیات کو مدنظر رکھ کر کام پر لگائے رہتے ہیں۔ میں نے اس بار کئی بار کوشش کی کہ ان سے بالمشافہ بات چیت کروں اور بعض معاملات اور مسائل پر ان کا ردِ عمل معلوم کروں۔ لیکن میں جس لمحۂ فرصت کی تلاش میں رہا وہ مجھے حاصل نہ ہو سکا۔ آج ۱۹؍فروری ۱۹۹۲ء ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی قصبہ بسولی ضلع بدایوں کے سفر میں ہیں۔ وہاں انھیں جشن امام مہدی کے آل انڈیا مشاعرے کی صدارت کرنی ہے۔ اس لیے میں نے اس موقع کو غنیمت جان کر لمحاتِ سفر کے جگنوؤں کو الفاظ و معانی کی مٹھی میں بند کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ مجھے موصوف کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ بس کے شہری سفر میں فیضانِ شعر کی گرفت میں ہوتے ہیں اور فی البدیہہ اشعار کہے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ریل کے

جناب نعیم الدین رضوی، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

میں یا تو سوتے ہیں یا پھر باتیں کرتے ہیں۔ ان کے مزاج اور معلومات کے پیش نظر میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے ایک بے ضرر سا سوال کر ڈالا۔

س۔ آج کل ادیبوں، شاعروں، فلمی ستاروں، سیاسی شخصیتوں اور دیگر اہم ہستیوں کے انٹرویو شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کیا اہم شخصیتوں کے ذہنوں کو کریدنا اور ان کی ذاتی زندگی کے نہاں خانوں میں جھانکنا ایک مستحسن فعل ہے؟۔

ج:۔ (پروفیسر عنوان چشتی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا) مجھے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ اس دور کی اہم شخصیتوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں۔ انٹرویو لینا، سوالوں کو ایک خاص ترتیب سے مرتب کرنا اور پورے انٹرویو کو ایک خاص انداز سے پیش کرنا ایک فن ہے۔ ہمارے سماج میں فلمی ستاروں اور سیاسی بازی گروں کے انٹرویوز شائع کرنے کی ایک مضبوط روایت ہے لیکن ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کے انٹرویوز مرتب کرنے کی روایت قدرے نئی ہے۔ ابھی تک ہمارے ملاقات نگاروں نے اس فن کی تعریف، قسموں اور حدود وامکانات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی ہے۔

س:۔ آپ کے خیال میں انٹرویو کی تعریف، اقسام اور حدود و امکانات کیا ہیں۔؟

ج:۔ انٹرویو کی مختصراً تعریف یہ ہے کہ یہ دو افراد کے درمیان کسی موضوع پر باضابطہ بات چیت یا بالارادہ گفتگو یا متعین خطوط پر سوال وجواب کی شکل میں تبادلہ خیال ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے اس تعریف میں باقاعدگی، ارادے اور متعین خطوط کی شرط کیوں عائد کی ہے؟ بات یہ ہے کہ انٹرویو کرنے والا یعنی ملاقاتی انٹرویو دینے والی شخصیت یعنی صاحبِ ملاقات کو اندھیرے میں رکھ کر، یا مغالطے میں ڈال کر، یا اس کی رضا و رغبت کے بغیر اس سے سوالات کرنے اور اس کے ذہن وضمیر میں اترنے کا مجاز نہیں۔ اگر ملاقاتی ایسا کرتا ہے تو اس کا یہ فعل غیر اخلاقی ہے۔ وہ صاحب ملاقات کے ذہن وضمیر پر شب خون مارنے کے مترادف ہے۔ اس کو اندھیرے میں رکھ کر رسوا کرنے کے برابر ہے۔ اس لیے ملاقاتی اور صاحب ملاقات میں کسی متعین موضوع پر، متعینہ وقت پر متعینہ انداز میں شعوری طور پر باقاعدہ گفتگو کا نام انٹرویو ہے۔

س:۔ آپ نے انٹرویو کی مختصراً جو تعریف کی ہے اس کی اساس زیادہ تر ادبیات سے زیادہ اخلاقیات پر ہے۔ ازراہ کرم انٹرویو کی ادبی اور فنی تعریف بھی کیجیے اور اگر مناسب ہو تو اس کی قسموں کی مختصراً تفصیل بیان فرمائیں۔

ج:۔ دنیا کے ادب کے جو اعلیٰ حصے ہیں، ان میں کسی نہ کسی طور پر اخلاقی شعور یا روحانی حسیت کی کارفرمائی ہے۔ جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے اس میں بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں مثلاً محبت، ایثار، شرافت، رواداری، سچائی، حسن خیر اور صداقت وغیرہ قدروں کی اہمیت سے دشمن اخلاق انسانوں کو بھی انکار کی جرأت نہیں۔ خیر ان باتوں کو چھوڑیے۔ اب میں آپ کے سوال کی بنیادی شق یعنی انٹرویو کی ادبی اور فنی تعریف کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جس طرح ادب اور فن کے دو پہلو ہیں، اسی طرح انٹرویو کے بھی دو پہلو ہیں۔ خارجی اور داخلی۔ خارجی پہلو میں سوالوں کے تیکھے پن کے علاوہ جوابات کی موزونیت، نادیت اور بصیرت عطا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے علاوہ زبان، اسلوب، تکنیک اور انٹرویو کی پوری ہیئت کی بنت بھی شامل ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ اچھے انٹرویو میں زبان اپنی پوری تازگی اور توانائی کے ساتھ سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس میں حسب ضرورت شوخی، طنز اور دلکشی کے عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اہم معاملات میں ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے جس کو علمی و ادبی زبان کہا جاتا ہے۔ اس لیے میں اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ہر انٹرویو کے سوالات اور ان کا مزاج و منہاج، جوابات یعنی انٹرویو کے غالب حصے کی زبان کے مزاج اور اسلوب کے منہاج کو متعین کرتا ہے۔ اب انٹرویو کے داخلی پہلو پر بھی نظر ڈالیے۔ داخلی پہلو میں معنویت اور اس کی تمام نہیں شامل ہیں۔ اس میں صاحب ملاقات کی شخصیت کا تخلیقی جوہر سمٹ آتا ہے۔ صاحب ملاقات کے جوابات اس کے بین السطور میں صاحب ملاقات کا ذہن و ضمیر جاگتا ہوا محسوس ہوتا ہوا اور ان سے صاحب ملاقات کے ردّ عمل کے نفسیاتی، فنی اور سماجی ردّ عمل کے اسالیب کا پتہ لگ جاتا ہے۔ غرض معنوی یا داخلی پہلو میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جنھیں ہم کسی تحریر کے داخلی پہلو سے مختص کرتے ہیں۔

س:۔ آپ نے انٹرویو کے داخلی اور خارجی پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، انٹرویو کی ادبی اور فنی تعریف کی ہے لیکن اس کی قسموں پر روشنی نہیں ڈالی۔ ازراہ کرم انٹرویو کی قسموں کے بارے میں کچھ اظہار خیال کیجیے۔

ج: نعیم صاحب! انٹرویو کا فن کتابی علم نہیں ہے بلکہ میں اس کو تجربی علم سمجھتا ہوں۔ میں نے اب تک جو انٹرویو پڑھے ہیں اور جو میں نے خود دیے ہیں، ان کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انٹرویو اپنے موضوع، مواد اور مقصد کے نقطۂ نظر سے کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ انٹرویو ہیں، جو غیر معروف شخصیتوں کے سوانحی اشاروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں ملاقاتی صاحب ملاقات سے اس کے/اس کے خاندان، اس کی ذات اور تعلیم و وطن وغیرہ کے بارے میں سوانحی نوعیت کے سوالات کرتا ہے۔ اس کو "سوانحی انٹرویو" کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے ایسے انٹرویو ہیں جن میں ملاقاتی صاحب ملاقات سے کسی ایک موضوع پر علمی انداز سے یا صاحب ملاقات کے ذاتی تجربے کی روشنی میں متعدد سوالات کرتا ہے۔ اس نوع کے انٹرویو کو "یک موضوعی انٹرویو" کہا جا سکتا ہے۔ "یک موضوعی" انٹرویو کو بھی دو ذیلی شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (الف) ایسا انٹرویو جو صاحب ملاقات کے ذہن و ضمیر، شعور و لاشعور، نفسیاتی وجدان کو روشنی میں لاتا ہے جس کو "ذاتی یک موضوعی" انٹرویو قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ب) دوسری ذیلی قسم وہ ہے جس میں ملاقاتی صاحب ملاقات سے خارجی زندگی، معاصرین، عصری رجحانات یا دیگر فنی، علمی اور اکتسابی علوم و فنون کے بارے میں سوالات کرتا ہے اس کو "غیر شخصی یک موضوعی" انٹرویو کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انٹرویوز کو معروضی اور موضوعی سادہ اور پیچیدہ، اکہرا اور متنوع بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ دراصل زندگی کی طرح فن کی بھی لاتعداد جہات اور اس کے اظہار کے ان گنت روپ ہیں۔ انٹرویو کو اس کے موضوع و مواد، ماحول و مقصد اور اظہار و استناد کی بنیاد پر تقسیم کر کے ان کی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔

س:- آپ نے انٹرویو پر جوابات دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ انٹرویو کے اپنے حدود و امکانات ہوتے ہیں۔ انٹرویو کے حدود و امکانات سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ج:- میرا خیال ہے کہ زندگی کی طرح فن کے نامعلوم حدود ہوتے ہیں۔ اور اس کے اچھوتے اور پوشیدہ امکانات بھی ہوتے ہیں۔ یہ حدود اور امکانات ادبی، فنی، نفسیاتی، سماجی تہذیبی اور متعدد طرح کے ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر انٹرویو ایک آزاد، تقریباً مکمل اور خود مکتفی فن پارہ ہے جس کا اپنا رنگ و آہنگ اور طرح و منہاج ہوتا ہے۔ اس کے اپنے مخصوص حدود اور امکانات

ہوتے ہیں۔ ملاقاتی اور انٹرویو کے ناقدین ان پہلوؤں پر کمند ڈال کر ان کے پنہاں اور پیدا جلووں کو اسیر کر سکتے ہیں۔

کاشی وشوناتھ ہاپوڑ کے اسٹیشن پر پہنچ چکی تھی اور پروفیسر عنوان چشتی صاحب اگرچہ ذہنی طور پر بیدار نظر آتے تھے، لیکن ریل کی گھڑ گھڑاہٹ میں ان کے چہرے پر میرے سوال کے جواب دینے اور دگاتار بولنے سے اضمحلال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میں اس راز سے واقف ہوں کہ موصوف کو چائے نوشی کا شوق ہی نہیں بلکہ شوق بے پایاں ہے۔ یوں بھی انھیں چائے پی کر ادبی کام کرنے اور ادبی گفتگو کرنے میں طمانیت قلب اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی چائے موصوف کے تخلیقی موڈ کو سہارا دیتی ہے۔ اس لیے میں نے اسٹیشن کی چائے پیش کی۔ موصوف نے آبخورہ کو مسکراتے ہوئے اس انداز سے قبول کیا جیسے آسمان سے من و سلویٰ اترا ہو۔ بس پھر کیا تھا چائے پیتے رہے اور ادبیات و شعریات پر گل افشانی کرتے رہے۔ میں نے موصوف کا اچھا موڈ دیکھ کر پھر انٹرویو کے فن پر ایک سوال کر دیا۔

س:۔ آپ نے چند لمحے قبل انٹرویو کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انٹرویو ایک فن ہے۔ اگر انٹرویو ایک فن ہے تو ملاقاتی اور صاحب ملاقات دونوں کو فن کار ماننا پڑے گا۔ ایک فنکار کی حیثیت سے ملاقاتی اور صاحب ملاقات میں کن خصوصیتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔

ج:۔ بیشک انٹرویو ایک فن ہے دیکھیے نا آپ بڑی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ میرے ذہن و ضمیر میں دبے پاؤں اس طرح اترتے چلے جا رہے ہیں کہ مجھے بھی اس کا احساس نہیں ہے۔ خیر! ملاقاتی کی خوبیوں اور خصوصیتوں کے سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ملاقاتی میں ایک جزنلسٹ کی طرح صاحب ملاقات کے ذہن میں اتر جانے کی صلاحیت ہونی چاہیے اس میں ایک جونک کی طرح صاحب ملاقات کے افکار و اقدار کا خون پی کر بکھر جانے کی اہلیت ہونی چاہیے اور ایک چابکدست مصور اور شاعر کی طرح سوالات کے جوابات کو صفحات پر خوبصورتی اور فن کاری سے سجانے اور لفظی پیکر تراشنے کی قوت ہونی چاہیے۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ملاقاتی ایک ذہین قاری اور فطین نقاد ہوتا ہے۔ دوسری اہم صلاحیت ملاقاتی کا صاحب ذوق، علم داں اور فنکار ہونا ضروری ہے۔ ملاقاتی جس طرح کی شخصیت سے انٹرویو لینا چاہتا ہے اس کو فن کے تقاضے سے کماحقہٗ واقف ہونا ضروری ہے۔ ایک ادبی آدمی ایک ادبی شخصیت سے، ایک علمی ملاقاتی

فلمی شخصیت سے اور ایک سیاسی انداز کا انسان ایک سیاسی شخصیت سے انٹرویو لے سکتا ہے اور انٹرویو کا فن اور اس کے تقاضوں سے انصاف کر سکتا ہے۔ اس لیے ملاقاتی میں نازک، نادر، نایاب اور تیکھے سوالات کرنے کی اہلیت ہو ورنہ انٹرویو ٹپواری کی کھتونی سے زیادہ روکھا پھیکا گوشوارہ بن سکتا ہے۔

س :۔ آپ نے ملاقاتی کی خصوصیات کا تو ذکر کیا ہے لیکن میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ جس شخصیت سے انٹرویو لیا جائے اس میں کیا خصوصیات ہونا چاہیے۔؟

ج :۔ نعیم صاحب میں اس طرف آنے ہی والا تھا کہ آپ نے درمیان میں قطع کلام کرتے ہوئے اپنے سوال کے ایک جز کو دہرادیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریل کی رفتار کے ساتھ آپ کے ذہن کی رفتار بھی تیز ہوتی جا رہی ہے۔ یہ اچھا ہے مگر میں اپنی تیزی و طراری سے میرے دل کی دھڑکن کو تیز نہ کیجیے۔ (میں خاموش رہا)

(موصوف نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور فرمایا)

ج :۔ بنیادی طور پر یہ سوال ملاقاتی کے معیار اور انٹرویو کے مقصد پر منحصر کرتا ہے اس کا فیصلہ خود ملاقاتی کو کرنا چاہیے کہ وہ کن حالات میں، کس مقصد اور ضرورت کے تحت کس مزاج اور معیار کی شخصیت سے بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ملاقاتی کو ایسی شخصیت کا انتخاب کرنا چاہیے جو اپنے دائرہ علم و فن میں اگر عظیم نہ ہو تو کم از کم ممتاز، منفرد یا اہم تو ضرور ہو۔ مجلجی شخصیتوں سے بات چیت کرنے میں کیا لطف آ سکتا ہے۔ خالی بوتل کو اوندھا کرنے یا خالی مینا کو اچھالنے سے خالی ساغر بھرا نہیں کرتے۔ اس لیے ملاقاتی کو جیتی جاگتی اور فعال و بالیدہ شخصیتوں سے انٹرویو کرنا چاہیے جس سے پڑھنے والے اس کے علم و فن اور تجربے سے استفادہ کر سکیں۔ میں یہاں اس نکتے پر خاص طور پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ملاقاتی کو دیو مالائی انداز کی شخصیتوں کو ہی تلاش نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے سماج، اپنے معاشرے اور اپنے ماحول کی ان چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی ہستیوں کو بھی ٹٹولنا چاہیے جن کے ذہنوں میں اپنے تجربوں کا نور بھرا ہوا ہے اور جو غیر علمی اور غیر ادبی وجوہ کی بنیاد پر سماج میں وہ مقام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ ایسے لوگ، عام طور پر گوشہ نشین، کم آمیز، خلوت پسند اور الگ تھلگ رہتے ہیں اس لیے ملاقاتی کو مردم شناس

بھی ہونا چاہیے اور ان گدڑی میں چھپے ہوئے لعلوں کو تلاش کر لینا چاہیے۔

س :- میں یہ جاننے کا خواہش مند ہوں کہ ادبی پس منظر میں انٹرویو کی کیا اہمیت و ضرورت ہے؟

اور یہ کہ ایک اچھے انٹرویو میں کیا خوبیاں یا خصوصیات ہونی چاہئیں ؛

(میں نے یہ سوال پوچھا ہی تھا کہ ریل کے پہیئے کی زد پر آیا ہوا اڑ کر ایک پتھر کھڑکی سے اندر داخل ہوا اور سلسلۂ کلام کو منقطع کر گیا۔) اس موضوع پر اپنے کچھ اشعار سنائے۔ ایک شعر نذر قارئین کیا جاتا ہے۔

لہو لہو جو مرا سر مجھے دکھائی دیا　　　خود اپنے ہاتھ میں پتھر مجھے دکھائی دیا

انھوں نے ناصر کاظمی کا یہ شعر بھی پڑھا

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں　　　آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

میں نے موصوف کا موڈ دیکھ کر پھر اپنے سوال کو دہرایا کہ

س :- ایک اچھے انٹرویو کی کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔

ج :- بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں جتنے سر ہیں اتنے ہی سودے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بات پرانی ہے۔ اس دور میں انسان مختشر خیال کا مصداق بن چکا ہے۔ ہزاروں خنجروں کی زد پر پڑا ہوا تڑپ رہا ہے۔ اس لیے ایک سر اور ہزار سودے کے مصداق زندگی گزار رہا ہے۔ چونکہ زندگی کی ایک متعین جہت اور رفتار نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں اگر چشم بصیرت حاصل ہو تو ان گنت جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ فن بھی زندگی کا شارح، مفسر اور نقاد ہے۔ اس لیے اس میں بھی زندگی کا سا تنوع ہے۔ چونکہ انٹرویو بھی ایک فنی اظہار ہے، اس لیے اس میں بھی وہ ساری خوبیاں اور خصوصیات ہونی چاہئیں، جو ایک ادبی اور نیم ادبی نثر میں ہوتی ہیں یہاں میں کہنا چاہوں گا کہ اچھے انٹرویو کو صاحب ملاقات کی شخصیت کے ان مخفی گوشوں کو منور کرنا چاہیے۔ جو بہت نازک، نادر اور مبہم ہوتے ہیں۔ اور جو عام طور پر اس شخصیت کے فکر و فن میں پوری طرح بوجوہ ظاہر نہیں ہو پاتے۔ یعنی ایک اچھے انٹرویو میں صاحب ملاقات کے ذہن و ضمیر کا سچا عکس ہونا چاہیے۔ اس کے فکر و فن کا بھرپور اظہار ہونا چاہیے۔ اس کے نفسیاتی کیف و کم کو ظاہر ہونا چاہیے۔ غرض ایک اچھے انٹرویو میں اگر ان کہی، ان سنی، اچھوتی باتیں ہوں تو اس کو کامیاب انٹرویو قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی خصوصیت کو کسی انٹرویو کا جواز کہا جا سکتا ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ادبی انٹرویو کی اہمیت و ضرورت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر واقعی انٹرویو صاحب ملاقات کی باطنی شخصیت کی دستاویز ہے اور اس کی مخفی صلاحیتوں، خوبیوں اور خصوصیات کا منظرنامہ بناتا ہے تو وہ نہ صرف صاحب ملاقات کا بے میل اور سچّا اظہار ہے، بلکہ اس شخصیت پر کام کرنے والوں کے لیے ایک بنیادی دستاویز کا کام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اردو میں ابھی تک انٹرویو کے فن کو ایک غیر ضروری اور غیر معیاری چیز سمجھ کر نظرانداز کیا جاتا رہا۔ کاش ہمارے نئے لکھنے والے انٹرویو کی صحیح اہمیت اور ضرورت کو سمجھ کر اس طرف توجہ کریں۔

ریل تیزی سے مسافت طے کر رہی ہے۔ مرادآباد کے مضافات کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں۔ اس لیے اب میں بھی اپنے قلم کو دوبارہ اسٹیشن پر اترنے کے لیے بقول غالب کان پہ رکھتا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ موصوف نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ آپ کا بھی شکریہ۔

ابوعبید

عربی ادب میں رومانیت

عربی ادب میں رومانیت کب اور کن حالات میں وجود میں آئی۔ اس کے حقیقی اسباب وعلل اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے نیز اپولو تحریک سے اس کا کیا تعلق ہے۔ یہ جاننے کے لیے سب سے پہلے کلاسیکیت سے واقفیت ضروری ہے کیونکہ تحریک رومانیت سے قبل یہی وہ پہلی تحریک تھی جس نے ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کرتے ہوتے قدیم ادب وشعر کو کسی طرح زندہ کر رکھا تھا۔

کلاسیکیت اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے لاطینی لفظ CLassious classis سے ماخوذ ہے جس کے معنی اس وقت پہلا طبقہ یا پہلی صف ہوا کرتا تھا۔ classiques بعد میں آخرالذکر لفظ classiques کا اطلاق روم ویونان کے قدیم مصنفین پر ہونے لگا جو آگے چل کر فرانسیسی اور پھر انگریزی زبان میں قدیم ادب کے لیے استعمال ہوا۔

کلاسیکیت یورپ کے اندر سب سے پہلی ادبی کاوش تھی جو پندرھویں صدی کے نصف میں ترکوں کے ہاتھوں بیزنطہ اور قسطنطنیہ کی تباہی کے بعد قدیم یونانی اور لاطینی زبان وادب اور ثقافت کے احیاء کا سبب بنی۔ اس لیے کہ یہ ادیب، عالم اور فلسفی جو سقوط قسطنطنیہ کے وقت اپنے قدیم ادبی سرمائے اور علماء کے مخطوطات کو لے کر بحفاظت روم ویونان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے، جملہ یورپی حکماء، علماء، فلاسفہ شعراء وادباء کی تصنیفات کو منظر عام پر لاتے نیز ان کے قائم کردہ اصول وضوابط سے پورے یورپ کو متعارف کرایا۔ یہیں سے یورپ میں

جناب ابوعبید ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵۔

ادبی بیداری کی فضا عام ہوئی۔

پندرھویں صدی کے نصف میں یورپ میں پریس کی ایجاد ہوئی۔ قدیم و جدید کتابوں کو منظر عام پر لایا گیا۔ اس طرح سارا یورپ علم کی روشنی سے منور ہو کر ترقی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو گیا۔ یورپی عالموں و ادیبوں کی انھیں ادبی سرگرمیوں کو کلاسیکی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ کلاسیکیت یورپ کے اندر جملہ ادبی تحریکات کے مقابلے سب سے طویل عرصے تک چلنے والی ادبی تحریک ہے۔ محمد غنیمی ہلال اپنی مشہور کتاب "الرومانتیکیہ" میں لکھتے ہیں کہ "کلاسیکیت یورپ کی سب سے طویل عرصہ تک زندہ رہنے والی ادبی کاوش ہے جس کا زمانہ سترھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے ابتدائی کچھ حصے تک پھیلا ہوا ہے جس کی مثال یورپ کے اندر زندہ رہنے والی کسی بھی ادبی کاوش میں نہیں ملتی[1] اور پھر انیسویں صدی کے نصف یعنی ۱۸۵۰ء یا اس سے کچھ قبل کلاسیکی تحریک کی مخالفت میں رومانوی تحریک نے جنم لیا جس نے روشن خیال ادیبوں کی دعوت تجدید کے ہاتھوں کلاسیکیت کی تمام دیواروں کو منہدم کر کے ایک ایسا ادب پیش کیا جو انسان کے ذاتی جذبات و احساسات اور اس کے دل کی دھڑکنوں کا ترجمان تھا۔ اس تحریک نے کلاسیکیت کے اصول و قواعد سے بے پروا ہو کر ایک ایسا نیا نظریۂ فکر پیش کیا جو ظالم حکمرانوں کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا جسے مظلوم عوام نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے ایک اہم ذریعہ سمجھا ایک ایسا ذریعہ جس نے سماجی ناانصافی، عدم مساوات اور نسلی امتیازات کو ختم کرنے کا نعرہ دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس بابرکت کاوش کا سہرا فرانسیسی شعرا مثلاً وکٹر ہیوگو اور الفریڈ دی میوسی کے ہی سر جاتا ہے۔ چونکہ ایک لمبے عرصے سے چلے آرہے ظالم حکمرانوں کے ظلم و تشدد اور پھر نیپولین کی فوجوں کی شکست کے بعد فرانسیسیوں کے دل جس غم و افسردگی اور قنوطیت کا شکار ہو چکے تھے، ان حالات کے پیش نظر ان کا ایک ایسی صنف شاعری کے اندر پناہ لینا جو ان کے کرب و الم کی ترجمان ہو نیز جس سے انھیں سکون قلب میسر ہونا ہو ایک فطری بات تھی۔ چنانچہ جب ہم ان دونوں ادبی تحریکوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں دونوں کے نظریات میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے مثلاً اگر کلاسیکی ادب کا مطالعہ کریں تو اس میں ہر جگہ ہمیں عقل کا عمل دخل ملے گا۔ کیونکہ کلاسیکی ادب و شاعری میں عقل کو ہی مقام حاصل ہے جو رومانی شاعری میں جذبات و احساسات کو اور یہی وجہ ہے کہ کلاسیکیت

کو عقلی ادب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کلاسیکیت کے اندر عاطفہ یا خیال کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، بلکہ اس میں شاعر یا نثر نگار کو ہرگز یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے جذبے کے پیش نظر عقل کو بالائے طاق رکھ دے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا ادب پیش کرے جو عوام میں مقبول ہونے نیز اسے عقل سلیم اور فکر انسانی بھی قبول کرتی ہو۔ مختصراً یہ کہ کلاسیکی ادب میں جذبات وخیالات کے مقابلے عقل کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے۔

مشہور فرانسیسی شاعر بوالو Boiaeau کلاسیکیت کے اصول وقواعد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "تم جذبات کے بجائے ہمیشہ عقل کی آواز پر لبیک کہو" [۵] کیونکہ یہ وہ شے ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں تمھیں ہر طرح لغزشوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے جب کہ عاطفہ یا خیال نفس انسانی کو اس سمت مائل کرتے ہیں جہاں لغزش، خطاء اور خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس کے برعکس رومانیت کے اندر عقل کے بجائے جذبے، ذاتی احساس وشعور اور بالخصوص دل کو جو کہ سرچشمہ وحی والہام ہے اولیت حاصل ہے اس کے ساتھ اسے ایک ایسی بنیاد سمجھا جاتا ہے جس سے محض اس لیے لغزش وخطا کے امکان کا تصور نہیں کہ وہ شعور انسانی کا حقیقی منبع ہے۔

ایک رومانی فرانسیسی شاعر الفرید دی موسیہ بوالو کے نظریہ شعر وادب سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میرے لیے سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ میں دل کو عقل سے دور رکھوں اور اپنے ہم خیال شاعروں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ" ہمیشہ دل کے دروازے کو کھٹ کھٹاؤ یعنی دل کی جانب رجوع کرو کیونکہ قوت تخلیق کا حقیقی سرچشمہ صرف اور صرف دل ہے رہی عقل تو وہ خطا ونسیان کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو کبھی کم نہیں ہوتا۔ یا ایسا زہر ہے جو جذبات کو بھڑکانے کے بجائے اسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔ اے عقل تم محض ایک فتنہ ہو۔ لوگ تمھیں تعجب خیز نظروں سے تو ضرور دیکھتے ہیں مگر پسند کم ہی کرتے ہیں" (حوالہ ۶)

اسی طرح فلسفہ حقیقت اور فلسفہ جمال میں بھی دونوں جماعتوں کے نظریات مختلف ہیں، کلاسیکی ادیبوں کا خیال ہے کہ " لا شیئ اجملی من الحقیقة وھو وحدھا اھل لان نحب ونجب ان تسیطر فی کل شیئ" ان کے نزدیک حقیقت سے برتر کوئی چیز نہیں وہ جمال کو حقیقت کا ایک جز یا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک الگ سے جمال کی کوئی حیثیت نہیں؛ بلکہ حقیقت

یہی دراصل جمال ہے اور حقیقت ہی ایسی شئی ہے جسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا جاسکتا ہے اور اسی کا زندگی کے ہر گوشے میں عمل دخل یا غلبہ ہوتا ہے، Bokeau

اپنے اسی قول کی تائید میں یہ لوگ کہتے ہیں کہ حقیقت (عقل) کو اس لیے اوّلیت حاصل ہونی چاہیے کیونکہ یہی وہ شے ہے جو ہمیشہ انسانی شعور کو حد سے تجاوز کرنے سے روکتی ہے، نیز اس میں من گھڑت اور غیر معقول مقاصد کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی Boileau کلاسیکی ادیبوں کے اس قول کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "دنیا میں حقیقت (عقل) سے افضل کوئی چیز نہیں۔ محض وہی ایک ایسی شے ہے جسے ہمیشہ پسند کیا جاسکتا ہے۔ وہ جملہ فنون خواہ شاعری ہو، نثر نگاری ہو، یا خطابت ہو، ہر جگہ حقیقت کو ہی برتری، یا سیادت حاصل ہونی چاہیے"[۴]

اس کے برعکس رومانی شعراء کے نزدیک حقیقت اور جمال دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ الفریڈ دی موسیے اس قول کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے "لا حقیقتہ سوی الجمال ولا جمال بدون الحقیقتہ"[۵]۔ اس کے نزدیک دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔

گزشتہ صفحات میں کلاسیکی تحریک کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اور رومانوی شعراء کے افکار و نظریات کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئندہ ہم رومانی تحریک کی تاریخ اور اس کے اسباب و علل پر بحث کریں گے۔ Romanticism یعنی رومانیت کے اشتقاق کے بارے میں ادیبوں کے اقوال درج ذیل ہیں۔

غنیمی ھلال اپنی کتاب "الرومانتیکیتہ" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ Romanticism درحقیقت لفظ Roman سے مشتق ہے جو کہ ایک قدیم فرانسیسی لفظ ہے جس کے معنی اس وقت طویل خیالی قصّے ہوا کرتے تھے، خواہ وہ قصّے منظوم ہوں یا نثر میں۔ اس کے بعد یہ لفظ Romant لکھا جانے لگا جسے بعد میں انگریزی زبان میں Romount یعنی خیال کے غرق ہوجانے کے مفہوم میں لکھا گیا اور پھر یہ Romanious یعنی ذاتی رنج و غم اور تاثرات و احساسات و جذبات میں غرق ہوجانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا آج تک اسی معنی میں مستعمل ہے۔[۶]

ڈاکٹر محمد مندور اپنی کتاب "الادب ومذاہبہ" میں صفحہ ۵۹ پر لکھتے ہیں کہ یہ لفظ درحقیقت Romanticism سے ماخوذ ہے جس کا اطلاق اس وقت اس زبان وادب پر ہوتا تھا جو دراصل قدیم لاطینی زبان سے متعلق تھا۔[۵]

عبداللطیف شرارہ اپنی کتاب "معارک ادبیہ قدیمہ ومعاصرہ" صفحہ ۹۴ پر اسے "اسپانوی الاصل لفظ بتاتے ہیں" اور وہ کہتے ہیں کہ اپنے بہت سے معانی میں استعمال ہوتا ہوا یہ لفظ ۱۷۸۰ء میں "القصص العاطفیۃ" یعنی لمبے اور جذباتی قصوں کے لیے استعمال ہونے لگا"۔[۶]

بہرحال ان جملہ اقوال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ اپنے ابتدائی زمانہ ۱۷۸۰ء یا اس کے قریب، جذباتی اور لمبے قصوں کے لیے مستعمل ہو چکا تھا۔ البتہ ادبیات کے سلسلے میں سب سے پہلے ۱۷۸۱ء میں وارٹن اور ہرڈ نے اس لفظ کو استعمال کیا اور پھر اس کے بعد گوئٹے اور شلنر نے ۱۸۰۲ء میں اسے ادبیات کے سلسلے میں اس کا اطلاق کرنا شروع کیا۔ لیکن شلیگل اور مادام دی اسٹائیل نے اسے ایک اصطلاح کی شکل میں رائج کیا اور اس طرح یہ لفظ جو پہلے صرف کسی زبان کے نام کے طور پر استعمال ہوا کرتا تھا آگے چل کر زبان کے مخصوص ادبیات اور داستانوں کا لقب بنا پھر ادب میں ماورائیت، آراستگی اور عہد وسطیٰ کی قدروں کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ یہ لفظ ادب کے ایک مخصوص مزاج کا مظہر بن گیا۔

چونکہ مادام دی اسٹائیل ایک فرانسیسی ادیبہ تھیں اس لیے یہ بات ماننے میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ لفظ اپنے آخری اور اصطلاحی معنی میں سب سے پہلے فرانس ہی میں مستعمل ہوا۔

رومانی تحریک کے بالکل حقیقی اور ابتدائی دور کا پتہ لگانا یا تاریخ کے کسی ایسے نقطے کو پا لینا جہاں سے رومانی دور کا آغاز ہوتا ہے ایک مشکل کام ہے۔ کیونکہ رومانیت انسان کے ذاتی جذبات واحساسات کے مترادف ہے اور اگر ہمیں انسانی جذبات کی حقیقت جاننی ہے تو سب سے پہلے فکر انسانی کی تاریخ کے مشہور فلسفی یا موجد فلسفہ افلاطون تک جانا ہوگا جو یہاں پہ خارج از بحث ہے۔

ہمارے لیے محض اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ یہ تحریک اپنی مکمل شکل میں انقلاب فرانس

[redacted]

کے بعد ہی وجود میں آئی یا اسے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ انقلاب فرانس ہی بنا۔ کیونکہ اگر ہم انقلاب فرانس اور اس کے اردگرد کے زمانے کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ تحریک اسی دور کی ایجاد ہے۔

فرانس میں اس وقت امراء کی مزدور طبقہ پر زیادتی اور حق تلفی، انھیں جانوروں سے کمتر سمجھنا اور ان سے بدتر ان کا برتاؤ، مزدوروں اور کسانوں پر نت نئے ٹیکس اور جدید عائد کرنا، نیز امراء اور پادری طبقے کا ملک کے خزانے کا بیجا تصرف، اور اس کا خمیازہ غریب مزدوروں اور کسانوں کو بھگتنا، یہی وہ حالات تھے جن سے فرانس اس وقت گزر رہا تھا اور جس میں عام فرانسیسی باشندے کا دم گھٹنے لگا تھا فرانس اس وقت اپنے باشندوں کے اعتبار سے تین طبقوں میں منقسم تھا۔ پہلا پادری طبقہ، دوسرا حکمراں طبقہ اور تیسرا طبقہ کسانوں اور مزدوروں پر مشتمل تھا جن میں درمیانی لوگ بھی شامل تھے۔

پادری یعنی مذہبی پیشوا جس کا تعلق ملک کے سب سے اعلیٰ طبقے سے تھا اسے حکومت کے ہر عمل میں بیجا دخل حاصل تھا۔ یہ اور دوسرے طبقے کے لوگ یعنی امراء، رؤساء اور جاگیردار یہ دونوں مل کر ملک کی آبادی کے لحاظ سے صرف پانچ فیصد تھے لیکن وہ ملک کی تقریباً پینتالیس فی صد سے عمدہ کاشت کاری کی زمینوں پر قابض تھے۔ چونکہ ملک کا جملہ نظم و نسق بھی انھیں دونوں طبقوں کے ہاتھ میں تھا اس لیے یہ لوگ ملک کی دولت اور اس کے خزانے کو بلا روک ٹوک جس طرح چاہتے صرف کر سکتے تھے۔

مزدوروں کے کام کے لیے وقت کا کوئی تعین نہیں تھا۔ یہ اس کے مالک پر منحصر تھا کہ وہ ان سے مستقل کتنی دیر تک کام لے سکتا ہے۔ مزدوری بھی مالک کی مرضی پر ہی منحصر ہوا کرتی تھی کہ وہ انھیں کتنی اجرت دے یا پھر دے بھی یا نہیں، یہ حق بھی اسے حاصل تھا۔ مزدور کو قطعاً اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنے بچوں کی بھوک یا فاقہ کشی کا ذکر کرے کیونکہ وہ ان کا غلام تھا اور اس کا خون بھی ان کے لیے حلال تھا۔

کسانوں کے پاس زیادہ تر ایسی زمینیں تھیں جن کا بیشتر حصہ بنجر تھا جس سے وہ اپنی سال بھر کی خوراک بھی نہیں پیدا کر پاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو مختلف قسموں کے ٹیکس اور تاوان بھی ادا کرنے پڑتے تھے جو اس کی حیثیت سے کئی گنا زیادہ تھے غرض یہ کہ وہاں کے کسانوں

کا حال بھی مزدوروں سے بہتر نہ تھا۔ رہے درمیانہ طبقے کے پڑھے لکھے لوگ جو شہروں میں رہائش اختیار کیے ہوئے تھے یہ بھی مرتبے کے لحاظ سے تیسرے طبقے یعنی مزدوروں اور کسانوں کے برابر سمجھے جاتے تھے اور حکومت کا برتاؤ ان کے ساتھ بھی اتنا گھناؤنا تھا جتنا کہ مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ۔

یہ وہ حالات تھے جن سے فرانس کا بچہ بچہ حکومت اور ان کے حامیوں کا باغی ہو گیا جس کے نتیجے میں فرانس کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔

فرانس میں انقلاب آیا۔ شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا۔ بادشاہ وقت کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نیپولین بونا پارٹ فوج کی مدد سے حاکم وقت مقرر ہوا لیکن اس اتھل پتھل کے باوجود عوام کو خوشحالی میسر نہیں ہوئی کیوں کہ نیپولین عوام کی فلاح وبہبود اور معاشی واقتصادی خوشحالی کی طرف توجہ کرنے کے بجائے فوجی طاقت کو بڑھانے میں سارا سرمایہ خرچ کرنے لگا اور پھر تمام پڑوسی ممالک سے برسرپیکار ہو گیا جس کے نتیجے میں فرانس کی طاقت کمزور ہوتی گئی اور اسے شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا ایک ایسی شکست فاش جو اپنے ساتھ حزن وملال، افسردگی، مایوسی اور ناامیدی کی اندھیری رات لائی۔

یہاں مناسب ہوگا کہ ہم ان حالات کا جائزہ لیں جن کے تحت انقلاب فرانس رونما ہوا جو اس طرز تحریر اور جدید تحریک کا سبب بنا۔ یہ وہ دور تھا جس میں ہر طرف ظلم وتشدد کا دور دورہ تھا ایسے حالات میں کھل کر حکومت کی مخالفت کرنا اپنی جان کا ضیاع تھا لہٰذا وہاں کے شاعروں کے قدیم طرز اور اسلوب جو کہ خاص طور سے حکمراں طبقے سے متعلق تھا کی مخالفت میں ایک نئے نظریے کو بڑھاوا دینا شروع کیا ایک ایسا نظریہ، ایک ایسی فکر جس میں سماجی برابری، عدم تشدد، عدل وانصاف کا پہلو غالب تھا۔ امراء وسلاطین کی شان میں قصیدے کہنے کے بجائے انھیں اپنے ذاتی رنج وغم میں ڈوبے رہنے میں سکون ملتا تھا۔ یہی وہ سارے عوامل تھے جن کے نتیجے میں انقلاب فرانس رونما ہوا جو اپنے پیچھے ایک جدید ادبی تحریک یعنی تحریک رومانیت لایا جس سے پوری دنیا کے آداب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تحریک رومانیت کو عالمی یا آفاقی شہرت دلانے میں یا اسے ایک مکمل فن کی شکل میں دنیا کے سامنے

[redacted]

پیش کرنے میں دو زبانیں یا دو ادب پیش پیش رہے ہیں۔ ۱۔ فرانسیسی ادب ۲۔ انگریزی ادب۔
فرانسیسی ادب میں رومانی تحریک کا بانی یا جدِ امجد روسو (۱۷۱۲ - ۱۷۷۸ء) کو مانا جاتا ہے،
جس کے اس قول کو رومانیت کا مطلع کہا جاتا ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر جدھر دیکھو
پابہ زنجیر ہے۔ حالات و زمانے کی اس پر اس قدر قیود و بندشیں عائد ہیں کہ اس کے ذہن سے آزادی
کا تصور بھی جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

روسو کے اس جملہ پر غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ عظیم مفکر اس وقت ملک کے حالات اور وہاں کے اکابرین کے رویّے سے کس قدر متنفر اور مایوس تھا، اس نے انسان کی آزادی کا دعویٰ کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا اور کہا کہ انسان کائنات کے اصولوں، ضابطوں کے لیے نہیں بلکہ کائنات خود اس کے لیے ہے۔

روسو کے ان جدید رجحانات کی تائید اور اتباع بعد کے ادیبوں نے کرنی شروع کی اور آہستہ آہستہ اصول و ضوابط کے پیمانے سانچوں سے سرتابی کی ایک نئی روایت پیدا ہو گئی۔ روسو کے بعد فرانس کے اندر رومانوی تحریک کو مکمل اصطلاحی شکل میں لانے کا سہرا مادام دی اسٹائیل کے سر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شاتوبریاں (۱۷۶۸ - ۱۸۴۸ء) وغیرہ کے نام بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے کلاسیکیت کی مخالفت میں رومانویت کو بڑھاوا دینے میں بھرپور حصّہ لیا۔ یہ وہ فرانسیسی ادیب و شاعر ہیں جن کا نظریۂ شعر و ادب فرانس ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ دوسری زبان و ادب پر اثر انداز ہوتا ہوا عرب ادیبوں کے ذہنوں کو بھی متاثر کیا مثلاً تحریکِ اپولو کے دوسرے صدر خلیل مطران نے جب فرانسیسی ادب کا مطالعہ کیا تو ان جدید افکار و خیالات سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اسے عربی ادب میں بھی عام کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

انگریزی ادب میں اس تحریکِ تجدد کے روحِ رواں ورڈس ورتھ (۱۷۷۰ - ۱۸۵۰ء)، کولرج (۱۷۷۲ - ۱۸۳۴ء)، بائیرن (۱۷۸۸ - ۱۸۲۴ء) اور خاص طور سے شیلی (۱۷۹۲ - ۱۸۲۲ء)، کیٹس (۱۷۹۵ - ۱۸۲۱ء) کو مانا جاتا ہے۔ ان شعراء نے انگریزی ادب میں کلاسیکی ادب کی بھرپور مخالفت کرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے مناظر میں کھو جانے اور انفرادیت کے نغمے الاپنے کی دعوت دی۔ ان کا خیال ہے شاعری انسان کے ذاتی جذبات و احساسات اور الہامی کیفیت کا نام ہے جس سے عقل کا دور

دور تک کوئی واسطہ نہیں۔ ان شعراء نے حقیقت سے راہ فرار اختیار کی اور خود کو غموں میں غرق کر لیا۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو سب سے نمایاں طور پر جو چیز نظر آتی ہے، وہ حقیقت سے فرار، غم و افسردگی میں غرق ہونا، انفرادیت اور قنوطیت ہے۔ ان رومانی شعراء کی پیروی کرنے والے عرب شعراء میں جبران، عقاد، شکری، مازنی، میخائیل نعیمہ، ابوشادی اور الشابی کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے عالم عرب اور اس کے باہر عربی ادب کو اس جدید تحریک سے متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ اس کے ذریعہ عربی ادب میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

مندرجہ بالا شعراء کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو سب کے یہاں ہمیں ایک ہی فکر ملے گی اور وہ یہ کہ ادب و شاعری کا تعلق انسانی جذبات و احساسات سے ہے نہ کہ عقل سے۔ ان کے نزدیک شعر بلبل ہزار داستان کا ایک میٹھا نغمہ ہے، یا وہ کسی آبشار یا جھرنے کی مدھر موسیقی ہے یا نسیم سحر کی مترنم سرسراہٹ ہے جو کہ عقل و اصول و قواعد سے ماوراء ہے۔ یہ ایک الہامی کیفیت ہے نہ کہ عقل و اصول کے قواعد کے دائرہ میں بالقصد ذہنی اختراع ہے۔ ایک رومانوی شاعر کے نزدیک حقیقت تک رسائی محض احساسات و جذبات ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ان کے نزدیک عقل محض چیزوں کی ظاہری شکل و صورت اور ترتیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن ان کی ماہیت یا حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتی۔ ان کے نزدیک عقل، چراغ راہ گذر سے زیادہ نہیں البتہ جذبات و وجدان ہی وہ روشنی پیدا کرتے ہیں جو کائنات کو نئے اُجالوں سے روشناس کراتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رومانویت نے کلاسیکیت کے اصول و قواعد کے توازن اور میانہ روی کے برعکس انتہا پسندی اور جذبات کی فراوانی پر زور ہی نہیں دیا بلکہ جملہ سماجی قیود و بندشوں کو روند ڈالنے کا تصور و نظریہ پیش کیا۔ اس نے آزادی کا نام لیا، تو مروجہ اصول کو توڑ کر نئے اصولوں کی تعمیر سے زیادہ فطرت کی طرف واپسی اور جذبے کی بے لاگ پرستش پر زور دیا، انقلاب کا نام لیا، تو انسانیت کی تمام مذہبی اور اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت ضروری سمجھی چونکہ اس نے قدیم اصولوں کو روند کر جذبات کو اس کی انتہائی شکل میں پسند کیا اس لیے ذاتیت یا فردیت کو اہمیت دی۔ لہٰذا رومانوی شعراء کے کلام میں ذاتی تغزل اور انفرادیت کی افراط ہے۔

رومانوی ادیب اور شاعر نے دُکھ درد اسی اور کرب کو سینے سے لگا کر اسے اپنی شخصیت کا جوہر

بنا لیا سان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، ایک ایسا درد جو اس کے لیے باعث تکلیف ہونے کے بجائے سامانِ راحت ہے۔ ایک ایسی اداسی جو اسے حقیقت کی دنیا سے دور تصورات کی دنیا کی سیر کراتی ہے جہاں وہ ہوتا ہے اس کے جذبات ہوتے ہیں اور کوئی نہیں، وہ تہذیب کے شکنجوں سے تنگ آکر فطرت کی رعنائیوں میں مست ہو کر اس کی پرستش کے ساتھ ساتھ سادگی اور معصومیت کے نغمے گنگنانے لگتا ہے۔

جدید کلاسیکی دور

یہاں جدید عربی شاعری میں تحریک تجدد یا رومانیت کے ذکر سے پہلے ماقبل رومانیت یعنی جدید کلاسیکی دور کا اجمالی خاکہ پیش کرنا ضروری ہے۔

جدید کلاسیکی دور انیسویں صدی کے نصف ثانی سے شروع ہو کر رومانی دور کی ابتداء تک پھیلا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک عربی شاعری خالص تقلیدی یا روایتی تھی مثلاً اگر آپ قایانی، جارم اور کاظمی وغیرہ کے کلام کا مطالعہ کریں تو صاف نظر آئے گا کہ یہ لوگ پنے قدیم سرمایہ شاعری سے چمٹے ہوئے نئے زمانے کے نئے اسلوب کو قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی شاعری محض تقلیدی یا کلاسیکی شاعری ہی کہی جائے گی۔ البتہ انیسویں صدی کے آخری حصہ میں جاکر آہستہ آہستہ روایتی شاعری سے شعراء گریز کرنے لگے اور پھر ان کے کلام میں جدید عنصر نظر آنے لگا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے شروع میں عربی شاعری مکمل طور پر جدید کلاسیکی شاعری کے روپ میں ابھر کر ہماری سامنے آتی ہے اس تبدیلی کے پیچھے بیک وقت کئی اسباب وعلل کارفرما نظر آتے ہیں جس میں قوی اور بڑا سبب شعور کی بیداری تھی جو پے درپے ترکوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کے دبانے کے باوجود اب نئے جوش و ولولہ کے ساتھ ابھر رہی تھی اس لیے کہ اول تو طباعت کے جدید انتظامات کی وجہ سے قدیم عربی کتب و دواوین کا مطالعہ بڑھا دوسرے اخبارات و رسائل کی کثرت سے جدید مغربی ادب و شاعری کے ترجمے ان کے افکار و نظریات سے واقفیت نے ذوق سلیم کو نکھارنے میں اہم رول ادا کیا۔ اس طرح قدیم عربی اور جدید مغربی عناصر نے مل کر عربی ادب کے مذاق میں تبدیلی پیدا کر کے اس کے معیار کو بلند کیا۔

چونکہ مصری قوم ایک طویل عرصہ سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی چلی آرہی تھی اس لیے ہر خاص و عام کے دل میں وطن پرستی کے جذبات موجزن تھے۔ لیکن اسے ابھارنے والوں کی ضرورت تھی لہٰذا ان شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے اندر ابلتے ہوئے آتش فشاں کو پھٹ پڑنے پر آمادہ کر کے انھیں غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزادی حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ان جدید کلاسیکی شعراء میں بارودی، شوقی، صبری، حافظ، اسمٰعیل، وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ تقلید ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے لیکن ان کی تقلید جامد نہیں۔ یہ لوگ متقلد ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہیں اور یورپی ادب کے عمدہ عناصر کا عربی شاعری کے قدیم عناصر سے امتزاج چاہتے ہیں ان کے یہاں ایک طرح کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ لوگ جدید مغربی ادبیات اور ان کے افکار و خیالات سے واقف ہیں اس لیے ان کے جدید مضامین و موضوعات سے عربی شاعری کو ایک نئی [illegible] دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی قدیم شاعری کے طرز ادا اور اندازِ بیان کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس طبقے نے ماضی سے نہ صرف یہ کہ اپنا رشتہ قائم کیا بلکہ اسے مزید تقویت پہنچائی۔ چنانچہ بارودی اور صبری نے زندگی کے مسائل پر توجہ دی حافظ نے قدیم اصناف شاعری کو قائم رکھا۔ مگر اس میں وطن پرستی، اور قوم پرستی، سماجی مسائل، اور معاشرتی پہلو بھی داخل کیے۔ شوقی نے قدیم مصری تہذیب کو اپنی شاعری میں زندہ کرنے کے ساتھ ساتھ عربی شاعری میں ڈرامہ نگاری کا بھی رواج ڈالا۔

یہی عربی شاعری کا جدید دور کہا جاتا ہے۔ یہیں سے ایک مدت کے بعد عربی شاعری نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں یہاں تک کہ جدید کلاسیکی دور کے بعد جدیدیت یعنی رومانیت اور اس جیسی دیگر تحریکوں کا دور شروع ہوتا ہے جہاں سے عربی شاعری یورپ کی شاعری سے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگتی ہے۔

[redacted]

سہیل احمد فاروقی

احوال وکوائف

انٹر یونیورسٹی قومی تقریری مقابلہ
ڈاکٹر امبیڈکر صدی تقریبات کے موقع پر

ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی زندگی ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جس نے اچھوتوں کے خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اعلیٰ عہدے اور نمایاں مقام حاصل کیے۔ وہ مادر وطن کے ان سپوتوں میں سے ہیں جنھوں نے ملک کی آزادی کے بعد پوری ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ انہی ڈاکٹر امبیڈکر کی یاد میں ۱۴ مارچ ۹۲ء کو وزارت بہبود، حکومت ہند اور ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز کے تعاون سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر صدی تقریبات کی مناسبت سے انٹر یونیورسٹی قومی تقریری مقابلہ محترم شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین صاحب کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ ان مقابلوں میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے ان بیس طلباء وطالبات نے شرکت کی جو ڈاکٹر امبیڈکر خدمات کے مختلف پہلوؤں کے موضوع پر اس سے قبل منعقد زونل یعنی علاقائی سطح کے مقابلوں میں آخری حلقے کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ساؤتھ زون

ایم۔ جی۔ پوجیتھا، نیشنل لا اسکول بنگلور یونیورسٹی

آرودیا، اونیاشن لنگم انسٹی ٹیوٹ آف ہوم سائنس اینڈ ہائر ایجوکیشن فار ویمن کوئمبٹور

ڈی۔ سری لواسن، بھارتی داسن یونیورسٹی آر۔ ای سی تریچی۔

تھومس کوشی، کالی کٹ یونیورسٹی

نندن نیلی وگی، نیشنل لا اسکول آف انڈیا بنگلور یونیورسٹی

ساؤتھ زون

ثمینہ عبدالماجد، شواجی یونیورسٹی کولاپور۔

سریتا گپتا، جودھپور یونیورسٹی۔

وردشالی پندھارکر، دیوی اہلیہ وشو ودیالیہ اندور۔

سندیپ سنگھ چوہان، جیواجی یونیورسٹی گوالیار۔

ہمال پانڈیا، سوراشٹر یونیورسٹی گجرات۔

ویسٹ زون

ششکتی کمار پاٹھک، کروکشیتر یونیورسٹی

الکا بہل، پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی لدھیانہ

کماری انوپم سنگھ، پنجاب اگریکلچر یونیورسٹی

کے ایم وویشا کوشل، گرونانک دیو یونیورسٹی امرتسر

سنجیو کمار، روھیلکھنڈ یونیورسٹی، بریلی

نارتھ زون

امر پرکاش ساونت، روی شنکر یونیورسٹی رائے پور

نوین کمار چودھری، انڈین اسکول آف سائنس دھنباد

آنند کمار، انڈین اسکول آف سائنس دھنباد

منوج کمار، رانچی یونیورسٹی، ہزاری باغ

اندو کماری، رانچی یونیورسٹی

جامعہ میں ہونے والے مقابلے کے لیے تین عنوانات دیے گئے تھے:

(۱) ڈاکٹر امبیڈکر اور سماجی تبدیلی کا منصوبہ

(۲) ڈاکٹر امبیڈکر اور دستور ہند

(۳) ڈاکٹر امبیڈکر اور عوامی تعلیم

جلسہ کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا اور پھر جامعہ کا ترانہ پیش کیا گیا۔ ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیر

[redacted]

پروفیسر حسین لیبین صدیقی صاحب نے شرکاء مقابلہ، اور مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس تقریری مقابلہ کی غرض و غایت اور جامعہ میں اس کے انعقاد کے اسباب پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر امبیڈکر کی سماجی خدمات کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد جناب ڈوڈ... ن کلچرل سکریٹری ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز نے مقابلہ کے قوانین وضوابط پڑھ کر سنائے۔ مقررین نے جنھیں ہندی یا انگریزی میں بولنے کی آزادی تھی دستور ہند کی تشکیل میں اور تعلیم کے میدان میں ڈاکٹر امبیڈکر کی بیش بہا خدمات کے پہلوؤں پر اظہار خیال کیا انھوں نے کہا کہ مظلوم طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے بابا صاحب امبیڈکر کی بے لوث جدوجہد کو زمانہ فراموش نہ کر سکے گا۔

ڈاکٹر پی سی پاتا نجلی، پرنسپل ڈاکٹر بی۔ آر امبیڈکر کالج، گیتا کالونی، نئی دہلی۔ ڈاکٹر ایچ۔ ایس بخشی پرنسپل ایکزیکیٹیو آفیسر، حیلپیج انڈیا اور ڈاکٹر ایم۔ اے علوی (سابق پروفیسر شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، نے جج کے فرائض انجام دیے۔ انعامات کے اعلان سے قبل پروفیسر مشیر الحسن نائب شیخ الجامعہ نے نوآبادیاتی عہد کے پس منظر میں اور قومی جدوجہد کے حوالے سے بابا صاحب امبیڈکر کی خدمات کا جائزہ لیا اور بعض بہت اہم گوشوں کی طرف اشارہ کیا جن پر ان کے خیال میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

مندرجہ ذیل شرکاء انعامات کے مستحق قرار پائے۔

۱۔ نوین کمار چودھری، انڈین اسکول آف سائنس دھنباد، پہلا انعام

۲۔ امریہ کاش ساونت، روی شنکر یونیورسٹی رائے پور، دوسرا انعام

۳۔ شکتی کمار پاٹھک، کروکشیتر یونیورسٹی، تیسرا انعام

۴۔ ثمینہ عبدالماجد شواجی یونیورسٹی، کولاپور تشجیعی انعام

۵۔ سریتا گپتا، جودھ پور یونیورسٹی، تشجیعی انعام

فائنل راؤنڈ میں کامیاب مقررین کو صدر جلسہ شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے شیلڈ اور میڈل تقسیم کیے۔ اس کے علاوہ آرگنائزنگ کمیٹی کے ارکان کو بھی ان کی نمایاں کارکردگی پر یادگاری تمغے دیے گئے۔ اس کے بعد صدارتی کلمات میں شیخ الجامعہ صاحب نے بابا صاحب ڈاکٹر

بی آر امبیڈکر کی نا قابل فراموش خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس طرح کے تقریری مقابلوں کے انعقاد کی علمی افادیت پر اظہار خیال فرمایا۔ موصوف نے اس بات کو بہت پسند فرمایا کہ بعض غیر ہندی داں ریاستوں سے آنے والے شرکاء نے بھی اپنی تقاریر سمجھے ہوئے اور شستہ انداز میں کیں جو ہماری قومی یکجہتی کے لیے فال نیک ہے۔ آرگنائزنگ سکریٹری ڈاکٹر سید جمال الدین نے آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبران، انصاری آڈیٹوریم اور ماس کمیونیکیشن ریسرچ سنٹر اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ مقابلہ میں آئے طلباء و طالبات جامعہ میں گزارے ہوئے چند دنوں کی خوشگوار یادیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ قومی ترانہ کے ساتھ یہ تقریب اختتام پذیر ہوئی اور حاضرین جلسہ نے شیخ الجامعہ کے ساتھ افطار میں شرکت کی۔ یہ روداد نامکمل رہے گی اگر ہم ایسوسی ایشن آف انڈین یونیورسٹیز کے کلچرل سکریٹری جناب ڈیوڈ سمسن کے تعاون کا اعتراف نہ کریں جن کی تحریک پر جامعہ میں اس تقریری مقابلہ کا انعقاد ممکن ہو سکا اور جنھوں نے مقابلہ سے متعلق انتظامی امور کو سرانجام دینے میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے ہماری ہر ممکن مدد کی۔

ایک نشست تاباں صاحب کے ساتھ

مشہور شاعر و ادیب جناب غلام ربانی تاباں جن کی جامعہ سے دیرینہ وابستگی رہی ہے اُن کے اعزاز میں ۲ مارچ ۱۹۹۲ء بروز جمعرات شعبہ اردو کی بزم جامعہ کے زیر اہتمام ایک جلسہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی صاحب ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے فرمائی۔ اس نشست میں پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے جناب غلام ربانی تاباں کی ادبی شعری اور سماجی خدمات پر روشنی ڈالی۔ حاضرین کے اصرار پر کہ وہ اپنے بارے میں کچھ فرمائیں تاباں صاحب نے طولانی گفتار سے احتراز کرتے ہوئے اس کو ترجیح دی کہ لوگ اگر ان سے بعض سوالات کرنا چاہیں تو وہ بخوشی ان کے جواب دیں گے۔ محترمہ قرۃ العین حیدر کے اس سوال پر کہ سابق سوویت یونین جہاں ادب کی تخلیق سوشلسٹ نظریہ کے تحت ہوتی رہی ہے موجودہ صورتِ حال میں کیا رخ اختیار کرے گی' تاباں صاحب نے فرمایا کہ نظریہ ایک چیز ہے اور ادب و شعر اس سے مختلف دوسری شے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ نظریہ پر اعتقاد کمزور پڑ جانے کی صورت میں ادبی و تخلیقی سرچشمے خشک ہو جائیں۔

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن صاحب ہاشمی کا یہ سوال تھا کہ چونکہ روس میں گزشتہ ستر سال سے کمیونزم پر مبنی حکومت قائم تھی اور مغربی جمہوریت کا تصور ذہنوں میں نہیں ہے تو کیا آپ کا خیال ہے کہ جمہوریت کا نیا پودا وہاں پنپ جائے گا یعنی کیا روس دوبارہ کمیونزم کی طرف پلٹ جائے گا یا مغربی جمہوریت وہاں کامیاب ہو جائے گی جس کا روسیوں کو کوئی شعور نہیں ہے اس کے جواب میں تاباں صاحب نے بس اتنا کہا کہ اس کا اندازہ آنے والا وقت ہی کرا سکے گا۔

سردار جعفری کے حوالے سے اقبال اور سوشلزم کے موضوع پر ڈاکٹر ہاشمی کے ہی سوال پر کہ کیا اقبال نے سوشلزم کو لبیک کہا تھا حالانکہ اقبال کی فکر اسلامی ہے۔ تاباں صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبال کا سوشلزم سے کوئی سروکار نہیں، اقبال صرف مذہبی شاعر تھے۔ انھیں سوشلزم سے وابستہ کرنا ایک گمراہ کوشش ہے۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی کے اس سوال پر کہ روس میں حالیہ تبدیلی کے ہندوستان پر کیا سماجی، سیاسی و ادبی اثرات مرتب ہوں گے۔ تاباں صاحب نے کہا اس تبدیلی کا کوئی خاص اثر ہندوستان پر نہیں پڑے گا کیونکہ وہاں پر نظریہ کا زوال نہیں بلکہ ایک ایسے طبقہ کا زوال ہوا ہے جو اس نظریہ کو صحیح طور پر نافذ نہ کر سکا۔ صادقہ صاحبہ نے ایک اور سوال تاباں صاحب کے ذاتی عقیدہ اور مسلک سے متعلق بھی کیا جس کا جواب تاباں صاحب نے ان الفاظ میں دیا کہ میں مذہبی آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی آئندہ رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں تاہم دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام میں کرتا ہوں۔

تعزیتی جلسہ برائے معصوم رضا راہی

۷ مارچ ۱۹۹۲ء کو شعبۂ اردو میں ڈاکٹر معصوم رضا راہی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے اور نظامت پروفیسر حنیف کیفی صدر شعبہ اردو نے کی۔ ابتداءً پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے مرحوم راہی صاحب کے حالات زندگی کا علی گڑھ سے بمبئی تک پھیلی ہوئی علمی اور فنی کاوشوں پر مبنی ایک تعارف پیش کیا اور بتایا کہ راہی صاحب جہاں کہیں بھی رہے استحصال، ظلم و زیادتی اور سماجی مسائل کے خلاف سینہ سپر رہے۔ سابق نائب شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب حسنین رضوی صاحب نے ڈاکٹر راہی کی

انفرادی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ روایت شکنی راہی کا شعار تھا۔ رضوی صاحب نے ان کے ناول آدھا گاؤں، پاس چنگیزی پر تحقیقی مقالہ اور طلسم ہوشربا میں ہندوستانی عناصر کو ان کی یادگار تصنیف قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ کسی دوسرے وسیلۂ اظہار کے ذریعہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا خاصا مشکل کام ہے جسے راہی صاحب نے ناول آدھا گاؤں ہندی میں لکھ کر انجام دیا اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصے تک یہ خیال پہنچانے کی کوشش کی کہ تقسیم ملک کے المیہ سے جتنا یہاں کا مسلم معاشرہ متاثر ہوا اتنا کوئی طبقہ نہیں ہوا۔

صدر جلسہ پروفیسر چشتی صاحب نے فرمایا کہ ڈاکٹر معصوم رضا راہی قابل ذکر صلاحیتوں کے مالک تھے اور ان کی ادبی خدمات لائق تحسین ہیں۔ موصوف نے مزید کہا کہ راہی صاحب مرحوم کی صرف ایک بات جس سے انھیں اختلاف ہے یہ تھی کہ وہ اردو کو دیو ناگری رسم الخط دینے کے حامی تھے لیکن چونکہ ہر شخص کو کسی معاملہ میں اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے اس لیے راہی صاحب پر کوئی نکتہ چینی مقصود نہیں ہے۔

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی نے تعزیتی قرارداد پیش کی اور پھر حاضرین نے کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی اختیار کیا۔

اس جلسہ میں صدر شعبہ پروفیسر حنیف کیفی، محترمہ قرۃ العین حیدر، پروفیسر محمد ذاکر اور ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کے علاوہ دیگر اساتذہ وطلباء نے شرکت کی۔

پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹز اینڈ لینگویجز کے منصب پر فائز

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر عنوان چشتی کو فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لنگویجز کے ڈین کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ موصوف اردو کے ممتاز شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ان کے تخصص کے میدانوں میں تنقید و تصوف، عروضیات و شعریات اور قدیم و جدید شاعری شامل ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی علمی دنیا میں اپنی خوش فکری اور خوش گفتاری کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے قبل پروفیسر چشتی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر اردو کرسپونڈنس کورس کے اعزازی ڈائرکٹر اور جامعہ کی متعدد مجالس کے رکن رہ چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے

اعتراف کے طور پر عثمانیہ یونیورسٹی میں ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں وہ کئی اہم رسائل کے شعبۂ ادارت ومشاورت میں شامل ہیں اور درگاہ حضرت شاہ ولایتؒ کے سجادہ نشین اور جماعتِ صوفیائے ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

نشتر — ہندوستان کا پہلا ناول کے موضوع پر محترمہ قرۃ العین حیدر کا لکچر

۲۳ر مارچ ۹۲ء کو جامعہ کے کانفرنس ہال میں شعبہ اردو کی بزم جامعہ کے زیر اہتمام ایک نشست شیخ الجامعہ پروفیسر بشیرالدین صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں محترمہ قرۃ العین حیدر نے اپنا مقالہ نشتر۔ ہندوستان کا پہلا ناول کے عنوان سے پیش کی۔ اس نشست کی نظامت پروفیسر حنیف کیفی صدر شعبہ اردو نے انجام دی۔ نشتر ۱۸ ویں صدی کے نصف آخر میں فارسی زبان میں حسن شاہ نے تصنیف کیا تھا۔ اس کا ترجمہ اردو میں سجاد حسین کسمنڈوی نے کیا جس کا ترجمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے حال ہی میں انگریزی میں کیا ہے۔ پروفیسر کیفی نے موصوفہ کی ادبی خدمات کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی ادبی کاوشوں کا دائرہ کافی وسیع رہا ہے اور نشتر کا انگریزی ترجمہ اسی کی ایک کڑی ہے۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ اصل سے قریب ہوتے ہوئے بھی اس ترجمہ میں تخلیق کی شان پائی جاتی ہے۔

ناول نشتر کا تعارف کراتے ہوئے قرۃ العین حیدر صاحبہ نے کہا اس کا حقیقت پسندانہ اسلوب اسے جدید ناول سے بہت قریب کر دیتا ہے اور یہ کہ یہ ناول اپنے دور کے سماجی وسیاسی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے اور حیرت کی بات ہے کہ لوگوں نے اس کی جانب توجہ نہیں کی اور یہ زمانہ کی گرد تلے دبا رہا۔ انھوں نے نشتر کو ہندوستانی زبان میں جدید تکنیک کا حامل پہلا ناول قرار دیا۔

بحث کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کے نتائج پر بعض شبہات کا اظہار کیا اور ناول میں جا بجا اشعار کی موجودگی اور مصنف کی کم عمری کو انھوں نے اختلاف کی بنیاد بنایا۔

پروفیسر مجیب رضوی صاحب نے قرۃ العین حیدر صاحبہ کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ تقریباً اسی دور میں جیبی میں بھی اس انداز کے ناول لکھے گئے اور جا بجا اشعار

کا استعمال اُس زمانے کا عام رواج تھا اور بلا شبہ عینی صاحبہ نے نشتر کو انگریزی میں منتقل کرکے ایک قابلِ قدر کام کیا ہے۔

طلباء و اساتذہ شعبہ اردو کے علاوہ اس جلسہ میں جناب بلراج کومل، جناب جوگندر پال اور پروفیسر ماجدہ اسد نے بھی شرکت فرمائی۔

پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز نے مباحثہ کے دوران کی گئی گفتگو کا مجموعی تاثر پیش کرتے ہوئے مختصراً اظہار خیال فرمایا اور قرۃ العین حیدر صاحبہ کو یہ تحقیقی کام انجام دینے پر مبارک باد دی۔

محترم شیخ الجامعہ صاحب نے جن کے لیے جامعہ میں کسی ادبی جلسہ میں شرکت کا یہ پہلا موقع تھا مباحثہ کے علمی معیار کی ستائش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی ایسی معیاری نشستیں جامعہ میں ہوتی رہیں گی۔

حیات اللہ انصاری کے اعزاز میں جلسہ

۲۰ر فروری ۹۲ء کو بزم اردو شعبۂ اردو کی جانب سے معروف ادیب و صحافی جناب حیات اللہ انصاری کے اعزاز میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ذاکر حسین چیئر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب سابق ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے کی۔

ناظم جلسہ پروفیسر حنیف کیفی صاحب نے انصاری صاحب کی ادبی و صحافیانہ خدمات کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی صاحب نے انصاری صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی خدمات پر ایک تفصیلی مقالہ پڑھا

انجمن طلبائے قدیم جامعہ کے انتخابات

۲۹ر فروری کو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے انتخابات پروفیسر ظفر احمد نظامی ریٹرننگ آفیسر کی زیر نگرانی کرائے گئے جس کے نتائج حسب ذیل ہیں۔

جناب جلال الدین پرنسپل جامعہ پولی ٹیکنک صدر

ڈاکٹر سید جمال الدین، شعبۂ تاریخ و ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ سکریٹری
جناب نعمت حسین، ڈپٹی رجسٹرار، جامعہ خازن
سید افتخار احمد، استاد جامعہ مڈل اسکول جوائنٹ سکریٹری

ممبران گورننگ باڈی:۔

(۱) محترمہ ادیبہ خاتون۔ (۲) جناب محمد اسماعیل ذکی (۳) جناب سید غضنفر حسین زیدی (۴) جناب سید مصطفیٰ علی
(۵) جناب منظور عبد الرحمٰن (۶) جناب اسلوب احمد خاں (۷) جناب سید ضمیر حسن زیدی۔

۲۶ مارچ ۹۲ء کو رسمی طور پر سابقہ عہدیداروں نے جامعہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نو منتخب کابینہ کو انتظامی ذمہ داریاں سونپ دیں۔

مجلسِ منتظمہ میں وزیٹر کے نامزد ممبران

جامعہ کے وزیٹر عزت مآب صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے مجلس منتظمہ کے لیے مندرجہ ذیل ممبران تین سال کی مدت کے لیے مقرر ہوئے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ صاحبہ ڈپٹی چیرمین راجیہ سبھا۔
۲۔ جناب سلمان خورشید صاحب، نائب وزیر تجارت، حکومت ہند۔
۳۔ جناب عزیز قریشی صاحب، سابق صوبائی وزیر تعلیم، مدھیہ پردیش و سابق ایم پی
۴۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، دہلی یونیورسٹی

اہل جامعہ نے اس اعلان کا استقبال کیا اور جامعہ کے حلقوں میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ان معزز ممبران کے مشوروں اور تعاون سے جامعہ اپنے توسیعی منصوبوں کی تکمیل میں کامیاب ہوگی۔

کرنل بشیر حسین زیدی چل بسے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق خازن اور یہاں کے کورٹ کے ممبر جناب کرنل بشیر حسین زیدی کا ۲۹ مارچ ۱۹۹۲ء کو انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ۹۴ سال کے تھے۔ ان کی نماز جنازہ اسی دن بعد نماز عشاء

جامعہ اسکولس کے لان میں ادا کی گئی اور جامعہ کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ اگلے روز یعنی ۲۰ مارچ کو جامعہ کے تمام تعلیمی و انتظامی شعبے اُن کے سوگ میں بند رہے۔ اُس دن انصاری آڈیٹوریم میں تعزیتی جلسہ ہوا جس میں شیخ الجامعہ صاحب ذمہ داران جامعہ کے علاوہ اساتذہ وطلباء کی بڑی تعداد نے شرکت جلسے کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا جس کے بعد ڈاکٹر صغرا مہدی صاحبہ ریڈر شعبۂ اردو نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ میں رہ کر اس ادارہ کی خدمت کرنے والوں کی مثالیں اکثر مل جائیں گی لیکن کرنل بشیر حسین زیدی ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو جامعہ سے باہر رہ کر بھی اس کی خدمت سے غافل نہیں رہتے ایک اور خصوصیت ان کی یہ تھی کہ کسی شخص میں چاہے کتنی ہی خرابیاں ہوں اس کی طرف سے بددل نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کی اچھائی کے پہلو پر نظر رکھتے تھے۔

جناب شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ نے کہا کہ زیدی صاحب مکتبہ جامعہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے تھے اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مکتبہ جامعہ کو حیات نو بخشنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے فرمایا کہ زیدی صاحب مرحوم نے انجمن کے صدر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کی مدت کے دوران انجمن کی بے مثال خدمت انجام دی اور دہلی میں اردو گھر کی تعمیر میں ان کے تعاون کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

محترم شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے ان الفاظ میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا کہ وسیع سماجی بصیرت کے حامل تھے، سوشل ایکشن اور سیکولر اقدار میں یقین رکھتے تھے اور سماجی خدمت کو نصب العین سمجھتے تھے۔

جناب خواجہ محمد شاہد رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعزیتی قرارداد پیش کی اور پھر دو منٹ کی خاموشی اختیار کی جامعہ ہی میں، دوسرا تعزیتی جلسہ اسی روز کانفرنس ہال میں ہوا جہاں "ہندی علاقہ کا نشاۃ ثانیہ اور ہندی اردو ادب" کے موضوع پر سمینار جاری تھا اس جلسہ میں پروفیسر مجیب حسین رضوی نے تعزیتی قرارداد پیش کی جس کے بعد حاضرین نے کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے کرنل بشیر حسین زیدی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ
جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ مئی ۱۹۹۲ء | شمارہ ۵

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

سید جمال الدین

شذرات

معاشی بحران کی وجہ سے تعلیمی اداروں کی ترقی و توسیع کے امکانات دھندلے ہو گئے ہیں۔ جامعہ کو جب مرکزی یونیورسٹی درجہ ملا تھا تو یہ امید کی گئی تھی کہ جامعہ کے ترقی کے دروازے کھل جائیں گے۔ لیکن قومی اور بین الاقوامی سطح پر کچھ ایسے واقعات و حادثات رونما ہو گئے کہ حکومت کی جانب سے مالی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ نتیجے کے طور پر ترقیاتی منصوبے سرد خانوں میں ڈال دیے گئے۔ جامعہ میں بھی شعبوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبے مجبوراً التوا میں ڈال دیے گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ترقی یافتہ، ترقی پذیر و غیر ترقی یافتہ اداروں کو ایک ہی اصول کے تحت اپنے بجٹ میں تخفیف کرنے کے لیے کہا گیا۔ وہ مرکزی یونیورسٹیاں جو ترقی کی راہ پر بہت آگے تک جا چکی ہیں جامعہ کو ان سے الگ کر کے نہیں دیکھا گیا۔ جامعہ میں فیکلٹیاں ہیں، شعبے ہیں، ادارے ہیں اور تقریباً تمام کے تمام اپنی ترقی کی ابتدائی منزل پر ہیں۔ ان شعبوں میں زیادہ تر تدریسی عملہ نوجوان اور باعزم اساتذہ پر مشتمل ہے جو اپنے علمی تخصیص کے میدان میں کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں۔ انھیں اپنی صلاحیتوں کے مظاہرے کے مواقع نہیں مل رہے ہیں اس لیے ان میں بے اطمینانی کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وزارت تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو جامعہ کو بطور خاص مالی امداد دینا چاہیے تاکہ یہاں کے شعبوں اور اداروں کی ترقی ابتدائی منزل پر ٹھہری نہ رہ کر آگے کی طرف بڑھے۔ اس سے ہرگز ہمارا مقصد یہ نہیں کہ دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کو مزید گرانٹ نہ دے کر ہماری یونیورسٹی پر خاص عنایت کی جائے بلکہ گزارش بس یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی کو ترقی و توسیع کے وہ تمام مواقع دیے جائیں جن سے دوسری تمام مرکزی یونیورسٹیاں بہت پہلے گزر چکی ہیں یعنی ہمارے شعبوں اور اداروں کی ترقی کے راستے مسدود نہ کیے جائیں۔ اس لیے ضروری ہو گا کہ جامعہ کے موجودہ بجٹ میں اضافہ ہو تاکہ ترقیاتی منصوبوں کو بسہولت عملی جامہ پہنایا جا سکے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے قیام کو دو دہے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ تاریخی تناظر میں اسلامی تہذیب و تمدن اور دنیائے اسلام میں لبرل تحریکوں کا مطالعہ اس کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے سماجیاتی مطالعے کا ہم نے ان میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ گزشتہ کئی برس سے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس انسٹی ٹیوٹ کو جامعہ میں ایک خود مختار مرکز کی حیثیت حاصل ہو تاکہ یہ ادارہ عصری تقاضوں کے پیش نظر اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرہ کا صحیح تاریخی تناظر میں مطالعہ پیش کر سکے۔ امید ہے کہ جامعہ کے ترقیاتی منصوبوں میں دوسرے شعبوں اور اداروں کے ساتھ اس ادارہ کو بھی شامل رکھا جائے گا تاکہ یہ ادارہ مستقبل میں دراسات اسلامی کے فروغ اور علمی تحقیق میں جامعہ کی ایک مخصوص شناخت قائم کر سکے۔

سال رواں کا تعلیمی سال ختم ہو رہا ہے۔ طلبا امتحانات کی تیاریوں میں مشغول ہیں ہم دعا گو ہیں کہ وہ شاندار کامیابی حاصل کریں اور ان کا مستقبل روشن ہو۔

رشید الوحیدی

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ

بیسویں صدی کا محدّثِ اعظم

شریعت کی تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم
قرآن پاک کی حفاظت کا وعدہ تو خود اللہ نے فرما دیا ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون آیہ
اور سنت کی حفاظت کے لیے اس نے ہر دور میں اپنے بندوں میں سے کچھ لوگوں کو مخصوص کر دیا جنھوں
نے اس پاک اور بلند مقصد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور جن کا مشن ہی حدیث کی خدمت
اور اس کی حفاظت رہا ہے۔

عالم اسلام اور ہندو پاک کے مشہور محدث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نور اللہ مرقدہٗ
انھیں جلیل القدر فرزندانِ اسلام میں سے تھے جن کی ساری عمر خاموشی کے ساتھ حدیث شریف
کی خدمت میں گذر گئی اور آخر کار ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ مطابق ۶ مارچ ۱۹۹۲ء کو اپنے
رب سے جا ملے۔ علم کی شمع خاموش ہے، مسندِ حدیث سونی ہے یہ ہے، ضرور ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے
کہ اس قسم کے اظہار بیان سے اس نقصان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو اس صدی میں محدث اکبر
کی وفات سے پیش آگیا ہے۔

مولاناؒ کی پیدائش ۱۳۱۹ ہجری مطابق ۱۸۹۹ء میں صوبۂ یوپی کے شہر مئو ضلع اعظم گڑھ میں
ہوئی۔ آپ کے والد کا نام مولانا محمد صابر تھا۔

ڈاکٹر رشید الوحیدی، ریڈر شعبۂ دراساتِ اسلامی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے وطن مئو کے اساتذہ سے ہوئی اس کے بعد گورکھپور اور بنارس وغیرہ بغرضِ تعلیم سفر فرمایا مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے عربی ادب، منطق فقہ حدیث وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالغفار صاحبؒ بھی خود بڑے فاضل علماء میں سے تھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ الہ آباد کے امتحانات ملا و فاضل میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کی۔ ۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل فرمائی۔ یہاں کے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا۔ مفتی عزیزالرحمٰن صاحبؒ سے تفسیر اور مولانا نبیہ حسن صاحبؒ سے ہیئت کے فن میں کمال حاصل کیا۔ اس کے علاوہ ۱۳۲۸ھ میں حضرت مولانا انورشاہ صاحبؒ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت میاں جی اصغر حسینؒ مولانا کریم بخشؒ سے حدیث شریف ابوداؤد، ترمذی مسلم وغیرہ کا درس حاصل کیا اور بعض اساتذہ سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔

۱۳۲۹ھ میں دارالعلوم مئو اعظم گڑھ میں اور ۱۳۳۴ھ میں مظاہرالعلوم بنارس میں عربی ادب، فقہ اور حدیث پڑھانے کی خدمت انجام دیتے رہے، مظاہرالعلوم میں نظامت تعلیمات کے فرائض بھی انجام دیے۔ "نظامت تعلیمات" کا سادہ سا لفظ بڑی جامعیت کا تقاضا رکھتا ہے اس عہدے کی بڑی ذمہ داریوں میں ایک یہ بھی ہے کہ ناظم تعلیمات تمام فنون میں مہارت کے ساتھ پڑھانے والے اساتذہ کی اہلیت کا جائزہ لے سکتا ہو اور اس بات کو پوری طرح سمجھتا ہو کہ کون سا استاد کس فن کو عمدگی سے پڑھا سکے گا بلاشبہ حضرت اعظمیؒ نے اس معیار پر نظامت کا فرض پوری طرح نبھایا۔

۱۳۴۹ھ میں حضرت مولاناؒ نے اپنے وطن مئو میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور اس کو ترقی دے کر دینی یونیورسٹی کے درجے پر پہنچا دیا۔ رئیس جامعہ (چانسلر) کی حیثیت سے خود حضرت مولانا نے اس کی ذمہ داری سنبھالی اور اس بوجھل کام کے ساتھ صحیح بخاری، سنن ترمذی جیسی حدیث کی بلند پایہ کتابوں کا درس بھی دیتے رہے کم و بیش بیس سال یعنی ۱۳۶۹ھ تک یہ دونوں اہم کام عمدگی کے ساتھ انجام دیے۔

۱۳۶۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے زیارت حج سے مشرف فرمایا اس کے بعد تو متعدد بار حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے علاوہ عالم عرب اور عالم اسلام کا علمی سفر بھی کئی بار ہوا، بیروت،

حلب، دمشق جہاں بھی تشریف لے گئے وہاں بھی زیارت حرمین شریفین اور موقع ہوا تو حج کے لیے جاتے رہے۔

اپنی مشہور علمی تحقیق "مصنف عبدالرزاق" کی طباعت کی نگرانی کے سلسلے میں بیروت کا دو بار سفر فرمایا۔ اس کے علاوہ متقدمین محدثین کی طرح حضرت مولانا کا علمی ذوق بھی انھیں شہروں اور ملکوں کے سفر پر مجبوراً کرتا رہا جس میں افاضہ اور استفادہ دونوں خیر و برکتیں جاری رہیں۔ چنانچہ کویت، دمشق، صیدا، بعلبک، حلب، الاذقیہ، جبلہ (بلاد شام میں) بحرین ان ملکوں کا سفر کیا، جہاں تشریف لے گئے اہل علم، محدثین، علماء کا مجمع ہوتا رہا، اصحاب علم سے کسب فیض بھی کیا اور تشنگان علوم، مشتاقان علم حدیث کو نہایت بلند پایہ علمی تحقیقات سے سیراب بھی کیا اسی قسم کے سفر کا ایک واقعہ ذکر کرنے کے لائق ہے جس سے مولانا اعظمی کی جلالتِ شان اور اہل عرب کے علمی اعتراف کا اندازہ ہوتا ہے۔ لندن کے ایک مشہور میگزین میں مولاناؒ کا مختصر مگر جامع تعارف بزبان انگریزی شائع ہوا ہے، مضمون نگار اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، انھیں کی زبان میں ملاحظہ کیجیے۔

About twenty years ago in a gathering of Ulema at Makkah el Mukarramah , el Imam el Akbar Dr. Abdul Halim Mahmud Shaikh el Azhar called on Maulana Abul Hasan Nadwi, M. Manzur Nu'mani and other leading Ulema were also present. Addressing the representative gathering of Ulema , Dr. Abdul Halim Mahmud testified that in his considered opinion Maulana Habibur Rahman Azami was the greatest living authority on Hadith.

قارئین کرام! یہ طویل اقتباس اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس میں جس فاضل عالم نے، جس مقدس مقام پر، جن فاضل بزرگوں کی موجودگی میں حضرت محدث کا اعتراف کیا ہے۔ ان سب کا بیان ہے۔

اس اقتباس کا مفہوم یہ ہے۔

کوئی بیس سال قبل کا واقعہ ہے مکہ مکرمہ میں جناب عبدالحلیم محمود شیخ الازہر مصر کی خدمت میں علماء ہندوستان کا ایک نمائندہ اجتماع موجود تھا جس میں مولانا منظور نعمانی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دوسرے علماء شامل تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰنؒ بھی موجود تھے۔ شیخ الازھر نے تمام علماء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "میرے خیال میں ہم عصر حدیث پاک کے مستند علماء میں مولانا اعظمیؒ سب سے بڑے عالم ہیں"

محترم شیخ الازہر کے اس اعتراف میں عالم اسلام کے کتنے ہی جلیل القدر مشہور علماء شریک ہیں۔ شیخ بھجۃ بیطار، شیخ عبداللہ سراج حلبی، شیخ نورالدین قمر، شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد امین کتبی سابق شیخ حرم مکی شیخ مغربی، شیخ مخلوف، شیخ البنانی۔ طوالت کی وجہ سے بہت سے نام چھوڑنے پڑے ہیں۔ ورنہ ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے اپنی تصنیفات میں اور زبانی حضرت محدث اعظمؒ کے علم حدیث میں کمال کا اعتراف کیا ہے پھر ان میں سے بہت سے لوگوں نے حضرتؒ سے حدیث کی اجازت حاصل کی اور دیگر علمی فائدہ اٹھایا ہے۔

۱۳۸۱ھ میں حضرت مولاناؒ یو پی اسمبلی کے مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کے اور جمعیۃ العلماء ہند کی مجلس عاملہ وغیرہ کے ممبر منتخب کیے گئے۔ اسی عرصہ میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے اصرار پر آپ نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بخاری شریف پڑھانا منظور فرمایا جیسا کہ قارئین کرام کو اندازہ ہوا ہوگا۔ اور تو سارے زائد کام تھے۔ حدیث ہی کا میدان وہ میدان تھا جس میں حضرت محدثؒ کے جوہر کھلتے تھے اور ندوہ میں مولانا اسی میدان میں علم کے موتی لٹاتے رہے۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت حکیم الامت قاری محمد طیب صاحبؒ نے باضابطہ مئو کا سفر فرمایا اور یہ سفر صرف اس لیے تھا کہ حضرت محدث اعظم کو دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء میں مفتی اعظم کے منصب کے لیے تیار کریں اور اپنے ساتھ لے آئیں مگر اہل شہر نے جامعہ مفتاح العلوم سے حضرتؒ کی علاحدگی گوارا نہ کی اور حضرت دارالعلوم نہ آسکے۔ بعد میں دارالعلوم دیوبند کے ناظم تعلیم کی حیثیت سے آپ کو بلانے پر اصرار ہوا مگر اس بار اپنی بیماری کمزوری اور بعض شدید امراض کے باعث آپ تشریف نہ لا سکے۔ البتہ شوریٰ کے آپ برابر ممبر رہے اور دارالعلوم کی ترقی اور راستہ کام کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے

آپ کے تحریری کاموں کو موضوع اور زبان کے لحاظ سے تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جس کا مختصراً ذکر آرہا ہے باقی رہا حضرت محدثؒ کے علمی کاموں کی قدر وقیمت اور اس کا صحیح تعارف۔ تو اس کی توقع آپ ایک طالب علم راقم الحروف سے نہ رکھیں اسی پائے کا کوئی عالم انشاء اللہ یہ کام کبھی پیش کردے گا یہ ضرور ایک امید افزا بات ہے کہ کم وبیش دو سال سے دلّی یونیورسٹی دلّی میں حضرت محدث کی ذات اور کارنامے پر ریسرچ کا کام ہورہا ہے۔ خدا کرے اس علمی تحقیق میں کچھ علمی گوشے اجاگر ہوسکیں۔ اگرچہ یہ کام ریسرچ اسکالر کی پی۔ایچ۔ڈی سے زیادہ کسی مستند عالم کی تحقیق وجستجو کا طالب ہے۔

بہرحال! حضرتؒ کے کام کا پہلا حصہ تحقیق وتالیف کا ہے۔ (عربی)

۱۔ مسند حمیدی، یہ کتاب ۲ جلدوں میں ۱۳۸۲ میں حیدرآباد اور مالیگاؤں سے طبع ہوئی۔

۲۔ کتاب الزھد والرقائق، عبداللہ ابن مبارک کی۔ ۱۳۸۵ میں یہ کتاب مالیگاؤں سے سے طبع ہوئی۔

۳۔ سنن سعید ابو منصور۔ دو جلدوں میں یہ کتاب ۱۳۸۸ میں مالیگاؤں سے طبع ہوئی۔

۴۔ علامہ ابن حجر کی انتقاء الترغیب والترھیب۔ یہ کتاب ۱۳۸۰ میں مالیگاؤں سے طبع ہوئی۔

۵۔ تلخیص خواتم جامع الاصول محمد طاہر پٹنی محدث کی۔ یہ کتاب مالیگاؤں سے طبع ہوئی۔

۶۔ المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ ابن حجر کی۔ چار جلدوں میں یہ کتاب ۱۳۹۰ء میں وزارۃ اوقاف کویت نے شائع کی۔

۷۔ المصنف عبدالرزاق۔ یہ کتاب گیارہ جلدوں میں ۱۳۹۰ میں دارالعلم بیروت سے شائع ہوئی۔

۸۔ کشف الاستار من زوائد مسند بزار ھیثمی۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ۱۳۹۹ میں مؤسسۃ الرسالہ دمشق سے شائع ہوئی۔

۹۔ المصنف ابن ابی شیبہ کی۔ اس کی پانچ جلدیں مکتبہ امدادیہ مکّہ مکرمہ سے شائع ہوئیں۔

۱۰۔ کتاب الثقات ابن شاہین کی۔ یہ کتاب تیار تھی، چھپ نہیں سکی تھی۔

۱۱۔ الحاوی لرجال الطحاوی۔ مشکل الآثار کے رجال پر یہ پہلی کوشش تھی جو محدث اکبرؒ کے قلم سے سامنے آئی۔

۱۲۔ الاتحاف السنیہ بذکر محدثی الحنفیہ۔ طبع نہ ہو سکی۔

(اردو تصنیفات)

۱۔ نصرۃ الحدیث۔ منکرین حدیث کے رد میں۔

۲۔ اعیان الحجاج (۲ جلد) (۳) رکعات تراویح (۴) شارع حقیقی (۵) اولیاء اللہ کے لیے نذر کے احکام (۶) طلقات مجموعی کے احکام (۷) ازہار نترلوبعہ فی رد آثار متبوعہ (۸) تحقیق اہل حدیث ۹۔ آیات مباہلہ کے سلسلے میں دفع المجادلہ (۱۰) اتحاد الثقلین بجواب اتحاد الفریقین (۱۱) التنقید السدید علی التفسیر الجدید (۱۲) تعزیہ داری کا ابطال (۱۳) تعزیہ داری سنی نقطہ نظر سے (۱۴) رھبر حجاج (دلیل الحجاج) (۱۵) دست کار اہل شرف (۱۶) اہل دل کی دلآویز باتیں۔

عالم عرب کے مشہور اہل قلم، محدث احمد محمد شاکر کی شرح مسند امام احمد بن حنبل پر حضرت محدث اعظمی نے گرفت فرمائی اور ان کی غلطیوں پر متنبہ فرمایا۔ جس کو محمد شاکر صاحب نے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ آئندہ اپنی کتاب میں اس کا ذکر اور اعتراف فرمایا اور ذاتی طور پر حضرت محدث اعظمی کو خط لکھ کر اس علمی احسان کا شکریہ ادا کیا، خط کا مضمون مختصراً حسب ذیل ہے۔ یہ صرف شکریہ نامہ نہیں بلکہ ایک عالم عرب کی طرف سے اپنے بھائی دوسرے عالم ہندی کی قابلیت اور علم حدیث میں اس کی بلند قامتی کا اعتراف ہے۔ علامہ شاکر لکھتے ہیں۔

حضرت الاخ العلامہ الکبیر المحقق الاستاذ حبیب الرحمان الاعظمی۔ الخ

اس معزز و محترم القاب کے بعد خط شروع ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

آپ کا پہلا قیمتی والا نامہ ملا، آپ کی ساری گرفت نہایت قیمتی ہے اور بہت بلند ہے یہ میں کسی تواضع اور انکسار سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس علمی احسان اور رہبری پر میں قلب کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اس کو سنت نبوی کی خدمت سمجھ کر آئندہ بھی اس قسم کی غلطیوں پر متنبہ فرماتے رہیں گے۔ جیسا کہ جناب کے علمی کاموں سے میں واقف ہوں۔ میں آپ کو اس عہد کے عظیم علماء میں شمار کرتا ہوں مکرر عرض ہے کہ اپنی قیمتی رائے اور نفیس علمی کاموں سے مجھے محروم نہ رکھیں اللہ پاک آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور آپ کی حفاظت فرمائے۔

السلام علیکم
احمد محمد شاکر

استدراک الحافظ قاسم بن قطلوبغا علی الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ کے سلسلے میں نہایت بلند قیمت تحقیقی کام پر علامہ محمد زاہد کوثری نے دل کھول کر حضرت محدثؒ کی تعریف فرمائی اور اپنے ایک مقدمے میں بہت بڑے بڑے القاب و آداب کا ذکر فرمایا۔

یوں تو عالم عرب ہند و پاک میں حضرت محدثؒ کے سیکڑوں شاگرد ہیں لیکن ان میں سے ہم مختصراً بعض مشہور علماء کا ذکر کریں گے جنھیں آپ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔

ھندوستان میں

مولانا منظور نعمانی لکھنؤ۔ مولانا محمد حسین بہاریؒ دارالعلوم دیوبند شیخ عبدالستار اعظمی ندوۃ العلماء لکھنؤ، شیخ الحدیث مولانا عبدالجبار مئو۔ مولانا ظفیر الدین نائب مفتی دارالعلوم دیوبند۔ محمد سلیمان اعظمی شیخ الحدیث۔ مولانا سعید الرحمان اعظمی ایڈیٹر البعث الاسلامی لکھنؤ۔

عالم اسلام و عرب میں جن علماء کو آپ سے اجازت حاصل رہی یا علمی استفادہ کیا ان میں چند نام قابل ذکر ہیں۔

شیخ ابوالفتاح ابوغدہ۔ شیخ اسماعیل انصاری دارالافتاء ریاض شیخ سعدی ہاشمی استاد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ۔

اس فہرست میں ریاض۔ مکہ۔ مصر۔ حمص۔ بغداد وغیرہ کے بڑے بڑے علماء کے نام ہیں جو بڑے بڑے علمی عہدوں پر فائز ہیں اور سب حضرت محدثؒ کے علم و خدمت حدیث کے معترف ہیں اس کی فہرست طویل ہے۔

ایک قابل ذکر واقعہ حضرت محدثؒ کے علمی کمال کا مدرسہ ڈابھیل سورت میں ١٩٨٥ء میں اس وقت سامنے آیا جب مصر کے وزیر اوقاف نے آپ کو ہندوستان میں علم حدیث کا سب سے بڑا عالم قرار دیا۔ اور اسی وقت شیخ الازہر علامہ عبدالحلیم محمود نے انھیں ٹوک دیا اور یہ جملہ کہا۔ " بل فی الدنیا کلہا فیما نعلم ـــــ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ساری دنیا میں ان سے بڑا حدیث کا کوئی عالم نہیں ہے۔ ساری دنیا میں نے جیسا کہ معلوم ہوا، عالم اسلام کا اکثر سفر وہاں جو علماء، دارالعلوم اور مراکز ارشاد و تبلیغ کی دعوت پر فرمایا۔ اس وقت ہوٹل میں، قیامگاہ پر مدرسوں میں ہر جگہ علماء کا جم غفیر جمع ہوتا، استقبال کرتا علمی سوال و جواب ہوتے تھے۔

بڑے بڑے علماء وزراء ورئیسانِ مملکت اپنے گھروں پر دعوت دینے اور اس میں فخر محسوس کرتے تھے کہ حضرت محدثؒ ان کے گھروں پر تشریف لے جائیں۔

"ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"

نہایت اختصار کے خیال کے باوجود بات بڑھتی جارہی ہے اور اگر قلم کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو ابھی دفتر تیار ہوسکتا ہے۔ ابھی بہت سے پہلو، جو دماغ میں مچل رہے ہیں، کہ انھیں بھی اس مبارک تذکرے میں جگہ دی جائے، ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اس لیے چند باتیں اور کر کے یہ مبارک کام اور مقدس سلسلہ بند کیا جاتا ہے اور عقیدت و احترام سے ایک التماس محدثین کرام رحمہم اللہ کی پاک جماعت کو علی الخصوص حضرت محدث اکبر مولانا اعظمیؒ کو نذر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

باآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند　　سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

حضرت محدثؒ کے آثار علمیہ میں سے دو عظیم الشان ادارے بحمد اللہ آج بھی سرگرم عمل ہیں، مرقاۃ العلوم مئو اور معہد عالی۔ یہ دونوں ادارے اعلیٰ تعلیم کے کامیاب مرکز ہیں۔ حضرتؒ کی علمی میراث ہیں، یہاں کے نصاب تحقیق و تدقیق میں حضرت محدثؒ کا علمی معیار ضو فگن ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بعد انھیں کے منہج پہ چلائے اور معیار باقی رکھے۔ تخصص فی علوم القرآن، تخصص فی علوم الحدیث تخصص فی الفقہ الاسلامی یہ ان مراکز کے اہم شعبے ہیں ان شعبوں ہی سے اس کی اہمیت اور علمی وقار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جمعیۃ العلماء کے صدر محترم مولانا اسعد مدنی مدظلہٗ نے جب دین کی ایک اہم ضرورت اور ملّی فریضہ کو "امارت شرعیہ" کی صورت میں زندہ کیا تو دہلی کے ایک تاریخی اجتماع میں ملک کے تقریباً پانچ سو جلیل القدر علماء اور اصحاب رائے نے حضرت محدثؒ کو اس کا امیر منتخب کیا، اس موقر عہدہ پر آپ اپنی وفات کے وقت تک فائز رہے۔ راقم الحروف پر حضرت اقدس کی تمام توجہ رہی۔ بڑا تعلق تھا۔ اس تناظر میں واقعات و احساسات کے ایک طویل سلسلہ ہے جس میں گو کہ حضرت محدثؒ کی اعلیٰ شرافت، خورد نوازی اور اخلاقِ کریمانہ کی جھلک ملتی ہے تاہم اپنا ذکر بھی ہے اس لیے اس کے ذکر میں تکلف مانع ہے۔

حضرتؒ کے دو فرزند صاحب علم و صاحب اولاد ہیں بڑے مولانا رشید احمد اعظمی نہایت شریف متواضع منکسر المزاج ہیں جو علماء جو اسلام سے فیض یافتہ ہیں آپ کی اولاد بھی الحمد للہ علوم سے آراستہ ہے۔ دوسرے مولانا سعید احمد یہ بھی صاحب علم ہیں اور علم کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سات بیٹیوں میں سے تین کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار بقید حیات ہیں۔

اللہ پاک حضرت محدثؒ کی خوبیاں ان کی اولاد اور در اولاد میں باقی رکھے۔ ان کے علمی کاموں کو زندہ رکھنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور جو کام ابھی پردۂ خفا میں ہیں وہ زیور طبع سے آراستہ کر سکیں۔

حضرت محدثؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت تھے۔ حضرت حکیم الامت بھی حضرت محدثؒ کے علم کے بیحد معترف تھے۔ اس کا ذکر حضرت محدثؒ کی کتاب التفسیر السدید علی التفسیر الجدید کے مقدمے میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتاب نصرۃ الحدیث پڑھ کر حضرت تھانویؒ نے بڑی تعریف لکھ کر خط میں بھیجی تھی۔ جدید ہندوستان کے اہل الرائے، اصحاب علم لوگوں میں سے مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولانا شاہ معین الدین صاحب، ڈاکٹر اسماعیل ندوی، ابو علی واصفی، علامہ اقبال سہیل صاحب وغیرھم حضرت محدثؒ کا بیحد احترام فرماتے تھے۔ ان کے مداح تھے اور حدیث میں ان کی گہری قابلیت اور درک کا بہت اعتراف کرتے تھے۔

پیچھے کہیں ذکر بھی آچکا ہے اور یہ بات تصدیق کو پہنچ گئی ہے کہ مصر، شام، عراق بغداد سے چل کر قدر دانِ علم حدیث مئو ضلع اعظم گڑھ پہنچتے تھے وہاں قیام فرماتے اور حضرت محدثؒ سے بخاری، ترمذی وغیرہ احادیث کی بلند پایہ کتابیں پڑھ کر سند لے کر واپس ہوتے۔ مشہور شامی عالم شیخ عبدالفتاح ابو غدہ تو کئی بار حاضر ہوئے۔ دوسرے شامی عالم قاری شیخ ابن سوید اور ان کے ہمراہ دو اور اہل علم مئو آئے۔ ایک ماہ مرقاۃ العلوم میں قیام کیا۔ اس عرصہ میں بھی برابر حدیث شریف پڑھتے رہے اور پھر واپس گئے۔ دوبارہ کچھ حصہ جدہ اور کچھ مکہ مکرمہ میں پڑھ کر سند لی۔

اب بالکل ایک نئے موضوع پہ کچھ اظہار ہو جائے یعنی حضرت محدث کی عربی اردو شاعری۔
ایک زمانے میں حضرتؒ کو اس کا بھی ذوق تھا۔ اس وادی کے سارے تقاضے یعنی کسی کی شاگردی، مشاعرہ، دیوان تذکرہ وغیرہ کی نوبت نہ آئی نہ باقاعدہ اشتغال رہا تاہم کبھی

کبھار مشق سخن فرماتے تھے اور اختر تخلص بھی فرماتے تھے۔ چند نمونے دیکھتے چلیں۔

مولانا علامہ اقبال سہیل کی ایک نعتیہ نظم کی تعریف میں چند اشعار تحریر کیے ہیں۔ دو ایک شعر یہ ہیں۔

اے اقبال اے شاعر ملت نازش قوم اور فخر جماعت
مدح نگارِ مرسل خاتم، صلی اللہ علیہ وسلم
لکھی تو نے کتنی سچی، کتنی بلند اور کتنی پیاری
نعت حضرتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم
تجھ کو مبارک مدح نگاری تجھ پر سایہ رحمت باری
تجھ سے راضی ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا جو عربی زبان میں تھا اور عربی زبان میں مرثیے میں جو اثر انگیزی ملتی ہے وہ اس مرثیے میں موجود ہے یہ مرثیہ برہان فروری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس مرثیہ کا ذکر اور اس کے دس اشعار ثقافۃ الہند جلد ۲۷ شمارہ ۱ و ۲ میں بھی موجود ہیں پورا مرثیہ ۳۷، اشعار پر مشتمل ہے۔

حضرت محدثؒ کی ایک مشہور نعت ہے جو حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھیؒ کو اس قدر پسند تھی کہ اسے اپنے مواعظ کے مجموعے "روح البیان"، حصہ دوم میں شامل کر لیا ہے۔ چند شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

وہ جہاں کا رمز وجود ہے وہ مدارِ کارِ نظام ہے
وہ خدا کی شانِ جمالی کا بخدا کہ مظہر تام ہے
کرو یاد معرکہ بدر کا، پڑھو فتح مکہ کا واقعہ
وہ خدا کا قہر و جلال تھا یہ نبی کی رحمت عام ہے
سبھی انبیاء کرام کا ہے مقام سب سے بلند تر
وہ ہلالِ چرخ کمال تھے، مرا شاہ بدر تمام ہے

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر عربی میں مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے

کان الفقید أخو نا حفظ رحمان　　　سهما نبیلاً عظیم القدر و الشان

اس کے علاوہ فارسی میں بھی کچھ اشعار کہے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، جوانی میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ذوق تھا تخلص بھی کرتے تھے۔ مگر اس میدان میں زیادہ دیر تک اور دور تک نہ چل سکے۔ کیونکہ اشرف العلوم کی خدمت کا مزاج اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

ہندوستان کے صدر مملکت نے آپ کے کمال علمی کا اعتراف کیا اور پریذیڈنٹ ہاؤس میں ملک کے "عظیم استاذ اور عالم" کا انعام عطا فرمایا۔ افسوس فخر ہندوستان نازش مسند حدیث اب ہمارے درمیان نہ رہا۔

اللہ ان کی قبر کو انوار و برکات سے مالا مال فرمادیں اور ان کی روح کو سکون عطا فرمائیں۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے حسب ذیل حوالے مفید ہیں۔

۱۔ "ہندوستان میں عربی علوم و فنون کے ممتاز علماء اور ان کی علمی خدمات" مصنفہ ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی صفحہ ۱۳۷ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۷۹ء

۲۔ معارف اعظم گڑھ اپریل ۷۹ء۔

۳۔ ماہنامہ ریاض الجنتہ ریاض العلوم گورینی کھیت سرائے ۸۹ء (غالباً)

۴۔ حالات سید سلیمان ندوی مصنفہ مولانا شاہ معین الدین صاحب۔

۵۔ صدق جدید یکم جولائی ۶۰ء میں مصر کے محقق عالم شیخ محمود محمد شاکر کی حضرت محدث اکبرؒ کے بارے میں رائے۔

۶۔ الجمعیتہ شیخ الاسلام نمبر میں اعظم گڑھ کے ایک جلسے کی روداد۔

۷۔ التعقید السدید علی التفسیر الجدید پر حضرت تھانویؒ کی تقریظ۔

عظیم الشان صدیقی

حیات اللہ انصاری شخصیت کے چند پہلو

حیات اللہ انصاری صاحب کی ادبی زندگی ساٹھ سال سے زیادہ مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنا پہلا ناول چودہ سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں تصنیف کیا تھا جو زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ ان کا پہلا افسانہ "بڈھا سود خوار" جون ۱۹۲۹ء میں رسالہ جامعہ میں شائع کیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جامعہ میں صرف وہی تحریریں شائع کی جاتی تھیں جو روش عام سے مختلف اور ترقی پسندانہ خیالات کی حامل ہوتی تھیں۔ انصاری صاحب کے مذکورہ افسانے میں یہ عناصر موجود تھے جو محض جوش جوانی یا نوجوانی کے ایڈیلزم کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ان کی باغیانہ فطرت اور مجموعی سیاسی اور سماجی صورت حال کا مظہر تھے جس نے انصاری صاحب کو فرنگی محل کی درس گاہ سے مولویت کی سند حاصل کرنے کے بعد بھی دستار بند نہیں رہنے دیا ورنہ وہ بھی درس نظامیہ کا حصہ ہوتے۔ البتہ ادب، سیاست اور صحافت میں آزادی فکر و اظہار کے تمام امکانات موجود تھے جس نے ان کے لیے سیاست میں کشش پیدا کر دی تھی لیکن اس کوچے میں تنگی و ترشی اور قلندری، نیکنامی و رسوائی، جرأت اور بزدلی، بیباکی اور مصلحت پسندی ساتھ ساتھ چلتی ہیں جس نے انصاری صاحب کو گو جیل کی زیارت اور قید و بند کی صعوبتوں سے محروم رکھا لیکن برطانوی حکام کی آنکھوں میں وہ ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے تھے۔ اس لیے انھیں بھی اکثر در بدر بھٹکنا اور روپوش رہنا پڑتا تھا اور ان مسائل سے دوچار ہونا پڑتا تھا جو اکثر حوصلوں کو پست کر دیتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے حوصلوں کو ہمیشہ بلند رکھا۔

اکٹر عظیم الشان صدیقی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس ہی ایسی جماعت ہوسکتی تھی جو نوجوانوں کو پناہ دے سکتی تھی اور بے راہ رو مذہبوں میں اعتدال پیدا کر سکتی تھی۔ انصاری صاحب بھی کانگریس میں شامل ہو گئے اور جب گاندھی جی کو اپنا قائد مان لیا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور دیگر سیاسی جماعتوں کے پرجوش نعرے اور ترغیبات بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔ انصاری صاحب کی کانگریس اور گاندھی جی سے یہ وابستگی اور عقیدت عارضی نہیں تھی بلکہ ان نازک لمحوں میں بھی آزمائش کی کسوٹی پر کھری اتری جب آزادی کے بعد لوگ گاندھی جی سے انحراف کرنے لگے تھے جن کی شہادت کے بعد تو گویا انھوں نے گاندھی جی کے خیالات و نظریات کو اپنی زندگی کا مقصد ہی بنا لیا جن کی وہ آج بھی مشنری اسپرٹ کے ساتھ تشہیر و تبلیغ کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہی سیاسی اور نظریاتی وفاداریوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا

وفاداری بہ شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

پرخلوص وفاداریاں اگرچہ صلہ و انعام طلب نہیں کرتی ہیں لیکن کسی نہ کسی سطح پر ان کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ انصاری صاحب کو آزادی سے قبل کانگریس اور پنڈت جواہر لال نہرو کا جو اعتماد حاصل تھا اس کا اظہار اس طرح ہوا کہ مخالف سیاسی جماعتوں کے پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے جب کانگریس نے ایک اردو روزنامہ قومی آواز جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کی نظر انتخاب حیات اللہ انصاری صاحب پر ہی پڑی اور انھیں قومی آواز کا مدیر اعلا بنا دیا گیا۔ انصاری صاحب نے اخبار کو دلکش اور جاذب نظر بنانے کے لیے نہ صرف گیٹ اپ، کتابت اور سیاہی کے استعمال میں ذوق سلیم سے کام لیا بلکہ شاہ سرخیوں اور ذیلی و ضمنی سرخیوں کے آداب بھی (مقام، الفاظ کی تعداد، انداز بیان اور طرز تحریر وغیرہ) متعین کیے اور ترجمے نیز خبروں کی عبارت میں صحت زبان و بیان کا خاص طور پر خیال رکھا جس کی وجہ سے قومی آواز معنوی اور صوری اعتبار سے نمائندہ اخبار بن گیا۔

انصاری صاحب نے اہم سیاسی اور سماجی مسائل پر خود بھی لکھا اور دوسروں کو بھی لکھنے کے لیے آمادہ کیا اور اداریوں میں سیاسی مخالفین پر اس طرح نکتہ چینی اور طنز و تنقید کی بارش کی کہ صف اعداء میں کھلبلی مچ گئی لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے صحافتی دیانت داری کو بھی برقرار رکھا اور مخالفین کے جوابات کو جس کشادہ دلی کے ساتھ اخبار کی زینت بنایا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اخبار کی اشاعت

اور خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور بحث و مباحثہ کی گرمی، مختلف، متضاد اور متنوع آرا کی اشاعت، عوام کے سیاسی و سماجی شعور کو بیدار کرنے لگی جو کسی بھی اخبار کے بنیادی مقاصد میں شامل ہوتا ہے۔

انصاری صاحب نے قومی آواز کے لیے جو اصول و آداب متعین کیے تھے یہ اخبار اگرچہ آج بھی اسی راہ پر گامزن ہے البتہ انصاری صاحب کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی خدمات اردو صحافت نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

قومی آواز سے انصاری صاحب کی وابستگی محض سیاسی مسلک، روزگار کا مسئلہ نظریات و خیالات کی اشاعت اور صحافت نگاری کے شوق تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ اس میں اردو سے وابستگی اور دوستی کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ انصاری صاحب اگر اس وقت قومی آواز کے مدیر نہ ہوتے تو شاید بائیس لاکھ اردو دستخط کی مہم کو شہرت اور اہمیت حاصل نہ ہوتی جو اگرچہ ناکام رہی لیکن اپنے پیچھے نشان راہ چھوڑ گئی۔

آزادی کے بعد جب اردو پر بے بسی کا وقت پڑا اور وہ بیک قلم اتر پردیش کی انتظامی اور تعلیمی زندگی سے خارج کی جانے لگی تو انصاری صاحب کو اپنی مادری زبان کا وجود خطرے میں نظر آنے لگا اور اس کی بقا اور تحفظ کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تو انصاری صاحب نے برسر اقتدار سیاسی جماعت سے وابستگی کے باوجود اردو کی آواز پر لبیک کہا اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی قیادت میں دستخطوں کی مہم میں شریک ہو گئے اور اپنی بیگم محترمہ سلطانہ حیات کے ساتھ اتر پردیش کا ہر شہر اور قصبہ چھان مارا۔ کسی زبان کی زندگی میں اسے ایسی بڑی تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے جس میں اردو کے آئینی اور سماجی حقوق کو بحال کرانے کے لیے اتنی بڑی اور ایسی منظم کوشش کی گئی تھی اور بائیس لاکھ دستخط جمع کر کے صدر جمہوریہ ہند کے سامنے پیش کیے گئے تھے لیکن یہ شاید جمہوریت کی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے کہ عوام کے اس مطالبہ کو سرکار نے نظر انداز کر دیا اور بائیس لاکھ دستخط ردّی کاغذ کی قیمت بھی وصول نہ کر سکے۔ لیکن جس طرح حق کی آواز کو دبایا نہیں جا سکتا ہے اور جس طرح وہ ابھر کر بار بار سامنے آتی رہتی ہے اردو کے حقوق کی بحالی کا مطالبہ بھی ایسی ہی حق کی آواز ہے جس کے تنِ مردہ میں بائیس لاکھ دستخطوں کی مہم نے ایسی جان ڈال دی ہے کہ اس نے زندہ، متحرک اور مستقل تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے جس کی قیادت کرنے والوں میں حیات اللہ انصاری کا نام بھی سرفہرست شامل رہے گا۔

اس بائیس ۲۲ لاکھ دستخطوں کی مہم نے دوسرا بڑا فائدہ یہ پہنچایا کہ اردو زبان کے وہ بنیادی تقاضے

اور مسائل سامنے آگئے جن کو سیاسی شور وغل نے پسِ پشت ڈال دیا تھا یعنی اردو تعلیم کا فروغ، اردو طریقہ تعلیم اور رسم الخط کی اصلاح جس کے لیے مختلف علاقوں میں مختلف لوگوں نے اپنے طور پر کوششیں شروع کر دیں۔ اس مہم کی ناکامی نے انصاری صاحب پر بھی تازیانے کا کام کیا اور وہ سود کو چھوڑ کر اصل سرمائے کی تلاش اور حفاظت کے لیے کمربستہ ہو گئے اور دن رات محنت کر کے ایسا طریقۂ تعلیم وضع کیا اور اردو تعلیم کے لیے ایسا قاعدہ "دس دن میں اردو" ترتیب دیا کہ جس کے ذریعے کم وقت اور کم محنت سے چلتے پھرتے اردو سیکھی جا سکتی تھی اور لام الف لا اور تے الف تا نے وہ کمال دکھایا کہ مرحوم اسمٰعیل میرٹھی کی روح خوش ہو گئی ہو گی جنھوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں تن تنہا، نہایت محنت اور جانفشانی سے کام لے کر ابتدائی آٹھ جماعتوں کے لیے ایسا اردو نصاب مرتب کیا تھا۔ کہ ایک صدی کے بعد بھی اس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ کاش کہ انصاری صاحب نے بھی اپنے کام کو آگے بڑھایا ہوتا۔

انصاری صاحب نے صرف اردو قاعدہ ہی ترتیب نہیں دیا بلکہ اردو تعلیم و تدریس کے مراکز اور اردو اساتذہ کے لیے تربیت گاہیں بھی قائم کیں اور اسے تعلیم بالغاں سے اس طرح وابستہ کر دیا کہ غیر اردو داں حضرات کے لیے بھی اردو تعلیم کے دروازے کھل گئے۔ دس دن میں اردو محض حروف شناسی کا نفسیاتی اور ذہنی وسیلہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ سازی اور اردو دانی کے لیے ترغیب و تحریک بھی پیدا کرتا ہے۔ انصاری صاحب نے اس کی ترتیب و آرائش میں نہ صرف ذاتی تجربے اور مشاہدے اور علم سے کام لیا ہے بلکہ نفسیات کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی پندرہ صفحات پڑھنے کے بعد طالب علم خود بخود چل نکلتا ہے۔

انصاری صاحب نے ابتدائی تعلیم کے موضوع پر پوری وابستگی کے ساتھ اس طرح غور و فکر سے کام لیا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں گھنٹوں بے تکان گفتگو کر سکتے ہیں۔

انصاری صاحب کے فکر و عمل کا دائرہ خاصا وسیع رہا ہے وہ ادبی تنقید کے کوچے میں بھی داخل ہوتے تھے لیکن اس ذوق و شوق اور سیلِ تند کی مانند کہ نقد و نظر کے تمام آداب کو طاق پر رکھ کر بھول گئے اور وہ ضبط و توازن برقرار نہ رکھ سکے جس کا تنقید مطالبہ کرتی ہے۔ اس وادی پرخار میں ان کا پہلا اور آخری شکار ن۔م۔ راشد تھے جن کے کلام پر انصاری صاحب نے طنز و تنقید، تضحیک و تمسخر کے ایسے نشتر برسائے

کہ راشد کی ہر نظم، ہر شعر اور ہر مصرع مرغِ بسمل کا نمونہ بن گیا اور ان کی کتاب "ن م راشد پر حیات اللہ انصاری" کے جواب میں کسی صاحب کو "ن م راشد پر حیات اللہ انصاری اور ان پر میں" جیسی کتاب تصنیف کرنی پڑی۔

تنقید اگر انا کو تسکین پہنچاتی ہے تو عرفان ذات کے لیے دروازے بھی کھولتی ہے اور اس حقیقت سے بھی واقف کراتی ہے کہ فن پارے کی وفاداری ذاتی وفاداری کی قربانی چاہتی ہے اور جو یہ قربانی نہیں دے پاتا ہے اس کے لیے تنقید بھی اپنے دروازے بند کر دیتی ہے۔ انصاری صاحب کی انا جب اس دروازے کو نہیں کھول پائی تو دبے پاؤں واپس لوٹ آئی۔ چنانچہ آج کوئی تنقید نگار حیات اللہ انصاری کے نام سے واقف نہیں ہے۔

انصاری صاحب کے لیے سیاست و صحافت، تنقید و تحریک اس منزل مقصود کی راہیں تو ہو سکتی ہیں جس کے لیے فطرت نے انھیں پیدا کیا ہے وہ بنیادی طور پر تخلیق کار، ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں جس کے لیے ان ضمنی مشاغل نے انھیں وسیع مطالعے و مشاہدے، عمیق تجربے، ژرف نگاہی، سوز و گداز اور سنجیدہ فکر کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ ان کے ناول 'مدار'، 'گھروندے' اور 'لہو کے پھول' اسی وسیع علم، دشت و صحرا، کوہ بیابان، کھیت بازار، جھونپڑی اور محل، گاؤں اور شہر، خواب و خیال اور فکر و نظر کے فنکارانہ استعمال کے شواہد فراہم کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی اور سماج کے اہم اور بنیادی مسائل کو اس طرح اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے کہ زندگی کی حقیقتیں پہلے سے کچھ زیادہ روشن نظر آنے لگتی ہیں۔ ان کے یہاں سماجی حقیقت نگاری کا فن اگرچہ پریم چند کے مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ پریم چند کے کورانہ مقلد نہیں ہیں بلکہ روایت کی پاسداری کے ساتھ توسیع کو ضروری تصور کرتے ہیں۔

'مدار' کا موضوع اگرچہ زندگی میں مادری زبان کی اہمیت ہے تو اس کے حوالے سے انھوں نے حسن و عشق کے اسرار سے بھی آشنا کرایا ہے۔ اور انسانی جذبات کی ماہیت اور ترجیحات کی نوعیت کو بھی واضح کیا ہے۔ ان کے خیال میں انسانی جذبوں میں اگرچہ بھوک اور جنسی جذبہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقتیں ہیں تو ان کی لذت یابی، رنگ آمیزی اور تسکین کے لیے ہم زبان کا ہونا بھی ضروری ہے جس کی عدم موجودگی سے ان جذبوں کا حسن اور کشش برقرار نہیں رہتی ہے۔ یہ ناول مادری زبان کے پس منظر میں ادراک حقیقت کا مطالبہ کرتا ہے۔

'لہو کے پھول' ان کا ضخیم ناول ہے جو کئی ہزار صفحات کی پانچ جلدوں پر مشتمل ہے لیکن اس کا موضوع وسیع ہے اور انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ یہ ضخامت بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ یہ ناول ۱۹۱۲ء سے

۱۹۵۲ء تک اس ہندوستان کا احاطہ کرتا ہے جو اپنی تحریکوں و تنظیموں، متضاد ذہنی و جذباتی رویوں، فکر و خیال کی جولانیوں، خوابوں و خیالوں حسرت و آرزوؤں کی تند و تیز لہروں کی وجہ سے آتش فشاں بنا ہوا تھا اور جس کے ظاہر و باطن میں ایک نیا مستقبل اور ایک نیا ہندوستان اس طرح کروٹیں لے رہا تھا کہ اس کو سمجھنا، تجزیہ کرنا اور گرفت میں لے کر فن کے قالب میں اُتارنا مشکل کام تھا۔ انصاری صاحب نے اس مشکل کو نہ صرف آسان کر دکھایا ہے بلکہ اس کی سیاسی، معاشی، تہذیبی اور سماجی روح کو جملہ لوازمات کے ساتھ اس طرح ناول میں پیش کر دیا ہے کہ زندگی اپنے خد و خال اور عیوب و محاسن کے ساتھ جگمگا اٹھتی ہے۔ اس ناول میں اگر مزدور کسان، متوسط اور اعلیٰ طبقہ اپنی فطرت و نفسیات، افکار و اقدار کے ساتھ جلوہ فرما ہے تو سیاسی شناسا اور غیر شناسا چہرے بھی ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ جس نے اس ناول کو ایسا نگارخانہ بنا دیا ہے کہ ہر رنگ دوسرے سے سوا نظر آتا ہے۔ یہ ناول ایسی سماجی اور تاریخی دستاویز بھی ہے جس کی اہمیت اور افادیت وقت گزرنے کے بعد بھی باقی رہے گی۔ لیکن اس کامیابی کے باوجود یہ ناول بعض نظریات اور کرداروں کے برتاؤ کی وجہ سے متنازعہ فیہ بھی رہا ہے اور اس تنازعہ کا سبب ایسے مفروضہ تصورات ہیں کہ قاری حیات اللہ انصاری کو رجعت پسند، کمیونسٹ دشمن اور سوشلزم مخالف تصور کرنے لگتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ اپنے قول و فعل اور عمل کے اعتبار سے سیکولر نیشنلسٹ، سوشلسٹ اور ترقی پسند ہیں البتہ ان کا خلوص اور کسی حد تک لبرل ازم کا محدود تصور اور صحافتی چھیڑ چھاڑ کی عادت انھیں بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے قول و فعل کے تضاد کو برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور وہ موقع ملتے ہی اس طرح بیساختہ، بے دریغ اور بے رحمانہ حملے شروع کر دیتے ہیں کہ حزب مخالف کو سنبھلنے اور صفائی کا موقع ہی نہیں ملتا، جس نے ان کے فن کو یک رخا بنا دیا ہے۔ حالانکہ سماجی حقیقت نگار مفسر اور سماجی تنقید نگار کی حیثیت سے ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فن کارانہ ہمدردی کے ساتھ تہذیبی اور سماجی پس منظر میں ان کرداروں کے تضادات اور محرکات کا تجزیہ کر سکیں گے۔ لیکن ان کا فن ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور نفرت کی آگ میں ماحول کے بجائے فرد کو جھونک دیتا ہے۔ ان کے پاس ان سوالوں کا جواب بھی نہیں ہے کہ آزادی سے قبل اگر ہندوستان کی تحریک آزادی کی یہ ترقی پسند بورژوا طبقہ رہنمائی نہیں کرتا تو کون کرتا۔ اس کے علاوہ سیاسی جماعت سے وابستگی کے باوجود ان کی نظر تحریکات اور سیاسی جماعتوں کے داخلی و خارجی تضادات تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ ان کے یہاں ذاتی تجربے اور مشاہدے کی کوئی ایسی نفسیاتی گرہ ہے جو انا کی تسکین کے لیے

کرداروں کے چہرے مسخ کردیتا ہے۔ حالانکہ یہ ترقی پسند بورژوا طبقہ اپنی تہہ دار شخصیت، پیچیدہ نفسیات اور تضاد کی وجہ سے اس امر کا مستحق تھا کہ ان کے باطن میں پوشیدہ امکانات کا جائزہ لے کر کرداروں کو ارتقاء کے مواقع فراہم کیے جاتے لیکن انصاری صاحب کا فن اس کی اجازت نہیں دیتا ہے جس کی وجہ سے طویل جدوجہد اور آزادی کی شکل میں تبدیلی کے باوجود انقلاب کی کوئی آہٹ سنائی نہیں دیتی ہے لیکن افسانوں میں انصاری صاحب کا فنی رویہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالتا ہوا نظر آتا ہے۔

انصاری صاحب کے افسانوں کے اب تک تین مجموعے انوکھی مصیبت (۱۹۳۹ء) بھرے بازار میں (۱۹۴۶ء) اور شکستہ کنگورے (۱۹۵۶ء) شائع ہو چکے ہیں۔ انوکھی مصیبت کے افسانے چونکہ بھرے بازار میں شامل ہیں اس لیے الگ مجموعہ تصور کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بھرے بازار کے افسانے چونکہ آزادی سے قبل تصنیف کیے گئے ہیں اس لیے ان افسانوں اور شکستہ کنگورے میں شامل آزادی سے پہلے تصنیف کیے گئے افسانوں پر استعماری ادب کی گہری چھاپ موجود ہے۔ البتہ "ماں اور بیٹیا" اور "شکر گزار آنکھیں" آزادی کے فوراً بعد فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں جن کو لکھتے وقت نہ جانے کتنی بار ان کی آنکھوں کو اشکبار ہونا پڑا ہوگا۔ لیکن انصاری صاحب چونکہ بنیادی طور پر رجائیت پسند ہیں اس لیے شدید غم اور مایوسی کی بوجھل فضا کے باوجود انسانیت، انسانی اقدار، نیکی، محبت اور ہمدردی پر سے ان کا ایمان متزلزل نہیں ہو پاتا ہے اور وہ درد کا رشتہ اور روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن تلاش کر ہی لیتے ہیں لیکن ان کے خوابوں، خیالوں اور آدرش کا شیش محل آزادی کے بعد لکھے جانے والے افسانوں "بھیک"، "موزوں کا کارخانہ" اور "بارہ برس بعد" میں اس طرح بکھرتا نظر آتا ہے کہ رجائیت پسندی بھی کوئی مدد نہیں کر پاتی۔ ان افسانوں میں شدید کرب، بےچینی، اضطراب اور مایوسی کی فضا اتنی گہری ہے کہ امید کا دیا بجھنے سا لگتا ہے اور آزاد ہندوستان میں کوڑھ کی طرح پھیلتی ہوئی بھوک، غریبی، بےبسی اور بیچارگی خوابوں کی کرچیاں بن کر ذہن زخم کو مزید کشادہ کر دیتی ہیں۔ لیکن ان کے یہاں محرومی کا یہ شدید احساس نقطۂ نظر کی تبدیلی کے بجائے چونکہ حقیقت نگاری کے راستہ سے داخل ہوا ہے اس لیے ان کا فن مجروح ہونے سے بچ جاتا ہے۔

"آخری کوشش" کو انصاری صاحب کے نمائندہ افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے جو استحصال زدگی اور غربت کی نفسیات کے ساتھ استحصال زدگی کو ذریعہ استحصال بنانے کی نفسیات کو بھی سامنے لاتا ہے جس نے افسانے کے مجموعی تاثر میں اضافہ کر دیا ہے۔ آخری کوشش کو پریم چند کے افسانے "بوڑھی کاکی" اور "کفن"

گے ساتھ رکھا جاسکتا ہے لیکن ان دونوں کا اگر فن اور حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو انصاری صاحب کو ایسا حقیقت نگار تو کہا جا سکتا ہے جو قاری اور افسانے کے درمیان کسی پردے کے قائل نہیں ہیں لیکن پریم چند قاری کے تجسس کے لیے کچھ حجابات کو برقرار رکھتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری صاحب تہہ دار شخصیت اور گوناگوں صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ وہ ریاستی اسمبلی اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے ہیں اور ایسے سماجی کارکن بھی ہیں جن کے دل میں غریبوں کے لیے درد اور ان کے مسائل سے دلچسپی بھی ہے وہ اپنے نام حیات کی ایسی جیتی جاگتی تصویر بھی ہیں جن کے لیے آرام حرام ہے۔ ان کے لیے کام ہی زندگی اور کام ہی عبادت ہے اور اکیاسی سال کی عمر کے باوجود وہ گھنٹوں کام کرتے ہیں اور اس خوف سے صرف ایک وقت کھانا کھاتے ہیں کہ دوپہر کا کھانا کسل مندی پیدا کرتا ہے جس سے کام میں خلل واقع ہوتا ہے اس لیے قیلولہ نام کی ان کی زندگی میں کوئی شے نہیں ہے۔ ہمیں بھی ان سے کام کرنے کا یہ انداز سیکھنا چاہیے۔

انصاری صاحب کی کھدر پوشی اگر کانگریس سے ان کی وابستگی اور وضع داری کی علامت ہے تو اُجلا سفید اور بے داغ لباس ان کی نفاست پسندی اور مزاج کی نرمی کو ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ وہ بظاہر قطعیت پسند نظر آتے ہیں۔ شیروانی کے ساتھ رومال نما اسکارف ان کی جدت پسندی کا مظہر ہے۔ معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے چرخہ چلایا اور کھدر بنا بھی ہے یا نہیں البتہ وہ اپنا کرتا پاجامہ خود ہی کاٹتے اور خود ہی سیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کون سا جذبہ ہے جو درزی کو اپنی عنایات سے محروم رکھتا ہے۔ البتہ آپ اسے اپنا کام آپ کرنے اور مستقل طور پر مخصوص طرز اور مخصوص وضع کا لباس زیب تن کرنے کی عادت کہہ سکتے ہیں۔

انصاری صاحب کو تیراکی کا بھی شوق ہے اور ایسا شوق جو پابندی اوقات کے ساتھ تکمیل پاتا ہے۔ قلم اور قینچی میں بظاہر کوئی تعلق نہ ہونے پر بھی ایک رشتہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ وہ دیگر ادیبوں کی طرح مضمون پر چیپیاں نہیں لگاتے لیکن کاغذ کاٹنے اور کاپیاں جوڑنے کے لیے تو قینچی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ادب اور تیراکی میں کوئی رشتہ نظر نہیں آتا ہے۔ وہ محقق اور تنقید نگار بھی نہیں ہیں جنھیں غواصی کے لیے غوطہ خوری کی مشق کی ضرورت ہوتی ہے وہ تو محض تخلیق کار ہیں اور ایک تخلیقی فن کار ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس گُر کو پا لیا ہے کہ گھنٹوں کام کرنے کے نتیجہ میں اعصاب کو سنسناہٹ اور جوڑوں کو درد سے بچانے کے لیے ہر فنکار کے لیے کوئی نہ کوئی جسمانی محنت کا کام یا کسرت ضروری ہے۔

اوران میں تیراکی سب سے بہتر کسرت ہوسکتی ہے جہاں تمام قیود اور فکر و ذہنی آزاد فن کار شش جہت میں ٹیڑھا اور ترچھا دوڑ لگا سکتا ہے لیکن بتدریج اعصاب کی بحالی کے ساتھ جب دل و دماغ پر کردار یورش کرتے ہوں گے تو فن کار ان کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتا ہے۔ انصاری صاحب کے ناول اور افسانوں کے کرداروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بھاگتے دوڑتے، چیختے چلاتے کردار پسند نہیں ہیں۔ وہ پہلے تھپک تھپک کر اپنے کرداروں کو سُلاتے ہیں۔ پھر اطمینان سے ان کی طرف مخاطب ہوتے ہیں۔

ان کے لیے تیراکی کا وقت دن بھر میں سب سے خوشگوار وقت ہوتا ہے جو جسم کے ساتھ روح کو بھی کثافت سے پاک کر کے تر و تازہ بنا دیتا ہے اور برق رفتار خیالات کی آمد اور گرفت کے لیے حوصلہ عطا کرتا ہے۔

حیات اللہ انصاری صاحب کے بارے میں کبھی کبھی یہ خیال شدت سے ستانے لگتا ہے کہ ان کی خدمات اور صلاحیتوں کے ساتھ زمانے نے انصاف نہیں کیا ہے اور انھیں جس مقام پر ہونا چاہیے تھا وہ وہاں نظر نہیں آتے ہیں۔ اسے زمانے کی ناقدری کہیے یا قسمت کی خوبی یا پھر یہ نام میں شامل لفظ انصاری کی تاثیر ہے جو صلہ نہیں چاہتا ہے بلکہ صبر، برداشت، خدمت و ایثار اور قربانی کا مطالبہ کرتا ہے اور سرگوشی کے انداز میں گوش دل تک یہ پیغام پہنچاتا رہتا ہے۔ بقول میر۔

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

اور جب دل اور دنیا کا معاملہ یہ ہو تو پھر کیسا گلہ اور کس کی شکایت، انسان کو تو ہر حال میں اپنی راہ چلتے ہی رہنا ہے اور جہاں یہ عزم سفر ہوتا ہے وہاں لبیک کہنے والے مل ہی جاتے ہیں۔

التماس

مضمون نگار حضرات سے گزارش ہے کہ براہ کرم مسودہ صاف اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں تاکہ کتابت کی اغلاط کم سے کم واقع ہوں، کاغذ کے دونوں جانب حاشیہ ضرور چھوڑیں (ادارہ)

اطہر رضا بلگرامی

ایک ماہ ماسکو میں

یادِ رفتگاں

(۳)

روس کا زرعی نظام بھی عجیب ہے۔ ایک طرف میلوں پھیلے ہوئے فارم جہاں مشینوں کا جال بچھا ہے اور سائنس ٹیکنالوجی، کمپیوٹرس اور اعلیٰ معیاری ریسرچ میں مصروف سائنس داں بہتر سے بہتر ریسرچ کے نتائج نکالنے کی کوشش میں اتنے سرگرداں ہیں تو دوسری طرف غلّہ کی اتنی قلت ہے کہ باہر سے منگوا کر کمی پوری کی جاتی ہے۔

میں نے ماسکو میں بعض زرعی اداروں کا اور کراسنادار Krasnodar میں ایک بڑے زرعی انسٹی ٹیوٹ کا دورہ کیا جہاں میرا ایک ہفتہ کا پروگرام تھا۔ یہ ماسکو سے ہوائی جہاز سے تقریباً تین گھنٹے کی دوری پر واقع ہے یعنی دو ڈھائی ہزار کلومیٹر کی دوری جو سُوچی کے قریب ہے۔ سُوچی روس کی انتہائی صحت افزا جگہ ہے جو بہت مشہور ہے۔ ہمیں ہوٹل انٹورسٹ میں ایک ہفتہ کے لیے ٹھہرایا گیا۔ یہ بڑے پر فضا مقام پر ۸ منزلہ خوبصورت عمارت ہے جہاں کمروں میں ٹھہرنے والوں کے آرام و آسائش کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ لابی میں کافی پینے کا لطف آیا۔ یہ کافی شاپ صبح ۸ بجے سے ۱۱ بجے رات تک کھلی رہتی ہے۔ مجھے کافی تیار کرنے کا منظر اتنا ترغیب آمیز ملا کہ بار بار پیتا تھا اور طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ ہندوستانی قصبوں کی بھڑبھونجے کی دوکان کی یاد آگئی جہاں بھڑبھونجا آپ کے سامنے بھاڑ میں چنے اور مکئی بھونتا ہے اور آپ کے نتھنے ایک اشتہا انگیز خوشبو سے بس جاتے ہیں۔ کافی شاپ پر کچھ ایسا ہی تجربہ ہوتا تھا۔

صاف ستھرے کاؤنٹر کے پیچھے ایک لڑکی کھڑی ہے جس کے ایک طرف ریک میں کافی کی خوبصورت

ڈاکٹر اطہر رضا بلگرامی، ریڈر شعبہ معاشیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

چھوٹی پیالیاں سجی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف ۸' ۱۰ فٹ لمبے سائیب پر دو مشینیں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک مشین کافی کے بیج کو بھون کر پاؤڈر تیار کرتی ہے اور دوسری کافی تیار کرنے کی ہے اس کو مشین کہنا غلط ہوگا کیوں کہ اس میں کچھ کل پرزے تو ہیں نہیں بلکہ یہ کچھ اس طرح کا ساز وسامان ہے جیسے کباڑی کے پاس ہوتا ہے۔ ایک اسٹیل کا گہرا و لمبا باکس ہے جس میں ریت بھری ہے جو نیچے گیس یا بجلی کے برنر کے ذریعہ مسلسل گرم ہو رہی ہے۔ بغل کی دیوار اونچی ہے اور اس میں بہت سے ہک لگے ہیں جس میں لکڑی کی موٹھ لگے موٹے موٹے و چھوٹے بڑے سوجے ٹنگے ہیں جو ریت کو حسب ضرورت گہرا یا چھچھلا کر دینے کے کام آتے ہیں۔ آپ نے کافی طلب کی تو لڑکی نے سب سے پہلے کافی کی پیالی میں تازہ تیار شدہ کافی کا تھوڑا سفوف ڈالا پھر پاس رکھے سماور سے پیالی میں کھولتا پانی ڈالا اور ریک سے اسٹیل ہینڈل لگے مگ نما برتن میں انڈیل دیا۔ یہ برتن بالکل ویسا ہوتا ہے جیسا سبیلوں پر پانی پلانے کے لیے مٹکوں میں پڑا رہتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں دستہ کے سرے پر لکڑی کی موٹھ لگی ہوتی ہے تاکہ اسٹیل راڈ جلنے کی صورت میں ہاتھ نہ جلے۔ اس برتن میں کافی انڈیل کر پیالی اور برتن میں دو تین بار دودھ کی طرح اچھالی پھر اسٹیل راڈ لگے مگ میں بھر کر گرم ریت بھرے لوہے کے تشت پر لائی اور راڈ پکڑ کر مگ کے پیندے کو ریت پر پہلے ہلکے پھر تھوڑا گہرائی کے ساتھ آگے پیچھے چلانے لگی۔ یہ عمل دو منٹ تک کرنے پر مگ میں اُبال آنے لگتا ہے۔ ابال آتے ہی مگ کو ریت سے ہٹا لیتے ہیں۔ جیسے ہی اُبال بیٹھنا شروع ہوتا ہے تو وہی عمل پھر دہراتے ہیں۔ اور اس طرح یہ عمل تین بار کرتے ہیں۔ اس عمل سے ایسی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے کہ کافی کی خواہش دوبالا ہو جاتی ہے۔ بس پھین اٹھی کافی کو پیالی میں ڈال کر کاؤنٹر پر آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ تاب میں رکھے شکر کیوب حسب منشا ڈال کر پیجیے اور بالکل تازہ اصلی کافی کا لطف اٹھائیے۔ شام کے وقت کرسنا دار کے دیگر مقامات پر بھی اسی طرح کافی تیار کرنے کا رواج ہے۔ میں نے ایک ہفتہ کے قیام کے دوران متعدد جگہوں پر یہ کافی پی لیکن ہر جگہ کافی تیار کرنے میں تجارتی انداز حاوی پایا جس کی وجہ سے وہ خوشبو نہ پا سکا جو اس ہوٹل کی کافی میں تھی۔

کرسنا دار چاول اور گیہوں کی پیداوار کے لیے سب سے زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں کرسنا دار شہر سے تقریباً ۴، ۵ کلو میٹر دور دھان کی پیداوار کے سلسلہ میں بہت بڑا اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہے جو بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور جس کے پاس میلوں علاقے میں پھیلے ہوئے

زرعی فارم اور مختلف اقسام کی تجربہ گاہیں ہیں۔ پہلے دن میری ملاقات انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر سے ہوئی جو بہ نفس نفیس گیٹ پر لینے کے لیے موجود تھے۔ وہ مجھے پہلے اپنے آفس لائے، کافی پلائی اور پھر میری لیڈی ٹرانسلیٹر کو جو میرے قیام کے دوران میرے ہر پروگرام کی گویا انچارج تھیں۔ ساتھ لے کر متصل کمیٹی روم میں آئے جہاں انسٹی ٹیوٹ کے متعدد شعبوں کے صدور پہلے سے موجود تھے۔ سب سے تعارف کروایا گیا اور پھر گفتگو کا آغاز ڈائرکٹر صاحب نے میرے متعلق چند کلمات سے کیا کہ میری تعلیم کہاں تک ہے؟ میں کس ادارہ سے منسلک ہوں اور اقتصادیات کے کن میدانوں میں میری دلچسپی ہے، کتنی کتابیں اور مضامین شائع ہوئے ہیں اور یہاں کیا مقصد لے کر آیا ہوں اور اس کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ میرا تعارف ادھورا ہے جب تک میں خود اپنی دلچسپی کے میدان اور یہاں آنے کے مقاصد پر روشنی نہ ڈالوں اور بہ کرمیں تفصیل سے اپنے مقاصد کی وضاحت کردوں تاکہ اس کی روشنی میں آپ کے آئندہ پروگرام مرتب کیے جاسکیں۔

میں نے تقریباً ۱۵ منٹ میں اپنے پروجیکٹ کی وضاحت کی جس کو بڑی خوبصورتی سے خاتون مترجم نے روسی زبان میں واضح کر دیا لُبِ لُباب یہ تھا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے اعلیٰ معیار کو زراعت کی ترقی میں استعمال کرنے کے باوجود پیداواری سطح پر روس نے کوئی کارہائے نمایاں کیوں انجام نہیں دیا؟ آپ ہمیشہ دوسرے ملکوں سے اناج منگواتے ہیں، غلّہ کی کمی اور غذا کی قلّت کا اعتراف کرتے ہیں آپ کے یہاں کی زراعت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زرعی فارموں کی وسعت اور مجبوراً مشینوں کے کثرت استعمال پیداوار اور پیداواری صلاحیتوں کو فروغ دینے کی ضمانت نہیں ہے۔ بڑے پیمانوں کی کفایتوں کے حصول کے بجائے، روسی زرعی سیکٹر، انتظامی پیچیدگیوں، بڑھتی ہوئی لاگتوں اور مناسب رسد کے فقدان کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور نتیجتاً باوجود سائنس وٹکنالوجی کی بلند سطح کو قائم رکھتے ہوئے، دنیا کے سامنے کوئی ایسا پرکشش ماڈل نہ رکھ سکی جس کی تقلید ہم جیسے ترقی پذیر ممالک بھی کرتے۔ اس کے علاوہ جاپان کے چھوٹے پیمانے کی زراعت جہاں سائنس وٹکنالوجی کے استعمال کو چھوٹے پیمانے کی موزونیت کے اعتبار سے ڈھال لیا گیا ہے کہیں زیادہ پرکشش نتائج کے حامل ہیں اور دنیا کے سامنے قابل تقلید نمونہ بنی ہوئی ہے۔ میں آپ کے ملک میں آپ سب سے مل کر تبادلہ خیالات کے ذریعہ اور زرعی فارموں کو دیکھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرے ان خیالات میں کہاں تک صداقت ہے۔ آپ کے یہاں کے وسیع زرعی فارموں میں جو حکومتی نگہداشت میں کام کرتے ہیں یا کوآپریٹیو طور پر چلائے جارہے ہیں، مشینوں نے ان کی پیداواری

صلاحیتوں کو فروغ دینے میں کیا کردار نبھایا ہے۔ آیا وہ معاون ثابت ہوئی ہیں یا اُن کا کوئی منفی رول رہا ہے۔ اور میں یہ اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستانی زرعی سیکٹر تیزی کے ساتھ مشینی دور میں داخل ہو رہا ہے میں اپنے حالات کے تحت آپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھا سکوں اور جہاں جہاں مشینوں کے استعمال میں انتہائی اقدامات اٹھانے ہوں اٹھاؤں اور جہاں جہاں اور جن جن میدانوں میں ان مشینوں نے پیداواری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہو اس کا جائزہ لوں اور اگر میرے حالات معاون ثابت ہوں تو اس کی تقلید کی سفارش کروں۔

میری گفتگو کو انتہائی غور سے سنا گیا اور چہروں کے تاثرات یہ بتا رہے تھے کہ شاید میں نے تنقید میں ڈپلومیسی سے کام نہیں لیا۔ تنقید کا کھلا پن بے تکلف ماحول میں گھٹن کا باعث بنا ہے۔ ایک تجربہ کار اور سن رسیدہ پروفیسر نے انتہائی پُر اثر انداز میں ہمارے تنقیدی جائزے کو سراہا اور مجھے فوراً محسوس ہوا کہ بندھا بندھا سا ماحول ایک دم کھل گیا ہے اور فضا صاف ہوگئی۔ پروفیسر صاحب نے اس بات کو تسلیم کیا کہ میرے یہاں کا زرعی سیکٹر جو ابتدا میں کشش کا باعث بنا تھا اپنی افادیت دھیرے دھیرے کھوتا گیا اور آج تمام تر سائنس و ٹکنالوجی کے استعمال کے دنیا کے نقشہ پر پیداواری رخ سے یقیناً کوئی اہم مقام نہیں بنا سکا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں اول آپ میرے نظام سے واقف ہیں جہاں لاگتوں، سرمایہ کو بڑھانے و گھٹانے رسد کے معقول انتظامات، قیمتوں، مانگوں کو اس نظر سے نہیں دیکھا جاتا جس طرح آپ دیکھ رہے ہیں یا آپ کے ذہن میں ان کو دیکھنے و سمجھنے کا خاکہ بنا ہے۔ اس لیے ایک نظام کا دوسرے نظام سے تقابل تصادم کا باعث بنتا ہے جس کا آپ شاید شکار ہوئے ہیں۔ آپ پہلے مکمل طور پر میرے نظام کو دیکھیے، جائزہ لیجیے اور پھر اس کے تحت کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ میرا جواب صاف تھا۔ میں نے کہا کہ میں خالص معاشیات کے نقطۂ نظر سے اپنے تاثرات بیان کر رہا ہوں۔ نظام کوئی بھی ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ زراعت میں اگر زرعی پیمانہ بڑا ہے، یعنی زرعی رقبہ بڑا رکھا گیا ہے اور مشینوں کے ذریعہ کام میں سہولتیں پیدا کی گئی ہیں، سائنس و ٹکنالوجی کی مدد سے پیداواری صلاحیتوں کو چھیڑا گیا ہے تو آپ کے سامنے اس تمام جدوجہد کے کیا نتائج نکلے ہیں۔ کیا آپ نے اپنا غذائی مسئلہ حل کر لیا۔ کیا زرعی پیداوار کے فقدان کو ختم کر لیا اور کیا زرعی پیداوار جو غذا کے علاوہ صنعتی سیکٹر میں بطور کچے مال کے استعمال ہوتی ہے اس کی ضرورت کو پورا کر لیا اگر ایسا ہوا ہے تو میرے خیالات اور تاثرات غلط ہیں اور اگر نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ایک

بار پھر اپنے زرعی نظام کا مکمل جائزہ لینا ہوگا۔

پروفیسر صاحب اور دیگر احباب نے اس کو تسلیم کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے سماج کی طلب جو میرے یہاں سے یقیناً جداگانہ ہے۔ طلب خورد و نوش جو میرے یہاں سے مختلف ہے، خورد و نوش کی عادات و اطوار جو میرے یہاں سے الگ ہے جغرافیائی و آب ہوائی عناصر جو مختلف ہیں، گورنمنٹ کا رول جو جداگانہ ہے انھیں پہلوؤں پر زور دیتے رہے اور کہتے رہے کہ ان سب نے ہمارے یہاں کی زراعت کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے آخر میں تبلایا کہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ٹھہرے پیمانہ کی کھیتیاں اور مشینیں، پیداواری صلاحیتوں کو بڑھانے کے نقطۂ نظر سے ہر ماحول اور ہر حالات میں کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیتیں میں آپ کو دکھلاؤں گا کہ ہماری مشینیں خواہ وہ آبپاشی کی ہوں، زمین کو جوتنے، ہموار کرنے نالیاں بنانے، بیج کھاد اور ادویات چھڑکنے کی ہوں، فصل کاٹنے، اناج اور بھوسا الگ کرنے، اناج کو اکٹھا کرنے، بھرنے اور گوداموں میں محفوظ کرنے کی ہوں کس طرح کام کرتی ہیں اور ان سے وقت، و بربادی کو کس طرح بچایا جاتا ہے۔ کیا مشینوں کے اس رول کو آپ نظر انداز کر دیں گے؟" میں نے جواب دیا یقیناً نہیں میں آپ کے یہاں مشینوں کی اس کارکردگی کا جائزہ لوں گا اور اپنے تاثرات رپورٹ میں درج کروں گا۔

یہ تمام گفتگو تقریباً ۲ گھنٹہ چلتی رہی۔ درمیان میں نفیس کافی اور لذیذ بسکٹوں سے تواضع بھی ہوتی رہی۔ لنچ کا وقت ہوگیا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب نے میری لیڈی ٹرانسلیٹر سے لنچ میں لے چلنے کو کہا اور اس طرح ہم سب کمیٹی روم سے انسٹی ٹیوٹ کی کینٹن کی طرف چلے۔ میرے ڈائریکٹر اور چند دیگر پروفیسران نے اپنی کسی دوسری مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر لی اور اس طرح ہم چار افراد ہی کینٹین گئے۔ لنچ پیاز اور ٹماٹر کے لذیذ سوپ سے شروع ہوا اور مختلف ترکاریوں، بریڈ مکھن، انڈوں کی مختلف چیزوں سے ہوتا ہوا آئس کریم پر ختم ہوگیا۔ لنچ کے بعد تقریباً گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرنے کی غرض سے لائبریری گھومتا رہا۔ اور تقریباً ۲ بجے دوسری شفٹ شروع ہوئی۔ لیڈی ٹرانسلیٹر کے پاس میرا پورا پروگرام تھا جس کو وہ دیکھ کر ہم کو چلنے کی ہدایت کرتی تھی۔ فیلڈ سروے کا کام شروع ہوا تو ایک انچارج کے سپرد کرکے وہ ٹرانسلیٹر ہم سے رخصت ہوگئی کیوں کہ وہ انچارج انگریزی سے واقف تھا۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے زرعی فارموں کے معائنہ کا پروگرام بنایا اور انسٹی ٹیوٹ کی جیپ پر مجھے چاروں طرف

پھیلے ہوئے میلوں فارموں کو دکھلاتے رہے۔ اس وقت دھان کی فصل تیار تھی سیکڑوں قسموں اور پیڑوں و بیجوں کی خصوصیات کو سمجھاتے رہے۔ چند قسمیں ایسی تھیں جن کے پیڑوں میں بالیوں میں مخالف آب وہوا اور دیگر قدرتی آفتوں کو برداشت کر لینے کی خاصیت پیدا کر دی گئی تھی اور ان کے سائنس داں مسلسل تجربہ کر کے دیگر اقسام میں یہ خاصیت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند بیجوں کو ملا کر جنس کی تبدیلی اور ان کی خاصیتوں کے تبادلہ کے ذریعہ کچھ مخلوط خصوصیات کے ساتھ نئے بیجوں کو ایجاد بھی کر لیا گیا تھا اور ان سب کے لیے وسیع پیمانہ کی تجربہ گاہیں، کمپیوٹر اور دیگر الکٹرانک ساز وسامان سے لیس تحقیقاتی مراکز موجود تھے۔ میں نے ان سب کا باری باری معائنہ کیا اور ان کے نتائج کو دیکھا و سمجھا۔ میں یقیناً ان کی کاوشوں سے متاثر ہو رہا تھا لیکن دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ دیوہیکل انواع واقسام کی مشینیں، یہ کمپیوٹر کا پھیلا ہوا نظام، یہ عظیم الشان تجربہ گاہیں اور ان میں کام کرنے والے دماغ ملک کے زرعی سیکٹر کو کیا معراج عطا کر رہے ہیں۔ چاول کی تمام قسمیں وہ دیکھیں جن کو ہمارے یہاں معمولی عوام تک استعمال نہیں کرتے ایسا موٹا، گٹھلی کی طرح چپٹا، لال جو ہمارے یہاں انتہائی کمترین معیار کا چاول سمجھا جاتا ہے۔ اس پر اس قدر محنت، ایسی کاوش اور ایسی تگ ودو دیکھ کر تعجب ہوا۔ ہاں کچھ اقسام اچھے چاولوں کے نظر آئے لیکن بہت کم۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے یہاں کا "باسمتی" اور دیگر خوشبودار چاول جو بغیر دیوہیکل مشینوں کے استعمال، تجربہ گاہوں کی سخت وکڑی نگرانیوں، تحقیقاتی مراکز کے مرحلوں کو جھیلے اعلیٰ معیار دپیداوار دیتے ہیں۔ ان پر کہیں زیادہ بھاری ہے۔ میں نے اپنے ملک کے کسانوں کو انتہائی احترام وفخر کی نگاہ سے دیکھا جو محض لنگوٹی میں ہر صعوبتوں کو برداشت کرنے کے باوجود ملک کو اعلیٰ معیار کے چاول فراہم کرتے ہیں۔ میرا رہبر مجھے سب کچھ دکھلاتا رہا سمجھاتا رہا اور اپنے طور پر اپنے کارناموں کی وضاحت کرتا رہا اور میرا ذہن اپنے دیش کے ریشم جیسے ملائم اور خوشبو سے معطر چاولوں میں کھویا رہا۔

کرسنادار میں میرا قیام ۶ روز رہا۔ ہر روز صبح سے شام تک مختلف شعبہ جات کے صدور سے ملاقات ہوتی رہی۔ پہلی شفٹ میں وہ اپنے شعبہ کے متعلق تمام کاموں کو سمجھاتے اور پھر اس شعبہ سے منسلک تجربہ گاہوں وتحقیقاتی مراکز میں لے جا کر ہونے والے کاموں کو دکھلاتے رہے۔ یہ سلسلہ ۶ دن تک لگتا رہا اور رخصت ہوتے وقت ڈائریکٹر صاحب سے ملاقات میں میں نے اپنے تاثرات دیتے وقت کہا

کہ یقیناً آپکی کاوشیں اور تحقیقاتی سرگرمیاں، لگن و محنت قابل تقلید ہیں لیکن میرے یہاں کے حالات یکسر جداگانہ ہیں۔ مجھے آپ کی لگن اور سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ رہا یہ مشینی نظام تو اس کو ہم اس طرح اپنائیں گے جو میرے دیہی کلچر کا جز بن جائے تاکہ وہ ہماری پیداواری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو اگر میں نے آنکھ بند کرکے آپ کی تقلید کی تو یقیناً بناوٹی ثابت ہوگی، پیوند کاری ہوگی اور سطحی ہوگی۔ کیونکہ وہ میرے یہاں کے دیہی مزاج و کلچر میں ضم نہ ہو پائے گی۔ مجھے یقیناً مشینوں و دیگر سائنس و ٹکنالوجی کا سہارا لینا ہے لیکن کچھ اس طرح کہ وہ دیہی سماج میں دیہی سماج کی طلب بن کر سرایت کرتا رہے، اور دھیرے دھیرے ان کے مزاج، مذاق اور کلچر کا جز بن جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ پائیدار تقلید ہوگی۔ جس کے مثبت نتائج کا مجھے یقین ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا آپ کا لہجہ بحیثیت معلم کے مجھے متاثر کر گیا۔ میں آپ کا ایک لکچر رکھواتا لیکن شاید ماسکو میں کل آپ کے دوسرے پروگرام ہیں۔ اس لیے اس امید کے ساتھ آپ کو رخصت کرتا ہوں کہ آپ پھر تشریف لائیں۔ میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور باقی دن کرسنادار کے دیگر تاریخی مقامات، یونیورسٹی بازاروں اور میوزیم کی سیر میں گزاری۔ یہ میرے پروگرام میں شامل کیا گیا تھا۔ ایک میوزیم میں مسز اندرا گاندھی کے عطا کیے ہوئے نٹ راج کے مجسمہ اور کچھ روایتی ملبوسات دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ رات انٹورلیسٹ ہوٹل کی آخری رات تھی۔ ڈوبار مخصوص کافی پی۔ ۲/۱ ۷ بجے صبح ماسکو کے لیے فلائٹ تھی۔ ۶ بجے اسٹاف کار بلوائی گئی گائیڈ نے سارا سامان رکھا اور جب نیچے اتر رہا تھا تو لابی کا کافی کاؤنٹر سونا تھا۔ وہ ۸ بجے کھلتا تھا۔ مجھ سے سرعت کے ساتھ بے ساختہ ایک حرکت سرزد ہو گئی میں سوٹ کیس لیے بھاگا بھاگا سونے کاؤنٹر کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر اور ہر چیز کو آنکھوں میں سمو کر فوراً پلٹ آیا۔ گیٹ سے نکل کر کار میں بیٹھا اور بس پھر پلٹ کر انٹورلیسٹ ہوٹل کی طرف نہ دیکھا جہاں دن رات شادیوں جیسا ہنگامہ مچا رہتا تھا۔

تقریباً ۱۱ بجے ماسکو واپس آیا۔ سائنس اکیڈمی کا بھیجا ہوا گائیڈ ایرپورٹ پر موجود تھا۔ یہ وہی گائیڈ تھا جس نے ماسکو پہنچنے پہ ایرپورٹ پر مجھ کو لیا تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر تقریباً ۱۲ بجے ہوٹل اکیڈمی پہنچ گیا۔ کمرہ کھولا تو میز پر میرے دیگر پروگرام لکھے رکھے تھے۔ کل صبح ۱۰ بجے فلاں انسٹی ٹیوٹ جانا ہے، ۴ بجے فلاں تحقیقاتی مرکز پہنچنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کسی طرف دھیان نہ دیا۔ کپڑے

تبدیل کیے اور سید صاحب بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ دماغ میں کرسنا دار کی کافی کی خوشبو اب تک بسی ہوئی تھی۔

شام کو اٹھا تو فون پر اپنے تمام ساتھیوں کو آمد کی اطلاع دی۔ مختلف منزلوں پر ٹھہرے ساتھی انتہائی جوش و خروش کے ساتھ کمرہ میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ میرے دو ساتھی میری طرح ماسکو کے باہر جا چکے تھے، باقی کچھ جانے والے تھے۔ شام کو ازبکستانی کھانے کا پروگرام بنا۔ ماسکو میں ہر سٹیٹ کے ریسٹورنٹ موجود ہیں۔ ہندوستان کے اشوکا کی برانچ بھی ہے گیا تھا لیکن میز خالی نہ ملی اس لیے بہت لیٹ رہا۔ اس بار ہوٹل کے شعبۂ رابطۂ عامّہ سے ازبکستانی ہوٹل کا مکمل پتہ، اوقات اور دیگر معلومات حاصل کر کے چلنے کا پروگرام بنایا۔ یہ ہوٹل کریملن کے پیچھے ایک سڑک جاتی ہے اس سڑک سے دیگر سڑکوں پر مڑ کر آتا ہے۔ اصغر علی انجینیر صاحب نے بڑی مدد کی۔ وہ یہاں آ چکے تھے کھانے کی بڑی تعریف کی اور ہم سب کو میٹرو (ٹیوب ریلوے) بسوں وغیرہ کا راستہ سمجھا دیا۔ انھیں کے بتائے ہوئے راستہ پر ہم چار آدمی ڈھونڈتے ڈھونڈتے بالآخر پہنچ گئے۔ یہ ہوٹل کسی نمایاں شاہراہ پر نہیں ہے بلکہ دہلی کی جامع مسجد جیسے علاقے میں ہے۔ بہت بڑا اور صاف ستھرا کریم نعمت کدہ جیسے ماحول کو اپنائے ہوئے ہے۔ مشکل سے جگہ ملی۔ جتنے لوگ بیٹھے تھے سرخ سفید نہایت تندرست تھے اور مرغ مسلّم کی ٹانگوں میں الجھے ہوئے۔ ہم سب نے گوشت سے تیار شدہ کھانوں کے اقسام پوچھے تو کباب کی ۳ قسمیں، قورمہ، کوفتہ اور قیمہ بتلایا گیا۔ پلاؤ بھی تیار تھا۔ ہم سب نے گوشت کی الگ الگ پلیٹیں منگوائیں۔ کھانا انتہائی لذیذ اور ذائقہ میں اپنے یہاں سے کچھ منفرد نظر آیا۔ کوفتہ کا سائز بہت بڑا اور صرف مسالوں میں لپٹا۔ کوفتہ پر ایک ہری مرچ گھسی ہوئی اور ایک موٹے دل کی پیاز رکھی ہوئی ملی۔ کوفتہ کے اندر چند خوشبودار مسالے بھرے تھے جن کی خوشبو بڑی منفرد تھی۔ لیکن ہمارے یہاں کی طرح چکنے اور ملائم نہیں تھے۔ پلاؤ بڑا دلچسپ تھا۔ ایک بڑی پلیٹ میں چوٹی دار اور خوشبودار بادل بھرے تھے جن کے چاروں طرف چھوٹی بوٹیوں، تلی پیاز اور مختلف قسم کے مسالوں کے پاؤڈر رکھے ہوئے تھے۔ کھاتے وقت سب کو ملا لیجیے اور کھائیے۔ پلاؤ میں بھی کوئی ایک خوشبو ایسی ضرور رہتی جو سب پر حاوی تھی۔ یوں ہمارے یہاں کا پلاؤ و بریانی اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ معیار کا ہوتا ہے۔ کھانے کی شروعات سوپ سے کی گئی جو بہت بڑے نقشین پیالوں میں بھر کر دیا گیا تھا اور جن کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پینا تھا۔ سوپ میں پوری پیاز کی گانٹھ، ایک چھوٹا چوزہ اور دیگر ترکاریاں کٹی

ہوئی تیزرہی تھیں۔ مرچ مصالحہ کے اعتبار سے بہت تیز تھا کیوں کہ اس میں کچھ سرکے جیسی تیزابیت بھی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد نمک مرچ کا ذائقہ منہ کو لگا تھا۔ اس لیے بڑی دلچسپی کے ساتھ پیا گیا۔ ہم سب لوگ تقریباً دو گھنٹہ ریستوران میں رہے اور جب باہر نکلے تو سبھی بہت خوش تھے کہ ہندوستان جیسا کھانا کھانے کو ملا۔

رات کو ہوٹل پہنچا تو پتہ چلا کہ اکیڈمی سے میرے پروگرام انچارج نے فون کیا تھا وہ دوبارہ پھر کریں گے میں کمرہ پر ہی رہا اور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹہ بعد ان کا فون آگیا۔ میرے کل کے پروگرام کی تفصیلات بتائی جا رہی تھیں۔ کل ۱۰ بجے مجھے ماسکو کے مضافات میں ایک زرعی انسٹی ٹیوٹ جانا ہے اور وہاں دن بھر رہنا ہے۔ گائیڈ ساتھ جائے گا۔ مجھے ۱۰ بجے تیار رہنا ہے۔

ٹھیک ۱۰ بجے ایک محترمہ بیگ لیے کمرہ میں حاضر ہوئیں۔ اپنا تعارف کرایا۔ میں نے ہوٹل کے رسٹوران میں کافی پلوائی۔ ہوٹل کے نیچے اکیڈمی کی کار موجود تھی۔ کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ یہ محترمہ بہت باتونی تھیں۔ راستہ بھر ہر بلڈنگ، ہر چوراہے اور ہر مجسمہ کی تاریخ بتلاتی چل رہی تھیں۔ ۴۰، ۴۵ منٹ بعد وہ انسٹی ٹیوٹ آیا۔ باغات کے درمیان گھرا ہوا۔ برآمدے میں چند افراد کھڑے میری آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اترتے دیکھا تو لپکے، تعارف ہوا اور ان کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے کمرہ میں پہنچا۔ انتہائی معمر، سنجیدہ اور تجربہ کار ڈائرکٹر تھے۔ ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ خیر مقدم ہوا۔ وہ سیدھے اپنے آفس سے ملحق کمیٹی روم میں آئے اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا تو تھوڑی دیر میں ۵، ۶ افراد اور آگئے جو انسٹی ٹیوٹ کے مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔

چلیے ایک بار پھر گفتگو کا آغاز ہوا۔ پتہ چلا کہ یہ انسٹی ٹیوٹ صرف پھلوں اور ترکاریوں پر ریسرچ کا کام کرتا ہے۔ سبزیوں و پھلوں کی پیداوار، ان کی غذائی اہمیت، ان کی بیماریوں اور ان سے محفوظ رکھنے کے اقدامات ان کے صنعتی طریق استعمال، مہر بند ڈبوں میں سوکھی یا تازی سبزیوں و پھلوں کو رکھنے وغیرہ کے سلسلے میں یہ ادارہ تحقیقاتی کام کرتا ہے اور اس طرح اپنی کارکردگی کے سلسلے میں روس کے چند مشہور اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ میرا پروجیکٹ مشینوں کے استعمال اور ان سے بڑھی ہوئی پیداواری صلاحیتوں کے سلسلے میں تھا اس لیے میں نے روس آنے کا مقصد بیان کرتے وقت اپنے پروجیکٹ کا تعارف کرایا اور دریافت کیا کہ سبزیوں اور پھلوں کی پیداوار گھر داشت

۔ مہر بند کرنے کے تمام مدارج میں آپ کے یہاں مشینوں کا کس قدر دخل ہے اور اس کو آپ کیا اہمیت دیتے ہیں۔
ڈائریکٹر صاحب اور دیگر صدر شعبہ بہت خوش ہوئے اور بتایا کہ دوائیوں کے چھڑکنے، پھلوں اور سبزیوں کو توڑنے ان کو دھونے کاٹنے، ابالنے اور مہر بند ڈبوں یا پولی پیک میں رکھنے کا بیشتر کام مشین انجام دیتی ہیں جس میں وقت بھی بہت بچتا ہے اور دیگر بربادیوں سے بھی محفوظ رہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت مند اجزاء کو بہت حد تک برباد ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ میرے یہاں آلو، کرم کلاّ دبتوں والی گوبھی، مولی، چقندر، شلجم، گاجر اور دیگر پتوں والی سبزیاں بکثرت ہوتی ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ پتوں والی سبزیوں کی تازگی کو ہم کس طرح محفوظ رکھتے ہیں۔ ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ پیداوار ہر سال بڑھتی رہے۔ پیداواری رقبہ کو اس قدر نہیں بڑھایا جاسکتا اس لیے یہی مشینیں، اچھے بیج، کھاد، چھڑکنے کی ادویات اور مسلسل ریسرچ کے نتائج اچھے برآمد ہوتے ہیں۔ ہم اپنے دیے ہوئے رقبہ پر زیادہ پیدا کرنے لگے ہیں۔ میں آپ کو اپنے آلات، مشینیں اور دیگر کل پرزے دکھلاؤں گا جن کی مدد سے ہم نے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔

پھر دوپہر بعد انھوں نے پیڑوں کو کاٹنے، ڈالوں کو چھانٹنے، قلم باندھنے، پتوں کو اکٹھا کرنے، ادویات چھڑکنے، پھلوں کو پیڑوں سے توڑنے، بیمار پودوں کے علاج کے طریقوں، پھلوں و سبزیوں کو کاٹنے، دھونے، اور ڈبوں میں بند کرنے کے طریقوں کو دکھلایا اور سمجھایا جو انتہائی دلچسپ اور مہارت آمیز تھا جس کو دیکھ کر یہ یقین ہو گیا کہ وقت اور بربادی دونوں کی بہت بچت ہوتی ہوگی اور یہی پیداواری صلاحیتوں کو ابھارنے کا ذریعہ بنی ہوگی۔

شام کو بہت تھکا ہوا واپس آیا۔ ہوٹل میں سارے ساتھی منتظر تھے۔ ان کا کہیں چلنے کا پروگرام تھا۔ میں نے پورے دن کی روداد سنائی تو سب نے بڑا لطف لیا خصوصیت سے جب مشینوں کی کارکردگی بتلائی۔ بھائی میرے یہاں سبزیوں اور پھلوں کی پیداواری سطح تک تو مشینوں کا استعمال نہیں کے برابر ہے۔ ہاں پھلوں سے تیار شدہ اشیاء کے سلسلے میں تو ہم بھی مشین استعمال کرتے ہیں لیکن شاید وہ اتنی معیاری نہ ہوں جتنی یہاں دیکھنے کو ملیں۔ نہا دھو کر ٹہلنے نکلا۔ کوئی جگہ طے نہ کی اور کہا کہ جدھر کی بس آجائے چڑھ جائیں اور جہاں اچھا لگے اتر جائیں۔

یہی کیا۔ ایک بس آئی۔ سب چڑھ گئے۔ اپنے اپنے ٹکٹ بیچ لیے اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑا پر رونق خطہ نظر آیا۔ بلند و بالا عمارتوں سے بھرا ہوا سب نے طے کیا یہیں اتر چلو

وہیں اتر پڑے۔ بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ یہ "اربات اسٹریٹ" ہے جو ماسکو کا "کناٹ پیلس" ہے۔ بڑے بڑے اسٹورس کی بھرمار اور فٹ پاتھوں پر عارضی دوکانداروں کی بھیڑ اور سامان کی خرید و فروخت کا وہی عالم جو شام کو کناٹ پیلس میں رنگل اور اطراف میں نظر آتا ہے۔ لیکن ایک چیز جو غور کرنے والی تھی وہ یہ کہ پورے علاقہ میں، پورٹریٹ بنانے والے مصوروں، آرٹ کا سامان اور پینٹنگ بنانے والوں اور بیچنے والوں کی بڑی بہتات تھی۔ ہر طرف، ہر گلی اور ہر شاہراہ پر جگہ جگہ آپ کو مصوری، پینٹنگ، مجسمے اور نوادرات کے ڈھیر نظر آئیں گے اور لوگ بڑے شوق اور دیدہ ریزی کے ساتھ چھانٹ پھٹک کر خریداری میں منہمک نظر آئیں گے۔ ہم لوگ کافی دیر تک گھومتے رہے پھر اگلے دن تھیٹر میں ایک بیلے دیکھنے کا پروگرام بناتے ہوئے واپس آئے۔

کریملن کے قریب سوم ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے ملا ہوا بال شوئی تھیٹر Bolshoi Theatre ہے جو دنیا کا مشہور ترین تھیٹر سمجھا جاتا ہے اور جہاں ٹکٹ مل جانا بس قسمت کی بات سمجھی جاتی ہے جب ماسکو پہنچا تھا تو یہ تھیٹر بند تھا۔ اب کھل گیا تھا۔ بڑی کوشش سے ہم لوگوں نے ٹکٹ حاصل کیے اور دوسرے دن اس کو بھی دیکھ لیا۔ چونکہ ہم سب کا ذوق تھیٹر کے مزاج و مذاق سے بالکل مختلف تھا اس لیے کوئی لطف نہ لے سکا۔ میرے لیے تو محض پیروں کی انگلیوں کے بل ایڑی اٹھا کر ہوا کے دوش پر لڑکیوں کا چل کر تیزی سے ناچ کرنا لطف کے بجائے الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہاں سیٹ روشنی اور آواز کا انتظام یقیناً متاثر کر رہا تھا۔

ایک زرعی انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ اور باقی تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ زرعی مشینوں پر ریسرچ کرتا ہے۔ اکیڈمی آف سائنس والوں نے پروگرام مرتب کیا اور صبح ایک گائیڈ کے ہمراہ اس انسٹی ٹیوٹ میں بھیجا۔ وہاں کے اسٹاف نے بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور اپنے یہاں مشینوں کی کارکردگی میں جو جدت اور اصلاحات کی گئی ہیں اس کو سمجھایا اور عملی مظاہرہ بھی کیا۔ دوپہر کے کھانے اور چائے شام کی چائے کا بھی انتظام کیا۔ پورا اسٹاف بہت ہلکے پھلکے موڈ میں تھا اس لیے کوئی سنجیدہ بات چیت نہ ہو سکی۔ یہاں یہ بات قابل قدر تھی کہ یہ انسٹی ٹیوٹ مشینوں کی کارکردگی میں اضافہ کرتے رہنے کے لیے دن ورات کوشاں رہتا ہے اور ایسی باریک بینی سے کام کرتا ہے کہ واقعی ان لوگوں کی لگن و محنت سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اکتوبر شروع ہو چکا تھا۔ برف باری بھی ہونا شروع ہو چکی تھی۔ سارا ماسکو گہرے بادلوں سے گھرا رہتا تھا اور ہلکی ہلکی بارش ہوتی رہتی تھی اور ہوائیں بڑی تیز و تند ہو چکی تھیں ہم نے سردی سے خوفزدہ ہوتے ہوئے کچھ لوگوں سے دریافت کیا تو سبھی ہنس پڑے۔ کہنے لگے ارے ابھی تو گرمی کا موسم ہے۔ سردیاں تو اکتوبر کے آخر سے پڑنا شروع ہوں گی۔ اس کو سردی کہتے ہیں۔ سردیوں میں ہر چیز سفید ہو جاتی ہے۔ سب کچھ برف سے ڈھک جاتا ہے۔ ہوائیں ایسی تیز کہ نکلنا مشکل۔ ابھی تو گرمی ہے لوگ اس موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آپ بھی ہوٹل کے باہر نکل کر آئس کریم کھائیے۔ میں خاموش ان کی صورت دیکھتا رہا۔

۸ راکتوبر کو میری واپسی تھی۔ ۷ راکتوبر کی شام کو اپنے کمرہ میں لیٹا سوچ رہا تھا کہ روسی قوم کتنی جفاکش ہے اس میں کس قدر وقت کی پابندی اور ذمہ داری کا احساس بھرا ہے۔ ہوٹل کے ریستوران میں سامان دینے والا ہمیشہ وقت پر پہنچا۔ کبھی لیٹ نہ ہوا۔ ہوٹل کا ریستوران ہمیشہ ٹھیک وقت پر کھلتا۔ فلور لیڈی کا آفس ٹھیک وقت پر کھلا ملتا اور روزمرہ کے طے شدہ کام ہمیشہ سنجیدگی سے وقت پر پورے ہو جاتے۔ گیلری کے قالین کی صفائی۔ کمروں کے قالینوں کی صفائی۔ چادروں و تکیہ کے غلافوں کا بدلنا اور ہر چیز کا چیک کرنا، ڈیوٹی بدلتے وقت دوسری لیڈی کا وقت پر پہنچ جانا سب اپنے مقررہ وقت پر خوش اسلوبی کے ساتھ ہوتا رہتا۔ میں نے ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں کسی طرح کی بد دلی، کوتاہی، معذوری نہ دیکھی۔ میرے کمرہ کی کھڑکی کے نیچے داہنی طرف ٹرام کا ڈپو تھا۔ میں ۹ ویں منزل سے اکثر و بیشتر کھڑکی پر کھڑا ٹراموں کا ڈپو میں آنا جانا دیکھا کرتا تھا۔ پہلی ٹرام صبح پانچ بج کر ۴ منٹ پر سیٹی بجاتی نکلا کرتی تھی۔ میں نے اپنے قیام کے دوران اس پابندی وقت کو کبھی گھٹتے نہ پایا۔ میری اکثر آنکھ کھل جاتی تھی۔ گھڑی دیکھتا تھا تو پانچ بج کر ۴ منٹ ہوتے تھے جب پٹریوں کی گڑگڑاہٹ اور سیٹی کی آواز کے ساتھ ٹرام ڈپو سے نکلتی تھی۔

رات کو اور صبح پورے شہر کو مشینوں سے دھلتے دیکھا۔ دیوہیکل مشینیں جن کے نیچے بڑے بڑے گول برش لگے ہوتے ہیں اور پیچھے پانی گرانے کی چھلنی دار پائپ وہ تمام بڑی شاہراہوں اور گلیوں میں گھوم گھوم کر سڑکوں کو صاف اور چمکدار بناتے ہیں۔ میں نے اس کام میں منہمک افراد کو جس خشوع و خضوع کے ساتھ کام میں لگے دیکھا وہ یقیناً قابل احترام تھا۔ انجینیرنگ کا کمال یہ دیکھا کہ محل نما پرشکوہ

قدیم عمارتوں کو سڑکوں کو چوڑا کرنے کی غرض سے جگہ سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ بہت سی عمارتوں پر اس طرح کا کام چل رہا تھا۔ گورکی اسٹریٹ پر لوگوں نے ہم کو بتلایا کہ یہاں کی بیشتر عمارتوں کو دونوں طرف پیچھے ہٹا دیا گیا ہے اور تب اتنی چوڑی سڑک نکالی جاسکی ہے۔

میرے سامنے ماسکو کے حالات اس قدر تیزی سے نہیں بدل رہے تھے جتنے اس طرف بدلتے دیکھ رہا ہوں۔ ہاں ماسکو کی فضا میں کھلے پن کا احساس ہو چلا تھا۔ اس سے قبل کا ماسکو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن میری گائیڈ نے بتلایا کہ پہلے کیسی پابندی اور گھٹن کا احساس ہوتا تھا جو اب دھیرے دھیرے ختم ہو رہا ہے۔ لوگ ڈالر اور باہری اشیاء کے دلدادہ ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں میں زیادہ جوش و خروش ہے اور اس کا واقعی احساس ہوا۔ وہ موجودہ حکومت کی پالیسیوں سے جوان کو زیادہ آزادی اور کھلی فضا دے رہی تھیں، خوش و مطمئن نظر آرہے تھے۔ پارکوں میں رات کو اور سڑکوں پر گٹار کی دُھن پر ناچتے گاتے نوجوان، دیر رات میں سڑکوں پر قہقہوں اور شور و غل کی آوازیں، حکومت کے نظام پر کھلی ہوئی بات چیت، تنقید اور اصلاحی مشورے آپ کو سمجھا دیں گے کہ ماسکو کا پرانا نظام جو جبر و تشدد پر ٹکا تھا بدل رہا ہے۔ اس کھلی فضا کو دیکھ کر میں بھی خوش ہوا لیکن ایک خدشہ دل میں ضرور ہے کہ یہ نئی آزاد فضا، وقت کی پابندی، احساس ذمہ داری، لگن اور مشقت جیسے روایتی حسن سے مالا مال قوم کو ڈگر سے نہ ہٹا دے۔

میں ۸ کو شام ۴ بجے ہوٹل اکیڈمی سے رخصت ہوا ۔ ۷ بجے کی فلائٹ تھی۔ تمام کارروائیوں سے حسب معمول سہولت سے گزر گیا۔ جب جہاز ماسکو کی فضا پر تھا تو پورا شہر لاکھوں کروڑوں جگنوؤں سے بھرا چمک دمک رہا تھا۔ جہاز شاید اور بلند ہوا تو یہ چمک دمک ابرک جیسی جھلملاہٹ میں تبدیل ہوگئی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں فضا میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں اور ذہن میں گزرا ہوا ایک ایک پل دھیرے دھیرے ابھرنے لگا۔ الوداع ماسکو

حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

نواب ثابت خاں کی یادگاریں

علی گڑھ میں

نواب ثابت خاں کا اصلی نام جعفر بیگ تھا۔[1] ان کے بزرگ تورانی ترک شزادے تھے۔ بعہد سلطنت مغلیہ کول (علی گڑھ) آئے اور یہاں املاک میں مبتلا ہوئے۔ بعہد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ دہلی پیادہ کی حیثیت سے کوتوال پانی پت کے ساتھ رہے اور پھر غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر بعہد فرخ سیر و محمد شاہ بادشاہ دہلی اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔ یہاں تک کہ بز مانۂ فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ دہلی خطاب ثابت خاں سے سرفراز ہوئے اور کول کے فوجدار مقرر ہوئے۔

کول (علی گڑھ) چونکہ قدیم دارالامارت دوآبہ کا رہا ہے اس واسطے انھوں نے بھی کول کو اپنا مسکن و دارالحکومت قرار دیا۔ وہ بڑے عالی ہمت و دیندار اور جمعیت اسلام میں یکتائے روزگار تھے ثابت خاں کی زوجہ اچھی بیگم مغلانی تھیں۔ ان کے فرزند فتح علی خاں ہوئے۔ ان کے فرزند قمرالدین خاں اور ان کے فرزند دوندے خاں ہوئے۔

مرزا محمد کی تالیف تاریخ محمدی سے واضح ہے کہ ثابت خاں کے ۲ دو فرزند ظفر علی بیگ خاں اور فتح علی خاں تھے۔ ظفر علی خاں ایک ہزار دوسو سوار کے منصب پر فائز تھے اور انھوں نے شاہجہاں آباد دہلی میں فروری ۳۶ ۱۷ء میں وفات پائی۔ فتح علی خاں اپنے والد نواب ثابت خاں کے بعد عامل کول ہوئے۔

---

[1] پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی سابق چیرمین شعبۂ کلیات اجمل خاں طبیہ کالج۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

نواب ثابت خاں بہادر کو تعمیرات سے بہت دلچسپی تھی لہٰذا انھوں نے کول (علی گڑھ) جلالی، ہردوا گنج اور اترولی ضلع علی گڑھ میں اپنے عہد میں متعدد عالی شان عمارات تعمیر کرائیں جن کا مختصر تاریخی تعارف حسب ذیل ہے:

۱۔ مسجد جامع علی گڑھ

یہ عالیشان مسجد نواب ثابت خاں بہادر نے بالائے قلعہ انتہائی بلندی پر تعمیر کرائی۔ یہ مسجد پنج دری ہے اور اس کے گنبد بھی پانچ ہیں اور اس لحاظ سے یہ دیگر مساجد سے مختلف ہے۔ اس مسجد کا صحن بھی نہایت وسیع ہے جس کے جانب مشرق، شمال و جنوب برآمدے ہیں۔ اس مسجد میں تین دروازے ہیں جانب مشرق صدر دروازہ ہے اور جانب شمال و جنوب ایک ایک دروازہ ہے۔ دروازوں تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں ہیں۔ مسجد جامع کے صدر دروازہ کی شمالی جانب تہہ خانے میں ایک وسیع حمام، حکیمانہ طبی اصول پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ مسجد جامع نواب ثابت خاں بہادر نے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی تعمیر کرائی تھی۔ حسب ذیل قطعہ تاریخ مسجد کے وسطی دروازہ پر نصب ہے۔

بعہد داور عالم محمد شاہ دیں پرور	بنا چوں کرد ثابت خاں بہادر مسجد جامع
کہ از پیشانیش پیداست نور ظلِّ سبحانی	مکارم گفت تاریخش بہ گیتی قبلۂ ثانی

۱۱۴۱ھ

مسجد جامع بالائے قلعہ علی گڑھ اور اس کے کنوئیں کی تعمیر سے متعلق کتبہ نواب ثابت خاں کے نام کا وسطی محراب کے اوپر نصب ہے جس سے واضح ہے کہ اس کی تعمیر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے جلوس کے گیارہویں سال یعنی ۱۱۳۰ھ میں شروع ہو کر ۱۱۴۱ھ میں تمام ہوئی۔ کتبہ کی عبارت بزبان فارسی حسب ذیل ہے:-

"الحمد للہ حمداً متوافراً والشکر للہ شکراً متواتراً کہ بمصارف خزانہ غیر محمدی صلی اللہ علیہ وسلم بندہ درگاہ خلائق پناہ ثابت خاں بہادر ثابت گنج بن محمد بیگ قوم مغل ترکمان ساکن قصبہ کول مسجد جامع و چاہ در سنہ ۱۱۳۰ھ شروع احداث کردہ در سال یکہزار و یک صد و چہل و یک ہجری موافق سنہ یازدہم جلوس محمد شاہ پادشاہ و غازی انجام تعمیر یافت۔ از دست

و زبان کہ برآید کز عہدہ شکرش بدر آید "۔

راج محمد کولوی نے اخبار الجمال میں ارقام فرمایا ہے کہ اوّلاً اسی مقام پر قطب الدین ایبک نے مسجد تعمیر کرائی تھی اور اس کے بعد اس کی درستی سلطان شمس الدین التمش و ناصر الدین محمود و محمد بن تغلق نے کرائی اور موجودہ مسجد جامع نواب ثابت خاں ترکمان کی تعمیر کردہ ہے۔

۲۔ ثابت گڑھ

نواب ثابت خاں بہادر عامل کول نے کول سے تیس میل کے فاصلہ پر جانب شمال ایک قلعہ بنام ثابت گڑھ تعمیر کرایا جس کا ذکر چتر من رائے نے چہار گلشن میں اور مسکین نے طہماس نامہ میں کیا ہے۔ اسی قلعہ کا نام راجہ سورج مل جاٹ نے رام گڑھ رکھا اور پھر افراسیاب خاں سپہ سالار نجف خاں نے اس قلعہ کو فتح کر کے علی گڑھ میں شامل کیا اور مکمل شہر جس میں جانب شمال اور جانب جنوب دو قلعے واقع تھے علی گڑھ کے نام سے موسوم ہوا۔

۳۔ قصر ثابت خاں

نواب ثابت خاں نے کول میں ایک شاندار محل بھی تعمیر کرایا تھا جو قصر ثابت کے نام سے موسوم ہوا۔ منشی تلنہ پرشاد نے تاریخ فرح بخش میں بیان کیا ہے کہ ۱۷۷۰ء میں احمد شاہ ابدالی نے نواب ثابت خاں کے محل یعنی قصر ثابت خاں میں قیام فرمایا تھا۔

۴۔ باغ ثابت خاں

نواب ثابت خاں نے ایک پر فضا باغ اس مقام پر تعمیر کرایا تھا جہاں کنلوج نامی کلکٹر علی گڑھ نے کنلوج گنج قائم کیا جو بگڑ کر کلاٹ گنج کہلایا اور پھر یہ نام تبدیل کر کے کلیان گنج رکھا گیا۔ یہاں اب اناج کی منڈی ہے اور اسی کے قریب ۱۸۷۰ء میں بمقبلیٹر فلر، آئی۔ سی۔ ایس جوائنٹ مجسٹریٹ کی نگرانی میں بارہ دری اور گھنٹہ گھر تعمیر ہوا۔ باغ ثابت میں ایک مسجد بھی ہے۔ نواب ثابت خاں کی وفات ۱۰ جمادی الثانی ۱۱۴۳ھ / ۲۱ دسمبر ۱۷۳۰ء کو ہوئی اور ان کی قبر باغ ثابت ہی میں بنی جو مذکورہ مسجد کے اندر جانب شمال واقع ہے۔

۵۔ تالاب ثابت خاں

باغ ثابت خاں کے متصل جانب مغرب نواب ثابت خاں نے ایک وسیع وعریض وعمیق پختہ تالاب بھی تعمیر کرایا تھا اور مسجد جامع بالائے قلعہ سے ایک زمین دوز کنکر کی پختہ نالی اس تالاب تک بنوائی گئی تھی۔ یہ تالاب کھنڈر کی صورت میں باقی ہے اور اب شہر کا کوڑا اس میں ڈالا جاتا ہے۔ اس تالاب کے متصل نشاط ٹاکیز قائم کیا گیا ہے۔

۶۔ مسجد جامع جلالی ضلع علی گڑھ

مسجد جامع سادات جلالی ضلع علی گڑھ جو غیاث الدین بلبن کے عہد ۶۶۵ھ کی یادگار ہے اور اس کی تعمیر نو عہد اکبر بادشاہ میں ہوئی تھی بوسیدہ اور شکستہ ہو چکی تھی۔ عہد محمد شاہ بادشاہ میں اس کی تعمیر نواب ثابت خاں بہادر نے کرائی جیسا کہ کتبہ نصب شدہ سے واضح ہے۔ کتبہ کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

بنائے مسجد سادات شد بفضل الٰہ بعہد سلطنت بوالفتح محمد شاہ !

بعون ثابت خاں اہتمام ناصر و سنہ ہزار و یکصد و سی ہفت از رسول اللہ

محمد علی معمار

مذکورہ کتبہ کی رو سے واضح ہے کہ بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی مسجد جامع جلالی، مسجد سادات کے نام سے مشہور و معروف تھی۔ نیز نواب ثابت خاں نے جس سال مسجد جامع علی گڑھ کی تعمیر نو کرائی اسی سال مسجد جامع سادات جلالی ضلع علی گڑھ کی تعمیر نو کرائی۔

۷۔ ہردواگنج ضلع علی گڑھ

چہار گلشن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں ایک سرائے واقع تھی۔ ایچکنسن نے علی گڑھ اسٹیٹکس میں بیان کیا ہے کہ موضع "ہردوا" کے متصل نواب ثابت خاں نے بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۷۲۴ء میں ایک گنج یعنی بازار تعمیر کرایا۔ ہردوا اور گنج دونوں مقامات متصل تھے۔ لہٰذا دونوں مل کر ہردواگنج کے نام سے موسوم ہوئے۔ لوح تاریخ منور علی خاں کی روایت سے واضح ہے کہ ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء

ہیں نواب شجاعت اللہ مع لشکر ہردوا گنج سے گزرتے ہوئے جلالی پہنچے اور وہاں عشرہ محرم کی عزاداری کی ۔ گنج کے متصل ایک قدیم مسجد بھی ہے

درگاہیں

نواب ثابت خاں بہادر نے مندرجہ ذیل دو درگاہیں ضلع علی گڑھ میں تعمیر کرائیں جیسا کہ کتبات و کاغذاتِ سرکاری کی روشنی میں واضح ہے۔

(۱) درگاہ شاہ اللہ بخش علیہ الرحمہ

شاہ اللہ بخش صوفی کی درگاہ موتی مسجد کے جنوبی حصّہ میں واقع ہے۔اس کا گنبد جداگانہ ہے اور خوبصورت ہے۔موتی مسجد پھول چوراہہ علی گڑھ کے نزدیک واضح ہے۔کتبہ سے واضح ہے کہ یہ درگاہ نواب ثابت خاں (جعفر بیگ) نے فرخ سیر کے جلوس کے چھٹے سال ۱۷۔۱۷۱۶ء میں تعمیر کرائی۔

کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"ایں روضہ برائے آسودگی و آرامش حقائق و معارف آگاہ شاہ اللہ بخش بندہ خادم الفقراء ثابت خاں عرف جعفر بیگ بن محمد بیگ بنا کردہ در سنہ ۱۱۲۹ یکہزار و یک صد و بیست و نہ ہجری مطابق سنہ ۶ ششم از جلوس محمد فرخ سیر پادشاہ غازی از بہاؤ سنگھ معمار ترتیب یافت۔

(۲) درگاہ شاہ فیاض علیہ الرحمہ

یہ درگاہ اترولی (ضلع علی گڑھ) کے جانب جنوب واقع ہے۔تاریخ اترولی مؤلفہ شیخ عبدالرحیم سے کہ حضرت شاہ فیاض علیہ الرحمہ نجف خاں حاکم کول کے عہد (۸۶-۱۷۸۵) میں اترولی پہنچے اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی درگاہ سکندر راؤ کے نواب کوتل خاں نے تعمیر کرائی۔ لیکن اترولی کی کھیوٹ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۱ء میں معافی درگاہ شاہ فیاض علیہ الرحمہ درج ہے۔نیز کھیوٹ رپورٹ میں تحریر ہے کہ اس درگاہ کی تعمیر نواب ثابت خاں کے عہد میں ہوئی۔کھیوٹ کے اندراج کے مطابق حضرت شاہ فیاض علیہ الرحمہ کی وفات ۱۷۳۰ سے قبل ہوئی ہے اور اس لحاظ سے آپ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کے صوفی بزرگ تھے نہ کہ نجف خاں کے عہد کے صوفی بزرگ ممکن ہے کہ نواب کوتل نے بھی درگاہ کا کچھ حصہ تعمیر کرایا ہو۔

سید افضال حسین قاسمی صاحب تبسّم کے بیان کے مطابق حضرت شاہ فیاض علیہ الرحمہ۔خانوادہ چشتیہ سے متوسل

تھے محمد شاہ بادشاہ دہلی نے ۱۱۵۶ھ میں موضع کندولی معافی پٹی شیر تحصیل اترولی ضلع علی گڑھ برائے نذر و نیاز درگاہ کا فرمان جاری فرمایا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء میں پیرزادہ محمد حسین صاحب کو باغی قرار دے کر ساری جائداد ضبط کرلی۔ واجب الارض اترولی ۱۸۷۲ء میں اس معافی وقف کا اندراج موجود ہے۔

درگاہ حضرت شاہ فیاض علیہ الرحمہ بیس بیگہ پختہ یعنی ساٹھ بیگہ کچی آراضی میں بحصار پختہ چہار دیواری واقع ہے جس کے چار گوشوں پر چار برج ہیں اور یہ برج زینہ دار ہیں۔ اس وقت دو برج صحیح حالت میں موجود ہیں بسمت جنوبی چہار دیواری سے متعلق ایک دیوار سالم موجود ہے اور غربی و شرقی دیواریں منہدم ہو گئی ہیں۔ درگاہ ہشت پہل ہے جس کے آٹھ گوشوں پر آٹھ ہشت پہل چھوٹے برج کھلے ہوئے تعمیر کیے گئے ہیں۔ یہ زائرین کی نشست گاہ کے طور پر تعمیر کیے گئے ہیں۔ جانب جنوب مغرب چار برج صحیح حالت میں موجود ہیں۔ ہشت پہل وسیع و عریض چبوترے کے وسط میں ہشت پہل عمارت مزار مبارک کی تعمیر شدہ ہے جس میں مزار شریف واقع ہے اور چاروں سمتوں میں آٹھ سنگین جالیوں کے ذریعہ مزار شریف کو احاطہ کیا گیا ہے۔ مغربی سمت میں گنبد دار صومعہ برائے ذکر و عبادت الٰہی تعمیر کیا گیا ہے۔ مکمل عمارت ہشت پہل مثمن شکل پر تعمیر کی گئی ہے۔ عمارت میں لکھوری چھوٹی اینٹ استعمال کی گئی ہے۔ اس عمارت درگاہ کی زیب و زینت اور سبک وضع دہلی اور آگرہ کی شاہی عمارتوں کے مانند ہے۔ درگاہ کی مشرقی جانب اندرون احاطہ درگاہ ایک کنواں بھی تعمیر کیا گیا تھا جو موجود ہے۔

بسمت جنوب راستہ اترولی کی بستی کو جاتا ہے جو ریکارڈ بندوبست میں دروازہ والا نمبر تحریر ہے۔ یہ راستہ محلہ گوریا اور کھیڑا پٹھان کے درمیان سے گزرتا ہے جس کو کاشت کاروں نے مزروعہ بنا دیا ہے۔ لہٰذا اب عید گاہ اترولی کے متصل چھرہ بس اسٹینڈ سے راستہ درگاہ شاہ ولایت علیہ الرحمہ کی مغربی دیوار کے ساتھ گزرتا ہوا درگاہ تک پہنچتا ہے۔ درگاہ حضرت شاہ ولایت علیہ الرحمہ عید گاہ اترولی کے قریب بسمت جنوب واقع ہے۔

مذکورہ درگاہ کی تعمیرات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نواب ثابت خاں بہادر تصوف کی جانب مائل تھے اور حضرت شاہ اللہ بخش علیہ الرحمہ و حضرت شاہ فیاض علیہ الرحمہ سے عقیدت رکھتے تھے۔

قبر نواب ثابت خاں

نواب ثابت خاں کی قبر اُن کے بنا کردہ باغ میں واقع تھی۔ موجودہ صورتِ حال کے مطابق کلاٹ گنج میں واقع گھنٹہ گھر کے نزدیک ایک اناج کی منڈی ہے جہاں ایک قدیم مسجد ہے۔ اس مسجد سے ملحق بجانب شمال نواب ثابت خاں کی قبر پختہ مع احاطہ واقع ہے۔ کلاٹ گنج "باغ ثابت خاں" کی تبدیل شدہ صورت ہے۔

دانش اختر

مولانا حافظ شاہ محمد جان بحری آبادی

علمی و ادبی خدمات

مولانا حافظ شاہ محمد جان ادیب بحری آبادی کا شمار اپنے عہد کے وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظ اور مستثنیٰ دل و دماغ کے حامل علماء و فضلاء میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت عالم اسلام کے ایک متبحر عالم جلیل القدر محدث، مایۂ ناز فقیہ، دیدہ ور مورخ، کامیاب مترجم، عربی، فارسی و اردو زبانوں کے بے مثل ادیب و قادر الکلام شاعر اور بلند پایہ مصنف تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر علم و عمل کی ساری خوبیاں جمع کر دی تھیں ؎

لَیْسَ مِنَ اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ أَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

خدا سے یہ محال نہیں کہ دنیا کو ایک ذات میں جمع کر دے

مولانا بحری آبادی نے اپنی ساری زندگی علم و ادب اور دین و ملّت کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اوّلاً آسی پریس لکھنؤ میں تصحیح کتب کے کام پر فائز ہوئے لیکن اس سے ان کے علمی ذوق و شوق کی تسکین نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا مشغلہ درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے اور تشنگان علم اور شائقین ادب کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب و شاد کام کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں مدرسہ مہابت خاں جوناگڑھ اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں ان کا قیام رہا۔ ان دونوں مدارس میں وہ صدر مدرسی کے اعلیٰ و معزز منصب پر فائز و متمکن تھے۔ مدرسۂ فرقانیہ میں فتویٰ نویسی کی خدمت بھی ان کے سپرد تھی۔ وہ ایک یگانۂ روزگار استاذ و مربّی تھے۔ ان کے حلقہ سے کئی نامور فاضل اٹھے جنھوں نے علم و ادب کے فروغ و ارتقاء میں اہم رول ادا کیا۔

جناب دانش اختر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔

مولانائے موصوف اپنے کمالات علمی کی بنا پر فائق الأقران تھے۔ علوم اسلامیہ اور فنون ادبیہ کے نامور فضلاء میں سے تھے۔ جملہ علوم و فنون میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ فقہ و اصول، عقائد و علم کلام، تاریخ و سیرت اور ادب و شاعری میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن متنوع خوبیوں سے نوازا تھا وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہیں۔ وہ ہر فن میں کامل اور ہر گوشۂ علم میں ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ قرآن و حدیث کا کوئی پہلو زیر بحث آتا تو اس نہج سے اس کی وضاحت کرتے کہ معلوم ہوتا کہ اس کے تمام گوشوں پر عبور حاصل ہے، اس کے سوا کسی فن سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے، یہی ان کا مرکز تحقیق اور حدف فکر ہے۔ اگر فقہ و اصول سے متعلق زبان کو جنبش دیتے تو اس اسلوب سے اس کے نکات بیان فرماتے اور مسائل کی اس طرح صراحت کرتے کہ سننے والے حیران ہو جاتے۔ اگر عقائد و علم کلام اور تاریخ و سیرت کے موضوع پر گفتگو ہوتی تو اس کے باریک اور نازک پہلوؤں کی زلف گرہ گیر کو اس انداز سے سلجھاتے کہ حاضرین مجلس ان کی وسعت مطالعہ، کثرت معلومات اور دقیقہ رسی کی داد دیے بغیر نہ رہتے۔ اگر سلسلۂ کلام کا رخ شعر و سخن کی طرف مڑ جاتا تو اس میں بھی ان کی رائے حتمی اور قطعی قرار پاتی۔ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتّٰی اور مستجمع علوم بے منتہا ہو۔ اب سوا اس گروہ علماء روزگار کے بساط عالم پر جلوہ گر نہیں۔

مولانائے موصوف کے علمی کارناموں کا دائرہ بہت وسیع اور خدمات متنوع اور ہمہ جہت ہیں۔ درس و تدریس، مطالعہ و کتب بینی، تلاش و تحقیق، تحریر و تالیف اور شعر و شاعری ان کے مرغوب و محبوب مشاغل تھے۔ وہ ایک عظیم المرتبت اور بلند پایہ مصنف تھے۔ متعدد علوم و فنون اور مختلف موضوعات و عنوانات پر کئی وقیع کتابیں اور معیاری رسائل و مضامین ان کے قلم کے رہین منت ہیں۔ عربی و فارسی شاعری کے مجموعے اور اردو کلام کے نمونے بھی ان کی یادگار ہیں۔ ان کی یہ تمام خدمات اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی وجہ سے علمی و ادبی سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا۔ ان سے علوم اسلامیہ پر ان کے عبور و دسترس اور ادبیات میں مہارت و قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ عظیم الشان اور گراں قدر کارنامے رہتی دنیا تک ان کا نام روشن اور سر بلند رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ذیل میں ان کی جملہ علمی و ادبی کاوشوں اور تصنیفات و تالیفات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) میلاد لابن الجوزی:۔

شاہ محمد جان بحری آبادی کے استاذ و شیخ مولانا محمد عین القضاۃ صاحب میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے جواز کے قائل تھے اور وہ اپنے قائم کردہ مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں ہر سال نہایت پابندی سے اور بڑے تزک و احتشام سے ساتھ محفل میلاد شریف کا انعقاد کراتے تھے۔ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اسی شغف کی بنا پر انھوں نے اپنے شاگرد رشید سے فرمائش کی کہ وہ اس موضوع پر علامہ ابن الجوزی کے عربی رسالہ "میلاد لابن الجوزی" کو اردو کے قالب میں ڈھال دیں۔

چنانچہ مولانا محمد جان بحری آبادی نے اپنے استاذ محترم کے حکم کی تعمیل میں اس رسالہ کو متن کے ساتھ تمام کمال و مہارت سلیس و رواں اور شگفتہ و شستہ اردو میں منتقل کر دیا جسے مولانا محمد عین القضاۃ نے افادۂ عام کی غرض سے اپنے صرف سے شائع کرا دیا۔

یہ رسالہ عربی و اردو زبانوں پر مولانا بحری آبادی کے عبور و دسترس اور فن ترجمہ پر ان کی قدرت و مہارت کی روشن دلیل ہے۔

(۲) الاصطبار علی شرور الأشرار :۔

مولانا بحری آبادی کے آخری دنوں میں ان کے استاذ علامہ عبدالحی فرنگی محلی کے فقہی موقف کے خلاف بمبئی یا اطراف بمبئی کے کسی شخص نے ایک کتاب "ذوالفقار حیدر کرار" کے عنوان سے شائع کی تھی جس میں بعض فقہی مباحث و مسائل میں علامہ فرنگی محلی کی تحقیقات و مختارات کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اور ان کے بعض اقوال پر رکیک اور دور از کار جرحیں کی گئی تھیں نیز ان کی شان میں سخت بے ادبی اور گستاخی کی گئی تھی، ان کے وقار کو مجروح اور پیکر کو داغدار بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور ان کے خلاف مطاعن بیجا اور اتہامات بے جا کے طومار باندھے گئے تھے۔ جب کہ علامہ فرنگی محلی نے اپنی تحقیق و اجتہاد سے نہایت قوی اور صحیح دلائل و براہین کی بنیاد پر بعض مقامات پر علمائے احناف سے اختلاف اور شوافع وغیرہ کی آراء سے اتفاق کیا تھا اور جدید افکار و آراء کا اظہار فرمایا تھا۔ ان مسائل میں سے شاید ہی کوئی مسئلہ ایسا ہو جس میں بعض معتمد و معتبر محققین احناف نے بھی علامہ موصوف ہی کی طرح مختلف موقف نہ اختیار کیا ہو۔

مولانا بحری آبادی کو اپنے استاذ محترم و معظم کی شان میں صاحب "ذوالفقار" کی یہ دیدہ دلیری نہ زوری اور بیباکانہ زباں درازی سخت ناگوار خاطر گزری۔ انھوں نے اس کا جواب لکھنا وقت کی

اہم ضرورت اور اپنا فرض منصبی سمجھا۔ اسی جذبے کے تحت " الاصطبار علیٰ شرور الاشرار" کے نام سے "نور الفقار" کی تردید و ابطال میں ایک مدلل و مفصل کتاب سپرد قلم فرمائی جس میں علامہ موصوف کے فکری مزخرف اور تحقیقات پر سیر حاصل بحث کی اور متہم کے ایک ایک الزام و اتہام کا مدلل، مسکت اور دنداں شکن جواب دیا۔ مولانا کی اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ متہم کی بدگوئی اور سخت کلامی کے باوجود کوئی کلمہ خلاف تہذیب زبان قلم سے نہیں نکلا، سخت لب و لہجہ نہیں اختیار کیا بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے تمام مطاعن و اتہامات اور تنقید دل کا عالمانہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے اور ایسا عمدہ اور تشفی بخش جواب تحریر فرمایا ہے کہ کوئی بھی منصف مزاج اس کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ کتاب اردو میں ہے اور مطبع قادری، لکھنؤ سے چھپ کر منظر عام پر آگئی ہے۔

(۳) مجموعۂ فتاویٰ

شاہ محمد جان مرحوم علوم اسلامیہ کے دیگر شعبوں کی طرح علم فقہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے جس پر ان کی مذکورہ بالا کتاب (الاصطبار علیٰ شرور الأشرار) اور فتاویٰ شاہد عدل ہیں۔ فتویٰ نویسی کی یہ خدمات انھوں نے مدرسۂ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ میں انتظامی و تدریسی فرائض ادا کرنے کے دوران انجام دی تھیں۔

مولانائے مرحوم فقہی مباحث و مسائل میں بڑی وسیع و عمیق نظر کے حامل تھے۔ کتب فقہ کی جزئیات پر ان کی وسعت نظر بدرجۂ اتم تھی۔ فطرتاً نہایت ذہین، طبّاع اور نہایت دقیقہ رس تھے۔ انتہائی صاف اور سلجھے ہوئے ذہن و دماغ کے مالک تھے۔ ان کا تیر نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات و غوامض کی عقدہ کشائی میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا۔ خواہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تک پہنچ جاتے تھے۔ یہ دراصل کرشمہ تھا ان یگانۂ روزگار علماء اور اکابر اساتذہ کے فیضان نظر کا جن سے انھوں نے علم فقہ کا اکتساب کیا تھا۔ ان میں علامہ عبدالحی فرنگی محلی اور مولانا محمد عین القضاۃ، حیدرآبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی خداداد ذہانت و استعداد کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مولانائے مرحوم فتاویٰ کے جوابات بہت ہی مختصر لیکن قلّ و دلّ دیتے تھے۔ یہ فتاویٰ مدرسۂ فرقانیہ

کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ "فتاویٰ مدرسہ فرقانیہ" چار جلدوں پر مبنی ہے۔ انھیں جلدوں میں مولانائے مرحوم کے بھی فتاویٰ ہیں۔ ان چاروں جلدوں کی فوٹو کاپی جامعہ ملیہ لائبریری میں بھی محفوظ ہے۔

تنقید الفاروق

علامہ شبلی نعمانی کی تاریخ تالیفات میں 'الفاروق' ایک شہرۂ آفاق کتاب ہے جس میں اہل ذمہ سے متعلق ایک معرکۃ الآراء بحث بھی ہے۔ ذمیوں پر اسلام کی عائد کردہ حدود و قیود کی وجہ سے جدید سے آراستہ حضرات اور عقلائے یورپ کے حلقوں میں اسلام کے نظام عدل و مساوات کے سلسلے میں سخت غلط فہمیاں اور بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں جن کے ازالہ کے لیے علامہ شبلی نے بہت زیادہ کد و کاوش کی اور اس موضوع پر اپنی تحقیقات کا بہت بڑا حصہ صرف کر دیا۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی متفرق تصانیف مثلاً الفاروق، سیرۃ النعمان اور رسائل شبلی میں محض ضمنی ہی تحریروں پر اکتفا نہ کر کے دو خاص رسائل "حقوق الذمیین، اور 'الجزیہ' بھی تصنیف فرمائے۔

لیکن علامہ کی ان تحریروں اور تحقیقات سے مولانا شاہ محمد جان بحری آبادی کو جو علاوہ دیگر کمالات کے تاریخ و تحقیق کا ذوق بھی بدرجۂ اتم رکھتے تھے، شدید اختلاف تھا کیوں کہ علامہ نے اس سلسلے میں جو طرز و اسلوب اختیار کیا اور جن افکار و آراء کا اظہار فرمایا ہے وہ مولانائے موصوف کے نزدیک حزم و احتیاط، روایت و درایت اور تاریخ و تحقیق کے معیار سے فروتر ہیں لہٰذا انھوں نے اظہار حق اور تحقیق واقعات کے لیے "تنقید الفاروق" کے عنوان سے 'الفاروق' پر ایک بسیط تنقید و تبصرہ سپرد قلم فرمایا جو مولانا محمد ظفر الملک علوی کے ماہنامہ 'الناظر' لکھنؤ بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۹ء میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کا حجم 'الناظر' کے تین پرچوں کے مساوی ہے۔

مولانا بحری آبادی نے اپنے اس تنقیدی رسالے میں اسلامی علوم و اسلامی تاریخ کے اپنے وسیع و عمیق مطالعہ اور تاریخی و تحقیقی بصیرت کی بنیاد پر ذمیوں کی بابت علامہ کے جملہ افکار و خیالات اور مباحث و تحقیقات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا اور ان کا عالمانہ و ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ جن جن مقامات پر انھوں نے تاریخ و تحقیق، روایت و درایت اور امانت و دیانت کے اصولوں سے انحراف کیا ہے اور جہاں جہاں ان سے اسلامی شریعت کا مقصد و منشاء سمجھنے اور صحیح نتائج اخذ کرنے میں فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی نشاندہی کر کے اصل حقیقت اور صحیح صورتِ حال واضح فرمائی ہے۔ نیز ان احادیث و روایات

اور تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے جنھیں علامہ نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانائے موصوف نے علامہ کے برخلاف فقہاء و مؤرخین کو مورد الزام و مستوجب سلام ٹھہرانے اور ان احکام کی غلط اور خود ساختہ تاویلات پیش کرنے کے بجائے نہایت حق گوئی و بیباکی کے ساتھ تمام حقائق کو جوں کا توں دنیائے علم کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت واضح طور پر تحریر فرمایا ہے کہ ذمیوں کے احکام اور اس سلسلے کی جملہ تفصیلات فی الواقع اسلام کے احکام ہیں نہ کہ فقہاء و مؤرخین کی ایجاد و اختراع اور مذہبی تعصب و تنگ نظری کے نتائج۔ روایات و آثار صحابہ میں ان کی تصریحات مختبر طور پر جستہ جستہ موجود ہیں۔ اور تاریخی واقعات میں صاف صاف مذکور ہے کہ اہل ذمہ فلاں فلاں لباس نہ پہنیں۔ فلاں فلاں وضع اور فلاں حقیت کی پابندی ان سے عملاً کرائی جائے۔ انھوں نے اپنی فطری صاف گوئی اور دیانت داری سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ قرآن مجید کی آیت جزیہ دَکوٰ

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ

(سورہ توبہ) نیز احادیث و روایات اور تاریخی واقعات سے ان احکام کا منشاء صریح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل ذمہ اسلامی سلطنت میں ہمیشہ ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا معاشرانہ پہلو دبا ہوا اور ہمسری و افتخار کے پایہ سے گرا ہوا ہو۔

مولانائے ممدوح کے اس تنقید و تبصرہ کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ذمیوں کے بارے میں جملہ احادیث و روایات و احکام صحابہؓ اور تاریخی واقعات و معاہدات کو یکجا کر دیا ہے تاکہ ان کی روشنی میں ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے قرآن مجید کے علاوہ حدیث و تاریخ کی جن کتابوں کو بطور مآخذ و مراجع استعمال کیا ہے ان میں حسب ذیل کتابیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، بیہقی، مصنف عبدالرزاق ابن ابی شیبہ، کنزالعمال، تلخیص ابن حجر کتاب الخراج از قاضی ابویوسف، معارف از ابن قتیبہ اور فتوح البلدان از بلاذری۔

الغرض مولانا بجری آبادی کا یہ مقالہ ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت، حق گوئی و بیباکی، وسعت علم و دقت نظر، تاریخی و تنقیدی شعور اور تحقیقی بصیرت کا غماز ہے۔ اس سے اسلام اور علمائے اسلام کی صاف اور بے داغ تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ لہٰذا اگر اسے آئینہ حق نما کہیں تو راست اور بجا ہے۔

ڈاکٹر فیروز احمد

اقبال سے متعلق تین خبریں

اقبال کی شاعرانہ حیثیت سے عموماً اس صدی کے اوائل ہی میں عوام و خواص باخبر ہو چکے تھے، چنانچہ ان سے متعلق خبریں یا ان کی بعض نظموں کی اشاعت پر مدیر کی جانب سے تبصرے، جن میں کبھی کبھی اقبال کی ذاتی زندگی کا ذکر بھی آجاتا تھا' شائع ہوا کرتے تھے۔ ایسی خبریں یا تبصرے ان اخبارات و رسائل میں آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں جو تحریک خلافت کے زمانے میں شائع ہوا کرتے تھے۔ زیر نظر مضمون میں ایسی ہی تین خبروں کا ذکر کیا گیا ہے، جو ہمدرد (دہلی) میں شائع ہوئی اور حیات اقبال کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں سے پہلی خبر ہمدرد' دہلی کے ۱۳ رمئی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ عنوان ہے "سیٹھ حاجی عبداللہ صاحب کا برقی پیغام سر محمد اقبال کے نام" سیٹھ حاجی عبداللہ جمعیت خلافت کے صدر تھے اور پیغام ارسال کرنے کے وقت شملہ میں مقیم تھے۔ یہ پیغام شملہ سے ۹ رمئی ۲۷ء کو بھیجا گیا تھا۔ پیغام حسب ذیل ہے۔

"مجھے لاہور میں بے گناہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ حملہ اور بعد کے خوفناک واقعات سے بہت صدمہ ہوا ہے۔ براہ کرم مظلوم مسلمان خاندانوں کے افراد اور دونوں قوموں کے بے گناہ اشخاص کو میری دلی ہمدردی کا پیغام پہنچا دیجیے۔ میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کے جذبات کو قابو میں رکھا۔ مجھے امید ہے کہ دوسری قوموں کے لیڈر اور اخبارات امن اور ہمدردی کی فضا پیدا کرنے میں آپ کی

ڈاکٹر فیروز احمد صدر شعبۂ اردو و فارسی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور۔

مدد کریں گے۔"[1]

اس پیغام سے اندازہ ہوگا کہ خلافت تحریک کے زمانے میں اتحاد و اتفاق کی جو فضا پیدا ہوئی تھی وہ بعض وجوہ کی بنا پر مکدّر ہو چکی تھی۔ مذکورہ خبر اگرچہ لاہور سے متعلق ہے، لیکن اس قسم کی کشیدگی اس زمانہ میں ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی نظر آتی ہے، "اقبال اور سیاست ملی" کے مؤلف رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

"اقبال اگرچہ قومیت متحدہ کی حقیقت سے واقف تھے اور وہ کبھی بھی اس دام ہمرنگ کے شکار نہیں ہوئے، لیکن دل کی گہرائیوں سے وہ اس امر کے حامی تھے کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اختلافات کے باوجود اتحاد و اتفاق کی زندگی بسر کریں اور کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ملک کی یہ دونوں بڑی جماعتیں، آشتی اور یگانگت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں"[2]

۲۸-۱۹۲۷ء تک اقبال نے عملی طور پر آشتی اور یگانگت کی فضا پیدا کرنے میں جو کردار ادا کیا، اسے بظاہر کسی سیاسی حکمت عملی سے تعبیر کرنا مناسب نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ واقعتاً باہمی منافرت کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان حائل "غیریت" کے پردے کو اٹھا دیا جائے تاکہ ملک میں امن و سکون کی فضا پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت جب لاہور کے بعض سرکردہ ہندو مسلمان اور سکھ لیڈروں نے مذکورہ فساد کے بعد ایک کانفرنس منعقد کی تو اقبال اس میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ جیسا کہ بعد میں ان کی ایک تقریر سے معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کانفرنس میں یہ تجویز بھی رکھی تھی کہ ایک سب کمیٹی بنائی جائے جو شہر کے مختلف علاقوں میں جاکر باہمی تنازعات کی خرابی عوام پر واضح کرے۔ اس پس منظر میں اب دوسری خبر ملاحظہ کیجیے جو ہمدرد ۱۹۲۷ء کے ۱۶ رمئی کے شمارے میں شائع ہوئی ہے، اخبار "لاہور میں ایک اور کانفرنس" کے عنوان سے لکھتا ہے۔

"لاہور۔ ۱۳ رمئی۔ آج ۴½ بجے عصر کے وقت لاہور کے ہندو مسلم اور سکھ لیڈروں کی ایک اور کانفرنس رائے بہادر لالہ موتی ساگر کی کوٹھی واقع فیروز پور روڈ میں منعقد ہوئی۔ سر محمد شفیع صدر تھے۔ دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ، رائے بہادر لالہ رام سرن داس،

---

[1] ہمدرد، ۱۳ رمئی ۱۹۲۷ء، صفحہ ۶ [2] اقبال اور سیاست ملی، صفحہ ۱۸۷۔

سردار بہادر مہتاب سنگھ، مسٹر گنپت رائے... بیرسٹر یوسف علی، سر محمد اقبال، ڈاکٹر نند لال وغیرہ کانفرنس میں شامل تھے۔ رائے بہادر گوپال داس کو کانفرنس کا سکرٹیری مقرر کیا گیا،' اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد حسبِ ذیل تھے۔

۱۔ تمام جماعتوں میں بین اعلیٰ اتحاد اور میل ملاپ کی روح پیدا کی جائے۔

۲۔ تمام شہروں میں اتحادی کمیٹیاں مقرر کی جائیں جس کی ذیلی شاخیں بھی ہوں گی۔

۳۔ اصلی مجرموں کو سزائیں دی جائیں اور بے گناہوں کی حفاظت ہو۔

ان اغراض و مقاصد کے ساتھ جو کمیٹی قائم کی گئی اس میں ابتداً ۱۴ ممبر تھے اور کمیٹی کو یہ اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مزید اشخاص کو کمیٹی کا ممبر نامزد کر سکتی ہے، اس کمیٹی میں اقبال کا نام نویں نمبر پر درج ہے۔ اس کمیٹی یا کانفرنس نے کیا خدمت انجام دی، اس کا اندازہ اقبال کی اس تقریر سے ہوتا ہے، جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے۔ یہاں اس تقریر کے بعض اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کمیٹی کے قیام کے بعد تقریباً دو مہینہ بعد ۱۸ جولائی ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل میں فرقہ وارانہ منافرت پر ایک تحریک التوا پیش کی گئی تھی، اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے جو کچھ کہا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیٹی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی، بقول اقبال

"تجاویز کی تو کمی نہیں، لیکن ان پر عمل کرنے کے لیے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا۔ لاہور میں فسادات کے فوراً بعد مختلف خیالات اور افکار کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کمیٹی کا ایک اجلاس رائے بہادر موتی لال ساگر کے دولت کدے پر منعقد بھی ہوا تھا، لیکن مجھے بے حد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ اجلاس پہلا اور آخری اجلاس تھا، اس میں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ باہمی منافرت کو دور کرنے کے لیے کمیٹی کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیاں بنائی جائیں جن کا یہ فرض ہو کہ وہ شہر کے مختلف حصوں میں جا کر لوگوں سے باہمی تنازعات کی خرابی واضح کریں، لیکن میری تجویز کا وہی حشر ہوا جو عام طور پر اس قسم کی تجاویز کا ہوتا ہے۔ ہم نے بہت سے مقدس مباحثے کیے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔"

اس کے بعد اقبال نے ایوان سے مخاطب ہو کر کہا:

"اس ایوان میں باہمی رفاقت کے لیے دھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں مشترکہ کمیٹیاں اور مفاہمتی بورڈ بنانے کے لیے کیا کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ایوان کے سر ممبر پر میں یہ امر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ لیت ولعل سے معاملات سدھر نہیں سکتے۔ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں مزید تاخیر قطعاً نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے معلوم نہیں، اگر ممبروں کو اس امر کا احساس ہو چلا کہ حقیقتاً ہم ایک خانہ جنگی کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اگر اس خانہ جنگی کو دبانے کے لیے سخت تجاویز عمل میں نہ لائی گئیں تو تمام صوبہ کی فضا مسموم ہو جائے گی۔"[1]

ہمدرد میں اقبال سے متعلق یوں تو متعدد خبریں شائع ہوئی ہیں، لیکن یہاں آخر میں جس خبر کا ذکر ضروری ہے وہ "لاہور میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کا التوا" کے عنوان سے ۱۱ جولائی ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے، اس خبر کے مطالعے سے مولانا محمد علی جوہر اور اقبال کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور اس کا مزید ثبوت ان مضامین سے فراہم ہو جاتا ہے جو اگست ۲۷ء کے شمارے میں "طبیب حاذق۔ سر محمد اقبال کا نیا نسخہ" کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل سے قطع نظر کر کے ذیل میں مذکورہ بالا عنوان کے تحت شائع شدہ خبر کا مکمل متن درج کیا جاتا ہے۔

"لاہور۔ ۹ جولائی۔ آج رات بادشاہی مسجد میں پھر ایک زبردست اجتماع ہوا۔ تقریباً دس ہزار مسلمان اس اعلان کو سننے کی غرض سے جمع ہوئے تھے، جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لاہور کے احکامات سول نافرمانی ملتوی کرنے کے متعلق تھا اور جس کا فیصلہ مسلمانوں کی کئی انجمنوں نے جن میں خلافت کمیٹی بھی شامل ہے، کل ایک خاص جلسہ میں کیا تھا۔

ڈاکٹر اقبال کی تقریر

مولوی محمد عبداللہ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ سب سے پہلے سر محمد اقبال نے تقریر کی اور لوگوں کو بتایا کہ پیغمبر اسلام کی توہین کے معاملہ میں تمام مسلمان ایسے دریدہ دہنوں اور خبیثوں پر لعنت ملامت کرنے کے لیے ہر وقت متحد ہیں، دیگر معاملات میں ان میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، مگر

---

[1] اقبال اور سیاست ملی، صفحات ۸۸۔ ۱۸۷

جس وقت ان کے مذہب اور بانیٔ مذہب کی مقدس شخصیت پر حملہ کیا جائے گا، تو وہ سب ایک ہو جائیں گے، اس وجہ سے وہ بدل و جان ان کی اس جدوجہد میں شریک ہیں، جس کا تعلق ناموس رسول اکرم کی حفاظت سے ہے، لیکن چونکہ ان کی رائے میں خلاف ورزی قانون نامناسب نہیں، اس لیے ان کو اس معاملے میں بے حد خوشی ہوئی کہ خلافت کمیٹی نے بھی دوسری انجمنوں کے فیصلے پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیا اور سول نافرمانی کی تحریک کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت کو اس دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے محفوظ رکھیں جس نے ان کے نبیؐ کی توہین کی ہے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے احکامات کی خلاف ورزی کرکے اپنی قوت و ہمت کو صرف نہ کریں کیونکہ یہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی عزت و حرمت کی حفاظت کے مقابلہ میں بالکل ایک فروعی مسئلہ ہے، ان وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کے ان تمام نمائندوں کو مبارکباد دی جنھوں نے کل کے جلسے میں شرکت کرکے سول نافرمانی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ گورنر پنجاب نے رنگیلا رسول کے فیصلہ کے متعلق ان کے ساتھ عملی ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ ان کو اس موقع پر حکومت کی مخالفت کرکے گورنر کی ہمدردی کو ضائع نہ کرنا چاہیے اور دو تین مہینے تک صبر سے کام لے کر انتظار کرنا چاہیے تاکہ اس عرصہ میں عدالت عالیہ رسالہ "ورتمان" کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دے۔

حاضرین کی مخالفت

اس موقع پر حاضرین میں سے بعض لوگوں نے چلا چلا کر کہا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے اور ایسے مشوروں کو سننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ ان کی تقریر کو ذرا خاموشی اور سکون سے سنیں لیکن مسجد میں ہر طرف شور و شغب بلند ہو گیا جس سے مجبور ہو کر ڈاکٹر صاحب نے تقریر ختم کر دی اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اس اجتماع میں چودھری افضل حق رکن مجلس مقننہ پنجاب اور مولانا ظفر علی خاں نے بھی تقریر کی۔"

شہناز انجم

دہلی میں اُردو تعلیم کی صورت حال

(ایک رپورٹ)

انجمن اساتذہ اردو جامعاتِ ہند اردو تعلیم کی موجودہ صورت حال، مسائل اور اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہر سال ۱۳؍مارچ کو کل ہند سطح پر یوم اردو مناتی ہے۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اردو تعلیم کی موجودہ صورت حال اور مسائل کا جائزہ لینے کے لیے گزشتہ دنوں غالب اکیڈمی کے تعاون سے ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں انجمن اساتذہ اردو کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ دہلی میں اردو تعلیم کو متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

دہلی میں اردو بولنے اور پڑھنے والی آبادی کسی ایک علاقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام دہلی اسٹیٹ میں بکھری ہوئی ہے اور دہلی کے اطراف میں نئی آباد ہونے والی بستیوں میں ان کی کثیر تعداد موجود ہے لیکن دہلی اڈمنسٹریشن کی طرف سے چلائے جانے والے اسکولوں، ماڈل اور سینٹرل اسکولوں میں اردو تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے جس کی وجہ سے طلباء سہ لسانی فارمولے کے تحت تیسری زبان کی حیثیت ے اردو تعلیم سے محروم ہیں اور سنسکرت کو جدید ہندوستانی زبانوں میں شامل کرکے یہ کوشش کی جاتی ہے ، یہ طلباء اردو کے بجائے سنسکرت پڑھیں جو کسی بھی جمہوری اور سیکولر ملک اور سماج میں لسانی اقلیتوں ، ساتھ انصاف کے سراسر منافی ہے۔

اسی طرح بیشتر علاقوں میں جہاں اردو بولنے والی آبادی خاصی بڑی تعداد میں موجود ہے ابھی

اکٹر شہناز انجم، لکچرر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

تک ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے اردو میڈیم اسکول قائم نہیں کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے یہ طلبا اپنی مادری زبان کے ذریعہ تعلیم کے حق سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ بیشتر اردو میڈیم اسکول پرانی دہلی میں قائم ہیں جن کی عمارتیں بوسیدہ اور گندی ہیں اور وہاں روشنی، دھوپ، بجلی، پانی جیسی بنیادی ضرورتیں بھی موجود نہیں ہیں۔ ان اسکولوں میں طلباء کی تعداد زیادہ ہے لیکن جگہ کم ہے اور ایک ہی کمرے میں دو یا تین کلاسیں لگائی جاتی ہیں اور بعض یہ بھی نہیں ہیں۔ طلباء سردی اور گرمی میں کھلے آسمان کے نیچے ٹاٹ پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ قومی اسکول سرائے خلیل کی عمارت ایمرجنسی کے زمانے میں مسمار کر دی گئی تھی۔ لیکن اس اسکول کو آج تک متبادل جگہ اور فنڈ فراہم نہیں کیا گیا اور عیدگاہ کے میدان میں کھلے ٹینٹوں میں یہ اسکول آج بھی ایمرجنسی کے ظلم و ستم کی یاد دلاتا ہے۔ پھر کبھی طلباء ان اسکولوں میں موجود ہیں لیکن وہ کیا پڑھیں انھیں نصابی کتابیں ہی فراہم نہیں کی جاتی ہیں۔ کبھی دو چار سال میں کتابیں آتی ہیں تو ان کا سلسلہ آخری ورق کے پھٹ جانے تک جاری رہتا ہے یہاں چھپیاں اصل کتاب کو ہی ڈھک دیتی ہیں۔

اردو میڈیم اسکولوں کو ختم کرنے کی دوسری بڑی سازش یہ ہے کہ زبان و ادب کے علاوہ دیگر علوم اور مضامین کی کتابیں ہی تیار نہیں کرائی جاتیں ہیں جس کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلباء کو انگریزی کتابوں کے ذریعہ پڑھانا پڑتا ہے لیکن ستم بالائے ستم امتحان کا پرچہ غلط اردو ترجمے کی شکل میں فراہم کیا جاتا ہے اور پھر ان کی کاپیاں اردو نہ جاننے والے ممتحن کو بھیج دی جاتی ہیں اور لائق طلباء کی ذہنی صلاحیتوں اور مستقبل کے امکانات کو قتل کر دیا جاتا ہے اور اگر پانچ سات سال میں کوئی کتاب ترجمہ ہو کر آتی بھی ہے تو اس وقت جب نصاب تبدیل ہونے والا ہوتا ہے۔ پھر یہ کتابیں بھی ڈکشنری کی مدد سے کیے گئے غلط ترجموں اور غیر مانوس ثقیل اصطلاحات سے بوجھل ہوتی ہیں اور بریکٹ میں انگریزی اصطلاحات نہیں لکھی جاتی ہیں۔ نصابی کتابوں کے ساتھ ایسی دھاندلی شاید ہی دنیا کے کسی حصہ میں کی جاتی ہو گی۔ ایسی صورت میں صرف یہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اساتذہ خود ہی ان کتابوں کا ترجمہ کر کے شائع کرائیں لیکن اس کے لیے فنڈ کے علاوہ کتابوں کی صحت اور معیار کو برقرار رکھنے کے لیے کمیٹی کی ضرورت ہے۔

اردو میڈیم اسکولوں کے خلاف ایک سازش یہ بھی کی جا رہی ہے کہ وہاں خالی جگہوں پر کوئی

[illegible] کیا جاتا ہے۔ [illegible] اگرچہ دلی اردو اکادمی محدود سطح پر کوشش کرتی رہی اور وہ عارضی طور پر کچھ اساتذہ کو وہاں بھیج دیتی ہے لیکن ان کو ریگ ٹیچر کے مقابلے ایک تہائی سے بھی کم معاوضہ دیا جاتا ہے اس لیے یہ ٹیچر بھی بادل نخواستہ ہی پڑھاتے ہیں اور اب جب سے اردو اکادمی کے بجٹ میں کٹوتی ہوئی ہے اس نے اس سلسلہ کو بھی مختصر سے مختصر کر نا شروع کر دیا ہے۔ بلکہ کارپوریشن کے اسکولوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ دلی اردو اکادمی کے ٹیچر کو اپنے یہاں نہ لگائیں۔

اردو میڈیم اسکولوں کو ختم کرنے اور انھیں ہندی میڈیم اسکول میں تبدیل کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ ان میں ہندی میڈیم سیکشن کھولے جارہے ہیں بلکہ اردو اساتذہ کی جگہ اردو نہ جاننے والے اساتذہ کا تقرر بھی کیا جاتا ہے اور چشمہ بلڈنگ گرلز اسکول، زینت محل گرلز اسکول میں ایسے ہیڈ مسٹریس کا تقرر کیا گیا ہے جو اردو نہیں جانتی ہیں اور انھیں اردو تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اردو میڈیم اسکولوں میں اردو نہ جاننے والے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر کے تقرر کے سلسلہ میں مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک یہ سلسلہ جاری ہے اور سینیر اساتذہ کے قحط کو بہانہ بنایا جارہا ہے جب کہ اردو اساتذہ کو ان کی میرٹ اور سینیرٹی کے مطابق ترقی سے بھی محروم رکھا جاتا ہے۔ ان اردو میڈیم اسکولوں کے تعلیمی مسائل کو جاننے اور ان کو معیار کو بہتر بنانے کے لیے بھی گزشتہ پینتالیس سال سے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اسکولوں کے معائنہ کے لیے اردو دال انسپکٹر آف اسکول بھی مقرر نہیں کیے گئے ہیں اور نہ ہی ان کے لیے اردو بورڈ قائم کیا گیا ہے

دہلی میں اردو میڈیم کالج نہ ہونے کی وجہ سے وہ طلبہ جو پرائیوٹ طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی۔ اے کرنا چاہتے ہیں خصوصاً لڑکیاں۔ ان کے لیے کوئی ایسا کوچنگ سینٹر نہیں ہے جہاں سے یہ طالبات رہنمائی حاصل کر سکیں۔ انجمن اساتذہ اردو اور انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مطالبہ پر کئی سال قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بی۔ اے کی سطح پر اردو میڈیم کارسپانڈنس کورس کی ایک تجویز وزارتِ تعلیم کے سامنے پیش کی تھی لیکن وہاں سے اب تک منظوری نہ ملنے کی وجہ سے یہ کورس بھی شروع نہیں کیا جا سکا ہے جس کی اس وقت سخت ضرورت ہے۔ ہندوستان میں اس وقت، ۳ کارسپانڈنس کورس چلائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کورس میں اردو میڈیم طلبہ کے لیے سہولتیں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یہ کورس جلد سے جلد شروع کرنا چاہیے۔

بحث میں حصہ لیتے ہوئے عزیز و بخت احمد صاحب نے حاضرین کی توجہ اردو میڈیم اسکولوں کے

تعلیمی معیار کی طرف مبذول کرائی اور کہا کہ ان اسکولوں کا معیار تسلی بخش نہیں ہے لیکن اگر ہمارے اساتذہ دلچسپی لیں تو ان اسکولوں کا معیار نہ صرف بہتر ہو سکتا ہے بلکہ یہ دیگر اسکولوں سے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن صاحب نے دہلی میں اردو تعلیم کے مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو والوں کے پاس صرف تین راستے ہیں۔ انھیں اردو کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے نہ صرف اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہیے بلکہ اب تک اردو کو جو سہولتیں حاصل ہیں ان کی حفاظت اور نگرانی بھی کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے اوپر اعتماد کا سبق بھی سیکھنا چاہیے اور اپنے بچّوں کی اردو تعلیم کا نہ صرف خود بندوبست کرنا چاہیے بلکہ اپنے تعلیمی ادارے بھی قائم کرنے چاہئیں۔ اپنی مادری زبان کی تعلیم اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہر عورت اور مرد پر فرض ہے۔ اس جلسہ میں جناب انوار انجم، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر بتول گیلانی، ڈاکٹر علی جاوید، ضمیر احمد صاحب، جناب ذہین حسن نقوی وغیرہ حضرات نے حصّہ لیا۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل تجاویز بھی منظور کی گئیں۔

انجمن اساتذہ اردو کا یہ جلسہ سرکار سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ (۱) اردو کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے (۲) دہلی کے تمام اسکولوں سرکاری، نیم سرکاری ماڈل اور سینٹرل اسکولوں میں اردو بطور اختیاری مضمون کی حیثیت سے تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور ان اسکولوں میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ (۳) دہلی کے اردو میڈیم اسکول کے مسائل، عمارت، نصاب، اساتذہ وغیرہ کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔ (۴) اردو میڈیم اسکول کے معائنہ کے لیے اردو داں انسپکٹر آف اسکول مقرر کیے جائیں اور امتحانات کے لیے اردو بورڈ کی تشکیل کی جائے۔ (۵) چشمہ بلڈنگ اور زینت محل کے اسکولوں سے اردو نہ جاننے والے اساتذہ کا فوراً تبادلہ کیا جائے۔

انجمن اساتذہ اردو کا یہ جلسہ دلی اردو اکادمی سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ (۱) دہلی میں اسکولوں اور کالجوں میں اردو تعلیم کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک جائزہ کمیٹی مقرر کی جائے اور اس کی رپورٹ شائع کرائی جائے۔ (۲) دہلی کے اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے پنجابی اکیڈمی کی طرح اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے اور انھیں معقول مشاہرہ دیا جائے۔

(۳) دلی اردو اکادمی دہلی میں اسکولوں میں اردو تعلیم کا بندوبست کرنے کے لیے دہلی ایڈمنسٹریشن پر زور ڈالے۔

انجمن اساتذہ اردو کا یہ جلسہ بیورو فار پروموشن آف اردو سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ (۱) اردو کے نصابات اور نصابی کتابوں کا جائزہ لے کر طلباء کی ضرورت کے پیش نظر موزوں اور مناسب کتابیں شائع کرائے اور زبان و ادب کے علاوہ دیگر مضامین کی کتابیں اردو میں تیار کرانے اور فراہم کرنے کی کوشش کرے (۲) اردو اساتذہ کے لیے ہر سطح پر اردو اور اردو کے ذریعہ دیگر علوم و فنون سکھانے کے لیے تربیتی کورس چلائے اور ان کے لیے مناسب کتابیں فراہم کرے (۳) اردو بولنے والی آبادی میں تعلیم بالغان کے لیے مرکز چلائے اور ان کے لیے کتابیں فراہم کرے۔ اور اس مقصد کے لیے منصوبہ بنا کر سرکار کے سامنے پیش کرے۔

انجمن اساتذہ اردو کا یہ جلسہ دہلی یونیورسٹی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے کارسپانڈنس کورس میں ایم۔ اے کی سطح پر اردو کو بھی شامل کرلے اور ساؤتھ کیمپس کے کسی کالج میں اردو تعلیم کا بندوبست کرے۔

انجمن کا یہ جلسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اردو میڈیم طلبہ کی سہولت کے لیے اپنے یہاں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی سطح پر اردو میڈیم کارسپانڈنس کورس جلد شروع کرائے۔

اس جلسہ میں دہلی یونیورسٹی، جواہرلال نہرو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے اسکولوں کے طلباء، اساتذہ اور اردو دوست حضرات نے شرکت کی اور مجلس صدارت کے فرائض پروفیسر محمد حسن پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر شریف احمد اور پرنسپل اختر الحسن صاحب نے انجام دیے۔

سہیل احمد فاروقی

ہندی اردو ادب پر سمینار

(رپورتاژ)

۳۰ر مارچ ۱۹۹۲ء کو ہندی اکادمی دہلی اور بزم اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ہندی لسانی خطّے کی بیداریٔ نو اور ہندی اردو ادب پر ایک موضوعی نشست کا انعقاد جامعہ کے کانفرنس ہال میں شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب کی زیر صدارت ہوا جس کا افتتاح ہندی کے معروف محقق پروفیسر نامور سنگھ (جے۔این۔یو) نے کیا۔ ناظم جلسہ ڈاکٹر عبدل بسم اللہ نے شرکاءِ نشست کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آج ہندی اردو ادب کے ایک تقابلی موضوع پر گفتگو اور تبادلۂ خیال کرنے کی دیرینہ خواہش پوری ہو رہی ہے۔ موضوع کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر مجیب رضوی صاحب، شعبۂ ہندی نے سامعین کو بتایا کہ اس سیمینار کی تحریک ڈاکٹر عبدل بسم اللہ کے ایک حالیہ مضمون سے ہوئی ہے جس میں انھوں نے یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ اردو اور ہندی زبان و ادب میں نشاط ثانیہ کا کیا تصور ہے اور اس کے آغاز و ابتداء کے کون سے پیمانے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔
انھوں نے کہا کہ اس موضوع کے کئی پہلو ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یورپ کی تاریخ کو نظر انداز کر کے فرض کر لیا جائے کہ نشاۃ ثانیہ جیسا کوئی واقعہ ہمارے یہاں ہوا ہے تو پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر یہ نشاۃ ثانیہ ہے تو بذات خود نشاۃ کیا تھا جس کی تجدید یا حیات نو رونما ہوئی، ہندی میں یہ دور وحدانیت مخالف تحریک سے شروع ہوتا ہے یا اردو میں شاہ ولی اللہ یا سرسیّد سے۔

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی لکچرر شعبۂ اردو نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے سیاست، معاشیات، ادب و تاریخ پر یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے مختصر ذکر کے بعد اردو کے مؤرخین کے

حوالہ سے کہا کہ اردو زبان و ادب میں نشاۃ ثانیہ کی ابتداء سرسید سے ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ سرسید کے خاندان کے بزرگ دربار مغلیہ سے وابستگی کے باعث ان سماجی و اخلاقی خرابیوں سے واقف تھے جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب بنیں۔ سید احمد شہید کی تحریک حریت کی ناکامی سرسید کے لیے ایک تازیانہ تھی جس نے انھیں احساس دلایا کہ مذہب کی تلوار غلامی کی بیڑیوں کو کاٹ نہ سکے گی اس لیے انھوں نے علاج بالعلم کا طریقۂ کار اختیار کیا اور مسلمانوں کا سیاست سے پرہیز کرنا ہی انھیں بہتر معلوم ہوا اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کے متعین خد و خال کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تعلیم کی دیرپا قوت کو اجاگر کرنا ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر عثمانی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سرسید کے مذکورہ بالا اقدامات کی کشش کا اندازہ ان شخصیات کے افکار و افعال سے ہوتا ہے جو سرسید سے قریب آئیں۔ الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی اور وقار الملک ان سب حضرات کے کام وقت کے تینوں منطقوں کو ایک ایسی ڈور میں پرونے کی کوشش ہیں جو انھیں ایک جگہ متحد کر دیتے ہیں۔ اس دور میں ناموران مشرق کے کارناموں کی بازیافت اور مہابھارت و رامائن کے ترجمے وغیرہ فکری عمل کے پہلو بہ پہلو اسالیب کو متاثر کر رہے تھے۔ عثمانی صاحب نے مزید کہا کہ سرسید تحریک کی پیدا کردہ نشاۃ ثانیہ نے ایسے اسالیب دیے جو ناقابل تقلید ہیں اقبال اور آزاد کے دور تک انگریزوں کو مزید حکمت عملی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ وہ یگانگت اور اتحاد کی گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد چکبست اور پریم چند نے حصول آزادی کے جذبہ کو فروغ دیا۔ اسی حساس فضا میں ترقی پسند تحریک نے اپنے بال و پر کھولے اور حصول آزادی کے موضوع سے وابستہ چھوٹے بڑے ناموں کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جن کے قلم کی روشنائی نے بتایا کہ مشرق کی جھولی میں بھی ایسے جواہر پارے ہیں جو آنکھوں کو خیرہ کر سکتے ہیں۔ موصوف نے اس امر پر اظہار تاسف کیا کہ ملک کی آزادی کے لمحۂ خیر میں نشاۃ ثانیہ کی فکری اساس میں کوئی ایسا رخنہ پڑ گیا کہ ہم چکبست، پریم چند اور فراق کی زائیدہ روشنی سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکے ہیں اور اس اساس کی پرداخت میں ادھر قرۃ العین حیدر اور ادھر انتظار حسین تنہا نظر آتے ہیں۔

پہ رفیسہ عنوان ہتنٹی ٹی دین نیکلٹی آف میڈ منیٹر اینڈ لینگویجیز نے پروفیسر مجیب رضوی صاحب

کی پر مغز گفتگو کے حوالہ سے فرمایا کہ رضوی صاحب نے بعض اہم گوشوں کو مَس کیا ہے ۔ پروفیسر چشتی صاحب نے کہا کہ اردو میں نشاۃ ثانیہ پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں امیر خسرو پر اس گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ کی حیثیت سے بھی نظر ڈالنی چاہیے جو ایک عرصہ تک مسلمانوں کے یہاں رچ بس جانے کی بنا پر وجود میں آئی اور جس میں کہہ مکرنیاں، پہیلیاں اور ریختہ جیسی اصناف نے جنم لیا۔ اس کے علاوہ یہ کہ جس دور میں سر سیّد اپنی کوشش کر رہے تھے اس وقت اردو اور ہندی ذہنوں کو متاثر کرنے والی کئی متوازی تحریکیں روبہ عمل تھیں جیسے ایہام گوئی کی تحریک، ہندی الفاظ کے کثرت استعمال پر زور، اصلاح زبان اور اصلاح سخن کی تحریک۔ چشتی صاحب نے اس اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اسلامی فلسفہ اور ویدانتی تصورات کے ملاپ سے عظمتِ آدم کے تصور کو فروغ ملا جو شعر و ادب کا ایک وسیع موضوع بنا۔

پروفیسر وشوناتھ ترپاٹھی نے ہندی میں مستعمل نشاۃ ثانیہ سے ملتی جلتی تین اصطلاحات لوک جاگرن، پنر جاگرن اور نوجاگرن کے حوالہ سے جن پر ڈاکٹر رام ولاس شرما اور پروفیسر نامور سنگھ نے بہت کچھ لکھا ہے یہ خیال ظاہر کیا کہ لوک جاگرن اور نوجاگرن میں فرق ہے۔ لوک جاگرن میں ماورائیت بہت ہے اور ارضیت حاشیہ پر ہے جب کہ نوجاگرن کا محور ارضیت ہے اور مذہبیت حاشیہ پر ہے۔ ترپاٹھی صاحب نے یہ بھی کہا کہ غالب حالی کے مقابلے میں بھارتیندو ہریش چند سے زیادہ قریب ہیں کیونکہ وہ مستقبل کو لبیک کہتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کی تلاش کی ہے۔

پروفیسر نامور سنگھ نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ ہمارا ملک عظیم اس لیے ہے کہ اس میں یکسانیت نہیں ہے سب کے مفاد یکساں نہیں ہیں اس لیے نشاۃ ثانیہ کے مطالعہ میں عوام کے مفادات کے مابین تفاعل کو مدنظر رکھنا چاہیے مثلاً یہ کہ اردو اور ہندی کے درمیان فرق قدرتی تھا اور انگریزی کی سازش کا زائیدہ نہیں تھا۔ آزادی کے سیاسی تصوّر نے پورا نقشہ پلٹ دیا جس نے نوجاگرن کو لوک جاگرن کو شکل دے دی اور یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موضوع کی توسیع ہمیں جا بجا ادب میں دیکھنے کو ملتی ہے اور اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک جنگِ آزادی اقتدار شکن تحریک تھی۔ تحریک جنگ آزادی کے دور کے ایک حصّہ میں عوام میں اتنا جوش پیدا ہوا کہ اردو اور

ہندی دونوں طبقے ایک فیصلہ پر متحد ہو گئے۔ پروفیسر نامور سنگھ نے ۱۹ ویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں بعض اہم نکات کی نشاندہی بھی کی ہے مثلاً یہ کہ مذکورہ صدی کے نشاۃ ثانیہ پر غور کرنا اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ہندی لسانی خطہ پر پھر بوجھ آ پڑنے والا ہے ملک کو جوڑنے یا بانٹنے کا جس کے لیے ہندو احیاء پرستی اور اسی بنیاد پرستی کے درمیان کوئی راہِ اعتدال اختیار کرنا ہوگا انھوں نے کہا کہ یورپی مستشرقین کے دیے ہوئے تصور نشاۃ ثانیہ کا جائزہ لینا بھی ایک اہم کام ہوگا جن کا خیال ہے کہ عہد حاضر میں علوم کی تمام تر توسیع انگریزوں کی عطا کردہ ہے اس ضمن میں موصوف نے [illegible] talists and [illegible] کتاب کا خاص طور پر حوالہ دیا جس کی رو سے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد مستشرقین نے ڈالی اور اگر ایشیاٹک سوسائٹی نہ قائم ہوتی تو ہندی اردو میں علم و دانش کا فروغ نہ ہوتا۔ اس سے پروفیسر نامور سنگھ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انگریزوں نے ہندوستان کے ماضی کو تلاش کرنے کی سعی کی لیکن ہمیں ایک دوسرے سے توڑنے میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی اس لیے مستشرقین کا مطالعہ جو بیشتر حقائق پر مبنی نہیں ہے بلکہ مفروضوں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے اسے تاریخ نہ سمجھا جائے اور اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر سر سید کو ۱۹ ویں صدی کے نشاۃ ثانیہ کا مرکز تسلیم کیا جائے تو کچھ مناسب نہ ہوگا کیوں کہ ان کے شانہ بشانہ اپنے افکار کے ساتھ اسی دور میں شبلی اور حالی بھی تھے جنھیں قدامت پرست کہہ کر بھلا دیا گیا اور جن کے افکار کا از سر نو مطالعہ کرنا چاہیے۔

پروفیسر شمیم حنفی صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں نشاۃ ثانیہ کا تصور ایک سحر کی حیثیت رکھتا ہے جس کا ٹوٹنا ضروری ہے اور اس کا تصور وسیع تناظر کے بغیر متعین ہی نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کے دائرہ کار میں سماج، اقتصادیات، تاریخ، ادب، سیاست سب کچھ آتے ہیں۔ حنفی صاحب نے اس پر زور دیا کہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا مشعل بردار غالب کو مانا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کا بیشتر حصہ ۱۹ یا ۲۰ سال کی عمر تک غدر سے پہلے مکمل کر لیا تھا اور ۱۸۴۰ء کے بعد کے زمانے میں انھوں نے خود کو شعر گوئی سے الگ کر لیا تھا جب کہ سر سید کو اپنی راہ اس وقت تک نہیں ملی تھی۔ غالب نے سر سید کی آئین اکبری پر جو تقریظ سفر رام پور کے دوران لکھی اس میں زبردست تخلیقی پیغام پوشیدہ ہے۔ حنفی صاحب نے کہا کہ نشاۃ ثانیہ کو مغرب کا بدل سمجھ لینا بھی مناسب نہیں ہے۔

کیوں کہ آزاد، حالی، وسرسید نے مغرب کو منزل نہیں بلکہ وسیلہ سمجھا تھا۔ حنفی صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ادب کی اپنا رد دل ادا کرنے کی صلاحیت اس لیے انحطاط پذیر ہوئی ہے کہ سیاست پر ادب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے، ادب لکھنے اور پڑھنے والوں کی مساوی تعداد نے ادب کو ایک اقلیت بنا دیا ہے اس طرح کہ وہ ذاتی عمل ہو کر رہ گیا جب کہ یہ تہذیبی عمل ہے۔ اس کے علاوہ روایت جو انسانی تخلیق کا ایک بڑا دائرہ ہے ان سے ہم نے رشتہ توڑ لیا ہے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ نے سمینار کے موضوع کو ایک وسیع موضوع قرار دیتے ہوئے اد میں غدر کے حوالے سے مختصر گفتگو کی اور بعض سوالات کی وضاحت بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ دا کی شاعری تک اردو میں غدر کا ذکر نہیں ہے لیکن غدر کی معنویت ادب میں ہے۔ تاہم ی ضروری نہیں کہ کسی خاص واقعہ کا ذکر ادب میں ہو۔ زوالِ بغداد، غرناطہ، دہلی، قسطنط اور تقسیم ہند جیسے قومی سانحوں کا براہ راست اثر رجحانات، خیالات اور جذبات پر پڑا ہے

ڈاکٹر نریندر یادو نے یہ خیال ظاہر کیا کہ نیر جاگرن کی ابتدا اصلاً بنگال سے ہوتی ہے جس کا مقصد استعماری تہذیب کی مخالفت تھی۔ انھوں نے کہا کہ شمالی ہند میں دو طر سے بیداری آئی ایک مسلم کلچر کے ساتھ اور دوسری ہندو کلچر کے ساتھ۔ ان کا یہ بھی خیال تھا نیر جاگرن کی بہتر بن شکل مہاراشٹر میں ابھرتی ہے جہاں شودر یا نچلے طبقے کے لوگ جن جاگرن لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے دلت ساہتیہ جیسا مہاراشٹر میں دیکھنے کو ملتا ہے ویسا کہیں اور نہیں۔

جبین انجم

احوال و کوائف

الازہر یونیورسٹی کے وفد کی جامعہ میں آمد

۳۰ مارچ ۱۹۹۲ء کو مصر کی الازہر یونیورسٹی کے ایک سہ رکنی وفد نے جامعہ کا دورہ کیا۔ وفد کے ممبران تھے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز، سیف النہار عبدالعزیز پروفیسر شعبۂ فلسفہ، ڈاکٹر محمد حسین توفیق پروفیسر و نائب صدر شعبۂ تحقیق درسات العلیہ (گروپ لیڈر) اور انڈسٹریل انجینئرنگ بائیو ٹکنالوجی کے پروفیسر اے۔ النورانی۔

جامعہ کے ماس کمیونکیشن اینڈ ریسرچ سنٹر کے ہال میں ایک استقبالیہ تقریب منعقد کی گئی جس میں شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے جامعہ کی مختلف فیکلٹیوں اور شعبوں کے سربراہان و اساتذہ کا تعارف مہمانوں سے کرایا۔ ان میں خصوصی طور پر نائب شیخ الجامعہ پروفیسر مشیر الحسن صاحب جناب انور جمال قدوائی، پروفیسر حبیب الرحمٰن قدوائی، پروفیسر ماجد علی خاں، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر اقبال حسین خاں، محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ۔ جناب ضیاء الحسن ندوی (صدر شعبۂ عربی) ڈاکٹر زبیر فاروقی، پروفیسر اوصاف احمد، پروفیسر آزاد فاروقی (صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز) اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید جمال الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ الجامعہ نے مختصر طور پر جامعہ کی تاریخ سے آگاہ کرایا اور بتایا کہ جامعہ کو ابھی ترقی کی کئی اور منزلیں طے کرنی ہیں۔ جن میں ماس کمیونکیشن اینڈ ریسرچ سینٹر اور انجینئرنگ و ٹکنالوجی وغیرہ کو خاص اہمیت دی جائے گی۔

وفد کے سربراہ جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد حسین توفیق نے یہ خواہش ظاہر کی کہ دونوں ملکوں کو

ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ایک دوسرے کے کلچر اور تہذیب کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سیمینار، کانفرنس، سمپوزیم اور دوسری ادبی تقریبات کا وقتاً فوقتاً اہتمام کریں جس کی حاضرین جلسہ نے تائید کی۔

انجمن طلبائے قدیم جامعہ کی جانب سے افطار کا اہتمام

۲۰ اپریل بروز جمعرات انجمن طلبائے قدیم جامعہ کی جانب سے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں افطار کا اہتمام کیا گیا جس میں شیخ الجامعہ جناب بشیر الدین احمد صاحب، فیکلٹیوں کے ڈین صاحبان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر اور جنرل سکریٹری جناب خواجہ شاہد صاحب اور جناب چودھری راحت محمود صاحب نے شرکت کی۔ انجمن طلبائے قدیم کے قیام کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب انجمن نے افطار کا اہتمام کیا تھا اور حسب توقع طلبائے قدیم نے کثیر تعداد میں شرکت کی کھلکر ہوئی، ملاقاتیں ہوئیں اور یہ اصرار بھی کہ جلدی جلدی ملتے رہیں گے۔

مشاعرہ

۲۳ اپریل بروز اتوار ۲ بجے دوپہر انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملیہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کے اشتراک سے مشاعرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت مشہور ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری نے کی مشاعرہ کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر سید جمال الدین سکریٹری انجمن طلبائے قدیم جامعہ نے انجام دیے۔

جناب صدر علی سردار جعفری نے علی گڑھ اور جامعہ کو دو ایسی مشعلیں بتایا جن کی روشنی سے تمام ہندوستان جگمگا رہا ہے۔ اردو کو جو روشنی ان اداروں نے دی اس کا سب ہی کو اعتراف ہے۔ اردو کی سربلندی کا سہرا ان ہی دونوں اداروں کے سر ہے جس کا اثر تمام ہندوستان پر پھیلا ہوا ہے۔ اردو کو مزید فروغ دینے کے لیے جناب صدر نے شعر فہمی کی تربیت پر مزید زور دینے کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیوں میں بیت بازی کے پروگرام ہوتے رہنا چاہئیں اس سے کافی حد تک اردو کو فروغ ملے گا۔ چونکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے اس لیے اپنے شعبہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اردو کے زیادہ سے زیادہ پروگرام کرائے جائیں شعر خوانی کی تربیت بھی دی جائے جدید شاعری اور جدید شعراء پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جدید شاعروں

میں ندا فاضلی کا لہجہ ایک نیا انداز لیے ہوئے ہے۔ لب و لہجہ کی اس جدیدیت کے باوجود اعلیٰ درجے کی شاعری سبک خیالی کے ساتھ تلخیوں کا ذکر بھی اُن کی ایک خاص خوبی ہے۔

تاباںؔ صاحب کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے جناب علی سردار جعفری صاحب نے بتایا کہ تاباںؔ کی شاعری اعلیٰ درجے کی کلاسیکی شاعری ہے۔ جو دل اور دماغ دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آئندہ مشاعرے میں شیخ الجامعہ کی موجودگی ہمارے لیے باعث فخر ثابت ہوگی۔

ڈاکٹر سید جمال الدین سکریٹری انجمن طلبائے قدیم جامعہ نے اپنے ابتدائی کلمات میں کہا کہ ملک میں اردو کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے ادبی و ثقافتی محفلوں کے انعقاد سے بڑی مدد ملے گی۔ اس مقصد کے تحت ہم جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کے اشتراک سے یہ مشاعرہ منعقد کر رہے ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ دونوں انجمنیں آئندہ بھی تعاون و باہمی اشتراک سے ثقافتی پروگرام منعقد کرتی رہیں گی۔

اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں صرف ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ پاکستان سے بھی کچھ شعراء تشریف لائے تھے جن میں جناب قتیل شفائی صاحب۔ جناب سید امروہوی اور جناب عمر جمالی صاحب شامل تھے۔

ہندوستان کے جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان کے نام ہیں۔ جناب علی سردار جعفری، جناب غلام ربانی تاباں، جناب ساغر خیامی، جناب ندا فاضلی، محترمہ ممتاز بیگم، محترمہ سیدہ شان معراج، جناب بریرہ درشنی ٹھاکر، جناب احسن الہ آبادی، جناب نور اندوری، جناب محمد علوی، جناب اسرار جامعی، جناب اکمل اجمل اور جناب فرحت احساس صاحب شامل تھے۔

مشاعرہ کے اختتام پر جناب چودھری راحت محمود جنرل سکریٹری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر نورالحسن انصاری میموریل لکچر

۸ر اپریل ۱۹۹۲ء کو فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز کے سمینار روم میں شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام

پروفیسر شعیب اعظمی کی زیر صدارت دوسرا پروفیسر نورالحسن انصاری میموریل لکچر منعقد ہوا جس میں پروفیسر امیرحسن عابدی (پروفیسر امریٹس) نے منتخب سعید کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس موقع پر ایم۔اے فارسی کے طلباء کی جانب سے پروفیسر شعیب اعظمی کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے پر اور پروفیسر عابدی کو پدم شری کا ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کی گئی اور ان کو ہار پہنائے گئے۔ خصوصی مہمانان کی حیثیت سے پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز اور پروفیسر مجیب رضوی سابق نائب شیخ الجامعہ نے شرکت کی۔ اس نشست کا آغاز پروفیسر اعظمی کے صدارتی کلمات سے ہوا اور پروفیسر شریف الحسن قاسمی (دہلی یونیورسٹی) نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

پروفیسر عابدی نے اپنے مقالہ کی ابتدا میں یہ بتایا کہ پروفیسر نورالحسن انصاری مرحوم ان کے پی۔ایچ۔ڈی کے پہلے شاگرد تھے اور انھوں نے ایک کتاب منتخب سعید انگریزی میں تصنیف کی تھی اور اسی کا تعارف وہ اس لکچر میں کرائیں گے۔ نورالحسن انصاری مرحوم دہلی یونیورسٹی کے وہ پہلے طالب علم تھے جو پی۔ایچ۔ڈی مکمل کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تہران یونیورسٹی گئے جہاں انھوں نے "تحفتہ الہند" کی تحقیقی و تنقیدی تدوین پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس سے قبل ۲۰ر فروری ۱۹۹۱ء کو دہلی یونیورسٹی میں پہلا پروفیسر نورالحسن انصاری لکچر فارسی کے معروف عالم و محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب نے دیا تھا۔

اس موقع پر فارسی کی کتب اور مخطوطات کی ایک نمائش ذاکر حسین لائبریری میں لگائی گئی جس کا افتتاح پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز اینڈ لینگویجز نے کیا۔

بزم عربی و بزم اردو کی الوداعی تقریبیں

۲۵ر اپریل شعبہ عربی میں جناب سید ضیاء الحسن ندوی کی زیر صدارت "النادی العربی الادبی" کا سالانہ "الوداعی جلسہ" منعقد ہوا۔ دیگر عرب مہمانوں کے علاوہ سفارت خانہ شام ناظم الامور جناب سید علی کرمچی نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔

سکریٹری "النادی العربی"، مسٹر شفیق احمد نے سالانہ رپورٹ اور فضل الرحمٰن (بی۔اے سال اوّل) "النادی لائبریری" کے متعلق ایک رپورٹ پیش کی۔ شمیم عالم (بی۔اے سال دوم) نے فارغ ہونے لے طلباء کو خطبۂ الوداعیہ پیش کیا اور فارغ التحصیل طلباء کی نمائندگی کرتے ہوئے فضل الرحمٰن

(بی۔اے سال سوم) نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

اس موقع پر ہندوستان میں عربی زبان و ادب کے موضوع پر تحریری انعامی مقابلہ میں کامیاب ہونے والے طلباء نے اپنے مقالاجات عربی میں پیش کیے۔ مسٹر شمس کمال انجم بی۔اے آنرز سال اول نے پہلا، سید محمد عرفان کوٹی نے دوسرا انعام حاصل کیا۔

صدر شعبۂ عربی جناب سید ضیاء الحسن ندوی و نگراں "النادی العربی" ڈاکٹر شفیق احمد ندوی نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے کلمات کہے۔ جلسہ کی تمام کارروائی عربی میں ہوئی۔ نظامت کے فرائض مسٹر امین ندوی بی۔اے سال سوم نے انجام دیے۔

۲۸ اپریل شعبۂ اردو میں ایم۔اے فائنل اور بی۔اے فائنل کے طالب علموں کو بی۔اے سال اول، سال دوم اور ایم۔اے سال اول کے طالب علموں نے الوداعیہ دیا جس میں فارغ التحصیل طالب علموں اور اساتذہ کو ان کی شخصیت کارکردگی اور صلاحیت کی مناسبت سے اشعار اور ٹائیٹل بھی دیے گئے۔

اس تقریب میں صدر شعبہ پروفیسر حنیف کیفی قریشی کے علاوہ پروفیسر قرۃ العین حیدر۔ پروفیسر شمیم حنفی، محترمہ ڈاکٹر صغرا مہدی صاحبہ، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، محترمہ ڈاکٹر شہناز انجم صاحبہ، ڈاکٹر عبید الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شمس الرحمٰن عثمانی، اور جناب خالد محمود صاحب شامل تھے۔

جلسے کی صدارت پروفیسر حنیف کیفی نے کی جس میں انھوں نے طلباء سے یہ امید ظاہر کی کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں بھی اسی طرح ہر امتحان میں کامیابیاں حاصل کرتے رہیں گے۔

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے ایک رپورٹ پیش کی جس میں انھوں نے شعبہ میں ہونے والی سالانہ کارکردگی پر روشنی ڈالی اور ان خامیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی جو اس سال شعبہ میں دیکھنے کو ملیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم شعبۂ اردو میں وقتاً فوقتاً سمینار منعقد کرائیں جن سے ہمارے طلباء زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔ انھوں نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ وہ آئندہ سال زیادہ سے زیادہ سمینار منعقد کرانے کی کوشش کریں گے۔

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹	بابت ماہ جون ۱۹۹۲ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

مجلس مشاورت

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

ہندوستان میں اسلام کی ایک شکل قدیم خانقاہوں میں نظر آتی ہے جہاں شریعت وطریقت کی آمیزش سے آفاقی اسلامی مسلک انسانیت کا درس دیا جاتا ہے۔ یہ خانقاہیں قدیم ہیں اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں موجود ہیں۔ ان خانقاہوں سے جو صوفیانہ ادب جاری وساری ہوا اس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ان کا تعارف عام ہوا۔ تاریخی پس منظر میں ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی، دینی وروحانی زندگی کی تشکیل میں ان خانقاہوں کا کیا حصہ رہا ہے اس وسیع موضوع پر تحقیق کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے۔ البتہ خانقاہی نظام سے وابستہ ایک ایسا گوشہ بھی ہے جس پر کم توجہ دی گئی ہے، اسے ہم 'مقبول اسلام' کہہ سکتے ہیں۔ 'مقبول اسلام' کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ اسلام کی وہ شکل ہے جسے بلا تفریق مذہب وملت عوام نے کسی مرد درویش کو محور بنا کر متشکل کیا ہے۔ 'مقبول اسلام' کی ایسی ہی ایک شکل ہم نے یکم مئی کو شملہ (ہماچل پردیش) میں دیکھی۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ بھی اس پر نگاہِ آفریں ڈالیں۔

تین اداروں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شملہ، نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی اور اَربن ہسٹری ایسوسی ایشن آف انڈیا، گرونانک دیو یونیورسٹی امرت سر کے زیر اہتمام شملہ میں ۲۸ر اپریل تا یکم مئی کل ہند سطح کا ایک سمینار منعقد ہوا، موضوع تھا۔

The Small Town in Indian History and Rural-Urban Networks

اول الذکر ادارہ میزبان تھا۔ یکم مئی جمعہ کا دن تھا اور ہمیں تشویش تھی کہ نماز جمعہ کہاں ادا کی جاسکے گی۔

ہمیں معلوم ہوا کہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی جہاں واقع ہے اس سے ذیلی سطح پر بالوگنج محلّہ ہے جہاں مسجد ہے لہٰذا جمعہ کی نماز وہاں ادا کی جاسکتی ہے۔ ہم نے ایک شخص سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ دریافت کیا، اس نے صحیح سمت بتا کر بڑی لجاجت سے کہا ہمارے لیے دعا کرنا۔ ہم نے کہا ضرور۔ اس نے بات بڑھاتے ہوئے کہا وہاں نیچے ایک مزار بھی ہے، گھوڑاچو کی مزار، ہم ہر جمعہ وہاں چراغی کرنے جاتے ہیں۔ ہمیں اشتیاق ہوا ہم نے اس سے درخواست کی کیا ہمیں وہاں لے چلوگے۔ اس نے کہا ضرور آج ہی شام۔ نماز جمعہ بالوگنج کی مسجد میں ادا کی۔ مشکل سے، بچّوں سمیت بیس پچیس نمازی رہے ہوں گے۔ ایک صاحب نے ہم سے تعارف چاہا اور ہم نے دوران گفتگو ان سے مذکورہ مزار اور صاحب مزار کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن وہ کچھ زیادہ واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کا مزار پر جانا ہوا تھا۔ البتہ ان کا کہنا تھا کہ وہاں ہر مذہب کے لوگ جاتے ہیں اور خاص طور سے ہندو بہت معتقد ہیں۔ ہمارا اشتیاق بڑھتا رہا، شام ہم اپنے گائڈ کے ساتھ مزار کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ بارش شروع ہوگئی، تیز ہوتی گئی اور اوپر سے اولہ باری بھی۔ احتیاط کی خاطر لی ہوئی چھتری ہم دونوں کے لیے ناکافی تھی۔ گھوڑاچو کی مزار شملہ کالکا روڈ پر پولیس بیریر سے نیچے کی طرف واقع ہے۔ مزار تک پہنچتے پہنچتے ہم بالکل بھیگ چکے تھے۔ راستے میں ہمارے گائڈ نے جس کا عیسائی نام تھا بتایا کہ اس کے دادا دراصل مسلمان تھے اور بعد ازاں انھوں نے مذہب تبدیل کرلیا تھا اور وہ خود اب چراغی کرتا ہے۔ ہم نے اس کی وضاحت چاہی تو اس نے بتایا کہ وہ چونکہ چراغی کرتا ہے لہٰذا چراغی کرنے والا مسلمان ہوا۔ لیکن اسے کلمہ نہیں معلوم تھا۔ بہرحال چراغی کرنے والے مسلمان گائڈ نے ہمیں گھوڑاچو کی مزار تک پہنچا دیا۔

یہ مزار تین درجوں پر مشتمل ہے۔ درمیانی درجہ میں مزار حضرت قبلہ باباجی محمد حسین خاں صاحب قادری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جن کی تاریخ وصال ۲۹ راکتوبر ۱۹۱۲ء ہے۔ دائیں درجہ میں ان کے چیلے، حضرت چودھری محمد قمیص خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے جن کی تاریخ وصال ۳ رمئی ۱۹۲۷ء ہے اور بائیں درجہ میں حضرت میاں منظور الحق صاحب ولد شیخ حافظ غلام قادر صاحب کا ہے جن کی تاریخ ۱۷ رمئی ۱۹۷۴ء ہے۔ روضہ کے دائیں جانب باہر کی طرف دیوار سے متصل ایک چھوٹا

مندر بھی ہے۔

'گھوڑا چوکی مزار'، کا مجاور سیوک کہلاتا ہے۔ ہم جس وقت مزار پر حاضر ہوئے سیوک کا نو عمر بیٹا روضہ کے درمیانی درجہ میں مزار کے پائنتی بیٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں خود سیوک بھی آ پہنچے۔ تعارف ہوا۔ یہ سیوک تھے۔ امر سنگھ رانا۔ اصلاً کانگڑہ کے باشندے، دلّی میں سنٹرل ٹیلیگراف آفس ایسٹرن کورٹ جن پتھ میں ملازمت کرتے تھے۔ ۱۹۶۱ء میں ۱۸ سال کی ملازمت کے بعد مستعفی ہو گئے، گریجوئٹی اور فنڈ ملا لیکن پنشن سے محروم رہے۔ ان کا خاندان بیوی کے علاوہ تین بیٹیوں اور دو بیٹوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۴ء میں سیاحی کرتے ہوتے شملہ پہنچے، روضہ پر نگاہ پڑی، شوق پیدا ہوا، روضہ پر حاضر ہوئے وہاں کوئی خادم نہیں تھا، کچھ ہی عرصہ پہلے وہاں کے مسلمان خادم کو بدکرداری کی وجہ سے بھگا دیا گیا تھا۔ امر سنگھ رانا کا خدمتِ شوق اس قدر بڑھا کہ وہ اس 'سنستھا' تک پہنچ گئے جو روضہ کی دیکھ بھال کا کام کرتی ہے۔ یہ 'سنستھا' کوئی رجسٹرڈ ادارہ نہیں ہے۔ اس وقت جو لوگ اس سے وابستہ ہیں اُن میں خاص ہیں جیا لال ورما، لالہ متوال چند اور کے۔ کے کھنّہ۔ ان میں اصل کرتا دھرتا جیالال ورما ہیں۔ ان کے والد ایم۔ ایل ورما صاحب بڑے بابا کے سیوک تھے اور مزار جس زمین پر واقع ہے اُن ہی کی ملکیت ہے۔ غرض جیالال ورما نے امر سنگھ رانا کو سیوک مقرر کر دیا اور تب ہی (۱۹۷۴ء) سے وہ سیوک کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مزار سے ملحق انھوں نے ایک کمرہ بنا لیا ہے جس میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتے ہیں۔ چڑھاوے میں ہزار بارہ سو روپے مہینہ انھیں مل جاتا ہے جس سے ان کی گزر بسر ہوتی ہے۔

سال میں دو عرس ہوتے ہیں جو عرف عام میں بھنڈارا کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک عرس مئی کے پہلے ہفتہ میں سنیچر اتوار کو ہوتا ہے اور دوسرا عرس ستمبر کے آخری ہفتہ میں سنیچر اتوار کو ہوتا ہے۔ عرس کی تاریخوں میں جو چڑھاوا آتا ہے وہ سنستھا

کو چلا جاتا ہے۔ یہی سنستھا عرس کا انعقاد کرتی ہے۔ تقریباً تین ہزار زائرین عرس میں شرکت کرتے ہیں جن میں بیشتر ہندو ہوتے ہیں۔ اعراس کے موقع پر سنیچر کو مزار پر شام کے وقت چادر چڑھائی جاتی ہے اور حلوے کا پرشاد تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے سنڈوار سے قوال آتے تھے لیکن اب اُن کا آنا بند ہو گیا ہے۔ مقامی لوگ آتے ہیں اور قوالی پیش کرتے ہیں۔ انوار کو ہری پور (ہماچل پردیش) کے مولوی صاحبان آتے ہیں، مزار کو غسل دیتے ہیں اور ختم کرتے ہیں۔ ختم کے بعد بھنڈارا (لنگر) ہوتا ہے، مٹر پلاؤ اور میٹھے چاول پکائے جاتے ہیں اور زائرین کو پیش کیے جاتے ہیں۔

زائرین میں زیادہ تر شملہ کے باشندے شامل ہوتے ہیں، ان میں عیسائی، سکھ، مسلمان اور ہندو سب ہی ہوتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ باہر ہی سے ماتھا ٹیک کر چلے جاتے ہیں، امیر غریب سب ہی اپنی مرادیں لے کر آتے ہیں لیکن ہمیں بتایا کہ خاص طور سے بنیے باباصاحب کے بہت معتقد ہیں۔ سیوک سے ہم نے دریافت کیا کہ ان کا طریقۂ عبادت کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ "مالک کا نام لے لیتے ہیں، کلمہ پڑھ لیتے ہیں، سچے دل سے کچھ بھی سوچیں کہیں صحیح ہوتا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ وہ "مندر جا سکتے ہیں لیکن کچھ تمنا نہیں بنتی۔" ہولی، دیوالی مناتے ہیں لیکن ان تیوہاروں پر پوجا نہیں کرتے، بس دیا موم بتی جلا لیتے ہیں یا رنگ گلال سے کھیل لیتے ہیں۔ اہل مراد کو سیوک کوئی تعویذ، گنڈا نہیں دیتے ہیں، بس پھول، نبل، پانی، بھبھوتی (راکھ) دے دیتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے مرادیں پوری ہو جاتی ہیں، بیمار صحت مند ہو جاتا ہے۔

صاحب مزار حضرت قبلہ باباجی محمد حسین خاں صاحب قادری قدس سرہٗ کے بارے میں ہمیں بہت محدود معلومات حاصل ہو سکیں۔ سیوک نے بتایا کہ آپ بجنور کے رہنے والے تھے۔ 'نواب خاندان' کے تھے۔ اپنی ریاست میں تحصیلدار تھے۔ جس وقت قدرت

نے روشنی دی عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ شملہ آئے جہاں ان کی ملاقات حضرت شیخ حافظ غلام قادر قدس سرہٗ سے ہوئی جو وائسرائے کے دفتر میں ہیڈ ڈرافٹسمین تھے۔ ان سے شرف بیعت حاصل کیا۔ ہماچل کے نہان کے جنگل ہیں بارہ سال تپسیا کی۔ انگریزوں نے انھیں گھوڑوں پر ٹراٹراکٹر رکھا، گھوڑے پر ہاتھ رکھتے، بھبوتی مارتے، پھونک مارتے، وہ ٹھیک ہو جاتا، پھر آدمی بھی ان کے معتقد ہوتے چلے گئے۔ اس سے زیادہ ہمیں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں اور یہ بھی تحقیق طلب ہیں۔ بابا صاحب کے شیخ کا مزار جالندھر میں ہے، اس کا انتظام بھی جیالال ورما دیکھتے ہیں، وہاں نومبر دسمبر میں عرس ہوتا ہے اور وہاں کا مجاور مسلمان ہے۔

بابا صاحب میں ان کے معتقدین کیا کشش محسوس کرتے ہیں کہ ان کا مزار مرجع خاص و عام ہو گیا ہے، یہ سوال ہمارے ذہن میں تھا لیکن مزار پر موجود لوگوں سے اس کا جواب نہیں مل پایا۔ البتہ وہاں کسی بی۔ ایل کپور کے منظوم نذرانۂ عقیدت بعنوان 'بابا سلوتری والے' پہ ہماری نظر پڑی جو دیوناگری میں چھپا ہے اور جس پر ۲۴ رمئی ۱۹۹۰ء کی تاریخ پڑی ہے۔ اہل شریعت و طریقت اس پر گرفت کریں گے لیکن ایک مسلمان مرد درویش سے لو لگانے والا ہندو معتقد ان بندشوں سے آزاد ہے۔ ذیل میں اسے ہو بہو نقل کیا جا رہا ہے تاکہ 'مقبول اسلام' کی ایک شکل واضح ہو کر ہمارے قارئین کے سامنے آ جائے۔

یہ درگاہ شریف روح پاک کی اس کے سجدے کرو

یہاں بابا آرام فرما رہے ہیں بات چھپ کے کرو

یہ وہ مقام ہے جس کا جلوہ سب نے دیکھا ہے

اس مزار پہ جو مستک ٹیکا بدلی اُس کی ریکھا ہے

میرے اوپر بابا سلوتری والے کا کرم بہت بھاری ہے
بابا تیرے قدموں میں ارپت میری ساری ہستی ہے

مرادیں پوری کرتے ہو اور کرتے رہتے ہو
خود پیار جگا کر سب کے دلوں ہیں قدم دھرتے رہتے ہو

آپ کے پاس آنے سے دل کو عجیب سکون ملتا ہے
کہ ناچیز بندے کو تیری رحمتوں کے بیان کا مضمون ملتا ہے

جو بھی درکار ہے اُسے خود کر دے اے غریب نواز بابا
میرے لیے تیری درگاہ ہی ہے مندر، مسجد اور کعبہ

تیرے فضل و کرم سے میری دنیا آباد رہی ہے
تو نے طاقت بخشی کہ ہر وقت اونچی میری اوقات رہی ہے

تیرے سجدے کرتا رہے دل، یہ آرزو پوری کر دے
میرے دل میں قیام کر کہ ختم سب دوری کر دے

تیری یاد ہی یادِ حق ہے یہ سچائی اُبھری ہے من میں
تجھے یاد کیا خدا حاضر ہو گیا کہ میری حالت سدھری ہے چھن میں

جو بھی آیا تیرے در پر اُسے چین اور آرام ملا ہے
اے مردِ مومن تو پیر مکمل ہے، تو ملا کہ رام اور شیام ملا ہے

تو رحیم ہر جگہ موجود ہے جہاں جاتا ہوں ساتھ رہتا ہے

بابا تو میرا رچھک سہایک ہے کہ میرے اوپر سدا تیرا ہاتھ رہتا ہے

بابا آپ نور کے مینار ہو آپ نے نور مجھے خوب دیا ہے

آپ کے نور میں دیکھا نور الٰہی پر مانند، یہ کمال آپ نے خوب کیا ہے

دوئی کا پردہ ہٹ گیا آپ میں اور رحیم میں بھید مٹا ہے

تیری بتائی حقیقت میں سارا گیان کہ قرآن، پران، بائبل اور وید دکھا ہے

"نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" یہ سچائی ظاہر ہوئی ہے

جسے دیکھا آپ نے اُس کی تقدیر بدلی کہ تیری نظر ماہر ہوئی ہے

آپ دیکھ سکتے ہو، ہم آپ کو دیکھ نہ پائے خود اپنا اظہار کر دو

اے بابا سلوتری والے اب کی بار اپنے آپ کو سروویاپک اور سروا کار کر دو

بابا آپ کے قدموں پر میرا سر یہ حالت سدا بنی رہے

مہر کرو پروردگار کہ اس درگاہ شریف پر میری نظر سدا جمی رہے

تیری بندگی اور خدا کی بندگی میں فرق کا بھرم سماپت ہو جائے

تیرا در کبھی بھی چھوٹے نہ کہ تیری مہر سے سب کچھ پراپت ہو جائے

دعا ہماری قبول فرمائی بابا نے اور خود نے، فرمایا اسپشٹ ہے

ہماری نظر ہے تم پر مرادیں پوری ہوں گی سدا ختم ہوا جو آیا کشٹ ہے

بابا آپ رحیم ہو، کریم ہو، حاضر ناظر ہو آپ کا نام اولیاء ہے

جو بھی کسی دکھ کو لے کر آیا آپ کے در پر لوٹنے پھر رہا نہیں دکھیا ہے

اسی لیے میرا دل و دماغ آپ کے قدموں میں سدا جھکتا رہتا ہے

آپ کی مہر کی نظر کرحمت اور موت کا سایہ میری طرف آنے سے رکا رہتا ہے

ایک مرد مومن، ایک مرد درویش جو آسودۂ مزار ہے وہ اب بھی دلوں کو گرما رہا ہے اہل دل ہندو کو وہ ملا تو رام اور شیام مل گیا ہے۔ یہ کون سی معرفت ہے ؟ ہمارا قلم یہاں رکتا ہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ سہارن پور کے کچھ مولویوں نے جی توڑ کوشش کی کہ سیوک امر سنگھ رانا کو درگاہ سے ہٹا دیا جائے۔ وہ ایک وقت میں ہماچل پردیش کے گورنر عالیجناب امین الدین سے بھی ملے۔ گورنر صاحب کی دانش مندی بذات خود مزار پر حاضر ہوئے انتظامات دیکھے، صفائی ستھرائی دیکھی، مطمئن ہوئے اور مولویوں سے کہا یہی بہتر ہوگا کہ انتظامات ہندو سیوک کرے اور ہندوؤں کی سنستھا نگرانی کے فرائض انجام دے۔

ایک بات کا ہمارے دل پر اثر ہوا، فضا میں روحانیت تھی، نور تھا اور سیوک نے نذرانہ طلب کر کے ہمارے سکون میں رخنہ نہیں ڈالا۔

حیات اللہ انصاری

اردو کا مسئلہ

پاکستان کے ایک نمائندے نے جو اردو ادب میں بھی بڑی جگہ رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو د۔
کے مولوی عبدالحق عالمی سیمینار (جنوری ۱۹۹۲ء) کے اجلاس میں صدارت کی صف سے سوال اٹھا
"ہندوستان میں آپ لوگ اردو اردو تو کرتے ہیں لیکن جہاں جاتا ہوں وہاں یہ سننے
میں آتا ہے کہ بچے اردو نہیں پڑھ رہے ہیں۔"
انجمن والوں کی طرف سے چند جواب دیے گئے مگر وہ کچھ اطمینان بخش نہیں تھے۔ تو میں نے کھڑ
ہو کر کہا کہ جس طرح انگریزی دور کی ابتدا میں اوپر کے طبقہ کا سارا زور انگریزی پر ہو گیا تھا اسی
آج کل اردو والوں کا اوپر کا طبقہ اردو کو بھلا بیٹھا ہے۔ کیونکہ اس طرف نہ روٹی ہے اور نہ وہ
جن کی ایسے طبقہ کے لوگوں کو تلاش ہوتی ہے۔ آج اس طبقہ کا سارا زور ہندی اور انگریزی پر
لیکن اس طبقے کے نیچے جو طبقات ہیں وہ اردو پڑھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اردو اخبارو
اشاعت برابر بڑھ رہی ہے اور نئے نئے اخبار بھی نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ مقبول عام کتابوں کی
کہ مذہبی کتابیں ہیں یا رومانی اور جنسی ناولیں ہیں، ان کی مانگ بھی برابر بڑھ رہی ہے۔

مکاتب اتر پردیش میں جو کہ اردو کا بڑا مرکز ہے وہاں مسلمانوں کے دو تہائی بچے مکتب
میں پڑھتے ہیں اور اردو اخباروں کے پڑھنے والے اسی طبقہ سے نکلتے ہیں
میرے اس جواب سے پاکستانی حضرات کچھ مطمئن ہوئے اور بات ختم ہوگئی۔ اس بات کی اہم
یہ ہے کہ اس سے اردو کا بنیادی مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی وہ مسئلہ جس کی طرف آج کل بختیر

جناب حیات اللہ انصاری، ابوالفضل انکلیو۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ہو رہی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اتر پردیش کے دو تہائی مسلمان بچے (ہندو بچوں کا مسئلہ آگے پیش کیا جائے گا) مکتبوں میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ مکتب کون لوگ قائم کرتے ہیں اور ان میں کون سے بچے شریک ہوتے ہیں۔ ان باتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

عام طور سے عربی مدارس کے فارغ طلباء مکاتب قائم کرتے ہیں جن کی جگہ عام طور پر مسجد ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو کھل کر بند ہو جاتے ہیں لیکن کچھ محلّے والوں کی امداد سے چلنے لگتے ہیں اور پھر بعض دینی انجمنیں ان کی امداد کرنے لگتی ہیں۔ امداد کرنے والوں کی اصل غرض ہوتی ہے دینی تعلیم کو پھیلانا۔ مکتبوں میں جو بچے داخل ہوتے ہیں ان کے سرپرست بھی دینی تعلیم کی غرض سے ان کو داخل کرتے ہیں۔ ایسے مکتبوں کی آمدنی کم ہوتی ہے اس لیے مدرّسوں کو تنخواہ بھی کم ملتی ہیں۔

ایسے مکاتب بھی ہیں جن کو بااثر انجمنوں نے قائم کیا ہے۔ ان کی مالی حالت کچھ بہتر ہے۔ مکتبوں کی ایک بڑی تعداد اس خاص دینی تعلیمی انجمن کے ماتحت ہے جس کو عدیل عباسی صاحب نے چلایا تھا اور جس کے اعلیٰ سرپرست جناب علی میاں ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے مکاتب بھی اچھی تعداد میں ہیں جو کسی سے وابستہ نہیں ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش نے جب یہ محسوس کر لیا کہ اردو والوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے اردو میڈیم اسکول ضروری ہیں اور حکومت ان کو قائم کرنے سے کترا رہی ہے تو ایک طرف تو انجمن اپنے اردو میڈیم اسکول قائم کرنے لگی اور دوسری طرف مکتبوں کو اسی نظر سے دیکھنے لگی کہ ان میں مذہبی تعلیم دو گھنٹے ہوتی ہے۔ ان گھنٹوں میں سے قطع نظر مکاتب اپنی ساخت کے لحاظ سے اردو میڈیم اسکول ہیں۔ پھر ان کو اسی راہ پر کیوں نہ ترقی دی جائے۔ اس لیے انجمن نے اس طرف توجہ کی۔ حکومت مکتبوں کو برائے نام امداد دیتی تھی جس کو حاصل کرنے میں محنت لگتی تھی کہ مکاتب ان کو چھوڑ دیتے تھے۔ انجمن نے اس امداد کو جدوجہد کر کے بڑھا کر ایک ہزار روپے سالانہ کرا دیا۔ عام طور سے ڈر تھا کہ اس اثر سے کہیں حکومت مکتبوں میں دخل نہ دینے لگے۔ انجمن نے آزاد مکتبوں کو یہ مشورہ دیا کہ آپ لوگ امداد لے کر مکتبوں کو بہتر بنائیں اگر حکومت نے دخل دیا تو امداد چھوڑ دی جائے گی۔ انجمن کا یہ مشورہ عام طور پر قبول کر لیا گیا

مکاتب کے فارغ طلباء

عدیل صاحب کی اسکیم مکتبوں کے طلباء کے لیے یہ تھی کہ وہ مکتبوں کی پانچ سالہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرکاری اسکولوں میں داخلہ لے لیں گے۔ لیکن دشواری یہ پیش آگئی کہ مکتبوں کے فارغ طلباء چھٹے کلاس کے داخلہ کے امتحان میں ناکام ہو جاتے تھے۔ عدیل صاحب نے اس وقت کے وزیر تعلیم پنڈت کملا پتی ترپاٹھی جی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ داخلہ میں ہندی کا امتحان نہ لیا جائے وہ چند مہینوں کے بعد لیا جائے لیکن میں نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ دیکھو کہ مکتبوں کے طلباء صرف ہندی ہی میں کمزور نہیں ہوتے ہیں اور مضامین میں بھی کمزور ہوتے ہیں۔ کملا پتی جی سے کہا کہ چھٹے کے داخلہ کے لیے امتحان کی کیا ضرورت ہے۔ سرسری جائزہ کے بعد طلباء کو داخل کرلیا جائے۔ جو کمزور ہوں گے وہ چھٹے کے امتحان میں رہ جائیں گے۔ کملا پتی جی نے یہ تجویز منظور کرلی اور مکتبوں کے بچے چھٹے میں داخل ہونے لگے۔ لیکن ان میں سے اسّی فی صد چھٹے میں فیل ہو جاتے تھے اور بمشکل دو تین فی صد ہائی اسکول میں کامیاب ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کی کمزوریاں ہر طرف تھیں۔ ہندی اور حساب میں تو کمزور ہوتے ہی تھے۔ جغرافیہ اور تاریخ میں بھی ناقص ہوتے تھے۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ ان کی اردو تحریر بھاری بھر کم الفاظ اور نفیس جملوں کے باوجود ادائے مطالب میں ناقص ہوتی تھی۔

چھٹے میں ناکام ہونے کے بعد مکاتب سے فارغ طلباء کیا کرتے ہیں۔ میں نے اس کا جائزہ لینے کے لیے چند قصبوں کا دورہ کیا۔ اس جائزہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے طلباء کی ایک تعداد تو اپنے خاندانی پیشوں میں کھپ جاتی ہے لیکن ان کے پیشوں کے بارے میں جو کتابیں حکومت کی طرف سے شائع ہوتی ہیں ان سے وہ لوگ اپنے علم کے ناقص ہونے کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے ہیں ان کے علاوہ جو طلباء ہوتے ہیں وہ بیکار اور بے مصرف زندگی گزارتے ہیں۔

جب میں نے عدیل صاحب کو یہ بات بتائی تو پہلے تو انھوں نے اس کو تسلیم نہیں کیا لیکن ایک عرصہ کے بعد بہت دکھ کے ساتھ مان گئے۔ اور سوچنے لگے کہ کیا حل نکالا جائے اس دشواری کا۔ اگر آج بھی اس دشواری کا حل نکل آئے تو اترپردیش میں اردو کی تعلیم کا مسئلہ بڑی حد تک حل ہو جائے۔ کیوں کہ پھر اردو کو کئی ہزار اردو اسکول مل جائیں گے۔

مکاتب کے فارغ طلباء خاص طور سے ہندی اور حساب میں کمزور ہوتے ہیں اور ان کی اردو تحریر ناقص ہوتی ہے۔ دوسری طرف مکاتب کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی ہے کہ وہ لائق استادوں کی خدمات حاصل کر سکیں۔ عام طور سے عربی مدارس کے فارغ یا سرکاری اسکولوں کے ایسے طلباء جن کو ملازمت نہیں مل سکی ہے وہی مکاتب میں ملازمت کرتے ہیں۔

ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش نے ۱۹۸۹ء میں ایسے مکاتب کے نمائندوں کی جو انجمن کے مشورے قبول کرتے ہیں۔ ایک کانفرنس بلائی تھی۔ جس میں ۴۶ ضلعوں کے نمائندے شریک تھے۔ وزیر اعلیٰ نرائن دت تواری نے کانفرنس کو خطاب کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ انجمن مکاتب کی بڑی کانفرنس بلائے۔ حکومت ان کی دشواریوں کو دور کرے گی۔ لیکن تواری جی نے اس تقریر کے بعد مکاتب کی کانفرنس کے لیے وقت نہیں دیا۔ اس طرح مکتبوں کا مسئلہ ویسے کا ویسا ہی رہا اور اب تو کایا ن سنگھ کی حکومت میں آکر اور الجھ گیا ہے

مکاتب کی تعلیم کا تین چوتھائی حصہ تو اپنی ساخت کے لحاظ سے اردو میڈیم اسکول ہوتا ہی ہے لیکن باقی حصہ کو اگر صحیح طرح سے چلایا جائے تو وہ بھی اردو تعلیم کے کام آسکتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ ایسے بھی مکاتب ہیں جہاں بچے تین چار سال میں مشکل سے معمولی اردو کا پڑھنا لکھنا سیکھے ہیں اور ایسے بھی ہیں جہاں ہر بچے کا سبق الگ ہوتا ہے یعنی کلاس کی پابندی نہیں ہوتی ہے۔ تعلیم میں خاص زور رٹنے پر دیا جاتا ہے اور شوق پیدا کرنے کا ذریعہ نصیحتیں ہوتی ہیں یا استاد کی مار۔

ٹریننگ مکاتب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر ان کے ٹیچروں کو ٹریننگ دے دی جائے اور نصاب میں تھوڑی بہت ترمیم کر دی جائے تو تعلیم بہت سدھر جائے گی۔ انجمن کی اسکیم یہ ہے کہ وہ اپنے مشوروں کو ماننے والے مکتبوں کے ٹیچروں کو ٹریننگ دے دے۔ اس ٹریننگ سے ضرور فائدہ ہوگا اور تعلیم بہتر ہو جائے گی۔ اس سے تو اور مکاتب بھی ٹریننگ کے خواہشمند ہو جائیں گے اور اپنی انجمن سے اس کو حاصل کرنے لگیں گے اور اس طرح مکاتب کی ترقی کا راستہ کھل جائے گا، مگر سوال یہ ہے کہ ٹریننگ دینے والے ٹیچر کہاں سے آئیں گے۔

تقریباً بیس سال ادھر کی بات ہے کہ انجمن نے بہت شور مچایا کہ پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں کی لیے اردو ٹیچروں کی ٹریننگ کا بندوبست کیا جائے۔ اس پر حکومت نے چار اردو

پرس ٹریننگ کالج کھول دیے جو چلنے لگے اور وہاں سے اردو ٹرینڈ ٹیچر نکلنے لگے اور سرکاری اسکولوں میں اردو ٹیچروں کی جگہ ملازم ہونے لگے۔ مگر یہ سب اردو ٹیچر اردو نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے۔ وہ جس اسکول میں جاتے تھے وہاں اردو کا خاتمہ کر دیتے تھے۔ انجمن اس حالت کے خلاف لڑتی رہی لیکن حکومت طرح طرح کی بہانہ بازیاں کر کے اسی نظام کو چلاتی رہی اور وہ اب تک چل رہا ہے۔

۲۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اچھے ٹیچر بلا باقاعدہ ٹریننگ کے پیدا کیے جا سکتے ہیں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ اردو ٹیچروں کو اردو میڈیم اسکولوں کی غیر موجودگی میں مناسب عملی ٹریننگ دی جا سکے؟

۳۔ اگر اردو میڈیم اسکول قائم کیے جائیں تو کیا وہ ایسے ہو سکتے ہیں کہ نتائج میں سرکاری اسکولوں کے ہندی تعلیم دینے میں مقابلہ کر سکیں؟

۴۔ اردو میڈیم اسکولوں میں اردو کا مضمون لازمی ہوگا جب کہ ہندی میڈیم اسکولوں میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اس صورت میں اردو میڈیم کے بچوں کو ایک مزید مضمون کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ کیا اس صورت میں وہ دوسرے اسکولوں کے بچوں سے کمزور نہ رہیں گے؟

۵۔ جس حلقہ میں کام کرو وہاں کی پبلک کو ساتھ لینے کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم بالغاں کا بھی کام کرو۔

۶۔ موجودہ نصابی کتابیں کیا ایسی ہیں کہ وہ اچھے ٹیچر اور اچھے طلباء پیدا کر سکیں؟

۷۔ یہ واضح رہے کہ منظور شدہ اسکولوں میں سرکاری نصابی کتابیں پڑھانا ضروری ہے۔

۸۔ اردو تعلیم کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان نظر نہ آئے یعنی تعلیم میں غیر مسلم بھی حصہ لے سکیں اور ان کی مساویانہ عزت ہو۔

ان سب سوالوں کا بوجھ اٹھانا تھا اکیلا انجمن ترقی اردو اتر پردیش کو اور اس نے ان اپنے کمزور کندھوں پر اٹھا بھی لیا۔

انجمن کے عملی کام ہم نے دھیرے دھیرے سب ہی مذکورہ کام اپنی بساط کے موافق شروع کر دیے۔ پہلے چھ ضلعوں میں خاص خاص مقاموں پر اردو میڈیم اسکول قائم کر دیے۔ پھر ان کی تعداد بڑھانے لگے۔ اس کے بعد تعلیم بالغاں کے

مرکز کھولے۔ پھر اردو ٹیچر ٹریننگ کالج کھولے جہاں کہ ریٹائرڈ پروفیسر درس دیتے ہیں۔ ہمارے ٹیچر طلباء انجمن کے اردو میڈیم اسکولوں میں اور ایسے غیر سرکاری اسکولوں میں جہاں اردو موجود ہے عملی ٹریننگ حاصل کرنے لگے۔

میری تحریر کردہ پرائمر "دس دن میں اردو" اور "دس دن میں ہندی" اس لحاظ سے بہت مفید ثابت ہوئیں کہ اردو میڈیم اسکولوں میں اگرچہ ایک مضمون اردو کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے لیکن ان پرائمروں کی وجہ سے وہ بوجھ بوجھ نہیں معلوم ہوتا ہے۔ نیز رفتہ رفتہ ہمارے اردو میڈیم اسکولوں کے نتائج بھی سرکاری اور غیر سرکاری ہندی اسکولوں کے برابر بلکہ بہتر ہونے لگے۔ اس وجہ سے اسکولوں میں جگہ کی کمی سے سابقہ پڑنے لگا۔

جب ہمارے تعلیم بالغاں کے اور "توسیع خواندگی" کے فارغ طلباء میں سے چند نے چار پانچ سال میں پرائیویٹ کوشش کر کے ہائی اسکول پاس کرلیا۔ پھر تو ہمارے فارغ طلباء کا اصرار ہونے لگا کہ ان کی آگے کی تعلیم کا کچھ بندوبست کیا جائے۔ ہم نے ان کے لیے چھٹے سے لے کر ایم اے تک اردو میڈیم امتحانات قائم کر دیے جو چلنے لگے۔

رفتہ رفتہ ہمارے امتحانوں کو بڑی مقبولیت ملی۔ تعلیم بالغاں کے اور اردو میڈیم ماڈل اسکولوں کے فارغ طلباء چھ سات سال میں ٹرینڈ ٹیچر بن کر پرائیویٹ اسکولوں میں ملازم ہونے لگے۔ کیونکہ وہ ایسے سرکاری اردو ٹرینڈ ٹیچروں پر جو اردو نہیں جانتے ہیں۔ ہمارے سرکاری اردو ٹیچروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے اس سلسلۂ تعلیم میں غیر مسلم کافی تعداد میں آنے لگے ہیں جو کہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ ورنہ اگر ہماری جدوجہد مکاتب تک رہتی تو اردو عملی طور پر مسلم زبان سمجھی جا سکتی تھی۔ افسوس ہمارے ذرائع ابھی ایسے نہیں ہیں کہ فی الحال اردو میڈیم اسکولوں اور تعلیم بالغاں کو زیادہ وسعت دے سکیں۔ آج کل تو سرکاری گرانٹ تقریباً تین سال سے نہ ملنے کی وجہ سے یہ دونوں سخت حالات کا شکار ہیں۔ انجمن کو سرکار سے اردو میڈیم اسکولوں اور تعلیم بالغاں کے لیے ۹۵ ہزار سالانہ کی گرانٹ ملتی تھی۔ یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ ہماری تعلیم بالغاں میں توسیع تعلیم بھی شامل تھی۔ اس کے تحت ہم ایسے بارہ تیرہ سال کے بچوں کو بھی جو دن بھر دستکاری کا کام کرتے ہیں۔ رات کو آدھ گھنٹہ خواندگی سکھا

ہیں، ۹۵ ہزار کی گرانٹ کو کانگریسی حکومت نے ۵ لاکھ کر دیا تھا لیکن اس کے بعد ہی وہ چلی گئی اور ملائم سنگھ اور کلیان سنگھ کی حکومتیں آگئیں جنھوں نے اب تک کچھ نہیں دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم بالغاں تو سسک رہی ہے اور اردو میڈیم اسکول لسٹم پسٹم چل رہے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش عام چندہ نہیں لیتی ہے خاص خاص موقعوں پر ایک دو رقمیں خاص لوگوں سے لے لیتی ہے جن کا حساب ان کو بھی دے دیتی ہے۔

آج کل ٹریننگ کا ضروری مسالہ ہمارے پاس تیار ہے۔ اس سال اکتوبر نومبر میں ہم اپنے اردو میڈیم ماڈل اسکولوں کو جن کو بیس سال پہلے ٹریننگ ملی تھی اور ٹیچرس ٹریننگ کالج کے بعض شعبوں کو ٹریننگ دینے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور شاید یہ کام ہو بھی جائے۔ ہمارے سامنے مکتبوں کی ٹریننگ کا بھی پروگرام ہے۔ وہ یہ کہ اپنے چالیس اضلاع میں سے ہر ضلع کے پانچ پانچ مکتبوں کے دو دو ٹیچروں کو ٹرینڈ کر دیں۔ اس سے نہ صرف ان مکتبوں میں تازی جان آجائے گی بلکہ مکاتب کے پورے نظام میں تازگی کی جھرجھری آ جائے گی اور ان کی انجمنیں ان کو ٹرینڈ کرنے کی کوششوں میں لگ جائیں گی۔

اردو سے دور مگر اس کے متمنی

مڈل کلاس کے اعلیٰ طبقے اور اوسط طبقے کی نظر میں پہلی چیز ہوتی ہے "اچھی آمدنی اور حکمرانوں کی نظر میں اپنی عزت۔ یہی دونوں طبقے انگریزی دور میں جوش و خروش سے انگریزیت مآب ہو گئے تھے کیا رہن سہن، کیا ذوق، کیا لباس اور تعلقات سب کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوششیں ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانیت پر "نے ٹیو" کا لیبل بنا دیا گیا تھا۔ وہی حال آج بھی ہے۔ مگر ایک فرق ہے وہ یہ کہ آج کوئی گروہ اپنی انفرادیت کو کھونے پر بالکل تیار نہیں ہے۔

آج آمدنی اور عزت کا راستہ نکلتا ہے انگریزی اور ہندی سے۔ اس لیے مڈل کلاس کے اعلیٰ طبقے اور اوسط طبقے کی نظروں میں یہی دونوں زبانیں اہم ہیں۔ اگر ان کے دس لڑکوں اور لڑکیوں سے کہو کہ اردو پڑھو تو ان میں سے تین چار ضرور پوچھیں گے کہ "اردو سے ہم کو

کیا ملے گا" اور اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے کیونکہ اس دور کی اردو دنیا میں اگر عزت ہے تو صرف خوش گلو شاعر کی ہے۔ ہاں تھوڑی بہت عزت ہے نعرے باز اردو لیڈر کی بھی۔ ورنہ بڑے بڑے مصنف اور شاعر اور خادم زبان کی وہ عزت نہیں جو ممبران اسمبلی اور ممبران پارلیمنٹ کی ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اردو مصنفوں کو اپنی کتابوں کی رائلٹی میں جو رقم ملتی ہے وہ لگ بھگ صفر ہوتی ہے۔ البتہ پبلشروں اور کتب فروشوں کی ضرور آمدنی ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف پست درجے کے مصنفوں کو ایوارڈ ملتے رہیں۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ اچھی کتابوں کے پڑھنے والے بہت کم ہیں اور پڑھ کر متوازن رائے دینے والے اور بھی کم ہیں۔ لیکن یہ تو قانون قدرت ہے کہ زمانہ جب دغا دیتا ہے تو کشتی اس طرح ڈگمگانے لگتی ہے کہ اب ڈوبی اور اب ڈوبی۔ مگر ایسے میں ہمت صدا دیتی ہے کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو ایسی کشتی میں بیٹھ سکتے ہیں؟

وہ اردو والے جنھوں نے خود اردو نہیں پڑھی ہے یا ان کی بیوی اور بچے نہیں پڑھ سکے ہیں اور وہ آج بڑے مرتبوں پر ہیں۔ ان میں اکثر حضرات کے دلوں میں یہ للک ہے کہ کاش وہ لوگ اردو سے ناواقف نہ رہتے۔ یہ لوگ ایسے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کو آسانی سے اردو سکھا دے۔ آج جو اردو کے لیڈر ہیں ان میں بھی کافی ایسے حضرات ہیں جو اس روگ میں مبتلا رہ چکے ہیں لیکن ان میں سے کچھ نے اپنی یہ خامی میری پرائمر "دس دن میں اردو" سے دور کر لی۔ اگر ایسے لوگ اخباروں کے ذریعہ اردو پڑھنے کے متمنی حضرات کو بتا دیں کہ وہ جس شارٹ کٹ کی تلاش میں رہیں وہ "دس دن میں اردو" میں ہے، تو اردو کی فوج میں ہزاروں ایسے ہندو، مسلم اور سکھ سپاہیوں کا اضافہ ہو جائے جو ملک میں با اثر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اضافہ سے اردو کی جدوجہد کو کتنی طاقت ملے گی۔

ہمارا طریقۂ کار ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا طریقہ یہ ہے کہ وہ محلے محلے خاص لوگوں سے ملنے اور محدود جلسے کر کے کام چلاتی ہے۔ بڑے پیمانہ پر پروپیگنڈہ کر کے اور بڑے جلسے کرنے سے حمایت سے زیادہ مخالفت ملتی ہے، اپنوں کی بھی اور غیروں کی بھی۔ دستخطی مہم میں بھی ہم نے نہ پبلک جلسے کیے تھے اور نہ جلوس نکالے تھے۔ اور نہ نعرے بازی کی تھی۔ صرف محدود پیمانے پر پراپیگنڈا تو کیا تھا۔ اس سے بھی ہندی کی شدید مخالفت کا

سامنا کرنا پڑا تھا جس میں اپنی آدھی طاقت صرف ہو گئی تھی۔ اس سے ہم نے سیکھا کہ ایسا محدود پروگرام اور ایسی محدود جدوجہد جو اپنے ضروری کام بنا سکے وہ بہتر ہے۔ اس سے کام بن جاتا ہے اور کوئی خاص رکاوٹ نہیں آتی ہے۔ نتائج کے لحاظ سے یہ طریقہ اچھا رہتا ہے۔

آج اگر ہم اپنے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں تو سرنگوں ہونے کی ہم کو کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے یہ جائزہ اگر صرف خواتین ہی کی کامیابیوں سے لیا جائے تو شاندار مثالیں نظر آئیں گی۔ مثلاً بعض ایسی خواتین جن کے لیے سب راستے بند تھے وہ آج گریجویٹ ہیں اور برسر روزگار ہیں اگر کوئی صاحب خلوص سے جائزہ لینے آئیں تو اس طرح کے مردوں اور خواتین سے ان کی ملاقات کرائی جا سکتی ہے۔ ہماری انجمن مشاعروں، سیمیناروں اور لوگوں کے یوم منانے کو پسند کرتی ہے لیکن اس نے یہ کام لے لیا ہے کہ کمزوروں کو اردو تعلیم کے ذریعہ اوپر اٹھائے اور اسی میں لگی ہوئی ہے۔

تمناؤں کے راستے

اردو کے بہت سے بہی خواہ یہ چاہتے ہیں کہ ریاستی انجمن ترقی اردو اتر پردیش کوئی ایسا اقدام کرے جس سے حکومت گھبرا کر اردو کے مطالبات تسلیم کر لے۔ مثلاً بڑے بڑے جلوس نکالے۔ اسمبلی کے سامنے مظاہرے کرے۔ ہزاروں کارکنوں سے قانون شکنی کرائے۔ جیل بھرو۔ اس قسم کے چند کام بڑے پیمانہ پر تو نہیں لیکن موثر حد تک انجمن کر تو سکتی ہے۔ وہ بیس پچیس ہزار اردو والوں کا لکھنؤ میں بھی جلوس نکال سکتی ہے اور پانچ سات لاکھ محبان اردو سے جیل بھر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ یقین ہو کہ اس سے اردو کا کچھ بھلا ہو گا۔

اردو کے مخالف کون لوگ ہیں اور کیوں۔ اس سوال پر ایسے اقدام سے پہلے غور کرنا ضروری ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے اس بات کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کے پس پشت ایک خاص طبقے کی وہی تمنائیں ہیں جنھوں نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا جھگڑا کھڑا کیا ہے۔ یہ لوگ دو قومی نظریہ کو مانتے ہیں اور ان کا خواب یہ ہے کہ مہابھارت اور رامائن کی شاندار تہذیب آج کے دور میں واپس آ جائے۔ کیونکہ ہندوستان کی اصل قومیت اور تہذیب

دہی ہے اور قومیت اور تہذیب کی جڑ ہوتی ہے زبان۔ اس بات کو دو رخوں سے دیکھیے۔ ایک یہ کہ بعض حالات کی وجہ سے ہندوستان میں سنسکرت کو رائج نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ہندی کو رائج کر دیا جائے مگر اس میں دشواری یہ ہے کہ باوجود زبردست کوششوں کے ہندی آج تک عام بول چال کی زبان نہیں بن سکی۔ اس لیے اردو کو ختم کیے بغیر قدیم تہذیب کی واپسی ممکن نہیں نظر آتی ہے

ان لوگوں کے نزدیک اردو میں دوسرا عیب یہ ہے کہ جب کبھی اردو پر حملہ کیا جاتا ہے اس کے دفاع میں مسلمان اور ہندو ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے دو قومی نظریہ بے جان ہو جاتا ہے اور متحدہ قومیت کی معقولیت روشن ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں کو جس چیز نے اردو دستخطی مہم پر آمادہ کیا تھا۔ اس میں خاص نکتہ یہی تھا کہ متحدہ قومیت کی سب سے گہری جڑ اردو ہے اگر متحدہ قومیت کو برقرار رکھنا ہے تو اردو کو بچانا ضروری ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین کی خدمت میں کسی نے ایک قینچی پیش کی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں قینچی سے کاٹتا نہیں ہوں۔ میں تو سوئی دھاگے سے جوڑتا ہوں۔ مسلم لیگ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلمانوں کی جتنی بھی زوردار تحریکیں چلیں سب قینچی والی تھیں، سوئی دھاگے والا عمل صرف ایک ہے جو بلا کسی منصوبے کے چلا آرہا ہے وہ ہے غیر مسلموں کی اردو دنیا میں آؤ بھگت۔ یہ چیز ہر طرح سے قابل تعریف ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ عمل توازن سے ذرا ادھر ادھر ہو جائے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس کو چلتے رہنا چاہیے۔ اس عمل کے علاوہ ہر عمل قینچی والا نظر آتا ہے جس کا اثر عام زندگی میں اترتا چلا جارہا ہے۔ اب سیاسی پارٹیوں کے ممبروں کے دلوں کو ٹٹولیں تو بالکل صاف دل پانچ فی صد نکل آئیں تو بہت غنیمت ہے ورنہ دلوں کا چوتھائی حصہ تو دو قومی نظریے سے بھرا ہوا ہے۔ حد یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹیوں میں بھی ایسے اثرات اسی تناسب سے ملیں گے۔ یہ یاد کیجیے کہ کمیونسٹ پارٹی نے آخر تک اس بات کی حمایت نہیں کی کہ اردو کو اتر پردیش میں دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ جہاں کوئی قینچی والی تحریک چلتی ہے، زہریلے اثرات بھڑک اٹھتے ہیں اور ایسے بھڑک اٹھتے ہیں کہ معقولیت منھ چھپا کر غائب ہو جاتی ہے۔

ان حالات میں اگر اردو والے کوئی جارحانہ تحریک چلاتے ہیں تو یکی بات ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے اندر کے قینچی والے جذبات بھڑک کر دوگنے ہو جائیں گے۔ اردو کے معاملے میں سب سے زیادہ

متوازن جماعت کانگریس رہی ہے لیکن اس نے بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان تسلیم کرنے میں کتنی دیر لگادی۔ خود کانگریسی ممبران قانونیہ میں ایک جماعت اس مطالبے کے خلاف پیدا ہوگئی تھی اور ایک ممبر اسمبلی باقاعدہ اس مطالبے کی مخالفت میں لیڈر بن کر کھڑے ہوگئے تھے۔ ہندی د میں جو لوگ سب سے زائد متوازن سمجھے جاتے تھے وہ تک اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کیے جا کے خلاف ہوگئے تھے۔

اردو کے مخالفوں کی مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کی تحریک کو فرقہ وارانہ قرار دے کر اس کو ہندو مسلم فساد کا شکار بنا دیں۔ مثال میں وہ واقعہ لیجیے کہ دستخطی مہم کی کامیابی پر جب گنگا پرشاد ہال لکھنؤ میں جلسہ ہو رہا تھا تو اس پر ہندی والوں نے باضابطہ حملہ کر دیا تھا ان کے نعرے یہ تھے۔ "اردو کے طلب گار ہیں۔ ملک کے غدار ہیں۔ پھانسی کے حقدار ہیں" کیسے فرقہ وارانہ جذبات سے بھرے ہوئے تھے یہ نعرے! ان کے حملے کو روکنے کے لیے میں اپنے کچھ جانباز والنٹیروں کے ساتھ گیٹ پر کھڑا ہوگیا اور ہم اردو مخالفوں کے ڈنڈوں، گھونسوں اور چھریوں کا سامنا کرنے لگے۔ کسی نے میری گردن پر چھری ماری لیکن اسی وقت کسی منچلے نے میرے پیٹ پر بھی گھونسہ مار دیا جس سے میری گردن ہل گئی اور چھری مارنے والے کا نشانہ چوک گیا۔

ہم سب یہ سوچ کر جان پر کھیل گئے تھے کہ اگر ہندی والوں نے اردو کانفرنس پر حملہ کر اور کچھ لوگ مارے گئے یا زخمی ہوگئے تو شہر میں فساد ہو جائے گا۔ جس پر ہندی اردو فساد لیبل لگا دیا جائے گا۔ انجمن والوں کی مسلسل کوشش رہی کہ اردو تحریک کو کسی حال میں ہن اردو فساد میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے لیکن ہندی والے اس کا بالکل الٹا چاہتے ہیں۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو آج اردو تحریک ایک طرح کی بابری مسجد تحریک بن گئی ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو تحریک کا راستہ اِدھر بھی آگ اور اُدھر بھی آگ۔ وہ راستہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ اس پر چلنے کے لیے بہت کچھ دیکھنے اور برابر سننے سمجھنے کی ضرورت ہے۔
واقعہ تو یہ ہے کہ اردو کے مخالف ایک ایسی دنیا کی تلاش میں ہیں جس کا وجود ختم ہو چکا ہے ۔

پرانا زمانہ روانہ ہوا!
نیا دن نیا کارخانہ ہوا

جمہوریت، عام بیداری، اخبار، سائنس اور تعلیم نے دنیا بدل دی ہے۔ صرف ایک دلتوں کا ہی مسئلہ کافی ہے اس خواب کو ختم کر دینے کے لیے۔ لیکن جب تک یہ خواب حقیقتوں سے ٹکرا کر چکنا چور نہیں ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے قسم کے جھگڑے بھی رہیں گے۔ پنجاب و کشمیر کے قسم کے ہنگامے بھی چلتے رہیں گے اور اس وقت تک اردو کا مسئلہ بھی ابھار رہے گا۔ لیکن یہ بات بھی پکی ہے کہ ایسے مسئلے بھی وہ حقیقتیں ہیں جو بیداری لے کر آ سکتے ہیں۔ اس لیے اردو والوں کو سچ کا یقین لے کر مسلسل جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔

یہ واضح رہے کہ ہم لوگ صفر سے چلے تھے اور ہر قدم پر ایک مہابھارت تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے بلا کوئی خوفناک طوفان اٹھائے ہم کافی میدان جیت چکے ہیں اور ہر جیت آگے کی فتح کی ضمانت ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

عظیم الشان صدیقی

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو تحقیق کی صورت حال

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اگرچہ اردو کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے لیکن دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں اس کا اردو خاصا نو عمر ہے۔ ۱۹۷۲ء میں جب جامعہ ملیہ میں ایم۔ اے کی سطح پر اردو تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو شعبہ کے علاحدہ قیام کی ضرورت بھی محسوس کی گئی اور ریسرچ میں داخلوں کی اجازت دی گئی۔ ان بیس برس (۱۹۷۲ - ۹۲) میں یوں تو ایک سو سے زائد طلباء نے ریسرچ میں داخلہ لیا اور رجسٹریشن کرا کے کام شروع کیا لیکن ان میں سے صرف بیس[۲۰] طالب علم ہی ایسے خوش نصیب ثابت ہو سکے جو مقررہ وقت اپنا کام مکمل کر سکے اور جامعہ ملیہ کی طرف سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے سرفراز کیے جا سکے ورنہ ا حضرات نے ریسرچ کو بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا یا پھر وہ روزی روٹی کے چکر میں اس طرح گرفتار کہ یہ بھول ہی گئے کہ انھوں نے بھی کبھی کوئی خواب دیکھا تھا۔

تحقیق کا کام صرف محنت اور لگن ہی نہیں چاہتا ہے بلکہ مقصد کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ کوئی کلرک یا پرائمری اسکول کا ٹیچر بننے کے لیے تو ریسرچ نہیں کرتا ہے اور اگر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگر بھی اعلیٰ تعلیمی اور غیر تعلیمی اداروں میں ملازمت نہیں دلوا سکتی تو پھر کوئی ریسرچ میں آنکھیں ٹپکائے البتہ موضوع کی اہمیت اور افادیت تحقیق سے رشتہ استوار رکھنے میں ضرور معاون ثابت ہو سکتی ہے لیکن جب سے یونیورسٹیوں میں تحقیق کے نام پر حیات و خدمات پر کام کرائے جانے د با چلی ہے یہ بھرم بھی جاتا رہا ہے کہ اس نے کسی ایسے موضوع پر کام کیا ہے جسے ادب اور تحقہ

ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

یہ مقالہ آل انڈیا یونیورسٹی اردو ریسرچ سیمینار بھوپال میں پیش کیا گیا تھا۔

کی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اس پر کام کے آغاز ہی میں یہ احساس شدت سے طاری ہونے لگ ہے کہ محنت کوئی کرے اور نام ونمود اور شہرت کسی اور کے حصہ میں آئے۔ ایسی صورت میں ابتدا ہی میں رلیسرچ اسکالر کے حوصلوں کا پست ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور اگر کسی نے گرتے پڑتے اپنا کا مکمل کر بھی لیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بغل میں دبا کر انٹرویو کی دہلیز تک پہنچ بھی گیا تو اس پر اینکش جان لیوا ثابت ہوتا ہے کہ اس نے جس موضوع پر کام کیا ہے وہ تحقیق کا موضوع ہی نہیں تھا یا اس پر زیادہ سے زیادہ ایم۔ اے کے لیے مقالہ لکھا جا سکتا تھا۔ اس نے ناحق ہی ادب و تاریخ سے اپنا رشتہ توڑ کر اپنی تمام صلاحیتوں اور قوتوں کو کسی ایسی شخصیت پر نثار کر دیا جو اس کی مستحق ہی نہیں تھی لیکن اب وہ کیا کرے۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا وہ ڈی لٹ کے لیے کام کرے یا پھر اپنے ہی لو کو اٹھائے شرمندہ پھرے۔ یہ کشمکش کس قدر قاتل ثابت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ ریسرچ اسکا ہی لگا سکتا ہے۔

حیات و خدمات پر کام کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے لیکن کسی زبان و ادب میں سو پچاس سا میں ایسی کتنی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں جن کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی کارنامے ادب میں اضافے کا سبب بن سکتے ہیں یا جنھیں نئے طرزِ فکر اور نئے اسلوب و روایت کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ادیب و شاعر اور محققین کی تعداد ہر دور میں محدود ہوتی ہے لیکن ان پر بھی کتنی یونیورسٹیوا میں اور ان کے کتنے پہلوؤں پر کام کرایا جا سکتا ہے اور اگر وہ شخصیات اتنی ہی اہم ہیں کہ ہر یونیورسٹ ان پر تحقیقی کام کو اپنے لیے افتخار کا سبب تصوّر کرتی ہے تو پھر اس کے لیے ایسی منصوبہ بندی بھی ضروری ہے جو اس شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لا سکے اور ہماری تحقیق تکرار بے جا سے بھی محفو رہ سکے لیکن اس بھیڑیا چال کو کیا کہیں جو دو چار درجن مقالے لکھے جانے کے بعد بھی یہ احساس دلا ہے کہ ہماری تحقیق ہنوز بسم اللہ کے گنبد میں بند ہے اور جب پہلے کیے گئے کاموں کی نقل ہی کرا ہے تو پھر تیشہ اٹھا کر فرہاد بننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں کو عام طور پر یہ شکایت ہے کہ ان کے پاس موضوعات نہیں رہے۔ اس لیے جو بھی موضوع سامنے آجاتا ہے وہ ہی ریسرچ اسکالر کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس کے معنی سہل پسندی۔ علاوہ یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یونیورسٹیوں کو تحقیق کے مقابلے میں طلباء کی تعداد سے زیادہ دلچسپی ہے

کسی زمانے میں ریاست کی وسعت، شان و شوکت اور امارت کا اندازہ غلاموں کی تعداد سے لگایا جاتا تھا اب اس کی جگہ ریسرچ اسکالروں کی تعداد نے لی ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں ترقی کا اندازہ تعداد سے لگایا جاتا ہے حالانکہ ترقی کا اصل پیمانہ موضوع و معیار اور اضافہ ہونا چاہیے۔ اور جہاں تک موضوعات کا سوال ہے کسی زبان و ادب میں اس کا ذخیرہ کبھی کم نہیں ہوتا ہے۔

لیکن اچھے موضوعات تحقیق کے مقاصد متعین ہونے کے بعد ہی سامنے آسکتے ہیں۔ کیا آپ زبان وادب کو زندگی کی تفہیم کا ذریعہ یا اس کے برعکس زندگی کو زبان وادب کی تفہیم کا ذریعہ تصور کرتے ہیں کیا آپ زبان وادب کے آئینہ میں فکر انسانی اور احساسِ جمال کے بتدریج ارتقا یا اس کے برعکس زبان وادب پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ کیا آپ زبان وادب میں متنوع انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و معاشرت اور اس کی نفسیاتی پیچیدگیوں کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں یا زبان وادب کی گمشدہ کڑیوں کو جوڑنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ زبان وادب کی تعمیر و تشکیل میں کون سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ کیا آپ یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کس طرح عام زندگی اور زبان وادب کو متاثر کرتا ہے یا ادب کس طرح زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور زبان وادب، ملکوں اور قوموں کے عروج و زوال میں کس طرح کا کردار ادا کرتا ہے۔ کیا آپ کا تجسس یہ معلوم کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ ایک ہی سیاسی معاشی نظام اور ایک ہی جغرافیائی حدود میں مختلف زبانوں میں نشو و نما پانے والے ادب میں کیا کیا امتیازات اور مماثلتیں ہوتی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں۔ یا پھر یہ سیدھا سادہ سا سوال آپ کے سامنے ہے کہ ادب اور زندگی کا کیا تعلق ہے اور یہ تعلق کس طرح انسانی رشتوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہاں تک ادب میں ژولیدہ بیانی، مہمل گوئی، زندگی سے فرار، جنسی جذبوں کی ورش اور جذباتیت کی افراط بھی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں۔

اور اگر یہ یا ان میں سے کچھ مقاصد آپ کے پیش نظر ہیں تو پھر موضوعات کی قلت اور قحط کا مسئلہ کبھی پیش ہی نہیں آسکے گا۔ زبان وادب کی طرح تحقیق بھی بصیرت اور مسرت فراہم کرتی ہے اور جو لوگ ادب میں بصیرت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی تحقیق کے ذریعہ حاصل ہونے والی مسرت اور بصیرت اور فکر کی اہمیت اور امتزاج سے انکار نہیں کر سکتے ہیں۔ تو پھر اردو تحقیق سمت و رفتار

بحران میں کیوں مبتلا ہے کیا اسے اصناف و ادوار، زبان و بیان، ادب کے تہذیبی، تاریخی اور سماجی رشتوں لسانیاتی اور عمرانی رابطوں، ادبی فلسفوں، تصورات، ادب کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں اور دیگر عوامل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جن پر مختلف زاویوں سے کام ہو سکتا ہے۔

تحقیقی مقالے نہ صرف نئے حقائق کو سامنے لانے کا سبب بنتے ہیں بلکہ وہ زبان و ادب کی تاریخ کی تدوین و تصنیف میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اردو میں ایسے لاتعداد موضوعات موجود ہیں جن پر ابھی تک کام نہیں ہوا ہے اور جو زبان و ادب کی تاریخ کے لیے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی اگر اردو زبان کے آغاز اور اس کے سرچشموں کی تلاش کے لیے ضروری ہے تو امیر خسرو سے قلی قطب شاہ تک کا زمانہ اردو ادب کے آغاز کے اعتبار سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور جب تک اس عہد پر مختلف زاویوں سے کام نہیں ہو گا۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی اور وہ سیاسی و سماجی غلط فہمیاں دور نہیں ہو سکیں گی جو شمشیر برہنہ کی طرح اردو کے سر پر لٹکی ہوئی ہیں۔

اسی طرح اردو کا دکھنی ادب زبان و ادب کی تاریخ میں اساسی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ کیسی تلخ حقیقت ہے کہ شمالی ہند تو پہلے ہی اس اہم کام سے دستبردار ہو چکا ہے لیکن اب جنوبی ہندوستان میں بھی کلاسیکی اور قدیم دکھنی ادب سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے جب کہ اس موضوع پر نہ صرف کام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ شمالی ہندوستان کی ہر یونیورسٹی میں دکھنی ادب کو پڑھانے کے لیے ماہر دکھنیات کی ضرورت ہے۔

جہاں تک اصناف و ادوار کا تعلق ہے ہماری یونیورسٹیوں میں اگرچہ ان موضوعات پر خاصا کام ہو رہا ہے لیکن یہ کام کس نوعیت کا ہے۔ کیا ان مقالات میں اصناف و ادوار کی روح سمٹ کر آ گئی ہے۔ کیا وہ ادب اور زندگی کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتے ہیں کیا ان کا معیار تسلی بخش ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات ان مقالات میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مقالات فہرست سازی کی حدود تک ہی محدود ہیں اور اب جب کہ وضاحتی کتابیات اشاریے اور فہرست سازی کا کام لائبریریوں نے شروع کر دیا ہے۔ یہ کام تحقیق کے دائرے سے خارج ہو گیا ہے۔ تحقیق معروضی تنقید کا مطالبہ کرتی ہے لیکن سہل پسندی نے اس اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ہمیں اپنے

ادب کو سمجھنے کے لیے مستشرقین کا سہارا لینا پڑتا ہے۔یا پھر چبائے ہوئے لقموں کو ہی بار بار چبا
میں مصروف رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا ادب ہمارے ماضی کی میراث ہے اور مخصوص حا
کا نتیجہ ہے جس کو ہندوستان کے تہذیبی پس منظر ہی میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ ہمارے خوا
طرح مستقبل کی امانت ہوتے ہیں۔اسی طرح ماضی کا ورثہ بھی ہیں جن کے ارتباط و اختلاط سے انف
اور اجتماعی زندگی کا نقشہ مرتب ہوتا ہے۔

جہاں تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تحقیقی کاموں کا تعلق ہے گزشتہ بیس برسوں میں وہاں مت
موضوعات پر کام ہو چکا ہے۔

(۱) اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم۔تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (۲) اکبر الہ آبادی کی شاعری کا ت
و تنقیدی مطالعہ (۳) پروفیسر محمد مجیب، حیات اور خدمات (۴) خواجہ غلام السیدین۔ حیات اور
(۵) اردو میں بچوں کا ادب (۶) بیدی اور اس کا فن (۷) ادبی نثر کا ارتقا (۱۸۵۷ء–۱۸۰۰ء) (۸)
میں خود نوشت سوانح نگاری (۹) اردو میں یوروپین زبان سے شاعری کے ترجموں کا تحقیقی اور تنق
مطالعہ (۱۰) اردو ناول میں طنز و مزاح (۱۱) مسعود حسین رضوی۔حیات اور خدمات (۱۲) اردو لغت
کا تنقیدی مطالعہ (۱۳) اسد اللہ وجہی۔ حیات اور خدمات (۱۴) یونیورسٹی درجات کے اردو نص
کا تنقیدی مطالعہ (۱۵) مرزا رسوا کے ناولوں کا سماجیاتی مطالعہ (۱۶) انیسویں صدی میں اردو شا
کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (۱۷) اردو و ہندی کی رومانی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (۱۸) ا
کے پس منظر میں تحریک آزادی کا سماجیاتی اور تاریخی مطالعہ (۱۹) اردو غزل کا فنی، تاریخی اور
مطالعہ (۲۰) میر انیس کے بعد اردو مرثیہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔

مذکورہ مقالات میں سے اول الذکر بارہ مقالات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں جن کے
سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان مقالہ نگاروں نے کس محنت اور لگن سے کام کیا ہے۔ان
بعض مقالات صرف تحقیق تک ہی محدود ہیں اور بعض مقالات میں تحقیق کے ساتھ معروضی اور
تنقید کے عناصر بھی موجود ہیں اور جو مقالات شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ان کے بارے میں یہ کہنا در
نہ ہوگا کہ وہ معیار سے کم تر ہیں۔ مقالہ لکھنا ایک الگ فن ہے اور تحقیقی مقالے کو کتاب کی شکل
تبدیل کرنا، اس کی اشاعت و فروخت کا انتظام کرنا ایک الگ فن ہے جس میں دسترس حاصل کر

ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اچھے مقالے اشاعت سے محروم رہ جاتے ہیں
اردو میں ایم۔ اے کرنے کے بعد بیشتر طلباء کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ تعلیم کے سلسلہ کو آئندہ بھی جاری رکھیں۔ یونیورسٹیوں میں ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے اور ریسرچ میں داخلہ کی شرائط بھی آسان ہیں۔طلباء کو ماہانہ فیس بھی ادا نہیں کرنی پڑتی ہے اور بعض یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل کی ڈگری کے بغیر ہی صرف ۵۵٪ نمبروں پر ریسرچ میں داخلہ مل جاتا ہے۔کشش کے یہ وہ پہلو ہیں جو طلباء کو اپنی طرف راغب کرتے ہیں لیکن ان یونیورسٹیوں میں داخلہ کا طریقہ کار خاصا صبر آزما ہے طلباء کو اکثر سال سال بھر بورڈ آف ایڈوانس اسٹڈیز کی میٹنگ کا انتظار کرنا پڑتا ہے جو ان کے حوصلوں کو پست کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلے کے وقت ان کی تعداد نصف سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ یونیورسٹیوں کو اپنا طریقہ کار بدلنا چاہیے اور ریگولر طلباء کی طرح ریسرچ اسکالر کو بھی اگست وستمبر میں داخلے کے لیے مواقع فراہم کرنے چاہئیں اور جو طلباء دیر میں اپنا ذہن بنا پاتے ہیں ان کو ایک موقع سال کے آخر میں بھی فراہم کرنا چاہیے تاکہ ایم۔اے کے بعد بیکاری کے وقفہ میں ان کا ذہن بھٹکنے سے بچ جائے۔

گزشتہ چند سالوں سے زبان وادب کے طلبا اور خصوصاً علوم مشرقیات سے تعلق رکھنے والے ان طلباء کو ایک اور دشواری کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو مدارس اور پاٹ شالوں سے تعلق رکھتے ہیں یا جنھوں نے باقاعدہ کسی اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ایسے طلباء محض انگریزی کا امتحان دے کر بی۔اے اور پھر اسی مضمون کا پرائیویٹ امتحان دے کر ایم۔اے تو ہو جاتے ہیں اور ریسرچ میں داخلہ کے مستحق بھی قرار پاتے ہیں۔ لیکن یونیورسٹیوں میں ان کے بارے میں کوئی واضح پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے انھیں تذبذب سے گزرنا پڑتا ہے۔ان میں بعض طلباء اچھے بھی ہوتے ہیں لیکن باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی صلاحیتوں کا مناسب اظہار نہیں کر پاتے۔ یونیورسٹیوں اور خصوصاً اردو شعبوں کو ان طلباء کے بارے میں کوئی واضح پالیسی اختیار کرنی چاہیے اور جہاں ایم۔فل کا کورس نہیں ہے وہاں ایسے طلباء کو کسی موضوع پر دو تین ماہ کام کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ ریسرچ میں داخلے کی ان دشواریوں کے باوجود ہر یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالروں کی خاصی بھیڑ نظر آتی ہے۔اس بھیڑ میں اگرچہ کام کرنے والوں کی تعداد کم

بس کا پاس، ریل کا سفر، لائبریری کے کارڈ و دیگر سہولتوں و اعزاز سے فائدہ اٹھانے والوں کی
تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریسرچ میں داخلہ لینے اور کامیاب ہونے والے طلباء کا
تناسب ایک اور چھ کا رہتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ صرف اٹھارہ فی صد طلباء ہی ریسرچ کی سہولتوں
سے حقیقی فائدہ اٹھا پاتے ہیں۔ اس ناکامی میں تعلیمی نظام کے علاوہ اکثر دیگر عوامل بھی شامل
ہیں۔ بعض اوقات طلباء کو کوئی ایسا موضوع دے دیا جاتا ہے جس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں
ہوتی اور طالب علم نہ تو کام ہی کرتا ہے اور نہ ہی موضوع سے دستبردار ہوتا ہے جس کی وجہ
سے بعض اوقات اچھے موضوع انصاف سے محروم رہ جاتے ہیں یا پھر موضوع اور دلچسپی کے بجائے
طلباء و اساتذہ کے درمیان مصلحتوں کے رشتے معیار کو متاثر کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

ریسرچ اسکالر کی تعداد کے اعتبار سے اگر جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو کا جائزہ لیا جائے تو یہ
تعداد خاصی حوصلہ افزا معلوم ہوتی ہے اس وقت شعبۂ اردو میں تینتیس طلباء مندرجہ ذیل موضوعات
پر کام کر رہے ہیں۔

(۱) اردو زبان و ادب کی ترقی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا حصّہ (۲) اردو ڈرامے کا تنقیدی مطالعہ
۱۹۳۶ء کے بعد (۳) فیض احمد فیض کی شاعری کا فنی اور جمالیاتی مطالعہ (۴) الطاف حسین حالی
حیات و شخصیت۔ علمی اور ادبی خدمات (۵) ناول اور افسانہ نگار بلونت سنگھ (۶) منٹو کی افسانہ
نگاری کا تنقیدی مطالعہ (۷) ولی کی غزل گوئی کا تنقیدی مطالعہ (۸) میر ناصر علی دہلوی حیات اور
ادبی خدمات (۹) اردو میں اصلاح سخن کی روایت (۱۰) احسن مارہروی کی خدمات (۱۱) ڈاکٹر
عابد حسین۔ سوانح اور ادبی خدمات (۱۲) عزیز احمد۔ علمی اور ادبی خدمات (۱۳) اردو غزل دتی
میں ۱۹۴۷ء کے بعد (۱۴) ہندوستان کے اردو افسانوں میں احتجاجی میلانات (۱۵) اردو نظم میں
ترقی پسند عناصر ۱۹۳۶ء کے بعد (۱۶) اردو نثر کے ارتقا میں مذہبی تصانیف کا حصہ (۱۷) بشیر الدین
حیات اور علمی و ادبی خدمات (۱۸) آزادی کے بعد اردو ناول کا تنقیدی مطالعہ (۱۹) نئی نظم کا
سماجیاتی مطالعہ (۲۰) مولانا محمد علی جوہر۔ حیات اور علمی و ادبی خدمات (۲۱) بیسویں صدی میں
اردو غزل (۲۲) فرہنگ کلیات نظیر اکبر آبادی مع مقدمہ و تنقید (۲۳) اردو شاعری پر تقسیم ہند
کے اثرات (۲۴) سجاد ظہیر۔ حیات اور ادبی خدمات (۲۵) ہندوستان میں اردو اسٹیج ڈرامے

کی روایت کا سماجیاتی مطالعہ ۱۹۳۶ء کے بعد (۲۶) شبلی بحیثیت سوانح نگار (۲۷) اردو نثر کے ارتقا میں جامعہ کا حصہ (۲۸) اردو فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات (۲۹) اردو خاکہ نگاری کا تنقیدی مطالعہ (۳۰) اردو کی ادبی نثر کے ارتقا میں راشد الخیری کا حصہ (۳۱) اصلاح سخن کی روایت دہلی میں داغ دہلوی کے بعد (۳۲) اردو غزل میں پیکر تراشی، ۱۹۴۷ء کے بعد (۳۳) عصمت چغتائی کے فن کا تنقیدی مطالعہ۔

ان میں بعض ایسے طلباء بھی شامل ہیں جو ریسرچ اسکالر ہونے کے افتخار سے محروم ہونا نہیں چاہتے ہیں اور مدت گزر جانے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح دوبارہ داخلہ لینے میں کامیاب ہو جاتے رہیں۔

مذکورہ موضوعات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں دو موضوع تو ایسے ہیں جن کا تعلق جامعہ ملیہ سے ہے۔ پندرہ موضوعات اصناف و ادوار اور رجحانات سے تعلق رکھتے ہیں اور سولہ موضوعات حیات وخدمات کے زمرے میں آتے رہیں۔

ریسرچ اسکالر کی مذکورہ تعداد اگرچہ خاصی وقیع معلوم ہوتی ہے لیکن یہ دہلی کی دیگر یونیورسٹی کے مقابلہ میں کہیں کم ہے۔ دہلی میں جامعہ ملیہ کے علاوہ جواہرلال نہرو یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی بھی موجود ہیں جنھیں جامعہ ملیہ کے مقابلہ میں کئی اعتبار سے فضیلت حاصل ہے۔ نہرو یونیورسٹی میں کل ہند سطح پر مقابلے کے امتحان کے بعد طلباء کو داخلہ دیا جاتا ہے، اور بیشتر طلباء کو وظیفہ بھی ملتا ہے۔ یہاں ہوسٹل، ریسرچ لائبریری اور کینٹین وغیرہ کی بہتر سہولتیں بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے پی ایچ ڈی میں ایم فل کی شرط ہونے پر بھی طلبا اس کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ ریسرچ کی یہ سہولتیں کم و بیش دہلی یونیورسٹی میں بھی موجود ہیں۔ لیکن یہاں طلباء کی تعداد میں اضافہ کا سبب اس کے ملحقہ کالج ہیں۔ لیکن جامعہ ملیہ کے پاس اس طرح کی سہولیات نہیں ہیں اس لئے اسے مقامی طلباء پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن مانوس ماحول اور خوش گوار فضا کے باوجود سال دو سال ان طلباء کی سمجھ میں یہی نہیں آتا ہے کہ وہ کس طرح ریسرچ کریں اور یہ صورت کچھ جامعہ ملیہ ہی میں نہیں ہے بلکہ ہر یونیورسٹی جہاں ایم فل کا کورس شروع نہیں کیا گیا اسی طرح کے مسائل سے دوچار ہے۔ لیکن جامعہ ملیہ میں بعض مصلحتوں کی وجہ سے ابھی یہ کو

شروع نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تعلیمی مسائل کا حل نہیں ہے۔ تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے ان کو فراہم کر کے ہی بہتر نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔

تحقیق کل وقتی کام ہے جو دوئی اور رقابت کو برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ چنانچہ جن طلباء کو سلسلہ حیات برقرار رکھنے کے لیے دیگر پیشوں کا سہارا لینا پڑتا ہے انھیں اس میدان میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملتی۔ ریسرچ کے دوران ایک طالب علم کو پانچ سو سے آٹھ سو کے درمیان روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اب سے چند سال قبل تک ہر یونیورسٹی کے پاس کچھ اسکالرشپ ہوا کرتے تھے جن سے ضرورت مند اور لائق طلباء کو استفادہ کا موقع مل جاتا تھا لیکن جب سے یہ اختیار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور مقابلے کے امتحان کی شرط عائد کر دی ہے۔ عام یونیورسٹیاں اچھے طلباء سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔

موجودہ سماج میں اگرچہ مقابلے کی دوڑ زندگی کا لازمی حصہ ہے جس کے لیے ہر طالب علم کو تیار رہنا چاہیے لیکن تحقیق کے میدان میں اس کے بہتر نتائج برآمد ہونے کی توقع کم ہے اسکالرشپ کے امتحان میں کامیابی کے لیے اگر ذہانت کی ضرورت ہے تو ریسرچ اور تحقیقی کام صبر و تحمّل، محنت اور لگن کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ اوصاف ذہین طلباء میں شاذونادر ہی نظر آتے ہیں اور وہ اپنا کام مکمّل کرنے سے قبل ہی دوسرے شعبوں کا حصہ بن جاتے ہیں پھر اسکالرشپ پانے والے طلباء کے پاس ترجیحات کی بھی ایک طویل فہرست ہوتی ہے وہ ان ہی یونیورسٹیوں میں داخلہ لیتے ہیں جہاں تمام سہولتیں موجود ہوتی ہیں چنانچہ مقابلے کے امتحان شروع ہونے کے بعد جامعہ ملیہ جیسی یونیورسٹیاں اچھے طلباء سے محروم ہوتی جارہی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اگر جونیر اور سینیر فیلوشپ کو اپنے اختیار میں رکھنا چاہتی ہے تو ضرور رکھے لیکن اسے باذوق اور محنتی طلباء کے لیے بھی ایسے "سب جونیر فیلوشپ" بھی جاری کرنے چاہئیں جو یونیورسٹی کے اختیار میں ہوں اور جنھیں مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد

جونیر فیلوشپ میں تبدیل کیا جا سکے۔

تعلیمی مشاغل اور تحقیقی کام اگرچہ آزادی چاہتے ہیں لیکن ہر یونیورسٹی کی اپنی ایک شناخت اور اپنا ایک امتیاز ہوتا ہے۔اسی کے مطابق ہر یونیورسٹی ریسرچ کے سلسلے میں اپنے منصوبے بناتی ہے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو حال ہی میں سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ ملا ہے اور یہ اپنے عبوری اور تشکیلی دور سے گزر رہی ہے۔ لیکن ہر یونیورسٹی کی طرح اس کی اپنی انفرادیت اور شناخت کیا ہوگی اس کا تعین اسی کے تحقیقی منصوبے ہی کر سکیں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موجودہ وائس چانسلر صاحب کی موجودگی میں بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی رہنمائی میں جامعہ اپنی انفرادیت قائم کر سکے گی۔

بیان ملکیت ماہنامہ 'جامعہ' اور دیگر تفصیلات

بمطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۲۔ وقفہ اشاعت : ماہانہ   ۳-۴۔ پرنٹر و پبلشر : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی   پتہ ۔ ۹-۳۴۳۔ ذاکر نگر، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۵۔ ایڈیٹر : ڈاکٹر سید جمال الدین   قومیت : ہندوستانی

پتہ : ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

— جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط : پرنٹر و پبلشر : عبداللطیف اعظمی   جون ۱۹۹۲ء

صغرا مہدی

عصمت کی افسانہ نگاری
اور
اردو کی افسانہ نگار خواتین

اردو افسانے میں سب سے زیادہ توانا روایت پریم چند کی روایت ہے جس نے براہ راست اور بالواسطہ اردو کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا ہے اس سے انحراف "انگارے" کی اشاعت سے ہوتا ہے۔ "انگارے" کے افسانوں میں سماج کے مروجہ نظام اخلاق اور سماجی رویوں کے خلاف بغاوت کا اعلان تھا۔

یہ افسانے ہندوستان کی نئی نسل کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ وہ نسل جو موجودہ سیاسی نظام سے بیزار تھی۔ بھوک، نابرابری، کمزور طبقوں کا استحصال، ریاکاری اور جنس ان افسانوں کا موضوع تھا اور تکنیک میں بھی یہ افسانے اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کے افسانوں سے مختلف تھے۔ اس گروہ میں ایک خاتون بھی شامل تھیں ڈاکٹر رشید جہاں۔

رشید جہاں نے خاص طور سے عورتوں کی سماجی حالت کو اپنے افسانوں میں پیش کیا مرد اور عورتوں کے لیے جو الگ الگ ضابطۂ اخلاق تھا اس کی مخالفت کی۔ آزادی تعلیم کی حمایت کی مردوں کے برابر ان کی حیثیت پر زور دیا۔ رشید جہاں نے اردو افسانے میں احتجاج کی جو آواز اٹھائی تھی اس کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا عصمت چغتائی نے۔

عصمت ایک سرکش اور ضدی طبیعت کی مالک تھیں۔ انھیں بچپن سے ہی مروجہ سماجی ضابطوں سے چڑھ تھی اور ان کو توڑنے کی شدید خواہش تھی۔ انھوں نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ رشید جہاں

ڈاکٹر صغرا مہدی، ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵۔

اور ترقی پسند تحریک نے انھیں راہ دکھائی اور وہ بہت جرأت اور خود اعتمادی کے ساتھ بقول قرۃ العین حیدر "ڈنڈا سنبھالے افسانے کے میدان میں اتر آئیں" عصمت میں افسانہ نگاری کی بے پناہ صلاحیت تھی زبان پر قدرت تھی مشاہدہ تیز تھا ان کی تیز نظریں دور سے اپنے شکار کو دیکھ لیتی ہیں اور وہ اس کو اپنی گرفت میں لے کر اس پر عمل جراحی شروع کر دیتی ہیں۔ بظاہر وہ بے درد جراح نظر آتی ہیں لیکن اصل میں انھیں اپنے شکار سے شدید ہمدردی ہوتی ہے۔ اس کی بے بسی پر ان کا دل خون روتا ہے۔ وہ اس پر روتی نہیں اس سے اظہار ہمدردی بھی نہیں کرتیں۔ بلکہ ان کو اس صورت حال پر شدید غصہ آتا ہے کہ ایسا کیوں ہے مگر پڑھنے والے کو اس سے شدید ہمدردی کا احساس ہوتا ہے اور اس صورتِ حال کے خلاف ایک نفرت اور غصے کا احساس بھی۔ یہ کیفیت چوتھی کے جوڑے میں بھی ہے اور ننھی کی نانی، گیندا اور ان کے مشہور و بدنام ترین افسانے لحاف میں بھی۔

عصمت کی وہ کہانیاں جن کا موضوع جنس ہے اس کو حد سے سوا اہمیت دی گئی اس کو کچھ زیادہ سراہا گیا اور خواہ مخواہ مخالفت بھی کی ترقی پسندوں نے بھی اس کو ناپسند کیا۔ ترقی پسند ادیب عزیز احمد نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ انھوں نے جنسی موضوعات پر جو افسانے لکھے ہیں ان میں ترغیب کا پہلو غالب آگیا ہے اور یہ مشورہ دیا ہے کہ ان کو ان موضوعات کو اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ کراہیت ترغیب پر غالب آجائے اور فتویٰ بھی دیا ہے کہ ان کے یہ افسانے گمراہ کن ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عصمت کا مقصد جنس نگاری کبھی نہیں رہا۔ انھیں تو جس طبقے کی زندگی دکھانی تھی اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے "جنس کا موضوع گھٹے ہوئے ماحول اور پردے میں رہنے والی بیویوں کے لیے بہت اہم ہے وہ اس پر بہت بات چیت کرتی ہیں اور افسانہ نگاری اس گھٹے ہوئے ماحول کی عکاسی کی ہے ــــ فوٹو گرافی ہے۔"(۱) عصمت نے اس کی عکاسی اس طرح کی کہ نہ اس میں لذتیت ہے نہ عریانیت اور انھوں نے اسے بجا طور پر "غسل آفتاب" سے تعبیر کیا ہے۔
عصمت نے بوڑھی عورتوں کی نفسیات پر بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے خود اس بات کا تذکرہ کیا تھا کہ ان کے ان افسانوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا اور ان کے وہ افسانے

---

(۱) انٹرویو گوشۂ عصمت۔ شاعر ۱۹۷۵ء۔

جن کا موضوع جنس ہے ان کی ہی تعریف ہوئی ہے یا تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس موضوع پر "ننھی کا نانی" او ر "بچھو پھوپی" ان کی بہت خوبصورت کہانیاں ہیں۔ انھوں نے بمبئی جانے کے بعد نئے ہندوستان کے نئے مسائل پر بڑے شہروں کی زندگی اور وہاں پر عورتوں کا جو استحصال ہو رہا ہے اس کو اپنے مخصوص انداز میں بہت خوبی سے پیش کیا۔ عصمت کی انفرادیت ان کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے انداز بیان میں ہے جس میں طنز ہے، تیکھا پن ہے ان کا باغیانہ لہجہ دو ٹوک بات کہنے کا انداز یہ خوبیاں جنھوں نے افسانوں کو مؤثر بنایا ہے۔

عصمت کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی بالخصوص عورتوں کی زندگی کے ان پہلوؤں کی عکاسی کی جن پر لوگوں کی یا تو نظر نہیں جاتی تھی یا پھر وہ ان پر لکھتے گھبراتے تھے عصمت نے ان کی بھرپور عکاسی کی۔ افسانے کو ایک نئی راہ دکھائی اور افسانہ نگاروں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔

جن افسانہ نگار خواتین نے خاص طور پر عصمت کا اثر قبول کیا ان میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور صدیقہ بیگم، سرلا دیوی، جیلانی بانو اور واجدہ تبسم ہیں۔

ان میں ہاجرہ مسرور سب سے زیادہ عصمت سے متاثر نظر آتی ہیں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ہائے اللہ" شائع ہوا تو اس میں کئی افسانے جنس کے موضوع پر تھے۔ ان کا طبقہ بھی وہی تھا جس طبقے کی زندگی کو عصمت نے دکھایا تھا اور مسائل بھی کم و بیش وہی تھے مگر ان افسانوں میں عصمت کی سی بیساختگی و اشاریت نہیں تھی۔ ان کے افسانے "ہائے اللہ" اور عصمت کے افسانے "گیندا" میں غضب کی مماثلت ہے۔

تقسیم ہند کے بعد ہاجرہ پاکستان چلی گئیں اور انھوں نے وہاں کے مسائل پر زیادہ اچھے افسانے لکھے۔ انھوں نے اپنے موضوعات میں وسعت پیدا کی اور بقول شبنم اختر فرد کی ذات اور اندرونی کشمکش کی عکاسی سے ہٹ کر سماجی استحصال اور تضادات کی طرف راغب ہوگئیں۔ ان کے اسلوب پر عصمت کے گہرے اثرات ہیں۔

خدیجہ مستور نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتدا رومانی افسانہ نگاری سے کی اور پھر عصمت کی طرح سماج کی دبی کچلی ہوئی عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اس کا ذمہ دار اس سماج کو ٹھہرا جس نے عورت کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کو روا رکھا ہے۔ معاشرے کے کھوکھلے پن اور دوہرے معیار

چوٹ کی مگر اپنے دھیمے اور دردمند لہجے میں۔

سرلا دیوی اور صدیقہ بیگم کی افسانہ نگاری پر بھی عصمت کے اثرات ہیں۔ ان دونوں خواتین نے بھی اپنے افسانوں میں ان ہی موضوعات کو پیش کیا جن کی پہل عصمت نے کی تھی۔ متوسط طبقے کی بدحالی، سماج کی پابندیاں عورت کا استحصال وغیرہ۔ سرلا دیوی نے عصمت کی طرح جنس کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ عورتوں کی مجبوریوں اور محرومیوں کو موثر انداز میں پیش کیا۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوئے "کلنک" اور "چاند بجھ گیا" ان افسانوں میں انھوں نے عورت کے درد و کرب کو بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔

صدیقہ بیگم نے کچھ افسانے جنس کے موضوع پر لکھے ہیں۔ "تارے لرز رہے ہیں" ان کی اس موضوع پر کامیاب کہانی ہے۔

جیلانی بانو نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو وہ ترقی پسند تحریک کا آخری زمانہ تھا مگر عصمت کی افسانہ نگاری اپنے عروج پر تھی۔ لہٰذا انھوں نے عصمت کا انداز اپنایا۔ ان کی اس کہانی پر جس سے ان کو شہرت ملی "موم کی مریم" عصمت کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ جیلانی بانو کے افسانوں کی خصوصیت سماجی حقیقت نگاری ہے۔ انھوں نے نئے ہندوستان کے نئے مسائل کو اور اس نئے ماحول اور معاشرے میں عورت کی حیثیت کو بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے اور انھوں نے وہاں کی تہذیب، جاگیردارانہ ماحول اور نوابی خاندانوں کی زندگی کو بھی اپنے افسانوں میں دکھایا ہے اور وہاں کے محنت کش طبقے کو بھی۔ ان کے اندازِ بیان میں طنز ہے اور کبھی زہرخند بھی۔ موجودہ افسانہ نگار خواتین میں جیلانی بانو کا ایک اہم مقام ہے۔ اور وہ عصمت کی روایت کی سب سے بڑی علمبردار ہیں۔

واجدہ تبسم نے جنس نگاری کی روایت عصمت سے لی اور انداز بیان پر بھی عصمت کا اثر ہے۔ حیدرآبادی زبان بہت اچھی لکھتی ہیں۔ جب انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی تو ان سے بہت توقعات وابستہ کی گئی تھیں۔ بقول ممتاز شیریں "انھیں کہانی کہنے کا گُر آتا ہے اور پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں"[1] حیدرآباد کے معاشرے، جاگیرداری تہذیب میں عورت کے

---

(۱) معیار صفحہ ۵۵

جنسی استحصال کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور کئی اچھے افسانے لکھے مگر اس کے بعد موضوع کی یکسانیت اور اسی ماحول کی عکاسی اور زبان نے ان کے افسانوں میں بے رنگی پیدا کر دی اور جنس نگاری میں لذتیت اور عریانیت آگئی۔ اس طرح ایک ہی موضوع میں خود کو محدود کرنے کی وجہ سے واجدہ نے جو افسانے کا سفر شروع کیا تھا اس کو ادھورا چھوڑ کر وہ خاموش ہوگئیں۔ اور وہ افسانہ نگار جس میں سب سے زیادہ عصمت کی روایت کو زندہ رکھنے بلکہ آگے بڑھانے کی صلاحیت تھی، افسانوی دنیا سے رخصت ہوگئی۔

افسانہ نگاری تو خواتین عصمت سے بہت پہلے سے کر رہی تھیں۔ عورت اور سماج میں اس کی حیثیت سماج کے رسم و رواج اور معاشرے میں اس پر ظلم ان کے افسانوں کے بھی موضوع تھے مگر فرق یہ ہے کہ عصمت نے ان رقت آمیز بیانات سے اردو افسانے کو نکالا اور حالات کے خلاف بغاوت کرنے کی راہ دکھائی اور انھوں نے عورتوں کی زندگی اور ان کے مسائل بالخصوص جنسی اور نفسیاتی موضوعات کو جرأت مندی اور بیباکی سے پیش کرنے کی طرح ڈالی جیسا کہ قرۃ العین نے کہا ہے کہ "عصمت چغتائی نے اردو افسانوں اور ناولوں میں جرأت و بیباکی کی ایک نئی مثال قائم کی ان کی شعلہ بار تحریروں نے ان لکھنے والیوں کو پس پشت ڈال دیا جن کا انداز رومانی تھا اور جو دبے دبے الفاظ میں اپنی بات کہتی تھیں۔ ادب میں ان کی جگہ باغیانہ سماجی حقیقت پسندی نے لے لی۔" عصمت کی روایت اردو افسانے میں ایک اہم روایت ہے اور اس کا اثر اردو افسانہ نگاری اور خاص طور سے خواتین افسانہ نگاروں پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ان خواتین کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، موجودہ زمانے میں بھی ایسی بہت سی افسانہ نگار خواتین ہیں جن کے یہاں "باغیانہ حقیقت پسندی" ملتی ہے جو عصمت کی دین ہے۔

مسعود انور علوی کاکوروی

حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ

مشترکہ تہذیب کی علامت

انسانی زندگی میں بہت سے ایسے معاملات اور واقعات پیش آتے ہیں جہاں عقل حیران و پریشان کھڑی نظر آتی ہے۔ چونکہ ان کا تعلق دل سے ہوتا ہے اس لیے بیچاری عقل کا گزر وہاں نہیں ہو پاتا ہے ایسا ہی ایک معاملہ بلکہ واقعہ شہنشاہ عالمگیر (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء ــ ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء) کے عہد میں اودھ کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں رونما ہوا کہ ایک ظاہری علوم سے ناواقف، ان پڑھ اور امّی سپاہی کے پاس اس دور کی سب سے بڑی علمی منقولات و معقولات کی ماہر پوری عربی دنیا میں مشہور اور جانی پہچانی شخصیت حاضر ہوتی ہے اور یہی نہیں بلکہ اس بے پڑھے لکھے سپاہی کی حلقہ بگوش، نیازمند اور جاں نثار مرید بن جاتی ہے۔ عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے کہ آخر کون سی ایسی خصوصیت ہے کہ عرب و عجم میں جس کے علم کا سکہ چل رہا ہے وہ ایک ایسے انسان کے اثر میں کیسے آجاتا ہے جو لکھنا پڑھنا تک نہیں جانتا ہے۔ مگر دل کے معاملات تو اس سے کہیں سوا ہوتے ہیں۔ روحانی طاقتوں کے نمونے تو اس سے کہیں بڑھ کر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

یہ چھوٹی سی گمنام بستی بانسہ شریف (ضلع بارہ بنکی) کے نام سے مشہور ہے۔ وہ امّی سپاہی مشترکہ تہذیب کی علامت حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ اور وہ عالم درس نظامی کے بانی مشہور فاضل اجل استاذ الاساتذہ حضرت ملّا نظام الدین محمد فرنگی محلی تھے۔

اس مضمون میں ان ہی امّی سپاہی کے سلسلہ میں مختصراً گفتگو ہوگی۔ حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ریڈر شعبہ عربی، علی گڑھ۔

شاہجہاں کے زمانہ میں تقریباً ۱۶۳۸ء میں ضلع بارہ بنکی کے موضع رسول پور جو محمود آباد موضع سے قریب ہے پیدا ہوئے۔ آپ کا نانیہال بانسہ شریف تھا۔ دادھیالی سلسلہ سے سید اور نانیہالی سلسلہ سے قدوائی تھے۔

پیدائش سے قبل بعض مجذوبوں اور بزرگوں نے بشارتیں دیں جن سے آپ کی بزرگی کا پتہ چلتا ہے گویا آپ مادرزاد ولی تھے۔ والدین کی گزر بسر کا ذریعہ زمینداری سے تھا۔ اسی لیے آپ کا بچپن اسی ماحول میں گزرا۔ بچپن ہی میں مستقل طور پر اپنے نانیہال میں منتقل ہو گئے۔ ۱۲ برس کی عمر میں علم حاصل کرنے کی غرض سے ردولی شریف ضلع بارہ بنکی اپنے ایک ملازم کے ساتھ جاتے ہوئے حضرت شیخ عنایت اللہ نامی بزرگ سے ملاقات ہوئی جن کی کیمیا نظری اور صحبت کی تاثیر سے سید صاحب کی دنیا بدل گئی۔ علم ظاہری کے حاصل کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی اور یہ عالم ہو گیا کہ عارف رومیؒ کی زبان میں پکار اٹھے ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن ۔۔۔ سینہ را از عشق او گلزار کن

علم رسمی سر بسر قیل است وقال ۔۔۔ نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

(تمام کتابوں اور سب اوراق کو آگ میں جھونک کر عشق الٰہی سے اپنا سینہ گلزار بنا دو دیکھو۔) ظاہری علم صرف قیل وقال ہے جس سے نہ کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کوئی حال طاری ہوتا ہے)

سچ تو یہ ہے کہ اب دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ علم ظاہر کی ضرورت ہی نہ تھی ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت ۔۔۔ بہ غمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

(میرا محبوب نہ کبھی مدرسہ گیا اور نہ کچھ لکھا پڑھا بلکہ ایک ہی نظر میں تمام مسائل سیکھ کر مکمل استاد بن گیا)

راستہ ہی سے بانسہ شریف واپس آ گئے اور پھر آغاز جوانی میں نوکری کے خیال سے ترک وطن کیا اور متعدد مقامات پر تقریباً سات سال ملازمت کی۔ اس دوران بھی ہر طرح کے سند و مسلم فقیروں اور سادھو سنتوں سے ملتے رہے۔ غرض کہ حضرت شیخ عنایت اللہ کے حکم پر حضرت میر عبدالصمد خدانما احمد آبادی سے احمد آباد جا کر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور اجازت و خلافت کے بعد بانسہ شریف واپس آ گئے۔

تنگیٔ معاش کی وجہ سے سپاہیانہ ملازمت کرتے رہے اور جہاں کہیں ان کے حال و مقام سے کوئی آگاہ ہو جاتا وہاں سے فوراً روانہ ہو جاتے اسی لیے ہمیشہ سپاہیانہ وضع میں رہتے اور فقیرانہ لباس سے اس لیے بچا کرتے کہ کوئی ان کے مقام سے واقف نہ ہو سکے بالآخر خلق خدا کی فیض رسانی کی خاطر مستقل بانسہ شریف میں مقیم ہو گئے اور ایک عالم کو اپنے باطنی فیوض و برکات سے سرفراز کرتے ہوئے ۸ شوال

۱۳۶۱ھ/۲۴/۷اء کو وصال فرمایا اور وہیں ابدی آرام گاہ بنی۔ وصال کی تاریخ پر آپ کا عرس بھی ہوتا ہے۔
صوفیائے کرام کی پوری زندگی اس کی تفسیر ہوتی ہے کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے
اسی لیے اس دنیا سے ان کے پردہ کر جانے یعنی انتقال فرما جانے کے بعد بھی ان کا فیض جاری رہتا ہے
اور ہندو مسلمان ہر مذہب و ملت کے لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق ان سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔
چنانچہ حضرت سید صاحبؒ کا مزار بھی سفلی عملیات، جنونی امراض کے دور کرنے کے لیے اور مرادیں پوری
ہونے اور مشکلات کے حل کے سلسلے میں آپ کی نذر کا توشہ تریاق مجرب عوام میں مشہور ہے۔
سیّد صاحب نے دنیاوی ضرورتوں سے بظاہر اپنے دامن کو نہ بچایا۔ شادی بھی کی اور اللہ تعالیٰ
نے اولاد بھی عطا کی۔ البتہ قلب کو ضرور ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور ہر خیال سے فارغ رکھا۔ قلب
کی یہی فراغت اور یکسوئی تصوف کی اساس ہیں ؎

جن کے دل محو جمال کوچۂ محبوب ہیں
ساری دنیا کو نگاہوں میں وہ کیوں لانے لگے

محبت اور پریم کے سُریلے اور رسیلے بولوں سے عوام و خواص کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ بانسہ شریف آپ
میل ملاپ اور محبت کا مرکز بن گیا۔ آپ کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غریب ؒ
جس مشن کو لے کر ہندوستان آئے تھے اسی مشن کی آپ نے تبلیغ و اشاعت کی۔ اسی بنا پر ہم کو اس
کے بڑے بڑے علماء و فضلا آپ کے در دولت پر جبین عقیدت رکھے نظر آتے ہیں۔ صوفیائے کرام کا تخاط
عام طور پر سادہ لوح، سیدھے سادے عام انسان سے ہوتا ہے اسی لیے آپ نے بھی بڑی آسان لیکن
اور دلنشیں نصیحت اور تعلیم کا طریقہ اپنایا۔
ایک مرتبہ ایک بگلے کو ندی کے کنارے پر دیکھا کہ وہ اپنے شکار کی طرف متوجہ ہے اور لوگوں کے
جانے سے ذرا نہیں بھڑکتا تو کہا انسان کو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف ایسا ہی متوجہ ہونا چاہیے
آپ نے صوفیائے کرام کے عام طریقے کے مطابق ہر مذہب و ملت کے لوگوں کو سینے سے لگایا
ایکتا اور آپسی اتحاد کو فروغ دیا اور اللہ تعالیٰ کو تمام دنیا کا رب بنا کر پیش کیا۔
ماگھ کے میلے کے موقع پر الہ آباد میں ہندوؤں کے مجمع میں بھی تشریف لے گئے اور بہت سے سادھوؤں
سے ملاقات کی۔ بانسہ شریف سے ۱ کلومیٹر دور ایک بستی رام پور میں دو بیراگی جیت رام اور پرس رام

تھے جن کو آپ سے عقیدت تھی۔ وہ برابر خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ بھی ان کے یہاں تشریف لے جاتے تھے۔ بھادوں کی ۸ ویں تاریخ کو کرشن جی کی پیدائش کا دن ہے۔ پرس رام نے اپنے یہاں اس سلسلہ پر ایک مرتبہ جشن کا اہتمام کیا تو آپ بھی اس کے یہاں تشریف لے گئے۔

کبیر کے اقوال سے بھی خاصی دلچسپی تھی اور اکثر کسی نہ کسی سے کلام سنتے تھے ایک بار ان کے سلسلے میں فرمایا کہ وہ حق گو اور نکتہ شناس تھے۔ دوسرے وقت ایک صاحب سے تعلیماً یہ بھی فرمایا کہ کبیر کی مشکل سامنے موجود ہے اور کہہ رہی ہے۔

تو رام رام بھج، جگ جھگڑن دے

(تو رام رام جپے جا۔ دنیا کے جھگڑوں میں نہ پڑ۔ جھگڑنے ہیں تو جھگڑنے دے)

شیعہ سنّی اتحاد کی بھی جیسی مثال آپ نے پیش کی اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔

یہ تھا مشترکہ تہذیب کی علامت حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کا مختصر تعارف جنھوں نے زندگی کے مقصد سے انجان اور ناواقف لوگوں کو اس کا عرفان عطا کیا اور خود شناسی و خدا شناسی کی تعلیم دی۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی مطبوعات

عنوان ———— سالانہ چندہ / قیمت

۱۔ اسلام اور عصر جدید ———— پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ———— 21 -00 روپے
۲۔ نگارِ معنی ———— " ———— " ———— 35 -00 "
۳۔ ذاکر صاحب اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں " ———— " ———— 45 -00 "
۴۔ فلسفۂ اقبال ———— ایس وحید الدین ———— 30 -00 "
۵۔ سہ ماہی اسلام اور موڈرن ایج ———— 60 -00 "
ہندوستان ————
غیر ممالک (بمعہ ڈاک خرچ) ———— 23 -00 US
ہوائی جہاز کا ڈاک خرچ ———— 30 -00 US
۶۔ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید (اردو) ———— 30 -00 روپے
۷۔ سہ ماہی اسلام اور عصر جدید (سعدی نمبر ۱۹۸۹ء) ———— 30 -00
۸۔ ماہنامہ جامعہ ———— 30 -00 "

دانش اختر

مولانا حافظ شاہ محمد جان ادیب بحری آبادی

بحیثیت شاعر

ہندوستان کی مردم خیز سرزمین سے شعروادب کی متعدد مایہ ناز اور یگانۂ روزگار شخصیتیں اٹھیں جنھوں نے اپنی نواسنجی سے اصحاب ذوق کی روح کو بالیدگی بخشی اور اپنی تخلیقات سے ادبیات کے سرمایہ میں بیش بہا اضافے کیے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک نمایاں کڑی مولانا شاہ محمد جان ادیب بحری آبادی ہیں۔ موصوف اس ادبی دائرے کے وہ درخشاں فرد ہیں جو اسلامیات وادبیات دونوں کے فاضل تھے۔ ان دونوں میدانوں میں ان کی خدمات ناقابل فراموش اور کارنامے ناقابل انکار ہیں۔ لیکن وہ بنیادی طور پر ایک ادیب وشاعر تھے اور شعروادب کی طرف طبعی میلان ورجحان رکھتے تھے۔ علوم اسلامیہ کے ایک زبردست فاضل ہونے کے ساتھ ان کا ادبی ذوق قابل صدرشک تھا۔

ادبیات سے اپنے اسی خصوصی شغف کی بنا پر انھوں نے اس کی تحصیل پر اپنی خاص توجہ مرکوز کردی تھی اور اس کا مطالعہ نہایت ذوق وشوق اور غایت درجہ محنت وجانفشانی کے ساتھ کیا تھا نیز اس فن کے ممتاز اور نابغۂ عصر علماء خاص کر مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ان کی علمی وادبی صحبتوں سے ایک عرصے تک مستفید وفیضیاب ہوئے تھے۔ مولانا فاروق چریاکوٹی کی ذات تبصرہ وتذکرہ کی محتاج نہیں ہے۔ موصوف اپنے دور کے مشہور فاضل، عربی وفارسی کے خوش گو خوش فکر شاعر اور ممتاز نقاد سخن تھے۔ ان کی رنگارنگ اور جامع الکمالات شخصیت کو مولانا سید سلیمان ندوی

جناب دانش اختر، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ۔

نے مندرجہ ذیل الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

"مولانا فاروق چریا کوٹی فلسفہ، منطق، ھندسہ ادب عربی اور ادب فارسی میں خاک ہند کے آخری فرزند تھے۔ ان کے بعد علماء میں ان تمام فنون کے ایسے جامع شاید ہی اٹھیں۔" (۱)

مولانا فاروق چریا کوٹی کے فیضِ صحبت نے شاہ محمد جان کی خداداد شعری وادبی صلاحیتوں کو جلا بخشی، ان کے ذوق سخن کی آبیاری کی اور ادب و شاعری کے اسرار اور رموز ونکات سے انھیں واقف بہم پہنچائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فنون ادبیہ میں اپنے معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے اور ادیب کے لقب سے ممتاز ہوئے۔ چونکہ شاعری کا جوہر ان میں فطری تھا۔ عربی، فارسی اور اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے اس لیے جلد ہی ان تینوں زبانوں میں عمدہ اشعار موزوں کرنے لگے اور مختلف اصناف سخن میں اپنے کمالات اور جولانی طبع کے جوہر دکھلانے لگے۔ ان زبانوں میں انھوں نے شاہ وشاہکار تخلیقات پیش کی ہیں جو ان کے مذاق سلیم اور قدرت کلام کا بیّن ثبوت ہیں۔

مولانا بحری آبادی کو شعر وشاعری سے اس قدر شغف تھا کہ جہاں بھی رہے انھوں نے اپنا مرغوب مشغلہ جاری رکھا اور بیشمار منظومات یادگار چھوڑیں۔ موصوف تقریظ نگاری اور تاریخ گوئی میں بھی ملکہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں بھی ان کی لاتعداد منظومات ملتی ہیں۔ مولانا شاہ ابوالحسن صاحب کی حسب روایت:

"پچاسوں منظومات عربی، فارسی اور اردو میں ان کی یادگار ہیں جن کا زیادہ تر حصّہ ماہنامہ "البیان" اور مطبع اصحّ المطابع کی کتابوں پر بطور تقریظ شائع ہوا اور آخر میں تین قصائد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی شان میں۔"

مطبع اصحّ المطابع سے طبع ہونے والی جن کتابوں پر انھوں نے منظوم تقریظیں لکھیں۔ ان میں "سفینۃ البلاغۃ" مصنفہ مولانا محمد زماں خاں "شہادت نامہ" مصنفہ مولانا حافظ شاہ ع النور اور "مسدّس فاروقی" منظومہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ان تقاریظ کے نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔

---

(۱) یادِ رفتگاں، ضیاء پریس کراچی، بار اول ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۴۔

"سفینۃ البلاغۃ" مصنفہ مولانا محمد زماں خاں (شہید ۱۲۹۲ھ) (مطبوعہ اصح المطابع، لکھنؤ، ۱۲۹۰ھ) پر عربی میں حسب ذیل تقریظ لکھی:

إِنَّ مِنْ فَضْلِ الْإِلٰهِ   مَا بِهِ كُلٌّ يُبَاهِي
طَبْعُ سِفْرٍ مُسْتَنِيرٍ   مَا لِذٰلِكَ مِنْ نَظِيرٍ
سَطْرُهُ كَسِلْكِ اللَّآلِي   أَوْ كَنَهْرٍ مِنْ زُلَالٍ
حَرْفُهُ الشُّهُبُ الدَّرَارِي   أَوْ كَشَذْرٍ مِنْ نُضَارِ
رَاقَ حُسْنًا وَجَمَالًا   فَاقَ بَدْرًا وَهِلَالًا
حَبَّذَا سِفْرٌ كَرِيمٌ   مِثْلُهُ حَقًّا عَدِيمٌ
مَنْ رَآهُ قَالَ كَلَّا   يَا لَهُ نُورًا تَجَلَّى
كَيْفَ لَا تَالِيفُ سَامٍ   مُقْتَدًى بَيْنَ الْأَنَامِ
كَانَ فَرْدًا فِي أَوَانِهِ   وَوَحِيدًا فِي زَمَانِهِ
سَالِكًا خَيْرَ الْمَسَالِكِ   رَاغِبًا فِيمَا هُنَالِكَ
بَالِغًا أَقْصَى النِّهَايَةِ   وَاقِفًا سِرَّ النِّهَايَةِ
عَاشَ فِي مَرْضَاةِ مَوْلًى   عَزَّ سُلْطَانًا وَجَلَّ
لَمْ يَزَلْ فِي ذِكْرِ وَالٍ   دَائِمًا فِي كُلِّ حَالٍ
فِي رُكُوعٍ وَسُجُودٍ   وَقِيَامٍ وَقُعُودٍ!
كَانَ بِاللّٰهِ سَعِيدًا   فَلِذَا مَاتَ شَهِيدًا
وَالْتَقَى الْمَوْلَى الْكَرِيمَا   وَرَأَى عَيْشًا مُقِيمَا
حَلَّ جَنَّاتِ النَّعِيمِ   فَازَ بِالْفَوْزِ الْعَظِيمِ
أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْهِ   وَحَبَاهُ مَا لَدَيْهِ
ثُمَّ لَمَّا بِتُّ لَيْلًا   عَامَ خَتْمِ الطَّبْعِ أُمْلِي
إِذْ تَبَدَّى فِي الْمَنَامِ   هَاتِفٌ أَعْلَى الْمَقَامِ
قُلْتُ يَا عَيْنَ الْعُيُونِ   أَبْدِ عَمَّا يَسْأَلُونِي!

قَالَ فَاصُدَحُرِیَاجَنَابِیُ مَبُدَأُ خَیُرِ الْکِتَابِ

۱۳۱۱ھ

"شہادت نامہ" مصنفہ مولانا حافظ شاہ علی انور (مطبوعہ اصح المطابع، ۱۳۱۴ھ، صفحات ۸، تقطیع کلاں) کے آخری صفحہ پر فارسی میں لکھی ہوئی تقریظ پیش خدمت ہے۔

"تاریخ طبع چکیدۂ خامہ ناظم جواہر گرانمایہ بلاغت معنوی و فصاحت صوری طلیق اللسان زلیق البیان مولانا ابوالخیر حافظ محمد جان بجری آبادی غازی پوری":-

صد شکر خدائے لم یزل را — کایں نسخہ چہ لاجواب شد طبع
حافظ علی انورش رقم زد — پر نور چو آفتاب شد طبع
از حسن سواد و خط روشن — چو سلک گہر خوش آب شد طبع
خوش مصرع سال گفت ابوالخیر — ایں نقش بہ آب و تاب شد طبع

۱۳۱۰ھ

اردو میں مسدس فاروقی مصنفہ مولانا محمد فاروق چریا کوٹی (مطبوعہ اصح المطابع ۱۳۱۳ھ صفحہ ۳۲۰) پر تقریظ لکھی۔ مولانا چریا کوٹی نے اپنے اس مسدس میں مئو ضلع اعظم گڑھ میں گاؤ کشی کی بابت ہندو مسلم کے درمیان ۱۸۹۳ء میں پیش آنے والے معرکۂ عظیم کو نظم فرمایا ہے۔ ۳۱ کتاب پر منجملہ دیگر حضرات کے مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کی تقریظ بھی ملتی ہے۔ مولانا بجری کی تقریظ ملاحظہ ہو۔

تاریخ طبع از طبع معنی فہم متقاصد مبادی مولوی حافظ محمد جان صاحب ابوالخیر بجری آبادی:-

للہ الحمد چھپی نظم دل آرا کیسی — ہوگئی جس سے عیاں رفعت شان فاروق
جس نے اک بار بھی یہ نظم پڑھی یا کہ سنی — ہوگیا شیفتۂ حسن بیان فاروق
لفظ لفظ اس کا ہے غیرت وہ صد لعل و گہر — ہے مگر دُرج گہر درج دہان فاروق
روکش عقد ثریا ہے ہر اک سطر اس کی — بل ہے رخشندگی عقد جمان فاروق
نظم اس زور فصاحت کی وہ لکھ سکتا ہے — پاس جس شخص کے ہو دست و زبان فاروق
خوش بیانی کا اگر ان کی نہ قائل ہو عدو — کہیے پھر اس میں بھلا کیا ہے زبان فاروق

کرنا فردوسی طوسی بھی بلاشک تحسین
خوبی بخت سے پاتا ہے زمان فاروق

جس جگہ وہم فلاطوں بھی نہ پہنچا زنہار
پہنچا سوبار وہاں وہم وگمان فاروق

عرش سے آگے پہنچتا ہے بیک چشم زدن
توسن فکر ہے ایسا تہ ران فاروق

نکتہ وہ کون ہے جو اون پہ نہیں ہے روشن
رمز وہ کیا ہے نہیں ہے جو عیان فاروق

ملک تدریس کی شاہی اونہیں حاصل ہے مگر
اوڑ رہا ہے جو ہر اک سمت نشان فاروق

عقدۂ مشکل ہر فن کو کیا کیسا حاصل
ناخن حل معاقد ہے بیان فاروق

دستِ طولیٰ اونہیں ہر فن میں ہے ایسا حاصل
سیکڑوں مسئلے ہیں نوک زبان فاروق

فیض سے اپنے کیا بہرہ ور اک عالم کو
خوان یغما ہے کوئی یا کہ ہے خوان فاروق

آج اس دور میں جتنے ہیں سخنور نامی
اون سے پوچھے کوئی قدر سخنانِ فاروق

کر لیا زیرِ نگیں مملکت شعر وسخن
کلک فاروق نہیں ہے یہ سنانِ فاروق

گھس گیا سینۂ اعدا میں بسان خنجر
نیزہ ہے یا ہے یہ کلک دو زبان فاروق

کس نے پائی ہے سخن سنج طبیعت ایسی
کون ہے آج سخن گوی بسان فاروق

الغرض ان کے کمالات کہاں تک ہوں بیاں
جو ثنا کیجے وہ ہے لائق شان فاروق

اس کا اب صنعت توشیح سے تاریخ کا سال
کر لے معلوم بس اے زمزمہ خوان فاروق

ایضاً

منت ایزد کہ شد چاپ چنیں نسخۂ
کز وہ ذکر و بیان مصست بسے دردناک

بسکہ نبا شد درد جز بہ بیان الم
می شنود کہ ہر او سینہ کند چاک چاک

زپے تاریخ طبع فکر نمودم چو من
گفت دلم بہر آں ذکر شہیدان پاک

۱۳۱۳ھ

مولانا بحری آبادی کی تاریخ گوئی کی مزید مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا شاہ ابوالقاسم صب کی حسب روایت مولانا ئے موصوف کی پہلی شادی ان کے عمّ محترم شاہ عبدالرحمٰن صاحب دوسری صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کا انتقال ایک بچی مسمّاۃ سلمیٰ بی بی کی ولادت کے سلسلے میں ہوا۔ اپنی ان زوجہ کی وفات پر انھوں نے ایک قطعۂ تاریخ لکھا کہ:

تاریخ وفات حسرت آیات اہل خانہ خود رحمہا اللہ تعالیٰ وغفر لھا بغیر حساب :۔

افسوس کہ جن سے تن نے راحت پائی — اور روح کو جن سے سازگاری پہنچی
ان کی رحلت سے ناگہاں دل پہ مرے — کیا کہیے کہ چوٹ کیسی بھاری پہنچی
پوچھا ہاتف سے میں نے ایک دن کہ مجھے — ہے علم کہاں وہ حق کی پیاری پہنچی
آخر کس جا
بولا وہ کیوں نہیں مجھے ہے معلوم — قصرِ جنت میں بے سواری پہنچی
مجھ کو صرف اتنا ہے معلوم — ۱۳۱۱ھ

اور لڑکی کی تاریخ وفات یہ لکھی۔

قطعۂ تاریخ وفات دختر خود سلمیٰ مرحومہ :۔

رخشندہ گوہر من یعنی کہ دختر من چوں رفتہ از بر تن شد باخدائے واصل
روزے برائے سال کردم بہ دل خیالے آمد چہ حسب حالے داغے نہاد بر دل

۱۳۱۱ھ

جوناگڑھ کے قیام کے دوران داتار مقام میں ایک پل بن رہا تھا جس کے لیے ان سے ایک تاریخی نظم لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ۲۲، ۲۴ اشعار کی ایک نظم لکھ کر کارکنوں حوالے کر دی۔ اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے :۔

اے داتار کے آنے جانے والو — لو ہوئی تم پہ خدا کی رحمت نازل

مدرسۂ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ وارد ہونے کے بعد ان کے استاذ و شیخ مولانا محمد عین القضاۃ نے دارالحدیث کی عمارت تعمیر کرانا شروع کی تو ان سے عربی میں تاریخ کی فرمائش کی مولانا ہجری نے تاریخ یوں کہی :

لِلّٰہِ ھٰذَا الْقَصْرُ قَصْرٌ اِسْمُہٗ — دَارُ الْحَدِیْثِ عَلٰی لِسَانِ الْمُلْھِمِ
قَدْ شُیِّدَتْ أَرْکَانُہٗ وَأُسِّسَتْ عَلٰی — تَقْوٰی مِّنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْمُنْعِمِ

اسی سلسلہ کا دوسرا قطعہ ہے :۔

يَا حَبَّذَا قَصرٌ زَهَا | قَصُرٌ حَوىٰ شَرَفَ الرِّضَا
دَارٌا لِحَدِيثِ لَهُ بِدَا | إِسمٌ عَلَىٰ مَا أُلهِمَا
لَا غَرُوَ إِنْ بَاهَتْ بِهَا | أَهْلَ السَّمٰوٰتِ الْعُلىٰ
أَصْلُ تَأَسَّسَ فِي الثَّرىٰ | فَرْعٌ تَسَامىٰ فِي السَّمَا

یہ دونوں قطعات ایک مکتوب سے اخذ کیے گئے ہیں جو محترم جناب اعجاز صاحب دسا(؟) استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی) نے مولانا شاہ ابوالقاسم صاحب کی خدمت اقدس میں مورخہ ۱۲(؟) سنہ کو ارسال کیا تھا۔ ان کے بقول مدرسۂ فرقانیہ کے درجۂ عربی میں مولانا بجری آبادی کے : قطعات آویزاں ہیں۔ تیسرے قطعہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں گیارہ شعر ہیں۔ غالباً وہ بھی مو محمد جان کا کہا ہوا ہے۔ اس کے شیشے کے اندرونی حصے پر کافی گرد جمع ہونے کے باعث پہلے شعر صرف آخری مصرعہ پڑھا جاسکا۔ وہ ہے ؎

أَرَأَيْتَ نَاراً فِي الْمِيَاهِ مُوَقَّدَا

مولانا شاہ ابوالقاسم صاحب کی حسب روایت ان کے پدر بزرگوار ایک بار اپنی سسرال آستانہ بھیرہ ولید پور ضلع اعظم گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں ان سے شیخ عنایت علی مرحوم ک وفات لکھنے کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے یہ تاریخ لکھی:

عِنَايَتُ عَلِيٍّ إِذْ نَمَا نَحْوَ رَبِّهِ | فَلَاهُ لِيْ هُنَالِكَ عَيْشاً مُقِيْماً
وَأَصْحَابُنَا قَدْ بَخُوا عَامَ فَوْتِهِ | فَقُلْنَا وَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً

مولانا شاہ محمد جان کے | حضرت مجددالف ثانیؒ کی شان میں مولانا بجری آبادی کے عربی قصائد

عربی کلام میں ان تین قصائد کو نمایاں اور اہم مقام حاصل ہے جو حضرت مجدد الف ثانی مولانا سرہندی قدس سرہ کی شان میں ہیں۔ عربی شاعری میں یہ قصائد شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے اور اختتام صلاۃ وسلام پر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر خاص طور سے تذکرہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ حفاظ وقراء کی ایک بڑی جماعت قرآن خوانی کے لیے ہر سال سرہند جایا کرتی تھی۔

بانی مدرسہ مولانا محمد عین القضاۃ صاحب اس جماعت کے اہتمام وانتظام میں پیش پیش رہتے تھے ا اپنے خرچ پر سرہند بھیجا کرتے تھے۔ ان ہی کی ایماء پر ان کے شاگرد رشید اور مدرسہ فرقانیہ کے نامو شاعر مولانا شاہ محمد جان ہجری آبادی حضرت مجدد صاحبؒ کی مدح ومنقبت میں ہر سال ایک قصیدہ نظم فرمایا کرتے تھے۔ تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

یہ تینوں قصائد بڑے طول طویل ہیں اور الجذبۃ الشوقیۃ إلی الحضرۃ المجددیۃ المقالۃ الأولیٰ والثانیۃ والثالثۃ کے عنوان سے مختلف مطابع میں طبع ہو کر منظرِ عام پر ہر ایک قصیدہ کے اشعار کی تعداد، مطابع کے نام اور سنین نظم وطباعت حسب ذیل ہیں:۔

قصیدۂ اوّل مشتمل بر ۶۵ اشعار، مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ؛ قصیدہ دوم مشتمل بر ۶۲ اشعار، منظومہ ۱۳۳۴ھ، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ، ۱۹۱۶ء؛ قصیدۂ سوم مشتمل بر ۹۴ اشعار، منظومہ ۱۳۳۵ھ، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ، ماہ دسمبر ۱۹۱۶ء۔

اس طرح ان تینوں قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد ۲۲۱ ہوتی ہے۔

یہ قصائد اب عام طور سے دستیاب نہیں ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ مولانائے مرحوم کے اہل خانہ کے پاس محفوظ ہے۔ شبلی لائبریری، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قصیدۂ دوم، مطبوعہ اصح المطابع، لکھ ۱۹۱۶ء موجود ہے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی نے قصیدۂ سوم کے چند منتخب اشعار اپنی مشہور کتا۔ "نزھۃ الخواطر" (جلد ہشتم، طبع دوم، حیدرآباد دکن، صفحات ۴۱۶ - ۴۱۷) میں درج کیے ہیں۔

مولانا ہجری آبادی کا یہ مجموعۂ کلام غزل گوئی اور قصیدہ نگاری پر ان کی قدرت ومہارت دلیل، فصاحت وبلاغت کا آئینہ دار اور عربی شاعری پر ان کے عبور ودسترس کا غماز ہے۔

نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔ اوّلاً غزلیں بعد ازاں قصائد ملاحظہ فرمائیں:۔

غزلیں | اشعار مندرجہ ذیل میں عاشق اپنے معشوق سے مخاطب ہو کر اس سے ہجر وفراق میں اپنا زار بیان کرتا ہے۔ طول فراق کی وجہ سے اس کی زندگی میں جو تلخی اور بے کیفی پیدا ہو گئی۔ اس کا ذکر کرتا ہے۔ فراق کو موت سے کم تر اور صارم مہند (ہندی تلوار) قرار دیتا ہے۔ میں معشوق سے اپنے حال زار پر ترس کھانے اور اپنے ساتھ لطف وکرم سے پیش آنے کی ا کرتا ہے اور وصالِ یار کا متمنّی ومشتاق ہے:۔

عَيْشِيْ تَنَكَّدَ مُنْذُ كَ هَجْرُكَ قَدْ بَدَا — وَ زَمَانُ وَصْلِكَ قَدْ مَضٰى مُتَبَعِّدَا
ذُقْتُ الْفِرَاقَ وَكَانَ مَوْتِيْ دُوْنَهٗ — يَا لَيْتَ هَجْرُكَ لَمْ يَكُنْ مُتَوَلِّدَا
شَاهَدْتُ اَهْلَ الْوُدِّ قَدْ قُتِلُوْا بِهٖ — كَانُوْا اُسُوْدًا قَبْلَ ذَاكَ تَجَلُّدَا
هَجْرُ الْحَبِيْبِ وَحَقِّ نَفْسِكَ صَارِمٌ — وَمِنَ الصَّوَارِمِ مَا يَكُوْنُ مُهَنَّدَا
كَيْفَ الْحَيَاةُ تَطُوْلُ بِيْ يَا بَا حَتّٰى — وَكَوٰى فِرَاقُكَ قَلْبِيَ الْمُتَجَلِّدَا
وَضِرَامُ عِشْقِكَ فِيْ حَشَايَ مُشْتَعِلٌ — وَلَهِيْبُ وَجْدِكَ لَمْ يَزَلْ مُتَوَقِّدَا
يَا بَاخِلًا بِالْوَصْلِ كُنْ مُتَرَحِّمًا — سَمِعًا كَرِيْمًا بَاذِلًا مُتَفَقِّدَا
حَتَّامَ تُحْرِقُنِيْ بِبُعْدِكَ وَالنَّوٰى — وَ تَكُوْنُ فِيْ سُقْمِ الْفُؤَادِ مُزَيِّدَا

درج ذیل غزل میں عاشق کے احوال وکوائف بیان کیے گئے ہیں کہ جب محبوب کی نگاہوں کا تیر اس کے دل کو لگتا ہے تو پھر اسے کسی پہلو قرار و سکون و چین نصیب نہیں ہوتا۔ فراق یار میں وہ برابر آہ وزاری کیا کرتا ہے اور اس کی آنکھیں برابر اشکبار بلکہ خون بار رہتی ہیں۔ وہ لوگوں سے اپنی محبت کو پوشیدہ رکھنے کے لاکھ جتن کرتا ہے لیکن آنسو اس کے راز عشق کو افشا کر دیتے ہیں۔ محبوب کی دوری و مہجوری کا غم اس کے قلب وجگر کو پاش پاش کر دیتا ہے جس کی بنا پر اس کی حالت اس قدر دگرگوں ہو جاتی ہے کہ قریب ہوتا ہے کہ اس کی روح اس کے جسم میں پگھل کر رہ جائے تو کیا ایسی نازک حالت میں بھی معشوق اپنے عاشق شیدا پر نظر کرم نہ کرے گا؟

يَا عَاشِقًا طَارَ الْكَرٰى فِي الْهَجْرِ مِنْ اَجْفَانِهٖ — وَالْاَدْمُعُ الْقَانِيْ عَلٰى خَدَّيْهِ فِيْ سَيَلَانِهٖ
اِنَّ الْهَوٰى سِرٌّ اِذَا كَاتَمْتَهٗ لَمْ يَكْتَتِمْ — وَالْحُبُّ لَمَّا يَقْتَدِرْ اَحَدٌ عَلٰى كِتْمَانِهٖ
لَا تَطْمَعَنْ فِيْ سَلْوَةٍ يَوْمًا وَّلَا فِيْ رَاحَةٍ — مُذْ يَوْمَ آثَرْتَ الْهَوٰى وَهَوَيْتَ فِيْ غَيْرَانِهٖ
كَمْ قَائِلٍ مِمَّنْ رَاٰى عَيْنَاكَ تَهْمِيْ بِالدِّمَا — اَلْغَيْثُ فِيْ هَمَلَانِهٖ وَالْغَيْمُ فِيْ هَتَنَانِهٖ
بِاللّٰهِ سَلْ يَا صَاحِ مَنْ شَفَّ الْمَشُوْقَ بِجَادِهٖ — اَوَلَيْسَ يَوْمًا عِنْدَهٗ عَطْفٌ عَلٰى وَلْهَانِهٖ
بِصَقِيْلِ سَيْفِ قَطِيْعَةٍ تَرَكَ الْفُؤَادَ مُقَطَّعًا — وَبِكَادَ رُوْحُ الْمُبْتَلٰى لِيَذُوْبَ فِيْ جُثْمَانِهٖ
مَنْ لِّيْ بِيَوْمٍ نَدَا اَنِّيْ مُصَقَّلٍ مِّنْ خَدِّهٖ — وَبَمَائِسٍ مِنْ قَدِّهٖ كَالدِّمِّ فِيْ خَفَقَانِهٖ

نَوَمَى الْفُؤَادَ بِغَايَاتٍ مِّنْ لَحْظِهٖ فَأَذَابَهٗ   مُتَرَنِّمًا بِثَنَائِهٖ شُكْرًا عَلٰى إِحْسَانِهٖ

اس غزل میں شاعر اس امر کا ذکر کرتا ہے کہ صبح کے وقت ایک جنگلی کبوتری کی نوحہ سنجی اور آہ و بکا نے اس کے غمِ عشق کو تازہ کر دیا جس سے اس کا دل مضطرب اور بے قرار ہو اٹھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ رواں ہو گیا۔ اپنے اور کبوتریوں کے عشق کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہاڑوں کو چونٹیوں سے کیا نسبت؟ بعد ازاں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ جسے مرضِ عشق لاحق ہو جاتا ہے وہ برابر آتشِ عشق میں جلتا اور پگھلتا رہتا ہے۔ ذکرِ یار پر اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں جس کی وجہ سے رازِ عشق لوگوں پر منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اسے حقیر و ذلیل کرنے کے لیے ہدفِ طعن و تشنیع بناتے رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ اگر خود اس تجربے سے گزریں تو انھیں اپنے اس فعل پر شرمندگی اور ندامت ہوگی جیسا کہ شاہ محمد جان اپنی اسی غزل میں آگے چل کر کہتے ہیں ؎

لَوْ زَارَهٗ يَوْمًا لَأَصْبَحَ مُظْهِرًا   نَدَمًا عَلٰى مَا بَانَ مِنْهُ وَمَا ظَهَرْ
قَلِقَ الْفُؤَادُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّصْطَبَرْ   لِحَمَامَةِ الصَّحْرَاءِ نَاحَتْ بِالسَّحَرْ
غَرِدَتْ فَهَيَّجَ لِي الْبُكَاءَ بُكَاؤُهَا   حَتّٰى هَمٰى جَفْنِي بِدَمْعٍ كَالْفَجَرْ
لِحَمَائِمٍ وَجْدٌ وَّلِي لٰكِنَّهٗ   شَتَّانَ مَا بَيْنَ الْجِبَالِ وَبَيْنَ ذَرّ
قَلْبٌ بِهِمْ سَكَنَ الْهَوٰى فَكَأَنَّمَا   نَارٌ تَأَجَّجُ فِيهِ تَرْمِي بِالشَّرَرْ
قَلْبُ الْمَشُوقِ أَذَابَهٗ حَرُّ الْجَوٰى   فَيَكَادُ لَا يُبْقِيهِ مِنْهُ وَلَا يَذَرْ
سَفَحَتْ دُمُوعٌ مِّنْهُ وَهِيَ لَرُبَّمَا   بَاحَتْ بِسِرِّ الْعَاشِقِينَ فَمَا اسْتَتَرْ
لَوْ لَمْ تَكُنْ عَبَرَاتُهٗ مُنْهَلَّةً   سِرُّ الْهَوٰى مَا ذَاعَ مِنْهُ وَمَا انْتَشَرْ
إِنَّ الَّذِينَ قَدِ ازْدَرَوْا أَهْلَ الْهَوٰى   بِالْعَتْبِ فِيمَا لَيْسَ فِيهِ لَهُمْ خَبَرْ

مولانا شاہ محمد جان مجددی آبادی نے اپنے حسبِ ذیل قصیدے میں حضرت مجددِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے علوِ نسب اور تجدیدی کارناموں کا تذکرہ نہایت عمدہ پیرایہ میں کیا ہے۔ آپ کے فاروقی النسب ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فاروقِ اعظمؓ کو ایک تناور درخت سے اور آپ کو اس کی

ایک عمدہ شاخ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت کو صبح ہدایت کی نمود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آپ کے تجدیدی کارناموں کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ جب یہ خورشید پرضیاء طلوع ہوا تو اس کی روشنی سے شرک وضلالت کی ظلمتیں کافور ہو گئیں۔ گمراہی کو آپ نے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا اور رشد و ہدایت کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کیا اور مذہب اسلام کے مٹے ہوئے نقوش کو ابھارا۔ آپ شریعت و طریقت دونوں کے جامع تھے۔ انھیں آپ نے تمام آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کرنے کا فریضہ انجام دیا جس سے یہ دونوں نکھر کر ایک نئی شکل میں جلوہ گر ہوئے۔ آپ کے مکتوبات جو علم وعرفان کا بہترین نمونہ ہیں شریعت وطریقت میں آپ کے کامل و یکتا ہونے پر شاہد عدل ہیں۔ ان عظیم الشان کرامات کی بدولت آپ بجا طور پر مجدد کے لقب سے سرفراز ہونے کے مستحق ہیں۔

قصائد:۔

یا خَیْرَ فَرْعٍ نَابِتٍ مِنْ دَوْحَتِہٖ	تَنْتَمِیْ اِلٰی فَارُوْقَ نِعْمَ الْمُقْتَدٰی
لَمَّا وُلِدْتَ وَشَمْسُ وَجْهِكَ اَشْرَقَتْ	فَکَانَ یَوْمَئِذٍ بَدَا صُبْحُ الْهُدٰی
وَبِنُوْرِهَا ظُلَمُ الضَّلَالِ تَقَشَّعَتْ	وَظَلَامُ رِجْسِ الشِّرْكِ جَاءَ مُشَرَّدًا
قَدْ کُنْتَ نُوْرَ اللّٰهِ بَیْنَ عَبِیْدِهٖ	فَبِكَ اهْتَدٰی مِنْهُمْ اِلَیْهِ مَنِ اهْتَدٰی
بِكَ جَاءَ اُسُّ الْغَیِّ مُقْتَلَعًا کَمَا	بِكَ جَاءَ بُنْیَانُ الرَّشَادِ مُشَیَّدًا
جَمَعْتَ بَیْنَ شَرِیْعَةٍ وَّ طَرِیْقَةٍ	فَاَتَیْتَ فِیْ کُلٍّ هُمَا مَا مُرْشِدًا
وَسَعَیْتَ فِیْ تَمْحِیْصِ کُلٍّ مِّنْهُمَا	فَهُمَا بِذَالِكَ تَاَنَّقَا وَ تَجَرَّدَا
جَدَّدْتَ مُنْدَرِسَ الرُّسُوْمِ لِدِیْنِنَا	وَکَفٰی لِمَرْءٍ اَنْ یَّکُوْنَ مُجَدِّدًا
وَکَفٰی بِصُحُفِكَ فِیْ مَعَارِفِ حَقَّةٍ	اَوْدَعْتَهَا قَوْلًا مَتِیْنًا جَیِّدًا
شَهِدَتْ بِکَوْنِكَ فِی الشَّرِیْعَةِ کَامِلًا	صَدَعَتْ بِکَوْنِكَ فِی الطَّرِیْقَةِ اَوْحَدًا

اس قصیدے کے ابتدائی تین اشعار میں سرہند کی مقدس و پاکیزہ سرزمین وہاں کی عطر بیز و روح پرور فضاؤں اور اس خاک پاک سے اٹھنے والے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کا تذکرہ

کیا گیا ہے۔ وہاں کی دھرتی وہاں کی خدارسیدہ ہستیوں کو مصابیح الدجیٰ (ظلمت کے چراغ)، دراری الھدیٰ (ہدایت کے ستارے) اور انجم وکواکب کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

بعد ازاں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی مدح ومنقبت کرتے ہوئے انھیں ان انجم وکواکب میں آفتاب وماہتاب قرار دیا گیا ہے۔ ان کی جامع الکمالات شخصیت اور متنوع خصوصیات و امتیازات کو اجاگر کرنے کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں:۔

امام، مقتدیٰ، قطب اوان، فرد زمان، مقدام صفّ الاصفیاء، مصباح نادی الاولیاء، نبراس جمع الأتقیاء، عَلَم الھدیٰ، رأس التُّقیٰ، غیث الندیٰ، عین العطاء باھر حجۃ من ربّہ، واضح آیۃ للّٰہ، حبر الشئ بعلیٰ ماھراً، بحر لطریقۃ زاخراً

یہ الفاظ وکلمات حضرت مجدد صاحبؒ کی ہشت پہلو شخصیت کی صحیح طور پر غمازی کرتے ہیں اور اس امر پر دال ہیں کہ آپ تقویٰ وللٰھیت، زھد وقناعت، عرفان وآگہی اور سخاوت وفیاضی کی صفات سے متصف اور بلند مرتبے پر فائز تھے۔ اس کائنات میں خدا کی روشن دلیل اور واضح نشانی تھے۔ علوم وفنون کے ماہر کامل، شریعت وطریقت کے بحر ذخار اور دانائے رموز اور خدا کے مقرب و برگزیدہ بندے تھے۔

اس دنیا میں آپ کی آمد موسم بہار کی آمد تھی جس سے سارا عالم جگمگا اٹھا اور شجر اسلام سرسبز وشاداب ہوگیا اور شرک وبدعت خزاں رسیدہ ہو کر نیست ونابود ہوگئے۔

سُقْیًا لَھَا مِنْ مَرْبَعٍ نَفَحَاتُ مِسْکٍ دُوْنَہٗ ... وَغَمَامُ رِضْوَانِ الْإِلٰہِ عَلَیْہِ فِیْ ھَطَلَانِہٖ

فِیْھَا مَصَابِیْحُ الدُّجیٰ فِیْھَا دَرَارِیُّ الْھُدیٰ ... مِنْ أَنْجُمٍ أَنْوَارُھَا کَالْبَدْرِ فِیْ لَمَعَانِہٖ

فِیْھَا کَوَاکِبُ حُجِّبَتْ بِحِجَابِ تِیْبِ تُرَابِھَا ... وَالنُّوْرُ مِنْھَا دَائِمًا فِی الْخَلْقِ فِیْ فَیَضَانِہٖ

أَمَّا الَّذِیْ کَالشَّمْسِ فِیْمَا بَیْنَھَا فَھُوَ الَّذِیْ ... رَقِیَ السَّمَاءَ وَجَازَھَا بِمَقَامِہٖ وَمَکَانِہٖ

اَلشَّیْخُ أَحْمَدُ فِی الْوَرٰی ذَاکَ الْإِمَامُ الْمُقْتَدیٰ ... مَنْ کَانَ قُطْبَ أَوَانِہٖ مَنْ کَانَ فَرْدَ زَمَانِہٖ

مِقْدَامُ صَفِّ الْأَصْفِیَا مِصْبَاحُ نَادِی الْأَوْلِیَاءِ ... نِبْرَاسُ جَمْعِ الْأَتْقِیَا مِنْ کَامِلِیْ أَعْیَانِہٖ

بَثَّ الْھِدَایَۃَ فِی الْوَرٰی فَأَدَا الْبَرِیَّۃَ نَحْوَھَا ... عَمَّ الْبَسِیْطَۃَ کُلَّھَا بِسَنَاہُ مِنْ عِرْفَانِہٖ

عَلَمُ الْھُدیٰ صَارَتْ بِہٖ مَخْصُوْصَۃً أَزْمَانُہٗ ... وَالشِّرْکُ مُنْقَلِعُ الْبِنَا یَبْکِیْ عَلیٰ خِذْلَانِہٖ

مَنْ كَانَ بَاهِرَ حُجَّةٍ مِنْ رَبِّهِ فِي خَلْقِهِ ۔۔۔ مَنْ كَانَ وَاضِحَ آيَةٍ لِلّٰهِ فِي أَكْوَانِهِ

حِبْرُ الشَّرِيعَةِ مَاهِرًا بَحْرُ الطَّرِيقَةِ زَاخِرًا ۔۔۔ مَنْ جَاءَ مَحْمُودًا لَدَى الرَّحْمٰنِ فِي رِضْوَانِهِ

كَمْ مُعْضَلَاتٍ فِي الْعُلُومِ تَحَيَّرَتْ فِيهَا النُّهَى ۔۔۔ فَأَحَاطَهَا عِلْمًا بِهَا وَأَهَانَهَا بِبَيَانِهِ

وَجَدَتْ نِهَايَةُ غَيْرِهِ فِي بَدْئِهِ فَاقْدُرْ بِهِ ۔۔۔ مَا عِزُّهُ مَا قَدْرُهُ لَا تَقْرُنًا بِالَّذِي رُجْحَانِهِ

تیسرے قصیدے کے حسبِ ذیل اشعار میں حضرت مجدد الف ثانی رح کی تجدیدی خدمات اور فیوض و برکات کا تذکرہ قدرے تفصیل سے اور دلکش و دلپذیر انداز میں کیا گیا ہے۔ آپ نے اسلام کے فروغ و استحکام اور کفر و الحاد اور شرک و بدعت کے استیصال و بیخ کنی کے لیے جو طویل جدّ و جہد اور انتھک کوشش کی اس کے لیے آپ کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ آپ ایک بحرِ بیکراں اور زلالِ عرفان تھے۔ اس بحرِ عظیم سے بہت سے چشمے پھوٹے اور متعدد نہریں نکلیں جن سے اسلام کی سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئیں اور ضلالت و گمراہی سے جاں بلب انسانیت کو نئی زندگی و تابندگی ملی۔
آپ بیابان کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی تھے۔ آپ کے فیضانِ نظر سے جہالت، نفسانی خواہشات، اور امراضِ قلب میں مبتلا افراد کی روح میں جلا، نظر میں وسعت اور قلب میں فراخی و کشادگی اور رحمت و شفقت پیدا ہوئی۔ الغرض آپ کے فیوض و برکات کے اثرات روئے زمین کے ذرے ذرے اور چپے چپے پر نمایاں ہیں۔

بَرَكَاتُهُ عَمَّتْ فَوَائِدُ كُلِّ مَا ۔۔۔ ذَرَّتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ مِنْ بَحْرٍ وَبَرّ

عَمَّ الْوَرَى طُرًّا سَنَا آثَارِهِ ۔۔۔ قَرَّتْ لِرُؤْيَتِهَا عُيُونُ ذَوِي الْبَصَرْ

اَلرُّشْدُ ظَلَّ بِسَعْيِهِ مُتَهَلِّلًا ۔۔۔ مِنْ بَعْدِ مَا قَدْ كَانَ مُنْطَمِسَ الْأَثَرْ

وَالشِّرْكُ وَالْإِلْحَادُ قَدْ مُحِيَا بِهِ ۔۔۔ وَالْغَيُّ أَدْبَرَ وَالضَّلَالُ نَأَى وَفَرّ

كَمْ مُحْدَثٍ نِيرَانُهُ خَمَدَتْ بِهِ ۔۔۔ إِذْ طَارَ مِنْ نِيرَانِهِ شَرَرٌ وَشَرّ

بَحْرٌ خِضَمٌّ مِنْهُ كَمْ نَبَعَتْ وَكَمْ ۔۔۔ سَالَتْ عُيُونٌ أَوْ جَرَى مِنْهُ النَّهَرْ

كَمْ مِنْ مَوَاتِ الْقَلْبِ نَالَ حَيَاتَهُ ۔۔۔ مِنْ فَيْضِهِ نَزَهًا وَرَاقَ بِهِ النَّظَرْ

سَلْسَالُ عِرْفَانٍ بِهِ قَدْ مَيَّزُوا ۔۔۔ مَا كَانَ مِنْهُ صَفَا وَمَا مِنْهُ انْكَدَرْ

كَمْ جَاهِلٍ غَبِيٍّ أَتَاهُ لِرُشْدِهِ
فَالْجَهْلُ زَالَ بِرُشْدِهِ وَكَذَا الْغَرَرُ

كَمْ مَنْ أَتَىٰ سَعْيًا إِلَيْهِ بِقَلْبِهِ الْقَاسِي
وَرُوحٍ قَدْ أَحَاطَ بِهِ الْكَدَرُ

أَوْ نَفْسُهُ قَهَرَتْ فَجَاءَ وَنَفْسُهُ
مَقْهُورَةٌ أَمَّا هَوَاهُ فَقَدْ هَجَرَ

وَالرُّوحُ مِنْهُ بِنَظْرَةٍ مِنْهُ انْجَلَىٰ
وَالْقَلْبُ لَانَ وَكَانَ أَصْلَدَ مِنْ حَجَرٍ

حضرت مجدد الف ثانیؒ شریعت وطریقت کی ایک جامع الکمالات اور یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ آپ کے مکتوبات اس امر پر روشن دلیل ہیں۔ یہ مکتوبات ذکر وفکر اور وعظ وپند پر مشتمل عرفان وآگہی کے رموز ونکات اور تصوف وطریقت کے لآلی ودُرر سے مملو اور آپ کے قلم کا نادر ونایاب نمونہ ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ان ہی امور کے ترجمان ہیں:-

إِنَّ الشَّرِيعَةَ وَالطَّرِيقَةَ فِيهِمَا
كَمُلَتْ رِجَالٌ قَدْ مَضَوْا فِيمَا غَبَرَ

كَمُلُوا وَلٰكِنْ كَانَ فِي إِحْدَاهُمَا
وَلَأَنْتَ فِي كِلْتَيْهِمَا بَحْرٌ زَخَرْ

دَلَّتْ عَلَىٰ مَا قُلْتُ مِنْكَ صَحَائِفٌ
فِيهَا الشِّفَا لِمَنِ ارْتَأَىٰ وَمَنِ افْتَكَرْ

أَثَرًا بَدِيعًا مِنْ يَرَاعِكَ بَاقِيًا
عِظَةً لِمُتَّعِظٍ وَذِكْرَ مَنِ ادَّكَرْ

مُلِئَتْ غَوَامِضَ مِنْ إِشَارَاتٍ كَمَا
تُمْلَى الْحَقَائِبُ بِاللَّآلِي وَالدُّرَرْ

مَنِ ادَّعَىٰ نَقْصًا عَلَيْكَ فَبَاطِلٌ
مَا يَدَّعِ عَلَيْهِ فَلَيْسَ بَادٍ كَالنَّغَرْ

قصیدے کا آخری حصہ دعا اور صلاۃ وسلام پر مشتمل ہے۔ حضرت مجدد صاحبؒ نے حقیقی اور بے آمیز اسلام کی تبلیغ وترویج اور اشاعت کے لیے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اور اس راہ میں جس محنت وجانفشانی اور ایثار وقربانی کا مظاہرہ کیا اس کے لیے اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے آپ کو جزائے خیر دے اور ان خدمات جلیلہ کے لیے آپ کو عمدہ سے عمدہ اور بیش از بیش صلہ عطا فرمائے۔ لاکھوں درود وسلام ہو رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر، آل محمدؐ پر اور ان کے صحابہ کرام پر۔ آپ پر اور ان سبھی حضرات پر مسلسل ہر صبح وشام رضائے الٰہی کی بارش ہوتی رہے۔

جَازَاكَ يَا مَوْلَايَ عَنَّا رَبُّنَا
خَيْرًا وَأَفْضَلَ مَا يُجَازِي مَنْ شَكَرْ

وَحَبَاكَ مِنْهُ زِيَادَةً تَتْرَىٰ عَلَىٰ — عَدَدِ الرِّمَالِ وَعِدَّةِ قَطْرٍ مِّنْ مَطَرْ
ثُمَّ الصَّلٰوةُ عَلَى النَّبِيِّ الْمُنْتَقیٰ — مِنْ آلِ نَضْرٍ مِّنْ كِنَانَةَ مِنْ مُضَرْ
وَكَذَا السَّلَامُ عَلَيْهِ يَشْمَلُ آلَهُ — وَصَحَابَتَهُ مِنْهُ الْمَيَامِينَ الْغُرَرْ
سُحُبُ الرِّضَا جَادَتْ عَلَيْهِ تَتَابُعاً — وَعَلَيْهِمُ كُلَّ الْعَشَايَا وَالْبُكَرْ

خصوصیاتِ کلام

مذکورہ بالا عربی، فارسی اور اردو اشعار کے مطالعہ سے شعر و ادب کے ناقدین و مبصرین کو ہجری آبادی کے شاعرانہ کمالات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ ان اشعار سے انھیں اس امر کا ہو جائے گا کہ مولانائے موصوف شعر و ادب کا کتنا اعلیٰ اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، انھیں ان تینوں زبانوں اور ان کے اسالیب بیان پر کس قدر دسترس اور عبور حاصل تھا اور وہ اپنے شعریت کی زبان میں کتنے سلیس اور مؤثر طریقے سے ادا کر سکتے تھے۔ ذیل میں ان کی خصوصیات کلام پیش کی جا رہی ہیں۔

ان کے اشعار سادگی و شگفتگی، سلاست و حلاوت اور عمدگی و برجستگی کا بڑا اچھا نمونہ ہیں۔ غزلیں نہایت لطیف، رقت انگیز، درد و کرب اور سوز و گداز سے مملو ہیں۔ زبان کی روانی و سلاست اور بیان کی عذوبت و حلاوت ان کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی مدح و منقبت میں انھوں نے جو قصائد نظم فرمائے ہیں ان میں عربی قصائد کے محاسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت مجدد صاحبؒ کے مقام و پیغام کا بڑی جامعیت کے ساتھ تعارف کرایا ہے اور تقویٰ و للّٰہیت، اتباع سنت و اجتناب بدعت اور مکارم اخلاق و محاسن کردار کی ایسے انداز و اسلوب میں تعلیم و تلقین فرمائی ہے جس میں بڑی رعنائی و شگفتگی ہے اور زبان و بیان میں بھی متانت ہے۔ یہ ان کے کمال فصاحت و بلاغت کی کھلی شہادت اور قادر الکلامی کی روشن دلیل ہے۔

یہ خصوصیات و امتیازات انھیں شعرائے ہند کی بزم میں بلند مقام و مرتبہ عطا کرتی ہیں اور نزہۃ الخواطر کے حسب ذیل دعوے پر شاہد عدل ہیں:-

"محمد جان بن یعقوب عمری حنفی ہجری آبادی فنون ادبیہ کے نمایاں اور ممتاز علماء میں سے تھے۔"[1]

---

[1] نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم، طبع دوم، مطبوعہ حیدرآباد دکن، صفحہ ۴۱۶

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ
جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ جولائی ۱۹۹۲ء | شمارہ ۷

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

ماہنامہ ”جامعہ“

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی ـــ مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی د

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

ہندوستانی مسلمانوں نے دو اداروں سے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں، ایک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ آزاد ہندوستان میں متوسط طبقہ کا مسلمان اپنے تشخص کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو اس نے اپنے تشخص کی علامت قرار دے دیا ہے۔ اسی سے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنا جو تشخص قرار دے دیا ہے اس سے ان اداروں کا دور کا بھی علاقہ نہیں۔ سرسید نے علی گڑھ میں جس درس گاہ کی بنیاد ڈالی تھی اس کا ایک اہم مقصد مسلمانوں میں سائنسی مزاج پیدا کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے مغرب یعنی مغربی علوم کی طرف خاص طور سے توجہ کی تھی۔ جامعہ کے بانیان نے ایک ایسے ادارہ کا خواب دیکھا تھا جو مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان قومی دھارے میں شامل ہونے کی تربیت دے اور جہاں مغرب کی کورانہ تقلید نہ کی جائے بلکہ ملّی و قومی عزائم کو مدنظر رکھتے ہوئے آزاد شخصیتوں کے حامل انسان پیدا کیے جائیں۔ مغربی تہذیب کے منفی پہلوؤں کے مُضر اثرات سے نئی نسلوں کو محفوظ رکھنے کے لیے جامعہ نے تربیت کے لیے اعلا مذہبی اور اخلاقی قدروں سے کام لیا۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور مشکل بھی کہ سیکولر علوم کو مذہبی قدروں سے جوڑا جائے لیکن جامعہ میں اس کام کو سہل بنا دیا گیا۔ کامیابی بھی ہوئی اسی لیے قوم و ملت کے نمایاں ترین لوگ اسے ستائش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شاید اس کامیابی کی ایک وجہ تھی کہ جامعہ کے تعمیری دور کے رہنما و رہبر ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نہ صرف یہ کہ سیکولر علوم میں کمال حاصل کیے ہوئے تھے بلکہ مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ مذہب، اخلاق اور تہذیب کو مربوط کر کے دیکھتے اور پیش کرتے تھے اور ان سے انسان کو اچھا انسان بنانے، انسان کا معاشرہ اور قوم سے گہرا تعلق پیدا کرنے اور اسے نئے ہندوستان کا اچھا شہری بنانے کا کام لیتے تھے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے کس طرح کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ان اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اپنی صلاحیتوں کے مطابق روزگار پائیں اور سماج میں اپنا مقام پیدا کریں اور ملک و قوم کو اپنی بہتر خدمات کے ذریعہ اپنی افادیت کا احساس دلائیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ من حیث الجماعت ان اداروں پر کڑی نگاہ رکھیں کہ یہاں تعلیم کا کام اچھی طرح ہوتا ہے یا نہیں، تعلیم کے کام میں بہتری کے لیے تجاویز پیش کریں اور ان کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ان اداروں کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کریں۔ ان اداروں کو ہمیں اس کسوٹی پر پرکھنا چاہیے کہ سماج کا علم، کاریگری و ہنر، قدریں اور برتاؤ کے طریقے ایک سے دوسری نسل کو منتقل کرنے کے عمل کا نام تعلیم ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم کا کام یہ بھی ہے کہ علم کی نئی جہتوں کو تلاش کرے اور جدت طرازی کی ترغیب دے۔ کیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اس وقت اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم داخلی طور پر ان اداروں کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور ہمارا یہ احساس شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں ہم پیچھے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان اداروں کو لاحق مرض تلاش کریں اور اس کا علاج کریں، منفی طریقے اور تخریبی منصوبے ان اداروں کو پستی کی طرف لے جائیں گے۔ اگر سر سید کا ادارہ سائنسی مزاج پیدا نہ کر سکے اور ارکان ثلاثہ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کی جامعہ سیکولر علوم اور مذہبی قدروں کے مرکب سے تشکیل کیے ہوئے آزاد شخصیتوں کے حامل انسان نہ پیدا کر سکے تو ہمیں ان اداروں کے حال و مستقبل کی طرف سے فکر مند ہونا چاہیے۔

جس طرح ہندوستانی مسلمانوں نے ایک غیر مسلم اکثریتی آبادی والے ملک میں امن و سکون کی زندگی گزارنے اور یکجہتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے اسلامی طرز زندگی کو طریقت کے لباس میں پیش کیا اور شریعت و طریقت کی آمیزش سے رواداری کا طریقہ عام کیا اسی طرح جامعہ نے بھی سیکولر علوم اور مذہبیت کے درمیان توازن پیدا کر کے اچھے انسان پیدا کرنا اپنا نصب العین طے کیا۔ جمہوری اور سیکولر ملک میں اس سے بہتر نصب العین ہماری نظر میں نہیں آیا ہے۔ ہمیں اپنے مذہب اور تہذیب پر پختہ عقیدہ اور اعتماد ہے تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سیکولر علوم کو مذہب و تہذیب سے جوڑ کر ایک با اخلاق اور شہریت کے اصولوں سے مزین معاشرہ کی تعمیر میں بھرپور حصہ لے سکتے ہیں۔ اسلام میں پختہ عقیدہ سے ہمیں ایسی ہی تخلیقی تحریک ملتی ہے۔ ہم اپنی بساط بھر جوڑ پائیں، بنا پائیں تو سمجھیں گے کہ یہ اسلام کا فیضان ہے۔

عابداللہ غازی
ترجمہ: ڈاکٹر صغرا مہدی

راجہ رام موہن رائے کی شخصیت پر اسلامی اثرات

(ایک تحقیقی جائزہ)

(۱)

رام موہن رائے (۱۸۳۳-۱۷۷۲) اٹھارویں صدی کے ایک عظیم مصلح اور برہمو سماج کے بانی تھے۔ ان کی حیثیت اوتار یا پیغمبر کی نہیں بلکہ مجدّد یا مصلح کی تھی۔ انھوں نے اپنی مثال سے ان لوگوں کی رہنمائی کی جو ہندوستان کی جدید تاریخ میں اپنے ملک کی سیاسی سماجی اور روحانی ترقی میں حصّہ لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے اپنی شخصیت میں ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کی روایات کو سمولیا تھا۔

راجہ رام موہن رائے نے یہ پیشین گوئی کردی تھی کہ میرے مرنے کے بعد مختلف مذہبی جماعتیں یہ دعویٰ کریں گی کہ میں ان سے وابستہ تھا۔ حالانکہ میرا تعلق ان میں سے کسی سے بھی نہیں ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک جماعت یعنی برہمو سماج نے اس کا دعویٰ کیا کہ رام موہن رائے بلا شرکتِ غیر اس کے تھے۔ مگر ایک لحاظ سے دیکھا تو سبھی کے تھے۔

ان کی وفات کی صدی کی یادگار میں جو کتاب The Father of Modern India کے نام سے چھپی تھی۔ اس میں سبھی مذہبی فرقوں (سکھ، عیسائی، ہندو، یہودی، بودھ

یہ مضمون اسلام اور عصر جدید کے جولائی ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے قارئین جامعہ کے مطالعہ کے لیے دوبارہ شائع کیا جارہا ہے۔

آریہ سماج اور مسلمان) نے ان سے کسی نہ کسی حد تک ہم مشربی رکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان سب کے دعوے خلوص اور سچائی پر مبنی ہیں اور ان کی رنگا رنگ شخصیت کے کسی ایک پہلو کو پیش نظر رکھ کر کیے گئے ہیں۔

کاونٹ گوبلیٹ ڈی الویلا نے ان کے بارے میں صحیح کہا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ رام موہن رائے کو اس سے بہت خوشی ہوتی تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ ویدوں کو، عیسائیوں کے ساتھ عیسائی مذہب کو اور مسلمانوں کے ساتھ قرآن کو خراج عقیدت پیش کریں۔" حقیقت یہ ہے کہ ان میں جس قدر وسعتِ مشرب تھی اسی قدر خلوص بھی تھا۔[۴]

وہ ۱۷۷۲ء میں ایک راسخ العقیدہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ایک بالکل قدیم طرز کے اسلامی مدرسے میں ہوئی۔ وہ زندگی بھر ہر قسم کی روایات اور خیالات کی خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، حقیقت کی تلاش میں رہے۔ یہاں تک کہ آخرکار دور دراز ملک انگلستان کے شہر برسٹول میں عیسائیوں کے اہتمام میں ابدی آرام گاہ میں پہنچ گئے۔

ان کی شخصیت مختلف عقائد اور تہذیبوں کا سنگم تھی وہ ایک ایسے برہمن تھے جنھیں مسلمانوں کا کھانا انگریزی طریقے سے کھانے میں لطف آتا تھا۔[۵]

رام موہن رائے اس زمانے میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے جو انتشار اور تشکیک کا دور تھا۔ مسلمانوں کا پرانا نظام حکومت جس کے آگے ہندوؤں نے سر تسلیم خم کر دیا تھا دم توڑ رہا تھا۔ ملک میں ہر طرف بغاوت اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ادھر یورپ کی تجارتی کمپنیاں عیسوی عقیدے اور جدید خیالات کے ساتھ ہندوستان کے افق پر نمودار ہو رہی تھیں جس سے ایک نئی کش مکش پیدا ہو گئی تھی۔ رام موہن رائے پر بچپن ہی سے مختلف قسم کے اثرات پڑے تھے۔ انھوں نے ہندو مذہب کے مختلف فلسفوں، اسلام اور عیسائی مذہب کا مطالعہ کیا تھا اس کے علاوہ وہ ان جدید خیالات سے جو یورپین اپنے ساتھ لائے تھے دلچسپی رکھتے تھے؛ وہ ان سے متاثر ہوئے تھے مگر کوئی بھی ان کے ذہن کو محدود نہیں کر سکا تھا۔ ان میں تین اثرات کو متعین کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ ہم یہاں صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسلامی اثرات سے کس حد تک متاثر تھے۔

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ رام موہن رائے نے اسلام کے بارے میں براہ راست بہت کم لکھا ہے۔ انھوں نے جا بجا اسلام، مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ مگر یہ باتیں مختلف تاریخی سیاق وسباق میں مختلف مقاصد کے تحت لکھی گئی ہیں اس لیے آسانی کے ساتھ ان سے عام نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے کہ ان کی شخصیت پر اسلامی اثرات کس حد تک تھے۔ ایک طریقہ اور بھی ہے وہ یہ کہ انھوں نے ہندو اور عیسائی مذہب کی روایات کی جو توجیہہ کی ہے اس میں ہم اسلامی اثرات تلاش کرنے کی کوشش کریں اور یہاں یہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

(۲)

یہ مناسب ہوگا کہ پہلے ہم رام موہن رائے کی زندگی اور کارناموں کو تاریخ وار مختصر طور پر بیان کر دیں۔[۲] راجہ رام موہن رائے ایک راسخ العقیدہ، دیندار برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد پشتوں سے مرشد آباد کے حکمرانوں کے یہاں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ان کی والدہ برہمنوں کے "شکت" فرقے سے تعلق رکھتی تھیں، مگر شادی کے بعد انھوں نے بخوشی اپنے سسرالی عقیدے کے مطابق "ویشنو" دھرم اختیار کر لیا۔ ان کے والد ایک دھرماتما برہمن تھے اور اپنے بزرگوں کی روایات کے مطابق مرشد آباد کے مسلمان حکمرانوں کے ملازم تھے مگر بعد میں نواب سے کچھ اختلافات کی بنا پر وہ اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔[۳] رام موہن رائے کی ابتدائی تعلیم ایک بنگالی پاٹھ شالہ میں ہوئی لیکن گھر پر مولوی سے فارسی بھی پڑھتے تھے۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے ان کو نہ تو کلکتہ بھیجا گیا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا دارالحکومت تھا اور نہ ہندو پاٹھ شالہ بنارس، بلکہ دور دراز پٹنہ کے اسلامی مدرسے میں عربی اور فارسی تعلیم کے لیے داخل کیا گیا۔ کیونکہ اس زمانے میں یہی عزت وشہرت کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا۔[۵] ان کے سب سوانح نگار اس پر متفق

کہ یہ چند سال ان کی زندگی اور سیرت کی تشکیل میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تین سال پٹنہ میں رہنے کے بعد وہ روایتی سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنے بنارس چلے گئے وقت وہ تیرہ یا چودہ برس کے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں انھیں اپنے باپ سے پوجا کے سلسلہ میں اختلاف رائے ہو جانے کی وجہ سے گھر چھوڑنا پڑا اور انھوں نے د مقامات کا سفر کیا جس میں تبت بھی شامل تھا۔ یہاں انھوں نے لاماؤں کے مذہب مطالعہ کیا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان واپس آگئے اس عرصے میں ان کے والد کی نارا ہو گئی تھی۔ مگر چونکہ رام موہن رائے اپنے خاندان اور دوستوں سے شدید ذہنی ا رکھتے تھے اس لیے مجبور ہو کر ان کے والد کو ان سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ اس وقت را رائے بیس برس کے تھے۔ وہ بنارس چلے گئے اور برابر وہیں رہے۔ اپنے والد کی ذ کچھ سال پہلے ۱۸۰۳ء میں وہ گھر واپس آگئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ بیٹے مں صلح ہو گئی تھی۔

تقریباً اسی زمانے میں انھوں نے اپنی پہلی فارسی کتاب "تحفۃ الموحدین" ع کے ساتھ لکھی۔ اس کے ذریعے انھوں نے سب مذاہب کی روایات پر تنقید کی اور توحید پرستی کی بنیاد ڈالی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رام موہن رائے اس کتاب کو اپنی میں چھپوانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی ایک اور فارسی تصنیف "مناظرۃ الادیان" کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا ہے شاید ضائع ہو گئی۔

بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی۔ خوش قسمتی سے انھیں اس میں مل گئی۔ اس ملازمت کا اہم پہلو یہ تھا کہ اس طرح انھیں انگریزی تہذیب اور جد اور عیسائی مذہب سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہاں وہ مسٹر ڈگبی کے غیر معمولی طور پر ایک ہمدرد اور ذہین انسان تھے۔ کلرک کی حیثیت سے کام کر ۱۸۰۰ء میں مسٹر ڈگبی انھیں رنگ پور لے آئے جہاں وہ پانچ سال رہے۔ رنگ پور کے قیام میں انھیں مختلف عقائد کے علماء سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا موقع پر انھوں نے تانترک مسلک کی کتابوں اور بعض مذاہب کے مقدس صحیفوں کا مط

تقریباً دس سال مسٹر ڈگبی کے ساتھ رہنے سے وہ ایک نئی دنیا سے آشنا ہوئے جو بعض لحاظ سے اس دنیا سے بالکل مختلف تھی جس میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور پلے بڑھے تھے۔ یہ اختلاف تھا جس نے بہت سے ہندوستانیوں کو نئے سیاسی نظام کا مخالف بنادیا۔ مگر رام موہن را نے اندازہ کرلیا تھا کہ اس میں ترقی کے بڑے موقع ہیں۔ اپنی ذکاوت احساس کی بدولت انھوا مغربی تہذیب کو اس حد تک اپنا لیا جتنا ہندوستانی تہذیب کو۔

۱۸۱۴ء میں انھوں نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تاکہ اس کام کو انجام دیر وہ اپنی زندگی کا مشن سمجھتے تھے یعنی ہم مذہبوں کی اصلاح۔ قدرتی طور پر انھوں نے اس کے لیے کلکتہ کو منتخب کیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے آتمیہ سبھا بنائی اور مذہب کی مقدس کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ان کاموں کے سلسلے میں انھیں قدامت بر ہمنوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۲۰ء میں انھوں نے چاروں انجی کا انتخاب "تعلیماتِ حضرتِ عیسیٰ" کے نام سے شائع کیا۔ اس "ملحدانہ" فعل یعنی The Precepts of Jesus" کا انتخاب کرنے کی سیرام پور بپٹسٹ پادریوں نے شدید مخالفت کی رام موہن رائے کو عیسائی فرقوں کے مذہبی مناظروں میں خوب خوب گھسیٹا گیا۔ اسی موقع پر نے یکے بعد دیگرے تین رسالے "عیسائی قوم سے اپیل" کے نام سے شائع کیے جس میں عقیہ وحدانیت کی حمایت کی گئی تھی۔ ان اپیلوں کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی اور عبرانی دونوں زبانوں پر کس قدر عبور تھا۔

اس کے بعد مخالفت کا طوفان اور بھی زور شور سے اٹھا جب مسٹر اٹیدم نے جو ان کے مخالف "راندۂ درگاہ آدم ثانی" کہتے تھے۔ رام موہن کے ساتھ بائبل کے بنگالی ت کے دوران میں مذہب وحدانیت اختیار کرلیا۔

۱۸۲۸ء میں رام موہن رائے نے ان لوگوں کے لیے جو کسی خاص فرقے سے تعا نہیں رکھتے تھے بلکہ خدائے برحق کے پرستار تھے، برہمو سماج قائم کی۔ ان کا یہ قدم تھا کہ راسخ العقیدہ لوگوں کی طرف سے ان پر سخت تنقید ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی کی چند اور وجوہات تھیں یعنی تعدادِ ازدواج کی مخالفت، جدید تعلیم، اخباروں کی آزادی،

ا تعلیم کی حمایت وغیرہ۔

۱۸۳۱ء میں وہ مغل بادشاہ کے وکیل کے طور پر انگلستان گئے تاکہ ان کی پنشن کی بحالی کے لیے چارہ جوئی کریں۔ اگلے دو سال یعنی اپنی وفات (۱۸۳۳ء) تک وہ بہت اہم مشاغل میں مصروف رہے۔ وہ نہ صرف اعلیٰ حکام اور مسلک وحدانیت کو ماننے والے دوستوں سے میل جول رکھتے تھے بلکہ ایسی شخصیتوں سے بھی جیسے بنیتھم اور ولیم روسکو۔ انھیں شاہ فرانس نے پیرس میں کئی بار کھانے پر بھی مدعو کیا۔ ان کی کثیر تصانیف نے ہندوستان اور یہاں کے حالات کو سمجھنے میں برطانوی مسلک کو بڑی مدد دی۔ برطانوی سیاست کے سلسلے میں ایک بار انھوں نے بڑی دلچسپ دھمکی دی تھی کہ اگر ریفارم بل پاس نہ ہوا تو وہ برطانوی مقبوضات کو چھوڑ کر امریکہ جا بسیں گے۔

(۳)

کہا جاتا ہے کہ وہ علماء جو روایتی مدرسوں میں تعلیم پاتے رہیں، کتنی ہی کوشش کریں مگر قدامت پرستی کے اثرات پر غالب نہیں آسکتے۔ "مدرسہ" بجائے خود ایک الگ دنیا ہے جو ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہ ایک طرز زندگی بھی ہے اور طرز فکر بھی اور اظہارِ ذات کا ذریعہ بھی۔ آج کل یہ مدرسے تعلیم گاہوں سے زیادہ آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رام موہن رائے کے زمانے میں اس معاملے میں انتخاب کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں تھی کہ بچے کو کہاں پڑھایا جائے۔ یا تو اسلامی مدرسہ تھا یا ہندو پاٹھ شالا۔ دونوں زمانے سے پیچھے تھے مگر پاٹھ شالا مدرسے سے بھی ہزار سال زیادہ پیچھے تھا۔ برہمنوں کے وہ خاندان جو تعلیم کو ذریعہ معاش بنانا چاہتے تھے۔ اپنے بچّوں کو پہلے پاٹھ شالہ میں اور پھر مدرسے بھیجتے تھے مگر رام موہن رائے کے معاملے میں یہ ترتیب بدل گئی تھی اور اس تبدیلی سے ان کی شخصیت میں بڑا فرق پڑ گیا۔

رام موہن رائے نو یا دس سال کی عمر میں پٹنہ گئے اور وہاں تین سال تعلیم پائی۔ ان کے سب سوانح نگاروں نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ پٹنہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کا ان کے طرز فکر بلکہ پوری زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔

بہ قول برجندرناتھ سیل کے "سب سے پہلے اسلامی تہذیب نئے بصرہ و بغداد کی
نے جو ہندوستان کے اسلامی مدرسے کے ذریعہ اس کم عمر لڑکے تک پہنچی اس کے ذہن
کیا۔ اقلیدس نے علم ہندسہ، فرفوریوس کے منطقی معقولات نے جو عربی منطق کے سانچے میں
فارسی غزلوں نے جن کا مطلب وہ اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا مگر ان کی گرمی اپنے خون میں
کرتا تھا، اس کی چشم بصیرت کو وا کیا۔ اسی طرح قدیم یونان کے افلاطون اور ارسطو
عربی لباس میں ملبوس تھے اس کی ملاقات ہوئی۔"[۱۰]

مسٹر سیل کہتے ہیں کہ سب سے گہرا اثر اس پر معتزلہ اور موحدین کا تھا۔ ا
دوسرے سوانح نگار پی۔ ایس شاستری کے نزدیک "رام موہن رائے زندگی بھر ا
اثرات سے آزاد نہ ہو سکے۔[۱۱] یہ اثرات اتنے گہرے تھے کہ انھوں نے رام موہن رائے
واطوار اور ان کے ذوق و وجدان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔[۱۲] علم حدیث اور فقہ پر
قدر عبور حاصل تھا کہ لوگ انھیں ایک زبردست مولوی کہتے تھے۔"

بدقسمتی سے اس تعلیم کے بارے میں جو رام موہن رائے نے پٹنہ میں حاصل
پاس کوئی مستند شہادت نہیں ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہاں انھوں نے کن کن کتا
مطالعہ کیا، ان کے استاد کون تھے۔ یہاں تک کہ ان کے قیام کی مدت بھی جو تین
کہی جاتی ہے صحت کے ساتھ متعین نہیں کی جاسکتی۔ تین یا چار برس کا قیام تو
کا حقہ مطالعہ کرنے یا فارسی تصوف اور افلاطون و ارسطو کے فلسفے کو سمجھنے کے
کم ہے۔ عام طور پر درسِ نظامیہ کو پورا کرنے کے لیے دس سال درکار ہوتے ہیں
ان کے پٹنہ میں رہ کر اسلامی علوم حاصل کرنے کی کہانی عقیدت مندوں کی م
ہے یا حقیقت میں اس لڑکے نے جس کا ذہن قبل از وقت پختہ ہو چکا تھا، اس
قابلیت حاصل کر لی تھی۔[۱۳] رام موہن رائے کے سوانح نگار ان مسائل کو حل کر
ہمیں کوئی مدد نہیں دیتے اور اس سلسلے میں ہمیں زیادہ تر قیاس آرائی سے کا
پڑتا ہے۔

ہندوستان کے زیادہ تر مدرسوں میں درس نظامیہ ہی پڑھایا جاتا ہے

نصاب بہت ہی جامع اور علوم اسلامی کی سب شاخوں پر نیز متعلقہ علوم فلسفہ منطق اور اصول اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ ۱۸ ویں صدی میں بہت سے مشہور اسلامی مدارس تھے جن میں کسی ایک علم کی خصوصی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسۂ دہلی میں حدیث و تفسیر کی، لکھنؤ میں فقہ و منطق کی، مدرسۂ خیرآباد میں علم الکلام اور فلسفہ کی۔[14] چونکہ خیرآباد پٹنہ سے قریب تر ہے اس۔ ممکن ہے کہ وہاں مدرسۂ خیرآباد کے اثرات غالب ہوں۔ رام موہن رائے کی پہلی کتاب "تحفۃ الموحدین" کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ان علوم پر پوری دستگاہ رکھتا ہے۔ ان کی اس اہم تصنیف پر آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بحث ہوگی۔

اب ایک سوال اٹھتا ہے کہ ایک دیندار برہمن کو کیا ضرورت پیش آئی جو اس نے اپنے بیٹے کو سیکڑوں میل دور پٹنہ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا۔ شاید اس لیے کہ پٹنہ اس وقت علوم کا مرکز تھا۔ شاید کسی مولوی صاحب نے جو خاندانی دوست بھی ہوں، اس نوعمر لڑکے کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہو۔ ایک برہمن لڑکے کا ایک مسلمان خاندان کے ساتھ رہنا بجائے خود مشکل مسئلہ ہے مگر رام موہن رائے کے آبا و اجداد پانچ پشت سے ایک انتہائی زبردست قدم اٹھا چکے تھے یعنی پروہت کے پیشے کو خیرباد کہہ کر شاہی دربار کی نوکری اختیار کر چکے تھے۔ اور جہاں تک کھانے پینے کے پرہیز کا تعلق ہے اسے خود انھوں یا ان کے بزرگوں نے پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے لباس اور غذا کو کیوں اپنایا تھا اور کچھ معاملوں میں قدیم رسم و رواج سے کیوں انحراف کیا تھا۔

یہ بات اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ رام موہن رائے کی ماں بڑی مذہبی عورت تھیں اور بیٹے نے بچپن ہی میں ان کے اثر سے مذہبی رسوم و روایات اپنائے تھے۔ وہ اس وقت تک پانی نہ پیتے تھے جب تک بھگوت پر ان کے مقررہ اشلوکوں کا جاپ نہ کر لیں۔[15] اس کے بعد گھر سے علیحدہ رہ کر اسلامی روایات سے اس قدر قریبی رابطہ کرنا ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان استادوں اور اسلامی معاشرے کے اثرات میں اور ان کی ابتدائی تربیت میں تین تضاد تھا۔ ان کے ایک جدید سوانح نگار مسٹر اقبال سنگھ نے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے: "بلاواسطہ اور فکر انگیز اثر اسلام

تھا۔ یہ انھیں اپنے آبائی عقیدے سے جو بچپن میں سکھایا گیا تھا بالکل متضاد معلوم ہوا ہوگا۔ انھا
نے اپنی ماں کی پرجوش کٹر مذہبیت کی گھٹی ہوئی فضا میں تربیت پائی تھی جس نے مذہب اور
روحانیت کے سارے نچوڑ کو رسوم وعبادات کی میکانکی تکرار تک محدود کردیا تھا۔ اس کے مقابلے
میں اسلامی عبادات کے سیدھے سادے طریقے.... ناممکن تھا کہ ان کے ذہن پر گہرا اثر نہ ڈالتے
اور ان کے دل و دماغ میں ہلچل نہ پیدا کرتے۔ اسی طرح اسلامی دینیات میں کوئی پیچیدگی نہ تھی
یہ عقیدہ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان کسی قسم کے وسیلوا
اور واسطوں کی خواہ وہ علامات کی شکل میں ہوں یا اداروں کی صورت میں، ضرورت نہیں
لازمی طور پر ان کے لیے دلکشی رکھتا ہوگا اور اس نے ان کے اندر اگر روحانی انتشار اور
کشمکش نہیں تو خلش اور بے چینی تو ضرور پیدا کر دی ہوگی۔[۱۶]"

ممکن ہے کہ اس تضاد کو مبالغے سے بیان کیا گیا ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ رام موہن
رائے اپنے معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ خاص طور سے اس کی ظاہری رسوم
مورتی پوجا، کھانے پینے کے قوانین اور ذات پات کے نظام کو۔ اقبال سنگھ کا یہ کہنا بجا ہے
کہ رام موہن رائے کو پٹنہ میں جو تجربہ ہوا تھا وہ سفر کا اختتام نہیں بلکہ آغاز تھا۔ قرآن
مطالعے نے "ان کے ابتدائی مذہبی عقیدوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا"[۱۷] مگر وہ اپنے رو
عقائد کی جگہ اسلام کو ایک مذہب کے طور پر تو نہ اپنا سکے کیوں کہ اپنے مذہب میں ان
جڑیں بہت گہری تھیں۔

بہر حال یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ مدرسے کا اثر ان پر محض برائے نام تھ
اس لیے کہ وہ آئندہ چند سال میں بعض مروجہ مذہبی رسومات اور مسلمہ نظریات پر مسلسل
حملہ کرتے رہے۔ اپنی نوعمری کے زمانے میں یعنی پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے
ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا جس میں ہندو مذہب کی مورتی پوجا کے قابل تسلیم ہونے
شبہ ظاہر کیا گیا۔[۱۸]

(۴)

اسی تنقیدی انداز میں انھوں نے تحفۃ الموحدین تصنیف کی۔ یہ ایک مناظرہ

نصاب بہت ہی جامع اور علوم اسلامی کی سب شاخوں پر نیز متعلقہ علوم فلسفہ منطق اور اص
اخلاقیات پر مشتمل ہے۔ ۱۸ ویں صدی میں بہت سے مشہور اسلامی مدارس تھے جن میں کہ
ایک علم کی خصوصی تعلیم دی جاتی تھی۔ مدرسۂ دہلی میں حدیث وتفسیر کی، لکھنؤ میں فقہ و منط
کی، مدرسۂ خیرآباد میں علم الکلام اور فلسفہ کی[۱۴] چونکہ خیرآباد پٹنہ سے قریب تر ہے اس۔
ممکن ہے کہ وہاں مدرسۂ خیرآباد کے اثرات غالب ہوں۔ رام موہن رائے کی پہلی کتاب
"تحفۃ الموحدین" کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف ان علوم پر پوری دستگاہ رکھ
ہے۔ ان کی اس اہم تصنیف پر آگے چل کر کسی قدر تفصیل سے بحث ہوگی۔

اب ایک سوال اٹھتا ہے کہ ایک دیندار برہمن کو کیا ضرورت پیش آئی جو اس۔
اپنے بیٹے کو سیکڑوں میل دور پٹنہ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا۔ شاید اس لیے کہ پٹنہ اسا
علوم کا مرکز تھا۔ شاید کسی مولوی صاحب نے جو خاندانی دوست بھی ہوں، اس نوعمر لڑ
کی تعلیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لی ہو۔ ایک برہمن لڑکے کا ایک مسلمان خاندان کے سا
رہنا بجائے خود مشکل مسئلہ ہے مگر رام موہن رائے کے آبا واجداد پانچ پشت سے ایک انت
زبردست قدم اٹھا چکے تھے یعنی پروہت کے پیشے کو خیرباد کہہ کر شاہی دربار کی نوک
اختیار کر چکے تھے۔ اور جہاں تک کھانے پینے کے پرہیز کا تعلق ہے اسے خود انھوں
یا ان کے بزرگوں نے پہلے ہی توڑ دیا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے مسلمانوں
لباس اور غذا کو کیوں اپنایا تھا اور کچھ معاملوں میں قدیم رسم و رواج سے کیوں انحراف کیا تھا۔

یہ بات اس لحاظ سے اور بھی اہم ہے کہ رام موہن رائے کی ماں بڑی مذہبی عور
تھیں اور بیٹے نے بچپن ہی میں ان کے اثر سے مذہبی رسوم و روایات اپنائے
وہ اس وقت تک پانی نہ پیتے تھے جب تک بھگوت پر ان کے مقررہ اشلوکوں کا
نہ کر لیں[۱۵] اس کے بعد گھر سے علیحدہ رہ کر اسلامی روایات سے اس قدر قریبی رابط
کرنا ان کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلمان استادوں اور اسلامی معاشرے
اثرات میں اور ان کی ابتدائی تربیت میں بیّن تضاد تھا۔ ان کے ایک جدید سوانح نگ
مسٹر اقبال سنگھ نے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے: "بلاواسطہ اور فکر انگیز اثر اسلام

تھا۔ یہ انھیں اپنے آبائی عقیدے سے جو بچپن میں سکھایا گیا تھا بالکل متضاد معلوم ہوا ہوگا۔ انھوں نے اپنی ماں کی پرجوش کٹر مذہبیت کی گھٹی ہوئی فضا میں تربیت پائی تھی جس نے مذہب اور روحانیت کے سارے نچوڑ کو رسوم و عبادات کی میکانکی تکرار تک محدود کر دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی عبادت کے سیدھے سادے طریقے.... ناممکن تھا کہ ان کے ذہن پر گہرا اثر نہ ڈالتے اور ان کے دل و دماغ میں ہلچل نہ پیدا کرتے۔ اسی طرح اسلامی دینیات میں کوئی پیچیدگی نہ تھی یہ عقیدہ کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان کسی قسم کے وسیلوں اور واسطوں کی خواہ وہ علامات کی شکل میں ہوں یا اداروں کی صورت میں، ضرورت نہیں لازمی طور پر ان کے لیے دلکشی رکھتا ہوگا اور اس نے ان کے اندر اگر روحانی انتشار اور کشمکش نہیں تو خلش اور بے چینی تو ضرور پیدا کر دی ہوگی۔[16]"

ممکن ہے کہ اس تضاد کو مبالغے سے بیان کیا گیا ہو مگر اتنا ضرور ہے کہ رام موہن رائے اپنے معاشرے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ خاص طور سے اس کی ظاہری رسوم، مورتی پوجا، کھانے پینے کے قوانین اور ذات پات کے نظام کو۔ اقبال سنگھ کا یہ کہنا بجا ہے کہ رام موہن رائے کو پٹنہ میں جو تجربہ ہوا تھا وہ سفر کا اختتام نہیں بلکہ آغاز تھا۔ قرآن مطالعے نے "ان کے ابتدائی مذہبی عقیدوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا[17] مگر وہ اپنے را عقائد کی جگہ اسلام کو ایک مذہب کے طور پر تو نہ اپنا سکے کیوں کہ اپنے مذہب میں ان جڑیں بہت گہری تھیں۔

بہر حال یہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا کہ مدرسے کا اثر ان پر محض برائے نام تھ اس لیے کہ وہ آئندہ چند سال میں بعض مروجہ مذہبی رسومات اور مسلمہ نظریات پر مسلس حملہ کرتے رہے۔ اپنی نو عمری کے زمانے میں یعنی پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے ایک کتاب کا مسودہ تیار کیا جس میں ہندو مذہب کی مورتی پوجا کے قابل تسلیم ہونے شبہ ظاہر کیا گیا۔[18]

(۴)

اسی تنقیدی انداز میں انھوں نے تحفۃ الموحدین تصنیف کی۔ یہ ایک مناظرہ

رسالہ ہے جو عربی مقدمے کے ساتھ فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اس میں جو دلائل دیے گ
منطقی ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پر معتزلہ کا گہرا اثر ہے نیز یہ کہ ان کو
"علم الکلام" پر عبور حاصل ہے بلکہ وہ فقہ اور اصولِ فقہ سے بھی بہت اچھی طرح
ہیں۔ اس رسالے میں اس قسم کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے جیسے عقیدۂ توحید،
جزا و سزا وغیرہ) اور قرآن کی آیتیں اور فارسی شعراء کے اشعار بر محل نقل کیے گئے
رام موہن رائے نے اسلامی منطق کی مدد سے اپنے خیالات کے صحیح ثابت کرنے میں
ہے جن کی زد سب مروجہ مذاہب پر جن میں اسلام بھی شامل ہے پڑتی ہے۔

آئیے اب ان موضوعات پر نظر ڈالیں جن سے تحفۃ الموحدین میں بحث کی
اس میں انھوں نے سب مذاہب کا جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔
سب کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ ان کے نزدیک "ہر مذہب ایک ذات واحد پر
ہے۔ جو تمام موجودات کا خالق اور رب العالمین ہے" (صفحہ ۹۴) انھوں نے مختلف
ان رہنماؤں پر تنقید کی ہے جنھوں نے اپنے نام اور شہرت کی خاطر لوگوں کو یہ سمجھا
ایک خاص مذہب حق محض کا حامل ہے۔ پھر اس مسئلے پر کافی تفصیل سے بحث
کہ روایت کی نقل میں تواتر کا مسئلہ بہت مشکل ہے وہ کہتے ہیں کہ "یہ تواتر اس
کہ کوئی روایت جو قرین عقل ہے متعدد لوگوں نے بیان کی اور کسی نے اس کی
کی اس کو یقین کرنے کے لیے کافی ہے مگر یہ اس تواتر سے مختلف ہے جس میں
عقل بات ایسے راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچی ہو جن کے بیانات میں اختلا
(صفحہ ۱۰۹) وہ معجزات اور ما فوق الفطرت واقعات کو عقل کی کسوٹی پر کسنے
وہ روح کا آخرت اور جزا و سزا کے عقائد کو قبول کرنے پر تیار ہیں مگر اس بنا پر
کو ناجائز کاموں سے باز رکھنے کے لیے مفید ہیں۔ مگر جب کتب مقدسہ اور
کر دیا جائے تو پھر مذہب میں کیا رہ جاتا ہے؟

ان کا خیال ہے کہ جب مذہب کی غیر عقلی بندشیں دور ہو جائیں گی
واحد کی طرف رجوع کریں گے جو اس ہم آہنگ نظام کائنات کا خالق ہے۔

ں جنھیں صراطِ مستقیم دکھائی گئی ہے۔" جس کی خدا رہنمائی کرتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔
جن کو وہ گمراہ کرتا ہے اس کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا۔" (صفحہ ۹۴) خود ان کے عقائد کی
اد توحید ہے وہ خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہیں جو اعلیٰ و عظیم ہے خالق کائنات ہے۔
بّ العالمین ہے وہ بقائے روح کے قائل ہیں اور عقل کو رہنما مانتے ہیں۔" اس کی اہمیت ہے
انسانوں کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہونے چاہئیں وہ بغیر رنگ اور نسل مذہب و ملت کے
باز کے آپس میں محبت رکھیں اور یہی وہ خالص عبادت ہے جو خدائے تعالیٰ کے نزدیک قابل
ل ہے۔" (صفحہ ۹۵)

اس رسالے میں مخصوص اصطلاحات اور خیالات کی بھرمار ہے۔ متکلمین کے انداز میں
ث کی گئی ہے جو یونانی منطق، قرآن اور عقل کا ایک معجون مرکب ہے۔ اگرچہ اس میں
اہر سب مذاہب کو رد کیا گیا ہے۔ لیکن خاص طور سے ان لوگوں سے خطاب ہے جو فارسی
، اچھی دستگاہ رکھتے ہیں اور عربی منطق کی بنیادی اصطلاحوں سے واقف ہیں۔
ں وہ ہندو پنڈت بھی شامل ہیں جو عربی سے واقف ہیں اور مسلمان علماء بھی۔ ہو سکتا ہے
ہ اس رسالے کو لکھنے کا محرک یہ ہو کہ وہ ان ہندو پنڈتوں کے سامنے اپنے صحیح عقائد
وضاحت کریں جنھوں نے ان پر "مسلمان" ہونے کا الزام لگایا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو
تی ہے کہ چونکہ انھوں نے ہندوؤں کی بہت سی مذہبی رسموں اور روایات پر تنقید
تھی۔ اس لیے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ خرابیاں صرف ہندو مذہب ہی میں نہیں ہیں
ں نے اس پر زور دیا کہ خالص مذہب "خدائے واحد" کی عبادت کے سوا کچھ نہیں۔
بہرحال یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس رسالے کی اشاعت نہیں
، تھے۔ ان خیالات میں جو انھوں نے اس میں ظاہر کیے، آگے چل کر بہت کچھ تبدیلی ہوئی
ا اشاعت میں جو انھیں تامل تھا اس کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ انھیں خود ان خیالات اور
نت کی صحت میں شبہ ہو۔ جو اس میں انھوں نے پیش کیے یا پھر مولویوں کی مخالفت کا ڈر ہو۔
مسلمانوں کی تسلی کا صرف ایک پہلو ہے کہ ہر مذہب کی روایات کو رد کیا گیا ہے۔ اس
ے میں انھوں نے آیاتِ قرآنی کے جو حوالے دیے ہیں وہ (صرف دو کو چھوڑ کر) اس خیال

دیے گئے کہ وہ حقیقت کے آئینہ دار ہیں بلکہ ان کا مقصود صرف اسلوب بیان میں
شی پیدا کرنا ہے[۲۰] اب رہیں وہ آیتیں جن میں اس نظریے کا جو مسلمانوں سے منسوب
ے جواز پیش کرنا مقصود ہے کہ "بت پرستوں کو بلا امتیاز قتل کر دیا جائے" آخر میں
سونتو کمار کی رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ "وہ مذہبی جذبات جو تحفۃ الموحدین
کیے گئے ہیں رام موہن رائے کی بالغ نظری اور نقطۂ نظر کی نمائندگی نہیں کرتے۔"[۲۱]
تاہم اس رسالے کو پڑھ کر برجندر ناتھ سیل کے اس خیال کی تصدیق ہوگی کہ "رام
ئے کی ذہنی میراث ان نظریات پر مشتمل تھی جن میں عربوں کے فلسفہ و دینیات کے
مذاہب کو قرآن و شریعت ارسطو کی منطقی فکر کے سانچے میں ڈھالا گیا تھا خصوصاً
العقیدہ فرقوں معتزلہ، صوفیہ، موحدین فراموش طرز کی جماعت اخوان الصفا اور
سدی کے ناموس نگاروں کے نظریات پر۔"[۲۲]
اس چھوٹے سے رسالے کی بنا پر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ رام موہن رائے کو علوم
پر عبور حاصل تھا البتہ یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ عربی مدارس کی
تابوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اگرچہ ان کے زیادہ تر خیالات سے اسلامی روایات
ت ظاہر ہوئی لیکن جو تھوڑے بہت مثبت عقائد ان کے یہاں ملتے ہیں ان میں
طور پر تعلیماتِ قرآنی کی روح پائی جاتی ہے۔

(۵)

تحفۃ الموحدین چونکہ مناظرانہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لیے ہم مجبور ہیں کہ ان
کو جو اس میں پیش کیے گئے ہیں بہت زیادہ قابل توجہ نہ سمجھیں، کیونکہ مناظرے
ان کا نقطۂ نظر تعمیری نہیں تخریبی ہوتا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آخر عمر میں
نے اپنے منفیانہ انداز نظر کو بدل دیا تھا۔ اگر تحفۃ الموحدین کو چھوڑ کر ان کی کسی
تصنیف میں مسلمانوں اور پیغمبر اسلام کا ذکر ہوتا تو ہم اس کی روشنی میں ان کے
ت کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔ مگر ہمیں سخت الجھن ہوتی ہے کہ ایک طرف تو ان کے
ح نگار ا، ا، ۳۱، عقیدت کا: کر تر ملو، حوا نخھو، اسلام سے تھی۔ دوسری طرف

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے سلسلے میں بالکل خاموش ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نجی صحبتوں میں تو انھوں نے اکثر و بیشتر اسلام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ مگر اس موضوع پر لکھنے کی نہ تو انھیں فرصت ملی اور نہ خاص ضرورت پیش آئی۔ ان کے دوسرے سوانح نگاروں کی طرح مس۔ ایس ڈی کولٹ بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ " رام موہن رائے کو اسلام سے گہری عقیدت تھی" وہ لکھتی ہیں " یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ رام موہن رائے کو اسلام سے دلی تعلق تھا۔ خاص طور سے اس کے "توحید کے عقیدے سے"۔ وہ مسٹر آدم کے حوالے سے بیان کرتی ہیں " جب کبھی انھیں پیغمبر اسلام کی سیرت اور تعلیمات پر لوگوں کے اعتراضوں کا جواب دینے کا موقع ملتا تو انھیں بڑی خوشی ہوتی۔ ان ہی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے سیرتِ نبوی پر ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی مگر بدقسمتی سے وہ مکمل نہ ہو سکی۔ یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ اس نامکمل مسودے کا کیا انجام ہوا۔

رام موہن رائے نے سیرت کا مطالعہ مستشرقین اور مشنریوں کے واسطے سے نہیں مدرسے کی تعلیم کے دوران کیا تھا۔ نوعمری کے زمانے میں انھوں نے جس طرح اپنی سماج کو چنوتی دی اور اپنے عقائد کی بنا پر جو تکلیفیں سہیں ان میں آنحضرتؐ کی مکّی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ رسول اللہؐ کو صرف مجدّد اور مصلح ہی سمجھتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ جس طرح بعثت رسولؐ سے پہلے عرب معاشرہ پستی کی حالت میں تھا، اسی طرح خود ان کے زمانے میں ہندو معاشرہ انحطاط میں مبتلا تھا۔ ان کے تخیل کو آنحضرتؐ کی مثال نے چھیڑا کہ کس طرح آپ نے ایک پچھڑے ہوئے قبائلی معاشرے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہندو معاشرے میں نئی زندگی کی روح پھونکنے کے لیے ہمہ گیر اصلاح کی ضرورت تھی۔ رام موہن رائے کو محسوس ہوا کہ انھیں مصلح کا کام انجام دینا ہے۔

مورتی پوجا کے بارے میں ان کا رویہ وہی ہے جو اسلام کا ہے۔ ان کے خیال میں بت پرستی گناہوں کی جڑ ہے۔ توحید کا عقیدہ اخلاقی سیرت کو بلند کرتا ہے۔ بُت پرستی اسے پستی کے گڑھے میں ڈھکیل دیتی ہے۔ ان پر مدرسے کی تعلیم کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ قوم کی اخلاقی گراوٹ کا سبب وہ دنیوی امور، جیسے تعلیم کی کمی اور معاشی وسیاسی استحصال

کے بجائے بت پرستی کو سمجھتے تھے۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ ان میں سماجی و سیاسی شعور کی کمی نہ تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں انھوں نے غیر معمولی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور ان کی اخلاقی کمزوریوں کو ان کے عقیدۂ توحید کی کمزوری پر محمول کیا ہے۔ ذیل میں ہم ایک دلچسپ اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کس طرح مسلمانوں کے طور طریقے اپنائے تھے۔

"انھوں نے مسلمان امراء کا لباس اختیار کر لیا تھا۔ وہ اچکن، چغہ اور پاجامہ پہنتے تھے۔ اوپر سے شال لپیٹتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر میں بھی وہ مسلمانوں کی طرح کبھی ننگے سر نہیں رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ رات کا کھانا انگریزی طریقے پر ہوتا تھا مگر اس میں کھانے بالکل مسلمانوں کے ہوتے تھے، پلاؤ، کوفتہ، قورمہ وغیرہ، رات کو سونے سے پہلے وہ پسندیدہ میٹھا حریرہ پیتے تھے جو خالص مسلم کھانا سمجھا جاتا ہے۔"[۲۵]

اسے پڑھ کر اتاترک کی اصلاحات کا جو انھوں نے ترکی میں کی تھیں، خیال آجاتا ہے انھوں نے مغربی لباس کو اہمیت دی تھی۔ رام موہن رائے کے نزدیک بھی سماجی طور طریقوں اور لباس وغیرہ کا سیاسی آزادی اور شخصی آزادہ روی سے قریبی تعلق ہے۔
ان کا خیال تھا کہ ہندو معاشرے میں کوئی بنیادی خرابی ضرور ہے۔ انھوں نے برہمو سماج کے رسالے میں لکھا تھا:

"ہم کوئی نو سو سال سے غلامی کی ذلت سہہ رہے ہیں اور ہماری اس پستی کا سبب ہماری حد سے بڑھی تہذیب خونریزی ہے۔ یہاں تک کہ جانوروں کو ذبح کرنے سے پرہیز اور ذات پات کا نظام ہے جس کی وجہ سے ہم میں یک جہتی نہیں ہے۔"[۲۶]

ان کا یہ بیان اس وجہ سے دلچسپ ہے کہ انھوں نے سماجی خرابیوں کا تعلق سیاسی غلامی سے بتایا ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے نزدیک سیاسی ترقی کے لیے سماجی خرابیوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اس میں ان پر پڑنے والے اسلامی اثرات کا

اتصال نظر آتا ہے، اس بات کو انھوں نے ایک خط میں جو ۱۹۲۱ء میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا، صاف کہا ہے:

"مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا موجودہ مذہب جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں ان کے سیاسی مفاد کے لیے سازگار نہیں ہے۔ ان کے یہاں ذات پات کی تقسیم، ان کا ان گنت ٹکڑوں میں بٹا ہونا۔ یہی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وہ حب الوطنی کے جذبے سے محروم ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ مذہبی رسوم اور تقریبات کی بھرمار اور طہارت کے اصولوں نے انھیں کوئی مشکل کام انجام دینے کے قابل نہیں رکھا..... میں سوچتا ہوں کہ ان کے مذہب میں کچھ تبدیلیاں آنی چاہئیں۔ کم از کم فلاح اور سیاسی مفاد کی خاطر۔"[۲۷]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذات پات کے نظام اور سماجی کمزوریوں کو مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ سیاسی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں ہمیں اٹھارویں صدی کے مغربی مفکرین کے خیالات کا اثر ان کے ذہن پر صاف نظر آتا ہے۔ اس وقت جب مغلیہ سلطنت کا زوال اور عیسائی طاقت کا عروج شروع ہو رہا تھا۔ اس وقت ان کی چشم بصیرت ہندو معاشرے کے لیے روشن مستقبل کے بڑے امکانات دیکھ رہی تھی۔ بشرطیکہ وہ اپنی سماجی خرابیوں کو دور کرے۔[۲۸]

اپنشد کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں وہ مورتی پوجا پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"مجھے ہمیشہ شدید رنج اور افسوس کے ساتھ قوم کی اخلاقی پستی کا احساس رہتا ہے جس کے اندر میرے خیال میں ترقی کی صلاحیتیں موجود ہیں جو اپنی ذکاوت، احساس صبر و تحمل اور حلم کی بدولت بہتر مستقبل کی مستحق ہے۔"[۲۹]

آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان پر رسول اللہؐ کی سیرت اور اسلامی معاشرے کا گہرا اثر تھا۔ اس اخلاقی ذمہ داری کے احساس نے جو ان پر اپنی سماج کی طرف سے عائد ہوتی تھی انھیں یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ اس کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے۔ جدید

مغربی خیالات اور سیاسی حالات کے مطالعے سے انھیں یقین ہو گیا تھا کہ تجدید اور اصلاح کے بعد ہندو سماج کا مستقبل ضرور سنور جائے گا۔ ان کے نزدیک اس کی پستی کا باعث بت پرستی کا روگ تھا جس کا واحد علاج یہ تھا کہ وہ توحید کی طرف رجوع کریں۔

حوالہ جات

۱؎ رام موہن رائے کی تاریخ پیدائش اور ان کی زندگی کے دوسرے واقعات کی تاریخوں میں اختلاف رائے ہے۔ اس میں جو تاریخیں دی گئی ہیں ایس۔ڈی کولیٹ کی کتاب The Life and Letters of Raja Ram Mohun Roy. سے ماخوذ ہیں۔

۲؎ The Father of Modern India. یہ یادگار صحیفہ ۱۹۳۳ء میں رام موہن رائے کی صدی کی تقریبات کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اسے ستیش چندر چکرورتی نے دو حصوں میں مرتب کیا۔ اس میں بہت سے مضامین خراج ہائے عقیدت، پیغامات اور رام موہن رائے کی سوانح عمری کے بارے میں متفرق معلومات اور مستقل مضامین کی تفصیلات بھی درج ہیں۔

۳؎ رام نند چیٹرجی کا مضمون Ram Mohun Roy and Modern India. جو انھوں نے The Father of Modern India. میں لکھا ہے۔ حصہ دوم، صفحہ ۱۷۔

۴؎ مدرسہ ایک روایتی ادارہ ہے جس میں اسلامی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ادارے پیغمبر اسلامؐ کے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ ہندوستان میں مدرسے کی روایت قدیم ہے اور ابھی تک موجود ہے۔ ملک میں سیکڑوں مدارس ہیں جہاں روایتی تعلیم دی جاتی ہے ملاحظہ ہو J. Pederson "Madarsa" in shorter Encyclopedia of Islam. صفحہ ۳۰۰ تا ۳۱۰۔

۵؎ ملاحظہ ہو The Father of Modern India. حصہ دوم۔ صفحہ ۲۹۔

۶؎ یہ معلومات زیادہ تر ایس۔ڈی کولیٹ اور پنڈت وشوا ناتھ شاستری کے مضمون Ram Mohun Roy: The Story of His Life. سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو The Father of Modern India. حصہ دوم۔ صفحہ ۷ تا ۲۸۔

۷؎ رام موہن رائے کے بزرگوں کے تعلقات دربار مرشد آباد سے اقبال سنگھ کی کتاب
Ram Mohun Roy. صفحہ ۱۵تا ۱۸ میں بیان کیے گئے ہیں۔
۸؎ پنڈت وشونا تھ شاستری کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۹۔
۹؎ ہندوستان کے مشہور مدرسہ دارالعلوم کے نصاب کا ذکر The Deobund School
and the Demand for Pakistan. از ضیاء الحسن فاروقی صفحہ ۲۲ تا ۲۷ ملاحظہ ہو۔
۱۰؎ ملاحظہ ہو برجندرناتھ سیل کا مضمون Ram Mohun Roy, The Universal Man
جو The Father of Modern India. میں شامل ہے۔ صفحہ ۹۶۔
۱۱؎ پنڈت وشونا تھ شاستری کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۹۔
۱۲؎ The Father of Modern India. میں ایڈیٹر کا نوٹ صفحہ ۲۹۔
۱۳؎ کم از کم ان کے ایک جدید سوانح نگار اسے زیب داستاں سمجھتے ہیں۔ اقبال سنگھ
کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۳۱ تا ۳۵ ملاحظہ ہو۔
۱۴؎ "Deobund' Encyclopedia of Islam. از خلیق احمد نظامی، شائع کردہ۔
E. J. BRILL Leyden.
۱۵؎ الیس ڈی کولیٹ کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۵
۱۶؎ اقبال سنگھ کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۳۳۔
۱۷؎ الیس ڈی کولیٹ کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۵۔
۱۸؎ رام موہن رائے کا خود نوشت سوانحی خاکہ The Father of Modern India.
حصہ دوم، صفحہ ۱۲۰۔
۱۹؎ اصل فارسی عبارت کا ترجمہ دی انگلش ورکس آف راجہ رام موہن رائے
سے منقول۔

اصل فارسی کتاب مجھے دستیاب نہ ہو سکی۔ اس کا پہلا ترجمہ ۱۸۸۴ء میں شائع
ہوا جو مولوی عبداللہ العبیدی نے کیا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ الیس ڈی کولیٹ کا ادارتی
نوٹ صفحہ ۱۸، ان کی مذکورہ بالا کتاب میں۔

۲۰ مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۳۷۔ ۳۸

۲۱ پروسونتو کمار سین کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۶۱۔

۲۲ کتاب مذکورہ میں منقول۔ صفحہ ۶۱۔ ۰

۲۳ میکس ملر کے قول کے مطابق جو تحفۃ الموحدین پر مبنی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا "خدا کی وحدت اس کا قادر مطلق اور خیر محض ہونا۔"

۲۴ ایس ڈی کولیٹ کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحات ۲۲ تا ۲۳۔

۲۵ پنڈت وشوناتھ شاستری کے مذکورہ بالا مضمون پر ایڈیٹر کے حواشی۔ صفحہ ۲۹۔

۲۶ رامانند چٹرجی کا مضمون Ram Mohun Roy and Modern India. جو The Father of Modern India. میں شائع ہوا۔ صفحہ ۷۵۔

۲۷ مذکورہ بالا مضمون میں منقول۔ صفحہ ۷۵۔

۲۸ ان کا آزاد ہندوستان کا تصور جس کے متعدد اشارات ان کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ رامانند چٹرجی کی مذکورہ بالا کتاب۔ صفحات ۸۳ تا ۸۴

۲۹ Translation of English Works of Ram Mohun Roy. میں The ISOPNISHAD. کا تعارف ملاحظہ ہو۔ صفحہ ۴۷۔

(بقیہ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ)

HUI کہلاتے ہیں۔ دوسرے ترک مسلمان ہیں جو کئی قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ وئی گر۔ ازبک۔ قزاک۔ کرغز۔ اور تاتار وغیرہ۔ یہ سینٹرل ایشیاء سنکیانگ میں زیادہ رہتے ہیں۔ یہاں ۷۵ فی صدی اوئی گر ہیں۔ کچھ افراد ایسے ہیں جو عربی النسل ہیں مگر شادی بیاہ چینی خاندانوں میں کر چکے ہیں۔ یہ زیادہ ترکینٹن اور بیجنگ شہروں کے آس پاس کے علاقوں میں بسے ہوئے ہیں۔

چین کے مسلمان سو سال سے پابند سلاسل رہے۔ مگر اب شکنجوں کی گرہیں کھل رہے ہیں۔ مدرسوں اور مسجدوں میں پھر سے زندگی پلٹ آئی ہے۔ روس ہی کی طرح چین کسی بھی وقت ٹوٹ پھوٹ سکتا ہے۔

— — —

دیوان حافظ کا پہلا مصرع

حقیقت کی جستجو

شعر کی تاثیر سے کسی کو انکار کی مجال نہیں ہو سکتی۔ اس کی اثر آفرینی ہی ایسی خوا
ہے جو اس کو آسمان میں درخشندہ چاند کے مرتبے تک پہنچاتی ہے۔ ایک اچھا شعر پڑھ کر یا سن
قاری یا سامع کا لذت و اثر سے دوچار ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ہر زمانے میں شاعروں کی قدرد
ہوتی چلی آئی ہے اور شاعری سے بڑے بڑے کام لیے جاتے رہے ہیں۔ شاعری کے با
میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ قدرت شاعری کا ملک
کچھ منتخب انسانوں میں ودیعت کرتی ہے۔ یہ ایک مخصوص اور محدود صفت ہے جو ہر انسا
میں نہیں پائی جاتی:

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن جس میں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے وہ اپنے عہد کے سماج اور معاشرہ میں ایک ا
مقام حاصل کر لیتا ہے۔ حافظ کا نام بھی انھیں خوش قسمت انسانوں میں شمار ہوتا ہے
جس کو شاعری کی صنف قدرت کی طرف سے عطیہ میں حاصل ہوئی تھی۔ ان کو شاع
کی تمام صنف اور بالخصوص غزل میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ حافظ کے کلام کا مطالعہ اس
سے تو بہت ہوا کہ انھوں نے فارسی شعر کو کس درجہ تک پہنچایا، غزل میں وہ کس پائے

ڈاکٹر ریحانہ خاتون، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

شاعر ہیں، ان کی جہاں بینی، ان کی بشر دوستی، ان کا اخلاق، ان کے شعر میں عشق و تجلی وغیرہ کی خوب خوب چھان بین کی گئی۔ لیکن حافظ نے فارسی زبان کو کتنا مالا مال کیا۔ اس لحاظ سے ان کے کلام کا مطالعہ بہت کم کیا گیا اور حقیقت یہ ہے کہ جب دیوان حافظ کا مطالعہ اس لحاظ سے کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ واقعتاً انھوں نے سیکڑوں ترکیبوں اور پچاسوں نئے لفظوں کا معنی خیز استعمال ایسے ایسے نئے الفاظ میں کیا ہے کہ اس کی بدولت فارسی زبان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے مطالعے میں یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ اس طرح کی جو نئی ترکیبات اور نئے فقرے حافظ کے یہاں ملتے ہیں وہ خود ان کے موجد ہیں یا انھوں نے کہیں اور سے ان کو اخذ کیا ہے۔ اس لیے کہ جب تک ان سے قدیم شعرا کا مطالعہ اس نہج سے نہ ہو جائے اس وقت تک ان کے بارے میں کوئی بات بالیقین نہیں کہی جا سکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے یہاں جو ترکیبات، فقرات اور نئے کلمات کا استعمال ہوا ہے اور پھر اس میں جو جدت پیدا کی ہے اس سے ان کے کلام میں بڑی ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ چند الفاظ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

راہ و رسم، منزل، سبکبار ساحل، مرغ وصل، دنبال دل، طرۂ شبرنگ، قصر امل، حشمت پرویز۔ یہ فقرہ اقبال کے یہاں بہت استعمال ہوا ہے جس کو انھوں نے حافظ کے یہاں سے ہی لیا ہے۔

ان گوناگوں خوبیوں کے باوجود حافظ پر التزام تراشی سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ سودی صاحب کا کہنا ہے کہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا مصرع "الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا" یزید بن معاویہ کا ہے۔ یہ ان کے ایک قطعے کی دوسری بیت ہے۔ وہ قطعہ بحر ہزج میں ہے اور پورا قطعہ اس طرح ہے:

انا المسموم ما عندی   بتریاق ولا راقی
ادر کاساً وناولہا   الا یا ایہا الساقی

(یعنی میں زہر آلود ہوں اور میرے پاس تریاق نہیں ہے اور نہ ہی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے اور اے ساقی تو پیالہ کو گردش میں لا اور مجھے دے)

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ حافظ نے اپنی شاعری میں شعری ضرورت کے پیش نظر اس قطعے کی دوسری بیت کو الٹ پلٹ لیا اور ادر کاساً و ناولہا کو اپنی غزل کے قافیے کے مطابق بعد میں رکھا اور الایا ایہا الساقی کو پہلے، اس طرح سے تضمین کے طور پر اپنی غزل میں پورا ایک مصرع بنا لیا۔ سودی کے اس طرح کے بیان کی وجہ سے بہت سے شعرا نے خواجہ پر اعتراض کیا کہ انھوں نے یزید بن معاویہ کے مصرع کو اپنے یہاں کیوں نقل کیا ہے۔ ان معترضین میں اھلی شیرازی کا بھی شمار ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

خواجہ حافظ را شبی دیدم بخواب — گفتم ای دُر فضل و دانش بی مثال
از چہ بستی بر خود این شعر یزید — با وجود این ھمہ فضل و کمال
گفت واقف نیستی زین مسئلہ — مال کافر ھست بر مومن حلال[۴]

(ان اشعار کا مفہوم اس طرح ہے کہ میں نے ایک رات خواجہ حافظ کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اے حافظ تو تو فضل و دانش میں بے مثال ہے تو پھر تو نے باوجود اپنے فضل و کمال کے اپنے یہاں یزید کے شعر کو کیوں باندھا ہے۔ حافظ نے جواب میں کہا کہ کیا تو اس مسئلے سے واقف نہیں ہے کہ کافر کا مال مومن پر حلال اور جائز ہوتا ہے)

ایک دوسری جگہ کاتبی نیشاپوری فرماتے ہیں:

عجب حیرتم از خواجہ حافظ — بنوعی کش خرد زان عاجز آید
چہ حکمت دید در شعر یزید او — کہ در دیوان نخست از وی سراید
اگر چہ مال کافر بر مسلمان — حلال است و درو تیلی نشاید،
ولی از شیر عیبی بس عجیب است — کہ لقمہ از دھان سگ رباید[۵]

(یعنی میں حیرت میں ہوں کہ حافظ نے یزید کے شعر میں ایسی کیا خوبی دیکھی کہ اس نے اس کے شعر کو اپنے دیوان میں پہلے شعر کی حیثیت سے شامل کر لیا۔ اگرچہ مسلمان پر کافر کا مال حلال ہوتا ہے اور شاید اس طرح کرنے میں حافظ کو کوئی قیل و قال نہ رہا ہو لیکن شیر سے اس طرح کی حرکت عجیب معلوم

ہوتی ہے کہ وہ کتے کے منھ سے لقمہ چھین لے)۔

علامہ قزوینی کے قول کے مطابق یہ بات واضح ہے کہ اہلی شیرازی کی وفات ۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ء میں ہوئی جس کی وضاحت مجالس المومنین، ہفت اقلیم، آتش کدہ، حبیب السیر ج ۲ صفحہ ۱۱۲) اور فہرست نسخ فارسی برٹش میوزیم اور ریو صفحہ ۶۵۷ سے ہو جاتی ہے جب کہ کاتبی نیشاپوری کی وفات ۸۳۸ھ / ۳۴-۱۴۳۳ء یا ۸۳۹ھ / ۳۵-۱۴۳۴ء میں ہوئی جس کا حوالہ تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی، مجالس المومنین، ریاض العارفین میں واضح طور پر ملتا ہے۔

کاتبی نیشاپوری کے مصرعے:

بنوعی کش خردزان عاجز آید

میں شین کا ضمیر مفعولی کے طور پر استعمال ایک فاش غلطی ہے کیوں کہ "کش" "ورا" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پوری کی پوری عبارت ہی بے معنی ہے اور یہاں اس کا استعمال بے محل اور غلط ہے۔ اس بات کا بھی پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کاتبی نیشاپوری جو کہ خود فاضل اور دانشمند شاعر تھے کس طرح اس غلطی کے مرتکب ہو سکتے تھے۔ یقیناً یہ کسی ایسے نادان اور جاہل کی کارستانی معلوم ہوتی ہے جس کو فارسی کی معمولی سی بھی واقفیت نہ ہو گی۔

چہ حکمت دید در شعر یزید او   کہ در دیوان نخست از وی سراید

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس شعر کو کاتبی نیشاپوری سے منسوب کیا گیا ہے اور ان کا یہ کہنا ہے کہ حافظ نے یزید کے شعر میں ایسی کیا خوبی دیکھی کہ اس کو اپنے دیوان میں پہلی غزل کے پہلے مصرعے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کا مصنف کوئی بھی ہو لیکن غالباً وہ اس بات سے واقف نہیں کہ حافظ نے اپنے اشعار کو خود یکجا نہیں کیا بلکہ اس کی وفات کے بعد اس کے دوستوں میں سے کسی نے یہ نیک کام انجام دیا۔ اس طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "الا یا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا" کا پہلی غزل متعین ہونا دراصل حافظ کا خود اپنا کلام نہیں ہے بلکہ اس غزل کو پہلی غزل شمار کرنا اس شخص کا کام ہے جس نے دیوان حافظ کو یکجا کیا اور دوسرے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا

ابیات نیشا پوری کے نہیں ہیں جو حافظ کا یا تو معاصر تھا یا اس کا قریب العصر تھا۔

گفت واقف نیستی زیں مسئلہ　　　　مال کافر هست بر مومن حلال

اُس حکایت کے ذیل میں جس کا ذکر اطلی شیرازی نے اپنے اشعار میں کیا ہے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ انھوں نے خواب میں حافظ سے پوچھا کہ آپ نے یزید کے شعر کو کیوں استعمال کیا ہے۔ حافظ نے جواب دیا کہ کیا تو اس مسئلے سے واقف نہیں کہ کافر کا مال مرد مومن پر حلال ہوتا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کاتبی نیشاپوری کا زمانہ اطلی شیرازی سے بعد کا زمانہ ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کاتبی کی وفات اطلی کی وفات سے ایک سو تین سال قبل واقع ہو چکی تھی یعنی کاتبی ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء میں وفات پا چکا تھا۔ جب کہ اطلی کی وفات کا سن ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء ہے۔ اس دلیل سے یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ غالباً یہ بیہودہ اور رکیک اشعار کاتبی نیشا پوری کے نہیں ہو سکتے ہیں۔ دونوں کے غلط انتساب کو اس بات سے بھی مدد ملتی ہے کہ بقول مرزا محمد قزوینی انھوں نے اطلی شیرازی کے تین اور کاتبی کے دیوان کے ایک نسخے کا بغور مطالعہ کیا۔ اطلی کے دو نسخے کتابخانۂ مجلس تہران اور ایک دوسرا نسخہ آقای سعید نفیسی کے پاس محفوظ ہے۔ یہ آخری نسخہ ۹۷۲ھ/۱۵۶۴ء کا کتابت کیا ہوا ہے۔ کاتبی کے دیوان کا بھی نسخہ آقای سعید نفیسی (تہران) کے پاس ہی ہے۔ راقم نے بھی اطلی شیرازی کے دیوان کے ایک نسخے کا مطالعہ کیا جو دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور حامد ربّانی کی کوششوں سے ۱۳۴۴ شمسی میں شائع ہوا۔ اس میں بھی ان سے منسوب قطعہ دستیاب نہ ہو سکا۔ بظاہر یہ بات بہت قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دونوں قطعے بھی جعلی اور بے بنیاد ہیں اور بے وجہ ان کا انتساب دونوں دانش مند شعرا کے سر منڈھا جا رہا ہے اور اگر بالفرض محال یہ مصنوعی اور غلط نہ بھی ہوں۔ پھر بھی تاریخی نقطۂ نظر اور روایات کی رو سے کوئی بھی چیز خواب کی بناء پر ثابت نہیں کی جا سکتی ہے۔ چہ جائیکہ شعرا کے تصوراتی خواب غالباً بعض ان خیالات کے مسائل کا جن تک انسانی ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ بیداری کی صورت میں حل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ جو باتیں محض خواب کی حالت

میں دیکھی گئی ہوں ان کا حل نکالا جاسکے۔ دیوان کاتبی ہی میں ایک ایسے قطعے کا ذکر ہے جس میں کاتبی نے اپنے معاصر شاعر خواجہ عصمتؔ بخاری متوفی ۸۲۸ھ/۱۴۲۴ء کے لیے ایک خواب دیکھا۔ وہ قطعہ اس طرح ہے :۔

خواجہ خسرو را علیہ الرحمہ شب دیدم بخواب — گفتمش عصمت ترا یک خوشہ چین خرمن است
شعر او چون بیشتر شہرت گرفت از شعر تو — گفت باکی نیست شعر او ہمان [شعر] من است[۵]

(میں نے خواجہ خسرو کو ایک رات خواب میں دیکھا اس سے میں نے کہا کہ عصمت ترے اشعار کا خوشہ چین ہے اور اس کے شعر تمھارے شعر سے زیادہ شہرت حاصل کر چکے ہیں تو خواجہ نے جواب دیا کہ اس میں کوئی خوف کی بات نہیں ہے کیونکہ وہ شعر جو شہرت حاصل کر چکے ہیں دراصل میرے ہی ہیں)۔

اسی طرح ایک اور حکایت مجالس المومنین[۵] کی بارھویں مجلس میں "شرح احوال سلمان ساؤجی" کے ضمن میں نوراللہ شوشتری بیان کرتے ہیں :

"مولانا نظام استرآبادی در خطبۂ دیوان خود آوردہ کہ شبی در واقعہ دیدم کہ جای با صفائی است و شخصی ایستادہ و در فکر افتادہ، بجسن کیاست دانستم کہ کیست ؟ پیش رفتم و سلام کردم، سر برآورد و علیک گفت، گفتم کہ شما سلمان ساؤجی نیستید ؟ گفت: ھستم، فقیر را التفات نمودہ پیش طلبید و معانقہ و مصافحہ کرد و گفت؛ رحمت بر تو باد کہ بوادی قصائد را چابکانہ طی می کنی، و دست بر کتف من نہاد و مشفقانہ توجہ نمود، با وجودی کہ او چنین ملایمت را مرعی داشت فقیر، گفتم : کمینہ را بملازمان شما اعتقاد بسیار است، لائق حال شما نمی دانم کہ شما اشعار مردم را تصرف کردہ اید بی اشعار بتضمین، و این اشعار را سرقہ می گویند، گفت : کجا ؟ گفتم : از جملہ در تعریف عمارت گفتہ اید :

ابن آن اساس نیست کہ گردد خلل پذیر
لو دکت الجبال او انشقت السماء

فرمودند کہ چرا اعتراض بر مولانا عبدالرحمٰن جامی نمی کنید کہ او از ضمن قصیدہ مصراعی را اخذ کردہ:

کَالبَدرِ فِی الدُّجُنَّۃِ وَالشَّمسِ فِی الضُّحٰی

بقادری کہ سماوات بی ستون بر یاست قدرتش وعلی کل ما یشاءُ قدیرٌ۔ کہ فقیر مصراعی کہ خواندہ نشنیدہ بودم، چون بیدار شدم وتفحص کردم چنان بود کہ ایشان فرمودہ بودند"۔

(مولانا نظام استرآبادی اپنے دیوان کے خطبے میں بیان کرتے ہیں کہ ایک رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بہت صاف ستھری جگہ ہے اور ایک شخص وہاں تفکرات میں غرق کھڑا ہے۔ میں نے اپنی ذکاوت سے یہ سمجھ لیا کہ کون ہے۔ سامنے گیا۔ سلام کیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور سلام کا جواب دیا۔ میں نے کہا کہ کیا آپ سلمان ساؤجی نہیں ہیں۔ کہا ہوں میری طرف توجہ کی، پاس بلایا، ہاتھ ملایا اور کہا کہ اللہ کی تجھ پر رحمت ہو اور تو قصائد کی وادی کو تیزی سے طے کرے (یعنی تجھ میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے) اپنا ہاتھ میرے کاندھے پر رکھا، بہت محبت سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے اتنی نرمی اور رعایت برتی میں نے کہا کہ مجھ فقیر کو آپ کے کام پر بہت بھروسہ ہے۔ یہ بات میں آپ کے حال کے مطابق نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کے اشعار میں تصرف کریں اور اس کو اپنی شاعری میں شامل کر لیں۔ اس عادت کو سرقہ (چوری) کہا جاتا ہے۔ انھوں نے پوچھا ایسا کہاں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ جب عمارت کی تعریف میں شعر کہا ہے۔ (اس شعر کا مفہوم یہ ہے) کہ یہ وہ بنیاد نہیں ہے جس میں خلل پڑ جائے اور ریزہ ریزہ ہو جائے بلکہ اگر پہاڑ ٹکرا جائیں اور آسمان پھٹ جائے تو وہ ان کو بھی خاک کر دے عرض کیا کہ کیوں مولانا عبدالرحمٰن جامی پر اعتراض نہیں کرتے ہو کہ اس

نے بھی اسی قصیدے کے ایک شعر کو لیا ہے۔

جیسے چاند تاریکی میں اور صبح میں سورج

وہ ایسا قادر ہے جس کی قدرت کی وجہ سے آسمان بغیر ستون کے کھڑا ہے اور وہ ہر اس چیز پر قادر ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ جو مصرع انھوں نے پڑھا تھا۔ مجھ فقیر نے اس سے پہلے نہیں سنا تھا۔ جب میں بیدار ہوا اس کی تلاش و جستجو کی تو جیسا انھوں نے فرمایا تھا ویسا ہی تھا)۔

علامہ قزوینی کا یہ کہنا ہے کہ جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے وہ حکایت جو سودی نے بیان کی ہے یعنی یزید بن معاویہ کے شعر کو حافظ نے چرا کر اپنے یہاں شامل کر لیا، لیکن کوئی بھی ایسا ایرانی ماخذ جس میں حافظ یا اس کے اشعار پر بحث کی گئی ہے ان میں کہیں بھی اس طرح کی اطلاع نہیں پائی جاتی کہ یہ مصرع یزید بن معاویہ کی طرف منسوب سمجھا جائے۔ ان تذکروں میں تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی، نفحات الانس جامی بہارستان، حبیب السیر، ہفت اقلیم، مجالس المومنین، سفینۃ الاولیاء، آتش کدہ ریاض العارفین، مجمع الفصحا اور فارس نامۂ ناصری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ غالباً ایسا پہلی بار ہے کہ سودی کا کلام ایک ایسا ماخذ ہے جو سنہ ہزار ہجری کے لگ بھگ تالیف ہوا۔ اس میں اس طرح کی اطلاع فراہم کی گئی ہے۔ جیسا کہ بار بار کہا جا چکا ہے کہ اس حکایت کی حقیقت محض یہ ہے کہ یہ بہت عامیانہ، رکیک اور غیر ایرانی فعل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ فارسی اور عربی شاعری میں اس کی اصلیت محض اتنی ہی ہے کہ سودی کے ہی عہد میں یعنی نویں دسویں صدی ہجری میں عالمگیر کے روز افزوں انتشار کے بعد دیوان خواجہ حافظ کی تضحیک اور توہین کے لیے بعض متعصب علماء و فقہا نے یہ بہتان تراشا ہے یعنی حافظ نے اس مصرع "الایا ایہا الساقی ادر کاساً وناولہا" کو یزید بن معاویہ کے کلام سے لے کر اپنے دیوان میں شامل کیا ہے۔ علماء نے یہ کہہ کر عام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی، ان بیہودہ اور کم حیثیت اشعار کے ساتھ جعل سازی کر کے ان کو یزید کی طرف منسوب کیا اور لوگوں کے درمیان شہرت

پہنچائی۔ ایک مذہبی عثمانی (ترکی) عالم نے حافظ کے دیوان کے مطالعے سے منع فرمایا اور
اس کے خلاف فتویٰ صادر کیا۔ دسویں صدی ہجری کے وسط میں ایک شخص نے قسطنطنیہ
کے مفتی ابوالسعود آفندی بن محی الدین محمد بن مصطفیٰ عمادی حنفی سے اس بارے میں
فتویٰ لیا۔ انھوں نے اس کا جواب دیا۔ اس سوال و جواب کو حاجی خلیفہ نے اپنی کتاب
"کشف الظنون" میں "دیوان حافظ" کے عنوان سے نقل کیا ہے۔ ابوالسعود حنفی قسطنطنیہ
کے نواح میں اسکلیب کے اطراف میں ۸۹۶ھ/۱۴۹۰ء یا ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں پیدا ہوئے۔
وہ سوال اس طرح ہے:۔

"زید در خصوص دیوان حافظ اگر بگوید کہ این دیوان لسان الغیب است
وعمرو [درجواب زید] بگوید: لسان غیب گفتن خطاست، حتی رئیس
علماء فتوی دادہ است دیوان او را نخوانند، زید مزبور برئیس علماء سوء
ادب نمودہ بگوید: این امر باب دھان او نیست، این فقرہ از ذوقیات
است، دراین صورت بر زید شرعاً چہ لازم می آید؟"[۹]

(اگر زید دیوان حافظ کی خاصیت کے بارے میں یہ کہے کہ یہ دیوان غیب کی
زبان ہے اور عمرو زید کے جواب میں کہے کہ غیب کی زبان کہنا غلط ہے، یہاں تک
کہ عالم نے فتویٰ دیا ہے کہ اس کے دیوان کو نہ پڑھا جائے۔ زید نے عالم کے لیے
گستاخی کی اور کہا کہ یہ معاملہ اس کے لیے نہیں ہے۔ یہ فقرہ ادبی ذوق کی
وجہ سے ہے۔ اس صورت میں شرعاً زید پر کیا لازم ہوتا ہے)۔

مفتی صاحب نے جواب میں اس طرح کہا:

"در مقالات حافظ بسیاری از حکم رائقہ (کذا) ونکات فائقہ و کلمات حقہ موجود است
لیکن در تصانیف آن خرافات خارج از نطاق شریعت شریفہ نیز هست، مذاق
صحیح آنست کہ بیتی را از بیت دیگر فرق دادہ سمّ افعی را تریاق نافع نشمرند
نعمت مبادی ذوق را احراز و از اسباب خوف الیم احتراز نمایند"[۱۰]

(حافظ کے مقالات میں بہت سے باذوق جملے، بہترین نکتے اور حقیقی کلمے

موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے ایسے خرافات بھی ہیں جو بہتر شریعت کی شرح سے خارج ہیں۔ صحیح مذاق یہ ہے کہ ایک بیت کا دوسری بیت سے فرق کریں اور زہر قاتل کو نفع بخش تریاق نہ سمجھیں۔ بنیادی اصولوں کو اخذ کریں اور تکلیف دہ خوف کے اسباب سے پرہیز کریں)۔

علامہ قزوینی کا کہنا ہے کہ انھوں نے عربی ادبیات، عربی اشعار، عربی اخبار اور عربی کی تاریخ کی کتابوں کا عمیق مطالعہ کیا لیکن انھیں وہ دونوں مصنوعی بیتیں یعنی

أنا المسموم ماعندی بتریاق ولا راقی
ادر کاساً وناولها الا یا ایها الساقی

جن کو سودی نے یزید بن معاویہ سے منسوب کیا ہے۔ کہیں بھی دست یاب نہیں ہوئیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عربی ادب میں ان اشعار کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے۔ صرف نویں یا دسویں صدی ہجری کے وسط میں یہ راز کھلتا ہے کہ اس طرح کے اشعار کا ذکر ترکی ادب میں ملتا ہے لیکن اس بات کی صداقت کے لیے کوئی معتبر سند یا ماخذ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک غیر معتبر اور کمزور ماخذ ہے۔ پھر کوئی بھی باہوش دانش مندر جو علماء کی سیرت سے انسیت رکھتا ہو یا ان سے متعلق آثار و اخبار جمع کرتا ہو، ان اشعار کو یزید بن معاویہ سے منسوب نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اس عامیانہ اور گھٹیا درجے کی حکایت پر یقین کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ابیات وزن، قافیہ مضامین، طرز ادا اور سب سے زیادہ اس غزل میں استعمال کے اعتبار سے بے محل ہیں۔ یورپین محققین کی نظر میں یہ الہام شدہ باتیں ہیں۔ سعدی کی غزل کی بعض ابیات کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ یزید بن معاویہ کی ابیات سے لی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے چند شعر:

بپایان آمد این دفتر حکایت ہمچنان باقی بصد دفتر نشاید گفت حسب الحال مشتاقی
اخلاقی و احبابی ذروا من حبہ مابی مریض العشق لا یبری ولا یشکو الی الراقی
قِم املأ وَا سقِنِی کاساً و دع مافیہ سموما اما انت الذی تسقی فعین السم تریاقی

انا المجنونُ لا اَعبا باحراقٍ و اغراقی [1]   سعیٰ فی صحتی الشافی وَلمّا یدرِ ماشانی .

(اب یہ دفتر اگرچہ خاتمے تک پہنچ گیا ہے لیکن ابھی حکایت اسی طرح باقی رہ گئی ہے اور شاید اگر سیکڑوں اسی طرح کے دفتر لکھ کر بھر دیے جائیں پھر بھی حسب حال نہیں ہوگا۔

اے میرے دوستو جو عشق کا مرض میرے اندر ہے مجھے اس میں مبتلا رہنے دو۔ کیونکہ مریض عشق کبھی شفایاب نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اپنے مرض کی شکایت جھاڑ پھونک کرنے والے کے پاس کرتا ہے۔

اٹھو، پیالہ بھرو اور مجھے پلاؤ اور وہ زہر آلود چیزیں جو اس میں ہیں، رہنے دو، کیوں کہ اگر تو ہی مجھے اس کو پلائے تو پھر زہر بھی میرے لیے تریاق کے برابر ہے۔

شفا دینے والے نے ہی میری فضیحت کی کوشش کی اور میری حقیقت کو نہیں پہچانا۔ میں مجنوں ہوں۔ اس لیے جلنے اور غرق ہونے کی میں پرواہ نہیں کرتا ہوں)۔

غور فرمائیے کہ بعض تعبیرات اور کلمات جیسے الراقی، تریاقی، اسقنی، کاسًا سمومًا اور انا المجنون میں بعض لفظوں اور بعض معنی کے اعتبار سے یزید کی مذکورہ بالا دونوں بیتوں سے الفاظ اور تعبیرات کے مطابق معلوم ہوتی ہیں۔

حواشی

[1] بحر ہزج، عربی میں ہمیشہ چار مفاعیلن کے وزن پر ہوتا ہے اور فارسی میں بحر ہزج آٹھ مفاعیلن پر مبنی ہوتا ہے۔ اس طرح عربی میں مربع ہے اور فارسی میں مثمن اور عربی کی ایک بیت فارسی میں ایک مصرع کے برابر ہوتی ہے۔

۲ے مجلہ یادگار شمارہ ۹، صفحہ ۷۰۔

۳ے ملاحظہ ہو شرح سودی بر حافظ ج ا۔ ترجمہ دکتر عصمت ستارزادہ ۱۳۴۷ خورشیدی
چاپ ارژنگ۔ اور مجلہ یادگار تضمینای حافظ کے ذیل میں، صفحہ ۷۱۔

۴ے مجلہ یادگار، صفحہ ۷۱۔

۵ے ایضاً، صفحہ ۷۴۔

۶ے مجالس المومنین صفحہ ۵۱۰، چاپ تہران۔

۷ے یہ مصرع جبلی غرجستانی کے قصیدے سے منسوب ہے اور پوری بیت اس طرح
ہے:

باخاطر منیر م وبار اسی ر وشنم
کالبدر فی الدجنۃ والشمس فی الضحیٰ

اور بجائے کالبدر کے کالبرق آیا ہے اور ملاحظہ ہو مجلہ یادگار شمارہ ۹،
صفحہ ۷۵ حاشیہ۔

۸ے مجلہ یادگار، صفحہ ۷۴ - ۷۵ مجالس المومنین، صفحہ ۵۱۰۔

۹ے ایضاً صفحہ ۷۷۔ اس فتوی کی اصل عربی میں ہے جس کا فارسی ترجمہ آقای
حاج اسمٰعیل نے کیا ہے۔

۱۰ے ایضاً، صفحہ ۷۸

۱۱ے ایضاً۔

چودھری شرف الدین

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ
اور
چین میں تبلیغ اسلام

ظہور اسلام کے ابتدائی دور کی کوئی ایسی تفصیلی دستاویز عربی تاریخ میں دستیاب نہیں ہے جس سے عرب و چین کے تعلقات پر روشنی پڑ سکے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چین میں مسلمانوں کا وجود اتنا ہی پرانا ہے جتنی تاریخ اسلام۔ یہی نہیں بلکہ اسلام سے قبل بھی عربوں کے تجارتی تعلقات ایک حد تک چین سے قائم ہو چکے تھے۔

قارئین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس مشہور حدیث سے بخوبی واقف ہوں گے کہ "علم طلب کرو اگرچہ وہ چین میں ہو۔" اس بات کا بھی سب کو علم ہے کہ خطّہ سرزمین چین ممالک عربیہ سے کافی فاصلے پر ہے اور حضورؐ کے زمانے میں سفر کے لیے برّی اور بحری راستے کچھ زیادہ ہی پُرخطر اور دشوار گزار تھے۔ اس لیے مندرجہ بالا حدیث کا سیدھا سادا مطلب یہ ہوا کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اور دور سے دور جا کر بھی علم حاصل کرو اور دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ علم حاصل کرنے کا مطلب صرف علم دین تک ہی محدود نہیں بلکہ علم دنیا حاصل کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔

تاریخ کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں کہ حضورؐ کے زمانے کی ایسی مثالیں بھی

جناب چودھری شرف الدین، نعمت اللہ روڈ، امین آباد، لکھنؤ۔

ملتی ہیں جب کہ دشمن کے قیدیوں کو اس شرط پہ بھی رہائی ملی کہ وہ اپنی مادری زبان مسلمانوں کو سکھلائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ ایرانیوں کے طریقۂ جنگ کو دیکھ کر حضوؐر نے خندقیں کھدوانے کو بھی پسند فرمایا اور منجنیق کے استعمال کو بھی اپنایا۔

حضوؐر کے زمانے میں چین علم دنیاوی سے اسی طرح مالا مال تھا جیسے آج امریکہ۔ چین میں کئی مشہور فلسفی حضرت عیسٰیؑ سے بارہ سو سال پہلے گزر چکے تھے۔ جن کے مکاشفات سے چینی بہرہ ور ہو چکے تھے۔ مشہور فلسفی کنفیوشس کے فلسفہ کا اگر موازنہ کیا جائے تو اخلاقی مسائل اور روزمرّہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے امور میں اسلامی اصولوں سے کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں ہی خالق عالم اور زمین وآسمان کے پروردگار کے احترام کو واجب قرار دیتے ہیں۔ چین کے لوگوں نے ابتدائے اسلام سے نوسو سال قبل یعنی حضرت عیسٰیؑ سے تین سو سال پہلے اپنے ملک کی پاسبانی کے لیے لق ودق دیوارِ چین بنا کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یہ دیوار آج بھی اسی شان سے کھڑی سیّاحوں کی کشش کا ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ ابن بطوطہ نے دیوارِ چین کو اپنے سفر نامے میں یاجوج ماجوج کی دیوار سے تعبیر کیا ہے۔

چین میں سلاطین تانگ کا دورِ حکومت ۱۸ھ سے شروع ہوتا ہے اور اسلام کی ابتدا کا دور بھی یہی ہے۔ تانگ بادشاہت کا یہ دور سنہرا دور کہلاتا ہے۔ چین کے اس دور میں تاریخ۔ آرٹ۔ کلچر۔ پینٹنگ۔ فن تعمیر۔ صنعت وحرفت اور شعر وشاعری کو عروج ملا۔ کاغذ بھی سب سے پہلے چین میں ایجاد ہوا۔ چھپائی کی شروعات بھی یہیں سے ہوئی۔ عرب سیّاح ابن بطوطہ جس نے اپنی جوانی کے ۲۵ سال دنیا کی سیر میں لگا دیے جب چین پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ چین کے لوگ راستہ چلتے راہ گیروں کی تصویر اس طرح بنا دیتے ہیں کہ اگر مسافر کسی وجہ سے بھاگ جائے تو اس کی تصاویر دوسرے ملک بھیج کر اس کو پکڑوا سکیں۔ ابن بطوطہ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی تصاویر کاغذ پر بنی لٹکی ہوئی دیکھیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جب دنیا میں لین دین کا ذریعہ چاندی اور سونے کے سکّے تھے تب چین میں کاغذ کے چھپے نوٹ رائج تھے۔ ریشم اور چینی برتنوں کی مانگ اس وقت بھی بہت تھی۔ تانگ خاندان کا دور ۹۰۶ء تک چلا اور اس زمانے

کا پورا ریکارڈ ابھی تک محفوظ ہے۔

تانگ حکمرانوں کے دور کی پرانی دستاویز The Ancient Record of the Tang Dynasty سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا ایک وفد تحفہ تحائف لے کر حضورؐ کے مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ایک دوسرے صحابی کی زیر قیادت چین پہنچا اور اسلام کے عقائد سے چین کے عوام اور بادشاہ کو روشناس کرایا۔ جس وقت یہ وفد چین پہنچا اس وقت "ینگ دی" کی حکمرانی تھی۔ اس نے مذہب اسلام کو اپنے لیے سخت گیر پایا۔ مگر اسلامی عقائد و اصولوں کو خوب سراہا۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو مذہب اسلام کی تبلیغ کی اجازت دے دی۔ بادشاہ کے حکم سے چانگان میں مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہوا جو چین کی پہلی مسجد تھی اور آج بھی مسلمانوں کی پہلی آمد کی یاد دلاتی ہے۔ چین کے مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (جن کی تلوار آج بھی مکہ مکرمہ میں موجود ہے) کے ساتھ جانے والا وفد چین میں مسلمانوں کی پہلی آمد ہے۔

مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضورؐ کو بھی ملک چین کے احوال وکوائف کا پورا علم تھا اور حدیث میں جو علم حاصل کرنے کے لیے چین کا نام لیا گیا ہے وہ صرف تمثیلی نہیں ہے۔

مسلمانوں کے پہلے وفد کے بعد تاجروں اور سیاحوں کی آمد و رفت عرب اور چین کے درمیان بڑے پیمانے پر ہو گئی تھی۔ چین جانے کے لیے مسلمانوں نے عراق کے دو بندرگاہ "ابلہ و سیراف" کا انتخاب کیا اور سمندری راستے سے ہوتے ہوئے چین کے شہر کینٹن جسے عرب خانفو کہتے تھے پہنچے۔ یہ شہر مسلمانوں کا پہلا مرکز بنا۔ خشکی کے راستے سے جانے والے مسلمان ایشیاء کوچک ہوتے ہوئے چین کے دارالسلطنت سی۔ نان۔ فو جس کو عرب خمدان کہتے تھے داخل ہوئے اور یہ بھی مسلمانوں کا قدیم مرکز ہوا۔ تانگ کے بعد سیانگ حکمراں آئے تو مسلمانوں کی زیادہ تعداد خشکی کے راستے سے تسنچو شہر پہنچی اور یہ شہر زیتون کے نام سے مشہور ہوا۔ مسلمانوں نے اپنے اعلیٰ کردار سے چین کے باشندوں اور حکمرانوں کے دل جیت لیے۔ چین کی تاریخ میں عربوں کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

"خاندان تانگ کی ابتدائی حکمرانی کے عہد میں مملکت مدینہ سے غیر ملکیوں کی ایک بڑی تعداد کینٹن میں آئی۔ وہ لوگ آسمانی پروردگار کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں میں بت اور تصویریں نہیں پائی جاتیں۔ یہ لوگ سور کا گوشت نہیں کھاتے اور نہ ہی شراب پیتے ہیں جن جانوروں کو خود ذبح نہیں کرتے اس کے گوشت کو حلال نہیں سمجھتے۔ انھوں نے کینٹن میں خوبصورت مکانات تعمیر کر لیے ہیں اور بادشاہ چین نے ان کی استدعا پر ان کو وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ وہ لوگ دولت مند اور خوشحال ہیں۔ وہ خود اپنوں میں سے ہی ایک شخص کو امیر منتخب کر لیتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں۔"

ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں نے چین جانے کے لیے خشکی کا ایک اور راستہ اپنایا اور چین کے جنوب مغرب میں صوبہ یونان تک گئے۔ سید اجل ۶۷۲ھ سے ۶۷۸ھ تک صوبہ یونان کے گورنر رہے اور بعد میں ان کے لڑکے بھی گورنر بنائے گئے۔ ان کی اولادوں ہی میں سے ایک عالم نے ۱۰۹۵ھ میں مشہور کتاب مقناطیس الاسلام شائع کی جس میں انھوں نے اسلامی اور چینی اخلاق میں مطابقت کی نشان دہی کی۔

چوں کہ چین کا شمار پرانے زمانے میں ترقی یافتہ ملکوں کے صفِ اول میں ہوتا تھا اس لیے اس ملک کی تاریخ عیسیٰ مسیح سے بھی بہت پہلے سے محفوظ ہے اور اہم حالات و واقعات ہمیشہ قلم بند ہوتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں بھی بہت سی معلومات چینی تاریخ میں موجود ہیں۔

۷۴۲ھ میں چین کے حکمرانوں نے ایک فرمان جاری کیا تھا اور اسلام کو سرکاری طور پر "الدین الحق الحنیف" کہا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ عربوں کے بہت سے وفود یہاں آچکے تھے اور انھوں نے اپنے زہد۔ تقویٰ۔ دیانت داری اور خوش اخلاقی سے چینی عوام و خواص کے علاوہ حکمرانوں کے دل و دماغ پر خوشگوار چھاپ چھوڑی تھی۔ عرب سے آنے والے تاجر کاروبار پر بھی خوب چھا گئے تھے۔

خلافتِ راشدہ کے دور میں عربوں کا جذبۂ جہاد شباب پر تھا جب فیروز بن یزد

سے جنگ چھڑی تو اس نے گھبرا کر عربوں کے خلاف چین سے مدد مانگی مگر چین کے حکمرانوں نے عربوں سے تعلقات کے پیشِ نظر اس درخواست کو ٹال دیا۔ چینی تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۳۱ھ میں چین نے اپنا سفیر خلیفہ حضرت عثمانؓ کے پاس بھیجا اور اس کے جواب میں خلیفہ نے بھی اپنی فوج کا ایک افسرِ اعلیٰ چین روانہ کیا۔ اُموی دور کے علاوہ خلفاء عباسیہ میں سے ابوالعباس اور ہارون الرشید نے سفارتی وفود چین بھیجے اور جنگی معاہدہ بھی عمل میں آیا۔

۸۳۲ھ میں بادشاہ کے حکم سے شہر سی۔نان فو اور پیکن (بیجنگ) میں مساجد کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ نویں صدی کے اواخر میں ایک مسلمان تاجر سید علی اکبر نے چین میں چند یوم گزارے تھے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہاں مسلمانوں سے درآمد پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا۔ مذہب کے معاملے میں مسلمان آزاد ہیں۔ اس نے بیجنگ میں چار بڑی مسجدیں دیکھیں اور دوسرے مختلف شہروں میں نوّے مساجد شمار کیں جن کو بادشاہ نے اپنے خرچ سے بنوایا تھا۔

۱۲۸۰ء میں کابلی خاں نے منگول حکومت قائم کی جو ۱۳۶۸ء تک چلی۔ پھر مینگ قابض ہو گئے۔ ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک اس دورِ حکومت میں مسلمانوں نے کافی ترقی کر لی۔ حتّٰی کہ تجارتی بیڑے کا منتظمِ اعلیٰ بھی عرصہ دراز تک مسلمان ہی رہا اور مسلمانوں نے اپنی محبت و رواداری سے چین کے باشندوں (ہن) کے دل جیت لیے۔ سات سو سال تک مسلمانوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ مینگ بادشاہوں نے مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے الگ قاضی مقرر کیے۔ یہاں یہ لکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ چین کے مسلمان بلادِ اسلام کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے اور بیشتر تصنیفات تاجروں و سیاحوں کے ذریعہ چین پہنچ جاتی تھیں۔ قارئین جانتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ ایک عرصہ تک قید میں محبوس و مجبور رہے اور اسی حالت میں انتقال ہوا مگر جب یہ خبر آناً فاناً چین پہنچی تو مسجدوں کے میناروں سے صدائیں بلند ہوئیں "الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن" اور اس طرح ہزاروں میل کی دوری پر امام ابن تیمیہ کے لیے نمازِ جنازہ غائبانہ طور پر ادا کی گئی۔

آٹھویں صدی ہجری میں جب عرب سیاح ابن بطوطہ ہندوستان اور لنکا سے

گھومتا گھامتا چین پہنچا تو اس نے مسلمانوں کو خوشحال پایا۔ مسجدوں میں نمازیں ادا کی جا رہی تھیں۔ وہ کینٹن پیکن اور زیتون شہروں میں بھی گھوما۔ اس نے لکھا ہے کہ مسافروں کے لیے چین دنیا کے سب ملکوں سے اچھا ہے۔ یہاں مسلمان عربی زبان اور کلچر کو اپنائے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کا شیخ الاسلام بھی الگ ہے۔ جو ان کے معاملات طے کرتا ہے۔ جب مسلمانوں نے چینی خواتین سے شادیاں کرنا شروع کیں تو چینی کلچر بھی اپنایا جانے لگا۔ کچھ مسلمانوں نے چینی بیویوں کے نام کو اپنے نام کا جز بنا لیا اور بہت سے ناموں میں چینی الفاظ شامل کر لیے گئے۔ محمد کو MO مصطفےٰ کو MAI مسعود کو MU سے بدل دیا گیا۔ اسی طرح حسن کو HA حسین کو HU سعید کو SAI لکھا گیا۔ عربی کے ساتھ ساتھ چینی زبان کو بھی اپنایا گیا۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے اپنی انفرادیت کھودی اور تقریبات کے علاوہ مسلمانوں کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ یہاں یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مسلمانوں کا چینی زبان یا چینی طرزِ معاشرت اپنا لینا کوئی نئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے اس کا دامن بڑا وسیع ہے وہ جس ملک میں بھی پھیلا اس کو اچھا ضابطہ حیات بخشا اور زہد و تقویٰ سے مالا مال کر دیا اور کچھ مقامی رسم و رواج اپنا بھی لیے۔

۱۶۴۴ء سے ۱۹۱۱ء تک منچو فرقہ کی حکومت چین پر رہی۔ جس نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کو اپنایا۔ چینی۔ منگول اور تبتی جھگڑے ہونا شروع ہو گئے اور مسلمان بھی نشانہ بنے۔

۱۹۱۲ء میں چین جمہوریہ کی بنیاد پڑی اور سن یات سین سربراہ ہوئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہن (چینی) ہو (مسلمان) مان (منچو) تسنگ (تبتی) اور مینگ (منگول) قومیں حکومت کی نظر میں برابر ہیں اور سب قوموں میں میل و محبت بڑھے۔

گردش لیل و نہار نے پھر پلٹا کھایا اور ۱۹۴۸ء میں ایک نیا انقلاب رونما ہوا۔ روس کے اثر سے چین میں بھی کمیونزم کی داغ بیل پڑی۔ عام نظام تہہ و بالا ہو گیا۔ تمام اقلیتیں مصیبت میں گرفتار ہو گئیں۔ مسلمانوں پر مظالم ہوتے اور ان کے لیے

ماؤ کی حکومت پیغام سیہ بختی لائی۔ جن قبیلوں کی زبان عربی تھی اس کو لیٹن سے بدل دیا گیا۔ مسلمانوں کو کیمپوں میں رکھا گیا جہاں ان سے مزدوری کا کام لیا گیا اور کمیونزم کی تعلیم دی گئی۔ کئی لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ مسجدوں کو بند کر دیا گیا۔ کہیں کہیں مسجدوں میں دفتر بھی کھول دیے گئے۔ مدرسوں کو بند کر کے، بچّوں کو ایسے اسکول بھیجا گیا جہاں اشتراکیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر اس ظلم وستم کے باوجود سرکار مسلمانوں کے دلوں سے اسلامی روح فنانہ کر سکی۔

آج چین میں کمیونزم کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور وہ آخری سانسیں لے رہا ہے۔ مسجدیں آباد ہو رہی ہیں۔ ۱۹۷۸ء سے اب تک ۲۸ ہزار مساجد مسلمانوں کے زیر انتظام آچکی ہیں۔ عربی زبان دوبارہ ترقی کر رہی ہے۔ اسلامی لٹریچر چھپ رہا ہے۔ کلام پاک آٹھ زبانوں میں موجود ہے۔ چینی زبان میں بھی پڑھا جا رہا ہے۔ فریضۂ حج ادا کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ چینی مسلمانوں میں عام بیداری پھیل چکی ہے۔ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں مسلمانوں نے ایک بڑا مظاہرہ کیا کہ دکانوں سے ایسا لٹریچر ہٹا دیا جائے جو مسلمانوں کے خلاف ہے۔ نئی نسل بھی صف بندی کرنے میں شامل ہو گئی ہے۔

راقم نے ۱۹۹۱ء میں امریکہ میں دیکھا کہ چین کے ۲۷؍ اور روس کے ۲۶؍ مقامات کے لیے "امریکہ مسلم کمیونٹی سنٹر" کو اس بات کے لیے رجوع کیا گیا کہ وہ ان کے لیے قبلہ کا صحیح رخ اور نماز کے اوقات سے آگاہ کرے۔ اور مسلم سینٹر نے اس معاملہ کو جناب سیّد خالد شوکت صاحب کو جو ارلنگٹن میں رہتے ہیں اور کمپیوٹر سائنس کے ماہر انجینیر ہیں سونپ دیا۔

چین کی کل آبادی ایک ارب تیرہ کروڑ پینسٹھ ہزار ہے۔ جس میں ۵ ملین مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی تقسیم اس طرح ہے۔ ۵۰ فی صدی ایسے مسلمان ہیں جو چینی ہیں اور اسلام قبول کر چکے ہیں اور تمام چین میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ابو عبید

جدید عربی ادب اور اپولو تحریک

جس طرح فرانسیسیوں کے ظلم وستم، عثمانیوں کے جبر واستبداد اور یورپی آداب سے واقفیت نیز پریس وغیرہ کی آسانیوں کی وجہ سے جدید کلاسیکیت عربی ادب وشاعری میں نمودار ہوئی۔ اسی طرح عثمانیوں اور انگریزوں کے جوروستم سے عاجز آکر نیز اپنے معاشی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے عربوں نے مادر وطن کو خیرباد کہہ کر امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی جانب ہجرت کرنی شروع کی۔ وہاں پہنچ کر انھیں زبان وقلم کی آزادی اور معاشی فارغ البالی تو ملی، مگر اجنبیت کا احساس، وطن عزیز کی یاد اور اس کی جدائی کے غم نے انھیں رومانیت کے اندر پناہ لینے پر مجبور کیا۔ چنانچہ جب انھوں نے یورپ کے رومانی شعراء کے افکار وخیالات اور ان کے کلام کا مطالعہ کیا تو اسے انھوں نے اپنے دل کی آواز اور اپنے لیے مشعل راہ تصور کیا اور پھر وہ بھی رومانی نغمے گنگنانے لگے۔

یہ حقیقت ہے کہ یورپ کے جدید شعر وادب کے مطالعے کے بعد مہجری شعراء کو عربی شعر وادب بے جان نظر آنے لگے۔ کیونکہ روایات وتقلید کی ان پر اتنی دبیز تہیں جمی ہوتی تھیں کہ دور جدید کی ترقی کی روشنی کا ان تک پہنچنا مشکل تھا۔ لہٰذا ان شعراء نے روایات وتقلید کی چادروں کو اتار پھینکا۔ اور عربی شاعری کو جدید انداز فکر سے متعارف کرانے کی جدوجہد شروع کی جس کے نتیجے میں عربی ادب وشاعری میں جدیدیت یا رومانیت جیسی نئی تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ عربی شاعری میں رومانوی طرز کو مکمل طور پر سب سے پہلے مہجری شعراء ہی نے اختیار کیا جن میں اس طرز کا روح رواں اور اس تحریک کا بانی اور

جناب ابو عبید، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

امام جبران خلیل جبران ہے۔ ایک مشہور ادیب و نقاد یاسین الایوبی کے مطابق "جدید عربی ادب میں، رومانوی تحریک کا امام جبران ہے جس کا مقام عربی ادب میں وہی ہے جو فرانس اور انگلستان میں رومانی تحریک کے روح رواں شعراء، اور جدیدیت کے علمبرداروں کا ہے"۔[۱]

بقول ڈاکٹر احسان عباس "رومانوی طرز اپنے پورے اثرات کے ساتھ صرف عصر جدید میں نظر آتا ہے جس کا بانی جبران ہے۔ یہ طرز فرانس اور انگلستان کے شعراء کے رومانی طرز سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس طرز پر فطرت کا پوری طرح اثر ہے جس کے نغموں میں شوق و محبت بھی ہے اور رنج والم بھی۔ انسانی قوانین و روایات کے خلاف بغاوت بھی ہے اور قانون و محبت کا تقدس بھی۔ دل کو راہبر اور امام مانا جاتا ہے، اس میں صوفیانہ رموز بھی ہوتے ہیں اور مضمون نگاری کا اہتمام بھی۔ نیز اس میں سخت زبان کا استعمال بالکل نہیں ہوتا"۔[۲]

ڈاکٹر احمد امین لکھتے ہیں کہ "رومانوی طرز اپنانے والے وقت، مادہ، اور روایات کی قیود و بندشوں سے آزاد ہو کر مادّی دنیا سے بہت دور اپنے خیالی اور روحانی آسمان کی رفعتوں میں محو پرواز نظر آتے ہیں اور اس مقام حریت تک پہنچنے کے لیے انھیں صرف تصوّر اور تخیل کی راہ اپنانی پڑتی ہے"۔[۳]

رومانی طرز کا رواج زیادہ تر جنگوں کے بعد یا پھر انقلابات کے زمانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں انسانیت اور شخصی حقوق کے مطالبے کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ رومانی ادب، مغربی ادب کے سہارے عربی ادب میں پروان چڑھا اور اسی کے ذریعہ فرانسیسی انقلاب کے اثرات کے نتیجے میں لبنان کے اندر قومی تحریک اور اصلاح معاشرہ کی عام بیداری پیدا ہوئی۔ عثمانیوں کے مظالم دور کرنے اور لبنان کا سارے عالم عرب سے تعلق جوڑنے کا کام اسی فن نے انجام دیا۔ لبنان کے مصائب سے بالخصوص پہلی جنگ عظیم کے اس المیہ کو جس کے نتیجے میں قحط اور دوسری آفتیں آئیں۔ سارے عالم عرب کو روشناس کرانے کا کام بھی اسی فن نے انجام دیا۔ جبران کی تحریروں نے اس تصور کو مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا۔ اس کی ان تحریروں کا تعلق خیال سے تھا جس کو زمین پر ثبات نہیں تھا بلکہ آسمان کی بلندیوں کی جانب پرواز کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جبران کے افسانوں میں رومانی طرز جو کسی حد تک فرانسیسی ادب سے متاثر

ہے۔ جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ "الاجنحۃ المنکسرۃ"، "وردۃ المعانی" اور "مضجع العروس" کے علاوہ دیگر افسانوں میں بھی سماجی قیود سے آزادی کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ ذاتی اور شخصی اہمیت اور قیمت کا مطالبہ بھی شامل ہے۔ جبران کے یہ افسانے رومانی خصوصیات میں رنگے نظر آتے ہیں جن میں رنگینیت کے ساتھ ساتھ گہرے احساسات، آرائش و زیبائش اور حسن و آراستگی بھی ہے۔[۴۰]

اپنے نظریۂ فکر کی اشاعت و ترقی اور عربی ادب و شاعری کو نئے ذوق سے آشنا کرانے کی غرض سے جبران نے شمالی امریکہ میں مقیم عرب شعراء کی مدد سے ۱۹۲۰ء میں نیویارک میں الرابطۃ القلمیۃ کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کے روح و رواں خود جبران اور اس کے علاوہ میخائیل نعیمہ، نسیب عریضہ، ایلیا ابو ماضی اور رشید ایوب تھے۔ اس تنظیم نے متعدد اخبارات و رسائل کے ذریعہ بلادِ عرب میں اپنے جدید نظریہ کی اشاعت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا اور اپنے مقصد میں وہ کامیاب بھی رہے۔ ان شعراء کا خیال تھا کہ "ادب وہ ہے جو زندگی کے لیے نور و روشنی حاصل کرے جس کا احساس رفیق اور جس کا فکر عمیق ہو اور جو زندگی کے انقلابات پر نظر رکھتا ہو اور جس کے اندر اپنے نفسیاتی تاثر کو شامل کر کے ان کو پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ راہ تقلید سے تجدید کی طرف جاتی ہو۔"[۴۱]

ان شعراء نے عربی شاعری کو جملہ قیود و بندشوں، روایات اور مبالغہ آرائیوں سے آزاد کر کے قدماء کے اس طرز سے بالکل ہٹ جانا چاہا جس پر اب تک مدح، مرثیہ، اور قصیدے کہے جا رہے تھے۔ انھوں نے ادب برائے زندگی کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے شاعری کو زندگی کے ہر شعبے کا راہ نما بنایا۔ کیونکہ ان کے خیال میں زندگی اور ادب ایک ہی ماں کے دو بچے ہیں جن میں جدائی ممکن نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ "شعر کو غزل، نسیب، مدح، ہجو، مرثیہ، وصف، فخر اور حماسہ کے علاوہ دوسرے میدانوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔" ان شعراء نے عروض اور اوزان کے مروّجہ قواعد کی بھی سخت مخالفت کی او[ر] عربی شاعری میں ایک نئے صنفِ سخن یعنی آزاد شاعری کو عام کیا۔ ان جملہ تغیرات اور جدی[د] کے نظریات کو سمجھنے کے لیے جبران کا مضمون "لکم لغتکم ولی لغتی" کا مطالعہ ض[روری]

ہے جس میں اس نے قدیم طرز کی سخت مخالفت کے ساتھ ساتھ زبان وعروض اور اغراض و مطالب پر کھل کر نکتہ چینی کی ہے۔ نیز جدیدیت کی دعوت دیتے ہوئے اسے جملہ عیوب و نقائص سے پاک بتایا ہے"۔[۵۵]

جس وقت امریکہ میں مہجری شعراء رومانوی تحریک یا جدید طرز تحریر کو پھیلانے میں مصروف تھے۔ عالم عرب میں بھی شعراء وادباء اسی سمت مائل ہو رہے تھے۔ گو کہ مصر میں مہجری طرز کی کافی حد تک مخالفت بھی کی گئی جس میں عقاد، شکری، مازنی، اور طٰہٰ حسین وغیرہ پیش پیش رہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ ان کے جملہ افکار ونظریات سے مصری ادیبوں کو اختلاف تھا بلکہ ان کی غلو پسندی اور قدماء کی مخالفت میں حد سے گزر جانے نیز اوزان و بحور سے بالکل آزاد ہو جانے کی مخالفت تھی جب کہ بعد میں شکری، مازنی اور ابوشادی وغیرہ نے خود بھی شعر الحر وغیرہ پر طبع آزمائی کی اور اس کی دعوت بھی دی۔ مگر عالم عرب میں اس صنف سخن کو پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عربی شاعری غنائی شاعری ہے اور اوزان و بحور سے شاعری کو آزاد کرنا اس میں ایک عیب پیدا کرنا ہے دوسری بات یہ ہے کہ ان شعراء نے اس جدید صنف شاعری پر طبع آزمائی تو کی مگر یہ لوگ اس میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان لوگوں نے روایت وتقلید کو ناپسند کیا۔ اس پر نکتہ چینی کی اور اپنے لیے تجدد پسند ہونے کا دعوا کیا مگر یہ لوگ نہ تو پوری طرح سے روایات وتقلید سے آزاد ہو سکے تھے اور نہ ہی مہجری شعرا کی طرح مکمل طور پر جدیدیت کے رنگ میں رنگ سکے تھے۔

ڈاکٹر عیسیٰ الناعوری اپنے ایک مضمون "بین تجدید وتجدید" میں لکھتے ہیں کہ "اس بات کو سبھی جانتے ہیں کہ جماعۃ الدیوان کے شعراء کے بہت سارے دواوین منظر عام پر آئے۔ مثلاً شکری کے سات دیوان، مازنی کے دو دیوان اور عقاد کے دس یا اس سے زیادہ دواوین (جس میں عقاد شاعری میں سب سے کمتر تصور کیے جاتے ہیں) کے باوجود مجھے ان تینوں کی شاعری میں دور تک کہیں بھی تجدید کی جھلک نہ تو عبارت میں نظر آئی، نہ ہی لفظ میں، نہ ہی اس کی ساخت میں، اور نہ ہی ان کے خیال میں، میں نے ان کی شاعری میں نہ تو کوئی جدید روح دیکھی

اور نہ ہی معانی میں کوئی جدید رنگ، ان کے اشعار حرارت شعری سے اکثر خالی نظر آتے ہیں۔ تو کیا ایسے شعراء جس کے اشعار حرارت شعری سے خالی ہوں انھیں مجدد یا جدید پسند کہا جا سکتا ہے ؟ بلکہ کیا انھیں شاعر بھی کہا جا سکتا ہے ؟"[۶]

ڈاکٹر النا عوری کے بقول وہ لوگ تجدد سے بہت دور تھے ان کے اندر شاعری کی اہم خصوصیات میں سے ایک بھی موجود نہیں تھی۔ لہٰذا صاحب مقالہ نے ان کے شاعر ہونے پر بھی شبہ ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ ان لوگوں نے جدیدیت کی دعوت بھی دی اور خود بھی اسے اپنایا۔ یہ الگ بات ہے کہ روایت و تقلید کی مخالفت میں وہ اتنی دور نہیں جا پہنچے جہاں مہجری شعراء پہنچ چکے تھے تقلید کی مخالفت دونوں نے کی مگر مہجری شعراء قدماء کی مخالفت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے اپنے قدیم ورثے کو بھی حقارت بھری نظروں سے دیکھنا شروع کیا اور مصری شعراء نے مہجری شعراء کی سب سے زیادہ مخالفت اسی بات پر کی اور یہ کہنا کہ یہ لوگ سرے سے شاعر ہی نہیں تھے سراسر ناانصافی ہے کیوں کہ اہل ذوق و صاحب بصیرت نقادوں نے بھی ان کے کلام کو سراہتے ہوئے انھیں روشن خیال شاعر تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ عالم عرب میں شاعری کو جدید رجحانات سے متعارف کرانے میں ان کے اقدام اور کاوشوں کو سراہا ہے اور ساتھ ساتھ یہ کہا ہے کہ جذبات۔ عاطفہ و خیال کی جو کارفرمائی مہجری شعراء کے کلام میں ہے وہی ان کے یہاں بھی ہے۔ عالم عرب کی عربی شاعری میں جدید صنف سخن یعنی رومانوی طرز کی ابتدا خلیل مطران نے کی جس کی پیروی عقاد، شکری، مازنی، اور مکمل طور پر ابو شادی نے کی۔

عبد القادر القط کہتے ہیں کہ "اس بات سے سبھی اتفاق کرتے ہیں کہ خلیل مطران جدید عربی شاعری میں تحریک تجدد کا پیش رو اور امام ہے۔ نیز اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے یہاں اپنے ہم عصر شعراء کی بہ نسبت جدیدیت کے آثار زیادہ نمایاں ہیں۔ پھر بھی وہ اوزان و بحور الفاظ و تراکیب، تشبیہات و مجازات میں قدیم شاعری کے مزاج سے بہت دور نہ جا سکا اگرچہ یہ تمام چیزیں یعنی روایت و تقلید اس کے یہاں شوقی کے مقابلے بہت کم ہیں۔ لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا"[۷]

گو کہ خلیل مطران شعراء محافظین یعنی شوقی و حافظ کے ہم عصر ہیں مگر شوقی اور حافظ

کی بہ نسبت وہ زیادہ تجدد پسند ہیں۔ چونکہ مطران نے بھی مہجری شعراء کی طرح حکومت کے جبر و استبداد کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ جلاوطنی کی زندگی بھی گزاری تھی اور اپنی اسی جلاوطنی کی زندگی میں انھوں نے فرانسیسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا نیز وہاں کی جدید ادبی تحریکوں سے متاثر ہوئے تھے۔ جو اثر ان کی شاعری میں پوری طرح نمایاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شوقی اور اپنے دیگر ہم عصر شعراء کے مقابلہ میں جدیدیت سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ البتہ انھوں نے قدیم اور روایتی شاعری سے مکمل طور پر انحراف نہیں کیا بلکہ قدیم طرز و اسلوب کی قدر کرتے ہوئے جدید انداز فکر کو بھی اپنی شاعری میں لانے کی کوشش کی ہے۔ جے بروگمین انھیں کلاسیکیت اور رومانیت کے بیچ کا شاعر مانتے ہیں ان کے بقول:

"مطران نہ تو پوری طرح ایک روایتی شاعر تھا اور نہ ہی رومانی۔ بلکہ وہ ان دونوں کے مابین کا شاعر ہے، کیونکہ روایتی شاعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ شاعر مطران کے مقابلے شوقی اور حافظ کا ہم خیال زیادہ ہو، اور رومانی شاعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ شاعر مطران کی بہ نسبت عقاد، شکری، مازنی اور ابو شادی وغیرہ سے زیادہ قریب ہو یعنی مطران کو نہ تو مکمل طور پر کلاسیکی یا روایتی شاعر کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی رومانی شاعر۔"[۵۲]

"شوقی کی طرح مطران بھی روایت سے وابستہ رہے البتہ شوقی ان سے دو قدم آگے نظر آتے ہیں اور شوقی کی طرح انھوں نے بھی قدیم اوزان و بحور میں شاعری کی۔ اس سے بھی اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ الفاظ کی تراکیب پر متقدمین کی طرف وہ زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متقدمین کی تقلید سے واضح انحراف کے باوجود ان کے یہاں الفاظ اور تراکیب کا عمومی آہنگ اور مزاج متقدمین سے علیحدہ نہیں اور یہی وہ بنیادی وصف ہے جس کی بنا پر وہ شوقی و حافظ سے جدا ہوتے ہوئے بھی الگ نہیں معلوم ہوتے۔ شوقی کے مقابلے مطران کی شاعرانہ اہمیت ان جدید عناصر کی بنا پر زیادہ ہے جن سے انھوں نے عربی شاعری کو روشناس کرایا۔ ان میں پہلی بات یہ ہے کہ مطران نے شاعری کو اظہار فضل و کمال کا آلہ بنانے کے بجائے جذبات و احساسات کا آئینہ بنانے کی کوشش کی۔ نیز خارجیت سے زیادہ داخلیت پر زور دیا۔ مطران سے پہلے عربی نظمیں ردیف و قوافی کی وحدت کے باوجود اندرونی انتشار کا شکار رہتیں اور ایسی نظموں کا فقدان تھا جن میں انگریزی یا فرانسیسی نظموں کی طرح ایک ہی خیال یا تاثر پوری نظم میں

پایا جائے۔ مطران نے پہلی بار اس طرز کی نظموں سے عربی شاعری کو متعارف کرایا"۔[۹]

مطران کے بعد عالم عرب میں شاعری کے اِن جدید رجحانات کو منظّم طور پر تحریک کی شکل میں چلانے کا کام عقاد، شکری اور مازنی نے کیا۔ یہ لوگ خود انگریزی ادباء بالخصوص شیلی اور کیٹس کے جدید شعری رجحانات اور رومانی افکار و خیالات سے متاثر تھے لہٰذا انھوں نے مدرسۃ الدیوان کے ذریعہ جدید مکتب فکر کی اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ تقلیدی اور روایتی شاعری پر تنقیدیں بھی کیں۔ یہاں تک کہ روایت اور تقلید سے چمٹے رہنے والے شعراء کا مذاق اڑایا اور ان میں سے بعض کے شاعر ہونے سے ہی انکار کر دیا۔ تحریک الدیوان کا مقصد تھا کہ قدیم تقالید پر تنقید کر کے جدید مغربی خیالات سے شعراء کے دماغوں کو روشن کیا جائے۔ اس تحریک کی دو اہم خصوصیات تھیں

(۱) اس تحریک پر فرانسیسی ادب کے بجائے انگریزی ادب کے اثرات زیادہ گہرے تھے۔

(۲) جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ انگریزی ادب کے اثرات ان پر گہرے ہونے کے باوجود یہ لوگ مہجری شعراء کی طرح اپنے قدیم سرمایے کو نفرت اور حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ عربی شاعری کے کلاسیکی مزاج سے پوری طرح واقف ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اس قدیم سرمائے کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ بارودی، شوقی اور حافظ کی تحریک احیاء ہو یا عقاد، شکری اور مازنی کے تجدد پسندانہ خیالات اور تحریک الدیوان، یا مہجری شعراء کا حقیقت سے فرار اور رومانیت پسندی، یا مطران کا جدید نظریہ شاعری سب نے مل جل کر عربی شاعری کو بہت کچھ دیا کیونکہ باہمی نظریاتی اختلافات کے باوجود ان کا مقصد ایک ہی تھا۔ یعنی عربی شاعری کے جمود و تعطّل کو ختم کر کے اسے ترقی یافتہ زبانوں کے آداب و شاعری کے برابر لایا جائے۔ چنانچ ان تحریکوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ نئی ابھرنے والی نسل آزادانہ طور پر سوچنے کی عادی ہو گئی وہ شوقی و حافظ کو سننا بھی پسند کرتی تھی اور مہجری شاعری سے لطف اندوز بھی ہوتی اس ذہنیت کی بہترین نمائندگی احمد ذکی ابو شادی اور ان کی تحریک "اپولو" سے منسلک شعراء کرتے ہیں۔ "اپولو" تحریک کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر روما

رنگ غالب ہے کیوں کہ اس سے منسلک شعراء مثلاً ابوالقاسم الشابی وغیرہ نے خالص رومانی طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے کلام کو محض رومانی رنگ ہی میں رنگنے کی کوشش کی ہے۔

اس موقع پر تحریک اپولو کی تاریخ اور اس کا پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ذہن میں یہ سوال اُٹھ سکتا ہے کہ وہ کون سے سیاسی وسماجی حالات تھے جن سے مجبور ہو کر شعراء اور ادباء نے رومانیت کے اندر پناہ لی۔

اپولو

مصر پر برٹش سامراج کا تسلط، مصریوں پر ان کی روزانہ کی بڑھتی ہوئی ظلم وزیادتی نے مصریوں کے اندر آزادی کا جذبہ اور زندگی کی کرن پیدا کی چنانچہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کی لہر دوڑنے لگی اور جو قوم برسوں سے حکمراں قوم کے ظلم سہتی چلی آرہی تھی اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے ۱۹۱۹ء میں بغاوت کردی)۔ وہ آتش فشاں جو برسوں سے ان کے سینوں میں دبا ہوا تھا ۱۹۱۹ء میں پھوٹ پڑا اور ہر مصری کی زبان سے انقلاب زندہ باد اور آزادی کا نعرہ سنائی دینے لگا۔ بالآخر ان کی بغاوت کامیاب ہوئی۔ اور انھوں نے مصر کو ظالم اور اجنبی پنجوں سے آزاد کرالیا۔

۱۹۱۹ء کی بغاوت، انقلاب اور پھر آزادی نے مصریوں کے اندر زندگی کی ایک نئی روشنی ڈال دی۔ وہ اپنے مستقبل کو خوشگوار اور روشن کرنے کے خواب دیکھنے لگے اور مصر پوری طرح سے مہذب اور ترقی یافتہ نظر آنے لگا۔ لیکن قدرت شاید ابھی انھیں مزید آزمائشوں سے گزارنا چاہتی تھی۔ لہٰذا وہ جلد پریشانی جواب گزری ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ مظالم جو غیروں نے توڑے تھے اب اپنوں کے ذریعہ توڑے جانے لگے۔ مصر میں اندرونی اختلافات اور کشیدگی عام ہونے لگی۔ عوام کا اپنے حکمرانوں پر سے اعتماد اٹھنے لگا اور وہ فضا جسے مصریوں نے ابھی حلدی اپنے خون سے صاف کیا تھا پھر سے گندی ہونے لگی۔ شعراء وادباء جو اطمینان اور آزادی کی سانس لینی شروع کرچکے تھے ان کے دم پھر سے گھٹنے لگے۔ ایسے حالات میں انھیں اپنے گرد صرف حزن وغم، حرم والم یاس وحرماں نصیبی کے بادل چھائے ہوئے نظر آئے

لہٰذا انھوں نے رومانیت کے اندر پناہ لینی شروع کی۔ انھوں نے غم میں سکون تلاش کرنا شروع کیا اور سوزدروں کی کسک میں بھی راحت تلاش کرنے لگے اور اس کا ملجا صرف ایک ہی تھا اور وہ تھی رومانیت یا رومانی شاعری۔

۱۹۲۷ء میں سعد زغلول کی موت کے بعد ۱۹۲۸ء میں محمد محمود نے تالیف وزارۃ سنبھالی لیکن کچھ دنوں بعد ان کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۳۰ء میں عدلی کی وزارت نے ذمہ داری سنبھالی۔ لیکن یہ بھی زیادہ دن تک نہ چل سکی اور ملک فواد صدقی زہاوی نے جس شخص کو پورا مصر جانتا تھا کہ مصری قوم کا سب سے بڑا دشمن ہے وہ کبھی بھی انھیں پھلتے پھولتے ہنستے کھیلتے اور ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتا، مصری قوم کے لیے اس کے سینے میں کوئی ایسا دل نہیں جو بھولے سے ایک بار ہی دھڑک اٹھے اس نے پارلیمنٹ توڑ دی اور ۱۹۲۳ء میں دستور کو تبدیل کر دیا اور ایک ایسا قانون ایسا دستور پیش کیا جس سے مصریوں کی ۱۹۱۹ء کی قربانیوں کا کہیں سے کوئی صلہ ملتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں ممبران پارلیمنٹ اور عوام کے بیحد احتجاج کے باعث وہ پھر سے پرانا دستور لانے پر مجبور ہوا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں برطانیہ اور مصر کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی جس میں مکمل طور پر مصر کو آزادی ملی۔[۵۱]

اس مکدر اور دم گھٹنے والی فضا میں احمد زکی ابوشادی ظاہر ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے رفقاء کے تعاون سے تحریک ابولو قائم کی۔ ابوشادی کی تعلیم و تربیت لندن میں ہوئی جہاں انھوں نے زبان و ادب نہیں بلکہ علم طب کی تعلیم حاصل کی جس میں انھوں نے باطنی امراض اور جراثیم پر تخصص حاصل کیا۔ اگر ظاہراً دیکھا جائے تو اس تعلیم کا ادب و شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن ابوشادی جو بظاہر تو علم طب کے حصول میں محو تھا مگر اس کا دل ادب کی جانب مائل تھا اس نے مغربی تہذیب و تمدن وہاں کے ادب و ثقافت کا بھی بھرپور مطالعہ کیا جس کا اظہار ۱۹۲۲ء میں اس کی مصر واپسی اور دیگر مغربی افکار و خیالات سے عربی ادب کو متعارف کرانے پر ہوا۔ ادب کی جانب میلان کی سب سے بڑی وجہ، خلیل مطران کے اشعار کا مطالعہ ہے۔ کیوں کہ مطران ہی ایک ایسا شاعر ہے جس سے ابوشادی حد درجہ متاثر ہوا اور

سے اپنا آئیڈیل بنایا۔ خلیل مطران کے اسی تعلق نے ابوشادی کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کیا کر وہ
سی ادبی تحریک کی بنیاد ڈال سکے اس بات کا اعتراف ابوشادی نے کئی جگہوں پر کیا ہے، مثلاً
پنے دیوان "انداء الفجر" جو پہلی بار ۱۹۱۰ء میں، دوسری بار ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے
ختتامیہ میں اس نے اپنے افکار و خیالات، اپنے اشعار اور مطران کے نظریے کے تاثر کا بڑی
فصیل سے ذکر کیا ہے۔ جدید شاعری کے سلسلے میں ابوشادی کا نظریہ جاننے کے لیے اس
ی نظم الجدید کا مطالعہ ضروری ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

نمونۂ اشعار:۔

(۱) هذه صورة الجديد من الشعر — وفاءٌ وقوةٌ وإمارة!
(۲) ما يبالي بزخرف في نظام — او يغالي برونق في عبارة
(۳) بل هو الشعر نفحة من شعور — وحياة من حكمة امّارة
(٤) يخلق الشعب من جديد ويوحى — كلّ معنى الى العلى لا صغارة

ترجمہ:۔

(۱) یہ ہے جدید شاعری کی تصویر جس میں احساس و شعور کی حکمرانی ہے جو لفظی اور معنوی ہر لحاظ سے مکمل ہے۔
(۲) یہ شاعری اس سے بے پرواشخص کی برابری نہیں کرتی اور نہ ہی عبارت آرائی میں غلو کرتی ہے۔
(۳) بلکہ یہ شاعری شعور و فکر کا ایک جھونکا ہوتی ہے اور حکمت و دانائی سے بھری ایک زندگی ہوتی ہے۔
(٤) میری شاعری سماج کی از سر نو تعمیر و تخلیق کرتی ہے اور ہر معنی کو بلندی تک پہنچاتی ہے۔ پستی کی طرف نہیں۔/ میرا کلام عوام الناس کو ایک نیا وجود بخشتا ہے اور ہر قسم کی معنویت کا الہام کرتا ہے بلندی کی طرف پستی کی طرف نہیں۔

انگریزی ادب و شعر کے مطالعے اس وقت کے سیاسی و سماجی

حالات اور خود اس کے اندر کی ادبی صلاحیت نے مطران کو اپولو جیسی ادبی تحریک چلانے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں ابو شادی نے "اپولو" نامی ادبی سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا اور اکتوبر ۱۹۳۲ء میں شوقی کے گھر پر انھیں کی زیر صدارت اس سوسائٹی کی پہلی باقاعدہ میٹنگ منعقد ہوئی جس میں متفقہ طور پر شوقی کو اس کا صدر، اور خلیل مطران کو نائب صدر منتخب کیا گیا اس کے علاوہ کامل کیلانی، ناجی، احمد الشائب، علی محمود طٰہٰ، حسن کامل الصبری وغیرہ اس کے ممبران تھے۔ لیکن چند ہی دنوں بعد شوقی کی وفات کی بناء پر خلیل مطران کو اس کا دوسرا صدر بنایا گیا۔ ابو شادی بذات خود اس تنظیم کے سکرٹیری تھے۔ اس کے مقاصد یہ تھے۔ عربی شاعری میں بلند معیار پیدا کرنا، شعراء کی کاوشوں میں ان کی راہ نمائی کرنا، ادبی، سماجی و مادّی طور پر شعراء کے معیار کو بڑھانا اور خود ترقی دینا ان کی صلاحیتوں کی حفاظت کرنا، نیز عام شعر و شاعری میں فنّی بیداری کی مدد وراسے بڑھاوا دینا۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپولو اپنی پچھلی جدید ادبی تحریکوں میں سے کس تحریک کے افکار و خیالات کی ترجمان یا نظریاتی طور پر کس سے قریب ہے یا نہیں اس سلسلے میں ادیبوں کی رائیں مختلف ہیں، کوئی کہتا ہے کہ یہ تحریک خلیل مطران کے نظریہ شعر کی اشاعت و ترقی کے لیے چلائی گئی۔ کوئی کہتا ہے خلیل مطران کے ساتھ ساتھ یہ مدرسۃ الدیوان کے مقاصد کی بھی ترجمان ہے۔ کسی کے نزدیک یہ محض رابطہ قلمیہ، یعنی مہجری تحریکوں کے تاثر سے وجود میں آئی۔

چنانچہ ہم ادیبوں کے اقوال الگ الگ نقل کر رہے ہیں۔ ادونیس کہتا ہے کہ "ایک طرف خلیل مطران کے نظریہ شعر اور ان کے چند قصیدوں خاص طور پر قصیدۃ المساء جسے انھوں نے ۱۹۰۲ء میں لکھا اور اسی طرح عبدالرحمٰن شکری کے اشعار اور نظریے کے نتیجے میں اور دوسری جانب عباس محمود عقاد کی نثری کاوشوں، تنقیدی تحریروں اور جماعۃ الدیوان کے تاثر سے تحریک اپولو وجود میں آئی"[۱۱]

ج۔ برونگمین کے بقول "جدید مصری ادب کی تاریخ میں اپولو ایک اہم ادبی تحریک ہے جسے ابوشادی نے انگلینڈ سے واپسی کے بعد قائم کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابوشادی کے ذہن میں اس ادبی تنظیم کا خیال ۱۹۲۲ء میں امریکہ میں رہنے والے مہجری ادباء کے ذریعہ قائم کردہ ادبی تحریک رابطہ قلمیہ سے متاثر ہو کر آیا۔ کیونکہ اپنے دیوان "الشفق الباکی" میں انھوں نے ایک ایسی ادبی سوسائٹی کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا ہے جو رابطۂ قلمیہ جیسی ہو۔" ۱۳۲

عبدالعزیز الدسوقی اپنی کتاب "جماعت ابولو وعصرھا فی الشعر الحدیث" میں لکھتے ہیں کہ "محض یہ کہنا کہ اپولو ہر طرح سے مطران کے ذہن و فکر کی ترجمان ہے۔ اور اس میں دیگر کسی تحریک کا اثر نہیں۔ یا یہ کہ یہ تحریک محض مطران کے خیال کی روشنی میں پیدا ہوئی اور اس پر چلتی رہی غلط ہے کیونکہ اس طرح کی تمام تحریکات جو قدیم اور روایتی انداز سے ہٹ کر تجدد کی راہ پر چلنا چاہتی تھیں وہ تمام کی تمام انگریزی ذہن و فکر سے متاثر تھیں اور رہے مطران تو وہ انگریزی زبان وادب سے بالکل ناواقف تھے تو بھلا یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اس انگریزی ذہن و فکر سے آشنا ہوئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک " مدرسۃ الدیوان" کے ہی افکار و نظریات کی اشاعت کر رہی تھی۔" ۱۳۳

ڈاکٹر عیسی الناعوری اپنے مقالے "بین تجدید و تجدید" کے تحت لکھتے ہیں کہ "ابوشادی اپنے برطانیہ کے دوران تعلیم مدرسۃ الدیوان کی ادبی کاوشوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنی مصر واپسی کے بعد جماعۃ الدیوان کے افکار و نظریات کے تحت اس کے ادھورے کام کو پورا کرنے کے لیے اپولو تحریک کی بنیاد ڈالی۔" ۱۳۴

ان تمام اقوال کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ابوشادی کی یہ تحریک مطران کے جدید نظریۂ شعر کے ساتھ ساتھ رابطہ قلمیہ اور تحریک الدیوان دونوں ہی جماعتوں کے افکار و خیالات کی ترجمان تھی۔ البتہ اپولو تحریک پر مطران کے افکار و خیالات کے تاثر کا محض اس بنا پر انکار کرنا کہ وہ انگریزی زبان و ادب سے ناواقف ہونے کی بنا پر جدیدیت

...نا آشنا تھے دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ مطران کے اندر جدید نظریہ ...انگریزی ادب کے بجائے فرانسیسی ادب کے اثر سے آیا تھا جس پر مطران کا مطالعہ بہت گہرا ...ا اور رہی بات یہ کہ اپولو تحریک پر مطران کے نظریے کا کوئی اثر نہیں تھا یہ بھی غلط ہے۔ ...ونکہ جگہ جگہ ابو شادی خود اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ "مطران میرے استاذ ہیں وہ میرے ...اشعار کی اصلاح کرتے ہیں اور اگر مطران نہ ہوتے تو شاید میں یہ نہ جان پاتا کہ ادبی شخصیت ...س کو کہتے ہیں اور نہ ہی طلاقت فنی، وحدۃ القصیدہ، اور ادب وشعر کی حقیقی روح کے معنی ...ن پاتا۔ [15]

اس انجمن نے اپنے افکار ونظریات کی اشاعت اور ادبی مقاصد کے حصول کے لیے ...ولو ہی کے نام سے خالص ادبی رسالہ نکالنا شروع کیا جس کے مقاصد یہ تھے۔ عربی ...اعری میں بیداری، یعنی شعراء کے ذہن ودماغ کو روایتی اسلوب کے علاوہ جدید ذہن ...فکر سے آشنا کرانا، ان کے وقار کی حفاظت کرنا، اور ان کے اندر قوم کے درد کو سمجھنا اور ...ن کے اظہار کا احساس دلانا۔

اس رسالہ کے اڈیٹر ابو شادی خود تھے نیز یہ رسالہ ابو شادی کے ذاتی پریس جس ...نام "التعاون" تھا میں چھپتا تھا جس کا مالی بار خود ابو شادی ہی برداشت کیا کرتے ...ے۔ یہ عالم عرب کا پہلا خالص ادبی رسالہ تھا جو مکمل طور پر ادب وشعر اور ان سے متعلق ...قد وتبصرہ کے لیے مخصوص تھا۔ یہ رسالہ کسی خاص فکر یا جماعت کے لیے مخصوص نہیں ...تھا بلکہ اس کے دروازے جملہ ادبی وشعری ذوق رکھنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کے ...افکار ونظریات کی اشاعت کے لیے کھلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس ...نے تمام عالم عرب اور بلاد مہجر میں شہرت حاصل کر کے تمام ادبی وشعری ذوق رکھنے والوں ...کو اپنی جانب متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ خواہ وہ شوقی یا ان کے ہم عصروں کے کلام ...ہوں۔ مطران کا نیا نظریہ شاعری ہو، عقادی، مازنی، شکری، طٰہٰ حسین اور سعید قطب کے ...تنقیدی اصول ونظریات ہوں، یا مہجری شعراء کی آزاد خیالی ہو، یا شابی اور ان کے ہمنوا ...شعراء کے کلام سبھی کو اس میں جگہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اس رسالہ نے اپنے خاص ممبران کے

لیے خصوصی نمبر کا بھی اہتمام کیا۔ مثلاً ابوالقاسم الشابی کی موت پر" شابی" نمبر نکالا اور شوقی وحافظ کی یاد میں بھی خصوصی نمبر شائع کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۵ء تک جاری رہا مگر ابوشادی جب قاہرہ سے اسکندریہ منتقل ہوئے تو یہ بند ہوگیا۔ البتہ وہاں جاکر ابوشادی نے اپولو کی جگہ" الامام" نامی رسالہ نکالنا شروع کیا۔ لیکن اسے وہ شہرت و مرتبہ نہیں مل سکا جو اپولو کو ملا تھا۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اپولو کی شہرت اور اس کے مقبول ہونے میں محض ابوشادی ہی کی خدمات کا دخل نہیں تھا بلکہ درحقیقت وہ شعراء اور ادباء بھی اتنی اہمیت کے حامل ہیں جو اس رسالہ سے متعلق تھے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ابوشادی کے نام پر یہ رسالہ بھی اتنا ہی مقبول ہوجاتا جتنا اپولو ہوا۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ابوشادی وہ مصدر بنے جس کے ذریعہ ان ادیبوں نے اپنے نظریات لوگوں تک پہنچائے۔

گو کہ اپولو تحریک ایک مختصر سی مدت تک ہی جاری رہی لیکن اس کے باوجود عربی زبان وادب کی ترقی میں ایک نہایت اہم کردار ادا کیا جس کے اثرات جدید عربی شعروادب پر آج بھی نمایاں ہے۔ اس رسالہ کے علاوہ اس انجمن نے اپنے ممبران اور متعلقین شعراء وادباء کے بہت سارے دواوین اور کتابیں بھی شائع کیں۔ مثلاً ابوشادی کا دیوان" الینبوع" اطیاب الربیع، الشعلہ، فوق العباب وغیرہ کے علاوہ ناجی کا دیوان صیرفی کا" الالحان الضائعہ" اس کے علاوہ دیوان عتیق، دیوان مختار الوکیل اور انھیں کی ایک کتاب " رواد الشعر فی مصر" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اپولو کے پہلے شمارے میں جس میں انھوں نے تنظیم کے نام لفظ" اپولو" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ" اس ادبی سوسائٹی کا نام اپولو کے بجائے" عطارد" ہونا چاہیے کیوں کہ" عطارد" عربوں اور کلدانیوں کے یہاں شعر ونثر دونوں کا دیوتا تصور کیا جاتا رہا اور چونکہ" اپولو" ایک عجمی لفظ ہے اس لیے اس کے بجائے عطارد ہی زیادہ موزوں رہے گا۔" ابوشادی نے اس کے جواب میں لکھا کہ" یونان جو کہ زمانۂ قدیم سے لے کر اب تک عالمی و آفاقی طور پر علم وادب کا مرکز تسلیم کیا جاتا ہے وہاں" عطارد" محض ایک سیارہ کا نام ہے نہ کہ کسی فن کے دیوتا کا اور لفظ ابولو (اپولو) یونان میں شعر، موسیقی اور تمام قدیم وجدید کا مطلقاً دیوتا ہوا کرتا تھا۔

اس لیے اس یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہم نے لفظ "ایولو" کا انتخاب کیا" حالانکہ عقاد کا اعتراض بجا تھا لیکن ابوشادی اسے صرف عالم عرب تک ہی محدود رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ اسے عالمی و آفاقی تحریک بنانا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے عقاد کے مشورے کو رد کر دیا۔

جون ۱۹۳۳ء میں مجلّہ "ایولو" میں ایک مقالہ شائع ہوا جو شعراء و محافظین کے نظریے کی تائید کرتا تھا اور جس کے ذریعہ تحریک تجدد کو چلانے والوں پر زبردست حملہ کیا گیا۔ وہ کچھ اس طرح ہے۔

شعر کو وزن اور قافیہ سے بالکل آزاد کر دینا ہی اس تحریک کا مقصد ہے اس تحریک سے متاثر شعرا نے شعر کی حقیقی شکل کو بگاڑ کر اسے شعر الحر اور شعر منثور کا نام دے دیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر نہ تو شعر کہنے پر قدرت رکھتے اور نہ ہی نظم و نثر میں انھیں کوئی فرق نظر آتا بلکہ ہر مسجع عبارت کو وہ شعر سمجھ لیتے تھے۔ یہ تحریک ایسے مغربی اشعار کے ترجمے کا اہتمام کرتی ہے جن کا نہ تو کوئی ایک مطلب ہوتا ہے اور نہ ہی جسے عربی ذوق قبول کرتا۔

یہ شعرا جن کے اشعار مجلہ "ایولو" میں شائع ہوتے رہتے ہیں حقیقتاً یہ لوگ شاعری سے عاجز ہیں۔[16]

(۱) ابوشادی نے اس کے جواب میں لکھا کہ "اس وقت جب کہ پوری دنیا ترقی کی جانب مائل ہے۔ ہر چیز پھلنے پھولنے اور بڑھنے لگی ہے، ہر سمت ایک انقلاب اور ایک تبدیلی رونما ہوتی نظر آرہی ہے۔ ہم عربی شاعری کی اسی قدیم تعریف پر اکتفا نہیں کر سکتے جس میں شعر کو محض ردیف و قافیہ کی زنجیروں میں قید کر دیا گیا ہے بلکہ وانما الشعر هو البیان لعاطفه نفاذها الی ماخلف مظاهر الحیاۃ لاستکناه اسرارها وللتعبیر عنها فاذا جاء هذا البیان منظوما فهو شعر منظوم واذا جاء منشورا فهو شعر منثو

ترجمہ: "جذبات کے ذریعہ مظاہر حیات کے ماوراء کے اسرار و رموز کے علم اور اس کی سچی تعبیر کا نام شعر ہے۔ اگر یہ تعبیر منظوم ہے تو اسے منظوم شعر کہیں گے اور اگر منثو رہے یعنی نثر میں ہے تو اسے شعر منثو رکہیں گے۔"

۲۔ قافیہ اور وزن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " وزن اور قافیہ کا اہتمام شعر میں ثانوی چیز ہے سب سے پہلے ہمیں شعر کی روح اس کے مفہوم اور اس کی اصل کو جاننا ہو گا۔ ایک عمدہ شاعر جو کہ شاعری اور زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بالکل سادہ لوح اور صاف طبیعت کا مالک ہو تو ہمیں کہیں سے اس بات کا جواز نہیں ملتا کہ ہم اسے جبراً قوافی و بحور کے اسباق پڑھائیں۔

۳۔ اور رہی ترجمے کی بات تو دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے سے میرا مقصد عربی ادب کو دوسری قوموں کے ادب سے متعارف کرا کر اس کی کمیوں کو پورا کرتا ہے اور میرے خیال میں اس میں کوئی نقصان نہیں۔

۴۔ شعر منثور ترقی یافتہ قوموں کے یہاں باقاعدہ شعر ہی کی ایک قسم مانی جاتی ہے۔

۵۔ رہی یہ بات کہ "اپولو" کے شعراء شاعری سے عاجز ہیں تو میں صرف ایک بات عرض کرنا چاہوں گا کہ پورے محافظین گروپ میں کوئی ایسا شاعر نہیں جو "اپولو" کے شاعر ابراہیم کی نظم "قلب راقصۃ" یا "العودۃ" کے معیار کی نظم یا قصیدہ لکھ سکے"[۱۲]

ادونیس کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ابو شادی وزن اور قافیہ دونوں کو شعر میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ وہ اسے ایک غیر ضروری شے تصور کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شعر منثور کو پسندیدہ اور اچھی نظروں سے دیکھتے تھے تو ایسا نہیں ہے۔ البتہ صرف قافیے کے متعلق تو ان کے لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے مگر وزن کو وہ شعر کا جزو لاینفک مانتے تھے بلکہ وہ انگریزی امریکی شعر الحر کو پسند ہی اسی بنا پر کرتے تھے کہ اس میں وزن کا استعمال ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں ہم س۔ موریہ کے قول کا ذکر کر دینا بہتر سمجھتے ہیں۔

" ابو شادی اس بات سے پوری طرح متفق تھے کہ وزن شاعری کا ایک جزو لاینفک ہے۔ شعر منثور کو انھوں نے بہت اچھی نظروں سے نہیں دیکھا لیکن پھر بھی مختلف شعراء کے نثریہ کلام کو اپنے رسالہ "اپولو" میں شائع کرتے رہے البتہ اس صنف پر انھوں نے کبھی بھی طبع آزمائی نہیں کی۔ امریکی انگریزی شعر الحر آزاد شاعری، ابو شادی کی نظروں

میں قابل احترام تھا کیونکہ اس میں اوزان کا استعمال کیا جاتا تھا اس صنف میں ان کی پہلی نظم الشفق الباقی ۱۹۲۶ء میں چھپی، ۱۹۳۳ء میں محمد عود کے ایک مضمون "مجمع البحور الملتقی الاوزان" میں شعر الحر پر تنقید کی گئی۔ اس کے جواب میں ابوشادی نے وہی دلائل دیے جو ٹیمیریٹ مونرو کی کتاب Poets and Their Art (Newyork 1926 (جو کہ مکمل طور پر آزاد شاعری کی حمایت میں لکھی گئی) اس طرح کے سوالوں کے جواب میں دیے گئے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۲۶ء میں مندرجہ بالا کتاب شائع ہوئی اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد اسی سال ابوشادی نے اپنی پہلی آزاد نظم لکھی جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ابوشادی اس کے نظر و فکر سے حد درجہ متاثر ہوئے اور اس صنف شاعری کو اپنانے میں دیر نہیں کی۔"[۱۸]

خلاصۂ کلام یہ کہ ابوشادی نے شعراء کو اندھیرے سے نکال کر ایک نئی روشنی دکھانے کے ساتھ عربی شاعری کو قدیم روایتی قید سے آزاد کر کے اس کے افق کو وسیع تر کیا۔ ابوشادی کی یہ تحریک جس کے اغراض و مقاصد بے شمار ہیں اس نے دنیا کے دوسرے آداب سے اپنا ایک خاص رشتہ قائم کر کے فکر جدید کے رخ کو اپنایا اور اپنے مقصد کے حصول میں اپنے رسالے "اپولو" پر پورا اعتماد کیا۔ اور عربی شاعری کو ایک نئی زندگی اور ایک نئی روح عطا کی۔ اپولو تحریک سے متاثر شعراء کا مطالعہ کرنے سے سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعراء رومانیت کے دلدادہ ہیں اور ہمیشہ حزن و ملال ناامیدی و قنوطیت کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ خود روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلانا چاہتے ہیں۔ وہ دکھ درد کے علاوہ لوگوں کے درد کو بھی اپنے اندر محسوس کر کے اسے الفاظ کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ قدرت کے شاہکار اور فطرت کی صنّاعی کو وہ محض آنکھوں کو لبھانے والا منظر نہیں سمجھتے بلکہ وہ اسے اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ فطرت نے ان مناظر قدرت کے اندر کچھ ایسے راز پنہاں کر رکھے ہیں جن کا ادراک عام انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہے۔ اسی راز کی معرفت کی کاوش میں وہ حیران و پریشان ہیں۔ نیز اسی میں وہ فلسفۂ حیات ڈھونڈنے

ہیں۔ شعراء اپولو کے ذہنوں پر تجدد ایسا چھایا کہ انھوں نے عربی شاعری کا اہم جزء وزن وقافیے کو ترک کرکے آزاد نظم شعر مرسل اور شعر منثور تک پہنچ گئے۔ تحریک اپولو کا کوئی ایک خاص اور واضح مقصد نہیں تھا بلکہ وہ مستقل ایک مضبوط انقلاب اور محکم یقین بن کر کام کر رہی تھی۔ ایک ایسا انقلاب جس کا مقصد شعر کی آزادی اور اس کا کمال تھا۔ ایک ایسا یقین جس سے اس کے مقصد کی بلندی اور اس کی ابتدا کی برتری کا پتا چلتا ہے۔

حوالے

ل یاسین الایوبی۔ مذاہب الادب صفحہ ۲۸۰ ؎۲ احسان عباس فن الشعر صفحہ ۴۶

؎۳ احمد امین۔ النقد الادبی صفحہ ۳۲۹ ؎۴ ڈاکٹر اشفاق ندوی جبران خلیل جبران صفحہ ۱۴۱

؎۵ اشفاق ندوی۔ جبران خلیل جبران صفحہ ۱۸۰ ؎۶ ایضاً۔ صفحہ ۲۰۹

؎۷ مجلۃ الکویت۔ مجلۃ شہریۃ العدد ۱۲ صفحہ ۴۶

؎۸ عبد القادر۔ الاتجاہ الوجدانی فی الشعر العربی المعاصر صفحات ۹۷-۹۵

؎۹ J. Brugman - History of Arabic Lit. in Egypt , P. 56

؎۱۰ نسیم فاروقی۔ عربی شاعری صفحہ ۱۰۶

؎۱۱ ادونیس۔ الثابت والمتحول صفحہ ۱۰۹

؎۱۲ J. Brugman - History of Arabic Lit. in Egyot , P. 151

؎۱۳ ڈاکٹر عبد العزیز الدسوقی۔ جماعۃ ابولو اثرھا فی الشعر الحدیث

؎۱۴ ڈاکٹر عیسیٰ الناعوری۔ مجلۃ الکویت۔ بین تجدید صفحہ ۴۷ العدد ۱۲

؎۱۵ ڈاکٹر عبد المنعم خفاجی وغیرہ۔ الشابی ومدرسۃ ابولو صفحہ ۴۲

؎۱۶ ادونیس الثابت والمتحول صفحہ ۱۱۶ ؎۱۷ ایضاً۔ صفحہ ۱۱۷

؎۱۸ Modern Arabic Poetry 1800-1970, S.Morch,p.165

تبصرہ و تعارف

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

ماہ نامہ "ہمدرد نونہال" مدیر اعلیٰ: مسعود احمد برکاتی

ضخامت: ۲۸۸ صفحات قیمت: ۱۲ روپے

خاص نمبر ۱۹۹۲ء

ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد ڈاکخانہ، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

بچوں کے لیے لکھنا اور اس طرح کہ ان میں شوق پیدا ہو، وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی طرف مائل ہوں، وہ اپنے کو تلاش کریں اور آگے بڑھیں کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن "ہمدرد نونہال" نے اس کام کو واقعی آسان بنا دیا ہے۔ برصغیر میں "ہمدرد نونہال" بچوں کا مقبول ترین رسالہ بن گیا ہے۔ اسکی عمر تقریباً چالیس برس ہے اور اس کا ہر نیا شمارہ تازگی لے کر آتا ہے۔ بچے تو بچے بڑے بھی اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کہانیوں، مضامین اور نظموں کے ذریعہ یہ رسالہ بچوں کو اسلام، سائنس، صحت اور جدید معلومات کے موضوعات پر تازہ ترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس طرح بچہ اپنے زمانہ سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور خالی وقت میں اس کے مطالعہ سے اُسے ذہنی تفریح بھی گھر بیٹھے میسر آ جاتی ہے۔

اس وقت "ہمدرد نونہال" کا خاص نمبر ۱۹۹۲ء زیر تبصرہ ہے اس میں لکھنے والوں میں خاص طور سے صبا اکبرآبادی، حکیم محمد سعید، مسعود احمد برکاتی، قمر ہاشمی، حسن منظر، یوسف ناظم، خواجہ عابد نظامی، قدسیہ زیدی، ڈاکٹر سید اسلم، اشرف نوشاہی، رؤف پاریکھ، م ندیم، نجمہ خان، مرزا ظفر بیگ، عتیق الرحمان صدیقی، فتح علی انوری اور ڈاکٹر فرحت حسین کی تحریریں قابل تعریف ہیں۔ موضوع نئے ہیں اور لکھنے والوں نے بچوں کو ذہن میں رکھ کر اپنے موضوعات کو پیش کیا ہے اس لیے بچے ان میں ضرور دلچسپی لیں گے اور بار بار پڑھیں گے۔

برصغیر ہندوپاک کے نامور ادیبوں کے علاوہ نونہال ادیبوں نے بھی اس خاص نمبر میں قلم کے جوہر دکھائے ہیں جس سے یقین سا ہو جاتا ہے کہ بچوں کے ادب کا مستقبل اچھا ہی ہوگا۔ مدیر اعلیٰ مسعود احمد برکاتی نے زیر تبصرہ خاص نمبر کو گزشتہ برسوں کے خاص نمبروں سے بھی زیادہ پرکشش بنا کر پیش کیا ہے جس کے لیے وہ قابل مبارک باد ہیں۔ اس خاص نمبر کے ساتھ ایک تحفہ بھی جڑا ہوا ہے، ایک حسین آٹو گراف بک۔ امید ہے بچے اسے شوق سے لے کر گھومیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ بچے اور بڑے دونوں ہی "ہمدرد نونہال" کے اس خاص نمبر کو شوق سے پڑھیں گے اور اپنے کتب خانے میں محفوظ رکھیں گے۔

جبین انجم

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ اگست ۱۹۹۲ء | شمارہ ۸

فہرست مضامین

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی ــــ مطبوعہ: برٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سیّد جمال الدین

یونیورسٹیوں کا کام محض ایک طے شدہ نصاب تعلیم کے تحت تعلیم دینے اور علم کی جستجو کو فروغ دینے تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ قومی زندگی میں اس سے بھی زیادہ اہم کام ہیں جو یونیورسٹیوں کے حصّے میں آتے ہیں۔ لیکن عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ یونیورسٹیاں بندھے ٹکے ڈھرے پر ہی چلنے میں عافیت سمجھتی ہیں اور وہ کام جو نصاب تعلیم سے ہٹ کر تہذیب و ثقافت کے گوشوں کو چھوتے ہیں یا سماجی عمل سے متعلق ہوتے ہیں ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی یا ان کو ضمنی حیثیت دی جاتی ہے۔ آج جب کہ مذہب اور سیاست میں تشدّد کے رجحان نے متحدہ قوم کی تعمیر کو دشوار کن بنا دیا ہے تو ہمارا ذہن یونیورسٹیوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور خیال آتا ہے کہ متحدہ قوم کی تعمیر کو کیوں نہ یہاں انجام دیا جائے۔

مسلم دانش وروں کے ایک اہم طبقہ نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی متحدہ قومیت کے نظریہ کی پرزور حمایت کی۔ یہ دانشور مسلمانوں کے دو اہم اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ تھے اور ان اداروں کو وہ محض ڈگریاں تقسیم کرنے والے مراکز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ یہاں سے تعلیم اور علم کی جستجو کے علاوہ متحدہ قوم کی تعمیر کا کام بھی انجام دینا چاہتے تھے۔ انھیں توقع تھی کہ یہ کام ان اداروں سے بہتر کوئی اور نہ کر سکے گا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف آوری کے موقع پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے وائس چانسلر کی حیثیت سے کہا تھا کہ علی گڑھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے۔ یہ وہی کام تھا جو ذاکر صاحب اور ان کے ساتھی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کرتے رہے تھے۔ اس کام کی علی گڑھ میں داغ بیل ڈال کر ایک طرح سے ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کو فکری سطح پر مربوط و متحد کر رہے تھے۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں اور خاص طور سے اپنے زمانہ کے حالات دیکھ کر کہ یہ کام جامعہ اور علی گڑھ کو ضرور انجام دینا چاہیے اور ہم پورے اعتماد کے

ساتھ یہ سکتے ہیں کہ یہ کام ہم سے بہتر کوئی اور نہ کر سکے گا۔ لیکن یہ کام کیا ہے جس طرف ذاکر صاحب نے توجہ دلائی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

وہ کام ہندوستانی تدبّر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے، یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قومی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کا حصّہ اور مقام۔ کتنا بڑا کام ہے اور کیسا دلکش کام، یہ مختلف تمدّنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین وجمیل کُل کی تشکیل میں مدد دے۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی مشترک میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گم شدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالامال کرنا، سب کو مستقبل میں ایک جد وجہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین ہندوستانی زندگی کو صالح زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمے داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں، یا بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانہ نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟

سیکولر جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت کا حصّہ اور مقام طے کرنا معمولی کام نہیں ہے۔ اس کام میں سب سے بڑی دشواری ان لوگوں کی طرف سے آرہی ہے جو دوسروں سے نہ لینے اور خود اپنی تہذیبی میراث میں مذہب کی بنیاد کی غلط تعبیر و تفہیم کی بنا پر تخفیف اور قطع و برید کے عمل پر اصرار کرتے ہیں وہ ملّت کو قوم سے جدا تو کر سکتے ہیں ملا نہیں سکتے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ خدمت کا کوئی بھی کام ہو وسیع المشربی کے بغیر بے سواد رہ جاتا ہے۔ تفریق خدمت کرنے والوں کا مشرب نہیں ہو سکتا۔ تفریق نہیں اتحاد ہمارے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کے اہم ترین تعلیمی اداروں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نصب العین ہونا چاہیے۔

صغرا مہدی

مسافر کی ڈائری ۔ ایک جائزہ

خواجہ احمد عباس کا تعلق اس نسل سے تھا جس نے غلام ہندوستان میں آنکھ کھولی مغربی تعلیم حاصل کی اور ملک میں سماجی ابتری معاشی نابرابری اور حاکم قوم کے ظلم وستم کے عبرت ناک مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جمہوریت، سیکولرازم، لبرل ازم سوشلزم اور کمیونزم سے ان کی شناسائی ہوئی اور ان کے دل میں اس نظام کے خلاف جس نے ان کے ملک کو غلام بنا رکھا تھا بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے اور ان جذبات نے عمل میں ظاہر ہونے کے مختلف راستے تلاش کیے۔

عباس نے اپنے لیے صحافت کا انتخاب کیا۔ وہ اس راہ سے ملک کی جنگِ آزادی میں حصّہ لینا چاہتے تھے۔ وہ اس ہتھیار سے ہندوستان بلکہ دنیا میں ہونے والی ناانصافیوں و ظلم وستم سے لڑنا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ انتخاب ابتداء میں ہی بہت سوچ سمجھ کر کرلیا تھا جیسا کہ ان کے بڑے بھائی خواجہ غلام السیّدین نے اپنی خودنوشت "مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں" لکھا ہے[1]۔ "اس نے علی گڑھ کی تعلیم کے زمانے ہی میں طے کرلیا تھا کہ وہ جرنلزم کا پیشہ اختیار کرے گا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس میں بڑی عسرت اور آزمائشوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر مثلاً وہ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوجائے تو اس کا کامیاب ہونا تقریباً یقینی ہے۔ اس نے سو روپے ماہوار پر برسوں عبداللہ بریلوی کے ساتھ بمبئی کرانکل میں کام کیا۔ ایک چال نما کمرے میں کئی سال گزارے۔ لیکن دوسرے

---

[1] صفحہ ۲۸۹

ڈاکٹر صغرا مہدی، ریڈر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

(بالعموم حکومتی) اخباروں کی پیش کش کو جہاں کئی گنا تنخواہ زیادہ تھی قبول نہیں کیا۔"
اسی زمانے میں جب انھیں صحافی کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے چند سال ہوئے تھے انھوں نے اپنے محدود ترین وسائل کے ساتھ دنیا کے سفر کی ٹھانی۔ اس کا مقصد دوسرے ملکوں کے سیاسی اور سماجی حالات کا تجزیہ کرنا تھا اور اس کے پس منظر میں اپنے ملک کے حالات کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر یہ بھی کہ وہ جانتے تھے کہ قوم و وطن کے آگے بین الاقوامیت یا عالمگیر انسانیت کی منزل ہے اور جیسا کہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا کہ "میری قومیت کا تصور یہ ہے کہ میرا ملک آزاد ہو تاکہ ضرورت کے وقت سارا ملک دوسری قوموں کی زندگی کی خاطر مر مٹے۔"

عباس نے جب یہ سفر کیا تو وہ چوبیس پچیس سال کے تھے اور بحیثیت صحافی کے پہچانے جانے لگے تھے۔ یہ سفر ۲۸ جون ۱۹۳۶ء کو شروع ہوا اور ۲۴ نومبر ۱۹۳۶ء کو ختم ہوا۔ سترہ ملکوں کی سیر کی روئداد انھوں نے اپنی ایک مختصر کتاب "مسافر کی ڈائری" میں بیان کی ہے جو حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر نے ۱۹۴۰ء میں شائع کی۔ اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس کی قیمت ایک روپے ہے۔

میرے خیال میں عباس کی یہ اہم تصنیف ہے۔ اس لحاظ سے کہ ان کو پڑھ کر ان کی شخصیت، ان کی دلچسپیوں، ان کے خیالات اور مستقبل میں جو کام وہ کرنا چاہتے تھے جوان کے منصوبے تھے۔ اس سفرنامے میں ان کی نشان دہی بخوبی ہو جاتی ہے۔ اپنے ملک ہندوستان سے ان کو کس قدر گہرا لگاؤ ہے۔ اس کی ابتر حالت پر ان کے دل میں کس قدر غم و غصہ ہے۔ اس کے ساتھ دنیا کے عام لوگوں، خاص طور سے ان مصیبت زدہ لوگوں کے لیے جو سماجی نابرابری اور طاقتور قوموں کے جبر و استحصال کا شکار ہیں۔ ان کے دل میں کتنی ہمدردی ہے۔ کس طرح دردمندی کا یہ جذبہ حب الوطنی سے عالمگیر بھائی چارے اور مساوات کے تصور سے جا ملتا ہے۔

عباس کتاب کے دیباچے ہی میں یہ بات صاف کر دیتے ہیں کہ "اس سفر کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میں دنیا اور دنیا کے ملکوں کے متعلق کتنا کم جانتا ہوں"[1] اور یہی احساس

---

[1] مسافر کی ڈائری، صفحہ ۴

ان کے سفر کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

سفر کا مقصد ملکوں کی تاریخی جغرافیائی اقتصادی معلومات حاصل کرنا نہیں۔ یہ معلومات تو کتابوں سے بھی حاصل کی جاسکتی ہیں اور ایک سیاح جو ایک صحافی بھی ہو اس کے لیے یہ معلومات حاصل کرنا کافی بھی نہیں ہیں جیسا کہ عباس نے مسافر کی ڈائری کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ جاپان میں ریل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا رہے تھے ان کے ہمسفر جاپانی کا اصرار تھا کہ ریل کی کھڑکیاں بند رہیں اور یہ کھڑکیاں کھلی رکھنا چاہتے تھے جیت ان کی ہوئی اور بقول ان کے "بعض لوگ ریل اور دماغ کی کھڑکیاں بند کر کے سفر کرتے ہیں۔ اس سفر میں میں نے کچھ کیا یا نہیں۔ یہ دونوں کھڑکیاں کھلی رکھیں اور کھڑکیوں سے میں نے کیا دیکھا وہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔"[۱]

اس کتاب کو پڑھ کر ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ۱۹۳۸ء میں ان سب ملکوں کا سفر عباس کے ساتھ کر رہے ہیں جن میں کئی حسین اور خوبصورت مناظر بھی ہماری نظروں سے گزرتے ہیں بدنما اور بھدے سین بھی۔ اور نائٹ کلبوں اور قحبہ خانوں میں بھی ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں اور رقصِ عریاں بھی دیکھتے ہیں اور وہاں عورتوں کی تذلیل پر اپنا سر شرم سے جھکتا محسوس کرتے ہیں اور عباس اس کا ذمہ دار سرمایہ داری نظام کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم ان ملکوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال سے بھی واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ ادیبوں سے بھی ملاقات ہوتی اور لیڈروں سے بھی۔ وہاں ان کی ملاقات ایک ایسی امریکن عورت سے ہوتی ہے جو ڈائننگ کار میں ان کو اس لیے نہیں بیٹھنے دیتی تھی کہ وہ ان کو نیگرو سمجھتی ہے اور جب ریل کا عملہ اس کو یقین دلاتا ہے کہ وہ نیگرو نہیں تو وہ اجازت دیتی ہے مگر عباس احتجاجاً ان کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اسی امریکہ میں ان کی ملاقات ایک ایسے امریکن سے ہوتی ہے جو ہندوستان سے سخت دلچسپی رکھتا ہے اور جو ان کے ذریعے ہندوستانیوں کو یہ پیام بھجواتا ہے کہ وہ ان کے ملک کی آزادی کا خواہاں ہے۔

[۱] صفحہ ۵۔

شنگھائی میں ہاتھ سے کھینچنے والا رکشہ دیکھ کر شملہ نینی تال اور مسوری کی یاد آتی ہے اور ان لوگوں پر وہ تاسف کرتے نظر آتے ہیں جن سے اس ترقی یافتہ دور میں یہ مشقت کرائی جاتی ہے مگر چین میں عورتوں کی آزادی ترقی اور بہادری سے متاثر ہوتے ہیں۔

مسافر کی ڈائری پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ عباس ہمارے گائڈ نہیں ہم سفر ہیں۔ ذہین دلچسپ اور گہرا مشاہدہ کرنے والے ہم سفر۔ اور وہ ملکوں کی سیر کراتے وقت اپنا تبصرہ اور تجزیہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں بھولتے کہ ان کا ملک غلام ہے اور اس احساس کے ساتھ ان کی نظر اس نکتہ پر بھی ہے۔ وہ سب ملک جو دوسری قوموں اور ملکوں کو محکوم بناتے ہیں ان میں کس غضب کی مماثلت ہے اور دوسرے اقوام کو محکوم بنانے کی تاویلیں بھی یہ ایک ہی پیش کرتے ہیں۔

وہ جب ہالی وڈ جاتے ہیں وہاں بنائی جانے والی ایک فلم "گنگا دین" کو دیکھ کر وہ برافروختہ ہو جاتے ہیں کہ اس میں ہندوستانیوں کی تذلیل کی گئی ہے اور ہندوستان کی غلط تصویر پیش کی گئی ہے اور وہ وہاں ہی یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اگر ان کے بس میں اس فلم کو بننے سے روکنا نہیں ہے تو کم از کم ہندوستان میں اس کی نمائش نہ ہو اس کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستان آکر اس کی کوشش کرتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں اور جب ہالی وڈ میں ان سے تقریر کی فرمائش کی جاتی ہے تو وہ وہاں بھی اپنی تقریر میں اس فلم پر سخت الفاظ میں احتجاج کرتے ہیں۔

"مسافر کی ڈائری" ایک ایسا سفرنامہ ہے اور ڈائری کی فارم میں لکھا گیا ہے اور اس میں ہر جگہ ایک صحافی کا زاویۂ نگاہ ملتا ہے مگر اس کے اندر چھپا ہوا ادیب بھی کہیں کہیں جھانکتا رہتا ہے۔ زبان و بیان میں سادگی اور واقعیت ہے مگر انداز بیان غیر دلچسپ نہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے خوبصورت انداز میں مناظر کی عکاسی اس طرح کی ہے جس سے ہم خود کو اس فضا میں پاتے ہیں جیسے جاپان میں موجی کے مقام کی منظر نگاری اس طرح کرتے ہیں۔ "سورج پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور کنارے کی روشنیوں کا عکس سمندر پر عجب پر کیف مناظر پیش کر رہا تھا۔ آسمان

پر ہلکے ہلکے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے جیسے جاپانی مصوری کے نمونوں میں اکثر نظر آتا ہے۔ میں اس خوبصورت منظر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا" یہ اور بات ہے کہ ان منظر کی طرف ان کی توجہ کم ہے بلکہ اس طرح کے مناظر کی توجہ اپنی طرف زیادہ کھینچی ہے جیسے "صبح سویرے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ریل سرنگوں سے گزر رہی ہے۔ پہاڑ کی سرنگوں کا شہر کے نیچے نیچے ریل کی لائنوں کا جال بچھا ہے۔ کہیں کہیں ریل زمین کی سطح پر آ جاتی ہے اور شہر کا حصہ نظر آتا ہے۔ دھواں، کارخانے چمنیاں کالے کالے مکان۔ غربت زدہ آبادی مزدوروں کے غول کے غول کارخانوں کی طرف جاتے ہوئے یہ ہے نیو یارک کا پہلا منظر جو میں نے دیکھا۔ ہر شہر میں داخل ہونے کے کئی راستے ہیں مثلاً بمبئی میں اگر سمندر کے راستے داخل ہوں تو دور سے تاج محل اور فورٹ کی شاندار عمارتیں نظر آئیں گی مگر جب ریل سے آتے ہیں تو سب سے پہلے دادر اور پریل کے مزدوروں کے گندے اور اندھیرے مکان نظر آتے ہیں۔ اس طرح میں نیو یارک میں غلط راستے سے داخل ہوا۔ اگر سمندر کے راستے آتا تو میلوں دور سے آزادی کا شاندار بت نظر آتا۔ شہر کی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں بندرگاہ میں بڑے بڑے پہاڑ کھڑے نظر آتے ہیں میں نے نیو یارک کا تاریک پہلو بھی دیکھ لیا۔ شاید کسی شہر کو دیکھنے کا یہی بہتر طریقہ ہے"[1]

آپ نے دیکھا کہ اس میں عباس کا مخصوص انداز تحریر نمایاں ہے اور اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ دوران سفر مختلف ملکوں کو انھوں نے کس طرح دیکھا۔ کہیں کہیں واقعات کو بہت دلچسپ انداز سے بیان کرتے ہیں جس میں کہیں طنز اور مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہے۔ میں نے اس سفر نامہ کو دلچسپ اور پر لطف بنا دیا ہے۔ امریکہ میں ریڈیو اسٹیشن کے ذکر میں وہاں اشتہاروں کی بھرمار اور بے تکے پن کا ذکر اس طرح کرتے ہیں " مثلاً میری تقریر کرتے ہوئے اناؤنسر نے کہا ابھی ابھی آپ نے خواجہ احمد عباس کی تقریر سنی جو ہالی وڈ کی سیر کو ہندوستان سے آئے ہیں اگر آپ ہندوستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں۔ فلاں سفر ایجنسی سے آپ کو سب ضروری اطلاعات مل سکتی ہیں۔ اگر آپ کو ہندوستانی مصنوعات سے دلچسپی ہے تو فلاں دکان پر ملے گا" یہی نہیں بلکہ یہاں تک " ہمارے یہاں پُر بہار پُر فضا قبرستان میں اپنے عزیزوں کو دفن کرائیں۔ عباس نے اپنے سفر نامے میں بے جا طوالت سے کام نہیں لیا بلکہ چند جملوں بلکہ کہیں چند الفاظ میں واقعات اور مناظر کو بیان کیا ہے اور ایسے بلیغ اور معنی خیز اشارے کیے ہیں کہ ہم مشاہدے کی گہرائی کے قائل ہو جاتے ہیں بلاشبہ مسافر کی ڈائری ایک اچھا سفر نامہ ہے۔

---
[1] صفحہ ۱۱۹

ریحانہ خاتون

داراشکوہ — مشترکہ تہذیب کا ترجمان

مغل شہزادہ داراشکوہ اتحاد باہمی اور قومی یکجہتی کا علمبردار تھا اور مذہبی خیالات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تہذیب کو بڑھاوا دینے میں اس کا نمایاں حصّہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مشہور مصنف، شاعر اور مترجم بھی تھا۔ سِرِ اکبر نام سے اس نے پچاس اپنشدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ یہ کام بہت مشکل تھا لیکن اس نوجوان شہزادے نے اس کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس نے ہندو اور اسلام دونوں مذاہب کے عقائد کا تقابلی مطالعہ کیا اور غالباً اس طرح کی یہ پہلی کوشش ہے جو ہندوستان میں آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل کی گئی۔

داراشکوہ ۱۰۲۸ھ/ ۱۶۱۵ء میں اجمیر میں ساگر تال جھیل کے قریب پیدا ہوا۔ جب یہ تیرہ سال کا تھا تو اس کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل عالم مقرر کیے گئے جن سے اس نے قرآن مجید، حدیث اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے ابتدائی دور کے استادوں میں ملاّ عبداللطیف سلطان پوری کا نام سب سے پہلے آتا ہے جن کی تربیت میں وہ طویل عرصے تک رہا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس شاہزادے نے اپنی کسی تصنیف میں ملا شاہ عبداللطیف سلطان پوری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سکینۃ الاولیاء سے ان کے ایک اور استاد شیخ احمد دہلوی کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں جن سے اس نے کسب فیض کیا تھا۔ مغل شاہزادوں کے لیے خوش نویسی اور مصوری کی تعلیم بھی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ داراشکوہ کے لیے بھی ان علوم کے سیکھنے کا بھی معقول انتظام کیا گیا۔ خوش نویسی کی تعلیم اس نے ملاّ عبدالرشید سے حاصل کی۔ ملاّ عبدالرشید میر اعماد قزوینی کے شاگرد تھے جن کی برابری نستعلیق میں کوئی

---

* ڈاکٹر ریحانہ خاتون، لکچرر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

دوسرا نہیں کرسکتا تھا۔ داراشکوہ نے اس علم کو آگے بڑھایا اور یہ خوشی کی بات ہے کہ اس کی تحریروں کے نمونے آج بھی دستیاب ہیں۔ اس کے مصوری کے استاد کا نام بھی کسی دستیاب ماخذ سے معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ علم کسی نہ کسی استاد سے ضرور سیکھا ہوگا اور اس کے استاد شاہجہاں کے دربار سے ضرور وابستہ رہے ہوں گے۔

داراشکوہ کی تصانیف میں اس کی سب سے پہلی تصنیف سفینۃ الاولیاء ہے جو ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں تکمیل ہوئی جب وہ محض پچیس سال کا تھا۔ اس کی دوسری تصنیف سکینۃ الاولیاء ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں لکھی گئی جب کہ وہ اٹھائیس سال کا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں رسالۂ حق نما، حسنات العارفین، مجمع البحرین، سرّ اکبر، ایک دیوان، صوفیانہ خطوط، طریقۃ الحقیقۃ یا رسالۂ معارف، مکالمۂ داراشکوہ و بابالال، حکمت ارسطو، وہ پند ارسطو، مثنوی سلطان ولد اور داراشکوہ کے مرقعے خاص طور پر قابل ذکر ہیں

داراشکوہ کا میلان ابتدا سے ہی تصوف وعرفان کی طرف تھا، چنانچہ اس کے اس میلان کو جلا اس وقت ملی جب اس کی ملاقات اپنے باپ شاہجہاں کے ساتھ دو مرتبہ حضرت میاں جیو سے ہوئی۔ ان کی گفتگو سے اس کے دل پر تصوف اور عرفان کے مسائل واضح ہوتے تھے۔ اس نے ان ملاقاتوں کا تفصیلی ذکر اپنی دونوں کتابوں سفینۃ الاولیاء میں اختصار کے ساتھ اور سکینۃ الاولیاء میں نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اسی وقت سے قادریہ سلسلے میں داخل ہوا اس لیے کہ میاں جیو کا تعلق اسی سلسلے سے تھا۔ سفینۃ الاولیاء میں داراشکوہ رقم طراز ہے:

"و این فقیر دو بار بملازمت شریف، ایشان رسیدہ بود و حضرت ایشان کمال مہربانی و عنایت خاص بمن داشتند چنانچہ درسن بیست و یک سالگی مرابیاری روی داد کہ اطباء از معالجۂ آن درماندند۔ چون بادشاہ بخانۂ ایشان رفتہ، دست مرا گرفتہ، گفتند: ایں پسر کلان ما است، و اطباء از معالجہ ایں درماندہ اند توجہ فرمائید کہ حق تعالیٰ این را ببخشند۔ ایشان کاسۂ آب را طلب داشتہ و دعا بر آن خواندہ، دمیدند و بہ فقیر دادند۔ چون آن را آشامیدم،

درآن هفته صحت کامل یافتم و بالکل آن آزار برطرف شد۔ چون پیش از این رساله ای در احوال و اوضاع آن حضرت و پیر و مریدان ایشان بتفصیل نوشته بود، دراین کتاب همین قدر اکتفا نموده[۱]

(اور یہ ناچیز دوبارہ ان کی خدمت میں گیا اور حضرت نے کمال مہربانی اور خاص عنایت مجھ پر کی۔ چنانچہ اکیس سال کی عمر میں بیماری میں مبتلا ہوگیا تھا کہ طبیب علاج کرنے سے عاجز رہ گئے۔ جب بادشاہ میرا ہاتھ پکڑ کر ان کے گھر لے گئے اور کہا کہ یہ میرا سب سے بڑا لڑکا ہے اور طبیب اس کے علاج سے معذور ہیں۔ آپ توجہ فرمائیں اور دعا کریں کہ حق تعالیٰ اس کو بخش دے۔ انھوں نے پانی کا پیالہ طلب کیا اس پر دعا پڑھ کر دم کی اور مجھ ناچیز کو دیا۔ جب میں نے اس کو پی لیا، اسی ہفتہ میں مکمل صحت یاب ہوگیا اور وہ بیماری قطعی طور پر دور ہوگئی۔ چونکہ اس سے پہلے رسائل میں ان کے اوصاف اور احوال پر اور ان کے پیر اور مریدوں پر بہت تفصیل سے لکھا ہوا تھا اسی لیے اس کتاب میں اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔)

میاں جیو ۱۰۴۵ھ/۱۶۳۲ء میں فوت ہوگئے۔ میاں جیو سے ملاقات کے بعد دارا شکوہ قادریہ سلسلے کے صوفیوں سے ارتباط بڑھاتا ہے۔ ان صوفیوں میں شیخ میرک خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کے بارے میں اس نے سفینۃ الاولیاء میں خاصی تفصیل اور وضاحت سے ذکر کیا ہے اور ان کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو اپنے بزرگ استاد سے خاصی عقیدت تھی۔ ۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء میں وہ کشمیر گیا اور وہاں اس کی ملاقات شاہ بدخشانی سے ہوئی۔ وہ ان کا مرید ہوگیا۔ سکینۃ الاولیاء میں اپنی اس ارادت کا ذکر اس طرح کرتا ہے:۔

"ونسبت ارادت این فقیر، اگرچه از ابتدا در زمرهٔ بندگان آستان قدس نشان حضرت غوث الثقلین ابومحمد شاه محی الدین سید عبدالقادر جیلانی داخل است، رضی الله عنه، و از اوان طفولیت تا امروز که به بیست سالگی

رسیدہ در جمیع احوال وھمہ اوقات باطناً از روح مقدس منور آن حضرت رضی اللہ عنہ تربیت یافتہ ودر ھمہ جا وھمہ وقت مدد ومعاونت نمودہ اند، ودر واقعہ ھا این بندہ شرمندۂ خود را بزانو خود نشاندہ، تربیت فرمودہ اند، وامیدوار است کہ بعد از این نیز در دنیا و آخرت، دستگیر این فقیر باشند۔"[۲]

(اس فقیر کی ارادت اگرچہ ابتدا سے ہی حضرت غوث الثقلین ابومحمد شاہ محی الدین سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے آستانہ مبارک سے بہت زیادہ ہے، اور عہد طفولیت سے آج تک جب کہ بیس سال کی عمر ہو چکی ہے۔ اس مقدس منور حضرت رضی اللہ عنہ کی روح باطنی اور جمیع احوال سے تربیت حاصل کی، اور ہر جگہ اور ہر وقت مدد فرمائی ہے، اور اکثر اس شرمندہ بندہ کو اپنے زانو پر بٹھا کر تربیت فرمائی ہے، امید کرتا ہوں کہ اس کے بعد بھی دنیا اور آخرت میں اس فقیر کے دستگیر ہوں گے۔)

ملا شاہ دارا شکوہ کی بڑی قدر کرتا تھا۔ ایک غزل میں اس نے اس کی بہت تعریف کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارا شکوہ نے تصوف و عرفان کے کتنے ہی منازل طے کر لیے تھے۔ اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ای بے خبر، ز عالم راز نہان دل
روزی شود ترا کہ شوی ھمزبان دل

دانستہ ای ز مرتبۂ دل کہ چیست دل
ای بیخبر ز مرتبۂ لامکان دل

شاھنشھی ملک حقیقت مسلم است
تا کیست محرم حرم آستان دل

بنوشتہ شد ز آفت صیاد در نجات
مرغی کہ جا گرفت در آن آشیان دل

دل خواہ راہ دل ز فلک معاست برترآن
داماں مردمی شود نرد بان دل

شاہ جہاں عالم تن نیست شاھین
شاہ جہانست کو مشدہ شاہ جہان دل

صاحب قران اول وثانی قرین جیست
دارا شکوہ ما شدہ صاحبقران دل

آخرز کائنات متاع دو کون را
کر داو بدست خود زمتاع دکان دل

گر جزء کل شود چہ عجب ذرہ آفتاب
شد پادشاہ کل کہ شد او پاسدان دل

توفیق یافت صاحب دل شد ز علم شاہ[۱۳]
خود نیک گشت واقف سود و زیان دل[۱۴]

ملا شاہ اور دارا شکوہ کے درمیان مکاتبت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان مکاتیب میں عرفانی اور صوفیانہ مسائل پر بحث و مذاکرہ ہوا کرتا تھا۔

دارا شکوہ صوفی تھا اور تصوف میں خاص رجحان رکھتا تھا۔ صوفی بزرگ میاں میر اور بابا لال داس بیراگی سے بھی بہت متاثر تھا۔ وہ صوفیوں کے قادریہ سلسلے سے تعلق رکھتا تھا جس کی بنیاد حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے ڈالی تھی۔ یہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ اس کی دونوں کتابیں سفینۃ الاولیاء اور سکینۃ الاولیاء صوفیانہ ادب میں بلند مقام پر فائز ہیں۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ اس نے اپنے وقت کے مشہور صوفیوں سے گہرا تعلق قائم کر رکھا تھا۔ قادریہ مشائخ کے علاوہ دوسرے بزرگوں سے بھی عرفان کے دقیق مسائل سیکھنے کا مشغلہ جاری رکھا تھا یہاں تک کہ مجذوبوں کے ساتھ بھی اس کی نشست و برخاست رہتی تھی چنانچہ سرمد سے بھی اس کو خاص عقیدت تھی جن کو اورنگ زیب نے اپنے عہد سلطنت میں قتل کرا دیا تھا۔ دارا شکوہ ہندی سنتوں سے بھی خاصی عقیدت رکھتا تھا جنھوں

نے اس کی زندگی کو ایک نئے رخ کی طرف موڑ دیا تھا، جس کے نتیجے میں اس نے ہندو اور مسلمان دونوں مذاہب میں اتحاد اور یکجہتی کے مشترکہ عناصر کی تلاش و جستجو کی۔ اس کی زندگی میں الہ آباد اور بنارس کی صوبیداری بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہیں اس نے ہندو مذہب اور ہندو مسلک کا عمیق مطالعہ کیا اور عرفانی مدارج طے کیے۔ جیسے جیسے اس کا مطالعہ اور تحقیق بڑھتی جاتی تھی اتنا ہی اس کی تلاش و جستجو کا شوق اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہندو صوفی بھی مخصوص مشرب اور مکتب سے تعلق رکھتے ہیں اور موحد کامل ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں نہایت دقیق اور اہم ہوتی ہیں۔ اسی بنا پر اس کا رابطہ و بید شناسوں اور سنیاسیوں سے گہرا ہو گیا تھا۔ اس تعلق سے اس پر یہ عقدہ کھلا کہ ہندو اور اسلام مذہب میں قدر مشترک کی تلاش ممکن ہے۔ اس عقیدے کے تحت اس نے ہندو مذہب اور ان کی عرفانی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جس کا نتیجہ مجمع البحرین کی تالیف کی شکل میں رونما ہوا۔ وہ اپنی تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندو صوفیوں اور مسلمان عارفوں میں بنیادی اختلاف کوئی نہیں ہے۔ جیسا کہ مجمع البحرین کے مقدمے سے ظاہر ہوتا ہے۔

"چنین می گوید فقیر بی حزن و اندوه داراشکوه بن شاہجہاں بادشاہ کہ بعد از دریافت حقیقت الحقائق و تحقیق رموز و دقائق مذہب برحق صوفیہ و فائز گشتن باین عطیۂ عظمیٰ درصدد آن شد کہ درک کند مشرب موحدان ہند و محققان این قوم و کاملان ایشان کہ بنہایت ریاضت و ادراک و فہمیدگی و غایت تصوف و خدایابی رسیده بودند، مکرر صحبت داشت و گفتگوی نمود، جز اختلاف لفظی در دریافت و شناخت حق تفاوتی ندید، این جہت سخنان فریقین را باہم تطبیق داده و بعضی از سخنان کہ طالبان حق را دانستن آن ناگزیر و سود مند است فراہم آورده رسالہ ای ترتیب داده است۔"[۵]

(ناچیز بی حزن واندوه داراشکوہ بن شاہجہاں بادشاہ اس طرح کہتا ہے کہ صوفیوں کی حقیقت کو دریافت کرنے اور مذہب کے دقیق رموز کی تحقیق اور ان

کے اس عطیۂ عظمیٰ پر فائز ہونے کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کے توحید پرستوں اور اس قوم کے محققین جو بہت زیادہ ریاضت اور تصوف کی انتہا کی وجہ سے خدا تک پہنچے ہوئے تھے ان کی صحبت میں بار بار بیٹھا اور ان سے گفتگو کی۔ اس عاجز نے حق کی شناخت کے بارے میں لفظی اختلاف کے علاوہ اور زیادہ فرق نہیں دیکھا۔ اس وجہ سے فریقین کی گفتگو کو آپس میں مطابقت دے کر اور جن کا جاننا طالبان حق کے لیے ناگزیر تھا ان سب کو یکجا کر کے اس رسالے کو ترتیب دیا ہے)۔

۱۰۶۵ھ/۴ ۱۶۵ء میں جب کہ داراشکوہ کی عمر بیالیس سال کی تھی مجمع البحرین کی تصنیف عمل میں آئی۔ اس نے اس کتاب میں اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ ان دونوں بڑے مذاہب میں جو قدریں مشترک ہوں وہ واضح کر دی جائیں۔ یہ کتاب اس بیت سے شروع ہوتی ہے:

بنام آن کہ او نامی ندارد	بہر نامی کہ خوانی سر برآرد[۱۹]

(یہ کتاب اس خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جس کا کوئی مخصوص نام نہیں بلکہ جس نام سے بھی اس کو پکارو وہ متوجہ ہوتا ہے۔)

اور وہ پھر لکھتا ہے:

"حمد موفور یگانہ ای را کہ دو زلف کفر و اسلام را کہ نقطۂ مقابل ھم اند بر چہرۂ زیبای بی مثل و نظیر خویش ظاھر گردانیدہ و ہیچ یک از آنہا را حجاب رخ نیکوئے خود نساختہ"

کفر و اسلام در رھش پویان	وحدہٗ لاشریک لہٗ گویان

در ھمہ اوست ظاہر، ھمہ از اوست جلوہ گر۔ اول اوست و آخر اوست

ھمسایۂ ھمنشین و ھمرہ ھمہ اوست	در دلق گدا و اطلس شہ ھمہ اوست

در انجمن فرق و نہان خانہ جمع	باللہ ھمہ اوست، ثم باللہ ھمہ اوست

(اس خدائے واحد کی بے انتہا حمد و ثنا کے بعد جس نے کفر و اسلام کی دو

زلف کو جو ایک دوسرے کے مقابل نکتے بھی ہیں بے مثل اور بے نظیر انداز
میں ظاہر کیا اور ان میں سے کسی کو بھی اپنے رخ کا حجاب نہیں بنایا۔
کفر اور اسلام خدا کی ذات ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، کہتے ہوئے
اسی کے راستے کی طرف دوڑ رہے ہیں۔
ہر چیز سے وہ ظاہر ہے اور ہر چیز میں وہ جلوہ گر ہے۔ اول بھی وہی ہے
اور آخر بھی وہی ہے۔
ہمنشین کا ہمسایہ اور سب کا ہمراہی وہی ہے۔ گدا کی گدڑی اور بادشاہ
کی اطلس اسی سے ہے۔ انجمن فرق و نہاں میں خدا کی قسم اسی کا اجتماع ہے
اور خدا کی قسم وہی ہے)۔

گویا مجمع البحرین ایک ایسا نمونہ ہے:
"مجمع البحرین نمونہ ای از در آمیختن در فرہنگ اسلام و ہندو در ہندوستان
می باشد"
(مجمع البحرین ہندوستان میں فرہنگ اسلام و ہندو تمدن کی آمیزش کا
ایک نمونہ ہے)۔

مجمع البحرین کی تالیف کے دو سال بعد وہ اپنشدوں کے ترجمے کی طرف متوجہ ہوا۔
اس نے پچاس اپنشدوں کا ترجمہ اپنی وفات سے دو سال قبل ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء میں دلی
میں کیا۔ یہ ترجمہ سرِ اکبر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بھی اس کا مطمح نظر
ان مشترک عناصر کی تلاش و تحقیق تھا جو اسلام اور ہندو مذہب میں پایا جاتا ہے۔
اس ترجمے کے سلسلے میں اس نے پنڈتوں اور سنیاسیوں سے بڑی مدد لی۔ جیسا کہ اوپر
ذکر کیا جا چکا ہے کہ بنارس اور الہ آباد کی صوبیداری کے وقت اس کو ہندو مذہب اور ہندو
مسلک کو سیکھنے اور سمجھنے کا بڑا موقع ملا۔ وہیں اس کی دوستی پنڈتوں اور سنیاسیوں
سے ہوئی۔ ان سے شاہزادہ کو بڑی عقیدت ہوئی۔ وہیں اس نے سنسکرت زبان
سیکھی۔ اس طرح جب وہ ترجمے کے کام میں مشغول ہوا تو اس کام کو آسانی سے

پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔

دارا شکوہ اگرچہ مذہب اسلام کا پیرو اور پیغمبر اسلام کا معتقد تھا اور قرآن کریم کو آخری آسما
کتاب جانتا تھا لیکن چونکہ وہ صوفی تھا اس لیے اس نے سرِ اکبر میں لکھا ہے کہ اس کی نظر وحدت
ذات کی اصل پر تھی نہ کہ عربی، سریانی، عبرانی اور سنسکرت زبانوں پر، اس لیے اس نے چاہا کہ ا
اپنشدوں کا فارسی زبان میں بے کم و کاست اور ٹھیک ٹھیک عبارت میں ترجمہ کر کے سمجھا جا
یہ اپنشد توحید کے گراں بہا خزانے ہیں اور ان کے جاننے والے اس قوم (ہندو) میں بھی بہت
کم ہیں' اور ان اپنشدوں کو مسلمانوں سے اس قدر پوشیدہ رکھنے کا راز کیا ہے، اس
تحقیق کی جائے۔ دارا شکوہ کا اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا مقصد بھی وہی ہے جو مجمع البحرین
کا تھا۔ یعنی اسلام اور ہندو مذہب کے مابین اجزائے مشترک کی تلاش۔ چنانچہ ترجمے کے
مقدمے میں اس نے اس بات کو وضاحت سے لکھا ہے کہ ۱۰۴۹ھ/ ۱۶۳۹ء میں جب وہ کشمیر
پہنچا تو خدا کی مہربانی سے اس کو موحد حقیقی اور عارف کامل پیر پیران پیشوای پیشوایاں
حضرت ملا شاہ بدخشانی کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہوئی۔ چونکہ اس کو عارفوں کے ہر گروہ
کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہو چکا تھا اور تصوف کی اکثر کتابیں اس کی نظر
سے گزر چکی تھیں اور ان سے متعلق وہ کتابیں بھی لکھ چکا تھا۔ اس سے اس کی توحید کو
جاننے کی تشنگی بڑھتی جاتی تھی اور دقیق مسائل اس کے ذہن میں ابھرتے رہتے تھے
جن کا حل سوائے کلام الٰہی کے کسی اور طرح ممکن نہ تھا' اور چونکہ قرآن کریم میں اکثر رموز
ہیں اور ان رموز کو جاننے والے کمیاب ہیں تو اس نے چاہا کہ وہ ساری آسمانی کتابوں
کا دقیق مطالعہ کرے تاکہ یہ رموز اس پر واضح ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے توراۃ، انجیل، زبور
اور دوسرے صحائف کا مطالعہ کیا۔ ان سب میں توحید کا بیان مجمل (مختصر) تھا۔ پھر اس
نے ہندوستان کے مروجہ توحید کی طرف توجہ کی تو اس کو معلوم ہوا کہ یہاں کے مذہب
میں توحید کا بیان مفصل طور پر ملتا ہے۔ ہندوستان کے قدیم علماء کو خدا کی وحدت پر
عقیدۂ کامل تھا۔ اس بنا پر ان کے بارے میں جو اشخاص کفر کا فتوا دیتے ہیں، وہ اعتبار
کے لحاظ سے ساقط ہیں، اس لیے کہ وہ بالکل موحد ہیں اور ان کا عقیدۂ توحید اسی طرح

راسخ اور ناقص ہے جیسا کہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کی چار آسمانی کتابوں یعنی رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر و وید جو یہاں کے نبیوں پر نازل ہوا' ان نبیوں میں برھما سب سے بڑا تھا جیسا کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے بنی آدم صفی اللہ ہیں۔ یہ بیان قرآن مجید کی اس آیت پر مبنی ہے جس کا مفہوم یہ ہے:

"دکوئی قوم ایسی نہیں ہے کہ جس میں نبی نہ آئے ہوں۔"

خلاصہ یہ کہ یہ چاروں کتابیں جس میں سلوک اور توحید کے سارے مسائل مندرج ہیں ان کو اپنشد کہتے ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں نے الگ الگ ویدوں کی تشریح بڑی تفصیل سے کی ہے (وید کی تفسیر اپنشد کہی جاتی ہے)۔ اس ترجمے کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ یہ سنسکرت زبان سے فارسی زبان میں پہلا ترجمہ ہے۔

۲۔ یہ قابل اعتبار ترجمہ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مترجم یعنی داراشکوہ بہت ذہین تھا اور اس کو پنڈتوں اور ترجمہ کے کام میں سنیاسیوں کی مدد حاصل تھی۔

۳۔ داراشکوہ فارسی زبان میں بڑا ماہر تھا۔ اس کے زمانے میں فارسی زبان سرکاری زبان تھی۔ خود اس کی فارسی زبان میں جگہ جگہ ہندوستانی جھلک نظر آتی ہے داراشکوہ نے جن تشریحی کلمات کا استعمال کیا ہے وہ خالص اسلامی ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو مذہب اور اسلام میں جو اعتقادات مشترک ہیں' وہ لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں۔ اس نے خاص طور سے ہندوؤں کے مشہور مذہبی گرنتھوں کا فارسی میں اس لیے ترجمہ کیا کہ جس سے مسلمان فارسی کے ذریعے ہندوؤں کے مذہبی نقطۂ نظر اور رسم و رواج کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

یوں تو داراشکوہ کی اکثر تصانیف جن کا تعلق تصوف اور عرفان سے ہے اس سے اس کی وسیع مشربی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے لیکن مجمع البحرین اور سرِ اکبر اس کی ایسی

کوششیں ہیں جن کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے ۔ یہ ایک ایسے نوجوان شہزادے کی تصانیف ہیں جو محض اپنی خواہش سے اس بات کے درپے ہوتا ہے کہ ان دونوں مذاہب میں مشترک عناصر موجود ہیں اور جو دوری ان دونوں مذاہب کے درمیان پیدا ہوگئی ہے وہ ان کے عالموں کے محدود مطالعے اور محدود نقطۂ نظر کی بنیاد پر ہے۔

مختصر یہ کہ میری محدود معلومات کی حد تک عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی کوئی ایسی تصنیف اب تک دستیاب نہیں ہوئی ہے جس میں اسلام اور ہندو مذاہب کی بابت اس طرح کی گفتگو کی گئی ہو اور دونوں مذاہب کے مشترک اجزاء کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہو جیسا کہ داراشکوہ نے مجمع البحرین اور سرّاکبر میں پیش کیا ہے۔ اس کی یہ تصانیف فارسی زبان میں ہیں ۔ فارسی اس کے اظہار خیال کا وسیلہ تھی اس لیے کہ فارسی زبان کی یہ تخصیص ہے کہ اس میں ہندوستان کی دو اہم فرہنگوں (اسلام اور ہندو مذہب) میں متحد عناصر کی تلاش کے سلسلے کا اس قدر اہم مواد موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ داراشکوہ کی یہ وسیع المشربی علماء کو پسند نہ تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ بعض جگہ داراشکوہ کی توجیہات غیر قابل قبول نظر آتی ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی زبان میں ایسے موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے اور اس طرح کا وافر مواد اس زبان میں موجود ہے جس سے نہ صرف ہندوستان کی ساری زبانیں بلکہ دنیا کی دیگر زبانیں بھی محروم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی یہ کوشش بالکل نئی تھی کہ جب دونوں مذاہب میں مشترک عناصر موجود ہیں تو ان میں اختلاف بے معنی ہے ۔ لیکن داراشکوہ کی یہ کوشش ناکام رہی اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی سیاسی ناکامی میں بھی اس کی اس دانشورانہ اور عارفانہ طرز کا بڑا دخل تھا۔ بلاشبہ داراشکوہ مشترکہ تہذیب کا ترجمان تھا۔ سانحہ یہ ہے کہ اس کے بعد پھر کوئی ایسا دانشور پیدا نہ ہوا جو اس کی اس روایت کو آگے بڑھاتا۔

حواشی

لہ سفینۃ الاولیاء، صفحہ ۶۸

۲ہ اُپنشد (سِرِّ اکبر) صفحہ ۱۸۰۔ ترجمۂ داراشکوہ، از متن سنسکرت، از دکتر تاراچند
و سید محمد رضا جلالی نائینی۔ سال ۱۳۴۰ شمسی ھجری ۱۹۶۱، چاپ تابان۔

۳ہ ملا شاہ بدخشانی "شاہ" تخلص کرتے تھے۔

۴ہ اُپنشد، صفحات ۱۵۴۔۱۵۵۔

۵ہ مجمع البحرین۔ صفحات ۱۔۲ یہ کتاب جلالی نائینی کی کوشش سے منتخب آثار داراشکوہ
کے ضمن میں ڈاکٹر تاراچند کے مقدمے کے ساتھ ۱۳۳۵ شمسی ھجری ۱۹۵۶ء میں۔
تہران سے شائع ہوئی۔

۶ہ اُپنشد، صفحہ ۲۱۷۔

محمد ذاکر

روئدادِ ناتمام

کل شام اس شہر کے
اک موقر جریدے کے اعلیٰ اڈیٹر نے
پھر اپنی دیرینہ فرمائشوں کا اعادہ کیا:
ہماری یہ خواہش ہے کب سے
کہ کچھ آپ لکھیں ہمارے لیے بھی
کبھی تو ہمیں بھی نوازیں!

تو یہ میں نے سوچا
کہ لکھوں میں ان کے لیے اک کہانی
کہانی یہ بچپن میں میں نے سنی تھی
کہ اک نیک عورت نے
اپنے خیالوں میں معصوم
سوتیلے بچوں سے اپنے کہا تھا:
کہ دیکھو کروگے اگر تم شرارت
تو ایسے پرندے بنوگے
سدا اڑتے رہنا مقدر ہے جن کا!

پروفیسر محمد ذاکر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

نہ منزل ہے اُن کی
کہیں مرغزاروں میں
شاداب پھولوں، لچکتی ہوئی ڈالیوں میں
نہ ویراں خرابوں کے
بے برگ پیڑوں کے سنگین ٹھنٹوں پہ
اُن کا کوئی عارضی بھی ٹھکانا!
شرارت اگر تم کروگے
تو ایسے پرندے بنوگے
جنھیں آب و دانہ زمیں پر کہیں بھی میسّر نہیں!
زمیں کی طرف رخ اگر وہ کریں بھی
تو ان کے لیے موت ہے ناگہاں!
خلاؤں میں جینا، خلاؤں میں مرنا
سدا اُڑتے رہنا۔ شب و روز اُڑتے ہی رہنا
ازل سے ابد تک مقدّر ہے ان کا
کہیں بھی تو ان کا ٹھکانہ نہیں!

کہانی یہاں تک ہی لکھی تھی میں نے
کہ دل نے یہ سرگوشیوں میں کہا: آج دیکھو
مرے سامنے دور تک ہیں
ہزاروں، کروڑوں، پدم، دس پدم، ان گنت
ایک پر کے پرندے
نہ دیکھی جنھوں نے کبھی آسمانوں کی وسعت
نہ ہیں پر فشانی کی لذّت سے یہ آشنا؟

سدا بے پری کے یہ مقدور ہی میں مگن سے رہے ،
یہاں ہیں وہیں ہیں ازل سے
پپوٹوں کے خپیدہ پردے اٹھائے
یہ تکتے ہی رہتے ہیں یوں آسماں کو
کہ جیسے کسی آسمانی بشارت کے ہوں منتظر!

یہ سرگوشیاں دل کی تھیں چھائیاں آئنے کی!
کہانی کا چھوٹا سرا میں نے پکڑا
کہانی یہ میں پوری کرنے کو تھا
یہ تہیّہ تھا میرا
کہ اتنے میں میری رفیقہ نے مجھ کو خبر دی
کہ گھر میں نہیں آج ایندھن کوئی!
یہ میں جانتا تھا
کہ ہمسائے میں بھی
نہیں گیس کا ایک بھی تو سلنڈر
نہ ہی نفتِ کورہ کی بطری
نہ سنگی زغال!
یوں بھی تو سنتا ہوں میں
عورتوں کو تو قرضے سے ہوتی ہے
نفرت کچھ ایسی
جو بخشش کے لینے سے ہوتی ہے
مردِ غیور و جواں کو!

مرے جی میں آیا کہ کہہ دوں
زمانے کے گلخن کا ہم سب ہیں ایندھن،
مگر میں سمجھتا تھا حاضر جوابی
اور اس فلسفے کا
یہ کوئی محل ہی نہ تھا!

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے کو پایا:
مری جاں
مری بست و شش سالہ پیاری
مری تیرہ بختی کی ساتھی —
یہ ہر صبح اُٹھ کر تمھاری مُناجات احسن
تمھاری قناعت
تمھاری یہ بڑھتی ہوئی استقامت!
تمھیں تو خبر ہے
فراعینِ دوراں کی یہ تُند خوئی،
کہ جس سے ہے یہ آشیانہ ہمارا
ہوا کی گزرگاہ میں اک پرِ کاہ!'
یہ ہر لحظہ بڑھتی ہوئی اُن کی تُندی و تیزی
کہ جس کے مقابل
وہ آندھی، وہ طوفاں تو کچھ بھی نہیں تھے
جو دیکھے تھے بال اور پر کے نکلنے سے پہلے!

مرے پاس رکھا ہی کیا ہے

[گنادرمرڈل کا یہ ایشیائی ڈرامہ]
یہ الماریاں، پیٹیاں
جن میں کاغذ کے پُرزے اٹا اٹ بھرے ہیں
سُبک مایہ تحریریں میری
اِنھیں کو اب ایندھن سمجھ کر جلا لو !

یہ سُن کر رفیقوں نے مجھ سے بپھر کر کہا یوں :
کہ میں ان کی قیمت سے ہوں باخبر بھی !
جو خوابیدہ شعلے مچلتے ہیں ان میں
وہ انسانیت کی تڑپ کے، چمک کے امیں ہیں،
امیں ہیں یہ آئندۂ بے بہا کے ؛
یہ یوں رائگاں گر ہوئے تو
زمیں ـــــ یہ زمیں ... اور انسانیت
جملۂ ناتمام

کہانی کا چھوٹا سِرا :
وہ بچّے یہ بولے : یہ سچ ہے
اور اب ہم شرارت نہ ہرگز کریں گے
مگر وہ کہانی تو پوری ہی کر دیجیے ـــــ
ہمیں یہ بتا دیجیے کہ اس شہرِ کہنہ کا
اور مردِ ہشیار کا کیا ہوا ؟
وہی شہرِ کہنہ کہ مٹّی کے ذرّے بھی واں کے سمجھتے تھے
سونے سے بہتر ہی سب ؛

وہی مردِ ہشیار رواں کا کہ جس میں
لبھاؤ کی باتیں تھیں ساری؛
اُسے لوگ جیسے خیالوں کی محبوس پریوں کا
شہپور ہی جانتے تھے
اُسی کو بجھکڑ سمجھتے تھے وہ بے بدل،
کوئی دیکھتا اُس کی ہر دلعزیزی،
مؤقر تھا وہ، ایک عالم میں رشتہ کرانے کا داعی تھا،
مشہور تھا،
وہ واقف تھا ہر ایک کے دردِ سر سے
اور اس کا مداوا بھی اپنے خیالوں میں
وہ جانتا تھا؛

وہ یہ جان لیتا
کہ کس کے لباسِ حریری کے نیچے
ہیں ناسور کتنے
کہ جن کی خبر دوسروں کو نہیں !
بڑی رازداری سے اور ہمدمی سے
وہ سب کو بتاتا
کہ کس کس کو کیا کیا تکالیف ہیں !
وہ آئینہ سب کا سبھی کو دکھاتا
ہر اک کی کہانی سناتا سبھی کو
کہانی جو ہوتی تھی سچی، اچھوتی !
یہی رازداری، تھی اس کی
جو بنتی سبھی کے دُکھوں کا مداوا

اُسی کے سبب سے
اگرچہ وہ اپنے تئیں ایک کشتی میں پاتے
وہ سب اپنے پاؤں بھی بھیگے ہوئے دیکھتے تھے
مگر اپنی دانائیوں میں
وہ غیبت میں ہنستے تھے اک دوسرے پر!
ہمیں یہ بتا دیجیے شہرِ کہنہ کا
اور مردِ ہشیار کا کیا ہوا؟

تو سونبلی ماں پھر یہ بولی:
سنو میرے بچو
کہ دنیا میں ہوتے ہیں ایسے بھی دانا
جو رکھتے ہیں پاتال تک کی خبر
وہ یہ جانتے ہیں
کہ کس کس کے مقسوم میں کیا لکھا ہے
مگر اپنی قسمت کا لکھا
[اگرچہ وہ اپنی ہی آنکھوں سے سب دیکھتے ہیں]
سمجھتے نہیں!
شہرِ کہنہ کے اُس مردِ ہشیار نے ایک دن
جو اک راز کی بات پائی
تو رخصت ہوئی اس کی روشن ضمیری!
سُنانے اُسے جب وہ دوڑا
تو اس نے یہ دیکھا
کہ وہ شہر والے تو غیبت میں

اک دوسرے پر ہی ہنسنے میں
مصروف تر ہو رہے تھے!
یہ دیکھا تھا اس نے کہ واں
شہر کے اس طرف
سنگِ خارا کی بھاری فصیلوں کے پیچھے
جہاں باڑھ کے تار تھے، خندقیں تھیں
وہاں آہنی راستوں کا
نیا جال سا بن چکا تھا
اور اُن پہ
ہزاروں ہی لشکر تھے مور و ملخ کی طرح سے
اور اُن سب کا رُخ شہر ہی کی طرف تھا!

لو اب باقی ماندہ کہانی
سناؤں گی کل میں
اگر کل کوئی ہو!

(جون ۱۹۷۴ء)

عذرا رضوی

خوابِ شکستہ

ہم نکل کر آئے تھے اپنی درس گاہوں سے
حوصلہ تھا ہمت تھی شوق تھا محبت تھی
کر کے کچھ دکھانے کا ولولہ تھا جرأت تھی
لیکن اب کھڑے ہیں یوں جیسے لُٹ کے آئے ہیں
اپنے پر شکستہ خواب چوٹ کھائے کھائے ہیں
حوصلوں میں پستی ہے شوق میں کمی سی ہے
کر کے کچھ دکھانے کا ولولہ نہ جرأت ہے
اور پیار کی گرمی ڈھلتی دھوپ جیسی ہے
مصلحت کے سائے ہیں ہم پناہ لیتے ہیں
مقصدوں سے بھٹکے لوگ تنہا تنہا پھرتے ہیں

محترمہ عذرا رضوی، ماس کمیونیکیشن ریسرچ سنٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

مسعود انور علوی کاکوری

حضرت شاہ تُراب علی قلندر کاکوریؒ

مشترکہ تہذیب کی علامت

اٹھارویں صدی کا پُر آشوب، فتنوں اور طوائف الملوکی سے معمور دور ہے۔ سلطنت مغلیہ کا دم واپسیں ہے۔ اخلاقی و معاشرتی اقدار بڑی تیزی سے مٹتی جا رہی ہیں۔ اودھ میں معاشرت تعیش میں ڈوبتی جارہی ہے۔ فوجی قوتیں اور ملکی اقتدار ختم ہوتا جارہا ہے مگر اس کے باوجود صوفیائے صاف باطن کا فقدان نہیں۔ تاریخ ہند پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ ان صوفیائے پاک طینت نے انسانوں کو اخوت، بھائی چارگی، باہمی میل محبت اور پریم و آشتی کا جو سبق پڑھایا اور اخلاق و کردار، اخلاص و نیازمندی کے جو حقیقی معنی سمجھائے اس کی مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنی شمیم اخلاق سے روحانیت کی ذہنی تشکیل کی، لوگوں کو تزکیۂ نفس کی تعلیم دی، مشترکہ تہذیب اور ایک اکائی میں پرونے کا سبق دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ایک صالح معاشرہ کی تشکیل تبھی ممکن ہے جب تمام انسانوں کو ایک خاندان گردانا جائے۔ انھوں نے حدیث نبویؐ کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب و مقبول وہی بندہ ہے جو اس کی مخلوق کے واسطے سب سے زائد نفع بخش ہو، پر پوری زندگی عمل کیا۔

اسی دور انقلاب میں اودھ کے مشہور و مردم خیز قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے میں ۱۱۸۱ھ/۱۷۶۸ء میں حضرت شاہ تراب علی قلندر پیدا ہوئے جو آگے چل کر بیک وقت ایک

ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی، ریڈر شعبۂ عربی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

متبحر عالم، بلند پایہ شاعر، متدین صوفی اور ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت بن کر ابھرے جنھوا نے اپنے فیضان صحبت سے گم گشتگان راہ کو ہدایت دی۔ خمول وگمنامی کے گوشے میں بیٹھ کر بھی اپنے دور کے معاشرہ کی اخلاقی سطح بلند کی۔ قومی یک جہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ سب ایک اکائی نظر آنے لگے۔ ان کے والد گرامی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر (۱۷۴۵ء اپنے عہد کے باکمال صوفی وعارف، ہندی بھاشا کے قادر الکلام نغز گو صاحب دیوان شاعر خانقاہ کاظمیہ کاکوری کے بانی، شکستہ قلوب کے لیے سامان راحت فراہم کرنے والے، عوام وخواص کو درس انسانیت دینے والے، ہندو مسلم اتحاد، یک جہتی اور آپسی میل محبت کے انمٹ نقوش ثبت کرنے والے۔ جبھی تو اس دور کی بڑی بڑی سربرآوردہ ہستیاں چاہے وہ مہاراجہ ٹکیت رائے بہادر، وزیر اعظم نواب آصف الدولہ ہوں یا لالہ مجلس رائے، بینی را اور لالہ شتاب رائے اور چاہے منشی فیض بخش علوی مورخ اودھ، امیر عاشق علی خاں سفیر شاہ اودھ، مفتی خلیل الدین خاں علوی سفیر شاہ اودھ اور شیخ طفیل علی فوجدار وغیرہ سبھی ان کے حلقہ بگوش اور ارادت مند نظر آتے ہیں۔ اسی بنا پر کاکوری اور قرب وجوا کی فضا پریم ومحبت کے نغموں سے ایسی گونج اٹھی کہ ہر شخص کہنے لگا ؎

شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی

ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

حضرت شاہ تراب علی قلندر نے ۱۲ سال کی عمر سے ہمہ وقت خانقاہ پر اپنے والد ماجد کے زیر تربیت رہنا شروع کیا اور ۹۴ سال کی عمر تک عوام وخواص کو فیضانِ صحبت سے مستفید کرتے اور محبت وپریم ویک جہتی کا سبق پڑھاتے رہے۔ انھوں نے عہد آصف الدولہ (۱۷۷۵ء - ۱۷۹۷ء) سے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد تک کے نشیب وفراز دیکھے، سلطنتوں کو بنتے، عروج پاتے اور زوال پذیر ہوتے دیکھا۔ ذرہ ذرہ سے بصیرت اور عرفان حیات حاصل کیا اور نہ صرف اپنی تصانیف بلکہ فارسی واردو اور ہندی شاعری میں معاشرہ کی اصلاح تہذیبی اقدار کی بلندی، مشترکہ تہذیب کی اہمیت، انسانیت کی خدمت اور مخلوق سے محبت وغیرہ کا جابجا پرزور بیان فرمایا ہے۔

چونکہ صوفیاء کے مخاطب عموماً سیدھے سادے بھولے بھالے عام انسان ہوتے ہیں اس لیے ان کی ذہنی سطح کو دھیان میں رکھتے ہوئے آپ نے بھی بڑے دلنشین اور آسان لفظوں میں محبت و پریم اور تصوف کے اسرار کو بیان کیا ہے۔ انداز بیان اور زبان کی سلاست ایسی پُراثر ہے کہ دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

دیکھیے کتنے آسان لفظوں میں خود پرستی اور انانیت کو چھوڑنے کی ترغیب دیتے ہیں ؎

وہ نیستی کا مذاق لوٹے جو قید ہستی سے اپنی چھوٹے
تراب کا دل جو سب سے ٹوٹے ہے خدا آگے بنے گیانی

جب تک خودی ہے تب ہی تلک ہے خدا جدا
غیبت گر آپ سے ہو تو حق کا ظہور رہے

ایک صوفی نسلی تعصبات اور قومی تفرقوں سے بلند ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

نیک و بد سب ہیں تراب اس کے ظہور اسما
مجھ کو یک رنگ نظر چاہیے ہر فرد کے ساتھ

جیسے موجیں عین دریا ہیں حقیقت میں تراب
ویسے عالم عین حق ہے غیر حق عالم نہیں

"فنا" کا جیسا دلنشیں اور آسان انداز میں بیان ہے وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔

فنا کی سیر جس کو دیکھنا ہو
تماشا باغ کا دیکھے خزاں میں

ان کے کلام میں فلسفہ اخلاق کا بیان ایسا سلیس و پُراثر ہے کہ ہر مذہب و ملت کے عوام و خواص کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے۔

ہم تو بدخواہ نہیں اپنے مخالف کے تراب
جو بدی ہم سے کرے اس کی خدا خیر کرے

عیب جوئی غیر کی کرنا برا ہے مدعی
خود نظر کرتا نہیں اپنے برے اعمال تو

طینت آدم کی خاکساری ہے　　　جو تکبر کرے وہ ناری ہے

اس کے علاوہ آپ نے ہندی میں پریم رس کو بڑے ہی اچھے انداز میں پیش فرمایا ہے ٹھمریاں اور گیت بھی لکھے جن میں وہی پیام انسانیت اور قومی یک جہتی ہے۔ پس منظر وہی گوکل وبندرا بن کے سر سبز وشاداب لہلہاتے سبزہ زار ہیں۔ وہی عطر بیز فضائیں وہی بادِ نسیم کے جھونکے وہی شیام کی شوخیاں اور وہی ادائیں ہیں جن پر الہڑ گوپیاں ہزار جان سے رجھی جا رہی ہیں۔ مطبوعہ ہندی کلام "امرت رس" میں بکثرت مثالیں ہیں۔

آیو بسنت بجیئیں منتواری　　　اُمنگ چلیں سب باری کنواری
کوئی عبیر لیے بھر جھوری　　　کوئی بنائے رہے پچکاری
کوئی بجاوت دَف کوئی گاوت　　　کوئی ڈگر ما ناچت ٹھاری
اب ہی سو برج ما دھوم مچی ہے　　　ہوری کھیلت ہے شیام بہاری
آپ بچو رہے سب کو رنگ دے　　　کو ہے تراب اُس چتر کھلاری

ایک دوسری جگہ ہولی کا بیان اس طرح ہے۔

اب کی ہوری کا رنگ نہ پوچھو　　　دھوم مچی ہے بندرا بن ما
شیام بہاری چتر کھلاری　　　کھیل رہا ہوری سکھین ما
ہاتھ لیے پچکاری پھرت ہے　　　عبیر گلال بھرے دامن ما
کیسے سکھی کو کوئے نکے مندر سو　　　ٹھاڑو ہے ڈھیٹ لنگر آنگن ما
مو کا کہاں وہ ڈھونڈھے پاوے　　　میں تو چھپی ہوں تراب کے من ما

چند اور نمونے ملاحظہ ہوں۔

رسیلے پیو سو رہس رہس کے کھلی جنن سو میں رات جاگی
جو بھور ہوتے پیا سدھارے بھیو کریجوا ہمار داگی
تراب موری بنتھا نہ پوچھو نہیں ہے مو سا کوئی ابھاگی
میں آج کیسے رہوں نہ بیکل مو ہے تو چٹک پیا سو لاگی

چڑھ کے اٹا پر دیکھ سکھی ری   آوت ہے کوئی کا گا بولا
سیاں بدلیں کہاں کا ساون   نِسدِن جی کو رہت ہے ملولا

رم جھم برسن لاگو مہروا   دادُر وسور مچاون لاگے
کا سو کہت ہے پنک پہ سندیبا   پیوا تہیں ساون لاگے

بھاگ رچیہوں اکیلی پیا سنگ   جھُرمٹ سو موری جائے بلائے
بسنتی رنگیہوں وہی کے رنگ سو   اور رنگ سب دیہوں بہائے
دھول لے اٹھوں پیا کے چرن کی   عبیر گلال سا دیہوں اُڑائے
سب جگ کھیلت ہے ہوری کھیلوں   لیہوں تراب کا گروا لگائے

الغرض حضرت شاہ تراب علی قلندر نے اپنے دور اور اس کے بعد کے زمانہ و معاشرہ پر جو گہرا اور دیرپا اثر ڈالا اور عوام و خواص کو جیسا اپنا گرویدہ بنا یا اس کی مثال نہیں ملتی۔ فارسی و اردو اور ہندی کلام کی مقبولیت کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ آپ کے اشعار سند کے طور پر روایت کرنے لگے۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ فیلن نے نیو ہندوستانی۔ انگلش ڈکشنری میں رسیلی آنکھ کی تشریح آپ کے ہی اس شعر سے کی۔

نیکی لگت مو ہے اپنے پیا کی   آنکھ رسیلی لاج بھری

اور یہ شعر بھی زبان زد ہو گیا ہے

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کردی   کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کی خدمات کو ہندوستان کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ یکجہتی کی علامت تھے۔ ان کے فکار کی معنویت ہمارے دور میں بھی باقی ہے۔ ان ہی کے ایک شعر کے ساتھ بات ختم کرتا ہوں[۵]

مجھے بھی یاد کریں گے کسی زمانہ میں   رہے گا ذکر مرا قصہ و فسانہ میں

ہیرلڈ لیم

عزیز احمد

چنگیز خاں

فاتح عالم

[ہیرلڈ لیم HAROLD LAMB کی تصنیف چنگیز خاں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ عزیز احمد نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو پاکستان سے شائع ہوا۔ یہ کتاب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ موضوع کے لحاظ سے تاریخ بالخصوص وسط ایشیا کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ وسط ایشیا کے بدلے ہوئے تناظر میں اس طرح کی تصانیف کا مطالعہ عام ہونا چاہیے جس سے اس خطے میں پیدا ہونے والی تہذیبی تبدیلیوں کا تاریخی پس منظر واضح ہو سکے۔ قارئین جامعہ کے لیے ہم ہیرلڈ لیم کی مذکورہ تصنیف جس کا ترجمہ عزیز احمد نے "چنگیز خاں۔ فاتح عالم" کے عنوان سے کیا ہے قسط وار شائع کر رہے ہیں۔ مع پیش لفظ یہ ترجمہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ زیر نظر شمارہ میں ہم پیش لفظ اور پہلے حصے کا پہلا باب شائع کر رہے ہیں۔]

پیش لفظ ــــ معمّا

سات سو سال پہلے ایک آدمی نے دنیا کو قریب قریب بالکل ہی فتح کر لیا تھا۔ اس زمانے کے ربع مسکون کے نصف حصّہ پر اس نے اپنا تصرّف قائم کیا اور نوعِ انسان پر ایسی دھاک بٹھائی جس کا اثر کئی نسلوں تک باقی رہا۔

اپنی زندگی میں اس نے کئی نام پائے ــ قتالِ اعظم، قہرِ خدا، جنگجوئے کامل، تاج گیر تاج و تخت۔ عام طور پر وہ چنگیز خاں کے نام سے معروف ہے۔

بہت سے صاحبانِ خطاب اپنے خطابوں کے اہل نہیں ہوئے، مگر وہ ان سب خطابوں کا اہل تھا۔ ہم امریکی، جن کی تعلیم یورپی روایات کے مطابق ہوتی ہے، بڑے شہنشاہوں کی فہرست مقدونیہ کے سکندرِ اعظم سے شروع کرتے ہیں اور روم کے قیاصرہ کو شمار کرتے ہوئے، اس فہرست کو نپولین پر ختم کرتے ہیں، لیکن اس یورپی بازی گاہ کے کھلاڑیاں کے مقابلے میں چنگیز خاں بہت ہی بڑے پیمانے کا فاتح تھا۔

معمولی معیاروں سے اس کا جانچنا مشکل ہے۔ جب وہ اپنے اردو (لشکر) کے ساتھ کوچ کرتا تو اس کا سفر میلوں نہیں، عرض البلد اور طول البلد کے پیمانوں پر ہوتا۔ اس کے راستے میں جو شہر آتے، اکثر حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے۔ دریاؤں کے رخ بدل جاتے۔ صحرا کے صحرا سراسیمہ اور لبِ مرگ پناہ گزینوں سے بھر جاتے اور اس کے گزر جانے کے بعد ان علاقوں میں جو کبھی آباد تھے، بھیڑیوں اور کرگسوں کے سوا کوئی زندہ مخلوق باقی نہ بچتی۔

انسانی جانوں کی ایسی تباہی، آج کل کے انسان کے تخیل کو ششدر کر دیتی ہے

حالانکہ دوسری جنگِ عظیم کی تباہی کے مناظر چشمِ تصور سے ایسے دور نہیں۔ ایک خانہ بدوش سردار چنگیز خاں نے صحرائے گوبی سے خروج کیا، دنیا کی متمدن قوتوں سے جنگ کی اور اس جنگ میں کامران ہوا۔

یہ سب اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں تیرھویں صدی عیسوی کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کا راسخ عقیدہ تھا کہ اس عالم اسباب و اشیاء میں یہ غیر معمولی انقلاب محض کسی فوق الفطرت قوت کے ظہور سے ہی آ سکتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ قیامت کے آثار ہیں۔ ایک مؤرّخ لکھتا ہے "کبھی اس سے پہلے مغلوں اور نصرانیوں کے حملوں کے نرغے میں دارالسّلام کی یہ حالت نہیں ہوتی۔"

عیسائی دنیا بھی چنگیز خاں کی موت کے بعد مغلوں کی اگلی پشت کے مقابلے میں اتنی ہی سراسیمہ و حیران تھی جب کہ خونخوار مغل شہسوار مغربی یورپ کو روندتے پھرتے تھے۔ پولینڈ کا شاہ بولسلاس اور ہنگری کا بادشاہ بیلا شکست کھا کے جنگ کے میدانوں سے بھاگ گئے تھے۔ اور سائیلیسیا کا ڈیوک ہنری اپنے تیوتانی شہسواروں کے ساتھ لڑتا ہوا لیگ نٹز میں مارا گیا تھا۔ یہی حشر روس کے گرینڈ ڈیوک جارج کا ہوا تھا اور قشتالیہ کی خوبرو ملکہ بلانش نے فرانس کے بادشاہ سینٹ لوئی کو یاد کر کے پکارا تھا "میرے بیٹے تو کہاں ہے!"

جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک ثانی نے، جو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا عادی تھا انگلستان کے شاہ ہنری ثالث کو لکھ بھیجا کہ یہ تاتاری عذاب الٰہی سے کم نہیں جو نصرانی دنیا پر عیسائیوں کے گناہوں کی پاداش میں نازل ہوتے ہیں اور یہ تاتاری دراصل اسرائیل کے دس گم گشتہ قبائل کی نسل سے ہیں، جن کو سامری کے سنہرے بچھڑے کی پوجا اور بت پرستی کی سزا دینے کے لیے ایشیا کے ویران صحراؤں میں بند کر دیا گیا تھا۔

یہاں تک کہ روجر بیکن جیسے فلسفی نے یہ رائے ظاہر کی کہ مغل دراصل دجّال کے سپاہی ہیں اور اب اپنی آخری دہشت ناک فصل کاٹنے آتے ہیں۔

یہ یقین ایک عجیب پیشین گوئی کی وجہ سے اور بھی محکم ہو گیا جو غلطی سے سینٹ جارج سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ کہ دجّال کے زمانہ میں ایشیا کے پہاڑوں کے اس پار یاجوج ماجوج کے ملک سے "ترکوں" کی ایک قوم خروج کرے گی یہ ایسی قوم ہوگی جو گندی اور میلی ہوگی

جو نہ شراب پیئے گی اور نہ نمک اور گیہوں کھائے گی اور جو ساری دنیا پر تباہی لائے گی۔

اسی لیے پاپائے روم نے لیون میں مجلس مشاورت طلب کی جس کا ایک حد تک یہ مقصد بھی تھا کہ کسی نہ کسی طرح منگولوں کے اس سیلاب کو روکا جائے۔ ایک لحیم شحیم مقدس راہب، پلانو کارپینی کے باشندے جان کو پاپائے اعظم کا نمائندہ اور سفیر بنا کے منگولوں کے پاس بھیجا گیا۔" کیوں کہ ہمیں خوف تھا کہ کلیسائے خداوندی کے لیے سب سے زیادہ قریب اور ظاہر جو خطرہ تھا، وہ ان ہی منگولوں کا تھا۔"

اور کلیساؤں میں منگولوں کے غضب سے نجات پانے کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔

اگر یہ کہانی محض اس تباہ کاری، اس تمدن کشی پر ختم ہو جاتی تو چنگیز خاں کا مرتبہ اٹیلا یا ایلارک سے زیادہ اونچا نہ ہوتا۔ وہ بھی ایک بے مقصد، بے پناہ، آوارہ گرد فاتح ہوتا اور کچھ نہ ہوتا، لیکن یہ قہر خداوندی، جنگجوئے کامل بھی تھا اور باج گیر تخت و تاج بھی۔

اور یہی وہ راز ہے جس میں چنگیز خاں کی شخصیت کھڑی ہوئی ہے، وہ ایک خانہ بدوش تھا، شکاری تھا، چرواہا تھا، تین تین بڑی سلطنتوں کے سپہ سالاروں کو اس نے شکست دی۔ وہ وحشی تھا، جس نے کوئی شہر نہ دیکھا تھا اور لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا۔ لیکن اس نے پچاس قوموں کے لیے قانون بنایا اور نافذ کیا۔

جہاں تک خداداد فوجی قابلیت کا تعلق ہے، بادی النظر میں نپولین یورپ کا سب سے درخشاں سپہ سالار تھا لیکن ہم یہ فراموش نہیں کر سکتے کہ نپولین نے ایک فوج کو مصر میں تقدیر کے حوالے کر کے چھوڑ دیا اور دوسری فوج کا بچا کھچا حصّہ روس کے برف زاروں کے حوالے کر دیا اور بالآخر واٹرلو کی شکست پر اس کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ اس کے جیتے جی اس کی سلطنت مٹ گئی، اس کا قانون پارہ پارہ کر دیا گیا۔ اور اس کی موت سے پہلے اس کے بیٹے کو محروم الارث کر دیا گیا۔ یہ پورا واقعہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تھیٹر میں کوئی ڈراما ہو رہا ہو اور جس میں نپولین خود بھی محض ایک ایکٹر ہو۔

فتح مندی میں چنگیز خاں سے موازنہ کرنے کے لیے مقدونیہ کے سکندر اعظم کا ذکر

ضروری ہے۔ سکندر ایک بے پروا اور فتح مند نوجوان تھا۔ دیوتاؤں جیسا، جو اپنی صف بہ صف فوج کے ساتھ مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس کے ہم رکاب یونان کے تمدن کی برکتیں تھیں۔ سکندر اور چنگیز خاں دونوں کی موت کے وقت ان کے اقبال و ظفر کا ستارہ انتہائی عروج پر تھا اور ان کے نام ایشیا کی حکایتوں میں محفوظ ہیں

دونوں کی موت کے بعد کے واقعات سے دونوں کی حقیقی کامرانیوں کے حاصل فرق کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ فرق بے اندازہ ہے۔ سکندر کے مرتے ہی اس کے سپہ سالا آپس میں لڑنے لگے اور اس کے بیٹے کو سلطنت چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

لیکن چنگیز خاں نے اس قدر کامل طور پر اپنے آپ کو آرمینیا سے کوریا تک اور تبت سے دریائے اتیل تک کے علاقے کا مالک بنا لیا تھا کہ بلا کسی ردّ و کد کے اس کے بیٹے کو اس کی جانشینی نصیب ہوئی۔ اور اس کا پوتا قوبلائی خاں بھی نصف دنیا پر حکمراں تھا۔

یہ عظیم الشان سلطنت جسے ایک وحشی نے محض نیستی سے پیدا کیا، مؤرخوں کے لیے ایک معجزہ اور ایک راز ہے۔ انگلستان میں اس کے عہد کے متعلق جو عام تاریخ حال میں مستند مؤرخوں نے تالیف کی، اس میں اس امر کو ایک ناقابل تشریح واقعہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک اور محترم عالم نے یہ کہہ کے حیرت کا اظہار کیا ہے "چنگیز خاں کی تقدیر ساز شخصیت کی تہہ تک ہم کسی طرح نہیں پہنچ سکتے، جیسے شکسپیر کی خداداد صلاحیت کا معمّا نہیں سلجھا سکتے۔"

کئی وجہوں سے چنگیز خاں کی شخصیت ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے، ایک تو یہ کہ مغل لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ یا کم سے کم انھوں نے لکھنے پڑھنے کی پروا نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چنگیز خاں کے عہد کی تاریخ ہمیں محض ایغوریوں، چینیوں ایرانیوں اور آرمینیوں کی منتشر تحریروں میں ملتی ہے۔ حال تک مغل سانگ است زین کی داستان کا بھی اطمینان بخش ترجمہ نہیں ہوا تھا۔

یعنی اس مغلِ اعظم کے سب سے ذہین مؤرخ اس کے دشمن تھے۔ یہ ایک ایسا امر واقع ہے، جسے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ مؤرخ دوسری قوموں سے تھے۔ اس کے

علاوہ تیرھویں صدی عیسوی کے یورپی باشندوں کی طرح اپنے ملک اور سرزمین سے باہر کے لوگوں کے متعلق ان کے تصوّرات بہت مبہم تھے۔

انھوں نے مغلوں کو ایک نامعلوم سرزمین سے دفعتاً خروج کرتے دیکھا۔ انھوں نے مغل اردو کے دہشت ناک حملوں کی ضرب برداشت کی اور پھر انھوں نے دیکھا کہ ان کی سرزمین سے ہوتا ہوا یہ سیلاب دوسرے نامعلوم ملکوں کی طرف اُمڈ رہا ہے۔ ایک مسلمان مصنّف نے مغلوں کی یورش کے تجربے کو ان افسوس ناک لفظوں میں ادا کیا ہے، "آئے، قتل و غارت کیا، مال غنیمت سمیٹا اور چل دیے۔"

ان مختلف ماخذوں کو پڑھنا اور ان کا باہم مقابلہ کرنا بڑا مشکل کام ہے یہ قدرتی بات ہے کہ جو مستشرقین ان ماخذوں کے مطالعے میں کامیاب بھی ہوئے انھوں نے ساری توجہ مغل فتوحات کی سیاسی تفصیلوں پر صرف کر دی۔ چنگیز خاں کی جو تصویر وہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ وحشی قوت و طاقت کے ایک مظہر ایک عذاب کی ہے جو صحراؤں کی جانب سے اکثر نمودار ہوتا ہے اور تمدّنوں کو غارت کرتا ہے۔

سانَنگ ستسَن کے ساگا سے بھی اس معمّے کے حل کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں ملتی۔ کیوں کہ یہ ساگا بڑی سادگی سے یہ بیان کرتا ہے کہ چنگیز خاں دیوتاؤں کی نسل سے ایک "بوگدو" تھا۔ یہاں بجائے معمّے کے ہم ایک معجزے سے دوچار ہوتے ہیں۔

یوروپ کی قرونِ وسطیٰ کی تاریخوں میں، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، عام طور پر یہ رجحان ملتا ہے کہ مغلوں میں ایک طرح کی شیطانی طاقت سرایت کیے ہوئے تھی جو یورپ میں تگ و تاز کرتی رہی۔ غصّہ تو اس پر آتا ہے کہ جدید مؤرخین بھی تیرھویں صدی کے اوہام ہی کو دہراتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ تیرھویں صدی کے یورپ نے چنگیز خاں کے خانہ بدوشوں کو محض پرچھائیوں کی طرح یورش کرتے دیکھا تھا۔

لیکن چنگیز خاں کے گرد جو معمّا ہے، اسے حل کرنے کی ایک آسان تدبیر ہے اور وہ یہ کہ گھڑی سات سو سال پیچھے کر دی جائے اور چنگیز خاں کو اس طرح دیکھا جائے جیسے اس زمانے

کے مؤرخین اسے دیکھتے تھے۔ معجزے یا وحشی طاقت کے مظہر کے طور پر نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت
ہم کو یہاں مغلوں کی نسل کی سیاسی کامیابیوں سے غرض نہیں صرف اُس فردِ واحد
سے مطلب ہے، جس نے مغلوں کو ایک گمنام قبیلے کی حیثیت سے بلند کر کے دنیا کا مالک بنا
اس آدمی کا تصوّر زندہ کرنے کے لیے ہمیں اُسے اپنی قوم کے درمیان سات سو سال پہلے
کی دنیا میں جیتا جاگتا دیکھنا ہے۔ ہم اسے جدید تمدّن کے معیاروں سے نہیں جانچ سکتے۔ ہمیں
اسے ایک بنجر سرزمین کے ماحول میں دیکھنا ہے، جس میں خانہ بدوش شکاری بستے تھے، شہسوار
کرتے تھے اور شمالی ہرنوں کی گاڑیاں چلاتے تھے۔

یہاں، انسان جانوروں کے سمور کے لباس پہنتے ہیں اور گوشت اور دودھ کی خوراک
پر بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان اپنے جسموں پر چربی اور تیل ملتے ہیں تاکہ سردی اور نمی سے محفوظ
رہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوک اور سردی سے مر بھی جاتے ہیں یا دوسرے انسان اپنے ہتھیاروں
سے انھیں تکّا بوٹی کرتے ہیں۔

بقول بہادر فرا کاربینی کے جو پہلا یورپین تھا جس نے اس سرزمین پہ قدم رکھا یہاں
قصبے اور شہر نہیں، بس بنجر اور ریگستان ہیں، پوری زمین کا سواں حصّہ بھی ایسا نہیں جو
دریاؤں سے سیراب ہو سکے یا جس پر کاشت ہو سکے، کیونکہ یہاں دریا بہت کم ہیں۔

اس سرزمین میں درخت نہیں اُگتے، حالانکہ مویشیوں کی چراگاہیں بہت ہیں۔
شہنشاہ اور شہزادے اور باقی سب گوبر کے اپلوں سے آگ تاپتے ہیں اور انھیں پر ان کا کھانا پکتا ہے۔
موسم بڑا سخت ہے۔ وسط گرما میں بھی باد و رعد کے بڑے سخت طوفان اٹھتے ہیں اور
بہت سے لوگ مر جاتے ہیں گرمیوں میں بھی کبھی کبھی بہت برفباری ہوتی ہے اور ایسے
سرد طوفانی جھکّڑ چلتے ہیں کہ گھوڑوں پر سوار ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے ایک طوفان میں
ہم کو زمین پر لیٹ جانا پڑا۔ اور گرد و غبار کی وجہ سے ہمیں نزدیک کی چیز بھی نظر نہ آتی
تھی۔ اکثر اولے گرتے ہیں اور دفعتًا سخت ناقابل برداشت گرمی پڑنے لگتی ہے، جس کے بعد
اسی شدّت سے سردی ہوتی ہے۔"

یہ ہے صحرائے گوبی ۱۱۶۲ء عیسوی میں۔ بارہ جانوروں کی جنتری کے حساب سے یہ
خنزیر کا سال ہے۔

باب اوّل (پہلا حصّہ)

صحرا

گوبی میں زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ اونچے بلند ہموار ٹیلے، جن پر تیز ہواؤں کے جھکڑ چلتے، اور جن کی بلندی بادلوں کے قریب پہنچتی۔ جھیلیں جن کے اطراف اونچی اونچی گھاس تھی، جن میں ہجرت کرنے والے پرندے، شمالی ٹنڈراؤں کی طرف اڑتے ہوئے آن کر بسیرا لیتے۔ اوپر کی ہواؤں کے تمام عفریت وسیع جھیل بیکال پر جمع ہوتے۔ درمیانی جھاڑوں کی شفاف راتوں کو افق پر شمالی روشنیاں طلوع اور غروب ہوتی دکھائی دیتیں۔

شمالی گوبی کے اس گوشے کی اولاد جو انسان تھے، انھیں تکلیفوں نے سخت جان نہیں بنایا تھا بلکہ سخت جانی ان کو ورثے میں ملی تھی۔ جب ماں کا دودھ چھڑا کے گھوڑی کا دودھ شروع کرایا جاتا، اسی وقت سے بچے سے اس کی توقع کی جاتی کہ وہ اپنی فکر آپ کرے۔

گھریلو خیمے میں آگ کے قریب جوان جنگجوؤں اور مہمانوں کا مقام تھا۔ عورتیں بائیں جانب بیٹھ ضرور سکتی تھیں۔ لیکن ذرا دور اور لڑکے لڑکیاں جہاں بن پڑے وہیں بیٹھ جاتے تھے۔

یہی حال غذا کا تھا۔ بہار کے موسم میں جب گھوڑیاں اور گائیں خوب دودھ دیتیں تو خیر ٹھیک تھا۔ اس زمانے میں شکار بھی خوب ملتا۔ قبیلے کے شکاری ہرن یا ریچھ مار لاتے۔ بجائے اس کے کہ لومڑیوں یا ایسے ہی اور سمور والے دُبلے پتلے جانوروں کا شکار کریں۔ ہر چیز دیگ میں ڈال دی جاتی اور پھر کھائی جاتی ـــــ اس طرح کہ جوان طاقتور مرد پہلے جو چاہتے کھا لیتے۔ بوڑھے اور عورتیں ان کے بعد کھاتے اور بچوں کو ہڈیوں اور ریشوں کے لیے لڑنا پڑتا۔ کتوں کے لیے شاید ہی کبھی کچھ بچتا۔

جاڑوں میں جب جانور پتلے ہو جاتے تو بچّوں کو کچھ زیادہ نصیب نہ ہوتا۔ اس زمانہ میں دودھ کے استعمال کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اس کی کومیس بنائی جائے۔ کومیس دودھ کو چمڑے کے تھیلوں میں بھر کے خمیر دے کے اور پھینٹ کے تیار کی جاتی تھی۔ تین چار سال کے چھوٹے سے صاحبزادے کے لیے کومیس طاقت بخش اور کسی قدر نشہ آور ضرور ہوتی تھی، مگر شرط یہ تھی کہ وہ کسی طرح مانگ کے یا چرا کے اسے حاصل کرلے۔ جب گوشت نصیب نہ ہوتا تو اُبلے ہوئے باجرے سے بھوک کا کچھ نہ کچھ علاج کرلیا جاتا۔

بچّوں کے لیے آخری جاڑوں کا زمانہ بدترین ہوتا۔ مویشی اس لیے زیادہ کاٹے نہیں جاتے تھے کہ گلّوں کی تعداد بہت کم نہ ہو جائے۔ ایسے زمانے میں قبیلے کے جنگجو دوسرے قبیلوں سے غذا کا سامان لوٹتے اور گھوڑے اور مویشی ہنکالے جاتے۔

بچپن ہی سے بچّوں کا گروہ الگ شکار کھیلتا اور کلہاڑیوں اور کند تیروں سے چوہوں اور کتّوں کو مارنے کی کوشش کرتا۔ وہ بھیڑوں پر سواری کی مشق کرتے اور سہارے کے لیے ان کی پشم کو مضبوطی سے تھام لیتے۔

قوتِ برداشت پہلی چیز تھی جو چنگیز خاں کو ورثہ میں ملی۔ چنگیز خاں کا پیدائشی نام تموچین تھا۔ جس زمانے میں وہ پیدا ہوا ہے اس کا باپ قبیلہ کے ایک دشمن پر دھاوا کرنے گیا ہوا تھا اور اس دشمن کا نام تموچن تھا۔ اس مہم میں اسے کامیابی ہوئی۔ دشمن قید ہوا اور باپ نے واپس آکے اپنے بچّے کو قیدی دشمن کا نام دیا۔

اس کا گھر سمور کا خیمہ تھا جس کا ڈھانچا بانسوں کا بنا ہوا تھا اور جس میں اوپر دھواں نکلنے کے لیے ایک ذرا سا حصّہ کھلا ہوا تھا۔ سمور پر چونے کی سفیدی پھری ہوئی تھی اور زیبائش کے لیے تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ عجیب طرح کا خیمہ جو "یورت" کہلاتا تھا ایک گاڑی پر کھڑا کر دیا جاتا، جسے درجن بھر یا زیادہ بیل کھینچتے اور چراگاہوں اور میدانوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیے پھرتے۔ یہ بڑے کام کا خیمہ تھا، کیونکہ اس کی گنبد نما چھت، ہوا کے جھکّڑوں کی روک تھام کرتی اور جب ضرورت پڑتی، اس خیمے کو اتارا جا سکتا تھا۔

سرداروں کی بیویاں ــــ اور تموچن کا باپ بھی ایک سردار تھا ــــ علیحدہ اپنے

راستہ "یورتوں" میں اپنے بچوں کے ساتھ رہتیں۔ لڑکیوں کا فرض یہ تھا کہ یورت کا سارا کام کاج کریں، اور اوپر کے روشن دانوں کے نیچے، جن سے دھواں نکلتا تھا، آگ جلائے رکھیں۔ خیمے کے دروازے کے باہر، گاڑی کے چوبی تختے پر کھڑی ہو کے تموچن کی ایک بہن بیلوں کو ہنکاتی، ایک گاڑی کا بم دوسری گاڑی کے ڈھرے سے باندھ دیا جاتا اور اس طرح چرچر کرتی اور دھکے کھاتی ہوئی گاڑیاں مسطح چراگاہوں میں دور دور تک چلتیں، جہاں شاید ہی کبھی کوئی درخت یا ناہموار زمین کا ٹکڑا نظر آتا۔

یورت میں گھر بھر کی ساری دولت ہوتی۔ بخارا یا کابل کے قالین جو شاید کسی کارواں سے لوٹے ہوئے تھے ـــ عورتوں کے ملبوسات سے بھرے ہوئے صندوق، ریشمی کپڑے، جو کسی ہوشیار عرب سوداگر سے کسی اور چیز کے معاوضے میں خریدے ہوئے ہوتے اور منقش چاندی کے زیور۔ خیمے کے دیواروں پر ٹنگے ہوئے ہتھیاروں کی اہمیت اور بھی زیادہ تھی۔ چھوٹے ترکی نیچے، نیزے، ہاتھی دانت یا بانس کے ترکش، مختلف لمبائیوں اور وزنوں کے تیر، اور شاید دباغت کیے ہوئے چمڑے کی مدور ڈھال، جس پر روغن لگا ہوا ہوتا۔

یہ بھی لوٹی ہوئی یا خریدی ہوئی چیزیں تھیں اور لڑائیوں میں قسمت جس کا ساتھ دیتی۔ اس کے ہاتھ پڑ جاتیں۔

تموچن ـــ نوعمر چنگیز خاں ـــ کے سپرد کئی فرض تھے۔ گرمیوں کی چراگاہوں سے جاڑوں کی چراگاہوں تک سفر کرتے ہوئے جتنی ندیاں نالے آتے ہیں سب میں مچھلیاں پکڑنا، خاندان کے بچوں کا فرض تھا۔ گھوڑوں کے گلے بھی ان کے سپرد تھے۔ اگر کوئی جانور گم ہو جاتا تو لڑکوں کو اس کی تلاش میں نکلنا پڑتا اور نئی چراگاہوں کی تلاش بھی لڑکوں کا فرض تھا۔ زمین اور آسمان کے سنگم کی طرف وہ ہمیشہ چوکنے ہو کے دیکھتے رہتے کہ کہیں سے کوئی حملہ آور تو نہیں آ رہے ہیں۔ کئی راتیں انھیں آگ کے بغیر برف میں گزارنی پڑتیں وہ مجبور تھے کہ کئی کئی دن مسلسل زین پر گزار دیں، اور تین تین چار چار دن تک پکا ہوا کھانا نہ کھا سکیں، کبھی کبھی تو انھیں مسلسل فاقہ کرنا پڑتا۔

جب بکری یا گھوڑے کا گوشت افراط سے میسر آتا تو وہ فاقے کے دنوں کی کسر

نکالنے کے لیے اتنا کھا اور بچا لیتے کہ حیرت ہوتی۔ ان کا کھیل یہ تھا کہ میدانوں میں بیس بیس میل تک گھوڑ دوڑ کی اور واپس آگئے یا پھر کشتیاں لڑتے تھے، جن میں اکثر ہڈیاں ٹوٹ جاتیں۔
تموجن کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا جسم بڑا طاقت ور تھا اور اس کے دماغ میں تجویزیں سوچنے کی بڑی صلاحیت تھی۔ یہ گویا اپنے آپ کو ان حالات میں ڈھالنے کا ایک اور طریقہ تھا وہ کشتی لڑنے والوں کا سردار بن گیا، حالانکہ وہ زیادہ تنومند نہ تھا۔ وہ تیراندازی خوب کر لیتا، لیکن کمان اپنے بھائی قسّار کے برابر نہ کھینچ سکتا، جس کا لقب کمان دار تھا، لیکن قسّار تموجن سے ڈرتا تھا۔

ان دونوں نے اپنے طاقت ور سوتیلے بھائیوں کے خلاف ایک محاذ بنا لیا تھا اور پہلا واقعہ جو پیش آیا یہ تھا کہ تموجن نے اپنے ایک سوتیلے بھائی کو مار ڈالا تھا، کیوں کہ اس نے اس کی ایک مچھلی چرالی تھی۔ رحم ان نوعمر خانہ بدوشوں کی نظر میں ایک بیکار سی بات تھی، لیکن انتقام فرض سمجھا جاتا تھا۔

تموجن کو بہت سے ایسے جھگڑوں کا علم ہونے لگا جو بچوں کی لڑائی سے زیادہ اہم تھے۔ اس کی ماں اولون خوبصورت تھی اور اسی لیے اس کا باپ اسے ایک پڑوس کے قبیلے سے عین اس کی شادی کے روز اڑا لایا تھا جب کہ وہ برات کے دن اپنے ہونے والے دولھا کے خیمے کو جا رہی تھی۔ اولون ہوشیار بھی تھی اور ضدّی بھی۔ تھوڑے بہت واویلا کے بعد وہ جن حالات میں تھی ان میں راضی رہی، لیکن یورت میں سب جانتے تھے کہ ایک دن بدی کا بدلہ لینے کے لیے اس کے قبیلے کے آدمی آئیں گے۔
راتوں کو گوبر کی جلتی ہوئی آگ کے پاس تموجن گویّوں کے گیت سنتا، یہ بوڑھے گویّے یکتارا لیے ہوئے ایک خیمہ سے دوسرے خیمہ تک سواری کرتے اور بھنبھناتی ہوئی آواز میں قبیلے کے بزرگوں اور بہادروں کی شجاعت کے گیت گاتے۔
اُس کو اپنی طاقت اور اپنی سرداری کے حق کا احساس تھا۔ کیا وہ یسوکائی بہادر کا سب سے بڑا بیٹا نہ تھا، جو بگّا یا بڑے مغلوں کے خان، اور چالیس ہزار خیموں کا سردار تھا۔

گوئیوں کی کہانیوں سے اس نے جانا کہ اس کا نسب اعلیٰ ہے۔ وہ بورجگین والوں کی اولاد سے ہے، جن کی آنکھیں بھوری ہوتی تھیں۔ اس نے اپنے جدّ امجد قبل خاں کا قصّہ سُنا، جس نے ختا کے شہنشاہ کی داڑھی نوچی تھی اور اسی لیے اسے زہر دے دیا گیا تھا۔ اُسے معلوم ہوا کہ اس کے باپ کا منہ بولا بھائی" جس نے بھائی بننے کی سوگند کھائی ہے طغرل خاں ہے جو قوم قرایت کا سردار ہے۔ گوبی کے خانہ بدوشوں میں یہ سب سے طاقت ور تھا اور اسی کے تعلق سے ایشیا کے پریسٹر جان کے قصّے یورپ میں پھیلے۔

لیکن اس وقت تموچن کا افق اپنے یا کا مغل قبیلے کی چراگاہوں تک محدود تھا۔

ایک دانش مند مشیر نے اس لڑکے سے کہا۔" ہم چین کے سَویں حصّے کے برابر بھی نہیں، لیکن اگر ہم چین کا مقابلہ کرتے رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب خانہ بدوش ہیں، ہمارا ساز و سامان رسد ہمارے ساتھ ہے، اور ہم کو اپنے طریقے کی لڑائی میں مہارت ہے۔ جب موقعے ملتے ہیں ہم لوٹتے ہیں اور جب لوٹ نہیں پاتے تو چھپ جاتے ہیں۔ اگر ہم بھی شہر بسانا شروع کر دیں اور اپنی عادتیں بدل ڈالیں تو ہم پھل پھول نہ سکیں گے۔ اِس کے علاوہ خانقاہوں اور مندروں میں آدمی نرم دل ہو جاتا ہے۔ نوعِ انسان پر حکومت وہی کر سکتا ہے جو خوفناک اور جنگجو ہو۔

جب وہ گلّے کی نگہبانی کے فرض کا زمانہ پورا کر چکا تو اسے اپنے باپ یسوکائی بہادر کے ساتھ ساتھ سواری کرنے کی اجازت ملی۔ ہر لحاظ سے وہ خوبرو تھا، لیکن جسم کی طاقت اور سیدھی اٹھان کی وجہ سے جتنا ممتاز معلوم ہوتا تھا، اتنا خد و خال کے لحاظ سے نہیں۔

وہ ضرور دراز قامت ہوگا۔ اس کے شانے ہموار اور اس کی جلد گندم گوں سفیدی مائل، ڈھلی ہوئی پیشانی کے نیچے، اس کی آنکھیں ایک دوسری سے دور دور تھیں لیکن ترچھی نہ تھیں۔ اس کی آنکھوں کے تل سبز یا نیلے بھورے تھے اور ان کا حاشیہ سیاہ تھا۔ لمبے سرخی مائل بھورے بال چوٹیوں میں گوندھے ہوئے اس کی پیٹھ پر پڑے رہتے۔ وہ بہت کم بات کرتا تھا اور جو کچھ کہتا کہنے سے پہلے غور کر کے کہتا۔ اسے اپنے

غصے پر قابو نہ تھا، لیکن لوگوں کو اپنا گہرا دوست بنانے کا اسے خداداد ملکہ تھا۔

عشق اس نے بھی یونہی دفعتہً کیا، جیسے اس کے باپ نے کیا تھا۔ جب باپ اور بڑا دونوں ایک اجنبی جنگجو کے خیمے میں مہمان تھے تو اس لڑکے کو خیمے کی لڑکی میں جاذبیت محسوس ہوئی۔ اس نے ییسوکائی سے پوچھا کہ کیا میں اسے اپنی بیوی بنا سکتا ہوں۔

"وہ ابھی چھوٹی ہے" اس کے باپ نے اعتراض کیا۔

تموچن نے بتایا "جب وہ بڑی ہو جائے گی تو اچھی خاصی نکلے گی"

ییسوکائی نے لڑکی کو جانچا، جو ابھی نو سال کی تھی، مگر بہت حسین تھی۔ اس کا نام بورتائی تھا اور اس نام کا ماخذ اس کے اپنے قبیلے کا روایتی جدِّ امجد تھا جس کی آنکھیں بھوری بھوری تھیں۔

"ابھی چھوٹی ہے" لڑکی کے باپ نے کہا، لیکن وہ خوش تھا کہ مغلوں نے اس کی لڑکی کو پسند کیا۔ اس نے کہا۔ پھر بھی تم چاہو تو اس کو دیکھ بھال لو۔ اس نے تموچن کو پسند کیا اور کہا "تیرے بیٹے کا چہرہ صاف ہے اور آنکھیں چمکدار ہیں"

دوسرے دن رشتہ طے ہو گیا اور مغل خان تموچن کو چھوڑ کے روانہ ہو گیا، تاکہ تموچن اپنے خسر اور اپنی ہونے والی دلھن سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔

کچھ روز بعد ایک مغل گھوڑا دوڑاتا ہوا یہ خبر لے کے آیا کہ ییسوکائی بہادر نے کچھ دشمنوں کے خیمے میں رات گذاری تھی اور شاید اُسے زہر دے دیا گیا۔ وہ مرنے کے قریب ہے اور اس نے تموچن کو یاد کیا ہے ــــــ تیرہ سالہ لڑکا جتنی رفتار سے سواری کر سکتا تھا، روانہ ہوا۔ لیکن جب وہ اردو، یعنی قبیلے کے خیموں والے گاؤں پہنچا تو اس کا باپ مر چکا تھا۔

اس کی غیر حاضری میں اور بھی بہت کچھ پیش آیا تھا۔ قبیلے کے سربرآوردہ لوگوں نے بہت سے معاملات پر بحث کی تھی اور ان میں سے دو تہائی سردار کا پرچم چھوڑ کے دوسرے آقاؤں اور پاسبانوں کو تلاش کرنے نکل گئے تھے۔ اپنی، اپنے گھرانوں اور اپنے گلّوں کی حفاظت کے لیے۔ اس ناتجربہ کار لڑکے سے انھیں اس حفاظت کی توقع

نہیں تھی۔

گہرا پانی بہہ گیا۔'' وہ کہتے تھے۔ کرٹیل پتھر ٹوٹ گیا۔ ایک عورت اور اس کے بچوں سے ہمیں کیا سروکار؟''

اولون، عقلمند اور بہادر تھی۔ جو کچھ اس سے ہو سکا، اس نے کیا کہ قبیلے کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔ اس نے یاک کی نو دُموں والا پرچم اپنے ہاتھ میں اٹھایا اور چھوڑ کے جانے والوں کا تعاقب کر کے ان کی منّت کی اور کچھ خاندان اپنی گاڑیوں اور گایوں سمیت واپس آ گئے۔

اب تموجن گھوڑے کی سفید کھال پر یاکا مغلوں کا خان ہو کے بیٹھا لیکن اس کے جلو میں قبیلہ کا صرف ایک بچا کھچا ٹکڑا تھا اور اسے اس کا یقینی طور پر اندیشہ تھا کہ مغلوں کے تمام پرانے دشمن یسوکائی کی موت سے فائدہ اٹھا کے اس کے بیٹے سے اپنا بدلہ چکائیں گے۔

تعارف وتبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

تلاش آزاد

مصنف: پروفیسر عبدالقوی دسنوی

صفحات: ۱۴۰ قیمت: ۴۰ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، نئی دہلی ۲۵

زیر تبصرہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات، شخصیت اور خدمات کے مطالعہ پر محیط ہے۔ مولانا آزاد کے مختصر حالاتِ زندگی اور میدانِ صحافت میں اُن کے کمالات اور سرگرمیوں کے جائزہ کے علاوہ اس کتاب کے دوسرے ابواب ہیں:۔ مولانا ابوالکلام کا سیاسی سفر، مولانا ابوالکلاؔ کی نظربندی، مولانا آزاد پہلی بار قید فرنگ میں، مولانا ابوالکلام وادیِ شاعری میں اور زلیخا بیگم کی کہانی۔ مولانا آزاد اور دوسروں کی زبانی۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ تقریباً ۴۰ سال سے ان کا قلم رواں ہے اور دیگر تصانیف کے علاوہ مولانا ابوالکلاؔ کی شخصیت اور کارناموں کی مختلف جہات پر ان کی دس کتابیں منظرِ عام پر آکر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

کتاب کے دوسرے باب "مولانا آزاد وادیٔ صحافت میں" میں دسنوی صاحب نے مولانا آزاد کی مختلف اخبارات ورسائل سے وابستگی کے دوران ان کے کون کون سے مضامین تاریخی ترتیب سے کس اخبار میں شائع ہو اس کی پوری تفصیل فراہم کی ہے اور اُن عناصر کی نشان دہی بھی کی ہے جو مولانا آزاد کو ایک ذمہ دار، فرض شناس اور بالغ نظر صحافی کے منصب پر فائز کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ۱۹۰۱ء میں ہفتہ وار احسن الاخبار کی ادارت سے منسلک تھے

وراسی زمانے میں انھوں نے حکیم محمد علی، مدیر مرقع عالم ہردوئی کے نام جن کی پالیسی سائنسی ضامین کو زیادہ سے زیادہ جگہ دینے کی تھی ایک مکتوب میں اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی ,مرقع عالم میں سائنس سے متعلق جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان سے جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں یا ہوسکتی ہیں ان کی روک تھام کی بھی فکر کرنی چاہیے۔ اسی خیال کے تحت ولانا آزاد نے "علومِ جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون اسی اخبار میں اشاعت کے یے بھیجا تھا۔

مصنّف نے مولانا آزاد کے پہلے بامقصد ماہنامے لسان الصدق سے متعلق اُس ور میں شائع ہونے والے اہم جرائد کے مدیران اور دیگر معروف شخصیتوں کی آراء بھی لم بند کی ہیں جن میں شیخ عبدالقادر مدیر مخزن، لاہور، مولوی ظفر علی خاں اور مدیر بین الاخبار مراد آباد و مدیر ایڈورڈ گزٹ شاہجہاں پور قابل ذکر ہیں۔ لسان الصدق کے مقاصد پر روشنی ڈال کر پروفیسر دسنوی نے مولانا آزاد کی ایک ایسے صحافی اور مدبر کی صویر پیش کی ہے جو صحیح معنوں میں سرسیّد کا ہم نوا تھا۔ شبلی کا ہمخیال و ہم مزاج تھا والطاف حسین حالی کے تصنیفی کاموں کا قدرداں بھی تھا۔

لسان الصدق میں شائع ہونے والی مولانا آزاد کی جنوری ۱۹۰۴ء اور مئی ۱۹۰۴ء کی اُن ونوں تحریروں کے حوالے بھی موجود ہیں جن سے بالترتیب مولانا کے کانگریس سے اختلافات ور پھر اس کی جانب رجوع کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ کانگریس کے تئیں مولانا کے ابتدائی خیالات اور پھر چار یا پانچ ماہ کے مختصر سے عرصہ میں ان خیالات میں یکسر تبدیلی کا راز غالباً اب تک پوری طرح کھل نہیں سکا ہے۔ ضرورت تھی کہ دسنوی صاحب ان وجوہ وحالات پر بھی اظہار خیال کرتے جن کے نتیجے میں مولانا کو اس ضمن میں اپنا موقف بدلنا یا نرم کرنا پڑا۔

لسان الصدق کے بعد جس اخبار کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے وہ ہے ہفتہ وار پیغام جسے مولانا آزاد کی سیاسی سرگرمیوں کا منظرنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اس باب میں اخبار کے ۲۳ ستمبر سے ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء تک شائع ہونے والے شماروں کے مشمولات کی تفصیل مع سرورق اور اعلانات

دی گئی ہے۔ دسنوی صاحب نے ابواب کے اختتام پر جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ قاری کے ذہن کو پوری طرح چھو لیتے ہیں مثلاً ہفتہ وار پیغام، کلکتہ کے باب میں وہ لکھتے ہیں:

"(پیغام کے) مشمولات کا مطالعہ کیجیے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ تحریریں جو دوسرے ممالک سے متعلق رہیں، خاص طور سے اسلامی ممالک کے بارے میں یا پھر خود ہندوستان کی مختلف تحریکوں یا سیاسی جماعتوں کے مختلف اقوام یا منصوبوں اور فیصلوں کے سلسلے میں ان سب کا سرا آخر میں ہندوستان کی تحریک سے جا ملتا ہے مولانا آزاد نے ان اندراجات کی مدد سے سارے ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ اس ملک کے رہنے والے آزادی کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور متحد ہو کر اس کو حاصل کریں....."

مولانا آزاد کی مختلف صحافتی منازل کے شانہ بشانہ ان کے سیاسی سفر اسیری و نظر بندی کے موضوعات کا بھی مصنف نے مبسوط انداز میں احاطہ کیا ہے۔ قیام رانچی کے زمانہ میں مولانا آزاد کے پاس قلندر کمبل پوش کا آگرہ سے رانچی پیدل چل کر آنا اور ان سے مختصر مکالمہ کا واقعہ قارئین کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ہر چند کہ مولانا آزاد کی شعر گوئی کو ایک وقتی رجحان سے زیادہ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر شک کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں بعض ایسے حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے جو زمانہ کی نظروں سے اوجھل تھے مثلاً مولوی عبدالواحد سہسرامی تلمیذ مولوی فاروق چریاکوٹی کی ترغیب پر شعر گوئی کی تحریک، امیر مینائی، داغ دہلوی، امداد حسین ظہور میرٹھی اور شوق نیموی اور مرزا طیلسی عراقی سے اصلاح سخن اور آزاد تخلص یا عرفیت اختیار کرنے کی توجیہ۔ مولانا آزاد کی تربت خود ان کے اس شعر کی تفسیر ہے کہ ؎

گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد — شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

دسنوی صاحب کا اسلوب اختصار اور جامعیت سے عبارت ہے اور مولانا آزاد سے ان کی ذہنی قربت کا عکاس ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے یہ کتاب لکھ کر بڑی حد تک مولانا آزاد کے اس قول کی توثیق کی ہے کہ:

"بازار میں وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی ہے اس لیے ہر ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے مگر میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی بھی عام مانگ ہوئی میری دوکان میں جگہ نہ پا سکی۔"

سہیل احمد فاروقی

چند ایران شناس

مصنف: کبیر احمد جائسی
ناشر: ادارۂ علوم اسلامیہ، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ
صفحات: ۲۰۰ قیمت: ۸۰ روپے

زیر تبصرہ کتاب چار مطالعوں پر مشتمل ہے جن میں ان چند غیر ایرانی دانشوروں کا تعارف کرایا گیا ہے جنھوں نے ایرانی قوم کو اس کے ادب کے ذریعہ سمجھا اور اپنے ہم وطنوں سے اسے متعارف کرایا۔ ان میں سے ایک کا تعلق ترکی سے، دوسرے کا اٹلی سے، تیسرے کا اسرائیل سے اور چوتھے کا چیکوسلواکیہ سے ہے۔ اس مطالعہ میں چیکوسلواکیہ کی دانشور یرژی بیچکا کو شامل کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ماوراءالنہر تک محدود رہنے کے باوجود ان کا موضوع بحث بھی فارسی ادب ہے یوں بھی ایران اور ماوراءالنہر کے درمیان ثقافتی ربط کے پیش نظر یرژی بیچکا کا مطالعہ ایران شناسی سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔

ایرانی تہذیب کا شمار دنیا کی بڑی تہذیبوں میں کیا جاتا ہے۔ اس تہذیب نے جو فارسی ادب پیدا کیا اس کی سحر انگیزی اور معنی آفرینی کا زمانہ معترف ہے۔ ایران کے فارسی ادب کی جاذبیت نے ہی غیر ایرانی دانشوروں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی ہے جب کسی قوم یا اس کے پیدا کیے ادب کا مطالعہ اغیار کرتے ہیں تو اس قوم کے تہذیبی ورثہ کی افادیت بڑھ جاتی ہے کبیر احمد جائسی نے اغیار کی ایران شناسی سے اردو قارئین کو متعارف کرا کے ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

ترکی دانشور احمد آتش کے مختصر حالات زندگی کے ذکر کے بعد پروفیسر جائسی نے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ احمد آتش کے ادبی منصب کا تعین کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "یوں تو ترکی میں احمد آتش سے بھی بڑے اور اہم محقق گزرے ہیں مگر احمد آتش کی حیثیت اپنی جگہ صرف اس لیے مسلم اور قابل تعریف و تقلید ہے کہ انھوں نے اپنے ملک میں مشرقیات اور خاص کر فارسی علم و ادب کی تحقیق و ترویج میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان میں وہ منفرد ہیں۔" احمد آتش کا نصب العین یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات اور تالیفات کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں کو عربی و فارسی کے اعلیٰ علمی سرمایوں سے روشناس کرا سکیں، انھوں نے ترکی زبان میں فارسی زبان پر ایک محققانہ کتاب تحریر کی جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے

ہر نئے اڈیشن میں انھوں نے کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کیے۔ عربی زبان کی قواعد پر بھی انھوں نے ایک کتاب شائع کی۔ احمد آتش نے دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر پائی لیکن وہ مستقل جستجو اور تحقیق میں مشغول رہتے تھے اسی لیے انھوں نے کم عمر میں بھی بڑے گرانقدر ادبی کارنامے سرانجام دیے۔ بین الاقوامی سیمناروں میں ان کی شرکت خوش آئند سمجھی جاتی تھی۔ ایسے ہی بین الاقوامی سیمناروں میں انھوں نے اعلیٰ درجہ کے محققانہ مقالے پیش کیے۔ ان مقالات کے ذریعے احمد آتش نے تحقیق و تنقید کے "آئین نو" وضع کرنے کی کوشش کی۔ تنقیدی متن کے بارے میں ان کی تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ترکی دائرۃ المعارف کے لیے انھوں نے پچاس مقالے سپرد قلم کیے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بھی اُن کے پانچ مقالے شامل کیے گئے۔ ان کا ایک اہم ادبی کارنامہ غزنویوں کے عہد کی گم شدہ مثنویوں میں سے عیوقی کی مثنوی "ورقہ وگلشاہ" کی بازیافت ہے جو شاہنامہ فردوسی کی ہم عہد ہے اور جس کا موضوع عشق ہے احمد آتش نے اس مثنوی کو "ایک گم شدہ ادبی ہئیت کا منفرد نمونہ" قرار دیا ہے۔ احمد آتش نے ترکی کے مختلف قدیم کتب خانوں میں محفوظ مخطوطوں کی تفصیلی اور تحقیقی فہرستیں بھی مرتب کی ہیں۔ انھوں نے رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کے غزنویوں اور سلجوقیوں کی بابت حصّوں کے تنقیدی متن کو دو الگ الگ جلدوں میں شائع کیا۔ احمد آتش کے مطالعے کے اختتام پر کبیر احمد جائسی نے احمد آتش کی سندبادنامہ اور ترجمان البلاغہ کی تحقیقات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا دوسرا مطالعہ اٹلی کے دانشور اور مشہور مستشرق الیساندرو بوزانی سے متعلق ہے، بوزانی نے مشرقی علوم پر جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے مشرق والے ہی زیادہ واقف نہیں۔ اس لیے بوزانی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں اور اس کی افادیت بھی مسلم ہے۔ بوزانی کا سوانحی خاکہ دینے کے بعد کبیر احمد جائسی نے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا ہے، بوزانی کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ انھوں نے مختلف مذاہب کا غائر نظر سے مطالعہ کر کے ان کے اصل تک پہنچنے کی کوشش کی، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور تلاش و جستجو کا سلسلہ بھی۔ انھیں "عجائب روزگار" کہا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ پچیس زبانوں سے واقف

تھے جن میں سے تیرہ زبانوں میں روانی سے بامحاورہ گفتگو کر سکتے تھے۔ ان کی بیشتر تصانیف اطالوی زبان میں ہیں۔ بوزانی کا ایک کارنامہ جاوید نامے کا اطالوی ترجمہ ہے جس نے اٹلی میں اقبال شناسی کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اطالوی زبان میں قرآن پاک کا بھی ترجمہ کیا جس کی مغربی ملکوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس پر کہیں سے صدائے اختلاف بلند ہوتی۔ لیکن کبیر احمد جائسی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "ماخذ قرآن" کے زیر عنوان بوزانی نے کیا لکھا ہوگا۔ جاوید نامے کے علاوہ بوزانی نے اقبال کے منتخب فارسی اور اردو کلام کا بھی اطالوی میں ترجمہ کیا۔ اس کے مقدمے میں انھوں نے اقبال اور ان کے پیش رو شعراء کا فنی اور فکری موازنہ کرکے اقبال کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ بوزانی نے عمر خیام کی رباعیات کا نثری ترجمہ اطالوی میں کیا۔ تراجم کے علاوہ کبیر احمد جائسی نے بوزانی کی طبع زاد تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں 'تاریخ ادبیات پاکستان' تاریخ ادبیات ایران اور ایرانیان قابلِ ذکر ہیں۔ تاریخ ادیان بھی بوزانی کا محبوب موضوع تھا۔ اس موضوع پر انھوں نے جو کتاب لکھی اس میں زردشت سے لے کر بہاءُاللہ تک کے مذاہب کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مصنّف نے اس کتاب کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ بوزانی نے کئی رسالے بھی تحریر کیے اور مقالے بھی۔ ان کا ایک قابل ذکر رسالہ دین اسلام کے عنوان سے ہے۔ بوزانی کے بارے میں کبیر احمد جائسی کا مطالعہ ثانوی ماخذوں پر مبنی ہے۔ اسی لیے بوزانی کے علمی رتبے کا تعیّن کرنے میں قاری کو دشواری پیش آسکتی ہے۔ البتہ اردو قاری سے ایک مشہور لیکن غیر معروف مستشرق کا تعارف ہو جاتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے تیسرے مطالعہ کا موضوع میخائل زند سے متعلق ہے۔ میخائل زند کا خاندان پولینڈ سے ترک وطن کرکے سابق روسی سوشلسٹ جمہوریہ او کرائن آگیا تھا جہاں ان کی پیدائش ہوئی۔ انھوں نے ماسکو میں تعلیم حاصل کی اور کچھ عرصہ تاجکستان میں بھی رہنے کا موقع ملا۔ بعد ازاں ماسکو میں وہ مختلف اداروں سے وابستہ رہے لیکن بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر جون ۱۹۷۱ء میں ترک سکونت کرکے اسرائیل آگئے اور اب وہیں ان کا قیام ہے۔ پروفیسر زند نے اب تک جو کام کیے وہ روسی تاجیکی بہ خطّہ روسی اور عبرانی زبانوں میں ہیں۔ کبیر احمد جائسی نے اپنے مقالے کی بنیاد پروفیسر زند کی روسی زبان میں لکھی اس کتاب کو بنایا ہے جس کا انگریزی ترجمہ

SIXTH CENTURY OF GLORY کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر زند نے
یہ کتاب روسی قارئین کو سامنے رکھ کر لکھی ہے اور اسی لیے انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔
کبیر احمد جائسی نے اس کتاب کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ کتاب عہد
کی فارسی کا نہ صرف یہ کہ ایک قابل قدر مطالعہ ہے بلکہ ہمارے سامنے بہت سے سوالات بھی
پیش کرتی ہے۔ پروفیسر زند کے مطالعے میں کبیر احمد جائسی کا تجزیاتی و تنقیدی طریقہ واضح ہو کر
سامنے آتا ہے۔

اس کتاب کا چوتھا مطالعہ چیکوسلواکیہ کے دانشور یرثری ببچکا سے متعلق ہے۔
پروفیسر ببچکا کا مختصر سوانحی خاکہ پیش کرنے کے بعد کبیر احمد جائسی نے ان کی مشہور کتاب
تاریخ ادبیات تاجکستان کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دو حصّوں میں تقسیم ہے۔
حصّہ وسط ایشیائی ایران سے علیحدگی (سولہویں صدی عیسوی) سے لے کر اقتدار روس
زمانے پر محیط ہے۔ دوسرا حصّہ اکتوبر انقلاب کے بعد سے ۱۹۶۸ء تک کے "تاجکی ادب
احاطہ کرتا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں جائسی صاحب کا خیال ہے کہ "پروفیسر ببچکا
اپنے اس مطالعہ میں بڑی محنت، دیدہ ریزی، ژرف نگاہی اور بے تعصبی کا ثبوت دیا
اور ادبیات کو اس کے محرکات کے صحیح پس منظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے
لیکن جائسی صاحب کے نزدیک پروفیسر ببچکا کی اتنی گراں قدر کاوش میں اس لیے ادھ
ہے کہ اس میں ادبیات کی تفہیم کے لیے اس دور کے مذہبی رجحانات، معتقدات، اختلا
کا مطالعہ کر کے اس دور کے ادبیات میں ان کے اثرات کو تلاش کرنے کی سعی نہیں کی ہے
جائسی صاحب کی اس رائے سے اتفاق ہے کیوں کہ ادبیات کے مطالعہ کے لیے "مکمل نگا
ہونا ضروری ہے اور اس میں شبہہ کی گنجائش نہیں کہ فارسی ادبیات پر مذہب کا گہرا اثر
اردو قارئین کے لیے پروفیسر کبیر احمد جائسی کی تصنیف چند ایران شناس ایک مفید کتاب
ہوگی۔ اس کے مطالعہ سے معلومات حاصل ہوتی ہیں اور سوالات بھی ذہن میں ابھرتے ہیں۔ جائسی
نے اپنے نقد و تبصرہ سے ایران شناسی سے وابستہ چند اہم دانشوروں کے مطالعہ کی افادیت میں
کر دیا ہے جو قابل تحسین ہے۔

سید جمال الدین

سہیل احمد فاروقی

احوال وکوائف

پروفیسر عنوان چشتی کو اردو اکادمی کا ایوارڈ

اردو اکادمی دہلی نے پروفیسر عنوان چشتی کو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور فن شعر میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ برائے شاعری (۱۹۹۱ء) سے نوازا ہے۔ پروفیسر عنوان چشتی نے ایم۔اے (اردو) امتحان میں ۱۹۶۳ء میں امتیاز سے کامیاب ہوکر ۱۹۷۳ء میں اپنے مقالے بہ عنوان "اردو شاعری میں ہیئت اور تکنیک کے تجربے" پر دہلی یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۴ء میں ان کا تقرر جامعہ میں لکچرر کی حیثیت سے عمل میں آیا جہاں وہ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے ۱۹۷۵ء میں ریڈر اور پھر پروفیسر مقرر ہوئے۔ ان دنوں چشتی صاحب فیکلٹی آف ہیومینٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین بھی ہیں۔ وہ ایک ہمہ جہت فنکار ہیں اور اپنے علمی مشاغل میں سرگرم رہنے کے ساتھ ثقافتی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ ہند و پاک کے مؤقر جرائد ورسائل میں متعدد مضامین لکھنے کے علاوہ پروفیسر چشتی صاحب نے زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر ۱۸ کتابیں تصنیف کی ہیں اور کچھ اہم عنوانات زیر طبع بھی ہیں۔ ان کے طرز تحریر نے بعض ادبی و ثقافتی رجحانات پر اپنے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ ادبی حلقوں میں وہ بہ یک وقت شاعر، ادیب، نقاد اور خطیب کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کئی ادبی اور ثقافتی مجلسوں کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت بہت سے نظریات اور رجحانات سے کسب فیض کرتے ہوئے اپنی انفرادی شان سے رونما ہوتی ہے جسے انتخابی تنقید کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلیں ایسی کیفیت کی حامل ہوتی ہیں جو قاری کو لطف وسرشاری سے ہمکنار کرتی ہے۔

تعلیم بالغان کے ترغیبی مواد کی تیاری پر قومی ورکشاپ

۱۸ ر تا ۲۹ مئی ۔ خواتین اور محروم افراد کی مکمل خواندگی کی مہم والے علاقوں کے لیے ترغیبی اور بعد از خواندگی مواد کی تیاری کے موضوع پر ایک ورکشاپ نما تربیتی پروگرام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسٹیٹ ریسورس سنٹر، ایشیائی ثقافتی مرکز برائے یونیسکو جاپان، یونیسیف اور انسانی وسائل وبہبود کی وزارت کے ڈائرکٹوریٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن کے اشتراک وتعاون سے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ میں منعقد ہوا جس کا مقصد تھا ملک کے ہر فرد کو تعلیم کے مواقع فراہم کرنا۔ اس پروگرام میں ۲۷ شرکاء اور ۹ مشاہدین نے حصہ لے کر مختلف صوبوں کی نمائندگی کی۔ محترمہ نشاط فاروق، ڈائرکٹر اسٹیٹ ریسورس سنٹر نے افتتاحی تقریر میں اپنے خطبۂ استقبالیہ میں تین اہم مقاصد کی طرف خصوصی توجہ دلائی یعنی خواتین اور سماج کے محروم طبقوں تک اس منصوبہ کے فوائد کو پہنچانا، آسان اور علمی سائنسی معلومات پر مبنی بعد از خواندگی مواد کی تیاری اور لوگوں کے سماجی حالات پر مبنی مواد کی تیاری۔

اس کے علاوہ جناب اے کے پاسو، ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم بالغان وزارتِ انسانی وسائل حکومت ہند نے اپنے کلیدی خطبہ میں گزشتہ سال اسلام آباد میں منعقد بین الاقوامی کانفرنس اور اسی کے تسلسل میں اس ورکشاپ کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔ ورکشاپ کے دوران جن شرکاء نے مضامین پڑھے ان کے نام ہیں جناب وی کرشنا مورتی (تامل ناڈو)، جناب ذنیش پروہت (راجستھان) محترمہ اندو سنہا (بہار) محترمہ سدھا منی (کرناٹک) جناب وی کے عبدالرحیم (کیرالا) اور محترمہ نشاط فاروق (دہلی)

دوسرا ریفریشر کورس برائے سوشل ورک

سوشل ورک کے اساتذہ کو جدید ترین تکنیک سے واقف کرانے کی غرض سے جامعہ کے شعبۂ سوشل ورک نے اکیڈمک اسٹاف کالج کے اشتراک سے ۲۴ ر اپریل تا ۱۳ ر مئی ۹۲ء دوسری بار تین ہفتہ پر مشتمل ایک ریفریشر کورس منعقد کیا جس میں مختلف صوبوں سے بشمول ۵ خواتین ۲۱ ر اساتذہ نے شرکت کی۔ اس تربیتی نصاب کا افتتاح دہلی یونیورسٹی کے سابق پرووائس چانسلر پروفیسر کے۔ بی گنگراڈے نے فرمایا۔ نصاب کا نظام عمل کئی موضو

پر منقسم تھا جن سے متعلق جامعہ کے اساتذہ کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کے ممتاز اہل علم اور ماہرین نے لکچر دیے۔ دوران نصاب شرکاء کو پارلیمنٹری اسٹڈیز بیورو، لوک سبھا اور راجیہ سبھا دیکھنے کا موقع فراہم کیا گیا اور دہلی و آگرہ کے تاریخی مقامات کی سیر بھی کرائی گئی۔

کیندریہ ودیالیہ سنگٹھن کے ان سروس ایجوکیشن کورس میں اساتذۂ جامعہ کی ریسورس پرسن کی حیثیت سے شرکت

مرکزی تنظیم مدارس، نئی دہلی نے ۱۳ر مئی تا یکم جون ۱۹۹۲ء تاریخ کے پوسٹ گریجویٹ اساتذہ کے لیے ایک دورانِ کار تعلیمی کورس انعقاد کیندریہ ودیالیہ گول مارکیٹ، دہلی میں کیا جس میں پورے ملک سے ۳۱ر اساتذہ نے شرکت کی۔ اس میں حصہ لینے والے دس خصوصی مشیروں میں جامعہ سے ڈاکٹر سید جمال الدین، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، ڈاکٹر مجیب اشرف، ڈاکٹر سید عنایت علی زیدی اور محترمہ ڈاکٹر سنیتا زیدی، ریڈر شعبۂ تاریخ و ثقافت جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی شامل تھے۔ ان حضرات نے درج ذیل موضوعات پر لکچر دیے۔

ڈاکٹر سید جمال الدین (۱) قرون وسطیٰ کی تاریخ کے مطالعہ کی جہتیں (۲) عہد وسطیٰ کا ہندوستانی فن تعمیر: مقصد، تکنیک اور جمالیات (۳) صوفی اور بھگتی تحریک (۴) عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اقتدار اور مذہب۔

ڈاکٹر مجیب اشرف: (۱) ہندو سماج میں مذہبی اصلاح کی تحریک (۲) مسلم یونیورسٹی میں مذہبی اصلاح کی تحریک۔

ڈاکٹر سید عنایت علی زیدی: (۱) سلطنت مغلیہ کا زوال۔ مختلف نظریات (۲) ۱۸ویں صدی کا ہندوستان۔

ڈاکٹر سنیتا زیدی: (۱) عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مشینی و تکنیکی ترقی (۲) مال گذاری کا نظام

ڈاکٹر سید جمال الدین کے ساتھ شرکاء نے دہلی، آگرہ اور فتح پور سیکری کے تاریخی مقامات بھی دیکھے۔

اساتذۂ شعبۂ تاریخ کی شملہ میں منعقد سمینار میں شرکت

انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ نے ۲۸ راپریل تا یکم مئی ۹۲ء نہرو میمو
میوزیم اینڈ لائبریری (نئی دہلی) اور اربن ہسٹری ایسوسی ایشن آف انڈیا کے اشتراک
"ہندوستانی تاریخ میں چھوٹے شہر اور شہری ودیہی نظام" کے موضوع پر ایک سمینا
منعقد کیا۔ اس سمینار کے شرکاء میں ملک کی یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں سے
وابستہ معروف شخصیتیں بھی شامل تھیں۔ یہ سمینار ۹ علمی نشستوں میں منقسم تھا۔ ڈ
سید جمال الدین، ڈاکٹر سید عزیز الدین اور ڈاکٹر سنیا زیدی نے سمینار میں جامعہ ملیہ اسلا
کی نمائندگی کی جنھوں نے بالترتیب "عہد وسطیٰ کے قصبات میں خانقاہوں کی مرکزیت
خانقاہ برکاتیہ مارہرہ کے حوالے سے" "امروہہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا ایک شہری م
اور "پالی: مشرق و مغرب کی درمیانی کڑی" کے عنوانات پر مضامین پیش کیے۔ سمینار میں
پیش کیے گئے جملہ مضامین ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں برائے مطال
دستیاب ہیں۔

ڈاکٹر عابد حسین میموریل لکچر

۷رمئی ۱۹۹۲ء کو جامعہ کے کانفرنس ہال میں ڈاکٹر عابد حسین میموریل لکچر ڈاکٹر عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے ز
اہتمام منعقد ہوا جس میں مہمان مقرر محترمہ ڈاکٹر زہرا سیدین، پروفیسر سنٹر آف انٹرنیشنل ایجوکیشن اینڈ ڈیولپمنٹ
یونیورسٹی آف البرٹا، کناڈا نے کثیر جماعتی معاشرہ میں مسلمانوں کی حیثیت کے موضوع پر اظہار خیال ک
انھوں نے دنیا کے دوسرے کثیر جماعتی معاشروں میں مسلمانوں کی حیثیت کے مطالعہ کی اہمیت
اور ضرورت پر زور دیا۔ اعداد و شمار کے حوالے سے ڈاکٹر زہرا سیدین نے کہا کہ دنیا کے تقریباً تمام
ممالک میں کثیر یا قلیل تعداد میں مسلمان آباد ہیں جن میں سے ۴۶ ایسے ہیں جو خود کو آئینی طور پر
اسلامی ریاست ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور ان سب میں اجتماعی کثرت قدر مشترک کے طور پر
پائی جاتی ہے تو ایسا مطالعہ ضرور ہونا چاہیے کہ وہ مذہبی، ثقافتی اور قومی سطحوں پر حیات با
کے کن اصولوں کو اختیار کرتے ہیں۔ انھوں نے کناڈا کے مسلمانوں کے مسائل و حالات کے حوالہ سے
اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور خصوصاً نوجوانوں سے ایک وسیع جا
اور جمہوری طرز فکر اپنانے کی بھی درخواست کی۔

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۹۲ء | شمارہ ۹

فہرست مضامین

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئ

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

ہندوستان کا نظامِ تعلیم ناقص ہے، اس سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو۔ نظام تعلیم کیا ہو اس مسئلہ پر غور کیا جاتا رہا ہے فیصلے ہوئے ہیں منصوبے بنتے ہیں، قومی پالیسیاں بھی مرتب ہوئی ہیں لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم دونوں میدانوں میں تجربے تو کیے جا رہے ہیں لیکن دنیا اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے کہ ہم اس کی رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں۔ بے شک ملک کے معاشی و اقتصادی شعبے بہت اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی مناسب تنظیم کرنا ملکی حکومت کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ ہماری معاشی خوشحالی کا دار و مدار ترقیاتی منصوبوں پر ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کی تشکیل کا کام حکومت کا ہے۔ نظام تعلیم کا ترقیاتی منصوبوں سے گہرا ربط ہے۔ اسی لیے اس کی تشکیل اور تنظیم حکومت ہی کے دائرۂ عمل میں آتی ہے اور اس کا کام یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ترقیاتی منصوبوں سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس پر نظر رکھے کہ ہمارا نظام تعلیم سماجی سطح پر ہم آہنگی اور یک جہتی کو کس حد تک فروغ دے رہا ہے۔ مرکزی حکومت میں انسانی وسائل کی ترقی کی وزارت تعلیم سے تعلق قومی پالیسیاں مرتب کرتی ہے۔ لیکن چونکہ آئین نے تعلیم کا معاملہ ریاستوں کے سپرد کیا ہے لہٰذا ریاستیں اس شعبہ میں خود مختار ہیں۔ جب تک مرکز اور ریاستوں دونوں میں ایک ہی سیاسی جماعت حکمراں تھی مرکز اور ریاستوں کے تعلیمی نظام میں تضادات نہیں اُبھرے۔ لیکن اب سیاسی صورتِ حال بدل چکی ہے۔ مرکز میں حزب مخالف میں شامل سیاسی جماعتوں کی کئی صوبوں میں حکمرانی ہے۔ شمالی ہندوستان کے چار اہم صوبوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہے اور اس نے اپنے زیرِ حکومت صوبوں میں نظام تعلیم میں اپنے مخصوص نظریات کے مطابق تبدیلیاں کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

۲۳ر اگست ۱۹۹۲ء کے انگریزی اخبار انڈین ایکسپریس (دہلی اڈیشن) میں ایک اہم رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اخبار کے نمائندہ لکھنؤ یوگیش باجپئی نے اتر پردیش کے بنیادی اور ثانوی تعلیم کے ریاستی

اگر سیاست کا مفہوم زیرِ تشکیل تاریخ ہے تو جس طرح ہم نے اب تک سیاست چلائی ہے اس نے ہمارے تاریخ پڑھانے کے طریقے کو بے مصرف بنا دیا ہے۔ "تاریخ کا مطالعہ مستقبل کے رہبر کی حیثیت سے ہونا چاہیے جو ہمیں یہ سکھائے کہ اپنے عوام کے تحفظ کے لیے کون سی پالیسی موزوں ترین ثابت ہوگی اور یہی اس کا اصل مقصد و ماحصل ہے۔"

پہلی عالمی جنگ کے بعد ہٹلر نے جرمنی میں رائج طریقۂ تعلیم کو نئی شکل دینے کا عزم کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ طلباء کو تہذیب ساز آریائی نسل کے نمائندہ افراد کی حیثیت سے اعلیٰ تہذیب سے واقف کرایا جائے اور ان اقدار کی تعلیم دی جائے جس کے ذریعہ وہ اس تہذیبی فوقیت کا تحفظ کر سکیں۔ اس نے اس بات کی تاکید کی کہ "ایسے انداز میں تاریخ نگاری بہت اہمیت رکھتی ہے جس میں نسلی مسائل کو نمایاں طور پر موضوعِ بحث بنایا گیا ہو۔" ہٹلر اس خیال کا بھی حامی تھا کہ علوم کو بھی ایک ایسے آلۂ کار کی شکل دینا چاہیے جس سے قوم میں فخر کا جذبہ بیدار ہو اور نہ صرف تاریخِ عالم بلکہ تاریخِ تہذیبِ عالم بھی مجموعی طور پر اسی اصول کی روشنی میں پڑھائی جانی چاہیے۔

پورنیا ہٹلر کے ان خیالات میں اور بی جے پی کی نئی تعلیمی پالیسی میں مماثلت دیکھتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ بی جے پی کی یہ منطق کہ طلباء کو "تاریخ پڑھانے کا مروج طریقہ دورِ حاضر کی سیاست کے لیے مہلک ثابت ہوا ہے۔" ہٹلر کے اس طریقہ سے کسی طرح مختلف نہیں ہے جو اس نے خود اپنے ملک میں تاریخ کی تعلیم کے سلسلے میں تجویز کیا تھا۔ اسی طرح ویدک ریاضی کو شاملِ نصاب کرنے کی منطق ہٹلر کی تجویز سے مشابہ نظر آتی ہے جس کا مقصد ملک میں سائنس کی تعلیم کے طریقہ میں تبدیلی لانا تھا۔ پورنیا لکھتی ہیں کہ تاریخ اور علوم جیسے مضامین ہی نہیں بلکہ جسمانی اور فوجی تربیت کی ہٹلرانہ تاکید آر۔ ایس۔ ایس کے زیرِ اہتمام چلنے والی شاکھاؤں میں دی جانے والی تعلیم و تربیت سے بہت قریب ہے۔ ہٹلر کا خیال تھا کہ "ریاست کو اپنے تعلیمی امور اور منصوبوں کو اس طرح تشکیل دینا چاہیے کہ بچپن سے لے کر آگے کی عمر تک نوجوانوں کو منظم تربیت دی جائے تا کہ ان کے جسم مستقبل کے مطالبات کی تکمیل کے لیے سخت اور پختہ بن جائیں۔"

ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ فسطائی جماعتوں کا آدرش ہیرو ہٹلر نہیں تو کیا کارل مارکس ہوگا۔

نادین سنگھ نے بحث کو ایک اور رخ دیا ہے۔ انڈین ایکسپریس (دہلی اڈیشن ۳۰ راگست ۱۹۹۲ء) میں اپنے کالم Capital Notes میں 'تاریخ چورا ہے پر' کے عنوان سے لکھتے ہوئے وہ بی۔ جے پی کی دانشوری کو مضحکہ خیز تصور کرتی ہیں۔ تاہم انھوں نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ کانگریس کے چالیس سالہ دورِ حکومت میں بھی جعلی تاریخ پڑھائی جاتی رہی ہے وہ لکھتی ہیں کہ ہو سکتا ہے قدیم ہند یا مغل دور کی تاریخ میں کانگریسی

حکومت نے تبدیلیاں کرنے کی زحمت نہ کی ہو لیکن تحریک آزادی کی شاندار داستان دہرانے اور بچّوں کو ہمارے عظیم رہنماؤں کے کارنامے بتلاتے وقت کانگریس حکومتوں نے کیا سچائی کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا۔ وہ سوال کرتی ہیں کہ کیا ہمیں یہ نہیں پڑھایا گیا کہ ”مہاتما گاندھی کے بعد جو سب سے اچھی بات ہندوستان میں ہوئی وہ چاچا نہرو کا وجود تھا۔“ لہٰذا تلوین کا یہ کہنا ہے کہ اب اگر آر۔ ایس ایس کے بانی ڈاکٹر کیشو راؤ ہیڈگیور جیسے لوگوں کو عظیم رہنما بتا کر بی۔ جے پی کے لوگ ان کی توصیف بیان کر رہے ہیں تو ہم انھیں کیسے باز رکھ سکتے ہیں۔ تلوین کو آر ایس ایس کے عالمی نظریہ سے کوئی دلچسپی نہیں اور انھیں انڈین ایکسپریس میں اپنے مستقل کالم کے بارے میں جو نفرت بھرے خطوط ملتے ہیں ان میں سے بیشتر آر ایس ایس کے ہمدردوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔ تاہم وہ ہیڈگیور اور ان کے دیگر برخوردار 'نکّر والوں' کو پنڈت نہرو اور ان کے اہل خاندان سے کم دیش بھکت نہیں سمجھتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اگر ایک سیاسی جماعت محض وزراء اعظم کو 'بڑے پیغمبر' ثابت کرنے کے لیے تاریخ کو مسخ کرنا اپنا حق سمجھتی ہے تو اگر کوئی دوسری سیاسی جماعت بھی ایسا ہی کرے تو ہم اعتراض نہیں کر سکتے۔ وہ سوال کرتی ہیں کہ کیا ہندوستان میں کوئی ایسی درسی کتاب ہے جس میں نہرو یا گاندھی پر ناقدانہ سوال قائم کیے گئے ہوں؟ کیا بچّوں کو پڑھایا جاتا ہے کہ وہ نہرو کے معاشی افکار یا گاندھی جی کی سیاست میں مذہبی علامتوں پر تنقیدی نگاہ ڈالیں؟ تلوین کا خیال ہے کہ یہ دو رہنما چاہے کتنے ہی عظیم ہوں لیکن یہ سوالات اپنی جگہ معقول ہیں۔

تلوین سنگھ نے جو سوال اٹھائے ہیں، جو بحث چھیڑی ہے اس میں ایک پہلو بہت کمزور ہے اور وہ یہ کہ گاندھی نہرو روایت اور ہیڈگیور روایت کے درمیان انھوں نے کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے۔ ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں گاندھی نہرو روایت نے مثبت رول ادا کیا ہے۔ ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کیے بغیر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آزاد، جمہوری، سماج وادی اور سیکولر ہندوستان کی تعمیر میں ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور وہ قوتیں یا افراد یا افکار جو ہندوستان کو جمہوری، سماج وادی اور سیکولر آدرشوں کی مخالف سمت میں لے جانے کے لیے کوشاں تھے۔ انھیں ہم گاندھی، نہرو اور ابوالکلام آزاد کے مساوی نہیں کھڑا کر سکتے۔ ہندو راشٹر کی تاریخ میں گاندھی و نہرو ولین ہوں گے اور ہیڈگیور ہیرو۔ اس کے برعکس ہندوستانی متحدہ قومیت کی تاریخ میں ہیڈگیور اور ان کے برخوردار 'نکّر والے' ولین ہوں گے اور گاندھی، نہرو اور ابوالکلام آزاد ہیرو۔ نہرو خاندان سے بغض رکھنے کی وجوہات ہو

سکتی ہیں لیکن یہ بغض اتنا بھی نہ بڑھ جائے کہ ہم مثبت اور منفی رجحانات میں تمیز نہ کر پائیں۔

بی جے پی ہو یا کانگریس یا کوئی دوسری سیاسی جماعت، تاریخ نگاری کے باب میں سیاسی دانشوری کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ سماجی علوم کے ماہرین اپنی تحقیقی کاوشوں میں اس کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ایسا علم معاشرہ کو دیں جو اسے بہتر طریقے سے اجتماعی زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائے۔ مؤرخ ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں، حال سے نظر حاصل کرتے ہیں اور مستقبل کے لیے راہیں سجھاتے ہیں۔ لہٰذا تاریخ نگاری کو مؤرخ پر چھوڑ دیا جائے۔ کوئی بھی مؤرخ حقائق کو نہیں جھٹلا سکتا خواہ وہ حقائق آریاؤں سے متعلق ہوں یا چندرگپت موریہ اور چانکیہ کی زندگی سے وابستہ ہوں یا اکبر اور اورنگ زیب کی پالیسیوں سے متعلق ہوں، مؤرخ حقائق کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اسے مکمل آزادی ہونا چاہیے کہ وہ حقائق کی جستجو کر کے ان کے بارے میں اپنی تفہیمات کو معاشرہ کے سامنے پیش کر سکے۔ مؤرخ کا یہ کام نہیں کہ وہ افراد پر اخلاقی فیصلے صادر کرے۔ اس کا کام ہے کہ وہ پالیسیوں، اداروں، تنظیموں پر اپنے فیصلے سنائے نہ کہ ان افراد پر جنھوں نے ان کی تشکیل کی۔

سیاسی دانشور ایک بات ملحوظ نظر رکھیں کہ تاریخ سائنس ہے اس میں ہر بات کے لیے سند یا شہادت درکار ہوتی ہے۔ ہٹ دھرمی تاریخ نگاری کی سند نہیں بن سکتی۔

پروفیسر ولی الحق انصاری

غالب کی فارسی شاعری

بہ مرگ من کہ پس از من بہ مرگِ من یاد آر　　بہ کوی خویشتن آں نعشِ بے کفن یاد ار
من آں نیم کہ ز مرگم جہاں بہم نخورد　　فغانِ زاہد و فریادِ برہمن یاد آر
بیام و در ز ہجوم جواں و پیر بگوئے　　بکوی و برزن از اندوہ مرد و زن یاد آر

غالب کو اپنی حیات کے دوران اپنے کلام کی صحیح داد نہ ملی اور وہ "محوِ سخن گستراں پیشیں" کو اپنے فن کا مقر نہ بنا سکے اور ان کے "سخن ہائے گفتنی" کے لیے کوئی "زبان داں" میسّر نہ آسکا۔ برعکس اس کے اہل زمانہ کے طنز و تشنیع سے دل برداشتہ ہو کر انھیں کہنا پڑا کہ

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلہ کی پروا　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ، نہ سہی

لیکن ان کے انتقال کے پوری ایک صدی کے بعد جب دست برد زمانہ سے وہ زبانیں جن میں انھوں نے اپنا سرمایہ سخن چھوڑا ہے خود ان کے وطن میں رو بہ زوال ہیں۔ زمانہ ان کی قدر شناسی کے لیے مجبور ہو چکا ہے اور دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے فن کا اعتراف اور ان کی عظمت کا اقرار کیا جا چکا ہے۔

مرزا غالبؔ اپنے فن کے اعتبار سے بلاشبہ دنیا کے عظیم ترین فنکاروں میں سے تھے اور مولانا حالیؔ کا ان کو "رشکِ عرفیؔ و فخرِ طالب" قرار دینا قطعاً مبالغہ پر مبنی نہ تھا اور خود اپنے معترضین کی خدمت میں ان کا یہ کہنا کہ

تو اے کہ محوِ سخن گستراں پیشینی　　مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

پروفیسر ولی الحق انصاری (سابق صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی)، فرنگی محل، لکھنؤ۔

بھی تعلی محض نہ تھا۔ ان کے تخیل میں وہ گرمی تھی کہ انھیں خود کہنا پڑا ؎

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے"

تخیل کی یہ بلند پروازی بھی کبھی گستاخی کا سبب بنتی ہے جو ودلیعت پروردگار ہے جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیج است   کہ تیز گامیٔ توسن ز تازیانۂ تست

ان کے کلام میں وہ تمام آفاقی عناصر موجود ہیں جو کسی بھی شاعر کے کلام کو لافانی ولاثانی بنا دیتے ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام کو چھوڑ کر جس میں بیدلؔ ہلالؔ اسیرؔ وغیرہ کی پیروی ہے اس میں صرف معنی آفرینی کی طرف توجہ کی گئی تھی اور دل کے بجائے صرف دماغ سے شعر کہنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے باقی کلام کا زیادہ حصّہ شعریت سے مملو اور دولت تاثیر سے مالامال ہے جس پر" از دل خیزد بر دل ریزد" کا مقولہ پورے طور پر صادق آتا ہے۔ طرز بیدل سے جس میں بقول خود ان کے دس برس کے عرصہ میں انھوں نے ایک ضخیم دیوان جمع کر لیا تھا اور تمیز آجانے پر" اس دیوان کو دور کیا" اوراق یک قلم چاک کیے") سے روگردانی کے بعد ان کے پیش نظر عرفی، وطالب آملی نظیری اور ظہوری کا کلام تھا اور انھیں کے دواوین کے مطالعہ نے ان کو اپنے کلام میں لفظی ومعنوی دونوں محاسن کی طرف توجہ دینے پر مجبور کیا۔ اور ان ہی شعرا کے اثر نے ان کے تصور شعر کو بدل دیا اور تاثیر کلام کو وہ اصل شعریت سمجھنے لگے۔

چہ خیزد از سخن کز درون جان نبود   بریدہ باد زبانی کہ خون چکان نبود

لیکن ساتھ ہی ساتھ انھیں شعرا کا یہ بھی اثر تھا کہ طرز بیدل سے منہ موڑنے کے بعد بھی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی اور ترجمانی کا عنصر ان کے اشعار میں بدرجۂ اتم موجود رہا اور وہ صحیح معنی میں سبک ہندی کے آخری عظیم شاعر قرار دیے جا سکتے ہیں جس کا کلام لفظی ومعنی دونوں حیثیتوں سے کسی بھی ایرانی شاعر سے کم نہیں ہے۔ ان کے اشعار میں سوز بھی ہے اور ساز بھی۔ ان کے یہاں ظرافت بھی ہے اور سنجیدگی بھی لیکن یہ تمام خیالات وجذبات کچھ ایسے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ اُن سے زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں شاید ہی ان کے

کسی پیش رو نے انھیں پیش کیا ہو۔

مرزا غالب فارسی میں نہ سہی اردو میں یقیناً پہلے شاعر ہیں جس نے شاعری کو عمیق تفکر سے آشنا کرایا۔ خیام، فیضی، عرفی کی طرح انھوں نے بھی زندگی و کائنات کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات کو اشعار کے پیکر میں ڈھالا۔ زندگی و کائنات کے مطالعہ کا ایک لازمی نتیجہ خالقِ کائنات کے متعلق بھی غور و خوض کرنا تھا اور اس غور و خوض نے غالب کے کلام میں تصوف کا وہ عنصر پیدا کیا جس میں وہ نظیری کے پیرو نظر آتے ہیں۔ ان کی نظر میں دنیا صرف "جلوۂ یکتائیِ معشوق" ہے اور یہاں کا ذرہ ذرہ "محو جلوۂ حسنِ یگانہ" ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں | ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
ہر ذرہ محو جلوۂ حسنِ یگانہ ایش | یا | گوئی طلسم شش جہت آئینہ خانہ ایست

اور اس عالم میں جب ساری کائنات ذاتِ محبوب کی جلوہ گری کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں تو خود وجودِ انسانی کی کیا حقیقت۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

زوہم نقش خیالی کشیدہ ای ورنہ | وجودِ خلق چو عنقا بہ دہر نایاب است

اس حسنِ یگانہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنی ہستیِ موہوم کو اس ذاتِ حقیقی میں فنا کرنا ضروری ہے۔ جب "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" تو اس حسنِ ازلی کی معرفت کے حصول کے بعد خود اپنے وجود کی بقا کا کیا سوال اور خورشید کا نشان پا جانے کے بعد شمع کے باقی رہنے کا کیا جواز۔ غالب اس خیال کے قائل تھے اور اس کو انھوں نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے مثلاً

آنانکہ وصل یار ہمی آرزو کنند | باید کہ خویش را بگداز ند او کنند
مژدۂ صبح درین تیرہ شبانم دارند | شمع کشتند و خورشید نشانم دارند

ان کی نظر میں ذاتِ انسانی کا الگ کوئی وجود ہی نہیں اور یہ جسمانی نمود محض اپنے مبدا سے الگ ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ:

پنہاں بہ عالمیم ز بس عین عالمیم | چون قطرہ در روانیِ دریا گم ایم ما
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا | یا | ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ان کا عقیدہ تھا کہ یہ دنیا عالم راز ہے اور اگر کسی انسان کی قوت عقل و فکر میں وہ توانائی نہیں ہے کہ وہ اس کو سمجھ سکے تو نگاہِ حقیقت بیں سے کائنات کے جلوؤں کا مشاہدہ کرنا چاہیے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اس عالم راز کا ظاہر و باطن سب مظہرِ جلوۂ حسنِ یگانہ ہے اور اس کو سمجھنے میں نہ کسی وقت کی قید ہے اور نہ زمانے کی بندش۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں   تابِ اندیشہ نداری، زنگاہے دریاب
فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار   نیست گر صبح بہاران شب ماہی دریا

ان کے خیال میں صرف یہی نہیں کہ عالم "آئینہ راز" ہے وہ مراۃ وجود" بھی ہے جس کے ذرے ذرے میں حسن ازلی کی جلوہ گری ہے اور اگر اس حیثیت سے اسے دیکھا جائے تو اس کا عدم پذیر ہونا معلوم!

عالم ہمہ مراۃ وجود است، عدم چیست   تا کار کند چشم، محیط است کران نیست

راز تکوین عالم کے انکشاف کے بعد اس عالم یعنی مراۃ وجود سے حقیقت خالق کائنات بیساختہ طور پر ظاہر ہونے لگتی ہے اور اس کی خوشبو ہر طرف سے دماغ میں آنے لگتی ہے جیسا کہ غالب کہتے ہیں:

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں   در بہاران ہمہ بوئیت ز صبا می آید

اور یہ حقیقت اس طرح ظاہر ہوتی ہے کہ عالم حیرانی میں زبان گنگ ہو جاتی ہے اور آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔

رخ گشودند ولب ہرزہ سرایم بستند   دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

لیکن اگر بدقسمتی سے ان رازوں کی تہ تک انسان نہ پہنچ سکے تو یہ خود اس کی کوتاہی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ راز خود ہی منکشف ہونے کے لیے بیچین رہیں اور ان پر پڑی ہوئی ہر نقاب خود ان کو عیاں کر رہی ہے۔ اسی خیال کو غالب نے یوں ادا کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

راہ حقیقت کے سالک کو راہ میں مشکلات کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن جیسے:

منزل قریب آتی جاتی ہے انھیں مشکلات میں ایک لذت اور ایک کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے اور یہ احساس کہ وہ مشکلات اور غم راہ محبوب میں پیش آ رہے ہیں یک گونہ مسرت کا باعث بنتے ہیں چنانچہ اس خیال کو بھی غالبؔ نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے مثلاً

آخرِ منزلِ نخست خوی تو راہ می زند   اول منزلِ دگر بوئے تو زاد می دہد

اے کہ بدیدہ نم زتست وی کہ بسینہ غم زتست   نازش غم کہ ہم زتست خاطر شادی دہد

مست عطائے خود کند ساقی ما نہ ہست مے   دادہ زیادہ می برد، بسکہ زیادی دہد

لیکن جب انسان پر یہ مصالح خداوندی و راز کائنات منکشف ہوتے ہیں تو ان رازوں کا اظہار کرنے کے لیے قوت گویائی جواب دے جاتی ہے اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

دریغا کہ کام ولب از کار ماند   سخن ہائے ناگفتہ بسیار ماند

گنجینہ ہے سینہ مرا اسرار نہاں کا   اے وائے اگر معرضِ گفتار میں آوے

کائنات وخالق کائنات کے علاوہ انسان اور زندگانی انسان کے متعلق بھی غالب نے اپنے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں جا بجا کیا ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک طوفان ہے جس میں انسان موجِ حوادث کے تھپیڑوں سے دوچار ہے اور اس بحر طوفاں خیز سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نہیں ہے۔

ہوا مخالف وشب تار و بحر طوفان خیز   گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

وہ ہستی کو ایک "دام فریب" سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود غم دوراں سے ہراساں نہ ہوکر اسی حلقۂ دام خیال میں مسرتوں اور خوشیوں کی تلاش کی تلقین کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

پیمانہ بگردش است درین بزم بہ گردش   ہستی ہمہ طوفان بہار است خزاں نیست

ہاں یہ دوسری بات ہے کہ خود اس بہار سے غالب کو بھی زیادہ فیض حاصل نہ ہو سکا اور میرؔ کی طرح انھیں بھی تمام عمر ناکامیوں سے کام لینا پڑا لیکن انھیں ناکامیوں نے ان کی زندگی کو بھی وہ سوز عطا کر دیا جس نے ان کی شاعری کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

ذات انسانی کے متعلق بھی غالب نے اپنے خیالات اپنے اشعار میں پیش کیے ہیں۔

وہ اسے ایک ایسی ہستی سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ہنگامہ وجود برپا ہے اور جس پردۂ خاک سے وہ باہر آتا ہے وہاں ایک قیامت کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اپنے اس تصور کو وہ یوں پیش کرتے ہیں۔

زما گرم است این ہنگامہ بنگ شور ہستی را　　　قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انسان شد

یہ انسان صرف بیرونی دنیا ہی کے لیے ایک قیامت نہیں ہے بلکہ خود اپنی ذات کے اندر بھی ایک قیامت پوشیدہ رکھتا ہے جیسا کہ وہ کہہ گئے ہیں ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

لیکن یہی انسان، یہی قیامت کا پتلا اپنے اندر وہ شیطانی خصوصیات بھی رکھتا ہے جو اسے ننگ وجود بھی بنا سکتی ہیں۔ انسانیت کی اعلیٰ سطح پہ پہنچ کر یہی انسان فرشتوں کا محور بن جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کی اعلیٰ سطح تک پہنچنا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے اور بقول ان کے "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

نبرد گاہ حیات میں انھیں شکست ہوئی اور اس کا انھیں شدید احساس اور غم تھا جس کا اظہار ان کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ غم کی عظمت و افادیت کے بھی قائل ہیں۔ کیوں کہ یہی غم انسان کو پاکیزہ قدروں سے آشنا کرتا ہے:

نہ مرا دولتِ دنیا نہ مرا اجر جمیل　　　نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل

یا

دگیر ز ساز بیخودی ماصدا مجوئے　　　آوازے از گسستن تارِ خودیم ما

ان حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد کہ موجوداتِ عالم صرف ایک بحرِ ناپیدا کنار کی مختلف لہریں ہیں تو کفر و دین کی مخاصمت کیسی۔ کفر و دین کی بحث میں پڑنا غالب کے لیے ممکن ہی نہ تھا اور یہی وہ منزل تھی جہاں وہ محسوس کرتے ہیں کہ کفر و دین کی ظاہری کیفیتیں محض "آلائش پندارِ وجود" ہیں اور پاکی ذات اصل چیز ہے جس کو حاصل کرنے کی وہ ان الفاظ میں تلقین کرتے ہیں۔

کفر و دین چیست جز آلائش پندار وجود　　　پاک شد پاک کہ ہم کفر تو دینے نشود

اور یہی پاکی ذات جو مذاہب کی ظاہری رسوم سے بالا تر ہے مذہب کی روح حقیقی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے نزدیک تمام مذاہب کی بنیاد ایک ہے اور کفر و ایمان کی کشمکش سے فارغ رہ کر ہر انسان کا فرض حسن حقیقی کی بارگاہ میں نذرانۂ خلوص پیش کرنا ہے خواہ وہ کسی شکل پر پیش کیا جائے۔ غالب نے اپنے ان خیالات کا اظہار مختلف انداز میں کیا ہے مثلاً۔

خوش بود فارغ ز بند و کفر و ایمان زیستن   حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن

یا

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ براں آستاں رسد

غالب کے تصورات و خیالات جنھیں انھوں نے شعری جامہ پہنایا صرف خالق کائنات، کائنات عالم، انسان وغیرہ سے متعلق فلسفیانہ موشگافیوں تک محدود نہیں ہے۔ وہ ایک گوشت پوست کے انسان تھے۔ دماغ کی طرح دل بھی ان کی رہنمائی کرتا تھا اور عقل ہی کی طرح جذبات کی بھی ان کے وجود پر حکمرانی تھی۔ وہ خوشی سے خوش اور غموں سے غمگین ہونا جانتے تھے۔ وہ عشق کے پاکیزہ جذبہ سے بھی واقف تھے اور ہوس کے رکیک انداز بھی سمجھتے تھے۔ حالی نے انھیں حیوانِ ظریف کہا ہے اور بے شک ان کے خطوط کے علاوہ ان کے اشعار سے بھی ان کی شگفتگیٔ طبع کا اندازہ ہوتا ہے مثلاً

شباب و زہد! چہ نا قدردانیٔ ہستی ست   بلا بجانِ جوانانِ پارسا ریزد
با یدز مے برآئینہ پرہیز گفتہ اند   آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند
با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر   ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

زمانہ کی جفا کاریوں اور اس کی نازل کردہ بلاؤں کا علاج ان کے خیال میں یہ نہیں ہے کہ ان سے گریزاں رہنے کی کوشش کی جائے۔ ان کا بہترین علاج یہ ہے کہ بے دریغ ان کو لبیک کہا جائے اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا جائے۔ کہتے ہیں:

رو تن بہ بلا دہ کہ دگر بیم بلا نیست   مرغ قفس کشمکش دام ندارند

یا

بے تکلف در بلا بودن بہ از دام بلاست   قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

ان کا عقیدہ ہے کہ غم صرف دنیا ہی میں انسان کے حصے میں نہیں آیا بلکہ اس کا سلسلہ عدم تک قائم ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

اور یہ غم ان کی زندگی میں اس طرح داخل ہے کہ زندگی اور غم انھیں ایک ہی چیز نظر آتی ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اور جب غم ہی زندگی بن جائے تو اس میں سوائے ناامیدی اور یاس کے رہ ہی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کا بھی یہی تجربہ ہے جب وہ کہتے ہیں کہ

نومیدگی گردشِ ایام ندارد — روزی کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

فانی نے زندگی کو مر مر کے جیے جانا قرار دیا ہے۔ لیکن غالب کو اس کا احساس بہت پہلے ہو چکا تھا۔

عمر بیست کہ می میرم و مُردن نتوانم — در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست

وہ اس حد تک قنوطی اور ناامید ہو چکے تھے کہ خود کو فریبِ مسرت سے بھی نہیں بہلا سکتے تھے اور بختِ خفتہ سے ایک خوابِ خوش قرض لے کے بھی مصنوعی طور سے بھی اپنی زندگی کو بارونق بنانے کی ان میں ہمت نہیں تھی اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس غیر حقیقی مسرت کے بدلے میں انھیں ستم ہائے روزگار ملیں گے چنانچہ کہتے ہیں کہ

لوں وام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش و لے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

لیکن اس غم سے جو ان کے لیے "جاں گسل" اور جو "غمِ عشق" یا "غمِ روزگار" کسی نہ کسی شکل میں ہر انسان پر مستولی رہتا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ خودداری کو کسی قیمت پر قربان کرنے کو تیار نہیں اور اپنے پیشوائے روحانی یعنی عرفی شیرازی کے آہنگ میں "تحفۂ مرہم نگیرد سینۂ افگار ما" کے انداز میں فرماتے ہیں:

دریوزۂ راحت نتواں کرد ز مرہم — غالب ہمہ تن خستۂ یاراست گدا نیست

یا

خود داریم بہ فصل بہاراں عناں گسیخت　　　گلگون شوق را رگ گل تازیانہ نیست

غالبؔ کو اپنی ضروریات زندگی کے حصول کے لیے کار ہوس پیشگان یعنی قصیدہ گوئی اختیار کرنا پڑی اور انھوں نے اپنے ضمیر کے خلاف دوسروں کی مدح سرائی کی اور اپنے قصائد میں انھوں نے اپنے ممدوحین اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو ان کی زبان تک سے ناواقف تھے، کے سامنے دستِ سوال بھی دراز کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جذبہ خود داری باقی تھا۔ انھیں "منت کش دوا" ہونے سے زیادہ "اچھا نہ ہونا" پسند تھا اور ان کی خودداری انھیں معشوق نک کی جفائیں برداشت کرنے سے روکتی تھی جس کی طرف انھوں نے جا بجا اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے قصائد میں امرا کی مدح کی اور ان سے صلہ کے طالب ہوئے لیکن غزل میں ان ہی اہل جاہ سے وہ یہ بھی کہہ گئے کہ:۔

جاہ ز علم بے خبر علم ز جاہ بے نیاز　　　ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

ان کی زندگی کا یہی تضاد غمِ جاناں کے علاوہ غم دوراں کی شکل میں ان کے سامنے آیا اور ان کی زندگی اس کی وجہ سے اتنی تلخ ہو گئی کہ انھیں کہنا پڑا کہ

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا　　　زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی　　　میں دل ہوں فریب وفا خوردگاں کا

مسرت و غم کے جذبات کی طرح جذبۂ عشق و محبت کی کسک سے بھی غالب آشنا تھے۔ ان کا تصورِ عشق عرفی کے تصورِ عشق کی طرح بلند تھا اور ان کے خیال میں یہی وہ جذبہ ہے جس سے زندگی میں مزہ پیدا ہوتا ہے اور اس سے زندگی کے تمام لطف وابستہ ہیں۔

ان کا کلام صرف مخزن معنی ہی نہیں ہے۔ یہ خصوصیت تو صرف ان کی غزلیات کی ہے اگر ان کے قصائد پر نظر ڈالی جائے تو کچھ اور ہی کیفیت نظر آتی ہے اور ان کے رنگ و آہنگ میں فرخی و عرفی کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے قصائد میں جو زیادہ تر ان ہی زمینوں میں کیے گئے ہیں جن میں عرفی نے قصائد کہے تھے اسی زور کلام اور بلندی فکر کی جھلکیاں ہیں جو عرفی کے قصائد کی خصوصیت بنی۔ ساتھ ہی ان کے بہت سے قصائد میں لطف، عرفی نغمگی، ترنم اور روانی ہے جو عنصری فرخی اور آخر میں قاآنی کے قصائد

میں پائے جاتے ہیں مثلاً لارڈ آکلینڈ کی مدح میں قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے۔

باز بہ اطراف باغ آتش گل در گرفت	مرغ بہ رسم معانی زمزمہ از سر گرفت
سبزہ بر اندام خاک حلہ ز مخمل برید	مہر بہ دیدار باغ آئینہ در زر گرفت
دشت بہ پر کار باد طرح صنم خانہ ریخت	باد بہ اطراف دشت صنعت آذر گرفت
سرو بہ بالائے سرو طرہ ز سنبل فکند	گل بہ تماشائے گل دیدہ ز عبہر گرفت
قامت رعنائے سرو پردۂ گلبن درید	عارض زیبائے گل دل ز صنوبر گرفت

قصائد و غزلیات ہی کی طرح ان کی مثنویات بھی خیال و آہنگ کا امتزاج ہیں اور قصائد ہی کی طرح محاکات کی بعض بہترین مثالیں ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں مثلاً چراغ دیر میں بنارس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سوادش پائے تخت بت پرستاں	سراپایش زیارت گاہ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیاں است	ہمانا کعبۂ ہندوستان ست
بتانش را ہیولیٰ شعلۂ طور	سراپا نور ایزد چشم بد دور
تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است	دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار	خرامی صد قیامت فتنہ در بار

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی

کرنل سیّد بشیر حسین زیدی

کرنل صاحب خانوادۂ سادات بارہہ مظفر نگر کے ایک ممتاز فرد تھے۔ اُن کا خاندان عہدِ مغلیہ میں نہایت پُر وقار رہا۔ اسی خاندان کے دو برادران سید عبداللہ اور سیّد حسین علیؑ اٹھارویں صدی میں "سیدانِ بادشاہ گر" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ لیکن کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب انسان گری کی خدمات انجام دیتے رہے۔

کرنل صاحب کا وطن نگرولی ضلع مظفر نگر ہے۔ اُن کے والد سید شوکت حسین صاحب دہلی میں انسپکٹر پولیس تھے۔ اُن کی پیدائش ۳۰ر جولائی ۱۸۹۸ء کو ہوئی۔ انھوں نے ہائی اسکول کا امتحان عربک اسکول دہلی سے اور بی۔ اے کا امتحان سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے پاس کیا۔ جس کے فوراً بعد ہی ۱۹۱۹ء میں انگلینڈ روانہ ہوئے اور کیمبرج یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۲۲ء میں بی۔ اے آنرز کی ڈگری اور ۱۹۲۳ء میں وہیں سے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور پھر ہندوستان واپس آئے۔ کیمبرج کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے ایک اردو میگزین "نوائے کیمبرج" بھی جاری فرمایا تھا۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے باصرار اُن کو یونیورسٹی اسکول کا پہلا ہندوستانی ہیڈ ماسٹر بنا لئے گیا۔ چنانچہ وہ ۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء اس منصب پر فائز رہے۔ ۱۹۳۹ء میں

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی ۱۳۰۵/۴ نیو سر سید نگر۔ علی گڑھ

انھوں نے خواجہ غلام السیدین صاحب کے ساتھ عراق و ایران کا سفر کیا اور زیارتِ عتبات عالیات سے مشرف ہوئے۔

نواب حامد علی خاں بہادر والئی رام پور نے آپ کو ہائی کورٹ کا پیونی جج ۱۹۲۰ء میں مقرر فرمایا اور پھر اعلیٰ حضرت نے فروری ۱۹۳۱ء میں اُن کا تقرر ہاؤس ہولڈ منسٹری پر فرمایا۔ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۳ء سر عبدالصمد خاں بہادر کی روانگی یورپ کے دوران صاحب موصوف قائم مقام چیف منسٹر رہے۔ اور اس کے بعد انھوں نے پولیٹکل منسٹری کی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۳ء میں تھرڈ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں رام پور کی نمائندگی فرمائی۔ صاحب موصوف کے چارج میں متفرق صیغہ جات۔ پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی بجلی گھر، واٹر ورکس، تعلیمات اور پبلسٹی بیورو وغیرہ رہے۔ ۱۹۳۵ء میں یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مرادآباد سیشن میں صدارت فرمائی۔ ۱۹۳۶ء میں محکمہ جات ریونیو اور فائننس کا چارج لیا۔ اور پھر چیف منسٹر ریاست رام پور کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اُن کی چیف منسٹری کے زمانے میں رام پور نے نمایاں ترقی کی۔ کارخانوں کے اعتبار سے اس زمانے میں کان پور کے بعد رام پور سب سے بڑا صنعتی مرکز بن گیا تھا۔ ریاست کے نظم و نسق میں بہت سی اصلاحات عمل میں آئیں جنھیں خاص طور سے قابلِ ذکر طریقہ مستاجری کی تنسیخ ہے جس کے مطابق ریاست کے دیہات کا نیلام ہوا کرتا تھا۔ نئے بندوبست کے بعد مال گزاری میں ترمیم کر کے کاشت کاروں کی حالت بہتر بنانے اور ان کے حقوق کے تحفظ [illegible]

[illegible] ہندوستان کی مجلس آئین ساز کے [illegible]

[illegible] ریاست رام پور کے انضمام کے بعد [illegible]

آئین ساز [illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible]

[illegible]

مرحوم [illegible]

[illegible]

برات میں جو خوشگوار تبدیلیاں ہوئیں وہ اس یونیورسٹی کی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ مسلم یورسٹی علی گڑھ میں میڈیکل کالج کے لیے منصوبہ بندی ہوئی۔ مولانا آزاد لائبریری، بڑی ہال، فیکلٹی آف آرٹس، پالی ٹیکنیک اسٹاف کنب اور وی سی لاج کی جدید عمارات تعمیر ہوئی اور بھی کئی شعبوں کے لیے نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مسلم یونیورسٹی میں عالی شان رات کی تعمیر پر اُن کو شاہجہاں کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سیعی منصوبہ کے تحت انھوں نے آرڈی اسٹیٹ، رانی کھیت میں ولیم آرڈی سے خرید کی۔ اسٹیٹ پہاڑی علاقہ میں سوا چار ایکڑ زمین میں واقع ہے اور نہایت پرفضا و پرسکون مام ہے ارباب مسلم یونیورسٹی سے متعدد حضرات موسم گرما میں تبدیل آب و ہوا اور سیر خریح کے لیے یہاں جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈیپارٹمنٹ آف لائف سائنس کے ریسرچ اسکالر قیق و ریسرچ کے لیے یہاں مستقل طور پر قیام پذیر رہتے ہیں۔ اس علاقہ میں جڑی بوٹیوں کثرت ہے۔ انواع و اقسام کے نباتات اور جڑی بوٹیاں بکثرت یہاں پائی جاتی ہیں۔ اگر یپارٹمنٹ آف بوٹنی اور ڈیپارٹمنٹ آف علم الادویہ کے ریسرچ اسکالرز بھی یہاں تحقیقی م انجام دیں اور ایک ہربیریم بھی یہاں قائم کیا جائے اور ایک بوٹینکل گارڈن بھی یہاں یا جائے تو طلباء کو خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

کرنل زیدی صاحب کے دل میں ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ بے پناہ تھا۔ آزادی ہند ہندوستان میں ایک نئے اتحادی سماج کی تعمیر چاہتے تھے اور اسی جذبہ وہ سوشل سروس ایجوکیشن طلبہ کے لیے ضروری خیال فرماتے تھے اور اسی مقصد کر انھوں نے سوشل سروس کمیٹی (رجسٹرڈ) کی بنا ڈالی اور اس کے تحت طلباء اور شہریوں کو اتحاد کے ساتھ سوشل سروس کے لیے تیار کرنے کا پروگرام کی تعلیم و تربیت کے لیے شہر میں متعدد کلب قائم کیے گئے۔ ایک دو سماج کیٹ میں اور دوسرا سول لائن دودھ پور میں قائم کیا گیا۔

سروس کمیٹی کے تحت بچوں کی سوشل سروس تعلیم و تربیت اور کے لیے بال برادری سوسائٹی (رجسٹرڈ) قائم کی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں

سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کی گرانٹ اور پبلک کے چندہ سے ایک بال بھون، امیرنشان کے قریب لال بہادر شاستری مارگ پر دودھ پور میں تعمیر ہوا۔ جواب یونیورسٹی کی ملکیت ہے۔ بال برادری سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے صدر شری سر بیندر کمار صاحب، سکریٹری ڈاکٹر انس صاحب اور ٹرژرار بیگم صاحبہ پروفیسر سید نورالحسن صاحب بالقابہ تھیں۔

سوشل ایجوکیشن سروس کا کام چلانے کے لیے کرنل زیدی صاحب قیصر نقوی امروہوی صاحب کو جامعہ ملیہ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی اجازت آن ڈیپوٹیشن علی گڑھ لائے اور سوشل ایجوکیشن آفیسر کی پوسٹ پران کا تقرر فرمایا انھوں نے بال برادری کی اسکیم اور سوشل سروس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے سعی بلیغ فرمائی اور یہ اسکیمیں بہت کامیاب ہوئیں۔

سوشل سروس ایجوکیشن کمیٹی اولاً علی گڑھ میں کرنل زیدی صاحب کی تحریک سے جاری ہوئی اور اس کے چیرمین وہ خود رہے اور شعبۂ تاریخ کے ڈاکٹر ستیش چندر صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ انھوں نے اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی جانفشانی فرمائی۔ اور اس کے تحت مختلف محلوں میں کلب قائم کرنے، سماج کیندر بنانے کے لیے سعیٔ بلیغ فرمائی اور اس طرح یہ اسکیم کامیابی کے ساتھ علی گڑھ میں پھیلی اور بڑھی۔ اس اسکیم کے مطابق جب این۔ ایس۔ ایس (نیشنل سوشل سروس اسکیم) مختلف یونیورسٹیوں میں جاری ہوئی تو اسی کے ساتھ یہ اسکیم ضم ہوگئی اور بال بھون میں بھی یونیورسٹی کے کلب کا دفتر قائم ہوگیا۔

کرنل زیدی صاحب کے عہد وائس چانسلری میں دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی کمرشل اسکیل پر اعلا پیمانہ پر قائم ہوا اور شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کے عہد پرنسپلی میں اس دواخانے نے بڑا عروج پایا۔ آج یہ دواخانہ پورے ہندوستان کو مرکب ادویہ صحیح اجزاء کے ساتھ تیار کرکے سپلائی کر رہا ہے اور اکثر شہروں وقصبات میں اس دواخانہ کی ایجنسیاں اور اسٹاکسٹ قائم ہیں اس دواخانہ کی تعمیر وترقی میں حکیم محمد صدیقی صاحب اور ان کے بعد سعادت علی صاحب نے سعی بلیغ کی جو لائق مدح وستائش

۱۹۶۲ء میں علی گڑھ سے واپسی کے بعد کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے اور اُن کی تحریک پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سیفی ایجوکیشن ٹرسٹ قائم ہوا جو ہر سال یونیورسٹی کے مستحق طلباء کو وظیفے دیتا رہا۔

۱۹۶۲ء میں حکومت مغربی جرمنی کی دعوت پر انھوں نے وہاں کی مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کر ان کے طریقہ کار کا مطالعہ کیا اور پھر کچھ مفید اصلاحی قدم اٹھائے اور مفید اسکیمیں جاری کیں۔ ۱۹۶۴ء میں انھوں نے ہندوستانی خیرسگالی مشن کے لیڈر کی حیثیت سے مغربی ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ ۱۹۶۶ء میں انھوں نے افغانستان کے یوم استقلال کے جشن میں ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔ ۱۹۶۷ء میں وہ فرقہ وارانہ فساد کے متعلق تحقیقاتی کمیشن کے ممبر مقرر ہوئے۔

علی گڑھ سے واپسی پر انھوں نے نو سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آنریری ٹریشرار کی خدمات انجام دیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر اور ڈاکٹر ذاکر حسین کالج منیجنگ کمیٹی کے ممبر اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے۔ علاوہ ازیں کئی سال تک ...یہ کالج دہلی کی مجلس منتظمہ اور دیش بندھو کالج نئی دہلی کی منیجنگ کمیٹی کے صدر بھی رہے اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کی مجلس منتظمہ کے ممبر بھی رہے۔ نیز انڈو ایران سوسائٹی کے صدر بھی رہے۔ وہ ہندوستان کی یوتھ ہاسٹل ایسوسی ایشن کے نائب صدر رہے اور غالب صدی کمیٹی کے ٹریشرار رہے۔

کرنل زیدی صاحب مرکزی انیس صدی کمیٹی کے بھی صدر مقرر ہوئے اور اُن ہی کی صدارت میں کتاب انیس شناسی مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ اور انیس کے مرثیے مرتبہ ...لحہ عابد حسین شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں میر انیس کے غیر مطبوعہ مراثی کی تحقیقات کا کام انجام پایا۔ اور اس کارنامہ میں اُن کے معاونین کی حیثیت سے سید نائب حسین نقوی، ...ٹر سید عابد حسین، شہاب سرمدی، سید علی احمد دانش لکھنوی، مالک رام اور بیگم حبیبہ بانو خصوصی طور پر محنت شاقہ کے بعد میر انیس کے ۳۱ مراثی کا انتخاب فرمایا اور ان مراثی ...جلد نہایت آب و تاب کے ساتھ اور جناب شہاب سرمدی کے پُرمغز مقدمہ کے ساتھ مرکزی

انیس صدی کمیٹی کی جانب سے پہلی بار ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کی طباعت کے سلسلہ میں شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی نے خصوصی توجہ فرمائی۔ یہ انتخاب مراثی، حقیقت یہ ہے کہ مرثیائی ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے جس کا سہرا کرنل زیدی صاحب کے سر ہے۔

رام پور کے قیام سے لے کر آخر دم تک اُن کا ملک کے متعدد صنعتی اور کاروباری اداروں سے تعلق رہا۔ اس دوران وہ متعدد کمپنیوں کے ڈائرکٹر رہے۔ تقریباً آٹھ سال تک آپ ریزرو بینک آف انڈیا کے مرکزی بورڈ کے ڈائرکٹر رہے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔

۷۷-۱۹۶۳ء تک وہ نیشنل ہیرالڈ، قومی آواز اور نوجیون اخبارات کی کمیٹی، ایسوسی ایٹیڈ جرنلس لمیٹڈ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین رہے اور تعلیم کے شعبہ میں اہم خدمات اور سماجی کارکن کی حیثیت سے اُن کو پدم وبھوشن کا ایوارڈ بھی ملا۔

کئی سال تک وہ دہلی مسلم وقف بورڈ کی املاک کمیٹی کے صدر رہے اور اس دوران انھوں نے کربلائے شاہِ مرداں جور باغ دہلی کا نظام بھی درست کیا اور یہاں عزاداری کو فروغ دیا۔

آئی ایم انٹر کالج امروہہ میں واقع سائنسی بلاک کے قیام میں کرنل صاحب کی سعیٔ بلیغ ناقابل فراموش ہے۔ انھوں نے اس کالج کی بورڈ آف اسٹڈیز کے ممبر تھے اور کافی عرصہ بورڈ آف ٹرسٹیز کے صدارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

کرنل سید بشیر حسین زیدی صاحب کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کانپور یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں بھی پیش کیں۔

کرنل زیدی صاحب کا انجمن وظیفہ سادات و مؤمنین سے بھی قدیمی تعلق تھا۔ وہ جنوری ۱۹۳۳ء میں اس انجمن کے عمومی ممبر تھے پھر دوامی ممبر بنے۔ پہلی بار ۱۹۷۲ء میں صدر منتخب ہو کر سہ سالہ دور پورا کیا۔ سکریٹری وظیفہ بیرون ہند بھی رہے۔ ۱۹۸۰ء میں بار دیگر بحیثیت صدر اُن کا انتخاب ہوا۔ اُن کی صدارت میں منعقدہ جلسہ بمبئی میں انجمن کو پچاس ہزار روپے سے زائد کے عطیات اپریل ۱۹۸۴ء تک وصول ہوئے۔ امروہہ کے

جلسہ سالانہ میں انجمن کے مستقل مرکز کی تعمیر و تشکیل کی تجویز پیش کی گئی۔ چنانچہ انجمن نے اس کو منظور کیا۔ پروفیسر اطہر عباس رضوی صاحب نے حسینیہ زہرا، زہرا باغ علی گڑھ سے متصل ایک پلاٹ انجمن کے مستقل دفتر کی تعمیر کے لیے عنایت فرمایا اور کرنل زیدی صاحب کی حیات ہی میں یہ تعمیر مکمل ہوئی اور انجمن وظیفہ سادات و مومنین کا صدر دفتر اس میں مستقل طور سے منتقل ہو گیا۔

کرنل زیدی صاحب بیک وقت ایک اچھے منتظم اور ماہر سیاست داں تھے۔ وہ علوم و فنون کے مربّی اور سرپرست رہے۔ اگر ایک طرف ان کو جہاں بانی کا فن خوب آتا تھا تو دوسری طرف جہاں بینی کے ہنر میں بھی یکتا تھے۔ اور ان تمام خصوصیات کے ساتھ وہ ایک درد مند اور وضعدار انسان بھی تھے۔ جن کی نوازشات مذہب اور فرقے اور ذات سے بلند تھیں۔ ان کی یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے ان کو سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین بالقابہ مرحوم اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا معتمد بنا دیا تھا۔

کرنل زیدی صاحب کی شادی قدسیہ بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی جن کی وفات ۱۹۶۰ء میں ہوئی، اور قبرستان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ان کی قبر یادگار ہے۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) اُن کے ہم زلف تھے۔ بیگم زیدی صاحبہ کو ادب اور تھیئٹر سے بہت دلچسپی تھی۔ انھوں نے متعدد کتب تصنیف کیں اور مختلف زبانوں کے عمدہ ڈراموں کا اردو زبان میں ترجمہ فرمایا۔ ان کی تصانیف میں سے دو کو سرکاری انعامات بھی ملے۔ انھوں نے کئی ڈرامے لکھے جن میں سے "آذر کا خواب" اور "خالد کی خالہ" بہت مقبول ہوئے۔

شادی کے سال بھر کے بعد پلوٹھی کی لڑکی شمع صاحبہ ۱۹۳۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے میرانڈا ہاؤس دلّی سے بی۔ اے کیا اس کے بعد رائل اسکول آف ڈراما لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ۴ رجنوری ۱۹۴۱ء کو احمد رضا زیدی عرف سید صاحب کی رام پور میں ولادت ہوئی۔ انھوں نے مسوری اور دہلی میں تعلیم کی تکمیل کے بعد نیو یارک اسکول آف سوشل ریسرچ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور دلّی یونیورسٹی کے فلاسفی

[باقی صفحہ ۲۸ پر]

محمد ذاکر

غمگسار کی موت

(فیضؔ کی یاد میں)

تو نے رات اس طرح چاہا ہے مجھے
جیسے میں آخری خواہش ہوں تری
میں کہ سورج کی شعاعوں کی طرح
لحظہ لحظہ تھا بکھرنے کے لیے؛

تو نے چاہا تری بانہوں میں سمٹ جاؤں سمٹتا ہی رہوں
تیرے سینے سے لب و رخ سے چمٹتا ہی رہوں
تیری آغوش سے باہر نہ نکل جائے کہیں میرا وجود
تجھے معلوم نہ تھا
حلقۂ بانہوں کا مری تھا تری قامت سے سوا
میں نے چاہا کہ مرے لمس سے کچھ اور بڑھے تیری چبھن
اور بڑھتی رہے سانسوں کی مہک
تیرے عارض کی دمک اور بڑھے
اور شاداب ہوں سینوں کے سمن اور گلاب
تیرے ارمانوں کی دولت کا نصیبہ جاگے
کیسے افلاک کے انوار سمیٹے ہیں سنے

پروفیسر محمد ذاکر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

کہ تری آنکھوں پہ زرتاب اُجالا ٹھہرے
تیری پلکوں سے اذاں دیتی رہے ایسی سحر
جس سے مٹتی رہیں کاذب صبحیں
تیرے صحرا زدہ افسانوں میں سُرخی کے لیے
دور بھی پاس بھی لہراتا رہا اپنے لہو کے پرچم
برف زاروں میں بھی چھڑکا کیا میں اپنا لہو
تجھے معلوم بھی تھا
یہ لہو تیرا تھا، تیرا ہی تھا، میرا تو نہ تھا

تیری پلکوں کے تلے آنسوؤں رینگ گئے کیسے جلوس
وہ سیہ تاب بدن جیسے افریشیا کی دھوپ کے نہلائے ہوئے
بے زباں درد کے پیکر اُبھرے
شرق سے غرب تلک آتے رہے جاتے رہے
کیسے خُرما کے درختوں پہ صدائیں جاگیں
کیسے غم تپنے لگے اور ہوائیں سُلگیں
دور بھی پاس بھی کٹتے ہوئے سنگریزے شرر دینے لگے
کیسے تابندہ، تمنا کے لہو رنگ شرر
پاک کرتے ہوئے شعلوں کی زبانیں لپکیں
برف زاروں میں لہو چھینٹے بھی لَو دینے لگے
کیسے چھٹتے گئے
آلام کی رینوں کے دُھوانسے بادل
ہاں اُجالا تو ہوا ہے مگر اب بھی کم کم

تو نے چاہا تری بانہوں میں سمٹ جاؤں سمٹتا ہی رہوں

تیری آغوش میں واماندہ پڑا ہوں آخر
سانس کا تار جو ٹوٹا ہے تو بس ٹوٹ گیا
تو نے دیکھا بھی ہے ہر سانس کے ساتھ
کیسے ملتے رہے ہاتھوں میں مرے ہاتھ میں ہاتھ
میری بانہوں میں ملیں بانہیں ملیں اور ملیں
حلقہ بانہوں کا مری اور بڑھا اور بڑھا
شاید اب جان گئی ہو تو بھی
تیری قامت سے سوا
خوب سے خوب تر ہوتی ہوئی قامت سے سوا
حلقہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے بانہوں کا مری!

[بقیہ کرنل بشیر حسین زیدی]

کے شعبہ سے وابستہ ہوئے۔ دوسرے صاحبزادے سید علی رضا زیدی عرف بلال صاحب ۲۳ر اگست ۱۹۳۴ء کو رام پور میں تولد ہوئے۔ مسوری اور دلی میں تعلیم حاصل کی۔ تاریخ میں بی اے آنرز کیا۔ جدہ میں اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن کی سعودی شاخ کے منیجر ہوئے۔

کرنل زیدی صاحب نے پچانوے (۹۵) سال کی طویل حیات نہایت بامقصد اور بڑی کامیابی کے ساتھ گزاری اور ان کا وقار ہمیشہ بلند رہا۔ آخر عمر میں ضعف و نقاہت نے انھیں معذور بنا دیا اور گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ مفید اور کارآمد مشوروں سے نوازتے رہے۔ ان کی حرارت عزیزی یوماً فیوماً گھٹتی رہی اور ان کے قویٰ رفتہ رفتہ مضمحل ہوتے رہے اور بالآخر یہ ماہتاب درخشاں اپنی آب و تاب سے ایک دنیا کو فیضیاب کر کے بوقت صبح بروز یکشنبہ بتاریخ ۲۹ر مارچ ۱۹۹۲ء زیدی ولا جامعہ نگر نئی دہلی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گیا اور بوقت شب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شہر خموشاں میں سیکڑوں سوگواروں کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شمس الحق عثمانی

اردو ادب اور نشأۃ ثانیہ

نشأۃ ثانیہ۔ یا نوجاگرن۔ فرانسیسی لفظ Renaissance کا متبادل ہے۔ یہ لفظ یورپ کی اس کلچرل تحریک کا احاطہ کرتا ہے جس کے خدوخال چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں نمایاں ہوئے۔ اٹلی سے آغاز شدہ یہ تحریک رفتہ رفتہ پورے یورپ میں پھیل گئی اور لگ بھگ سنہ ۱۶۰۰ء تک اس تحریک نے اس خطۂ ارض کے تمام فنون، مذاہب، سیاسیات، معاشیات، تجارت اور جملہ علوم کی تجدید اور فروغ کی راہیں ہموار کیں۔ علوم و فنون کے تمام شعبوں پر اس تحریک کے اثرات کی ابتدا اور تکمیل کا زمانہ بھلے ہی مختلف رہا ہو مگر آج لگ بھگ چار سو برس بعد، یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ نشأۃ ثانیہ کے اس عمل نے ڈھائی سو سال کی مدت میں پورے یورپ کو انسانی تجربہ و فہم کے ایسے واحدے کا تحفہ نذر کیا جو ماضی اور حال کی زمانی تقسیم سے واغدار نہ تھا اور اس عمل کے زیر اثر یورپ نے اپنے ماضی کے اثاثوں کو اپنے حال کا اٹوٹ انگ بنایا تاکہ مستقبل کی جانب بڑھتے قدموں میں ماضی و حال کی ایک جان قوتیں پوری طرح شامل رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اردو ادب کے مؤرخ اور مفکر بتاتے ہیں کہ ہماری نشأۃ ثانیہ وہ ہے جو بالعموم سرسیّد تحریک کہی جاتی ہے۔ اس تحریک کے آغاز کا سبب وہ کوائف تھے جو سید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے لڑکپن سے جوانی تک قلعۂ معلّٰی کے اندر اور دلّی کے اطراف میں بہ چشم خود

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

دیکھے تھے۔ کیوں کہ سرسید کے بزرگ دربار مغلیہ سے وابستہ تھے، اس باعث وہ ان تمام سیاسی، سماجی اقتصادی اور اخلاقی خرابیوں سے واقف تھے جن کے نتیجے میں مغلیہ سلطنت کو زوال کا منھ دیکھنا پڑا۔ ان قریبی ذاتی تجربات اور چشم دید واقعات کے ساتھ ہی ساتھ سرسید کے ذہن پر ایک تحریک کی ناکامی نے بھی شدید اثرات مرتب کیے۔ ان کی کتاب آثار الصنادید شاہد ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک حریت کی ناکامی بھی ان کے لیے ایک بڑا صدمہ تھی۔ یعنی ۱۸۳۱ء میں جنگ بالاکوٹ کی ناکامی کے قصے نے سید احمد خاں کو یہ باور کرا دیا کہ تنہا مذہب کی تلوار، اس ملک کی بیڑیاں کاٹنے میں ناکام ہی رہے گی۔ اور جب سرسید نے ۱۸۵۷ء میں ملک کی سیاسی طاقت کی مکمل پسپائی کا منظر بھی دیکھ لیا تو وہ سمجھ گئے کہ ان کی قوم کے زخموں کا علاج فی الحال مذہب اور سیاست کے مرہم سے ممکن نہیں۔ یہی دو بڑے اسباب تھے جو سید احمد خاں کو علاج بالعلم کی طرف لے گئے۔ اور یہ تجویز کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو سیاست سے مکمل پرہیز کرنا چاہیے، سید احمد خاں نے مذہب کے وہ حقیقی خدوخال نمایاں کرنے کا بیڑا اٹھایا جو عام پیشہ ور مولویوں کے مفروضات، توہمات اور رسوم کی گرد میں گم ہو چلے تھے۔ یعنی سرسید کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ملکی سیاست پر انگریز کی گرفت اس قدر مضبوط ہو چکی ہے کہ اگر ہندوستانی اس سے براہ راست ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہونے کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہ ہوگا؛ ہاں ـــ مذہب کے حقیقی خدوخال کی رونمائی اور تعلیم کی دیرپا قوت، یقیناً ایسے راستے ہیں جن سے ہندوستانی قوم ایک روز خود بہ خود سیاسی قوت بھی حاصل کر سکتی ہے۔

اردو ادب کی نشأۃ ثانیہ کی اس بنیادی فکر کو عمل میں ڈھال کر، نتائج حاصل کرنے کے لیے سرسید نے جو اقدامات کیے وہ اپنے آپ میں کتنی کشش رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان شخصیات کے ناموں اور کاموں سے ہوتا ہے جو سرسید سے قریب آئیں اور ان کے رنگ میں رنگ گئیں۔

عہد سرسید کا کوئی قابل ذکر ذہن ایسا نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز میں سرسید کے افکار سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اس وقت ہمارا مقصد ان تمام شخصیات کے کاموں کا فرداً فرداً جائزہ لینا نہیں ہے لیکن سرسری نظر بھی ڈالتے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ الطاف حسین حالی ہوں یا ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور مولوی ذکاء اللہ ہوں یا مولوی چراغ علی، یا محسن الملک سید

مہدی علی خاں اور وقار الملک مولوی مشتاق حسین وغیرہ۔ ان سب کے کام وقت کے تینوں منطقوں یعنی ماضی حال اور مستقبل کو ایسی ڈور میں پرونے کی کوشش ہیں جو مذاہب اور علوم وفنون کو ایک دوسرے سے قریب لاکر انھیں افراد اور قوم کی طاقت بنا دیتی ہے۔ مذکورہ شخصیات کی جدید سائنسی موضوعات پر توجہ، ادبیات مشرق کی تفہیم، مشرق ومغرب کے معائیر نقد سے آگہی، ناموران مشرق ومغرب کے کارناموں کی بازیافت، علم بیان وکلام، فلسفہ اور منطق کی ترویج، تفسیر قرآن، گیتا اور ویدوں کی شرحیں، مہابھارت اور رامائن کے تراجم وغیرہ؛ ایسے کام تھے جو ذہنی وفکری بیداری کے بنیادی عمل کے پہلو بہ پہلو اردو کے اسالیب وبیان پر اپنے اثرات مرتب کر رہے تھے۔

ذہنی وفکری بیداری کے مقصد نے براہ راست بیان کی حامل سادہ نظم ونثر کو فروغ دیا۔ ماضی کے ورثے کی چھان پھٹک ہوئی تو اظہار مدعا اور افادیت پسندی نے داستان کی کوکھ سے قصے کہانیاں اور ناول برآمد کیا اور شعری اصناف میں مثنوی ومسدس کو فوقیت دی گئی۔

سر سید نے مسدس حالی کی تعریف اس طرح کی کہ اس صنف اور موضوع کی تائید کرنا لوگوں کو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ محسوس ہونے لگا۔ سر سید کی اس مشہور تعریف کا یہ پہلو بھی قابل بیان ہے کہ سر سید کے نزدیک، تحریک کے مقاصد اتنے وقیع اور محترم تھے کہ وہ اسے اپنی عاقبت سنوارنے کا بھی وسیلہ تصور کرتے تھے۔

اس حد تک پہنچے ہوئے تصورات اگر ایک جانب ان کی نیک نیتی کا ثبوت ہیں تو دوسری جانب اس امر کی انتہائی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ، اور ان کے ساتھی، دنیا و دین کو ایک دوسرے سے مربوط جانتے تھے۔

سر سید تحریک کی مختلف جہات اور مدارج ہیں، مغربی خیالات اور شخصیتوں کے اثرات سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ سر سید اور ان کے ساتھی، جس مشرقیت کی تجدید کے خواہاں تھے، اس کے دروازے مغرب کے صالح تجربات کے لیے بند نہ تھے یعنی اس تحریک نے جس طرح انسان کی مادی وروحانی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا تھا۔ اسی طرح اسے مشرق اور مغرب کے علمی وفکری خزانوں کا مساوی حق دار بھی تصور کیا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے حسن اتفاق کہا جائے یا تاریخ ادب اردو کا المیہ کہ اردو ادب میں

سر سید تحریک کی زائیدہ نشاۃ ثانیہ نے نظم و نثر اور تہذیب و مذہب کو جو دو مثالی ذہن عطا کیے وہ اپنے زبان و بیان کے لحاظ سے تا حال انتہائی ناقابل تقلید ہیں کیوں کہ وہ خود بھی غیر مقلد تھے یعنی اقبال اور ابوالکلام آزاد۔ ان دونوں، اور بالخصوص اقبال نے جیسی فہم و ذکاوت سے کام لیتے ہوئے، مشرق کو مغرب کے اوصاف حمیدہ و خصائل ناپسندیدہ سے آگاہ کیا ویسی فہم و ذکاوت تو شاید سر سیّد کو بھی میسّر نہ تھی۔ یہ ذکاوت غالباً اس باعث میسّر آئی کہ اقبال میں فکر سر سیّد اور اس فکر کے نہایت اہم انکشش: اکبر الٰہ آبادی کا اندازِ نظر بھی، بہ یک وقت اور ایک عجب توازن کے ساتھ کارفرما تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حقیقی یا معنوی اولاد کی کسی سبقت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے پدرِ معنوی یا حقیقی سے بڑا کہا جائے۔ ابوالکلام کو جس فکری سرمائے نے غیر مقلّد ذہن عطا کیا وہ دینِ خالص، وطن دوستی، عالمی اخوّت اور دور اندیشی کا مرکب تھا اور یہ کم و بیش، سر سیّد ہی سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔

اقبال و ابوالکلام کے عہد تک آتے آتے برطانوی حاکموں کو برصغیر میں پاؤں جمائے رکھنے کے لیے مزید قوتوں اور خصوصی حکمت عملی کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس احساس نے حکومت کی نظر میں ہر اُس اقدام اور فرد کو انتہائی مشکوک و خطرناک بنا دیا تھا جو برصغیر کے تہذیبی و ثقافتی ورثوں کی بازدید اور اِس زمین پر آباد مخلوق میں یگانگت و اتحاد کی بات کرتا تھا۔ ابوالکلام و اقبالؔ کے پہلو بہ پہلو پریم چند اور برج نرائن چکبست بھی ہیں جن کی تیز نگاہ اور مفکر ذہن سے، ملکی زندگی کا ایسا کوئی گوشہ اوجھل نہ رہا ہو جو اصلاح اور وطن دوستی کی قوتوں کا طلب گار تھا۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ اِس زمانے تک آتے آتے بّرصغیر کی فضا پر حصولِ آزادی کا جذبہ پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ سیاست کے میدان میں گاندھی جی کی مذہب دوستی، جواہر لال کا تاریخی شعور اور محمد علی جوہرؔ کے جذبات کارفرما تھے۔ ادب کی دنیا میں پریم چند، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھ پوری کی تیز و مدھم، مگر دل و جاں میں گھر کر لینے والی آوازیں وجود پا چکی تھیں۔

بیسویں صدی کے چوتھے عشرے تک بّرصغیر کا ماحول ہر اس آہٹ کو ایک نعرۂ مستانہ تصوّر کرنے لگا تھا جو وطن عزیز کی شاہراہ آزادی سے پیدا ہوتی تھی۔ اسی حسّاس فضا میں

ترقی پسند ادبی تحریک نے بال و پر کھولے اور حاکمانِ فرنگ کے تئیں مخالفانہ ماحول کو اپنی احتجاجی آواز سے کچھ اور شدید بنا دیا۔

حصول آزادی کے لمحے پر ایک ذرا رک کر گزشتہ ۹۰ سال پر نظر ڈالتے ہیں تو اردو ادب کی ایسی بےشمار چھوٹی بڑی شخصیات دکھائی دیتی ہیں کہ جن کے نام بھلے ہی اس مختصر تحریر میں نہ آ سکے ہوں۔ مگر باخبروں کو علم ہے کہ ان شخصیات نے انفرادی اور اجتماعی طور پر اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ کو تقویت بخشی ہے۔ ان کے قلم برصغیر کی صالح مذہبی روایات کی تجدید کے لیے اٹھے، ان کے قلم کی روشنائی نے ان فکری اثاثوں کو از سر نو منور کیا جو حاکم قوم کے ہاتھوں درآمد شدہ تصورات کے مقابل کچھ مدت کے لیے ماند پڑ گئے تھے۔ ان کی تحریروں نے بتایا کہ مشرق کی جھولی میں بھی ایسے جواہر پارے ہیں جو دنیا کے دیگر خطوں کے مال و متاع کی طرح آنکھوں کو خیرہ کر سکتے ہیں۔ ان کے فن پاروں نے یاد دلایا کہ مشرق کے دامن میں بھی وہ مادی اور روحانی قوتیں عرصۂ دراز سے موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو جائیں تو ہم بھی اپنی خمیدہ کمر سیدھی کر سکتے ہیں اور کارگاہِ ہستی میں اپنے پورے یعنی داخلی و خارجی اور ماضی و حال کے وجود کو بر سر عمل لا سکتے ہیں۔

مجھ بے علم کو نہیں معلوم کہ کسی سماجی یا ادبی مؤرخ نے تاحال اس پہلو پر توجہ کی یا نہیں کہ برصغیر کی آزادی تک تو اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ کا عمل بڑی حد تک جاری رہا۔ لیکن ملکی آزادی کے لمحۂ خیر میں اس کے ساتھ کچھ بدشگونیاں ہو گزری ہیں۔

کوئی صاحب نظر جائزہ لے تو معلوم ہو کہ دولخت آزادی اور اس کے بعد کے حالات نے برصغیر کی فکری قوتوں میں ایسے کیا رخنے ڈال دیے کہ ہم سر سید، حالی، اقبال، چکبست، پریم چند میراجی، ن۔م راشد اور فراق کی زائیدہ روشنی سے خاطر خواہ اکتساب نہیں کر پا رہے ہیں ہے۔ آج کا اردو قلم، مجموعی طور پر کس زاویے سے چلے کہ نشاۃ ثانیہ کا عمل از سر نو جاری ہو؟۔ اور وہ کیا ڈھب ہو کہ ہم اپنا ظاہر و باطن ایک جٹ کر سکیں ہے تاکہ مغرب کی اس نئی یلغار کا سامنا کر سکیں جو مشرق کو ایک بار پھر پسپا کرنے کے لیے آغاز پا چکی ہے۔

مجھے تو بار بار یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ مذکورہ بدشگونیوں کے مقابل ادھر اکیلی قرۃ العین حیدر اور ادھر انتظار حسین، بھلا کب تک اور کیا کیا کر سکتے ہیں؟؟

جبین انجم

رسالہ عصمت

افتتاحی جلد کا جائزہ

انیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستانی سماج میں خواتین کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ عورتوں کی ایک مختصر تعداد کو چھوڑ کر زیادہ تر آبادی باقاعدہ تعلیم سے محروم تھی۔ عورتوں کی سماجی حیثیت بھی قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ حالانکہ مسلمانوں میں عورتوں کے لیے جائیداد کا حق، شادی اور طلاق کے لبرل قوانین موجود تھے مگر پردے اور تفریق کے عیوب ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ زیادہ تر خواتین تو ناخواندہ تھیں لیکن خوش قسمتی سے جو کچھ پڑھ لکھ گئی تھیں۔ وہ معلوماتی کتابوں کے بجائے اپنا وقت بے کار قسم کے مشاغل میں صرف کرکے علمی معلومات سے محروم رہ گئیں۔

ملک میں یوں بھی ادبی اور معلوماتی کتابوں کی کمی کی وجہ سے خواتین کا ذہن دوسری کمتر دلچسپیوں میں الجھا رہنے لگا اور ایک ایسے رسالے کی کمی شدت سے محسوس کی جانے لگی جو خواتین کو علم کی روشنی کی طرف لے جاسکے۔ اس کوشش میں چند رسالے اور اخبارات جو کام کر رہے تھے وہ بہت اہم تھے لیکن ان کا دائرہ اثر محدود تھا اس لیے اردو میں ایک ایسا رسالہ نکالنے کی ضرورت محسوس کی گئی جس کے ذریعے اردو داں مستورات کی آسانی سے ذہنی تربیت ہو سکے۔

جبین انجم، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵۔

چنانچہ مسلم خواتین کو معلومات کے ساتھ دلچسپ مضامین بہم پہنچانے کے لیے جناب شیخ محمد اکرام صاحب نے مخزن پریس دہلی سے جون ۱۹۰۸ء میں "عصمت" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا جس کا مقصد عالم نسواں کی ترقی تھا اس سے فائدہ یہ ہوا کہ کسی شہر میں خواتین کی ترقی سے دوسرے شہروں کی خواتین کو بھی واقفیت حاصل ہو جاتی۔ "عصمت" نے اس ترقی کے تمام حالات مختلف ذرائع سے جمع کر کے ان کی طرف دوسری خواتین کو متوجہ کرایا اور ان کے لیے تبادلۂ خیال کا ایک موثر ذریعہ فراہم کیا۔

ناظرین کے لیے معلومات عامہ بہم پہنچانا اور ان کی معلومات کو بڑھانا ہر اخبار اور رسالے کا فرض ہوتا ہے "عصمت" نے بھی اس فرض کو بخوبی نبھایا۔ اس کے علاوہ مشہور مقامات کے مختصر حالات مع تصاویر دیے تاکہ پردہ نشین خواتین ملک کے حالات سے بالکل ناواقف نہ رہ جائیں۔

"عصمت" میں علمی ادبی۔ تاریخی معاشرتی غرضیکہ ہر قسم کے مضامین جو مستورات کے لیے مفید اور ضروری سمجھے گئے شائع کیے گئے اور سیاسی مضامین سے قطعی احتراز کیا گیا۔

جس وقت "عصمت" منظر عام پر آیا اس وقت ملک میں دو تین پرچے عالم نسواں کے لیے مخصوص تھے۔ پہلا مشہور پرچہ "تہذیب نسواں" جو لاہور سے نکلتا تھا اور دوسرا "خاتون" جو علی گڑھ سے نکلتا تھا۔ ان دونوں پرچوں کی غیر معمولی مقبولیت نے شیخ محمد اکرام کو عالم نسواں سے متعلق پرچہ جاری کرنے پر اکسایا۔ چونکہ مندرجہ بالا دونوں پرچے اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود وقت کی ضرورت کو کما حقہ، پوری کرنے سے قاصر تھے اس لیے جون ۱۹۰۸ء میں "عصمت" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ جو علمی و ادبی اعتبار سے "تہذیب نسواں" اور "خاتون" سے کم نہیں تھا۔

رسالہ "عصمت" کا حجم علاوہ سرورق کے ۴۸ صفحات ہے۔ رسالہ چکنے ولایتی کاغذ اور خوش قلم سے چھپا ہوا ہے۔ ہر رسالے میں ایک تصویر مزین ہے۔ اس کی قیمت سالانہ مع محصول ڈاک صرف تین روپے تھی۔ رسالے کا سرورق گلابی رنگ کا ہے جس پر سنہرے قلم سے رسالہ کا عنوان 'عصمت' چھپا ہوا ہے۔

عصمت کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ مضمون نگار خواتین کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس لیے اس رسالے میں خواتین کے مضامین کو زیادہ اہمیت دی گئی تاکہ خواتین میں ہمت و حوصلہ

بلند ہو اور وہ بھی سماج میں کچھ کر دکھانے کی صلاحیت پیدا کرسکیں۔ مردوں کے مضامین بھی شامل کیے گئے لیکن ان کا مقصد صرف نمونہ اور مثال کے طور پر یا معلومات میں مدد دینا تھا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی عصمت میں شائع شدہ مضامین نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ زبان عام بول چال کے قریب ہونے کے باوجود سنجیدگی اور شائستگی لیے ہوئے ہے اسی طرح نظموں کا معیار اعلیٰ اور دلکش ہے جن سے بیک وقت بچے اور بڑے دونوں ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

آج تقریباً چوراسی سال کا وقفہ گزر جانے کے بعد بھی عصمت کی زبان کی دلکشی باقی ہے اس کے کچھ ہی مضامین کے مطالعہ سے قارئین عصمت اس کی عظمت کے معترف ہو جاتے ہیں۔ اور ان پر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ چوراسی سال کے اس وقفہ نے کس طرح ہماری تہذیب سماج تعلیمی اقدار معلومات اور ادب میں تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔

تہذیبی اور معاشرتی تاریخ کی تشکیل میں ادب بالخصوص بہت معاون ثابت ہوتا ہے پیش خدمت مضمون میں ہم "عصمت" کی افتتاحی جلد کے شماروں کا قارئین سے تعارف کرا رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان شماروں میں شامل مضامین اور نظموں کے مطالعہ سے موجودہ صدی کے پہلے دہے میں شمالی ہندوستان کے مسلم طبقہ کی خواتین میں بیداری کی لہر کے بارے میں بھرپور اشارے ملتے ہیں۔ "عصمت" میں موجود مضامین کا تعلق براہ راست خواتین کے مسائل اور ان کے لیے فراہم کردہ مفید معلومات سے ہے۔ لہٰذا ہم ذیل میں ان کا مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

"عصمت" میں شائع شدہ تعلیم سے متعلق مضامین

عصمت کی پہلی جلد میں تعلیم سے متعلق پانچ مضامین شائع ہوئے۔ ان میں پہلا مضمون (جون ۱۹۰۸ء) سیدہ ام جہریہ صاحبہ کا ہے۔ جس میں انھوں نے نصاب تعلیم کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ انھوں نے بالخصوص اس تعلیم پر توجہ دی ہے جس سے ہمیں اپنے روزمرہ کے کاموں میں سابقہ پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر گھر کا انتظام خوش سلیقگی سے کس طرح انجام دیں۔ کس قسم کا انتظام گھر میں زیادہ سے زیادہ خوشیوں کو اپنے اندر سمیٹ کر رکھتا ہے اور اس کے لیے سیدہ صاحبہ

نے کئی طریقے بھی بتائے ہیں۔ مثال کے طور پر مذہبی تعلیم کی تکمیل، زبان دانی وانشا پردازی، اصول خانہ داری، دستکاری وسوزن کاری، اصول معاشرت کو اپنے روزانہ کے کاموں میں جگہ دینے سے خواتین یقیناً ایک اچھی زندگی کا آغاز کرسکتی ہیں۔

مذکورہ شمارے میں اگلا مضمون حمیدہ بانو صاحبہ کا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے دور کے نظام تعلیم پر بحث کی ہے۔ آج کل معاشرے میں تعلیم سے مراد جس قسم کی تعلیم لی جاتی ہے۔ اس طرف بھی انھوں نے توجہ دی ہے۔ تعلیم کے اصل مقصد کی طرف انھوں نے بڑی خوبصورتی سے توجہ دلاتے ہوئے یہ مشورہ دیا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد دراصل کفایت شعاری۔ مذہبی عقائد کا مضبوط ہونا اور اخلاق کی استواری ہونا چاہیے۔

تیسرا مضمون دختر صاحبزادہ عبدالمجید صاحب کا "تعلیم وتربیت" کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم کی یکساں ضرورت پر زور دیا ہے۔ کیوں کہ عورت اور مرد دونوں ہی سماج کے اہم جز ہیں۔ ایک اچھے سماج کی تشکیل کے لیے عورت اور مرد دونوں ہی کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اسلام میں خواتین کی تعلیم کی طرف بھی دھیان دیا گیا ہے جس کی مثال انھوں نے اسلام میں موجودہ خواتین کے کارناموں سے دی ہے۔ تعلیم کا مقصد صرف ڈگریاں حاصل کرنا نہیں بلکہ حصول علم ہونا چاہیے۔

جولائی کے شمارے کا آغاز سہردردیہ بیگم کے مضمون "مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم" سے ہوتا ہے۔ مضمون کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر حال کی روشن تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس مضمون کے ذریعے سہردردیہ صاحبہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی رہتی ہے کہ اسلام میں تعلیم نسواں کی اجازت نہیں ہے۔ انھوں نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے ایام جاہلیت کی مثال دی ہے کہ اس دور میں بھی تعلیم نسواں کا زور تھا۔

اسی سلسلہ کا آخری مضمون دسمبر ۱۹۰۸ء میں "مذہب اور عورتوں کی تعلیم" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ذکیہ صاحبہ کا یہ مضمون مذہب اور تعلیم کے رشتے کو ایک مضبوط دھاگے میں باندھتا ہے۔ انھوں نے قرآن پاک اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو بنیاد بنا کر خواتین کی تعلیم پر

زور دیا ہے اور اس کے لیے قرآن پاک کی چند آیتوں کو مثال بنا کر پیش کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مثالیں پیش کر کے انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کی ہے کہ اسلام میں خواتین کی تعلیم پر بھی اتنا ہی زور دیا گیا ہے جتنا کہ مردوں کی تعلیم پر۔

بچّوں کی نگہداشت

اسی سلسلے کا دوسرا موضوع ہم نے بچّوں سے متعلق چنا ہے۔ اس میں بھی تقریباً پانچ مضامین بچّوں کے موضوع پر پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں شائع کیے گئے۔ ان مضامین کا ایک ہلکا سا خاکہ ذیل میں درج ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ماں کی ممتا کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اس موضوع پر راشد الخیری کا مضمون "بچّوں کا رکھ رکھاؤ" ماہ جون ۱۹۰۸ء میں شائع کیا گیا۔ جس میں جڑی بوٹیوں سے علاج کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کی کئی ہدایات بھی مضمون میں درج ہیں۔ راشد الخیری صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ روزمرہ کام آنے والی دوائیں گھر میں موجود رہیں تاکہ بوقت ضرورت فوری طور پر استعمال میں لائی جا سکیں۔

چونکہ "عصمت" کا مقصد خواتین کو ان باتوں کا علم بہم پہنچانا تھا جن سے زندگی میں قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ ان ہی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جولائی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں فیروزہ سراج الدین صاحبہ کا مضمون "بچّوں کی نگہداشت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بچّوں کی عادات و اطوار اور ان کے نیچر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ مختلف طرح کی عادتیں بچّوں میں آگے چل کر کس طرح کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس مضمون کو اگر بچّوں کی نفسیات سے متعلق کر لیں تو غلط نہ ہوگا۔

ستمبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں مولوی سید احمد صاحب کا مضمون "بچوں کا رکھ رکھاؤ" شائع ہوا جس کا ہندوستان کی ماؤں سے گہرا تعلق ہے۔ اکثر مائیں اپنے آرام کے لیے بچوں کو افیم دے کر سلا دیتی ہیں تاکہ وہ آرام سے گھر کا کام اور دیگر مصروفیات کو نبٹا سکیں۔ مولا صاحب نے [illegible] افیم دینے کے لیے منع کیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے

تمام بیماریوں سے آگاہ کیا ہے جو کہ افیم کھانے سے ہو جاتی ہیں۔ ان کا گھریلو علاج بھی مضمون میں درج ہے۔ اس لحاظ سے یہ مضمون کافی معلوماتی قرار دیا جا سکتا ہے۔

ن۔ا بیگم کا مضمون "بچوں کے اخلاق کی درستگی" دسمبر ۱۹۰۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا اس میں اخلاقی تعلیم کے فروغ کی طرف توجہ کی کوشش کی گئی ہے۔ خاص کر ان لڑکوں کے لیے جو اسکولوں میں زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ چیز ہے جس سے زندگی بگڑ بھی سکتی ہے اور سنور بھی سکتی ہے اس لیے اخلاق کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے ذمہ دار ماں اور باپ دونوں ہی ہوتے ہیں۔ اچھی باتوں کے لیے حوصلہ افزائی کرنا ایک اخلاقی فرض ہے۔ زیادہ رعب و دبدبہ اور زیادہ آزادی ولاڈ دونوں ہی اخلاق کو بگاڑنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اس لیے ایک خاص اعتدال ضروری ہے۔

امور خانہ داری

امور خانہ داری خواتین کی زندگی کا ایک اہم جُز ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا فائدہ مند ثابت ہوں گی۔ "گھر کی صفائی" کے موضوع پر قمر جہاں صاحبہ کا مضمون ماہ جون ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شامل کیا گیا۔ مضمون کا خاص مقصد یہ ہے کہ کس طرح اپنے گھر کو خوبصورت اور خوشنما بنایا جائے۔ اس کے لیے گھر کی تقسیم کچھ اس طرح کرنی چاہیے کہ ملاقاتیوں کے لیے الگ کمرہ مخصوص کر دیا جائے اور آرام سے بیٹھنے کے لیے الگ کمرہ۔ اس کے علاوہ گھر کے سامان کو الگ جگہ رکھنا چاہیے تاکہ ہوا بھی صاف رہے اور ماحول بھی خوشنما رہے۔

نواب بیگم آف سچین کا مضمون "سینا پرونا" ماہ اگست کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس میں سینے پرونے سے متعلق کچھ اصول اور ان کے فوائد بتائے گئے ہیں۔ اور اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ لڑکیوں کو اپنی تعلیم میں سے کچھ وقت نکال کر سینا بھی ضرور چاہیے۔

بنت عبدالباقر کا مضمون "مہذب گھر" کچھ اسی انداز کا مضمون ہے بلکہ اسے مضمون مناسب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس میں مکالمے کچھ اس انداز کے ہیں جیسے ہم سب کچھ اپنی

آنکھوں سے ایک تماشائی کی طرح دیکھ رہے ہوں۔ ایک مہذب گھرانے کا حال ہے جو کہ تعلیم یافتہ بھی ہے اور انگریزی کا دلدادہ بھی۔ انگریزی کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک اچھے مہذب گھرانے میں جس قسم کی ضروریات کا سامان، جیسا انداز گفتگو اور لباس و پوشاک ہوتا ہے انھوں نے دلچسپ ہی بیان کر کے قاری کو اپنی طرف اور مہذب گھرانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ تاکہ اس انداز سے خود کو اور دیگر افراد کو مہذب رکھا جائے۔

"سینا پرونا" کے موضوع پر ہی مسز محمد عبداللہ کا مضمون اکتوبر ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں بھی سینے پرونے کو اہمیت دی گئی اور ایک اہم ضرورت خیال کرتے ہوئے خواتین کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ اُن کے لیے سینا پرونا کتنا ضروری ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بلوچستان اور پشاور کی خواتین کی مثالیں دیں اور ہندوستانی خواتین کو ایک مثالی خاتون بننے کی طرف اشارہ کیا۔ اور بلوچستان، پشاور۔ ملتان وغیرہ کی خواتین پر آفریں کرتی ہیں۔

بنتِ نذرالباقر کا اگلا مضمون بھی "مہذب گھر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے دوسرے حصے میں انھوں نے نئی اور پرانی تہذیب کے دو نمونوں کو جمع کیا ہے اور ان کے ملاپ کی مشکلات دکھلائی ہیں۔ معلوم نہیں ان کی ذاتی رائے بحیثیت مجموعی کس تمدن کی طرف مائل ہے۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرنے میں ہمیں تامل نہیں کہ ہم مغربی تمدن کی خوبیوں کا تو اعتراف کرتے ہیں۔ مگر اس کے قائل نہیں کہ وہ ساری کی ساری ہمارے ملک کے لیے موزوں ہیں۔ ہم اپنی تہذیب میں ترمیم کرلیں یہ اور بات ہے۔ لیکن اس سے قطع تعلق کر کے کبھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

حفظانِ صحت

اس سلسلے کا پہلا مضمون جناب زہرا بیگم فیضی صاحبہ نے شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی کی مشہور کتاب "تمدن عرب" سے انتخاب کر کے بھیجا ہے۔ جس میں عربوں کے اصول حمیت کو مدنظر رکھ کر ان کی تفصیل درج کی گئی ہے۔ عربوں کے شفا خانے

صحت، اصول کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے۔ تبدیلی آب و ہوا کے فوائد بھی ان کو معلوم تھے۔ عربوں کی طبی ترقیاں زیادہ تر فن جراحی۔ علاماتِ مرض اور ادویات میں ہیں اور اس کے طریقے بھی مضمون میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ فن جراحی کی ابتدائی ترقی عربوں سے ہوتی ہوئی کس طرح زمانۂ حال تک پہنچی اور کس طرح یورپ تک اس کا اثر پہنچا اس پر بھی اس مضمون میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

اکتوبر ۱۹۰۸ء میں بیگم صاحبہ نواب خدیو جنگ بہادر کے مضمون "بیماری اور تیمارداری" کا انداز بھی تقریباً بنت نذر الباقر کے مضمون "مہذب گھرانے" کے مکالمی انداز پر ہے۔ یہ مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا جس میں عام مسلمان گھرانوں کی طرح نہ منتیں مرادیں ہیں اور نہ ٹونکے ٹوٹکے۔ بس دوا اور وقت پر آرام کی پابندی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ گھر کا خوش گوار ماحول بھی اچھی صحت کے لیے ضروری ہے۔

سفرنامے و تاریخی عمارتیں

اس ماہنامے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف پند و نصیحت کے مضامین ہی نہیں ہیں بلکہ تفریحِ ذہن کے لیے مفید سفرنامے اور تاریخی عمارتوں کا ذکر بھی شامل ہے جو یقیناً ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے۔ عبدالقادر صاحب کا مضمون "تاج محل" ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا جس میں تاج محل کا اقداری پہلو، اس کی تاریخی انفرادیت اور موجودہ حالت بیان کی گئی ہے۔

سفرناموں کے سلسلے میں ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرہ جنشان کا تک "سفر نامۂ یورپ" قسط وار ماہنامہ "عصمت" میں شامل کیا گیا۔ طبقۂ نسواں کے لیے یہ اس لیے بھی ایک یادگار بات ہے کہ ایک روشن خیال عالی رتبہ خاتون نے اپنے شوہر نامدار کی معیت میں ایسا لمبا سفر کیا۔ اپنے اس سفرنامے میں انھوں نے سفر پر جانے کے وقت سے لے کر وہاں موجود رہنے کے تمام حالات و واقعات بمعہ تاریخ کے نوٹ کیے ہیں۔

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ میں اس وقت کی تہذیب و تمدن رہنے سہنے کے ڈھنگ، کس طرح آج کے ماحول سے مختلف تھے۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کا مضمون بہ عنوان "حضرت محبوب الٰہیؒ" مشمولہ

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ء کا معلوماتی مضمون ہے جس میں خواجہ حسن نظامی نے حضرت محبوب الٰہی کے پورے مزار کی تصویر اتاردی ہے وہاں شام کے منظر کی تفصیل اور تاریخ پر واقعات بھی خوبصورتی سے مضمون میں پروئے گئے ہیں۔ اس مضمون میں ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں حضرت محبوب الٰہی پر ایک شہزادی کا عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اس نے ایک کروڑ روپے کا سامان حضرت کے مزار پر نذر کر دیا اس کے بعد محمد شاہ بادشاہ کا اور ان کی اہلیہ کے مزار کا ذکر ہے۔ امیر خسرو کے مزار کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مزار کے اطراف میں مقبروں اور دوسرے گنبدوں کی نشاندہی بھی اس مضمون میں کی گئی ہے، جس سے یہ ایک تاریخی شکل میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔

نمک کی کان کا ذکر اس اقتباس میں کرنا بیجا نہ ہوگا۔ مسٹر سراج الدین صاحب لاہور کا یہ مضمون ماہ نومبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون بھی ایک سفرنامے کے انداز میں شروع ہوتا ہے اور اپنے مقصد کی طرف بڑھتا ہوا نمک کی اہمیت۔ اس کے بنانے کے طریقے اور اس میں حائل دقتوں کا بیان کرتے ہوئے ہمیں کان کی منزل تک لے جاتی ہیں۔ یقیناً یہ ایک معلوماتی مضمون ہے جس کو پڑھتے ہوئے تجسس کا عنصر غالب رہتا ہے۔

عورتوں کے من گھڑت قصے

زمانۂ قدیم سے گھر کی چہار دیواری میں محدود عورتوں کی دنیا میں رائج توہمات کو یکلخت ان کے دل سے نکالنا دشوار کام ہے۔ ایسے ہی توہمات کی فہرست مولوی سید احمد دہلوی نے عصمت کے افتتاحی جلد کے کئی شماروں میں شائع کی ہے مقصد یہی ہے کہ عورتیں توہمات کی دنیا سے باہر آئیں اور توہمات کے مضر رساں نتائج سے خود بھی محفوظ رہیں اور وہ معاشرہ جن میں ان کا اہم رول رہتا ہے وہ بھی محفوظ رہے۔ مولوی سید احمد دہلوی کی اس کوشش کو حقیقتاً اصلاحی کہا جائے گا۔

"عصمت" میں شامل نظمیں

جس طرح "عصمت" کے مضامین کا اپنا ایک الگ مزاج اور معیار رہا ہے۔ اسی طرح نظموں کا انداز بھی سب سے جدا اور معیاری ہے مختلف لوگوں کی نظمیں جن میں خواتین اور مرد

ہی شامل ہیں" عصمت" میں شائع کی گئی ہیں۔ ان نظموں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ نظمیں اخلاقی ہوں جن میں اخلاق کی مضبوطی مقصود ہو۔ زبان کی سادگی، خیالات کی صفائی مطالب کی عام فہمی پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہے۔ چند ایک شرائط "عصمت" میں نظم کے لیے وقف کر دی گئیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے نظمیں مرتب کی گئیں۔

۱۔ ہر نظم میں شعروں کی مقررہ تعداد ملحوظ رکھی گئی یعنی ہر نظم میں بیس سے زائد اشعار نہ ہوں۔

۲۔ نظم کی سادگی پر خاص دھیان دیا گیا۔

۳۔ دیے گئے عنوان پر ہی نظم کا انتخاب کیا گیا۔

نظموں میں مذہبی، اخلاقی، تاریخی یا نیچرل مضامین منتخب کیے گئے۔

بزم عصمت

"بزم عصمت" سے متعارف کرانے کا خاص مقصد یہ تھا کہ ایسے خط جو خاص طور پر دلچسپ اور معلوماتی سمجھے جائیں۔ اس عنوان کے تحت شامل کیے جا سکیں۔ اس سے دور دور شہروں میں رہنے والی خواتین ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ باہمی ہمدردی کا رشتہ مضبوط ہو اور سب ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہو سکیں۔

عصمت کے پہلے شمارے میں قدرتی طور پر "عصمت" کے جاری ہونے اور اس کی ترقی پر بات چیت رہی۔ عصمت کے پہلے شمارے میں تقریباً آٹھ خطوط شامل کیے گئے ہیں جس میں سبھی "عصمت" کے اجرا اور ترقی پر مبنی تھے۔

اگست ۱۹۰۸ء کے شمارے میں تین خطوط شامل کیے گئے جن میں تینوں خط الگ الگ نوعیت کے ہیں۔ پہلا خط سلطانہ بیگم کا ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر کا حال بیان کیا ہے۔ دوسرا خط بڑودہ سے آمنہ طیب جی کا ہے جس میں انھوں نے دوپٹے رنگنے کی ترکیب بتائی ہے۔ اور تیسرا اور آخری خط بنت سید محمد شاہ کا ہے جس میں انھوں نے کپڑا رنگنے کی ترکیب پر لکھی گئی کتابوں سے واقفیت کرائی ہے۔

اسی طرح مختلف مشورے ترکیبیں "بزم عصمت" میں پیش کی گئی ہیں جن کے واسطے سے باوجود خواتین ایک دوسرے سے قریب دُکھ سکھ میں شریک نظر آتی ہیں۔

ہیرندیم

از بنرا احمد

چنگیز خاں۔ فاتح عالم

دوسرا باب

زندگی کی کش مکش

اس کے جدامجد قبل خاں اور اس کے باپ لیسوکائی کے زمانے میں یکا مغل شمالی گوبی میں ب طرح سے سردار مانے جاتے تھے۔ چونکہ وہ مغل تھے، اس لیے قدرتی طور پر جھیل بکال سے ، کر مشرق میں موجودہ منچوریا کی سرحد پر پہاڑوں کے اس سلسلے تک جس کو آج کل خنگان کہتے ہیں نی اچھی چراگاہیں تھیں، سب پر انھوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔

یہ بڑی پسندیدہ چراگاہیں تھیں۔ یہ گوبی کے بڑھتے ہوئے ریگ زار کے شمال میں دو ہوٹی ندیوں کلوران اور اونان کی زرخیز وادیوں کے درمیان واقع تھیں۔ پہاڑیاں برچ اور نوبر کے درختوں سے لدی ہوئی تھیں، شکار کثرت سے تھا۔ پانی افراط سے — کیوں کہ برف بر میں پگھلتی تھی — یہ سب باتیں ان قبیلوں کو خوب معلوم تھیں جو پہلے مغلوں کے یر حکومت تھے اور اب تیرہ سالہ تموچن سے اس ملکیت کو چھیننے کی تیاری کر رہے تھے۔

یہ ملکیت خانہ بدوشوں کے لیے بڑی قدر و قیمت کی تھی۔ زرخیز چراگاہیں، جہاں ڑوں میں سردی بہت زیادہ ناگوار نہ ہوتی تھی اور مویشیوں کے گلے جن سے وہ روزمرہ کی زندگی ، ضرورتیں پوری کرتے تھے، بالوں سے نمدا اور خیمہ باندھنے کی رسیاں بٹتے تھے۔ ہڈیوں ے تیروں کی نوکیں بناتے تھے اور چمڑے سے گھوڑوں کی زین، کوئیس کے تھیلے اور گھوڑے دیگر ساز و سامان تیار کرتے تھے۔

اس کا امکان تھا کہ تموچن بھاگ نکلتا۔ آنے والی ضرب سے بچنے کی کوئی صورت نہ فی۔ اس کے محکوم متزلزل تھے اور مویشیوں کا خراج وہ اس لڑکے کو دینے کو ایسے زیادہ تیار . تھے، جو اب ان کا خان بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ خود تمام پہاڑیوں پر منتشر

[redacted]

تھے اور اپنے گلّوں کو بھیڑیوں اور ابتدائے بہار میں لازمی طور پر آنے والے چھوٹے موٹے حملہ آوروں سے بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

لیکن وہ بھاگا نہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک اکیلا اپنے یورت میں رو دیا کیا۔ پھر اس نے سرداری کا کام سنبھالا۔ اپنے بھائیوں، بہنوں اور دوسرے سوتیلے بھائی کی روزی کا انتظام کرتا رہا۔ یہ دوسرا سوتیلا بھائی جو بچ گیا تھا اس لڑکے کو بہت چاہتا تھا۔ سب سے پہلے اس کی ماں تھی جو اچھی طرح جانتی تھی کہ اس پہلوٹھی کے لڑکے پر مصیبت آنی لازمی تھی۔

لازمی اس لیے تھی کہ ایک اور جنگجو نے جس کا نام ترغاتائی تھا اور جو خود بھی بورجین یا بھوری آنکھوں والوں کی نسل سے تھا، شمالی گوبی کے سردار ہونے کا دعوا کیا تھا۔ ترغاتائی، تائیجوت کا سردار تھا جو مغلوں کے نسلی دشمن تھے۔

اور ترغاتائی — جو تموچن کے بہت سے قبیلے والوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا — اب اس پر مجبور تھا کہ وہ مغلوں کے کمسن خان کا پیچھا کرے اور اس کا خاتمہ کر دے جیسے بڑا بھیڑیا، بھیڑیے کے ایسے کمسن بچے کو مار دیتا ہے جس سے ڈر ہو کہ یہ ایک دن بھیڑیوں کے گروہ کا سردار بننے کی کوشش کرے گا۔

بغیر اطلاع کے شکار شروع کیا گیا۔ گروہ در گروہ سوار مغلوں کے اردو، ان کے خیموں والے گاؤں پہنچے اور کچھ ذرا بھیڑ کے اِدھر اُدھر سے مویشیوں کو ہنکا لے گئے اور ترغاتائی نے اس خیمے کا رخ کیا، جس پر پرچم لہرا رہا تھا۔

ان جنگجوؤں کے آنے سے پہلے تموچن اپنے بھائیوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ قسار نے جو بڑی قوت سے کمان کھینچ سکتا تھا، اپنے گھوڑے کو لگام دے کے دشمنوں پر کچھ تیر برسائے اور لوں کو زندہ رہنے دیا گیا — ترغاتائی کو تموچن کے علاوہ اور کسی کی تلاش نہ تھی۔

ایسے شکار شروع ہوا۔ لڑکوں کے پیچھے پیچھے تائیجوت لگے ہی ہوئے تھے۔ شکاریوں نے کوئی خاص جلدی نہ کی۔ راستہ تازہ اور صاف تھا اور یہ خانہ بدوش کئی کئی دن تک ایک ایک گھوڑے کا پیچھا کرنے کے عادی تھے۔ اگر تموچن کو نئی سواری نہ مل سکی تو یہ ضروری تھا کہ یہ اُسے جا لیں۔

جبلتی احساس یا تقاضا تھا کہ یہ لڑکے گھاٹیوں کا راستہ لیں، جہاں تناور درختوں کی آڑ میں وہ چھپ سکیں تھے۔ کبھی کبھی وہ گھوڑوں سے اتر کے درختوں کو کاٹ کے راستے پر ڈال دیتے تاکہ تعاقب کرنے والوں کا راستہ روکیں۔ جب شام ہوئی تو وہ علیحدہ ہوگئے۔ بہنیں اور سب سے چھوٹے بھائی ایک غار میں چھپ گئے۔ قسار کسی طرف پلٹ گیا اور خود تموچن ایک ایسے پہاڑ پر گھوڑا دوڑاتا ہوا چڑھ گیا، جہاں چھپنے کی جگہ ملنے کی امید تھی۔

یہاں وہ کئی دنوں تک پیچھا کرنے والوں سے چھپا رہا۔ یہاں تک کہ بھوک سے مجبور ہو کے کوشش کی کہ گھات لگائے ہوئے تائیجوت کے درمیان سے گھوڑا نکال لے جائے، لیکن وہ دیکھ لیا گیا، پکڑا گیا اور جب وہ ترغاتائی کے سامنے لایا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اسے کنگ پہنا دیا جائے۔ یہ کنگ ایک طرح کی چوبی ہتھکڑی تھی جس سے شانے اور کلائیاں جکڑ دی جاتی تھیں جنگجو قبیلے والے پکڑے ہوئے مولشیوں کو ہنکاتے ہوئے اور تموچن کو اس طرح ہتھکڑی پہنائے ہوئے اپنی چراگاہوں کو واپس روانہ ہوئے۔ تموچن اس طرح مجبور اور لاچار ان کے ساتھ رہا۔ یہاں تک کہ ایک ایسا موقع آیا کہ جنگجو کسی دعوت میں گئے ہوئے تھے اور اس کی حفاظت کے لیے صرف ایک محافظ چھوڑ گئے تھے۔ جب خیمہ گاہ پہ اندھیرا چھا گیا تو نوجوان مغل نے قطعی ارادہ کر لیا کہ وہ ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے گا۔

خیمے کی تاریکی میں اس نے اپنے کنگ کے سرے کو محافظ کے سر پر دے مارا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب وہ دوڑ کے خیمہ سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ چاند نکل چکا ہے اور جس جنگل میں خیمہ گاہ تھی، اس میں چاندنی چھن چھن کے آ رہی تھی۔ جھاڑیوں میں گھس کے وہ اس ندی کی سمت چلا جسے ایک دن پہلے سب نے عبور کیا تھا۔ اپنے پیچھے تعاقب کرنے والوں کا شور سن کے اس نے ندی میں چھلانگ ماری اور ایک کنارے کی گھاس میں ڈوب کے بیٹھ گیا، صرف اس کا سر پانی سے اونچا تھا۔

یہاں بیٹھے بیٹھے اس نے تائیجوت سواروں کو دیکھا کہ وہ ندی کے کنارے کنارے اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک جنگجو نے اسے دیکھ لیا۔ ذرا ٹھٹھکا۔ پھر اسے پکڑوائے بغیر آگے بڑھ گیا۔

اس کنگ میں جکڑا ہوا تموچن اب بھی اتنا ہی بے بس تھا جیسے پہلے تھا اور اس نے سب جو کچھ کیا ادراک اور ہمت دونوں کی وجہ سے کیا۔ وہ ندی چھوڑ کے ان سوار [illegible] خیمہ گاہ میں داخل ہوا اور رینگتا ہوا اس جنگجو کے یورت کے اندر پہنچا جس نے [illegible] دیکھ لیا تھا لیکن اسے نہیں پکڑوایا تھا ــــ یہ ایک اجنبی تھا جو اتفاق سے [illegible] دوسرے قبیلے کے شکاریوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

اس لڑکے کو اس طرح بھیگا ہوا اور اس طرح نمودار ہوتے دیکھ کے یہ آدمی تموچن سے بھی زیادہ خوفزدہ ہو گیا، مگر قیدی پر اسے رحم آیا اور اس نے سوچا کہ اس کے لیے اچھا یہی ہو گا کہ کسی نہ کسی طرح اس نوجوان سے نجات پائے۔ اس لیے اس نے کنگ کو کاٹ کے اس کے ٹکڑوں کو جلا دیا۔ اور اس دوران میں تموچن کو اون سے لدی ہوئی ایک گاڑی کے اندر چھپا دیا۔

اس کھلے کھلے اون کے اندر بڑی گرمی تھی ــــ یہ کوئی آرام کی جگہ نہ تھی، خاص طور پر اس لیے کہ جب تائیجوت جنگجو خیمہ کی تلاشی لینے آئے تو انھوں نے اپنے نیزے گاڑی کے اندر بھی چبھوئے اور ایک نیزے کی انی سے تموچن کی ٹانگ زخمی ہو گئی۔

"میرے گھر کی آگ بجھ جاتی اور دھواں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا، اگر وہ لوگ تجھے یہاں ڈھونڈ پاتے۔" اس آدمی نے تلخی سے اس بھاگے ہوئے پناہ گزین سے کہا، مگر ساتھ ہی ساتھ اسے کھانا اور دودھ بھی دیا اور ایک کمان اور دو تیر دیے اور کہا۔ "اب اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کے پاس جا۔"

مانگے کے گھوڑے پر سوار جب تموچن اپنی زمینوں پر پہنچا تو اس نے وہی حالت پائی جس کا نقشہ اجنبی نے کھینچا تھا ــــ جہاں اس کی خیمہ گاہ تھی، وہاں اب صرف راکھ تھی۔ اس کے مویشی جا چکے تھے، اس کی ماں اور اس کے بھائی غائب تھے۔ اس نے بہرحال ان کا پتا لگا لیا اور دیکھا کہ بھو کا خاندان کس حال میں روپوش ہے ــــ سخت گیر اولون، کرٹیل قسار اور ملکوتی اس کا سوتیلا بھائی جو اس کی پرستش کرتا تھا۔

کسی نہ کسی طرح وہ زندہ رہے۔ راتوں کو اپنے ایک ہمدرد کی خیمہ گاہ کی جانب سفر کرتے ان کے پاس صرف آٹھ گھوڑوں کی ایک قطار تھی۔ گلہریوں جیسے چوچ لشکار کو پکڑتے رہے

اور بجائے بکری کے گوشت کے مچھلیوں پر گزر کرتے رہے۔ تموچن نے یہ سیکھا کہ دشمن کی گھات سے کس طرح بچتے ہیں اور کس طرح اپنے تعاقب کرنے والے دشمنوں کی صف کو چیرتے ہوئے اس پار نکل سکتے ہیں۔ شکار کی طرح اس کا تعاقب کیا جارہا تھا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے اس کی چالاکی بڑھتی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پھر کبھی پکڑا نہیں گیا۔

اب بھی اگر وہ چاہتا تو اپنے آباواجداد کی چراگاہوں کو چھوڑ کے بھاگ سکتا تھا، لیکن نوعمر خان کا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ اپنی میراث دشمنوں کے حوالے کردے۔ وہ اپنے قبیلے کی بکھری ہوئی آبادیوں میں گیا اور سنجیدگی سے اس نے چار جانور بطور خراج مانگے۔ ایک اونٹ، ایک بیل، ایک گھوڑا اور ایک بھیڑ — اپنی ماں کی آسایش کے لیے۔

یہ غور کے قابل بات ہے کہ دو چیزوں سے اس نے اجتناب کیا۔ بھوری آنکھوں والی بورتہ اب بھی اس کے آنے کا انتظار کر رہی ہے کہ وہ اسے بیاہ کے اپنے خیمے میں لے آئے اور بورتہ کا باپ ایک بڑے طاقت ور قبیلے کا سردار اور کئی نیزہ برداروں کا آقا تھا مگر تموچن اُن کے پاس نہ گیا۔

اور نہ اس نے ترک قوم قرایت کے "کفیل" سردار بوڑھے طغرل سے مدد مانگی جو بڑا ذی اثر تھا اور جس نے یسوکائی کے ساتھ رفاقت کی سوگند کھاکے جام پیا تھا۔ اس سوگند کے بیان سے یسوکائی کے بیٹے کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اس کے پاس ضرورت کے وقت جاکے منھ بولے باپ کی حیثیت سے اس سے مدد کرنے کو کہے۔ یہ شاید ایسا مشکل کام نہ تھا، میدانوں سے ہوتے ہوئے قرایت تک پہنچنا، جو فصیل والے شہروں میں رہتے تھے جن کے پاس سچ مچ کے خزانوں میں جواہر، ملبوسات، اچھے ہتھیار اور طلائی اطلس کے خیمے تھے۔ یہ قرایت ایشیا کے اس پریسٹر جان کی رعایا تھے۔

تموچن نے اپنے آپ سے جرح کی: "خالی ہاتھ بھک منگوں کی طرح جانے سے اس کی رفاقت تو خاک میسّر آئے گی، حقارت البتہ ملے گی۔

اور وہ اپنے اس ارادے پر جما رہا۔ یہ جھوٹا غرور نہ تھا بلکہ ایک یکا منگول کی سیدھی سادی منطق تھی۔ پریسٹر جان اس کو مدد دینے کا پابند تھا — ایشیائے عظیم میں رفاقت کی

سوگند کی بادشاہ کے دعدے سے زیادہ قدر و قیمت تھی ــــ لیکن نہ ناراض ہوا اور نہ ثبات کے مالک سے اس وقت تک کام نہ لے گا، جب تک کہ وہ اس قابل نہ ہو جائے کہ وہ ان کے سامنے بطور ایک حلیف کے پہنچ سکے، بھاگے ہوئے پناہ گزین کی طرح نہیں

اس دوران میں اس کے آٹھوں گھوڑے چوری ہو گئے۔

ان آٹھ گھوڑوں والا واقعہ اس لائق ہے کہ تاریخ سے اسے علیحدہ قبول کیا جائے۔ چوری لٹیرے تائیجوت کے لوگوں نے کی تھی۔ نویں راہوار پر ملکوتی باہر گیا ہوا تھا۔ یہ وہی سرخ گھوڑی تھی جس پر سوار ہو کے تموچن ترغاتائی کے چنگل سے نکل بھاگا تھا۔ ملکوتی گلہریاں پکڑنے گیا تھا اور جب وہ آیا تو نوجوان خان اس کے پاس گیا۔

"گھوڑے چوری ہو گئے۔"

یہ فکر کی بات تھی۔ ایک کے سوا باقی سب بھائی اب پیادہ ہو گئے تھے اور اگر کوئی حملہ آور آ نکلے تو محض اس کے رحم و کرم پر تھے۔

ملکوتی نے کہا "لٹیروں کا تعاقب میں کروں گا۔"

قستار نے کہا "تو انھیں تعاقب کر کے نہ پا سکے گا۔ میں جاؤں گا۔"

تموچن نے کہا "تم لوگ انھیں نہ پا سکو گے اور اگر پا سکے تو واپس نہ لا سکو گے۔ میں جاتا ہوں۔"

اور وہی اس تھکی ہوئی سرخ گھوڑی پر روانہ ہوا اور سوار دل اور آٹھ گھوڑوں کے پاؤں کے نشانوں سے کھوج لگاتا ہوا تین روز تک تعاقب کرتا رہا۔ وہ اپنے ساتھ کچھ سوکھا ہوا گوشت لے گیا تھا، جو زین اور گھوڑے کی پیٹھ کے درمیان رکھا تھا تاکہ نرم اور گرم رہے۔ یہ گوشت تو کب کا ختم ہو چکا تھا، مگر اس سے بڑھ کے مصیبت یہ تھی کہ یہ گھوڑی بار بار بچھڑ جاتی۔ تائیجوت جو ایک گھوڑے کے بعد دوسرا تازہ دم گھوڑا بدل سکتے تھے، اس کی نظروں کے پار ہی رہے۔

چوتھی صبح کو اس نوجوان مغل کو اپنا ایک ہم عمر جنگجو ملا جو ایک ندی کے کنارے ایک گھوڑی کا دودھ دوہ رہا تھا۔

لگام کھینچ کے تموجن نے پوچھا۔ " تو نے کچھ لوگوں کو آٹھ گھوڑوں کو بھگا کے لے جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

"ہاں پچھلے پہر آٹھ گھوڑے میرے قریب سے ہو کے نکلے تھے۔ میں تجھے وہ راستہ دکھا دوں گا جدھر وہ گئے ہیں۔"

مغل کی طرف دوبارہ دیکھ کے اجنبی نوجوان نے اپنا چمڑے کا کیسہ باندھ کے لمبی لمبی گھاس میں چھپا دیا اور کہا۔ " تو تھکا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا ہے، میرا نام بغورچی ہے اور میں تیرے ساتھ گھوڑوں کے تعاقب میں چلوں گا۔"

تھکی ہوئی سرخ گھوڑی چرنے کے لیے چھوڑ دی گئی اور بغورچی جن گھوڑوں کو چرا رہا تھا، ان میں سے ایک سفید گھوڑے پر رسّی ڈال کے اس نے زین کسی اور اسے تموجن کے حوالے کیا۔ انھوں نے پھر سے پگڈنڈی کی راہ لی اور تین دن بعد انھیں تائیجوت کی خیمہ گاہ نظر آئی جس کے قریب ہی چرائے ہوئے گھوڑے چر رہے تھے۔

دونوں نوجوان ان گھوڑوں کو ہنکا لائے اور فوراً ہی جنگجوؤں نے ان کا تعاقب کیا اور ان میں سے ایک جو سفید گھوڑے پر سوار تھا اور جس کے ہاتھ میں کمند تھی، ان کے قریب آ پہنچا۔

بغورچی نے تموجن سے کمان مانگی اور کہا کہ میں بچھڑ کے تعاقب کرنے والوں کا مقابلہ کروں گا لیکن تموجن نے اس کی یہ پیش کش نہ مانی۔ شام تک وہ گھوڑوں کو دوڑاتے رہے۔ اب سفید گھوڑے والا جنگجو اس قدر قریب آ گیا تھا کہ کمند پھینک سکتا تھا۔

نوجوان مغل نے اپنے نئے ساتھی سے کہا " یہ لوگ تجھے زخمی کر دیں گے۔ میں کمان کھینچتا ہوں۔"

پیچھے ہو کے اس نے زہ پر تیر چڑھایا اور اسے تائیجوت پر چھوڑا۔ وہ زین سے گرا۔ دوسرے جب اس کے برابر آئے تو انھوں نے لگام کھینچ لی۔ رات بھر دونوں نوجوان سفر کرتے رہے اور حفاظت سے گھوڑوں سمیت بغورچی کے باپ کی خیمہ گاہ میں آ پہنچے، جسے انھوں نے پورا واقعہ سنایا۔ بغورچی جلدی سے دودھ کا تھیلا ڈھونڈھ لایا تاکہ اس کے کھا

کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ اس نے بیان کیا کہ "جب میں نے اسے تھکا ماندہ اور پریشان دیکھا تو میں اس کے ساتھ ہولیا۔"

اس کا باپ جو ایک بڑے گلے کا مالک تھا، کسی قدر اطمینان سے یہ سب سنتا رہا۔ کیونکہ تموچن کے کارنامے میدانوں میں ایک خیمے سے دوسرے خیمے تک مشہور ہو چکے تھے۔ اس نے کہا۔ "تم دونوں نوجوان ہو۔ تم دونوں ایک دوسرے کے وفادار دوست بنو۔"

انھوں نے نوجوان خان کو کھانا دیا۔ ایک تھیلا دودھ سے بھر دیا اور اسے رخصت کر دیا۔ اور کچھ ہی عرصہ کے بعد بغورچی بھی اس کے پاس آ گیا۔ کیونکہ بغورچی نے اسے اپنا سردار بنا لیا تھا اور اپنے ساتھ اس کے خاندان کے لیے سیاہ سمور کا تحفہ لایا۔

تموچن نے اسے مرحبا کہا۔ "تیرے بغیر میں گھوڑوں کو پا نہ سکتا۔ اس لیے ان آٹھ گھوڑوں میں سے آدھے تیرے ہیں۔"

بغورچی نہ مانا۔ "اگر میں تجھ سے تیری چیز لے لوں تو میں تیرا رفیق کیسے ٹھہرا؟"

نہ تموچن کنجوس تھا نہ اس کے بہادر نوجوان ساتھی۔ فیاضی ان کی فطرت کی گہرائیوں میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ جس کسی نے تموچن کی کوئی خدمت کی، وہ اسے کبھی بھلا نہ سکتا تھا۔ رہ گئے وہ جو اس سے لڑ رہے تھے ـــــ تو صورتِ حال یہ تھی کہ اس کے اپنے چھوٹے سے گروہ کے علاوہ اور ہر کسی سے دشمنی کی توقع تھی۔

اس نے اپنے رفیقوں کو یقین دلایا۔ "جیسے سوداگر کو اپنے سامان سے نفع کا یقین ہوتا ہے، اسی طرح مغل کو اس کا یقین ہے کہ اس کی تقدیر اس کی شجاعت سے بنے گی۔"

اس میں وہ تمام خوبیاں اور سفاکیاں تھیں جو عربوں کی خانہ بدوش نسل میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو کمزور تھا وہ اس کے لیے بیکار تھا اور اپنے قبیلے سے باہر اسے اور کسی پر اعتبار نہ تھا۔ اس نے سیکھ لیا تھا کہ چالاکی کے ذریعے سے کس طرح دشمنوں کی دغا سے بچا جا سکتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے آدمیوں میں سے کسی سے کوئی وعدہ کرتا، تو وہ اپنی زبان کا پکا تھا، اور اپنا وعدہ پورا کر کے رہتا۔

کئی سال بعد وہ کہا کرتا: "وعدہ خلافی حاکم کے لیے بڑی بدنما بات ہے۔

اب اس کے قبیلے کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ کیوں کہ بہت سے جنگجو جو اس کے باپ کے ساتھ تھے۔ اب اس کی سرداری میں واپس آ رہے تھے۔ لیکن اپنے قبیلے میں بھی اس کی سرداری کا انحصار بس اسی امر پر تھا کہ اس نے دشمنوں سے بچنے اور کسی نہ کسی طرح اپنے ماتحت ساتھیوں کی چراگاہوں کو ان کے قبضے میں رکھنے کا گُر اور ہنر سیکھ لیا تھا۔ قبیلے کے رواج کے مطابق ان کے گلّے اور ہتھیار خان کی نہیں بلکہ ان کی اپنی ملکیت تھے۔ یسوکائی کا بیٹا ان کی اطاعت اور وفاداری کا اسی وقت تک حق دار تھا جب تک وہ ان کی حفاظت کر سکتا۔ پرانی رسم ــــ جو قبیلوں میں قانون کی مترادف ہے ــــ اس کی اجازت دیتی تھی کہ اگر تموجن خانہ بدوش سرزمینوں کی مسلسل اور سفاک لڑائیوں میں ان کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ اور کسی کو اپنا سردار مقرر کر لیں۔ چالاکی نے تموجن کو زندہ رکھا۔ بڑھتی ہوئی فراست نے اس کے اطراف قبیلے کا مرکز سا قائم رکھا۔ وہ جسمانی قوت، شجاعت اور چوکسی کا مالک تھا۔ جو سردار کلوران اور اونان کے درمیانی زرخیز علاقے پر دھاوے کرتے رہتے اسے کبھی کبھی پہاڑیوں سے نچلے میدانوں میں بھگا دیتے، مگر اسے دبوچ نہ پاتے۔

کہا جاتا تھا کہ تموجن اور اس کے بھائیوں کی قوت بڑھتی جا رہی ہے۔

صرف تموجن میں ایک متعین مقصد کا لافانی شعلہ بھڑک رہا تھا۔ یہ کہ وہ اپنی میراث کا مالک بن کے رہے گا۔ اس زمانے میں جب کہ اس کی عمر سترہ سال کی تھی وہ بورتائی کو لینے گیا تاکہ بیاہ کے وہ اسے اپنی پہلی بیوی بنا کے لائے۔

تیسرا باب

چھکڑوں والی لڑائی

قدیم چینی ان شمالی وحشیوں کو تیر کمان والے لوگ، لمبے دلوں اور اونچے سفید پہاڑوں کے رہنے والے لوگ کہا کرتے تھے۔ ان لوگوں میں ہنسنے بولنے، قہقہے لگانے کی بڑی عادت تھی۔ زندگی ان کے لیے انتھک محنت تھی۔ اور عناصر ان کے دشمن تھے۔ ان کی زندگی مسلسل مصیبت جھیلتے جھیلتے گزرتی تھی، اسی لیے تکلیفوں میں ذرا بھی کمی ہوتی تو یہ ہنس بول لیتے۔ تموچن اور اس کے مغلوں کا تصور ہی یوں ہوتا ہے کہ یہ بڑے ہنس مکھ ہنسی مذاق کرنے والے لوگ تھے اور ان کا مذاق کبھی کبھی ایسا ہی سخت ہوتا تھا جیسی ان کی سفاکی۔ ان کی ضیافتیں بڑی پرخوری کی محفلیں ہوتی تھیں۔

تقریبوں کا — جن کو وہ اخو دور کہتے تھے — بہت کم موقع آتا۔ بس شادی بیاہ کی تقریبیں ہوتیں یا میت کے سوگ کی رسمیں۔ تموچن جب بورتائی کے باپ کے خیموں والے گاؤں میں پہنچا، تب آپس کی بھیڑیا چال دشمنی کے دوران میں اس تقریب سے کچھ خوشگوار فضا پیدا ہوئی۔ دفعتہً کئی سو نوجوان سوار نمودار ہوئے۔ پوری طرح مسلح، بھیڑ کی کھالوں کے لبادوں میں ملبوس دباغت کیے ہوئے چمڑے کے شلوکے پہنے، اور سینوں پر بھیانک نقش و نگار والے چرمی سینہ پوش پہنے، اونچے زینوں کی دمچیوں پر پانی کی مشکیں، کاندھوں پہ نیزے لٹکائے — چہروں کی ہڈیاں نکلی ہوئی اور ان چہروں پہ سردی اور ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے چربی کی تہیں ملی ہوئی اور اس چربی پر گرد اور خاک اٹی ہوئی۔

بورتائی کے باپ نے نوجوان خان سے کہا "جب میں نے سنا کہ تجھ سے لوگوں کو کتنی سخت دشمنی ہے۔ تو ہمیں اس کی امید نہ رہی تھی کہ تجھے یوں زندہ دیکھیں گے۔"

قہقہہ اور بے تحاشا ہنسی مذاق کا بے نظیر منظر۔ نوکر ادھر سے ادھر دوڑتے ہوئے کر بھیڑوں اور موٹے موٹے دنبوں کو کاٹیں اور گوشت کے تکّے تکّے کریں اور اسے بھگانے کا بندوبست کریں۔ مغل جنگجو جو یورت میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اسلحہ دروازے پر چھوڑ آئے تھے، خیموں کے بزرگوں کے دائیں ہاتھ کی طرف بیٹھے ہوئے پینے اور تالیاں بجانے میں مصروف۔ ہر دَور سے پہلے نوکر جلدی سے تھوڑی سی شراب انڈیل کے چاروں سمتوں میں چاروں طرف کی ہواؤں کے لیے بکھیر دیتے اور رکیتاردں پر ہلکی سی چوٹ پڑتی۔ اپنے ساتھیوں کے کان کھینچتے ہوئے گویا اس لیے کہ حلق چوڑے ہو جائیں اور اُبلا ہوا جھاگ جھاگ دودھ اور چاولوں کی شراب اور آسانی سے اُترے اور بے ڈھنگے پن سے ہرنوں کے چمڑے کے جوتے پہنے ہوئے ناچتے ہوئے میدانی سواروں کا منظر۔

تیسرے دن بعد تائی موقع کے لحاظ سے خاموش سردار کے خیموں میں بائیں جانب بیٹھی تھی، وہ سفید سمور کا لمبا سا لبادہ پہنے تھی۔ اس کی چوٹیاں چاندی کے سکوں، اور ننھی ننھی مورتیوں سے بوجھل ہو رہی تھیں، اس کے سر پر صنوبر کی چھال کی مخروطی سی کلاہ تھی جس پر قیمتی ریشم منڈھا ہوا تھا اور جسے وہ دونوں کانوں پر گندھی ہوئی چوٹیوں کے جوڑوں کے سہارے اوڑھے ہوئے تھی اور وہ اس وقت تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی جب تک کہ رخصتی کا وقت آئے اور پھر وہ خیمہ خیمہ چھپتی پھرے، اور تموچن رسم کے مطابق اس کا پیچھا کرے رسم کے مطابق اس کی بہنوں اور خادماؤں سے لڑے اور بالآخر گھوڑے پر بٹھا کے اڑا لے جائے۔

یہ اس چھوٹی سی ناک والی حسینہ کی مختصر سی اخوددور (تقریب) تھی جو تموچن کے ایک ٹٹو پر بیٹھ کے اپنے خیموں والے گاؤں سے رخصت ہوئی۔ چار سال سے وہ اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی اور اب اس کی عمر تیرہ سال کی تھی۔

وہ یوں سواری کر رہی تھی کہ اس کی کمر اور اس کے سینے پر نیلے ٹِکے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے نوکر اپنے ساتھ ایک سموری لبادہ لیے جا رہے تھے جو تموچن کی ماں کو تحفے کے طور پر پیش کیا جانے والا تھا۔ اب وہ خان کی بیوی تھی۔ یورت کی نگرانی اس کا منصب تھا۔ اس کا کام تھا کہ ضرورت پڑے تو جانوروں کا دودھ دوہے۔ جب مرد لڑنے کے لیے چلے

جائیں توریوڑوں کی چوپانی کرے، خیموں کے لیے نمدا تیار کرے، ریشوں کی تانت سے کپڑے بنے اور مردوں کے لیے جبلیں اور موزے تیار کرے۔

یہ سب اس کے فرائض تھے اور بے شک تقدیر نے اسے ایسے مرتبے کے لیے چنا تھا جو اور سب عورتوں سے بہت بلند تھا۔ تاریخ اسے بورتائی زرجبین کے نام سے جانتی ہے جو شہنشاہ کی بیگم اور ان تین بیٹوں کی ماں بنی جنھوں نے بعد کے زمانے میں روم تا الکبریٰ سے بڑی سلطنت کے رقبے پر حکومت کی۔

سموری لبادے کی بھی اپنی الگ تقدیر تھی۔ تموچن نے اب یہ مناسب سمجھا کر قرایت کے سردار طغرل کے پاس جائے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے نوجوان بہادروں اور تحفہ دینے کے لیے سموری لبادے کو لیتا گیا۔

طغرل خاں صاحب کردار اور صلح پسند آدمی تھا۔ وہ خود تو عیسائی نہ تھا لیکن اس کے قبیلے والے زیادہ تر نسطوری مسیحیوں پر مشتمل تھے، جنھوں نے سینٹ اینڈرڈ اور سینٹ ٹامس کے اوّلین حواریوں سے مذہبی تعلیم پائی تھی۔ وہ ان دریائی زمینوں کے مالک تھے جہاں اب شہر ارجہ آباد ہے۔ چونکہ نسلاً وہ زیادہ تر ترک تھے۔ اس لیے مغلوں کے مقابلے میں وہ تجارت اور تاجرانہ آرام وآسائش کے سامان کے زیادہ دلدادہ تھے۔

جب تموچن اپنے اس منھ بولے باپ کے دربار میں پہلی بار گیا تو اس نے طاقت ور قیرات کی مدد نہ مانگی بلکہ طغرل نے اس کی روانگی سے پہلے اسے یاد دلایا کہ ان دونوں کے درمیان آپس میں مدد کا پیمان ہے۔

لیکن جلد ہی تموچن کو بوڑھے خان سے دوستانہ مدد کی درخواست کرنی پڑی۔ گوبی کے جھگڑے پھر سے بھڑک اٹھے۔ خلاف توقع شمالی میدانوں سے ایک طاقتور قبیلے نے حملہ کیا اور مغل چراگاہوں پر یورش کی۔ یہ لوگ مرکیت یا مکریت کہلاتے تھے۔ یہ کھرے وحشی تھے جو ٹنڈرا کے علاقوں کے قدیم باشندوں کی نسل سے تھے۔ یہ یخ بستہ سفید دنیا کے لوگ تھے جہاں آدمی بے پہیوں کی گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں۔ جن میں کتے اور رین ڈیر جتے ہوتے ہیں۔

ہر لحاظ سے یہ بڑے کڑے جنگجو تھے، اور یہ اس جنگجو کے رشتہ دار تھے جس کے پاس سے اٹھارہ سال پہلے تموچن کا باپ اولون کو اڑا لے گیا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ اس پرانی رنجش کو نہ بھولے تھے۔ وہ رات کو تموچن کے اُردو میں بھڑکتی ہوئی مشعلیں پھینکتے ہوئے در آئے تموچن کو اس کا موقع مل گیا کہ گھوڑے پر چڑھ کے تیر چلاتا ہوا حفاظت سے باہر نکل آئے۔ لیکن بورتائی حملہ آوروں کے جنگل میں پھنس گئی۔ قبائلی انصاف کے مطابق انھوں نے اس کو ایک ایسے شخص کے حوالے کیا جو اس شخص کا عزیز تھا، جس کے پاس سے اولون اغوا کی گئی تھی۔

اس شمالی جنگجو کو مغل کی دلہن کے ساتھ زیادہ دن مزے اڑانے کا موقع نہ ملا۔ تموچن جس کے پاس اتنے آدمی نہ تھے کہ مکریت پر حملہ آور ہو سکے، اپنے منھ بولے باپ طغرل کے پاس گیا اور قوم قرایت کی مدد مانگی۔ اس کی درخواست فوراً منظور کر لی گئی اور ایک چاندنی رات کو مغلوں اور قرایت نے مل کے حملہ آوروں کے گاؤں پر یورش کی۔

داستان میں یہ منظر خوب بیان کیا گیا ہے۔ تموچن درہم برہم خیموں کے درمیان سواری کر رہا تھا اور اپنی گمشدہ دلھن کو پکارتا جاتا تھا۔ بورتائی اس کی آواز سن کے دوڑی ہوئی آئی اور اس کی لگام پکڑ لی اور اس نے اسے پہچان لیا۔

میں جسے ڈھونڈھ رہا تھا وہ مجھے مل گئی۔ نوجوان مغل نے چلّا کے اپنے رفیقوں سے کہا اور اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔

اسے کبھی پوری طرح یقین نہیں ہوا کہ بورتائی کا پہلوٹی کا لڑکا اس کے اپنے نطفے سے ہے یا نہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بورتائی کو ہمیشہ بہت چاہتا رہا اور اس کے بیٹوں کے درمیان اس نے کبھی کوئی فرق نہ کیا۔ اس کے اور بھی بچے تھے، لیکن یہ لڑکے اس کے چہیتے رفیق تھے۔ دوسری بیویاں اور ان کے بچے داستان میں مبہم ناموں سے بڑھ کے نہیں۔

ایک مرتبہ سے زیادہ ایسا ہوا کہ جب تموچن کی جان کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو بورتائی نے اپنی جبلّت سے پتہ چلا لیا۔ صبح کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس کے بستر کے کنارے

دوز الو ہو کے رو رہی ہے۔

"اگر تیرے دشمن تیرے بہادروں کو جو دیواروں کی طرح سربلند ہیں ہلاک کر ڈالیں گے تو تیرے چھوٹے چھوٹے کمزور بچوں کا کیا حشر ہوگا؟"

صحرائی قبیلوں کی ان باہمی لڑائیوں میں کبھی امن کی نوبت نہ آتی۔ ابھی تک ان تمام خانہ بدوشوں میں جو دیوارِ چین کے اس پار ویران سرزمینوں میں گھوما کرتے تھے مغل ہی سب سے زیادہ کمزور تھے۔ طغرل کی سرپرستی سے کچھ سال وہ قبیلوں کے مغربی حملوں سے محفوظ رہا۔ لیکن مشرق سے تائیجوت اور بویر جھیل کے تاتاری[1] پرانی دشمنی اور کینہ توزی کے ساتھ اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ صرف لاانتہا جسمانی قوت، اور ایک بھیڑیے کی سی جبلت جس سے فوراً خطرے کا احساس ہو جائے، خان کی جان بچاتی رہی۔

ایک مرتبہ وہ مردہ سمجھ کے برف پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کے حلق میں ایک تیر پیوست تھا۔ دو رفیقوں نے اسے وہاں پڑا دیکھ کے اس کے زخم سے خون چوسا اور ایک پیالے میں برف پگھلا کے اس کے زخموں کو پونچھا۔ ان جنگجوؤں کی جاں نثاری محض زبانی جمع خرچ نہیں تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ بیمار پڑا ہوا تھا، انھوں نے دشمنوں کے خیمے سے اس کے لیے غذا چرائی اور پھر جب میدان میں برف و باد کا سخت طوفان آیا تو اس پر ایک چرمی لبادے کا سایہ کیے رہے جس کی پناہ میں وہ سوتا رہا۔

ایک ایسے خان کے یورت میں جس کو وہ دوست سمجھتا تھا ایک دعوت ہوئی اور اسے پتا چلا کہ بظاہر ایک سیدھے صاف قالین کے نیچے جس پر بیٹھنے کے لیے اس سے کہا گیا ہے، ایک خندق کھدی ہوئی ہے۔ جلد ہی تموچن کو ایسی ہی آفت سے اپنے پورے قبیلے کو بچانا پڑا۔

---

[1] تاتاریوں کا قبیلہ جداگانہ تھا۔ قدیم یورپی غلطی سے مغلوں کو تاتاری، اور مغل خانوں کی سلطنت کو تارتار کہتے تھے۔ یہ لفظ دراصل چینی ہے۔ تاتا یا تاتیٔ تزمی اس کے معنی ہیں "دور کے لوگ" اس کا بھی امکان ہے کہ تاتاریوں نے اپنے ایک پرانے سردار تاتور کے نام پر اپنے لیے خود یہ نام تجویز کیا ہو۔

مغل جن کی جملہ تعداد اب تیرہ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی، گرما کی چراگاہوں سے سرما کی چراگاہوں کی طرف سفر کر رہے تھے۔ وہ ایک لمبی سی وادی میں پھیلے ہوئے تھے ان کے " کبنکے " یا ایسے چھکڑے جن پر خیمے نصب تھے، آہستہ رو ریوڑوں کے درمیان کھڑکھڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے کہ خان کو اطلاع ملی کہ افق پر دشمنوں کا لشکر نظر آیا ہے اور تیزی سے اس پر جھپٹ رہا ہے۔

یورپ کے کسی شہزادے پر کبھی ایسا وقت نہیں آیا۔

یہ دشمن تیس ہزار تائیجوت نکلے جو سرغاتائی کی سرداری میں یورش کر رہے تھے۔

بھاگنے کے معنی یہ تھے کہ عورتوں اور مویشیوں اور قبیلے کی ساری ملکیت سے ہاتھ دھونا پڑتے لڑنے والے دستوں کو یکجا کر کے آگے بڑھ کے تائیجوت کا مقابلہ کرنے میں یہ بات یقینی تھی کہ تائیجوت چونکہ تعداد میں بہت زیادہ تھے وہ چاروں طرف سے اس کے آدمیوں کو گھیر کے کاٹ ڈالتے یا منتشر کر دیتے۔

یہ خانہ بدوشی کی زندگی کا ایسا نازک لمحہ تھا کہ قبیلے کے نیست و نابود ہو جانے کا ڈر تھا۔ اس وقت خان کے فوری فیصلے اور فوری عمل کی ضرورت تھی۔

فوراً اور اپنے مخصوص انداز میں تموچن نے اس نازک صورتِ حال کا مقابلہ کیا اب اس کے تمام جنگجو اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کے مختلف جھنڈوں تلے جمع ہو چکے تھے۔ اس نے دستوں کی ایک صف بنائی جس کا ایک پہلو ایک جنگل کی وجہ سے محفوظ تھا۔ دوسرے پہلو پر اس نے کبنکوں (چھکڑوں) کا ایک بڑا سا چوکور حلقہ بنایا۔ یہ حلقہ اندر سے خالی تھا۔ اس میں اس نے تمام مویشیوں کو ہنکا دیا اور چھکڑوں میں اس نے جلدی سے تمام عورتوں اور لڑکوں کو اکٹھا کر دیا۔ لڑکے تیر کمان سے مسلح تھے۔

اب وہ ان تیس ہزار کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا جو وادی کو طے کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ وہ پوری طرح آراستہ تھے اور پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم تھے۔ ان دستوں میں ایک ایک صف میں سو سو آدمی تھے اور اس طرح گہرائی میں پانچ پانچ صفیں تھیں۔

پہلی دو قطاریں مسلح تھیں۔ لوہے کی وزنی کانٹے دار جڑی ہوئی زرہیں، لوہے یا سخت منقش چمڑے کے خود جن پر گھوڑے کے بالوں کے طرّے لگے ہوئے تھے۔ گھوڑے بھی ساز پوش تھے۔ ان کی گردنوں، سینوں اور بازوؤں پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ اُن کے سوار چھوٹی چھوٹی گول گول ڈھالیں اور نیزے لیے ہوئے تھے، نیزوں کی انی سے ذرا نیچے گھوڑے کے بالوں کے گچھے تھے۔

لیکن مسلح سواروں کی یہ صفیں ٹھہر گئیں اور ان کے درمیان سے نکل کے، بالکل پیچھے کی صفیں آگے بڑھیں۔ ان میں جو سوار تھے وہ صرف دباغت کیا ہوا چمڑا پہنے ہوئے تھے۔ اور برچھیوں اور کمانوں سے مسلح تھے۔ تیز رفتار گھوڑوں پر انھوں نے مغلوں کے سامنے اپنے ہتھیار چلاتے ہوئے ایک چکّر کاٹا اور مسلح زرہ پوش سوار فوج کے لیے پردے کا کام کیا۔

تموچن کے آدمیوں نے جو اسی طرح مسلح اور آراستہ تھے، اس حملہ کا تیروں کی بوچھار سے جواب دیا۔ یہ تیر طاقتور کمانوں سے نکلتے تھے جنھیں سینگوں کے ذریعے مضبوط بنایا گیا تھا۔

یہ ابتدائی جھڑپ ختم ہوئی اور تائیجوت ہلکی سوار فوج چکّر کاٹ کے اپنی پرانی جگہ مسلح زرہ پوش صفوں کے پیچھے پہنچ گئی۔ پھر جمے ہوئے دستوں نے سرپٹ گھوڑے دوڑا کے پیش قدمی کی۔

تب تموچن نے بھی اپنے مغلوں کو ان کے مقابلے کے لیے بڑھایا؛ لیکن اس نے اپنے قبیلوں کو ایک ہزار کے دُہرے دستے میں تقسیم کیا تھا اور دستے میں دس صفیں تھیں۔ اگرچہ اس کے پاس کل تیرہ دستے تھے اور تائیجوت کے ساٹھ دستے تھے لیکن اس تنگ سے محاذ پر اس کے گہرے فوجی حجم کی وجہ سے تائیجوت کی پیش قدمی رک گئی اور ان کے آگے آگے کے دستے منتشر ہو گئے۔

اب تموچن کو موقع ملا اور وہ اپنے مسلح دستوں کو دشمن کے ہلکے دستوں کے مقابل جھونک سکا۔ مغل اپنے نویاکوں کے دموں والے جھنڈے کے پیچھے پیچھے آگے بڑھے۔ کھیلتے ہوئے

اور چکر کاٹتے ہوئے اور دونوں جانب تیر برساتے ہوئے۔

اس کے بعد صحرا کا سخت معرکہ شروع ہوا۔ سوار جتھے غیظ و غضب سے چیختے ہوئے تیروں کی بارش میں سمٹتے ہوئے چھوٹی چھوٹی تلواریں چلاتے ہوئے، کمندوں اور نیزوں کے کانٹوں سے اپنے دشمنوں کو زین سے نیچے کھینچتے ہوئے۔ ہر دستہ کا اپنا سردار تھا۔ وادی میں اس سرے سے اس سرے تک لڑائی ہوتی رہی اور جنگجو حملے کے بعد منتشر ہونے پھر سے جمع ہوتے اور پھر حملہ کرتے۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک آسمان سے دن کی روشنی رخصت نہ ہوئی۔ تموجن نے مکمل فتح پائی۔ پانچ چھ ہزار دشمن کھیت رہا۔ اس کے سامنے دشمن کے ستر سوار لائے گئے، جن کی گردنوں سے تلواریں اور ترکش لٹک رہے تھے۔

بعض روایتیں یہ کہتی ہیں کہ مغل خان نے ان ستر سواروں کو اسی جگہ کڑاہیوں میں زندہ ابلوا دیا۔ لیکن یہ ظلم کی کہانی قرین قیاس نہیں۔ نوجوان خان کے دل میں رحم تو خیر بالکل نہ تھا، لیکن وہ مضبوط جسم والے قیدیوں سے کام لینا خوب جانتا تھا۔

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

اردو میں نعت گوئی

مصنّف: ڈاکٹر ریاض مجید
ناشر: اقبال اکادمی پاکستان
قیمت: ۱۷۵ روپے۔ تعداد صفحات ۷۸۱

اردو میں نعت گوئی ڈاکٹر ریاض مجید کی تقریباً دس سالہ تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے جو موصوف نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ کی صورت میں پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں نعت کی پوری تاریخ، تمام اہم نعتیہ مجموعوں اور نعت گو شعراء کا تذکرہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اسے نعت گوئی کی تاریخ میں ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور فن نعت کے کسی پہلو پر قلم اٹھانے والا شخص اس تصنیف سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ ہرچند کہ کتاب کے عنوان سے اس کے اردو میں لغت گوئی کی روایت کے ارتقاء تک محدود ہونے کا گمان ہوتا ہے لیکن مصنّف نے بڑی جانفشانی سے عربی و فارسی میں لفظ نعت کے لغوی مفاہیم سے سیر حاصل بحث کرنے کے علاوہ وصف رسولؐ میں نعت کے اوّلین استعمال کا سراغ بھی لگایا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نعت کو وصفِ محض کے بجائے مدح رسول کے مفہوم میں استعمال کرنے کا سہرا فارسی شاعروں کے سر جاتا ہے۔ اگرچہ اس زبان میں یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں بھی مستعمل رہا۔ اور اردو زبان و ادب میں داخل ہونے پر اس لفظ کو باقاعدہ اصطلاح کا درجہ ملا اور وہ مدح رسولؐ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ اس ضمن میں ابن اثیرؒ ابنِ منظور، ابوالحسن مجدالدین کسائی میر معزی اور سید ضیاء الدین دہشتیری سے استناد کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا باب جو تمہیدی مباحث پر مشتمل ہے، نعت کے مفاہیم و مطالب، اس کے موضوعات اور مختلف انداز و اسالیب، قدیم و جدید نعت اور مضامین نعت پر ہندوستانی اثرات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب میں نعت کی قسمیں کے ذیلی عنوان کے تحت مصنف نے دو واضح قسمیں قائم کی ہیں ایک رسمی نعت اور دوسری حقیقی نعت۔ رسمی نعت سے متعلق انھوں نے ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے:

> رسمی نعت کے ذیل میں وہ نعت آتی ہے جو محض ایک شعری روایت کے طور پر لکھی گئی ہو۔ شعرا اپنے دواوین کی ترتیب اور مثنوی یا منظوم داستان کا آغاز حمد و نعت سے کرتے ہیں۔ سو اس شعری روایت اور رسم کے التزام کو برقرار رکھنے کے لیے کم و بیش ہر شاعر نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں دو چار شعر ضرور کہے ہیں..... رسمی انداز میں کثیر تعداد میں نعتیں لکھی گئی ہیں لیکن چونکہ ان کے لکھنے والوں نے انھیں محض حصول ثواب و برکت اور جوشِ عقیدت کی بنا پر حمد کے ساتھ تمہیداً بطور تبرک لکھا ہے۔ لہٰذا ان کی حیثیت محض ایک رسم کی رہ گئی ہے اور ان کے اندر وہ کیف نہیں جو حقیقی نعت کی جان ہے۔

اسی طرح حقیقی نعت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

> رسمی نعت کے برعکس نعت کی دوسری قسم حقیقی نعت ہے۔ حقیقی نعت کا اطلاق نعتیہ ادب کے اس معیاری سرمائے پر ہوتا ہے جن کے لکھنے والوں نے نعت کو ایک ادبی صنف کے طور پر نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے لوازمات فن اور صنفی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے گہرے شغف، توجہ اور جذب و انہماک سے ایک ادبی و فنی معیار عطا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی......
>
> آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کے ضمن میں رسمی عقیدت نگاری کے بجائے جذب و مستی اور جوشِ محبّت کا گہرا اور مؤثر اظہار نظر آتا ہے...

اس سلسلے میں راقم السطور کا خیال ہے کہ چونکہ رسمی اور حقیقی دونوں اقسامِ نعت کی تخلیق کے پس منظر میں آنحضرتؐ سے محبت و عقیدت کا جذبہ قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے ایک میں رسمی عقیدت

نگاری اور دوسری میں جذب و مستی و جوشِ محبت کے درمیان باریک فرق کا ادراک اور کیف پیائی خاصا مشکل عمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقی نعت کی دلکشی، تاثر اور مقبولیت کا راز جذب وکیف اور ذوق و شوق کے جوہر کے سبب ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس دلکشی کا سبب وہ مجموعی تاثر بھی ہے جو مختلف اسالیب میں کسی شاعر کے نعتیہ سرمائے کے یکجا شکل میں آنے سے ابھرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں تکلّف ہوتا ہے کہ رسمی نعت جذب و کیف اور ذوق و شوق کے جوہر سے عاری ہے یا یہ کہ رسمی نعت غیر حقیقی ہے۔ اس نہج سے اگر دیکھا جائے تو رسمی نعت کے مقابل حقیقی نعت کی بجائے اس کے علمی و فنی پہلوؤں کے مدِ نظر فنی نعت کی اصطلاح وضع کرنا زیادہ بہتر ہوتا۔

نعت کے فن پر ہندی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بعض معروف نعت گو حضرات کی تخلیقات میں ہندی بھجنوں، کی لفظیات، کرشن لیلا کے تلازمات اور ہندی معاشرت و تمدن کی جھلک کی نشاندہی کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مانڈو راوڑی اور ٹھمری کے علاوہ الیاس برنی، امجد حیدر آبادی، ساجد صدیقی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور عبد العزیز خالد کے یہاں ایسے نعتیہ اشعار ملتے ہیں جن میں نسائی محبت، جوگیانہ جذبات، ہندوستانی اساطیر اور غیر اسلامی تمدن کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایسی مثالیں بھی کم نہیں ہیں جہاں ان حضرات نے ہندی الفاظ کا استعمال اس اسلوب سے کیا ہے کہ ہندی معاشرت و تمدن اور اس کے مناسبات کا حوالہ اس طور پر نہیں آنے پاتا کہ شاعر جوشِ عقیدت میں احترامِ رسولؐ کی حدود سے تجاوز کر جائے۔ مدعا یہ ہے کہ نعت میں ہندی الفاظ کا استعمال احترامِ رسولؐ کے منافی نہیں ہے بلکہ نعت میں اوصافِ رسولؐ پر غیر اسلامی معتقدات اور تصوّرات کا انطباق اُسے ناقابلِ قبول بناتا ہے۔

کتاب کا دوسرا باب دو اہم اور قابلِ ذکر خصوصیتوں کا حامل ہے۔ اول یہ کہ مصنف نے نعت کے مآخذ۔ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ، کتب سیر و مغازی، الہامی صحائف و مذہبی کتب اور اسمائے رسول مقبولؐ۔ کا تقریباً ستر صفحات پر مشتمل ایک مطالعہ پیش کیا ہے اور قرآن کریم میں ان تمام مقامات کی نشاندہی کے علاوہ جہاں آنحضرتؐ کے اوصافِ حسنہ کا ذکر ہے

[redacted]

ان ارشادات باری سے متعلق بعض مستشرقین کی آراء بھی نقل کی ہیں اور ایسی صدہا مثالیں پیش کی ہیں جن میں شعراء نے اسماء رسول اور آیاتِ قرآنی سے رجوع کیا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام اور ہندوستان میں عربی اور فارسی نعت کا عہد بہ عہد ارتقا اور اس کے جو نمونے اس تحقیق میں پیش کیے گئے ہیں وہ نعت گوئی کی تاریخ میں نقش اولین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب کہ اس موضوع پر دو اک دہائی میں منظر عام پر آنے والی تصانیف میں اہل قلم نے نعت کی ابتدا اور ارتقا کے باب کو پوری طرح تشنہ چھوڑ دیا ہے۔ اس باب میں نعت گوئی کے فروغ میں جدید عوامل مثلاً ذرائع ابلاغ عامہ گراموفون ریکارڈ فلمیں ریڈیو اور ٹیلی وژن کے اثرات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

تیسرا باب اردو کے قدیم کے نعتیہ نمونے اور جنوبی ہند میں نعت گوئی کے جائزہ پر مشتمل ہے اور چوتھا باب شمالی ہند میں اردو نعت گوئی پر محیط ہے۔

پانچویں اور چھٹے ابواب میں جو بالترتیب عصر جدید اور عصر حاضر کی نعت گوئی سے متعلق ہیں، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور پھر ایک صدی بعد قیام پاکستان کے معاشرتی اور تمدنی اثرات کی روشنی میں نعت کے بدلتے ہوئے اسالیب اور موضوعات کے تنوع کا جائزہ مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، جناب نظم طباطبائی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری، علامہ اقبال سہیل، امجد حیدرآبادی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری اور عبدالعزیز خالد جیسے ممتاز نعت گو شعراء کے کلام کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔

ضمیمہ بھی لائق توجہ ہے جو احادیث نبوی میں لفظ نعت کا استعمال، اسماء رسول، شروح بردہ، میلاد نامے، غیر مسلم شعراء کے نعتیہ کلام خواتین کی نعت گوئی اور نعتیہ ریکارڈ اور فلمی طرز پر لکھی گئی نعتوں کی تفصیل پر مبنی ہے خواتین کی نعتیہ شاعری کے ضمن میں ہند و پاک یا خطۂ ایران کی کسی فارسی شاعرہ کا ذکر نہیں ملتا جب کہ قرۃ العین طاہرہ کا نام خاصا معروف ہے۔

گو کہ ابواب کے تحت مختلف عنوانات کے سامنے صفحات کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے تاہم مذکورہ بالا مواد کے ساتھ مبسوط کتابیات، ابجدی ترتیب سے حواشی کے التزام اور اغلاط کتابت کی تقریباً نایابی کے اعتبار سے بھی یہ کتاب مصنف کی خوش سلیقگی کی دلالت کرتی ہے۔ اس کاوش کے لیے ڈاکٹر ریاض مجید اور سیدہ فہمیدہ شہرت بخاری، ڈائرکٹر اقبال اکادمی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو ادب میں ایک اہم باب کا اضافہ کیا ہے

(سہیل احمد فاروقی)

ماہنامہ

جامعہ

سالانہ قیمت ۳۰ روپے

قیمت فی شمارہ ۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۹۲ء | شمارہ ۱۰

اردو ادب ماریشس میں (خصوصی شمارہ)

فہرست مضامین

اس خصوصی شمارہ کی قیمت : ۱۰ روپے

مجلس مشاورت

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

اردو ادب مارلیشس میں' اس عنوان کے تحت قارئین جامعہ کی خدمت میں یہ خصوصی شمارہ پیش کرتے ہوئے ہمیں بیحد مسترت محسوس ہو رہی ہے ۔ گذشتہ سال ۹ تا ۱۲ ردسمبر مارلیشس میں عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ایک وفد ہمارے ملک سے بھی گیا تھا۔ اس وفد میں ڈاکٹر صغرا مہدی (ریڈر شعبۂ اردو' جامعہ ملیہ اسلامیہ) بھی شریک تھیں ۔ "چلتے ہو تو موریشس چلیے" کے عنوان سے ان کا مارلیشس کا سفرنامہ دو قسطوں میں جامعہ کے مارچ' اپریل ۱۹۹۲ء کے شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔ مارلیشس میں اردو ادب کی نوعیت اور کیفیت کو اپنے ملک کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کی تحریک دراصل ڈاکٹر صغرا مہدی ہی سے ملی ہے۔ مذکورہ کانفرنس کے موقع پر انھیں خصوصی فائل بھی مارلیشس میں اردو ادب کے جو بھی نمونے دیے گئے وہ انھوں نے از راہ عنایت ہمیں نذر کر دیے۔ ان ہی میں سے کچھ مارلیشس کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی نمائندہ تحریریں اور تخلیقات ہم قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ خصوصی شمارہ شائع نہیں ہو سکتا تھا اگر ہمیں ڈاکٹر صغرا مہدی شوق نہ دلاتیں۔ ہم ان کے بیحد ممنون ہیں ان کا خصوصی شکریہ ادا کرتے لیکن وہ پرانی جامعی ہیں اس لیے قلم رکتا ہے۔ جامعہ کی تہذیب یہ رہی ہے کہ ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ یہاں یہ نہیں سوچا جاتا تھا کہ یہ تو ہمارا کام نہیں ہے۔ ہم کیوں دست تعاون بڑھائیں

بلکہ تعاون پیش کرنے والے اپنے کو پس منظر میں رکھتے تھے اور انھیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ ان کی کوششیں دوسروں پر عیاں ہوں، نام و نمود کی خواہش نہ تھی، یہی تھا جامعہ میں کام کا فلسفہ۔

جنوب مغربی ہند میں واقع جزیرہ ماریشس صرف ۱۸۶۰ مربع کلومیٹر کے رقبہ پر واقع ہے۔اس میں St. Brandon. اور Rodrigues, Agalega کے جزیرے بھی شامل ہیں۔ سال ۱۹۹۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق جزیرۂ ماریشس کی کل آبادی دس لاکھ اٹھاسی ہزار دو سو (۱۰،۸۸،۲۰۰) ہے۔اس آبادی میں ۶۸،۳ فی صد ہندی نژاد ہیں جس میں ۵۱،۸ فی صد ہندو اور ۱۶،۵ مسلمان ہیں۔ باقی آبادی میں کیریول (جنوب افریقی نژاد) فرانسیسی ماریشین اور چینی ماریشین نسل کے لوگ شامل ہیں۔ سرکاری زبان انگریزی ہے لیکن انگریزی کے مقابلے میں فرانسیسی زیادہ مقبول ہے۔ بھوجپوری اور ہندی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔

ماریشس کی تاریخ بہت قدیم نہیں ہے ۱۹۳۸ء میں ڈچ قوم کی آمد سے قبل یہ جزیرہ غیر آباد تھا۔ ۱۷۱۵ء میں اس پر فرانس کا قبضہ ہوا۔ معاہدۂ پیرس (۱۸۶۳ء) کے تحت فرانس نے یہ جزیرہ برطانیہ کو بخش دیا۔ اس معاہدہ کی ایک شق یہ بھی تھی کہ جزیرہ میں فرانسیسی زبان، ثقافت، قوانین اور رسوم برقرار رکھے جائیں گے۔ ابتدا میں افریقہ سے لائے گئے غلام گنے کے کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۳۵ء میں غلامی کے خاتمے کے بعد ہندوستان سے بالخصوص بہار، مشرقی اتر پردیش، تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے علاقوں سے مزدور جزیرۂ ماریشس میں لائے گئے۔ ان مزدوروں اور قلیوں کی زندگی غلاموں سے کچھ بہتر نہ تھی۔ مزدوروں کا خون پسینہ بن کر کھیتوں کو سیراب کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک نئی فضا نے جنم لیا اور بالآخر ۱۲؍ مارچ ۱۹۶۸ء کو ماریشس آزاد ہوگیا۔

پیش خدمت خصوصی شمارہ میں ماریشس میں آباد ہونے والے ان ہی مزدوروں اور قلیوں کے وارثوں کے رشحات قلم شامل کیے جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے نقاد انگلی اٹھائیں، ہمارے انتخاب کو پھسپھسا کہا جائے لیکن ہمیں اس بات سے تسکین ہے کہ ہم زندہ اردو ادب پیش کر رہے ہیں۔ دل کی دھڑکنیں، سانسوں کی گرمی، ذہنی کیفیتیں، ڈبڈباتی ہوئی آنکھیں، آبائی وطن کی مٹی کی خوشبو، وطن ثانی کی ترقی اور خوشحالی کے میٹھے جذبۂ شوق، اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے حوصلہ اور لگن۔ ان سب سے ماریشس کا اردو ادب عبارت ہے جس کی سطح بلند نہ سہی لیکن اردو ادب کی تاریخ میں اسے ایک نیا اضافہ سمجھا جائے گا۔ اس ادب کو پڑھ کر ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اردو عوام کی زبان ہے۔ ماریشس میں آباد اردو داں جو کچھ محسوس کر رہے ہیں اس کو اتنی آسان اور سہل زبان میں منتقل کر رہے ہیں کہ رشک آتا ہے۔

ماریشس کے اردو ادب کے انتخاب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ ادب کی مختلف جہتوں میں جو پیش قدمیاں ہو رہی ہیں، ان کی نمائندگی ہو جائے لہٰذا آپ اس میں نظم بھی پائیں گے اور مثنوی اور غزل بھی، کہانی بھی اور ڈراما بھی۔ اردو ادب کے فروغ کے لیے کوشاں اداروں کی خدمات کا تعارف بھی شامل کیا جا رہا ہے امید ہے کہ قارئین جامعہ ہماری اس کوشش کو بنظر تحسین دیکھیں گے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

صابر گودڑ

ماریشس کا اردو ادب

انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد ہمارے آباو اجداد کے قدم سرزمین ماریشس میں مضبوطی کے ساتھ جمنے لگے تھے اور بہار و سورت کی بجائے یہ مسکن ان کے لیے مقدر بن چکا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے آباو اجداد اپنے ساتھ اپنی تہذیب و زبان بھی لائے مگر یہ وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس زمانے میں کوئی ادبی تخلیق ظہور پذیر ہوئی۔ انیسویں صدی کے خاتمے تک ہمیں اردو میں کچھ تحریریں ضرور مل جاتی ہیں جو کہ مذہبی نوعیت کی تھیں۔ ان تحریروں میں زیادہ تر پندونصائح ہوتی تھیں۔ بدقسمتی سے انھیں محفوظ نہیں کیا گیا۔ بزرگوں کے کہنے کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ یہ صفحۂ قرطاس میں شائع ہوئی تھیں اور وقت کے سیلاب میں بہہ گئیں۔ بہر حال یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان تحریروں میں صوفیائے کرام کا رنگ شامل تھا (مثلاً معراج العاشقین وغیرہ) بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ چند عمر رسیدہ بزرگوں کے یہاں تلاش کرنے پر اس وقت کی لکھی ہوئی چیزیں برآمد ہوسکتی ہیں۔ اس شعبے میں باقاعدہ ریسرچ کرنے کی ضرورت ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے بعد اردو میں کئی چیزیں لکھی گئیں۔ خاص طور پر اس زمانے میں فن ڈرامہ نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ یہاں کے کئی مقامی ڈرامہ گروپ تھے جو ملک کے مختلف علاقوں میں اپنے ڈرامے پیش کیا کرتے تھے۔ کچھ ڈرامے طبع زاد تھے اور چند ماخوذ کیے گئے۔ فیروز گلنار اور گلِ بکاؤلی بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے۔ اس کے علاوہ سیپ صاحب کا مشہور ڈرامہ "خوابِ ہستی" نے اس وقت دھوم مچار کھا تھا۔ اس ڈرامے کے مکالمے اتنے دلچسپ تھے کہ بہت سے لوگوں کو پورا ڈرامہ یاد تھا۔ یہ ڈرامہ Cinema des familles میں کئی بار اسٹیج کیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں تفریح کے ذرائع کم تھے۔ لہٰذا جن مقامات پر یہ ڈرامے دکھائے جاتے تھے لوگوں کا ہجوم ہوتا

تھا۔ یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ اس وقت لوگ ٹکٹ خرید کر ان ڈراموں کو دیکھتے تھے۔ فلم انڈسٹری کے آنے سے رفتہ رفتہ فن ڈرامہ زوال پذیر ہوتا گیا اور یہ ڈرامہ نگار بھی گمنامی کے اندھیرے میں کھو گئے۔

اس زمانے کے چند شعراء کے نام بھی ہمیں ملتے ہیں جنھوں نے شعر گوئی میں کسی حد تک مہارت حاصل کر لی تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر موضوعاتی اور پابند نظمیں کہتے تھے جو کہ نثر کی طرح ناصحانہ ہوا کرتی تھیں۔ ان کی نظموں میں کہیں کہیں مولانا حالی کا انداز اور اسلوب نمایاں تھا۔ فن شاعری اور بحور و اوزان وغیرہ سے وہ زیادہ واقف نہیں تھے۔ میاں جی سائیکلون کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ ان کا پیشہ یوں تو امامت تھا مگر وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ طوفان کو فرانسیسی یا کریول میں سائیکلون کہتے ہیں۔ اس جزیرے میں طوفان کے آنے سے کیا کیا تباہیاں ہوتی تھیں۔ کتنے لوگ بے گھر ہو جاتے تھے۔ ہر طرف غربت کی چادر کس طرح بچھ جاتی تھی۔ ان سب کی تصویر کشی انھوں نے اپنی نظم 'سائیکلون' میں بڑے مؤثر انداز میں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام میں میاں جی سائیکلون کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ممتاز امرت صاحب کی کتاب The Muslims in Mautitius سے پتہ چلتا ہے کہ میاں جی سیکلون نے اور کئی چیزیں لکھی تھیں مثلاً تصوّف سے متعلق ایک کتابچہ "ان بولتی چڑیا"، ایک منظوم کہانی "سونا بھن" اور ایک ناول "ان بوجھ نگری بے بوجھ راجا"۔ ان کی ایک اور نظم Monsieur Manes ke moolwa par بھی بہت مشہور ہوئی جس میں انھوں نے لوگوں کے ظلم وستم اور استحصال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان کی یہ ساری تخلیقات کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے کسی شاگرد یا اس زمانے کے کسی عمر رسیدہ شخص کے یہاں الماری کے کسی گوشے میں بوسیدہ حالت میں پڑی ہوں۔ جن کی طرف کسی کی نظر نہیں گئی ہوگی۔

۱۹۵۰ء کے بعد ماریشس کے لوگوں میں دھیرے دھیرے سماجی بیداری کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی پیدا ہونے لگا تھا۔ گوروں کے ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند ہونا شروع ہو چکی تھی۔ وطن کے ان جاں نثار سپوتوں میں مرحوم عبدالوہاب فونڈن صاحب بھی تھے جن کی پوری

زندگی قوم کی خدمت، اردو زبان کی ترویج واشاعت اور عوام میں تعلیم کے فروغ کے لیے وقف ہوگئی۔
فونٹڈن صاحب گوناگوں خصوصیات کے مالک تھے۔ وہ ایک اچھے مترجم کے ساتھ روشن خیال ادیب بھی تھے۔ انھیں بیک وقت انگریزی، فرانسیسی، ہندی، اردو، سنسکرت وغیرہ پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی میں بہت کچھ لکھا جو کتابی شکل میں موجود ہے۔ ان کا کارنامہ مشہور فرانسیسی ناول نگار Bernandin de saint Pierre کے ناول کا اردو میں خلاصہ ہے۔ یہ ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔ فونٹڈن صاحب کی دوسری کتاب جزیرۂ مارشس میں ایک نئی تحریک کی کہانی ہے جس میں انھوں نے قبلِ آزادی کی سماجی ناانصافیوں اور ابلاغِ عامہ پر پابندیوں کے متعلق بڑی بے باکی کے ساتھ اظہارِ خیال کیا ہے۔ یہ کتاب ڈائری کی صورت میں ہے اور فونٹڈن صاحب کی نثر کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہیں کہیں مقامی بولیوں کے الفاظ سے عبارت مزید دلچسپ اور خوبصورت ہوگئی ہے۔ بعض مقامات پر ترجمے کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی منظرِ عام پر آچکی ہے اور اسے ایم۔ جی۔ آئی نے رشاد بروکر دبرکت صاحب سے کتابت کروا کے شائع کرائی ہے۔

اس وقت کئی اور لوگ تھے جو ریڈیائی ڈرامے لکھ کر M B S یعنی ماریشس براڈکاسٹنگ سروس کے اردو پروگرام میں پیش کیا کرتے تھے۔ اُن میں چند ایک کے نام یہ ہیں: مرحوم ایوب پیرعلی، مرحومہ حوربائی رجب علی، مرحوم احمدی صاحب، محترمہ گورا اسحاق، جناب شوکت علی امام دین وغیرہ۔ بعد میں رشاد بروکر صاحب نے بھی سلسلہ وار ریڈیائی ڈرامے لکھے جو ہر جمعہ کو باقاعدہ پیش لیے جاتے تھے۔ ان تمام ڈراموں کے موضوعات بقول سلام احمدی صاحب مذہبی یا سماجی ہوا کرتے تھے جن میں تعلیم نسواں کے ساتھ ساتھ عشق ومحبت پر مبنی کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ زبان بھی صاف تھی۔ مختلف جگہوں پر اشعار کے استعمال سے مکالمے مزید دلچسپ ہو جاتے تھے۔

سید مظفر علی محمد اشرف سالیری نے ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد پورٹ لوئس کے صد سالہ جشن کے موقع پر ایک کافی لمبی نظم لکھی تھی۔ موصوف نے اسے قصیدہ کہا ہے۔ بہر حال ۷۵ اشعار پر مشتمل یہ نظم جامع مسجد کے رسالہ The Jummah Mosque Mauritius میں شائع ہوئی ہے اور

بحیثیت شاعر ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

وادیوں کی اوٹ میں جب مہر سستانے لگا ۔۔۔ اور پسینہ چلچلاتی دھوپ کو آنے لگا
بحر کی آغوش میں سورج فدا ہونے چلا ۔۔۔ جیسے ایک زخمی سپاہی زخم کو دھونے چلا
جانے جانے تارے زریں ہر طرف بکھرا دیے ۔۔۔ بادلوں نے اپنے دامن پر انھیں ٹکوا دیے
چند کرنوں نے جو دیکھا مارس کے میدان کو ۔۔۔ جس نے رنگیں کر دیا مورشیس کی شان کو

اس نظم کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ناشر سالیری اقبال سے متاثر ہوئے تھے اور پوری نظم میں اقبال کی مناظرِ قدرت اور حُبّ الوطنی پر مبنی نظموں کے اثرات نمایاں ہیں۔

۱۹۶۷ء کے بعد اردو کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ علی گڑھ سے ڈاکٹر عظیم الحق جنیدی کی تشریف آوری ہوتی ہے۔ وہ بحیثیت Expert یہاں آئے تھے اور ابتدائی اسکولوں میں ملازمت کرنے والے اردو معلموں کی کوچنگ کرتے تھے۔ انھوں نے ایک رسالہ بعنوان "اردو" جاری کیا جس میں یہاں کے مقامی قلم کاروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں اُبھارنے کا موقع ملتا رہا۔ اس رسالے میں مضامین "افسانے" نظمیں وغیرہ شامل ہوتی تھیں۔ جنیدی صاحب کے جانے سے یہ رسالہ بند ہوگیا۔ پھر علی گڑھ ہی سے مرحوم ڈاکٹر اطہر پرویز تشریف لائے اور انھوں نے اردو کی خدمات انجام دینے کے علاوہ سرزمین ماریشس میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ڈالی۔ موصوف نے جزیرے کے کونے کونے میں ادبی رجحانات کو فروغ دینے میں زبردست کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اپنے مشوروں اور اصلاحی کاموں سے یہاں کے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی بھی کی۔

۱۹۷۰ء میں جناب علیم بخشو صاحب کی ادارت میں ایک اور رسالہ "شمع وطن" کے نام سے نکلا۔ یہ رسالہ ایک ایسے وقت میں منظرِ عام پر آیا جب ماریشس کی پوری فضا میں صدائے اردو اپنی آب و تاب کے ساتھ گونج رہی تھی۔ اس پرچے میں چند ایسے مقامی قلم کاروں کی تخلیقات ہوتی تھیں جنھوں نے آج بڑی حد تک مختلف اصناف میں پختگی حاصل کرلی ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے قلم کو بالائے طاق رکھ کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں میں زنگ بھر دیا۔ کاش کہ وہ لکھتے تو آج ہمارے درمیان اچھے ادیب کہلانے کے مستحق ہوتے۔ اس رسالے میں عبدالرحیم

پاروٹی، طالب الدین رادیم، احمد بخاری، طاہر دومن، عنایت حسین عیدن، محمد حنیف کنہائی، خاکسار وغیرہ لکھتے رہے۔ اس کے چند ہی شمارے نکلے مگر ہر شمارے میں مضامین کے علاوہ افسانے، نظمیں اور غزلیں ضرور ہوتی تھیں۔

طالب الدین رادیم نے شروع میں بڑی اچھی نظمیں اور غزلیں کہی ہیں لیکن ان میں نثر لکھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ محاورات و تشبیہات سے اکثر کام لیتے تھے کہ بعض اوقات تصنع معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ مسلسل لکھنے کی کاوش کرتے تو مجھے یقین تھا کہ ہمارے افسانوی ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا۔ ناول لکھنے کا ان کا دیرینہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

عبدالرحیم پاروٹی صاحب نے اردو کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ ان کو شاعری سے دلی رغبت تھی۔ انھوں نے مختلف عنوانات کی تحت کافی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ خاص کر بچوں کے معیار کی نظمیں۔ ان کے یہاں بھی وہی ناصحانہ انداز موجود ہے۔ وہ نفسیاتی اور اخلاقی تعلیم پر زیادہ زور دیتے رہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بھی یہ باتیں آگئی ہیں۔ وطن کی محبت میں سرشار ہو کر انھوں نے ایک خوبصورت نظم "ماریشس ہمارا" لکھی جسے اسکول کے بچے گاتے رہے۔

حسن محسن صاحب ہمارے ان بزرگ ادیبوں میں سے ہیں جو ایک لمبے عرصے سے مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ انھوں نے اردو میں بہت کچھ لکھا۔ ان کی چند چیزیں ادبی ہیں اور بعض غیرادبی۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کا کارنامہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں اور ملک کے مختلف مدرسوں میں استعمال کی جاتی ہیں۔ تاریخ اسلام حصہ اوّل، دوم، سوم اور ہماری اردو حصہ اول، دوم، سوم اور چہارم کے علاوہ سفینۂ ادب بچوں اور طالب علموں میں بیحد مقبول ہوئیں۔ فضول خرچی باعث تنزل ہے میں ان کے چند مضامین شامل ہیں جن کے ذریعے محسن صاحب نے معاشرے کی خرابیوں اور روپیوں کے بے جا خرچ سے درپیش مسائل و نقصانات کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔ ان کی زبان عام فہم ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد پڑی اور اس کے جنرل سکریٹری جناب عنایت حسین

[redacted]

عیدن صاحب مقرر ہوئے۔ عیدن صاحب نے اس ادارے کی آبیاری اپنے خونِ جگر سے کی ہے اور آج یہ ایک تناور درخت کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ عیدن صاحب نے اس ادارے کے ذریعے نہ صرف اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کا کام لیا بلکہ اپنے شاگردوں کو تخلیقی کاموں کی طرف خاص توجہ بھی دلائی اور ۱۹۷۳ء میں "انجمن ادب اردو" کی بنیاد ڈالی۔ ابتدا میں اس کے ۱۵ ممبران تھے اور آج ۹ ہیں۔ انجمن ادب اردو نے "جستجو" کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں عنایت حسین عیدن، قاسم ہیرا، حنیف کنہائی، سعید میاں جان، طاہرہ دومن، فاروق حسنو، عزیز چنو، شاکر بکین، شکور بھولا، سید رحمت اللہ، رشید نروا، ادریس علی محمد اور راقم الحروف لکھتے رہے۔ جو لوگ اس انجمن سے وابستہ رہے آج بھی لکھ رہے ہیں اور اُن کی تخلیقات باقاعدہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۱۹۷۰ء سے پہلے کی تخلیقات کو کیا ہم ادب کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں؟ یہ ایک بحث طلب سوال ہے۔ میں اسے بالعموم قارئین اور بالخصوص ناقدین پر چھوڑتا ہوں۔ بہرحال ۱۹۷۰ء تک کافی کچھ لکھا گیا۔ اگر ادب کی مختلف تعریفوں میں ایک تعریف زندگی کی عکاسی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام لکھنے والوں کے یہاں کہیں نہ کہیں ادب ضرور پایا جاتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جن لوگوں نے مختلف اصناف میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ڈراما

ماریشس میں اس صنف کی طرف توجہ بہت پہلے دی گئی اور ہمارے مقامی ڈراما نگاروں نے خود ڈرامے لکھے اور انھیں اسٹیج بھی کیے۔ ۱۹۷۴ء سے اس کی طرف لوگوں کا رجحان زیادہ بڑھا۔ اسی سن سے وزارت کھیل کود کی جانب سے مشرقی زبانوں میں ہر سال ڈراما فیسٹیول منعقد کیا جانے لگا۔ اس طرح اردو میں ڈراما لکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ بھی ہوا۔ کچھ نئے لوگ بھی اس فن میں دلچسپی ظاہر کرنے لگے اور بعد میں چل کر اچھے ڈراما نگار ثابت ہوئے۔ عیدن صاحب نے ہمارے قارئین اور ناظرین کو بڑے اچھے اور دلچسپ ڈرامے دیے۔ ان کے چند یک بابی ڈرامے بیحد مقبول ہوئے مثلاً قربانی، زندہ گوٹ، شرابی، شادی کا جوڑا، میں کھیت نہیں جاؤں گا، رام بھروسے چاچا، ساریاں

خوبصورت ہیں، ضمیر وغیرہ۔ یہ تمام ڈرامہ فیسٹول کے لیے اسٹیج کیے جا چکے ہیں اور ان میں کئی انعام یافتہ بھی ہیں۔ عیدن صاحب کے ڈراموں میں مقامی رنگ بھرپور طریقے سے پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے حالات، سماج کی خرابیوں اور انسانی عیوب کو سیدھے سادے انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ مقامی بولیوں کے الفاظ اس طرح استعمال کر جاتے ہیں کہ جن سے ظرافت کا پہلو بھی نکل آتا ہے۔ ان کے لہجے میں طنز بھی شامل ہوتا ہے۔ ان ڈراموں میں دیہاتی زندگی اور وہاں کے رسوم اور عادات و اطوار صاف طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامہ نگار کی شخصیت ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کامیاب ڈرامے ہیں اور خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ نے مجموعے کی شکل میں ان ڈراموں کو شائع کر دیا ہے۔

طاہر دومن صاحب نے بھی کئی یک بابی ڈرامے فیسٹول ہی کی غرض سے قلمبند کیے۔ ان کے ڈرامے، احساس، دریا دل ساس، اب دلّی دور نہیں، اشک ندامت، منڈی، مفتہ وغیرہ بہت پسند کیے گئے۔ طاہر دومن کے لکھنے کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ ان کے اکثر ڈراموں میں خواتین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں فارسی الفاظ بھی استعمال کر جاتے ہیں مگر کریول سے مکالمے میں چاشنی ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال 'اشک ندامت' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ دومن صاحب کے بعض ڈراموں میں اصلاحی پہلو ناظرین اور قارئین کو چند لمحوں کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ شاید یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔

فاروق رجل صاحب کے ڈرامے 'نازک لمحہ'، خوش آمدید، دھنک، جھوٹی، ذمہ داری' وغیرہ بڑے کامیاب اور اچھے ڈرامے ثابت ہوئے۔ انھیں رفتہ رفتہ اس فن سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اور وہ ایک ارتقائی منزل سے گزر رہے ہیں۔ آج کل وہ پورے اعتماد کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ نوجوانوں کے مسائل، نشیلی ادویہ اور منشیات کو موضوع بنا کر انھوں نے بڑے دلچسپ طریقے سے کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ انھیں چند بار بہترین ڈرامہ نگار کا ایوارڈ بھی حاصل ہو چکا ہے ان کی زبان روزمرہ بول چال کی زبان سے قریب ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے طلباء و طالبات ان کے ڈرامے بڑی آسانی کے ساتھ اسٹیج کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اس طرح چند اور ڈرامانگاروں نے اس صنف کو اپنی تخلیقات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ حنیف کنہائی کے ڈرامے 'ماتا' اور 'وصیت نامہ'، رشید نیر وا رازداں کے ڈرامے 'شبنم'، 'غفلت کی لاش'، 'سراسیگی'، قاسم علی محمد کے 'انصاف' اور 'عدالت'، 'حاکم اور خادم'، 'میں بھی انسان ہوں'، رشید حسین بخشی کے 'صدمہ' اور 'فریبی'، خاکسار کے 'انقلاب' اور 'انجام' وغیرہ کافی اچھے ڈرامے ہیں۔ ان تمام ڈراموں میں یہاں کی زندگی، سماجی سرگرمیاں، سیاسی حالات وغیرہ کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے ہیں۔

قاسم ہیرا نے ان تمام لوگوں سے ہٹ کر ایک بالکل نئی چیز دی۔ انھوں نے ایک بیلیٹ بنام 'نغمہ شکستہ' یہاں کے عوام کو عطا کیا۔ یہ ایم۔ جی۔ آئی کے پروجیکٹ کے تحت تیار کیا گیا تھا اور یہیں پر اسٹیج بھی کیا گیا۔ یہ خوبصورت بیلیٹ تقریبًا دو گھنٹے کا تھا جس میں موسیقی کا جادو، رقص و سرور اور نظمیں غزلیں شامل تھیں۔ اس نے ناظرین کو گویا اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے مکالمے کم مگر لاجواب تھے۔ انارکلی کی کہانی پر مبنی یہ بیلیٹ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔

افسانہ

افسانہ نگاری کے میدان میں کئی نام آتے ہیں جنھوں نے اچھے افسانے لکھے اور یہ شائع بھی ہوئے۔ ان میں عنایت حسین عیدن، محمد حنیف کنہائی، طاہر دوسن اور راقم الحروف کے علاوہ شکور بھولا، شاکر بیکن، فاروق حسنو، رشید نیر وا وغیرہ ہیں۔ موخر الذکر اشخاص نے شروع شروع میں چند ایک کہانیاں لکھیں مگر بعد میں بند کر دیں۔ رشید نیر وا نے ڈرامہ کو ترجیح دی۔ فاروق حسنو نے مضامین اور مقالے لکھے، شکور بھولا اور شاکر بیکن نے افسانہ نگاری سے ہاتھ اٹھا لیا اور مذہبی مضامین کی طرف توجہ دی۔

عیدن صاحب نے چند معیاری افسانے لکھے جن میں 'حسرت'، 'ہائے میری بہن'، 'ولایت کا تحفہ'، 'میراث'، 'موجیں' کے علاوہ ایک دو مبنی کہانیاں بھی ہیں۔ عیدن صاحب کے افسانوں کا کوئی مجموعہ ابھی شائع نہیں ہوا ہے مگر یہ افسانے 'جستجو' اور 'شمع وطن' میں شائع ہو چکے ہیں۔ عیدن صاحب ڈرامہ لکھنے کے ساتھ ساتھ افسانہ لکھنے کے گر سے بھی بخوبی واقف ہیں، وہ لمبے لمبے جملوں سے احتراز کرتے ہیں، مختصر

اور جامع انداز میں بات مکمل کر دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے اقدار کا تحفظ، انسانی رشتوں میں دراریں، معاشرے میں اپنی شناخت وغیرہ جیسے اہم موضوعات کو لے کر افسانے کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ انھوں نے اس صنف میں بھی اپنا ایک منفرد مقام پیدا کر لیا ہے جس کی وجہ سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں۔

حنیف کنہائی کے یہاں کبھی مختصر اور بعض اوقات طویل افسانے پائے جاتے ہیں۔ کنہائی صاحب کو زبان پر کافی حد تک مہارت حاصل ہے اور وہ اپنے کرداروں کے توسط سے بڑے اچھے مکالمے کہلواتے ہیں۔ ان کے یہاں کہیں کہیں ہلکی سی رومانیت بھی پائی جاتی ہے جن سے قارئین پڑھتے وقت لطف اندوز ہوتے رہیں مگر یہ اعتدال کی حدیں عبور نہیں کرتی کنہائی صاحب کے یہاں ماضی کی یادیں بڑی شدت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ ان کے چند افسانے یہ ہیں۔ شمعِ محفل، نبا ولد پٹھان، قربانی، جال اور بڑکا دادا۔ موخر الذکر افسانہ کو افسانہ نگاری کے مقابلے میں بہترین افسانہ قرار دیا گیا تھا جو شامل اشاعت ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو سال کی پرانی تاریخ کو کہانی کی شکل میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہ کہانی ہمارے آباواجداد کے زمانے کی مجبور زندگی اور محنت کے استحصال کی یاد دلاتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ افسانہ اپنے دور کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

طاہر دومن صاحب بہت دنوں سے اردو میں لکھ رہے ہیں گویا بال سفید کر چکے ہیں۔ ایک زندہ دل شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے عمدہ مال، لاٹری، شاگرد، بولتے گونگے، پرائے بے درماں جیسے خوب صورت افسانے ہمارے قارئین کو دیے۔ ان کے یہ تمام ڈرامے شمع وطن اور جستجو میں چھپ چکے ہیں۔ وہ آج بھی بدستور ڈراما اور افسانہ لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ اس تسلسل کی وجہ سے ان کو نثری زبان پر ایک طرح سے گرفت حاصل ہو چکی ہے۔ اپنے کرداروں کے حوالے سے معاشرے پر کبھی کبھار سخت تنقید بھی کرتے ہیں۔ ان میں ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی تمام تر صلاحیتیں موجود ہیں۔ اگر وہ اسی رفتار اور سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھیں تو مستقبل میں بہترین افسانے تخلیق کر سکیں گے۔

راقم السطور کے چند افسانے یہ ہیں 'سینیئر کیمبرج سے کھیت تک'، 'داغ'، 'مریض کی موت'، جو جستجو میں شائع

ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں انسانی بے بسی، غربت و افلاس، شکستِ آرزو، ڈسپنسری میں مریضوں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کو موضوع بنایا گیا ہے۔

فاروق حسنو نے "انوکھی سیر"، "انتظار"، فسانہ "میری ہستی" ناکام بن گیا اور وہ، شکور بھولانے "روشنی کا شکار"، شاکر بکین نے "زمانے کا رنگ"، "انسانیت" اور "فیشن" کے عنوانات سے کافی دلچسپ انسانے تحریر کیے مگر افسوس کہ یہ لوگ ادبی تخلیقات سے بہت دور چلے گئے۔ میری دانست میں میں نے ان حضرات کی کوئی تخلیق کافی عرصے سے نہیں پڑھی ہے۔ البتہ فاروق حسنو صاحب ریڈیو سے وابستہ ہو گئے اور ریڈیو کے لیے چھوٹی موٹی کہانیوں پر مبنی پروگرام پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان میں افسانہ لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر وہ دوبارہ اس صنف کی طرف سعی کریں تو مجھے یقین ہے کہ ہمارے افسانوی ادب میں ضرور اضافہ ہوگا۔

ناول

اگر ہم وسیع تناظر میں ناول کا جائزہ لیں تو یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان جیسے بڑے ممالک میں بھی آج کل ناول نگاروں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ یوں تو وہاں ناول بے شمار لکھے جا رہے ہیں مگر ادبی کم اور غیر ادبی زیادہ ہیں۔ ماریشس جیسا مختصر سا جزیرہ جہاں کی اردو ابھی عہدِ طفولیت سے گزر رہی ہے یہ توقع کرنا کہ کوئی ناول منظرِ عام پر آ جائے بعید از قیاس ہے۔ کم سے کم فی الحال یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ شروع میں میں نے طالب الدین رادیم کا ذکر کیا تھا کہ وہ اس صنف کی طرف توجہ دے رہے تھے مگر ان کا کوئی ناول ابھی تک نہیں آیا ہے۔

شاعری

ہمارے مقامی شاعروں کو شاعری سے دلچسپی ہمیشہ رہی ہے۔ شاعری یوں بھی محبوب کی طرح ہے جس کے عشاق خواص ہی نہیں بلکہ عوام بھی ہیں۔ شروع میں جن گنے چنے لوگوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ان کا ذکر آ چکا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد ہمیں کئی شعرا کے نام ملتے ہیں مثلاً عبدالرحیم پاروتی، احمد بنجاری، عزیز چتو، کرامت علی یوسف، گل حمید بگین، ناز انور عثمانی، شہنواز خاں سوامی، رشید نیروا، طاہر رومن، سعید میاں جان، قاسم ہیرا اور راقم الحروف وغیرہ۔

مذکورہ شاعروں میں عبدالرحیم پاروتی، عزیز چتنوؔ، کرامت علی یوسف کے علاوہ تمام لوگ ابھی تک عروس شاعری کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ہیں۔ احمد سنجاری نے نظموں کے علاوہ چند غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی نظمیں بالخصوص کسی تہوار یا مذہبی تقریب سے متعلق ہوتی ہیں۔ کبھی کبھار نظیرؔ اکبرآبادی کے اثرات کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے نعت و منقبت بھی کہی ہیں۔ شمعِ وطن کے اجراء کے موقع پر ان کی نظم کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہے پاسبانِ وطن بھی اور ہے تنویرِ حیات بزم طرب ہے احمدؔ شمعِ وطن رسالہ

طاہرؔ رومن نے تقریباً سو سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی کئی نظمیں مقامی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ شاعری میں ان کے یہاں وہی ناصحانہ انداز اکثر مقامات پر ملتا ہے اور وہ طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ انھوں نے نظموں کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ نثری نظم بھی لکھتے رہے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

سر اپنا جھکا کے نہ زمانے میں جیا کر جینا ہے تو سر اپنا اٹھا کے تو جیا کر
اردو کی محبت میں بہت تجھ کو شغف ہے اردو سے محبت ہے تو اردو میں کہا کر

خزاں میں پل کر جواں ہوئے ہیں بہار سے واسطہ نہیں ہے
نصیب سے ہم نے خار پائے بہار سے واسطہ نہیں ہے
یہ انجمن ہے مسرتوں کی فضول ہے غم کا ذکر طاہرؔ
سمجھ نہ پائے گا ساز کوئی جو تار سے واسطہ نہیں ہے

رشیدؔ نیروا کا تخلص رازداں ہے اور وقتاً فوقتاً نظموں کے علاوہ غزلیں بھی لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی چند تخلیقات جستجو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ایم۔ جی۔ آئی کا رسالہ وسنت کے اردو شمارے میں ان کی ایک نظم بعنوان "پہلا فراق" چھپی ہے جس کی چند سطریں پیش ہیں۔

تم نے جو جامِ عشق پلایا مجھے کبھی
وہ آج تلخ زہر سے کچھ کم نہیں مگر
دل میں کریدتا ہے کبھی وقت کی چبھن

تو وہ پرانا درد اُبھرتا ہے اس طرح
جیسے کہ سامنے کوئی محشر بپا ہوا

ناز نورؔ عثمانی صوفیانہ مزاج کے آدمی ہیں۔ انھوں نے حمد و نعت کے علاوہ قطعات، نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ ان کے یہاں گم شدہ قدروں کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ ایک تبلیغی تاثر بھی پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمانے کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں۔

جی کر غمِ ہستی میں سیکھا یہ سبق انورؔ
ہنستے ہوئے مر جانا مردوں کی نشانی ہے

زندگی میں کبھی حالات بدل جاتے ہیں
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں

ہے وہی فطرتِ انساں وہی انسان مگر
دل بدل جاتے ہیں جذبات بدل جاتے ہیں

سرزمینِ ماریشس میں متذکرہ شاعروں کے علاوہ جن شاعروں نے ۱۹۷۰ء کے بعد مسلسل لکھا۔ ان میں پیش پیش قاسم ہیرا صاحب ہیں جو آج کل ایم جی۔ آئی میں سینیئر لکچرر ہیں۔ مختلف سطحوں پر اردو کی خدمات کرتے ہیں خاص کر اسکولوں میں درسی کتابیں اور نصابات کی تیاریاں ان کا اہم شعبہ ہے۔ ہیرا صاحب کے اردو میں شعر کہنے کا اپنا منفرد انداز ہے۔ موسیقی سے آشنائی کی بنا پر ان کے کلام میں بھی موسیقیت ہر اعتبار سے پائی جاتی ہے۔ خوبصورت اور دلکش الفاظ استعمال کر کے کلام میں حسن اور کشش پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے نام سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے اور ہمیں مومنؔ کی یاد آتی ہے۔ بعض اوقات ان کے کلام کے مطالعے سے فیض احمد فیضؔ کا ہوکا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنا ایک لہجہ اور اسلوب قائم کر لیا ہے۔ ان کے یہاں کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔ ماریشس کے یہ واحد شاعر ہیں جن کا مجموعہ اس سال ایم۔ جی۔ آئی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ خدا کرے زورِ سخن اور زیادہ۔

قاسم ہیرا نے قطعہ، رباعی، آزاد نظم، پابند نظم، غزل وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

غم دنیا نے مرے دل میں جگہ پائی ہے
دل کو اشکوں میں ڈبویا تو وفا آئی ہے

ترے زخموں کے دیے پلکوں پہ رکھ کر میں نے
خوں جلایا ہے تو جینے کی ادا آئی ہے

عنایت حسین عیدن

ترجمہ : سہیل احمد فاروقی

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے بیس سال

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کا قیام ۱۸ ستمبر ۱۹۷۰ء کو عمل میں آیا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں اس وقت کی نامور مسلم شخصیات نے شرکت کی۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے خصوصی سرپرستوں میں ماریشس کے سابق وزیر اعظم عالی جناب شوساگر رام غلام، مرحوم سر عبدالرزاق محمد اور اس وقت کے قائم مقام گورنر جنرل سر عبدالرحمٰن عثمان تھے جن میں سے موخر الذکر نے انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا تھا۔ تقریب میں موجود تمام حضرات نے ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت کا اظہار کیا تھا جو نو آزاد ریاست ماریشس میں اردو کے فروغ کی ذمہ داری سنبھالے۔

اس طرح ہمارے جزیرہ میں اردو کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اردو لائبریری کے قیام کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور اس کے ساتھ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لیے ایک مرکز بھی وجود میں آیا۔ جہاں ہر ہفتہ اردو زبان و ادب پر کلاسیں اور لکچر منعقد ہوتے۔ اس کے لیے طلباء سے کوئی باقاعدہ فیس وصول نہیں کی جاتی تھی اگرچہ انسٹی ٹیوٹ کے خود بعض اصحاب خیر مثلاً عبداللہ کریم جی مرحوم (ہمارے اولین حیاتی صدر) سر عبدالرزاق مرحوم، احمد کھتر اڈا مرحوم، ڈاکٹر ایچ فاخم مرحوم، سلیمان واودا مرحوم، جناب اسحٰق جونا، جناب ایچ حیات اور جناب عبداللہ احمد کے مالی تعاون سے چلتا تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا خیال اس وقت ذہن میں آیا جب راقم السطور نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے استاد پروفیسر اطہر پرویز مرحوم سے تبادلۂ خیال

جناب عنایت حسین عیدن، جنرل سکریٹری نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ، ماریشس۔

کیا۔ میں نے ایک منصوبہ مرتب کر کے پروفیسر موصوف اور سرکردہ شخصیتوں کے سامنے رکھا جنھوں نے اس کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کی منظوری دے دی۔ پروفیسر اطہر پرویز کو ماریشس میں اردو کی تعلیم کے ماہر کی حیثیت سے یہاں بھیجا گیا۔ انھوں نے ماریشس میں اردو کا معیار بلند کرنے کے لیے بڑی محنت اور لگن سے کام کیا اور ہماری حد درجہ حوصلہ افزائی فرمائی۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ گذشتہ دو دہائیوں سے اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں برابر مصروف عمل ہے اور ہم نے اپنی وسعت بھر اپنے ملک میں اردو زبان و ادب کے تحفظ اور اس کی ترویج و اشاعت کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے کوئی کارنمایاں انجام دیا ہے بلکہ عرض مدعا یہ ہے کہ ہم نے اہل ماریشس کو اردو زبان و ادب کے ایک نئے تصور سے آشنا کرایا ہے۔ یہ ثابت کرنے میں ہم کامیاب رہے ہیں کہ اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس میں زندہ شعراء و ادباء موجود ہیں۔ متعدد شعراء اور دانشوروں کو ہم نے اپنے یہاں مدعو کیا ہے۔ مشاعروں کی روایت کی بنا ڈالنے کے علاوہ ہم نے اردو کی ادبی سرگرمیوں کو بھی ترقی دی ہے۔ ہم نے اردو میں شاعری کرنے والوں اور نثر اور ڈرامہ لکھنے والوں کی مدد کرنے اور نوجوانوں کو اردو پڑھنے کی ترغیب دلانے کا کام بھی کیا ہے۔ یہاں ہم حکومت ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہمارے بعض طلباء کو ہندوستان میں اردو پڑھنے کے لیے وظائف منظور کیے اور مالی تعاون کے حصول میں ہماری مدد کی۔ ہم ہمیشہ وزارت فنون و ثقافت اور دیگر اداروں کے ساتھ برابر اشتراک کرتے رہے ہیں لیکن جب بھی یہ محسوس ہوا کہ اردو انسٹی ٹیوٹ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ تو ہم نے اپنی آواز اس کے خلاف ضرور بلند کی ہے۔

گذشتہ بیس سالوں کے دوران ہم نے ہزارہا لڑکوں اور لڑکیوں کو اردو پڑھائی ہے جن میں سے تقریباً دو سو افراد کو حکومت کی اردو اساتذہ کی اسامیوں پر رکھا گیا ہے اور کچھ کم خوش نصیب لوگوں کو اردو کے میدان میں ہی ملازمتیں مل گئیں۔ بہر صورت وہ ایک زبان سے آشنا ہو گئے ہیں جس کے ذریعے وہ علماء کے وعظ سمجھ لیں اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔ یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ غزل، ڈرامہ اور ہندوستان و پاکستان سے ٹیلی ویژن

اور ریڈیو سے نشر ہونے والے اردو پروگراموں کو سمجھنے کی صلاحیت بھی ان میں پیدا ہو چکی ہے۔

ان طلباء میں چند ایسے بھی ہیں جو اردو کے فروغ کے لیے خود کو وقف کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اپنے قیمتی اوقات کا ایک بڑا حصہ انسٹی ٹیوٹ میں رہ کر بلا معاوضہ اردو پڑھانے میں گزارتے ہیں۔ وہ نہ صرف ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں بلکہ ان کی انتظامی ذمہ داریاں بھی قبول کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ گہرا جذباتی لگاؤ ان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔ یہ وفا شعار نوجوان ہیں فاروق بوچا، فاروق حسنو، صابر گوڈر، سعید میاں جان، رشید نیروا، حنیف کنہائی اور گوری توتا جن کے تعاون کے بغیر انسٹی ٹیوٹ ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکتا۔

کسی زبان کی مخالفت ہمارے موقف کے منافی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اس ملک میں تمام زبانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اردو کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اردو ہمیں اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں ملی ہے جو برصغیر ہند وپاک سے ہجرت کر کے یہاں آئے اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی خفت نہیں ہوتی کہ ہمارے اجداد دنیا کے اس خطّے سے آئے تھے۔ اردو ایک عظیم ثقافتی اور ادبی روایت کی امین ہے جس کی جڑیں نہ صرف ہند وپاک بلکہ عربی اور فارسی سے وابستہ ہیں۔

اردو ہماری سماجی شناخت کا ایک اہم پہلو ہے کیا کوئی خوبصورت غزل سن کر یا ٹی وی پر کوئی اچھا ڈرامہ دیکھ کر ہمیں فخر کا احساس نہیں ہوتا اور کیا یہ احساس اس وقت ہم میں نہیں پیدا ہوتا جب کوئی غالب یا اقبال کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔ یقیناً ہم اس وقت محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ہیں۔ اور اگر ایسا ہے تو وقت آ گیا ہے کہ ہم محسوس کریں کہ اردو ماریشس کے تہذیبی ورثہ کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ کہ ماریشس کی زبانوں میں سے اردو ہے۔

ساتویں دہائی کے وسط میں رونما ہونے والے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات نے ہمارے سماجی لسانیاتی پس منظر کو منتشر کر دیا تھا۔ اس انتشار کے اسباب و اثرات کا تعین کرنا سماجی لسانیات کے ماہرین کا ہے لیکن اس جانب اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ اردو خاص طور پر اس کا شکار ہوئی۔ ہمیں غربت اور بے بسی کے علاوہ بہت سی دشواریوں سے نبرد آزما

ہونا پڑا لیکن بڑے صبر اور سخت جانی سے ہم اپنے قدم جمائے رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔

آج بیس سال گزر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی بساط بھر پوری کوشش کی ہے لیکن ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اردو زبان کی وسعت و ترقی کے کام میں دوسرے لوگ بھی دلچسپی لیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اردو میں تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ طلباء اردو سیکھ سکیں۔ اپنی طرف سے ہم ہر مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے اساتذہ کی جماعت یہاں موجود ہے اور ان کا جو تعاون ہمیں حاصل رہا ہے اس کے لیے میں بہت شکر گزار ہوں اور صابر گودڑ، سعید میاں جان، فاروق حسنو، رشید نیر دا فاروق بوچا، حنیف کنہائی اور گوری توتا کی کوششوں کو آفریں کہتا ہوں۔

اس موقع پر میں یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اپنے صدر عبداللہ احمدسی، بی اے کا تعاون ہمیں ہمیشہ حاصل رہا ہے جو اپنی مصروفیات کے باوجود کسی بھی وقت ہمیں خوش آمدید کہنے کو تیار اور ہماری سرگرمیوں میں شریک رہتے ہیں۔ یہی نہیں کہ وہ اپنا پیسہ ہمیں دینے کو تیار رہتے ہیں بلکہ ہماری درخواست پر حرف انکار ان کی زبان سے کبھی نہیں نکلا۔

اس کے ساتھ میں ان تمام کرم فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو پابندی سے اپنے مالی عطیات انسٹی ٹیوٹ کو چلانے کی خاطر دیتے رہے ہیں خصوصاً کریم فیملی، جناب انور کھتراڈا، جناب اسحاق جونا، جناب غنی جونا، اور جناب ابراہیم داؤد، جناب قاسم ہیرا کا میں ممنون ہوں کہ ہمارے پروگراموں میں شریک اور اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ جناب رشاد بروکر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ مختلف امور میں اپنے تجربات سے انھوں نے ہماری مدد کی۔

گل حمید بیگن سے ایک ملاقات

ماریشس کے معروف صحافی شاعر، دانشور اور ماریشس عربی و اردو اکیڈمی کے صدر گل حمید بیگن گزشتہ دنوں اسلام آباد آئے تو ماریشس میں اردو کی صورتِ حال کے بارے میں ان کا ایک خصوصی انٹرویو ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے لیا جو قارئین کی نذر ہے۔ گل حمید بیگن کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اس وقت ماریشس کی وزارت تعلیم میں ایشیائی زبانوں کے سینیئر سپروائزر (انسپکٹر) اور شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں ان کا پتہ یہ ہے 12,Robinson Lane, Phoenix, MAURITIUS

ماریشس بحرِ ہند کے اس حصہ میں واقع ہے جہاں سے براعظم افریقہ شروع ہوتا ہے۔ یہ جزیرہ گیارھویں صدی میں عربوں نے دریافت کیا تھا۔ ۱۷۱۵ء میں یہ فرانسیسی کالونی تھی۔ ۱۸۱۰ میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا جب کہ ۱۹۶۸ء میں یہ دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک کی حیثیت سے ابھرا۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد اس وقت شروع ہوئی جب یہ فرانس کے زیر تسلط تھا۔ مسلمان یہاں کاروبار کی غرض سے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ جب اس خطے پر برطانیہ نے قبضہ کیا تو اس کی فوج میں بھی پنجابی اور پٹھان مسلمان سپاہی موجود تھے جنھیں مقامی لوگ لشکر کہا کرتے تھے۔ اس وقت یہاں کی کل آبادی گیارہ لاکھ ہے جس میں سے دو لاکھ مسلمان، ساڑھے پانچ لاکھ ہندو، اور کچھ دیگر اقوام کے لوگ بھی شامل ہیں۔ گل حمید بیگن نے ماریشس میں بولی جانے والی اور استعمال ہونے والی زبانوں کے بارے میں ہمارے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ:

یہاں کے لوگ "کریول" زبان بولتے ہیں جو کہ فرانسیسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ فرانسیسی ہر کوئی سمجھتا ہے لکھتا ہے اور پڑھتا ہے۔ ننانوے فی صد اخبار فرانسیسی زبان کے ہیں اگرچہ

انگریزی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے لیکن روزمرہ زندگی میں شاید ایک فی صد بھی نہیں بولی جاتی۔ دفاتر میں سرکاری سطح پر اور نیم سرکاری سطح پر زیادہ تر فرانسیسی میں کام ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ انگریزی نام کی رہ گئی ہے۔ انگریزی کے مقابلے میں لوگ اردو زبان جلدی سیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ بھوجپوری جو کہ اردو کی نسبت زیادہ بولی جاتی ہے اس میں ۷۵٪ الفاظ کا ذخیرہ اردو زبان کا ہے۔

علاوہ ازیں بھارتی فلموں کی وجہ سے لوگ بہت جلد اردو کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

س:۔ ماریشس کے تعلیمی اداروں میں اردو کو کیا مقام حاصل ہے؟

ج :۔ یہاں پرائمری سرکاری اسکولوں میں مقامی زبان کریول ذریعہ تعلیم ہے جب کہ اردو بھی بطور زبان کے موجود ہے اور ۱۸۶ سرکاری پرائمری اسکولوں میں باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے ان اسکولوں میں اس وقت اردو کے ۴۰۵ اساتذہ یہ فریضہ سرانجام دے رہے ہیں جب کہ اس زبان کے لیے حکومت نے چھ انسپکٹر آف سکولز بھی مقرر کر رکھے ہیں۔ یہاں اردو اگرچہ اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے لیکن تقریباً سب مسلمان یہی زبان پڑھتے ہیں۔ اس وقت اس ملک کے مختلف اسکولوں میں ۱۸۵۰۰ بچے اردو پڑھ رہے ہیں جب کہ ۲۵۰۰ طلبہ نے عربی بطور مضمون لی ہے جو خاندان اپنے بچوں کو اردو میں داخلہ دلواتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پاکستان سے تعلق قائم رہے اور بچے اپنے کلچر سے بیگانہ نہ ہونے پائیں۔ پرائمری اسکولوں کے علاوہ چار ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی اردو پڑھائی جا رہی ہے جب کہ چھ پرائیوٹ سکنڈری اسکول بھی اردو کو بطور اختیاری مضامین کے پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح ۱۰۰ کے قریب مساجد سے ملحق اسکولوں میں بھی اردو اور عربی پڑھائی جا رہی ہے لیکن مسجدوں کے ساتھ ملحقہ ان پرائیوٹ مدرسوں میں اردو عموماً شام کے وقت پڑھائی جاتی ہے جہاں تک ان اسکولوں میں پڑھائی جانے والی نصابی کتب کا تعلق ہے تو یہ زیادہ تر بھارت اور پاکستان سے آئی ہیں عمومی پڑھائی یعنی جنرل ریڈنگ کے لیے البتہ کتابوں کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے جسے پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کے مختلف ادارے یہاں کی لائبریریوں کے لیے اردو کی ایسی کتابیں ہدیہ کریں جن میں زبان و ادب، اسلام اور پاکستان کے بارے میں معلومات

پائی جاتی ہوں۔ کیونکہ اسلام اور پاکستان کے بارے میں جاننے کے لیے ری یونین جزیرے کے لوگ پہلے ہی اردو کو استعمال کر رہے ہیں اور تبلیغ کے لیے بھی یہ لوگ اسی زبان کو استعمال کرتے ہیں۔

س:۔ ماریشس میں ذرائع ابلاغ کے حوالے سے اردو کی کیا صورتِ حال ہے؟

ج:۔ ریڈیو پر تقریباً روزانہ ایک گھنٹے کا اردو پروگرام ہوتا ہے۔ ابن سعود گونو یہ پروگرام پیش کرتے ہیں عبدالسلام احمدی اس کے انچارج ہیں جب کہ عبدالرافع احمدی اردو کی خبریں پڑھتے ہیں۔ ہندی کا پروگرام اس کے علاوہ ہے۔ ماریشس براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے علاوہ ٹی وی سے بھی ہفتے میں ایک دن سوا گھنٹے کا اردو پروگرام نشر ہوتا ہے۔

س:۔ یہاں پہ کام کرنے والی اردو کی تنظیموں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج:۔ میں نے ۱۹۶۸ء میں ماریشس عربی اردو اکیڈمی قائم کی تھی جس کے مقاصد میں اردو، انگریزی فرانسیسی اور عربی میں مضامین اور کتابیں چھاپنا شامل تھا۔ اب تک ہم اردو کی تقریباً دس کتابیں شائع کر چکے ہیں جن میں سفینۂ رحمت، ساگر کا ملن، بیوی کے لیے (ڈرامہ) وغیرہ شامل ہیں۔ میرا شعری مجموعہ بھی تیار ہے جو عنقریب شائع ہو رہا ہے۔

ہم نے اس تنظیم کے تحت یوم پاکستان، یوم اقبال اور یوم اردو کے علاوہ بھی کئی تقریبات کا آغاز کیا۔ فاروق حسنو اور ابنِ سعود گونو بھی میری اس تنظیم میں میرے رفیق کار ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے انگریزی میں ایک کتاب A glimpse of urdu لکھی تھی وہ بھی اسی اکیڈمی کی طرف سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اردو کے کلاسیکل شعرا و ادباء کے تعارف پر مبنی مواد پیش کیا گیا تھا۔ نیز اس میں اردو کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں بھی ایک مقالہ شامل کیا گیا تھا۔ اسی طرح میں نے "فرنیچ انگریزی عربی اور اردو سیکھیے" کے نام سے ایک کتاب تیار کی ہے۔ جو سائیکلو اسٹائل ہو کر ری یونین میں استعمال ہو رہی ہے اور عنقریب چھپ بھی رہی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے درج بالا میں سے کوئی ایک زبان جاننے والا فرد بیک وقت باقی کی تین زبانیں سیکھ سکتا ہے۔ اس کے آخر میں پچاس صفحات کی فرہنگ اور اردو گرامر بھی دی گئی ہے۔

آخر میں گل حمید بیگن نے بتایا کہ ری یونین میں مولانا سعید انگار، یوسف راوت اور سلیمان دیندار جیسی شخصیات اردو اور اسلام کی بے پناہ خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ یہ لوگ اردو میں دینی کتابیں چھاپ کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ "اردو نیشنل انسٹی ٹیوٹ" یہاں کا سب سے بڑا ادارہ ہے جہاں سے وقتاً فوقتاً اردو کے رسالے بھی نکلتے ہیں۔ اس ادارے کے سربراہ عبداللہ احمد اردو کی بے پناہ خدمات کر رہے ہیں اور اب مقامی وزارتِ تعلیم کے تعاون سے ایک بین الاقوامی اردو کانفرنس بھی منعقد کی جا رہی ہے جو ۹ سے ۱۲ دسمبر تک ہوگی۔ اس کانفرنس میں مقالے بھی پڑھے جائیں گے اور مشاعرہ بھی ہوگا جس میں پوری دنیا سے ادباء و شعرا کو بلایا جا رہا ہے۔

اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے اردو کے ادیبوں، دانشوروں اور قلم کاروں کو تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کیا جائے۔ انفرادی تجربوں کی روشنی میں اردو کے فروغ کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کیا جائے اور ان ممالک میں موجود اسکولوں میں اردو کی تدریس کے لیے بہتر انتظامات کیے جا سکیں۔

(یہ انٹرویو بین الاقوامی کانفرنس کے انعقاد سے پہلے لیا گیا)

مریم گوڈر
ترجمہ: جبین انجم

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ (این یو آئی)

اور اس کی کارگزاریاں

اپنے قیام کے صرف بیس سال کی مختصر مدت میں اردو زبان اور کلچر کے فروغ اور اس کی اشاعت میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے جو کارنامے انجام دیے وہ یقیناً کسی تعارف کے محتاج نہیں

ماریشس میں اردو لائبریری کے قیام کا خیال سب سے پہلے ہندوستان کے I T E C کے ماہر نیز ٹیچرز ٹریننگ کالج کے معلم ڈاکٹر اطہر پرویز مرحوم کے ذہن میں آیا اور جناب عنایت حسین عیدن سے صلاح ومشورے کے بعد دونوں نے انسٹی ٹیوٹ کا ایک علمی خاکہ تیار کیا، اور جلد ہی مرحوم عبدالرزاق محمد اور جناب عبداللہ احمد اور کچھ دوسرے مخیر حضرات کی پیہم کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ جناب عنایت حسین عیدن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے ان کارناموں کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے جس نے اس ادارے کو ایک نئی زندگی دینے اور اسے استحکام دینے میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ جناب عنایت حسین عیدن نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آتے ہی نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا بلکہ انھیں بحسن وخوبی پایۂ تکمیل تک بھی پہنچایا۔ ٹیچرز ٹریننگ کالج کی کوچنگ کی ذمہ داری کے باوجود انھوں نے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری کا عہدہ بھی سنبھالا اور اس چھوٹے سے جزیرے میں اردو کی ترویج واشاعت میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس ادارے کو ترقی کی بلندی تک پہنچا دیا۔

غرضیکہ جناب عیدن نے نہ صرف اس ادارے کو صحیح خطوط پر گامزن کیا بلکہ اس کا معیار بلند کرنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

ابتدا سے لے کر آج تک نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ اردو زبان کے پرستاروں کا مرکز رہا ہے۔ اردو دراصل صرف ایک ذریعہ تعلیم ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے تفریح طبع کا ایک ذریعہ بھی ہے جو اردو شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ماریشس میں صرف نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ ہی وہ جگہ ہے جہاں وقتاً فوقتاً مشاعرے، بیت بازی، نعت غزل اور نظم خوانی وغیرہ کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان پروگراموں کا مقصد صرف علم میں اضافہ ہی نہیں بلکہ شہری زندگی کے ہنگاموں سے اکتائے ہوئے سامعین کو ذہنی سکون و آسودگی بھی فراہم کرنا ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ماریشس میں سامعین اپنے پسندیدہ شاعروں کو سنتے ہیں اور اچھے شاعروں کے کلام سے لطف اندوزی کو وہ سنہری موقع سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے شعراء میں ہندوستان کے بیکل اتساہی اور پاکستان کے احمد فراز ہیں جن کی شاعری اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ حقیقی معنوں میں وہ شاعر جو ناانصافی کو کسی طور پر پسند نہیں کرتا۔ سرکاری سطح پر بھی وہ ناانصافی کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں ناانصافی کے خلاف ایک آگ سی لگی رہتی ہے اور یہ آگ قلم کے ذریعے باہر نکلتی ہے۔ جہاں تک بیکل اتساہی کی شاعری کا تعلق ہے۔ ان کی شاعری میں دیہاتی و شہری زندگی کا عکس موجود ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیکل نے ادب کی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہے۔ بیکل کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا کلام ہمیشہ ترنم میں پڑھتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت اور خیالات کی گہرائی نمایاں ہے اور یہ خوبی بیکل کو ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے اور انھیں عوام کے دلوں کے قریب کر دیتی ہے۔ جب ہم ان شاعروں کی بات کرتے ہیں تو ایک مشہور مقولہ یاد آتا ہے۔ "خدا کے دربار میں بہت سے خزانے ہیں جن کی کنجیاں شاعروں کے قلم میں ہیں۔"

تجربہ اور علم کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اردو کی معلومات بہم پہنچانے کے لیے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ مشاعرے اور بیت بازی وغیرہ کے پروگرام منعقد کراتی ہے۔ اقبال ڈے اور مرزا غالب کی برسی جیسے پروگراموں کو منعقد کرنے کا خاص مقصد بھی یہی ہے کہ سامعین

کو ان ادبی شخصیتوں کے بارے میں واقفیت حاصل ہو جنھوں نے اردو ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور جن کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے باقاعدہ اردو کلاسز کا بھی انتظام کیا گیا ہے جس میں اردو کے امتحانات بھی کرائے جاتے ہیں۔ پچھلے بیس سالوں سے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ میں اردو کے مختلف کورسز چلائے جاتے ہیں۔ جن میں ابتدائی ادیب، ادیب ماہر ادر ادیب کامل بلا معاوضہ ان طلباء کو کرائے جاتے ہیں جو جامعہ اردو کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم پہلے G.E.C اے معیار کی بھی کلاسیں بھی لیتے تھے۔ اب صرف وہ طلباء جو اردو کو اختیاری یا خصوصی مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ وہ بھی اِس بلا وضہ کورس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان کورسز کے علاوہ بالغوں کے ناتے خاص کورس Adult Course کے نام سے بھی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ چلاتا ہے۔ ان کورسوں کو چلانے میں جناب عیدن، جناب گودڑ، جناب میاں جان، جناب کنہائی، جناب حسنو، جناب بوچا، جناب نیروا، اور محترمہ تونہہ کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔

مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے اردو مشیر کار جناب قاسم ہیرا کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں جنھوں نے ہمیشہ اردو کی خدمت کی۔ جناب ہیرا صاحب اپنے ادبی کاموں کے لیے مشہور رہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر، ادیب اور ڈراما نگار رہیں۔ جناب ہیرا کا لکھا ہوا "انارکلی" ڈرامہ کون بھول سکتا ہے۔ جو کہ غنایت اور خوبصورت الفاظ سے مزین ہے۔ چونکہ موسیقی اس ڈرامہ کا ایک خاص عنصر ہے اس لیے شیکسپیئر کا یہ مقولہ یاد آجاتا ہے "موسیقی ہی روحانی طاقت ہے جو پریشان حال لوگوں کو سکون دیتی ہے اور اصناف میں ایک توازن برقرار رکھتی ہے۔" مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ایک دن سنیچر کی صبح وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر جناب عیدن کی درخواست پر نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ آئے اور ہمیں اردو شاعری کی باریکیاں مثلاً شعر میں روانی، اور وزن وغیرہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اسی طرح جب بھی موقع ملتا وہ ہمیشہ اپنی نظمیں یا کسی اور کی نظمیں سنانے آتے یا پھر کسی موضوع پر کوئی لکچر دیتے

نعتیہ مشاعرہ کا پروگرام اکثر عید میلاد النبیؐ کے موقع پر منعقد ہوتا۔ طلباء اور اساتذہ دونوں ہی اس میں حصہ لیتے۔ ان کے علاوہ اور لوگ بھی اس میں حصہ لے سکتے تھے۔

پچھلے چند سالوں سے نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے جامعہ اردو امتحان کی ذمہ داری سنبھالی۔ عبدالوہاب فندن جو کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ انھوں نے ماریشس میں یہ امتحانات کرانے کی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس امتحان کی وجہ سے بہت سے لوگ T.T.C میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور بہت سے لوگوں کا تقرر پرائمری اسکولوں میں بحیثیت استاد عمل میں آ چکا ہے۔ جناب فندن دوسرے شخص تھے جنھوں نے اردو کی بے لوث خدمت کی اور یہ ذمہ داری انھوں نے بہ خوبی سنبھالی۔ بدقسمتی سے خرابیٔ صحت کی وجہ سے انھیں اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا پڑا

ان تمام کارگزاریوں کے علاوہ ہر سال جلسہ تقسیم انعامات بھی جامعہ اردو امتحان میں اول نمبر پر آنے والے طلبہ کے اعزاز میں کرایا جاتا ہے جو کہ اردو کی ترقی کے لیے ایک اور قدم ہے۔ ایک بار پھر ہم جناب عبداللہ احمد، جناب کریم جی اور دیگر لوگوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے طلباء کو انعامات دینے میں اپنی خدمات کو پیش کیا۔

پچھلے سال نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے پہلی اردو کانفرنس میں حصہ لیا جو کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں منعقد کی گئی۔

اِس میں کوئی دو رائے نہیں کہ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے ماریشس میں اردو کی ترقی کے لیے جو کام کیے ہیں وہ ماریشس کی آئندہ نسلوں پر بھی اپنا مثبت اثر چھوڑیں گے جیسے وقت کی ریت پر چلنے والے آئندہ نسلوں کے لیے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

فاروق حسنو

اردو: ہمارے بزرگوں کی زبان

ماریشس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مختلف زمانوں میں تارکین وطن آئے مگر ۱۸۳۴ء سے منظم طریقے سے مزدوری کرنے کی غرض سے بھرتی ہو کر آنے والے ہندوستانیوں کی اکثریت بہار اور مشرقی یوپی سے آئی تھی۔ ان لوگوں کی بولی بھوجپوری یا پوربی بولی تھی مگر تعلیمی اور ثقافتی زبان ہندی یا اردو تھی۔ ویسے تو اردو عظیم آباد (پٹنہ) اعظم گڑھ، گیا، سلطان پور وغیرہ اور ان کے مضافات کی زبان رہی ہے۔ ان علاقوں کے شعراء اور ادیبوں کے کارنامے ثبوت ہیں۔

اس جزیرے میں آکر ان کو وہ سازگار ماحول نہیں ملا جہاں پر وہ اپنی زبان و تہذیب کو فروغ دے سکیں۔ مگر رفتہ رفتہ ان تارکین وطن کے حالات سدھرتے گئے اور وہ اپنی زبان و تہذیب کی طرف توجہ دینے لگے۔ پہلی مسجد تو ۱۸۰۵ء میں پورٹ لوئیس میں بن چکی تھی۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک قبر ہے جس پر اردو میں ایک کتبہ لکھا ہوا ہے۔ رسم الخط اور الفاظ کی املا سے اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے قدیم اردو کا استعمال کیا ہے۔ پھر پورٹ لوئیس کی جامع مسجد کی تعمیر ہوئی تھی۔ ان دونوں مسجدوں میں نہ صرف نماز پڑھائی جاتی تھی بلکہ ساتھ ہی ساتھ دین کی تعلیم دینے کا بھی بندوبست تھا یعنی قرآن شریف پڑھنے کی تعلیم دی جاتی تھی اور ساتھ ساتھ فارسی اور اردو بھی پڑھائی جاتی تھی۔

جب ہمارے آبا و اجداد شکر کی کوٹھیوں سے نکل کر گاؤں میں بسنے لگے تو ان لوگوں نے بھی مسجدیں بنائیں۔ ان ہی مسجدوں میں بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ وہاں بھی

عربی، اردو اور تھوڑی بہت فارسی پڑھائی جاتی تھی۔ اردو پڑھانے کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کو اپنی زبان آجائے تاکہ وہ نہ صرف اس زبان میں لکھ پڑھ سکیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ مذہبی اور دینی کتابیں بھی پڑھ سکیں۔ فارسی اس لیے پڑھائی جاتی تھی کہ ہندوستان میں اس زبان کا جاننا تعلیم یافتہ ہونے کی علامت تھی۔ اور جب ہمارے آبا و اجداد ہندوستان سے چلے تھے تو وہاں پر مدرسوں میں فارسی سکھائی جاتی تھی۔ جو مولوی صاحب یا جو امام صاحب ہندوستان سے آتے تھے ان کو فارسی آتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا رواج اور اس کی ضرورت یہاں کم ہوگئی۔ چنانچہ موجودہ صدی کے ابتدائی حصے کے بعد فارسی پڑھانے کا رواج کم ہوتا گیا۔

شروع شروع میں محرم، ربیع الاوّل اور ربیع الآخر کے مہینوں میں مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ محرم کے مہینہ میں دس روز تک مجلس ہوا کرتی تھی جس کے دوران شہیدان کربلا کا ذکر ہوا کرتا تھا۔ ربیع الاول کے پہلے بارہ دنوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بیان کی جاتی تھی اور ربیع الآخر کے پہلے گیارہ دنوں میں غوث پاک عبدالقادر جیلانیؒ کی حیات اور کرامات پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ ان تمام مجلسوں میں اردو ہی کی کتابیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ دس مجلس، بارہ مجلس اور گیارہ مجلس کے نام سے مشہور تھیں۔ ان مجلسوں کے علاوہ میلاد شریف کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے تھے جن میں بھی اردو ہی میں نعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ اسی طرح اس زمانے میں جو مذہبی کتابیں رائج تھیں وہ ہیں 'نورنامہ'، 'چراغ نامہ'، 'تعلیم نامہ'، وغیرہ۔

ہندوستان میں گاؤں اور شہروں میں داستان سننے اور سنانے کا رواج بہت عام تھا جو لوگ وہاں سے آئے تھے وہ اپنے ساتھ قصہ کہانیاں اور داستانیں بھی لائے تھے۔ چنانچہ یہاں پر جب وہ کام سے فارغ ہو جاتے تھے تو آپس میں قصہ کہانیاں سناتے تھے۔ اسی طرح اردو کی چند داستانیں یہاں بہت مشہور تھیں ان میں قصہ حاتم طائی، قصہ گُل بکاؤلی، داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ کی داستان وغیرہ بہت مشہور ہوئی تھیں۔ جب ڈراموں کا رواج ہوا تو اردو کے چند ڈرامے بھی یہاں پیش کیے جانے لگے۔ 'فیروز گلنار'، 'خواب ہستی' اور چند ڈرامے کافی مشہور ہوئے تھے۔

۱۹۵۲ء سے پہلے سرکاری اسکولوں میں اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ مدرسوں میں اس کا انتظام تھا مگر وہاں کی سہولتیں محدود تھیں۔ ۱۹۵۳ء سے اردو کی پڑھائی سرکاری پرائمری اسکولوں میں شروع ہو جاتی ہے اور آج تک جاری ہے۔ چند ثانوی اسکول (جسے ہم کالج کہتے ہیں) میں بھی اردو پڑھائی جا رہی ہے۔ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں دوسری ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کا شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ جہاں پر درس و تدریس اور ثقافتی امور پر زور دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۰ء میں دی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد پڑی۔ اس ادارے میں رضا کارانہ طور پر اردو کی درس و تدریس ہوتی ہے۔ اردو کے ادبی جلسے بھی ہوتے ہیں اور اردو زبان کی فلاح و بہبودی اور ترقی کے لیے کام کیے جاتے ہیں۔ یہاں پر ایک ادبی انجمن بھی ہے جس کے ممبران اردو کے تخلیقی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ افسانے، مضامین، ڈرامے، نظمیں، غزلیں وغیرہ لکھتے ہیں اور انھیں "جستجو" نامی رسالہ میں شائع کرتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں بھی اردو کے پروگرام اس ادارے کی طرف سے پیش کیے جاتے ہیں۔

اردو آج بھی ماریشس میں زندہ ہے۔ ہمارے آبا و اجداد کی اس زبان کو آگے بڑھانا اور اس کو فروغ دینا ضروری ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ زبان ان ہی کی بدولت ملی ہے۔ اس زبان کی مدد سے ہمارا رشتہ اس سرزمین سے جڑ جاتا ہے جہاں وہ بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے

رشید نیروا
ترجمہ: سہیل احمد فاروقی

اردو ڈراما اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ

سینما کی ایجاد سے قبل اردو ڈراما بمبئی اور ہندوستان کے دیگر بڑے شہروں میں کافی مقبو
رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آغا حشر کاشمیری کے لکھے ڈرامے مثلاً فیروز گلنار، خواب ہستی اور یہودی
لڑکی، دوسری اور تیسری دہائی کے دوران ماریشس پہنچے، جہاں انھیں نومشق فن کاروں۔
اسٹیج پر پیش کیا لیکن جلد ہی سینما نے ڈراما میں عوام کی دلچسپی کو کم کر دیا۔

ماریشس کی آزادی کے چند سال بعد اردو ڈراما کو اس وقت حیاتِ نو ملی جب ۱۹۷۰ء میں نیش
اردو انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ کے جنرل سکریٹری جناب عنایت حسین عیدن کی مح
اور لگن نے اردو زبان و ادب کو ایک نئی بصیرت اور تصور سے آشنا کیا۔ وہ نہ صرف انسٹ
ٹیوٹ میں اردو پڑھاتے تھے بلکہ اردو کی ترویج و اشاعت کے وسائل کی تلاش میں بھی
سرگرداں رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کی خاصی تعداد تھی جو اردو میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ار
اس وقت کئی گاؤں میں پڑھائی جاتی تھی اور جناب عیدن ان سے رابطہ قائم رکھتے تھے
دوسری جانب اردو انسٹی ٹیوٹ نے اردو ڈراما میں لوگوں کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے وہاں
ممبران کو ڈرامہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔

۱۹۷۳ء میں جب وزارت کھیل کود نے پہلا ہندی ڈراما میلہ منعقد کیا تو نیشنل اردو ا
انسٹی ٹیوٹ نے اردو ڈراما میلہ بھی منعقد کرنے کی درخواست وزارت سے کی اور وزارت۔

جناب رشید نیروا، وزارت تعلیم و فنون و ثقافت، پورٹ لوئس، ماریشس۔

اس تجویز سے اتفاق کرلیا۔ جناب اور بیگم موہن مہارشی کی جوڑی کی ماریشس میں آمد سے اردو ڈراما کو بہت ترقی ملی۔ جناب قاسم ہیرا کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل ہوئی جس کے ممبر عنایت حسین عیدن بھی تھے۔ یہ دونوں حضرات اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی انتظامی کمیٹی نے اردو ڈراما کے مقابلہ کے شرکاء کو قیمتی انعامات سے نوازا۔ اردو ڈراما میلے کے لیے اے کریم جی، عبداللہ احمد، اے کتھارڈا، اسحاق جو نا اور دیگر حضرات نے کپ اور ٹرافیاں عنایت کیں۔ نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے کئی گروپوں کا الحاق کیا۔ کیوں کہ ضابطہ کی رو سے ڈراما فیسٹول میں شرکت کرنے والے ڈراما کلبوں کا کسی ادارہ سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔ اس طرح اردو ڈراما کی ابتدا ہوئی۔

وزارت کھیل کود نے (Anse La Raie) یوتھ ٹریننگ سنٹر میں ۱۹۷۵ء میں ایک سات روزہ اقامتی ڈراما سمینار منعقد کیا تھا جس میں قاسم ہیرا اور عیدن صاحب نے کئی سطحوں پر اپنا تعاون پیش کیا۔ سمینار کے اختتام پر شرکاء نے تغلق ڈراما کا ایک ایکٹ اسٹیج پر پیش کیا۔ یہ یادگار سات روزہ سمینار ڈراما میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے کافی مفید ثابت ہوا۔

ماریشس میں اردو کے فروغ میں نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ نے تاریخی کردار ادا کیا ہے اور اردو ڈرامہ فیسٹول کی کامیابی کے لیے اس نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ، طلبہ اور اکثر ڈراما کلبوں کو بھی ڈراما میلے میں شرکت کی تیاری کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ نے اپنے طلباء کی مدد سے کئی ریڈیائی ڈرامے بھی پیش کیے ہیں۔

ڈراما فیسٹول کے لیے اردو کے یک بابی ڈراموں کی ضرورت کے مدِّ نظر نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کی انجمن ادب اردو نے اردو زبان میں تخلیقی تحریروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ جناب عنایت حسین عیدن ماریشس کے اردو ادب کی تشکیل و تعمیر کی نہج پر ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں۔ درج ذیل حضرات انجمن کے ممبر ہیں: جناب ای۔ ایچ عیدن، جناب صابر گوڈر، سعید میاں جان، فاروق حسنو، طاہر دومن، ایم حنیف کنہائی، عزیز چڑو، سید سیو رحمت اللہ، فاروق رجول، قاسم علی محمود، احمد رحمت علی،

گوری تونا، محترمہ مریم گوڈر، جناب سورما بشیرالدین، فاروق بوچہ اور رشید بیروا۔ انجمن ادب کی تحریک پر اس کے بیشتر ممبران نے یک بابی اردو ڈرامے لکھنے کا آغاز کیا۔

اردو ڈراما کے میدان میں جناب عنایت حسین عیدن اور جناب قاسم ہیرا نے شروع ہی سے کافی دلچسپی لی ہے۔ اردو ڈراما فیسٹول کے موقعوں پر یہ حضرات ہر کلب کے شرکا سے فرداً فرداً ملاقات کر کے ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مقامی ادیبوں کو فنی تعاون بھی دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے ڈراموں کو زیادہ دلچسپ اور پُر اثر بنا سکیں۔

جناب قاسم ہیرا ایڈ وائزر مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ جو خود بھی اچھے شاعر اور ادیب ہیں انھوں نے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے انارکلی کی بنیاد پر ایک بیلے "نغمہ شکستہ" کے عنوان سے تخلیق کیا اور اسے ۱۹۸۴ء میں پہلی بار پیش کیا۔

وزارت تعلیم، فنون و ثقافت اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ میں بہت سے یک بابی اردو ڈرامے دستیاب ہیں جن میں سے بعض اردو ڈراما میلوں میں اسٹیج کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے قدیم موضوعات پر ہیں کہ ماریشس میں دکھانا مشکل ہے۔ تاہم قدیم موضوعات پر مبنی دو تین ڈرامے ہر سال اردو ڈراما میلہ میں دکھائے جاتے ہیں کیوں کہ نئے ڈراموں کی قلّت ہے۔

انجمن ادب اردو یک بابی ڈراموں کی تخلیق کا اہم کام انجام دے رہی ہے، کیوں کہ یہاں کے ممبران ہر ڈرامے پر تبادلہ خیال کر کے اس پر اپنی رائے دیتے ہیں۔ یہ ممبران مختلف ڈراما نگاروں مثلاً عنایت حسین عیدن، حنیف کنہائی، ایم طاہر رودمن سے یک بابی ڈرامے لکھنے کی فرمائش کرتے رہتے ہیں۔

اردو ڈراما سے متعلق سرگرمیاں قابل تعریف معیار کو چھو رہی ہیں جن کا مقصد اردو اور دیگر زبانوں میں فن تمثیل کو فروغ دینا اور ماریشس میں اردو ڈراما فیسٹول کے معیار کو بلند کرتا ہے۔

جناب قاسم ہیرا جو ۱۹۷۴ء سے اردو ڈراما کمیٹی کے چیرمین ہیں۔ ملک میں اردو ڈرامہ کی ترقّی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

اردو ڈراما کے میدان میں جناب عنایت حسین عیدن کی خدمات خصوصی اہمیت کی

حامل ہیں۔ انھوں نے اردو ڈرامہ فیسٹول کے لیے کئی یک بابی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے موضوعات سادہ ہوتے ہیں۔ جو بآسانی اسٹیج کیے جاسکیں۔ ان کے یک بابی ڈراموں میں قربانی، زندہ گرٹ، شرابی، شادی کا جوڑا، میں کھیت نہیں جاؤں گا، رام بھروسے چاچا، ساڑیاں خوبصورت ہیں اور ضمیر قابل ذکر ہیں۔ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کی خدمات دوسروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ عبدین صاحب کو مسلسل تین سال تک اردو ڈرامہ فیسٹول میں بہترین مقامی ادیب کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ دوسروں کو یہ موقع دینے کی خاطر وہ "بہترین مقامی ادیب مقابلہ" میں شرکت سے دست کش ہو گئے۔ ماریشس میں اردو ڈرامہ کی بنا پڑ جانے کے بعد سے وہ شب و روز اس کی ترقی کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اردو ڈرامہ کمیٹی کے وائس چیرمین، نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے فعال جنرل سکریٹری اور سالانہ مجلّہ "جستجو" کے مدیر ہیں۔

ڈرامہ کے فن میں لوگوں کو مزید سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے حکومت کی وزارت کھیل کود و ثقافتی امور نے ۱۹۷۶ء میں ایک چلتا پھرتا تھیٹر شروع کرنے کی ہدایت جاری کی جس سے ہمارے نوجوان طبقہ کو دور دراز دیہی علاقوں میں معیاری ڈرامے اسٹیج کرنے میں بڑی مدد ملی۔ ڈرامہ یونٹ نے جناب موہن مہارشی کے تعاون سے عبدین صاحب کے ڈرامہ زندہ گڈٹ کے دس شو جزیرہ ماریشس کے مختلف حصّوں میں دکھائے۔

وزارت کھیل کود نے ۱۹۷۴ء میں راماین کے موضوع پر مبنی تمام زبانوں میں پہلا ڈراما نگاری مقابلہ منعقد کیا جس میں اردو کے زمرہ میں واحد ڈراما عبدین صاحب کا قربانی تھا اور جسے ۱۹۷۵ء میں ٹرایولٹ مسلم سرکل نے پیش کیا تھا۔ عوام کو ڈراما میں دلچسپی دلانے اور اپنے جذبات و خیالات کی عکاسی کے قابل بنانے کی غرض سے وزارت نے ڈراما نگاری کے مقابلے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں بھی منعقد کیے۔ ۱۹۷۷ء کے مقابلہ کے لیے مندرجہ ذیل ڈرامے موصول ہوئے تھے۔

۱۔ بڑوں کے سامنے میں	ایم طاہر دومن
۲۔ ممتا	ایم۔ حنیف کنہائی
۳۔ انقلاب	صابر گوڈر
۴۔ فریب اور فریاد	امین مہر علی

۵۔ تین پیسے کی قسم — کماری راجپوت
۶۔ زبردستی کی شادی — خدیجہ مصطفیٰ
۷۔ صدمہ — بی۔آر حسین بخش
۸۔ فریبی — بی۔آر حسین بخش
۹۔ تقدیر کی لکیر — قاسم ہیرا
۱۰۔ گلزار — محمود گولو

۱۹۷۸ء میں مندرجہ ذیل ڈرامے شامل مقابلہ کیے گئے ۔

۱۔ علاج — ابن عبدالرحمٰن
۲۔ وصیت نامہ — ایم حنیف کنہائی
۳۔ سخاوت کے غلط اصول — قاسم علی محمود
۴۔ بیوی کی نصیحت — بی۔آر۔حسین بخش

۱۹۷۳ء کے ڈراما فیسٹول میں نیشنل اردو کے ایک سرگرم رکن اور اس کے پہلے طالب علم صابر گودڑ نے "کلرک کی موت" میں اپنی کارکردگی پر بہترین اداکار کا ایوارڈ حاصل کیا جب کہ وہ پرائمری اسکول میں اردو کے استاد تھے۔ ۱۹۷۵ء میں انھوں نے تخلیقی آرٹ افسر (اردو سکشن) کی حیثیت سے وزارت کھیل کود میں اپنی ذمہ داری سنبھالی تاکہ لوگوں کو اردو ڈراما فیسٹول میں شریک ہونے کی ترغیب دیں۔ اس وزارت میں دو سال گزارنے کے بعد انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے تین سالہ بی۔اے کورس کے لیے وظیفہ مل گیا جس کی تکمیل پر مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں ایجوکیشن افسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ ۱۹۸۵ء میں دوبارہ حکومت ماریشس کے وظیفہ پر وہ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے اور ان دنوں ہندوستان میں ہی ہیں۔ یک بابی ڈرامے، بچوں کے لیے خاکے اور ریڈیو ڈرامے لکھنے کے علاوہ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔

جناب طاہر رومن اچھے ادیب ہیں اور انھوں نے نظمیں اور ڈرامے لکھے ہیں۔ ۱۹۸۵ء کے اردو ڈراما فیسٹول میں انھیں اپنے ڈرامے "اشک ندامت" پر بہترین مقامی ڈراما نگار کا ایوارڈ ملا تھا۔

جناب قاسم علی محمود نے اردو ڈرامہ فیسٹول کے لیے "انصاف اور عدالت"، "حکیم اور خادم"

قدیر کی لکیر، میں بھی انسان ہوں اور پرورش اور سازش جیسے ڈرامے تخلیق کیے۔ انھوں نے ان ڈراموں میں داکاری بھی کی۔ ۱۹۷۴ء کے اردو ڈراما میلے میں وہ ڈرامہ پیش کرنے والے واحد مقامی ادیب تھے۔

جناب ایم حنیف کنہائی اردو سپرائمری اسکول انسپکٹر جو نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے بانیان میں سے ہیں اور انجمن ادب اردو امتحانات جامعہ اردو کے سکریٹری ہیں، زیادہ تر بچوں اور بڑوں کے لیے افسانے لکھتے ہیں۔ ان کی مؤثر انداز میں لکھی گئی کہانی بڑ کا دادا کو پہلا انعام دیا جا چکا ہے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ماریشس کی داستان لکھ دی ہے جس کے لیے ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے جو عام آدمی بآسانی سمجھ لے۔ وہ ڈرامہ کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔ درامہ نگاری میں وہ آسان تکنیک کا استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ اسٹیج کیا جا سکے۔ ان کے ڈرامے تمنا اور وصیت نامہ اردو ڈراما فیسٹول میں دکھائے جا چکے ہیں۔

اردو میں ڈرامے لکھنے والے ایک اور نوجوان فاروق رجول ہیں جنھوں نے اردو ڈراما یسٹول کے لیے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ ان میں اداکاری بھی کی۔ ۱۹۷۶ء کے اردو ڈراما میلہ یں انھیں ان کے ڈرامے مجرم کون پر بہترین مقامی ادیب کا ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ نھوں نے نازک لمحہ اور خوش آمدید کے عنوان سے بھی دو ڈرامے لکھے ہیں۔ اگر انھوں نے یہ کوشش جاری رکھی تو اچھے ڈرامہ نگار ثابت ہوں گے۔ جناب سید مظہر علی نے ماریشس میں پاکستانی سفارت کار کی حیثیت سے قیام کے دوران تقریباً بارہ ڈرامے لکھے اور وہ سب اردو ڈرامہ فیسٹول میں اسٹیج یے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ گل حمید بگبن، محمود گونو، بھائی رفیق حسین بخش اور آزاد چمکانے بھی اردو ڈرامہ یسٹول کے لیے ایک دو ڈرامے لکھے۔

آخر میں میں اردو کے شیدائیوں، اساتذہ اور طلباء سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ماریشس میں ردو کے فروغ کے لیے بڑی تعداد میں اردو ڈرامہ فیسٹول میں شرکت کریں۔

یک بابی ڈراما نگاری کے فن پر نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ لکچروں اور مذاکروں کا اہتمام کرتا رہا ہے ں کے علاوہ حکومت تعلیم و فنون و ثقافت نے بھی نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے جناب اسم میر کی نگرانی میں اس فن پر ایک روزہ ورکشاپ منعقد کی جس میں جناب عنایت حسین یدن اور اس مضمون میں مذکور تمام حضرات نے شرکت کی۔

محمد حنیف کنہائی

(کہانی)

بڑ کا دادا

مڑیا پہاڑ (Pieter Both) اپنی مختلف خصوصیات کی بنا پر الگ سی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنی دلکشی کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ شکل کے اعتبار سے بھی بہت ہی نرالا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے اسے اپنے ہاتھوں سے تراش کر موکا کے پہاڑی سلسلہ پر بڑے احتیاط کے ساتھ رکھ دیا ہے۔ اس کی چوٹی کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ کسی انسان کے بدن کا اوپری حصہ ہے۔ گویا نصف دھڑ پر ایک گول سر رکھا ہوا ہے۔

اسے دیکھتے ہوئے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ یہ اپنے مقام سے سارے جزیرے کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے صدیوں سے ماریشس کے مختلف ادوار کے ہزاروں لاکھوں انسانی رازوں کو اپنے سینے میں دبائے رکھا ہے۔ مڑیا پہاڑ (Pieter Both) نے جہاں اپنے دلکش مناظر کے ذریعے باشندگانِ موریشس کو دلوں کو محظوظ کرتے ہوئے روحانی تقویت بخشی ہے، وہاں اس نے مظلوں اور بیکسوں کو اپنے دامن میں پناہ بھی دی ہے۔

آج کل سین پییئر (Se. Pierre) سے لانیکولیئر (La Nicoliere) جانے کے راستے پر تھوڑی ہی دور لاوینیر (L.Avenir) نامی گاؤں کے قریب گنے کے کھیتوں کے بیچ ایک چھوٹا سا راستہ ہے جو بالکل مڑیا پہاڑ کے دامن میں لے جاتا ہے۔ وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کا نام لالورا (La Laura) ہے۔ آج کل نہ اس گاؤں کی شہرت ہے نہ ہی کسی کی نظر میں اسکی کوئی اہمیت ہے۔ سین پییر (Se. pierre) سے لانیکولیئر (L.Avenir) کے درمیان روزانہ سیکڑوں گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس کا دھیان اس گاؤں کی طرف جاتا ہو۔ بھلا اتنے اونچے پہاڑ کے نیچے ایک معمولی گمنام میدانی علاقے کی طرف کون توجہ دے گا؟ بالکل اسی طرح جیسے کسی بڑے

سی بڑے عہدیدار یا کسی محکمے کے چیف کے سامنے معمولی کارندوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

مجھے اپنے بچپن ہی میں لالورا (La laura) جانے کا اتفاق ہوا کیوں کہ وہاں میرے دا کے سگے بھائی رہتے تھے۔ وہ اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ وہ ہمارے خاندان میں سب ے عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ اس لیے وہ تمام رشتہ داروں میں 'بڑ کا دادا' (بڑادادا) سے مشہور د گئے۔ ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی ہوگی لیکن ان کے بدن کی مضبوطی سے معلوم ہوتا ہے ، وہ زیادہ سے زیادہ ساٹھ برس کے ہوں گے۔ گو کہ دھوپ کی شدت نے ان کے چہرے کو جھلس ر رکھ دیا ہے، مگر ان کی آنکھوں میں وہ چمک اور نرمی ہے جس سے شباب کی جھلک نمایاں ہوتی ے۔ ان کا سر ہمیشہ پہاڑ کی طرح اونچا رہتا ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی لالورا ں مٹریا پہاڑ کی نظروں کے سامنے گزار دی۔

یہ پہاڑ مجھے بچپن ہی سے متاثر کرتا آیا ہے۔ مگر بڑکادادا کے لیے یہ پہاڑ ان کی زندگی کا ایک حصہ ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ گویا ان کی دنیا صرف اس پہاڑ کی دلکشی اور لالورا کی شادابی سے آباد ہے۔ ہی دو جگہیں ان کی زندگی میں اہمیت کی حق دار ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ ہے مگر نہ جانے کیوں وہ اکثر کہتے ہیں کہ میری روزی کا انحصار مٹریا پہاڑ اور لالورا پر ہے۔ گویا نھوں نے لالورا کے میدان کو اپنی تدبیر کا میدان بنا رکھا ہے۔ یہیں پر انھوں نے اپنی زندگی ں جنگ لڑی ہے۔ جب جب اپنی زندگی کی جدوجہد میں ان کو مایوسی و ناکامی ہوئی، مٹریا پہاڑ نے نہ صرف ان کی عزت افزائی کی بلکہ کامیابی کی طرف رہبری بھی کی۔ جہاں لالورا کی شادابی سے ہمیشہ شاداب رہنا سیکھا وہیں انھوں نے مٹریا پہاڑ سے اپنا سر بلند رکھنا سیکھا یہی دونوں ان کے ہمدم ہیں۔ یہی دونوں ان کے محبوب ہیں۔

آصف اور ناصر ان کے دو بیٹے ہیں جو آج کل سرکاری ملازمت کرتے ہیں۔ دونوں بڑے ھرے سنبھالے ہوئے ہیں۔ کھاتے پیتے اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ شہر کی روشنی اور چہل پہل ے عادی ہو گئے ہیں۔ یہاں کی اداسی اور خاموشی ان کو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ بھلا س سنسان جگہ میں ان کا جی کیسے لگے گا؟ اور پھر ان کو اپنے بچوں کے مستقبل اور تعلیم کی بھی فکر تھی۔ وہ یہاں رہ کر بچوں کو کیسے پڑھا سکتے تھے؟ نہ کوئی اچھا سا پڑھانے والا

اسناد اور نہ پڑھائی کا اچھا سا ماحول ہے۔ وہ اپنے باپ کو شہر لے جانا چاہتے تھے مگر ٹبر کا دادا جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ بیٹوں نے مقدور بھر کوشش کی مگر ٹبر کا دادا ماٹریا پہاڑ کی چٹان کی طرح اٹل رہے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بھلا کون عاشق ایسا ہے جو اپنے محبوب سے دوری قبول کر سکتا ہے؟ "اب تو میرا جینا اور مرنا دونوں یہیں پر ہوں گے"۔ یہ کہہ کر بیٹوں کے ساتھ جانے کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر پورٹ لوئس چلے گئے۔

مجھے جب بھی فرصت ملتی ہے، مہینے دو مہینے میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ٹبر کا دادا کے یہاں ضرور جاتا ہوں۔ ہماری عادت ہے کہ سنیچر کے روز صبح گھر سے نکلتے ہیں اور تقریباً دس بجے ٹبر کے دادا کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ رات وہیں گزارتے ہیں اور اتوار کو دوپہر کے وقت وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ یہ دو دن میرے اور بچوں کے لیے بہت ہی خوش گوار ثابت ہوتے ہیں۔ ٹبر کا دادا بھی بہت ہی خوش نظر آتے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک جاتے ہیں۔ میری منّی کو گود میں اٹھا لیتے ہیں اور اپنے گلے سے چمٹا کر دیوانہ وار بوسہ لینے لگتے ہیں۔ وہ منظر دیکھ کر کسی کا دل پسیج سکتا ہے۔ بچوں کو بھی ان سے بےحد انس ہے۔ وہ بچوں کو گھمانے لے جاتے ہیں۔ کبھی دکان لے جاتے ہیں اور مٹھائیاں خرید کر دیتے ہیں۔ وہ بچوں کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بچے ان سے اکثر ماٹریا پہاڑ کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھتے ہیں۔ وہ مزے لے لے کر بہت سی پرانی باتیں سنایا کرتے ہیں۔ یہ پہاڑ تو اپنی مقامی روایتی کہانیوں کی وجہ سے بہت ہی مشہور رہے۔ ٹبر کا دادا اس پہاڑ کے متعلق جن، پری، شہزادے اور شہزادی کی کہانیاں اتنے اچھے انداز میں سناتے ہیں کہ بچے اسکول کا کام بھول بھال کر بڑی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ جادو کے اثر سے شہزادے کا پتھر بن جانا اور دوسرے مافوق الفطرت واقعات بہت ہی مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

وہ کبھی کبھی بچوں کو ندی پر گھمانے لے جاتے ہیں۔ "یہ تالاب دیکھو۔ اس میں اتنے موٹے موٹے جھینگے ملتے تھے"۔ اپنی سکڑی ہوئی انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہتے "یہ کھیت دیکھو" یہاں پر میں نے ہی سب سے پہلے مکئی کی کاشت کی تھی۔ مکئی کے اتنے لمبے

لمبے خول ہوتے تھے جو آج تک میں نے نہیں دیکھے ہیں۔ ساری ملکیاں جنگ عظیم کے دوران غذا کے طور پر محلے والوں کے کام آئیں۔" وہ کبھی مڑ یا پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولتے "صدیوں سے مڑیا پہاڑ کا پورا وجود جھاڑیوں، پیناور درختوں اور چٹانوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اب اس کی ڈھلان زمینوں پر بھی گنّے کی کاشت ہونے لگی ہے۔"

جب وہ تھک جاتے تب گھر واپس آتے۔ ان کے آنگن میں جو دو فینبے آم کا موٹا سا پیڑ ہے، اس کے نیچے سب بچوں کو بٹھا کر کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کے بچّے بھی آجاتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جہاں بٹر کا دادا بیٹھتے ہیں وہاں کہانیاں ضرور سنائی جاتی ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں اُبالا ہوا مانیوک (manioc) ہے جس پر دھنیے کی چٹنی لگائی ہوئی ہے۔ کسی کے ہاتھ میں پراٹھے کا ٹکڑا ہے جس میں گوبھی کا اچار ملایا ہوا ہے۔ ان بچّوں میں کسی کا نام سریش تھا تو کسی کا نام یوسف۔ کسی کا رام ناتھ اور پول بھی تھا۔ نہ رنگ کا امتیاز اور نہ نسل کا فرق ہوتا۔ ان کا ایک ہی مذہب ہوتا جس کی بولی محبّت ہوتی۔ تحریروں اور تقریروں میں کہا گیا ہے کہ مورشیس دنیا میں ایک چھوٹی سی اقوام متحدہ (United Nations) کی حیثیت رکھتا ہے۔ لالورا میں اس خیال کو عملی جامہ پہنا کر اس کی تصدیق بھی کر دی گئی ہے۔

ان بچّوں کے علاوہ نوجوان لوگ اور بوڑھے بھی آجاتے ہیں۔ سب ہی لوگ بٹر کا دادا کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ متّی کو اپنی گود میں لیے اس کی نازک انگلیوں کو اپنی ڈاڑھی میں بار بار اس طرح پھرواتے ہیں جیسے کوئی نوجوان نئی وضع کی تراشی ہوئی داڑھی میں بار بار کنگھا کر رہا ہو۔ "ارے بلدیو! تم کو معلوم ہے میری گود میں یہ متّی کون ہے؟" "ارے یہ میرے پوتے کی بیٹی ہے رے۔" یہ کہہ کر متّی کے دونوں گالوں میں بوسہ لے لیتے اور ان کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔

اتفاق سے پچھلی عید الفطر کے موقع پر عید کی نماز ادا کرنے کے بعد ہم بٹر کا دادا کے یہاں گھومنے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک بڑے تہوار کا دن ہم ان کے یہاں گزار رہے تھے۔ لیکن خلاف عادت بٹر کا دادا کے استقبال میں وہ جوش و خروش نہیں تھا۔ وہ

جوش و خروش نہیں تھا۔ وہ چہل پہل اور رونق نہیں تھی۔ ان کے چہرے پر خوشیوں کے وہ آثار بھی مفقود تھے جو حسبِ معمول نظر آتے تھے۔ اس کے برعکس چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ غمگینی، مایوسی اور خاموشی تھی۔ میں سمجھا کہ ٹبر کا دادا بیمار ہیں۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے دادا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔" دادا نے جواب دیا۔

"لگتا ہے کہ آپ بیمار ہیں۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ ہمیں افسوس ہے۔ ہم غلط موقعے پر آگئے ہیں۔"

"نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایسا کہہ کر میرے دل کو اور دکھی مت کرو۔ تم سب بیٹھو۔ کھانا پکا ہوا ہے۔ کھانا کھاؤ۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں آ جاؤں گا۔" ٹبر کا دادا نے سماجت کے لہجے میں کہا۔

"لیکن آپ جاتے ہیں کہاں؟ آپ کی پریشانی کیا ہے؟ آپ کو سب کچھ بتانا ہوگا۔" میں نے زور دے کر کہا۔

وہ خاموش کھڑے رہے۔ میں نے منت سماجت کی۔ لیکن ٹبر کا دادا کچھ بتانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ گویا انھوں نے ان رازوں کو اپنے سینے میں ہمیشہ کے لیے دفن کر رکھا ہے۔ میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ ان کی پریشانی اور غم کا سبب معلوم کر کے رہوں گا۔ میری بیوی حیرانی کے عالم میں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی اور بچے بھی ٹبر کا دادا کا اداس چہرہ دیکھ کر پریشان تھے۔ منّی میری گود میں مایوس کن انداز میں خاموش تھی، شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ کیا بات ہے، آج ٹبر کا دادا مجھے اپنی گود میں کیوں نہیں لیتے ہیں۔ مجھے بوسہ کیوں نہیں دیتے؟

میں نے آخری حربہ استعمال کیا۔ "چلو منّی۔ ہم گھر چلیں۔ آج دادا ہم سے ناراض ہیں۔" یہ سننا تھا کہ ٹبر کی دادا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ میں بھی آبدیدہ ہوگیا۔ منّی کی ماں سسکنے لگی۔ "نہیں بیٹا! ایسا ظلم نہ کرو۔ میں سب کچھ بتادوں گا۔" ٹبر کا دادا نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ٹبر کا دادا نے منّی کو میری گود سے چھین کر اپنے گلے سے بھینچ لیا اور دیوانہ وار منّی کو بوسہ دینے لگے۔ آنسوؤں سے ان کی داڑھی تر ہوگئی۔ منی اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے داڑھی

میں کنگھا کر رہی تھی۔

"بیٹی تم جاؤ۔ کھانا کھا لو اور بچّوں کو بھی کھلاؤ۔" منّی کو اس کی ماں کے حوالے کرتے ہوئے دادا مخاطب ہوئے۔ "ہم تھوڑی دیر پہ واپس آتے ہیں۔" میں دادا کے ساتھ ہو لیا۔

بڑ کا دادا پہاڑی راستے پر جلدی جلدی چل رہے تھے۔ ان کے چلنے کی تیز رفتاری پر مجھے تعجب ہوا کہ وہ اس عمر میں اس طرح کیوں کر چل سکتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ چلنے کے بعد وہ تھک گئے۔ وہ ہانپنے لگے۔ راستے میں کافی چڑھائی تھی۔ ایک سایہ دار یوکلپٹس (Eucalyptus) کے نیچے سستانے کی غرض سے بیٹھ گئے۔ ان کا سانس پھول رہا تھا۔ میرے دل و دماغ میں خیالوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے۔ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

جب ان کی حالت معمول پر آئی تو میں خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔ "دادا آپ نے بتایا نہیں کہ مجھے کہاں لیے جا رہے ہیں؟" وہ پہاڑ کی طرف گھورنے لگے۔ گویا پہاڑ سے یہ راز فاش کرنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ پھر بولے۔ "بیٹا! یہ ایک بہت ہی پرانی اور درد بھری کہانی ہے۔" یہ سننا تھا کہ کہانی سننے کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ "اب آپ اپنی کہانی سنا ہی ڈالیں، تب ہم آگے بڑھیں گے۔" میں نے بیتابی کے ساتھ کہا۔

بڑ کا دادا نے کہانی یوں شروع کی۔ بیٹا! آج میں تم کو وہ باتیں سناؤں گا جو میرے بچپن میں میرے مرحوم والد نے مجھے سنائی تھیں۔ اس کہانی میں ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن کو سننے کے بعد تمھارے دل کو چوٹ ضرور پہنچے گی مگر ساتھ ساتھ تمھارے بزرگوں نے جو قربانیاں دی ہیں، ان کے بارے میں علم تو ہو جائے گا۔

میرے والد مرحوم کہتے تھے کہ آج سے بہت سال پہلے جب کہ وہ خود پیدا نہیں ہوئے تھے اس جزیرے سے دور، بہت دور، سمندر کے اس پار، ہندوستان کی سرزمین سے ہمارے بہت سے آدمی کھیتی باڑی کرنے کے لیے یہاں لائے گئے تھے۔ ان کو لالچ دیا گیا تھا کہ اس جزیرے میں پتھر الٹیں گے تو زمین سونا اگلے گی۔ ڈھیر ساری دولت جمع کر کے واپس ہندوستان چلے جائیں گے۔ کتنے معصوم بچّے اپنے ماں باپ سے جدا کر دیے گئے تھے۔ کتنی بیویاں اپنے شوہروں سے بچھڑ گئی تھیں۔ کتنے بھائیوں کو اپنی بہنوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ بڑ کا دادا

نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میرے والد مرحوم کہتے تھے کہ ان آنے والے مزدوروں میں ان کے باپ بھی تھے۔ موریشس کی بندرگاہ پر اُترتے ہی وہ لوگ مختلف گورے سرمایہ داروں کے ہاتھوں بیچ دیے گئے۔ بالکل جس طرح آج کل مرغیوں اور بکریوں کے دام لگائے جاتے ہیں۔

بعض گورے مالک نیک دل ہوتے تھے مگر ان میں اکثر برے اور ظالم ہوتے تھے۔ وہ لوگ مزدوروں کو زر خرید غلام سمجھ کر ان پر ظلم وستم ڈھاتے تھے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کرتے تھے۔

اتفاق سے لالوراکی کوٹھی کے مالک مسیئے فلپ (Mons. Philip) بیس مزدوروں کی ایک ٹولی خرید کر یہاں لائے۔ ان میں دو جوان لڑکیاں بھی تھیں سلمہ اور فریدہ۔ میرے دادا اس وقت جوان تھے۔ ان کا سینہ چوڑا اور گٹھا ہوا بدن تھا۔ اپنی ہمت اور مضبوطی کی وجہ سے وہ پہلوان مشہور تھے۔ ان کا نام جعفر تھا مگر ٹولی بھر میں جعفر پہلوان سے موسوم تھے۔

سلمہ ایک سادہ سی معصوم مگر نہایت خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص کشش تھی۔ میرے دادا کو سلمہ سے محبت ہو گئی اور اسی ٹولی کے ایک بزرگ نے دونوں کا نکاح بڑی سادگی کے ساتھ پڑھا دیا۔ وہ دونوں مشقت کی زندگی گزارتے تھے مگر آپس کی محبت سے جو دلی سکون میسّر ہوتا تھا، اس سے وہ بے حد مسرور رہتے تھے۔

یہیں پر لکڑی کی بنائی ہوئی ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ وہ جھونپڑی گنّے کے سوکھے پتّوں سے چھائی ہوئی تھی اور نیچے کا فرش گائے کے گوبر سے لیپا ہوا تھا۔ اسی جھونپڑی میں میری دادی نے تین بچّوں کو جنم دیا۔ سب سے پہلے میرے چچا اکبر پیدا ہوئے۔ تین سال بعد میری پھوپھی زبیدہ کی پیدائش ہوئی اور آخر میں میرے والد جن کا نام اصغر تھا، پیدا ہوئے۔

اس زمانے میں آج کی طرح گھر میں آرام وآسائش کا کوئی سامان نہیں تھا۔ نہ پلنگ نہ الماری، نہ نرم بستر اور نہ کوئی قیمتی قالین تھا۔ بچّوں کی ولادت کے لیے کوئی ماڈرن زچّہ خانہ بھی نہ تھا جس طرح آج کل ماڈرن میٹرنٹی ہوم (Maternity home) ہوا کرتے ہیں۔

آج کی طرح وٹامن، کالشیم وغیرہ کا کوئی بندوبست ممکن نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ جنگل سے آم، جامن اور امرود وغیرہ توڑ کر کھا لیتے تھے۔ جن کو ندی کا تجربہ تھا ان کو مچھلیاں اور جھینگے کھانے کو مل جاتے تھے اور جس کے پاس بڑے صاحب کی دی ہوئی تھوڑی سی زمین ہوتی تھی، اس میں وہ سبزیاں بولیا کرتے تھے۔ گوشت مہینے میں کبھی میسّر نہ ہوتا۔

دن بھر کھیت میں بیل کی طرح کام کرنے کے بعد مہینے میں سات روپے تنخواہ کے طور پر ملتے۔ اور کھانے کے لیے ڈیڑھ پونڈ چاول روزانہ ملتا تھا۔ ہفتے بھر کے لیے آدھ پونڈ دال، آدھ پونڈ نمکین مچھلی، آدھ پونڈ تیل اور سو گرام نمک ملتا تھا۔

سونے کے لیے گوبر سے لیپے فرش پر واکوا (Vacoas) کے سوکھے پتّوں سے بنائی ہوئی چٹائی بچھائی جاتی تھی۔ سردی کے موسم میں یہی چٹائی اوڑھی جاتی تھی۔ وہ ہر دکھ اور ہر ظلم کو خوشی کے ساتھ سہہ لیتے تھے۔ وہ گوروں کے ہنٹر کھا کر بھی خوش تھے کیونکہ گھریلو زندگی محبّت اور سکون سے لبریز تھی۔ گویا یہی محبّت ان کے زخموں پر پٹّی کا کام کرتی تھی۔ ایک لمبے عرصے تک ان کی زندگی اسی طرح گزرتی گئی۔ صبح کے وقت چڑیوں کی پہلی چہچہاہٹ کے ساتھ کھیتوں میں ان کے پھاوڑے چلنے لگتے تھے۔ اور شام کے ساتھ جب چڑیاں اپنے گھونسلوں میں آکر تسبیح خوانی میں مصروف ہو جاتی تھیں تب جا کر ان کے پھاوڑے رکتے تھے۔ ننگی پیٹھ چلچلاتی دھوپ میں جھلس جاتی تھی۔ اس پر گوروں کے کوڑے برسائے جاتے تھے۔ پیٹھ لہولہان ہو جاتی تھی اور پسینے سے گھاؤ میں جو لہر اور درد پیدا ہوتا تھا، اس سے وہ اور تیزی سے پھاوڑے چلانے لگتے تھے۔ جس طرح آج کل گھڑ دوڑ میں گھوڑوں کو تیز دوڑانے کے لیے کوڑے لگائے جاتے ہیں۔

اس زمانے میں ہر مزدور کے لیے چند دستاویزات کا ہونا لازمی تھا۔ یہ دستاویزات ایک پہچان کارڈ، ایک فوٹو۔ پیدائش نامہ اور ایک ضلعے سے دوسرے ضلعے میں آنے جانے کے لیے ایک پولیس پاس (Police pass) پر مشتمل تھے۔ ان میں سے ایک کا کھونا جان کے کھونے کے برابر تھا۔

آہ! وہ ظلم اور مصیبت خدا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔" ٹمر کا دادا نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ جانتے ہو بیٹے۔ ان کی تقدیر کا دوش تھا۔ میرے دادا کے تینوں بچے جوان ہو گئے وہ سمجھے کہ اب دکھ بھرے دن بیت گئے اور چین کا سانس نصیب ہو گا۔

ان کی بد قسمتی کہ جھونپڑی میں آگ لگ گئی۔ کپڑے، لتے، برتن سب جل کر خاک ہو گئے۔ گھر میں ایک تنکا بھی نہ بچ سکا۔ پڑوس کی ایک دوسری جھونپڑی میں کچھ دنوں کے لیے وہ سب رہنے لگے۔ موکا کے تھانے سے پولیس والے اکثر گشت کیا کرتے تھے۔ اتنے زیادہ لوگوں کو ایک ہی جھونپڑی میں رہتے ہوئے دیکھ کر پولیس والوں کو شک ہوا کہ یہ لوگ بھاگے ہوئے غلام ہیں۔ ان سے فوٹو، پہچان کارڈ، پیدائش نامہ اور پولیس پاس طلب کیا گیا۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ آگ لگنے سے سب دستاویزات جل گئے۔

وہ لوگ نہ مانے میرے دادا، اکبر چچا اور میرے والد کو باندھ کر موکا لے گئے۔ وہاں پر تینوں کو خوب پیٹا گیا۔ ان کو دو دن تک حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تینوں کو مجرم قرار دے کر چار چار مہینے با مشقت قید کی سزا سنائی گئی۔

ٹمر کا دادا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ کہانی جاری رکھتے رہیں۔ دادی اور زبیدہ پھوپی رو رو کر اپنی آنکھیں کھو رہی تھیں۔ آخر وہ تھک ہار کر رہ گئیں۔ ان کو اپنا پیٹ بھی تو پالنا تھا۔ وہ دونوں مسٹر فلپ کے کھیت میں دن بھر کام کر کے اپنا گزارا کرتی تھیں۔ فلپ کا ایک بیٹا تھا جو بہت ہی بدکردار اور بدمعاش تھا۔ وہ ہر چیز پر اپنا حق جتانا چاہتا تھا۔ وہ شیطان پھوپھی کا شباب لوٹنے کی تاک میں تھا۔ ایک دن ماں بیٹی دونوں کھیت میں کام کر رہی تھیں۔ وہ بدمعاش وہاں پہنچا۔ موقع پا کر اس بیچاری پر جھپٹ پڑا جیسے ایک بھوکا شیر کسی کمزور ہرن کو دبوچ لیتا ہے۔ وہ بے بس ہو کر چلاتی رہی مگر اس درندے نے اسے اپنی ہوس کا شکار بنا کر اس کی عصمت لوٹ ہی لی۔ دادی اپنی معصوم بچی کو بچانے آئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں پھاوڑا تھا۔ وہ اس درندے کو مارنا چاہتی تھی کہ اس ظالم نے وہ پھاوڑا چھین کر دادی کے سر پر اس زور سے مارا کہ وہ وہیں پر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس دن کے بعد زبیدہ پھوپھی کی صورت کسی نے پھر کبھی نہیں دیکھی۔

"گاؤں میں کسی نے اس کا بدلہ نہیں لیا؟" میں نے بُٹر کا دادا سے پوچھا۔

"کس میں بدلہ لینے کی ہمت تھی۔ سب مزدور گوروں سے اس طرح ڈرتے تھے جیسے چوہے بلی سے۔" بُٹر کا دادا نے جواب دیا۔

دادا، اکبر چچا اور والد صاحب قید کی مدت کاٹ کر جب گھر آئے تو دادی اور پھوپھی کے حشر کی خبر پاکر غم و غصے میں اپنے ہوش و ہواس کھو بیٹھے۔ دادا کی دل کی دھڑکنیں تھوڑی دیر کے لیے تیز ہوگئیں اور پھر ہمیشہ کے لیے وہ دھڑکنیں بند ہوگئیں۔

اکبر چچا غم کی شدت سے تلملا اُٹھے اور غصے سے کانپنے لگے۔ اپنے باپ کی میت وہیں چھوڑی اور گنے کاٹنے والا تیز گنڈاسہ لیا اور اس بدمعاش کی تلاش میں نکلے۔ انتقام کی آگ میں وہ جل رہے تھے۔ اتفاق سے وہ درندہ اپنے دوستوں کے ساتھ خرگوش کا شکار کرتا ہوا ملا۔ اکبر چچا نے اس بدمعاش پر اتنے زور سے وار کیا کہ اس کی شہ رگ کٹ گئی۔ اور اس کا سارا خون بہہ گیا۔ وہ وہیں پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے دوست یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا گئے اور گھبراہٹ کے عالم میں چچا پر گولی چلا دی۔ گولی سینے پر لگی اور وہ بھی جنت کو سدھار گئے۔

اس سانحۂ عظیم کی خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ایک خوفناک ماحول چھا گیا۔ چاروں طرف سراسیمگی کا عالم تھا۔ سورج ڈوبنے کے بعد میرے والد اپنے بھائی کی لاش لانے گئے۔ گوروں نے دیکھ لیا۔ ان پر بھی حملہ کردیا۔ والد صاحب کو بری طرح پیٹا گیا۔ ڈنڈے سے ان کے ٹخنے پر اتنے زور سے مارا کہ وہاں کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ سر پر بھی گہری چوٹ لگی۔ وہ بیہوش ہوگئے۔ گوروں نے سمجھا کہ وہ مرگئے۔ مگر خوش قسمتی سے ان کی حیات باقی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا زندہ رہنا منظور تھا مگر وہ چلنے کے قابل نہ رہے۔ وہ ٹھیک ہونے کے بعد بیساکھی کا سہارا لے کر چلتے تھے۔ اسی بیساکھی کے سہارے اپنی زندگی گزار لی۔ میرے والد مرحوم اپنے باپ، بھائی، بہن اور ماں کا غم اپنے سینے میں لیے زندہ رہے۔

"جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، کبھی اپنے والد کو خوش و خرم نہیں پایا۔" بُٹر کا دادا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ "وہ ہمیشہ کھوئے کھوئے سے رہتے

تھے۔ جب میں بڑا ہوا، ان کی دیکھ بھال کے قابل ہوا، سوچا کہ اب میں ان کی زندگی کا سہارا بنوں گا۔ ان کی مدد کروں گا اور ان کے آنسو پونچھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن میری بدقسمتی کی انتہا بھی دیکھو لو کہ اسی زمانے میں جزیرے بھر میں کالرا (Cholera) کی وبا پھیلی۔ اسی میں وہ مبتلا ہو کر مجھے داغ مفارقت دے گئے۔ مجھے اس دنیا میں تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے۔

یہ کہہ کر بڑ کا دادا چپ ہو گئے۔ گویا ان میں بات کرنے کی تاب نہ تھی۔ پہاڑ کی طرف ٹکٹکی باندھے معلوم نہیں کیا دیکھ رہے تھے۔ یکایک اس سایہ دار یوکلپٹس پر چند میناؤں کی کائیں کائیں نے بڑ کا دادا کو چونکا دیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ”چلو میں تمھیں ان سب کی قبروں کی زیارت کراؤں گا۔ پہلے تو میں روز آیا کرتا تھا۔ عقیدت کے چند پھول چڑھانے۔ مگر اب طاقت نے جواب دے دیا ہے اس لیے روز تو نہیں آسکتا۔ مگر بڑے بڑے تہواروں کے موقعوں پر ان کی زیارت کرنے ضرور آتا ہوں۔ عیدالفطر کے دن تو ان کی یاد اور زیادہ آتی ہے۔“

بڑ کا دادا کی زبانی یہ دردبھری کہانی سنی تو میں اشکبار ہو گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل پر ایک تیز چھری چل رہی ہے۔

”چلو دادا۔ آج ہم بھی اپنے ان بزرگوں کی زیارت کر لیں جنھوں نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں۔“

ہم دونوں قبرستان کی طرف خاموشی سے بڑھ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ لوگوں کا یہ خیال کتنا غلط ہے کہ مٹریا پہاڑ صرف اپنی روایتی کہانیوں کے سبب مشہور ہے۔ نہ جانے اس نے اس قسم کی سیکڑوں کہانیوں کی چشم دید گواہی دی ہے

عنایت حسین عیدن

ڈراما

رام بھروسے چاچا

رمضانی نماز پڑھ کر دعا مانگ رہا ہے۔

رمضانی :۔ اے پاک پروردگار تو ہی مددگار ہے۔ تو ہی پالنہار سب تجھ سے یہی التجا ہے کہ مجھے جلد سے جلد سہی سلامت میرا گاؤں واپس کرادے مجھے میرا دیس واپس کرادے، تاکہ میں اپنا گاؤں دیکھ سکوں اپنے آم کے پیڑ دیکھ سکوں۔ ہرے بھرے کھیت دیکھ سکوں اور اپنے سب لوگوں سے مل سکوں۔ اے خدا تو بہت جلدی مجھے یہاں سے گھر واپس بھیج دے۔ میرے آم کے پیڑ میں تو بہت آم لگ گئے ہوں گے۔ اے مالک وہ دن جلدی سے آجائے کہ میں اس پیڑ کے آم کھا سکوں۔ اے مالک میں جانتا ہوں کہ پانچ برس ختم ہونے میں دو تین ہی ہفتے رہ گئے ہیں۔ اب تو یہ دن بھی کاٹے نہیں کٹتے۔ پاک پروردگار جلدی مجھے واپس میرے گاؤں میں بھیج دے۔

(رام داس آواز دیتا ہے)

رام داس :۔ رمجانی ارے او رمجانی۔ کہاں ہو؟

رمضانی :۔ آؤ بھائی رام داس آؤ۔

رام داس :۔ (داخل ہوتا ہے) بھائی معافی چاہتا ہوں۔ تمھاری نماز میں دخل دیا۔

رمضانی :۔ نماز تو کب کی پوری ہو چکی ہے۔ بس دعا مانگ رہا تھا۔

رام داس :۔ ہاں ہاں، پھر وہی دعا نہ کہ بھگوان تمھیں جلدی گاؤں واپس کرادے۔

رمضانی :۔ اس کے علاوہ اور مانگنا ہی کیا ہے۔

رام داس :۔ ہم لوگوں کے پاس اب تو اپنے گاؤں کی یاد ہی سب کچھ ہے، کیا زمانہ تھا

گاؤں کے کھیت، گاؤں کے لوگ، گاؤں کا پنگھٹ سبھی کچھ ایک ایک کر کے یاد آتے ہیں۔ نہ جانے اب ہم کب وہاں لوٹ سکتے ہیں۔

رمضانی: پر کیا کریں۔ پانچ سال تو گزارنے ہی ہیں۔ اس پیٹ کی خاطر ہمیں سب کچھ چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔

رام داس: جب سے فرنگی ہمارے ملک میں آئے ہیں سب کچھ ستیا ناس ہو رہا ہے۔

رمضانی: اور یہ فرنگی ہمارا پیچھا یہاں بھی نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کو تو لوٹ رہے ہیں ہی اور اب یہاں بھی ہمارا خون چوس رہے ہیں۔

رام داس: ہماری تو تقدیر بھی تو پھوٹی ہے۔

(رام بھروسے داخل ہوتا ہے)

رمضانی: آئیے رام بھروسے چاچا۔ آئیے یہاں بیٹھیے۔

رام بھروسے: میں بیٹھوں گا نہیں۔ بس تم سے یہی کہنے آیا تھا کہ بٹیا کی شادی کا مہورت نکل گیا ہے۔ شادی اگلے پورنماشی میں ہوگی۔

رمضانی: چاچا مبارک ہو۔ یہ بڑی اچھی خبر ہے۔

رام داس: ہاں چاچا، ہم تو بڑی دھوم دھام سے شادی منائیں گے۔

رام بھروسے (سرد آہ بھر کر) ہاں بیٹا۔

رام داس: ہم بالکل اپنے گاؤں کی طرح یہاں بھی شادی منائیں گے۔

رام بھروسے: کاش کہ ہم ایسا ہی منا سکتے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔

رمضانی: ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کچھ دیر بیٹھیے۔ حقّہ لاؤں۔

رام بھروسے: پھر کسی وقت۔ ابھی تو جلدی میں ہوں۔

رمضانی: ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم لوگوں کو بھی تو کوئی کام بتائیے۔ آخر ہم لوگ ہیں کیوں

رام داس: ہاں چاچا، ہمارے ہوتے ہوئے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔ آئیے بیٹھیے۔

رام بھروسے: اس وقت جلدی میں ہوں۔

رمضانی: مجھے بتائیے میں آپ کا کام کر دیتا ہوں۔

رام بھروسے :۔ بیٹا تم نے کھیت میں ہمیشہ ہماری مدد کی ہے۔ بھگوان ہی جانتا ہے کہ تم نے کن کن مصیبتوں سے مجھے بچایا ہے۔ اب اور کیوں بوجھ بنوں۔

رمضانی :۔ تو کیا ہم لوگ آپ کے لیے غیر ہیں۔ آپ ضعیف ہیں۔ آپ میں اب اتنی طاقت نہیں کہ سورج کے نکلنے سے سورج کے ڈوبنے تک کام کرتے رہیں۔ آپ کی مدد کرنا تو ہمارا فرض ہے۔

رام بھروسے :۔ یہ تو تم لوگوں کی محبت ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔

رمضانی :۔ مگر چاچا یہ تو بتائیے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔

(رام بھروسے چلا جاتا ہے)

رام داس :۔ چاچا بہت پریشان اور اداس نظر آرہے ہیں نا۔

رمضانی :۔ بیٹی کی شادی جو ہے۔ ابے رام داس تم کب شادی کر رہے ہو؟

رام داس :۔ جب تم کرو گے۔

رمضانی :۔ میں تو واپس جا کر گاؤں ہی میں شادی کروں گا۔

رام داس :۔ اور میری یہیں پر شادی کروانا چاہتے ہو۔ یار میں بھی تو دن گن رہا ہوں ایک بار یہ پانچ برس گزر جائیں۔ پہلے ہی جہاز سے وطن واپس چلے جائیں گے۔ اچھا تم بتاؤ۔ وہاں جا کر کیا کرو گے۔

رمضانی :۔ سب سے پہلے تو میں وہاں جا کر ایک کھیت لوں گا اور ایک اچھا سا گھر بناؤں گا۔

رام داس :۔ اور پھر شادی کرو گے۔

(دین دیال نشے میں داخل ہوتا ہے)

دین دیال :۔ کون ہے رے... میرا راستہ کیوں روک رہا ہے۔

رام داس :۔ آج پھر نشے میں چور ہے۔

رمضانی :۔ چلو اسے پکڑ کر اس کے کمرے میں رکھ دیں۔ آج تو بہت پی چکا ہے۔ خدا خیر کرے۔ اس کو غم کھائے جا رہا ہے۔

دین دیال :۔ رمضانی۔ رمضانی۔ آؤ۔ یہاں آؤ۔ تم واپس وطن جا رہے ہو نا۔

رمضانی :- ہاں دین دیال چاچا۔ اللہ نے چاہا تو جاؤں گا۔

دین دیال :- جاؤ۔ بیٹا جاؤ۔ اب تو ہمارا وہاں کیا رکھا ہے۔ سب کچھ برباد ہو گیا۔ سب کچھ۔ سیلاب آیا اور سب لوگ ندی میں بہہ گئے... سب...

رام داس :- بس کیجیے چاچا۔ بس کیجیے۔

(دین دیال زار و قطار رونے لگتا ہے)

رمضانی :- بس چاچا اللہ کی مرضی تھی۔ آپ چاچی اور بچوں کے لیے دعا مانگیے

رام داس :- چلیے میں آپ کو کٹیا میں چھوڑ آتا ہوں۔

(رام داس دین دیال کو لے کر چلا جاتا ہے)

رمضانی :- بیچارے کے بیوی بچے سب سیلاب میں بہہ گئے۔ کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ یا اللہ میرے ماں باپ بھائی بہنوں اور سب دوستوں کو صحیح سلامت رکھنا۔ اُن پر کوئی مصیبت نہ آئے۔

(پردہ گر جاتا ہے)

دوسرا سین

(رمضانی سامان باندھ رہا ہے۔ ایک چادر میں کپڑے رکھ رہا ہے اور پھر اُسے گٹھری بنائے گا۔ رتنو سردار داخل ہوتا ہے۔ یہ مدراسی ہے)

رتنو :- ارے رمضانی میں پھر سے کہے دیتا ہوں۔ مت جاؤ۔ یہیں کام کرو۔ کتنے مزے کی زندگی ہے۔ رک جاؤ۔ میں بڑے صاحب سے مل کر تمھیں پھر سے بھرتی کروا دوں گا۔

رمضانی :- رتنو سردار میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ جانا ہو گا۔

رتنو :- مگر وہاں جاکر کرو گے کیا۔ پھر بھوکے مرو گے۔ دیکھو اب کی بار پھر سے تمھیں شاید یہاں آنے کا موقع نہ ملے۔ جاؤ اپنا سامان واپس رکھو۔

رمضانی :- نہیں رتنو سردار مجھے جانا ہو گا۔

رتنو :- یہاں کوئی تکلیف ہے کیا۔

رمضانی :- یہاں کی زندگی کون سی جنّت کی زندگی ہے۔ اتنی ہی محنت اپنے گاؤں میں کرتا تو آج کیا سے کیا ہو جاتا۔

رتنو :۔ میں ایک بار اور کہتا ہوں رمضانی رک جاؤ۔ تم یہیں رہو۔

(رام داس داخل ہوتا ہے)

رام داس :۔ کیوں رتنو سردار۔ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟

رتنو :۔ اب چپ۔ تمھیں اس سے کیا مطلب۔ رمضانی تم پھر سے سوچو۔

(رتنو سردار نکل کر جاتا ہے)

رام داس :۔ تیاری ہو گئی رمجانی۔ میں تو تیار ہوں۔ لاؤ کیا کرنا ہے۔

رمضانی :۔ دیکھو ایک ڈوری ادھر پڑی ہوئی ہے۔ اسے لے آؤ۔

رام داس :۔ یہ لو۔ بھئی اس کو اس طرح رکھو (سامان کو اِدھر اُدھر کرتا ہے۔) تمھارے پتا جی اور تمھاری ماتا جی کے لیے یہ کمبل بہت فائدہ مند ہوں گے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ ان لوگوں کے لیے یہ خرید لیے ہیں۔

رمضانی :۔ پتہ نہیں کہاں سے ایسے ملک میں آگئے ہیں جہاں کوئی اچھی چیز بھی ملتی ہی نہیں۔ اپنی بہن کے لیے ایک خوبصورت نکلیس ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا اور آخر کار یہی جا کر ملا۔

رام داس :۔ تم تو بڑے خوش نصیب ہو کہ گھر کے لیے چند چیزیں لے جا سکتے ہو۔ ہمارا تو نہ جانے کیا حال ہوگا۔

رمضانی :۔ ہمت نہیں ہارو۔ ہم دونوں بہت جلدی اپنے گاؤں میں ملیں گے۔ یہ دیکھو۔

رام داس :۔ یہ نکلیس کس کے لیے؟

رمضانی :۔ تم ہی اندازہ لگاؤ۔

رام داس :۔ شاید ہماری ہونے والی بھابی کے لیے۔

رمضانی :۔ ہٹ تیری کی۔ یہ کیا بھابی بھابی لگا رکھی ہے۔

رام داس :۔ تو پھر کس کے لیے۔

رمضانی :۔ جب میں تمھارے گھر جاؤں گا تو تمھاری بہن یہ نہیں سوچے گی کہ میرے بھیا اگر آتے تو میرے لیے کچھ لاتے۔ اسی لیے جہاں میں اپنی بہن کے لیے ایک نکلیس

لیے جا رہا ہوں وہاں تمھاری بہن کے لیے بھی ایسے ہی نکلیس لیے جا رہا ہوں۔ آخر وہ بھی تو میری بہن ہے۔

رام داس:۔ (رمضانی سے جذبے کی رو میں بہہ کر گلے مل لیتا ہے) یار تمھارا احسان اور تمھاری محبت میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ مگر اتنا قیمتی نکلیس.....

رمضانی:۔ بس بس دوستی اور محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے۔ جلدی کرو۔ سامان باندھنے میں مدد کرو۔ راستہ کافی لمبا ہے۔ رات ہونے سے پہلے شہر تک پہنچ جانا ہے۔

(دین دیال داخل ہوتا ہے)

دین دیال:۔ رمضانی۔

رمضانی:۔ دین دیال چاچا۔ آپ۔ آئیے آئیے بیٹھیے۔

دین دیال:۔ رمضانی۔ تم میرے لیے ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہو۔

رمضانی:۔ ہاں چاچا۔ ایک کیا۔ جتنا کام ہو بتائیے۔ میں کرنے کو تیار ہوں۔

دین دیال:۔ بیٹا تم کو تو میرا گاؤں معلوم ہے نا

رمضانی:۔ جی ہاں۔ ہمارے گاؤں سے بیس کوس دور ہے۔ رام گھاٹ کے قریب۔

دین دیال:۔ ہاں۔ وہاں جانا۔ وہاں ایک مندر ہے۔ وہاں پر مندر کے دروازے پر ایک اپاہج بھکاری ہوگا۔ اسے یہ سو روپے دے دینا۔

رام داس:۔ سو روپے.....

دین دیال:۔ ہاں سو روپے دے دینا۔ بیچارے کو میرا آسرا ہوگا۔ گاؤں چھوڑتے وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ میرے بال بچے ان کا خیال کریں گے۔ لیکن اب تو کوئی نہیں رہا۔ بیچارے کا نہ جانے کیا حال ہوا ہوگا۔ رمضانی اس کو یہ پیسہ دے دینا۔ اور کہنا کہ میرے بیوی بچوں کے لیے پرارتھنا کرے (دین دیال رونے لگتا ہے) اور میرے لیے بھی۔

رمضانی:۔ چاچا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ بھی تو چار پانچ مہینے بعد گاؤں لوٹیں گے

دین دیال :۔ گاؤں لوٹوں ..... اب کیا رکھا ہے زندگی میں ....

رمضانی :۔ چاچا۔ بات سنیے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیے .....

دین دیال :۔ بس۔ رمضانی آؤ گلے مل لو۔ کہا سنا معاف کرنا۔ بھگوان تمھیں ہمیشہ سکھ رکھے (گلے مل کر جلدی سے چلا جاتا ہے۔)

رمضانی :۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) یا اللہ دین دیال چاچا پر رحم کر۔ رام داس تم دین د چاچا کا خیال رکھنا۔

رام داس :۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اس کا خیال رکھوں گا۔

رمضانی :۔ اور رام داس کل سے رام بھروسے چاچا نظر نہیں آرہے ہیں۔

رام داس :۔ ہاں آج کام پر بھی نہیں آئے تھے۔ بلا وجہ دو دنوں کی تنخواہ کٹ جائے گی

رمضانی :۔ کتنی اچھی بات ہوتی کہ پچھلی پورنماشی ہی میں ٹبیا کی شادی ہو جاتی ہم بھی اس میں شریک ہو جاتا اور رام بھروسے چاچا کی خوشی میں شامل ہو جاتا۔

رام داس :۔ مگر رام بھروسے چاچا نے ہمیں ابھی تک نہیں بتایا کہ شادی کیوں ٹال دی گئی ہے۔

رمضانی :۔ مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ کیا لڑکے والے نہیں مان رہے ہیں کیا! لیجیے رام بھروسے چاچا آرہے ہیں (رام بھروسے داخل ہوتا ہے) آئیے چاچا آئیے بیٹھیے چاچا کیا بات ہے۔ آپ بہت اداس اور فکر مند لگ رہے ہیں۔

رام داس :۔ آپ تھکے ہوئے بھی لگ رہے ہیں۔ کہیں دور سے آرہے ہیں کیا۔

رمضانی :۔ چاچا کیا بات ہے۔ بتاتے کیوں نہیں۔

رام بھروسے:۔ بیٹیا آج تم گاؤں واپس جا رہے ہو۔ مجھے تو اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر دوسری طرف تم ہم سب لوگوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اس سے ہم لوگ بہت دکھی ہیں۔ اس کوٹھی میں ہم سب لوگ ایک ہی کنبے کی طرح جیتے ہیں۔ تم لوگ میرے بیٹے کی طرح ہو اور جب تم جا رہے ہو تو مجھے دکھ نہیں ہوگا مگر دوسری طرف خوشی بھی ہے کہ تم جو چاہتے تھے وہ اب تمھیں مل جائے گا۔

گاؤں کو بہت یاد کرتے تھے۔ بھگوان تمھیں جلدی تمھارے گاؤں میں پہنچادے۔ پر وہاں جاکر ہمیں بھلا نہ دینا۔

رمضانی :۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں چاچا۔ آپ لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ہاں ایک بات کا بہت افسوس ہے وہ یہ کہ میں ٹبیا کی شادی میں شریک نہیں ہوسکوں گا اور آپ کا ہاتھ نہ بٹا سکوں گا۔

رام بھروسے :۔ بیٹا جو قسمت میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے۔

رمضانی :۔ شادی کی تاریخ پھر طے ہوئی ہے یا نہیں ؟

رام بھروسے :۔ تاریخ تو طے ہو سکتی ہے مگر..... (رام بھروسے سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے)

رمضانی :۔ ارے چاچا۔ کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔

رام داس :۔ چاچا کیا ہوا (دونوں رام بھروسے کو سہارا دے کر بٹھاتے ہیں)

رام بھروسے :۔ یوں ہی سر چکرا گیا تھا۔

رام داس :۔ چاچا آپ کے ہاتھ پاؤں دونوں کانپ رہے ہیں۔ آپ بہت کمزور لگ رہے ہیں۔

رمضانی :۔ میں پانی لاتا ہوں۔ (پانی لاکر رام بھروسے کو پلاتا ہے) چاچا کچھ آرام کریں۔

رام داس :۔ آپ یہیں لیٹ جائیے نا۔

رمضانی :۔ چاچا آپ کہیں دور گئے تھے کیا۔ ہم سے کہہ دیا ہوتا۔ آخر اس عمر میں آپ کو دور سفر کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

رام داس :۔ اور آپ کام پر بھی نہیں آئے۔ بلا وجہ دو دنوں کی تنخواہ کٹ گئی ہے۔

رمضانی :۔ چاچا کچھ تو بتائیے۔ کیا بات ہے۔

رام بھروسے :۔ کوئی بات نہیں ہے بیٹا۔ جاؤ تم تیاری کرو۔ بہت دور جانا ہے۔ شہر بہت دور ہے۔ میری فکر نہ کرو

رام داس :۔ ہاں چاچا کو کوئی فکر کھائے جا رہی ہے۔

رمضانی :۔ وہ تو ہم کافی دنوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مگر چاچا اب تو ہمیں غیر سمجھنے

لگے ہیں۔ اپنی باتیں نہیں بتا رہے ہیں۔ ہم لوگ ایک ساتھ تو رہتے ہیں۔ اور پھر بھی آپ ہمیں غیر سمجھ رہے ہیں۔

رام بھروسے:۔ بیٹا ایسی بات نہیں۔ تم ہی لوگوں کا سہارا ہے ورنہ میں نے تو کب کا دم توڑ دیا ہوتا۔ تم لوگوں کا احسان اتنا ہے کہ بس .....

رمضانی:۔ احسان کچھ نہیں۔ آپ کو ہرگز احسان کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔

رام داس:۔ مگر آپ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔

رمضانی:۔ چاچا بتائیے کیا بات ہے۔ آپ اتنے فکر مند کیوں ہیں اور بیمار کیسے ہو گئے آپ کہاں گئے ہوئے تھے۔

رام بھروسے:۔ ویسے ہی شہر تک گیا تھا مگر کوئی کام نہیں بن پایا۔ اب تو بس .....

(دین دیال ایک اور بڈھے کو لے کر داخل ہوتا ہے۔ بڈھے کا نام رگھو بیر ہے)

دین دیال:۔ رام بھروسے دیکھو تمھیں یہ صاحب ڈھونڈ رہے ہیں۔

رمضانی:۔ آئیے چاچا۔ آپ ادھر بیٹھیے۔ دین دیال چاچا آپ بھی بیٹھیے نا۔ رام بھروسے چاچا کی طبیعت خراب لگ رہی ہے

رام بھروسے:۔ نہیں نہیں میں تو ٹھیک ہوں۔ ارے ہاں آپ لوگوں کو تو بتایا ہی نہیں کہ آپ میرے ہونے والے سمدھی ہیں۔

رگھو بیر:۔ ہونے والے کیوں۔ میں تو تمھارا سمدھی ہو گیا ہوں۔ بس دو ہی ہفتوں کی بات ہے۔

رام بھروسے:۔ دو ہفتے .....

رگھو بیر:۔ ہاں۔ ابھی ابھی مہورت نکل گیا ہے۔ پروہیت جی کہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہی ہو جائے اتنی ہی اچھی ہے۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔

رام بھروسے:۔ لیکن ..... لیکن .....

رگھو بیر:۔ ارے یہ کیا۔ لیکن لیکن کیے جا رہے ہو۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے۔

میں بہت جلدی میں ہوں۔ایک دو روز کے بعد پھر آؤں گا۔ (واپس چلا جاتا ہے)

رمضانی: ہاں چاچا سب کچھ طے ہو جائے مگر میری بدقسمتی ہے میں تو آج ہی جا رہا ہوں .....

رام بھروسے: مگر بٹیا میں کیسے بتاؤں .....

رمضانی: - چاچا ہم غیر نہیں ہیں۔ بتائیے نا کیا بات ہے۔

دین دیال: ہاں رام بھروسے بتاؤ کیا بات ہے۔

رام داس: چاچا ہم آپ کے پاؤں پڑتے ہیں بتائیے کیا بات ہے۔

رام بھروسے: شادی کے لیے پیسہ چاہیے، ہم لوگ غریب سہی، ہماری عزت بھی تو کوئی چیز ہے۔ اپنی لڑکی کی شادی کروں اور اس کو خالی ہاتھ بھیجوں۔ کوئی زیور نہ دوں۔ اور پھر آپ سب لوگوں کو شادی میں بلاؤں اور کچھ خاطر نہ کروں۔ مانا کہ ہم ہندوستان کے اپنے گاؤں میں نہیں ہیں لیکن ہم اپنے پرکھوں کے مان مریادہ بھول تو نہیں سکتے ہیں۔ شادی کے لیے کم سے کم ہمارے اس کوٹھی کے تمام لوگوں کو دعوت کرنا ہو گا۔ اور پھر کپڑے کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤں۔ تم لوگ جانتے ہو میں ابھی کہاں سے آ رہا ہوں۔ اجناس میں ایک ساہوکار ہے۔ اس سے پیسہ اُدھار لینے گیا تھا اس نے پیسہ دینے سے انکار کر دیا۔

رمضانی: تو انکار کرنے دیجیے۔ اس سے کچھ نہیں ہوتا ہے

رام داس: ہاں۔ لیکن .....

رام بھروسے: بٹیا۔ تمھارے سر پر بیٹی کا بوجھ نہیں ہے۔

رمضانی: مگر ایک بہن کا تو ہے جس کا باپ بالکل بے بس ہے۔

رام بھروسے: بٹیا! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

رمضانی: کیا آپ میرے باپ کے برابر نہیں ہیں اور بٹیا میری بہن نہیں ہے۔ چاچا بٹیا کی شادی دو ہفتے بعد ہونی چاہیے اور ہو گی۔

رام بھروسے: لیکن بیٹا۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟

رمضانی: یہ پیسے لیجیے۔ پورے تین سو روپے ہیں۔ اور یہ لیجیے ایک

نکلیس اور کپڑے۔

مگر بیٹا یہ تو پانچ سال کی تمھاری کمائی ہے اور تم خالی ہاتھ گھر کیسے جا سکتے ہو۔ پھر نکلیس تو تمھاری بہن کے لیے ہے۔

رمضانی:۔ چاچا۔ آپ کو یہ لینا ہوگا۔ لیجیے۔

(رام بھروسے کپڑے اور پیسے لیتا ہے)

پردہ گر جاتا ہے

رشید نیروا

ایک پرانا پیڑ

ایک پرانا پیڑ ہو
جس کے سائے میں
چاندنی رات ہو کہ اندھیری رات
کڑی دھوپ ہو کہ سردی
تھکے ماندے کھیت سے واپس آئے
ٹیک لگا کر آرام کرے
وہ مقام ہو ایسا کہ
غنچہائے دل کھِل جائیں
چند لمحوں کے لیے
عالم بیخودی میں غرق ہو کر
عالم ناپائیدار کو بھول جائیں
ہاں!
یہ وہی لوگ تھے
ہمارے آبا و اجداد
جنھوں نے پہلے پہل اس خاک پر
قدم رکھا تھا

غیروں کے لیے دن رات مشقّت کرتے تھے
لیکن خود کو کچھ نہ ملا
آج وہ پیڑ کہاں!
صرف اس کی سوکھی ہوئی جڑیں
ہمیں وہ گزرے ہوئے واقعات یاد دلاتی ہیں
جب بھی اس پیڑ کا ذکر
زباں پہ آتا ہے
ان لوگوں کو یاد کیے بغیر
ہم نہیں رہ سکتے
جو اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے

عزیز چنتو

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی

ویران قبر میں رہنے والے!
اس خاک میں تیرا
ہے خمیر خون پسینے کا
پیٹ کی خاطر وطن کو چھوڑا
جہاں لکھی تھی روزی وہاں آیا
یہاں کی آب و ہوا نے
تجھے سیراب کیا
ندیوں نے تیرا عکس لیا
ان کھیتوں کی ہریالی دیکھو
لال پسینے سے سینچا گیا
کوہ و دشت و راہ و بیاباں میں
نقش قدم ہیں تیرے
سر بلند کیے ہوئے یہ
پرانی چمنی اور قدیم عمارتیں
جذب کیے ہیں تیرے گرم آنسو
لیکن صدیوں کے بعد
تیری محنت انقلاب لائی

سعید میاں جان سعید

خوش آمدید

یہ گذشتہ صدیوں کا سنو قصّہ ہے
ان غریب الوطنوں کا سنو قصّہ ہے
ہند سے آنے والوں کا سنو قصّہ ہے

ہند سے آ رہے جس گھڑی لوگ یہاں   سوچ میں ڈوب گئے جا رہے ہیں آپ کہاں
سر زمین موربشس انھوں نے دیکھی نہ تھی   یہ حسیں خاک وطن انھوں نے دیکھی نہ تھی
ہند کو چھوڑنے پر دل تو گھبرا رہے تھے   بے قراری میں تھے خوف بھی کھا رہے تھے

آؤ ان مضطربوں کا سنو قصّہ ہے
ہند سے آنے والوں کا سنو قصّہ ہے

جس سفینے میں وہ تھے پاس جب آنے لگا   جان میں جان پڑی دل بھی خوش ہونے لگا
خوف جاتا ہی رہا حوصلہ ان کو ملا   زندگی آئی نظر آسرا ان کو ملا
دل ہی دل میں یہ کہا اب تو رہنا ہے یہیں   زندگی ہے تو یہیں موت ہے تو بھی یہیں

یہ تو اگلی پیڑھیوں کا سنو قصّہ ہے
ہند سے آنے والوں کا سنو قصّہ ہے

جس گھڑی ان کے قدم اس زمیں پر جو پڑے   خیر مقدم کے لیے گل و غنچے بھی کھلے
سنگریزوں نے انھیں جھک کے آداب کیا   اپنا دامن بھی وہاں گھاٹ نے کھول دیا
ان کی آمد سے وطن کھل کے گلزار ہوا   ساری دنیا کے لیے مثل فردوس ہوا

یہ قلی گھاٹ والوں کا سنو قصّہ ہے
ہند سے آنے والوں کا سنو قصّہ ہے

صابر گودڑ

پرکھوں کی داستان

آؤ آؤ سنو اے وطن کے جواں
خون دل سے لکھی پرکھوں کی داستاں

ہند سے جب یہاں سب تھے آئے ہوئے
کشتی میں گورے کی سہمے سہمے ہوئے
تن پہ کپڑے پھٹے بس لپیٹے ہوئے
ڈیڑھ سو سال ہوئے ان کو بچھڑے ہوئے
ظلم سہتے رہے پر نہ کھولی زباں
تھی وہ مشکل گھڑی سخت تھا امتحاں

تھی یہ بنجر زمیں اس میں سونا ملا
پُروجوں کا یہاں کتنا خون بہا
چین کا وہ دیا رات بھر نہ جَلا
قیدیوں کی طرح ان کا جیون بتا
تاریکی میں رہے اپنے وہ مہرباں
اُٹھ رہا تھا مگر دل سے غم کا دھواں

منھ نہارے وہ سب چل دیے کھیت پر
پھاوڑا ہاتھ میں ہل لیے دوش پر
کہہ رہے تھے فرنگی کام کر کام کر
بارش ظلم سے ہو گئے جسم تر
کر دیا خون سے سینچ کر گلستاں
کیسے بھولیں تمھیں گلشن کے باغباں

جان دی ہندوؤں نے مسلمان پر
قوم مسلم نے بھی سر دیا آن پر
فیصلہ جو کیا صرف ایمان پر
گیتا پر ہاتھ تھا آس قرآن پر
ایسی شمع جلی دوستی کی یہاں
ہو گئی جھونپڑی روشنی کا مکاں

جب فرنگی نے لوٹی گاؤں کی آبرو
شور برپا ہوا کی گئی گفتگو
کون سنتا مگر ہوتی کیوں جستجو
چل گئیں گولیاں لاش تھی روبرو
منتظر تھے لیے دل میں آہ و فغاں
ہو گا اس دیس میں انقلابِ زماں

خواب پورا ہوا میرے اجداد کا
یہ کرشمہ ہی تھا ان کی فریاد کا
ہو گیا یہ وطن اُن کی اولاد کا
سب جلا ؤ دیا پرکھوں کی یاد کا
ہٹ گئے خار سب چل پڑا کارواں
آرہا ہے نظر منزل کا اب نشاں

نظم

طاہر دومن

یہ زنجیریں یہ بیڑیاں
یہ سلاسل یہ شکنجے
یہ کوڑے یہ تازیانے
یہ بحر اور یہ زمین
سب پہ داغ لگ چکا ہے میرے خون کا
آشنا ہیں سب میرے لہو کی بو سے
آج نہیں تو کل
رنگ لاکر رہیں گے
پھر تم بچ نہ پاؤ گے
اے میرے جسم کے لہو چوسنے والو!
تمھارے یہ ظلم وستم
مجھ غریب الوطن کو
جچتے نہیں
تم نے مجھ کو
گھر سے بے گھر کیا
وطن سے دور
لوٹا
مارا
ذلیل ورسوا کیا

پھر بھی
میں چُپ رہا
تمھارے ہاتھوں میں بندوق و چابک
جو بے بسوں کو ستانے کے لیے ہیں
وحشت پھیلانے کے لیے
تم اور تمھارے آلے ہیں
اور میرے ہاتھوں میں
یہ اوزار ہیں
دنیا کو بسانے کے لیے
یہ بیاباں یہ وشت وجبل
کاٹ کر بسانے کے لیے
یہ کھُرپا یہ کدال
یہی میرے سرمایہ ہیں
یہی وراثت میں اپنے وارث کو دوں گا
مال وزر نہیں
بس ایک چنگاری
چھوٹی سی ایک دم چھوٹی سی
جو اس کے دل کو گرم رکھے
اور وقت آنے پہ
بھڑک اُٹھے
ایک شعلہ بن کر
اور پگھلا دے
تمھاری ہر زنجیر و سلاسل کو

سعی میاں جان سعیدؔ

ایک ٹوٹی ہوئی قبر

مرا گذر کسی جنگل میں ایک روز ہوا
خموش رہ پہ تھے میں اور میری تنہائی
دل و دماغ تھا آزاد زندگانی بھی
سنہرے خواب بھی لینے لگے تھے انگڑائی

کہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر پڑیں نظریں
ٹھہر گیا میں ذرا سا خیال کرنے لگا

یہ کس کی قبر ہے؟ ویران اس طرح کیوں ہے
بہت ہی مدتوں پہلے کی یادہے شاید
یہ دشت، یہ گھنے جنگل، یہ بکھرے پتھر بھی
چھپے ہوئے کئی افسانے ان میں ہیں شاید

کہ اتنے میں کوئی آواز قبر سے آئی
عجیب درد بھری، کانپتی ہوئی آئی

ڈرو نہیں میرے بچّے! میں کوئی غیر نہیں
تمھارے پرکھوں میں سے ہوں تمھیں خبر تو نہیں
میں پیٹ کے لیے ہندوستان سے آیا تھا
گزر گئیں ڈیڑھ صدیاں تمھیں خبر تو نہیں

ہندو بھی، مسلمان بھی کچھ تھے، ہم ہندی سبھی کہلاتے تھے
مذہب بھی الگ، ملّت بھی الگ، ہم پھر بھی قلی کہلاتے تھے
غیروں کے لیے محنت کی مگر برباد رہے، بدحال رہے
ہم خون پسینے اک کرکے مظلوم رہے، کنگال رہے
جسموں پہ پڑے کوڑے ہنٹر، ایک پل بھی ہمیں راحت نہ ملی
غیروں کے لیے سب کچھ جھیلا، ان سے بھی ہمیں اُلفت نہ ملی
ہم سب کی بھی محنت چھین کے وہ سب اپنے خزانے بھرتے گئے
جسموں سے بھی سب خون چوس کے وہ اپنے پیمانے بھرتے گئے
غیروں کے دکانوں میں دارو کے پیمانوں کا دور رہا!
ہم جیسے غریبوں کی کٹیوں میں پھیکا پانی تک نہ رہا
اس خاک میں ایسی روحیں ہیں جو چیخ رہی ہیں زخموں سے
دھرتی کے مسانوں میں پھونکیں لاشیں گھائل ہیں ظلموں سے
ہم کو تو زمانہ بھول گیا۔ دنیا بھی ہمیں تو بھول گئی
اس گورِ کہن پر بھی کب سے کھلنا بھی کلی تو بھول گئی
دن رات ہمارا خواب یہ تھا کب صبح ہماری آئے گی
تخریب کے بادل چھوٹیں گے کب بھور ہماری آئے گی
ہم آج بہت مسرور ہوئے خوشحالی تو تم کو مل ہی گئی
گو آج یہ مرقد ویراں ہے آزادی تو تم کو مل ہی گئی

یہ سن کے آنکھ کھلی، دل بھی میرا جاگ اُٹھا
میں کھو گیا ان ہی بیتے دنوں کی یادوں میں
جہاں شروع میں ہی بھارت سے لوگ آئے تھے
جہاں میرے سبھی اجداد تھے غریبوں میں

چلو اے ہم وطنو! آج ہم ذرا جاگیں
کہ یاد کچھ تو کریں ان ستم زدوں کو ہم
جنھوں نے خاک وطن مورشیس پہ جانیں دیں
چلو سنا دیں یہ تاریخ باسیوں کو ہم

کہو وہ وقت نہیں ہے تمام غیروں سے
کہ اب ہمیں کبھی کم ظرف و کم عقل سمجھیں،
ہم تو لوگ مہذّب جہاں میں کہتے ہیں،
کہو کہ دنیا میں ہم کو وہ ذی عقل سمجھیں

ہماری خاک وطن امن کا جزیرہ ہے
ہمیں تو ظلم و ستم کے چلن سے نفرت ہے
کہو کہ ہم تو اخوت پسند کرتے ہیں!
ہمیں تو پیار بھری زندگی سے الفت ہے

یہ لہلہاتے ہوئے کھیت اور یہ فصلیں — کبھی کوئی نہیں اب ہم سے چھین سکتا ہے
ہماری کوشش و محنت، ہماری آزادی — کبھی کوئی نہیں اب ہم سے چھین سکتا ہے

چلو کہ آج کہیں پائمال روحوں سے — کہ اب کبھی نہ کسی پر کوئی ستم ہوگا
ہمیں تو امن و سکون کی متاع کی حاجت ہے — یہ سر بھی غیروں کے آگے کبھی نہ خم ہوگا

چلو کہ آج ذرا ان کی قبروں پر جائیں — شمع جلائیں، کوئی پھول بھی چڑھائیں ہم
دعائے خیر بھی ان کے لیے ذرا مانگیں — کہ ان کے نام پہ مالا کوئی چڑھائیں ہم

سعید میاں جان سعیدؔ

مُڑیا پہاڑ

مثنوی داستانِ صباؔ و جمیلؔ

بہت ہی دنوں کی پرانی ہے بات — بزرگوں سے ہم نے سنی ہے یہ بات
نہ جانے کہاں تک حقیقت ہے بات — مگر ایسی باتوں سے کٹتی تھی رات
موریشس کے ایک چھوٹے گاؤں میں تھا — یتیم ایک لڑکا، گوالا جو تھا
جمیلؔ اس کو کہتے محبت سے لوگ — غریبی پہ اس کی ترس کھاتے لوگ
کسی چھوٹی کٹیا میں رہتا تھا وہ — کبھی فاقہ ہو کر بھی سوتا تھا وہ
زمانے میں پیدا ہوا تھا نہیں — بشر اس کے جیسا جوان و حسین
ہمیشہ وہ پیدل چلا کرتا تھا — سدا دودھ سر پر لیا کرتا تھا
کبھی دودھ بکتا نہیں صبح و شام — کئی دن گزر جاتے تھے بے طعام
کہ اک روز گرمی سے وہ تھک گیا — اور اک پیڑ کے سائے میں سو گیا
پہر دو پہر کا عجب تھا وہ وقت — مگر ہر طرف تھے گھنیرے درخت
گھڑی دو گھڑی بعد اک غُل ہوا — کہ جس سے اسے خوف پیدا ہوا
اٹھا ہر طرف دیکھنے وہ لگا — جما کر نظر جھانکنے وہ لگا
زنانی صدائیں وہ سننے لگا — ہنسی، قہقہے بھی وہ سننے لگا
اچانک وہیں اس کی نظریں پڑیں — جہاں چند پریاں نہانے لگیں
دبے پاؤں نزدیک ان کے گیا — گھنی جھاڑیوں سے نظارہ کیا

وہاں ایک چھوٹا سا تالاب تھا   کہ جس میں نہایت شفاف آب تھا
کنول کے ہزاراں حسین پھول تھے   ہواؤں سے جن ہیں حسیں جھول تھے
کنارے پہ تھے سبزے پھیلے ہوئے   جہاں پھول پتے تھے بکھرے ہوئے
پہاڑ اک طرف تھا، چمن اک طرف   فضا ئیں بھی کتنی جواں ہر طرف
درختوں کے سائے ہیں ٹھنڈی ہوا   معطّر تھی یوں جیسے بادِ صبا
انھیں میں کوئی ایک شہزادی تھی   جو سب سے حسیں، دودھیا والی تھی
سہیلیوں کے گھیرے میں وہ تھی کھڑی   کہ پانی چھڑک ہی رہی تھیں سبھی
صبؔا نام تھا اس پری زاد کا   کہوں حال کیا پیکرِ حسن کا
وہ بھی شکل وصورت میں تھی بے مثال   کہوں کیسے اس کا وہ حسن وجمال
گل اندام تھی اور وہ گل عذار   نظر جیسے تلوار کی تیز دھار
وہ لب سرخ تھے ایسے جوں پنکھڑی   حسین دانت تھے موتیوں کی لڑی
بدن سرو جیسے لچکدار تھا   کہ ملبوس جیسے ہوادار تھا
کہوں کیا میں وہ دیدۂ نیلگوں   سمایا تھا جس میں جہاں کا فسوں
کہ پھر اپنی خلوت سے نکلا جمیؔل   کھڑا ہو گیا سامنے بے فصیل
سہیلیاں اسے دیکھ کر ڈر گئیں   کہ پل بھر نظر سے وہ گم ہو گئیں
صبؔا تو اکیلی کھڑی رہ گئی   نڈر ہو کے اس کو وہ تکنے لگی،
خموشی سے دونوں کی نظریں ملیں   کہ پھر دھڑکنیں دل کی بڑھنے لگیں
وہ پھر نکلی پانی سے بھیگی ہوئی   کہ باریک کپڑا تھی پہنی ہوئی
قیامت کی زلفیں تھیں بکھری ہوئی   کہ پانی کی بوندیں تھیں گرتی ہوئی
قریب اس کے جا کر کھڑی ہو گئی   تبسم بہ لب ہو کے کہنے لگی
خدا نے مرے پاس بھیجا تجھے   یہ ہے اک بہانہ کہ پا لوں تجھے
ترا نام کیا ہے اے شکلِ جمیل   کہا نام ہی تو مرا ہے جمیؔل
کہا جیسی صورت ہے ویسا ہی نام   صبؔا ویسے میرا ہے پریوں میں نام

اب ایسے ہی روزانہ ملنے لگے
وہ رازِ محبت بھی کہنے لگے!

درختوں کے سائے میں بیٹھے کبھی
چمن میں بغل گیر ہوتے کبھی

کئی داستانیں اُبھرنے لگیں
کئی حسرتیں دل میں آنے لگیں

کبھی رات کی چاندنی میں ملے
کبھی دوپہر دھوپ میں بھی رہے

اسی طرح گزرے کئی ماہ و سال
کہ جیسے ہمیشہ تھا اُن کا وصال

کسی کو نہ معلوم تھا اُن کا راز
کہ بڑھتا گیا اُن کا راز و نیاز

مگر ایک دن یہ صبا نے کہا
اے جانِ جہاں! میری جانِ وفا!

کہے گا کسی سے ہماری بہار
تو تجھ کو بنا دوں گی میں اک پہاڑ

جہاں تک ترا دم ہے کہنا نہیں
سدا خوش رہے گا، بتانا نہیں

کہا شرط منظور ہے یہ مجھے
اگر ایسا ہو تو سزا ہو مجھے

مگر وہ کہاں تک چھپائے یہ راز
کسی کو بتانے یہ تھا اس کو ناز

کہ آخر بتا ہی دیا ایک کو
پتہ چل گیا جلد ہر ایک کو

اچانک صبا نے سُنا جب یہ حال
تو غصے سے چہرہ ہوا اس کا لال

وہ جذباتی سے بڑھ کے تھی بااصول
اسے وعدہ شکنی نہیں تھی قبول

محبت کی بربادی ہو یا نہ ہو
بہر حال اس قول کا پاس ہو

کہا اے مرے پیارے! افسوس ہے
تجھے اب سزا ہو، ترا دوس ہے

کہاں ہے وہ وعدہ ترا اب بتا
یہی نقص ہے ہر بشر میں سدا

تجھے ایک بننا پڑے گا پہاڑ
جسے دیکھ کر لوگ ہوں ہوشیار

جمیل اب ندامت سے خاموش رہا
دکھے دل کا ارمان جاتا رہا،

نگاہوں سے گرم اشک جاری ہوا
دلِ زار بھی اور زخمی ہوا،

بتاؤں میں کیا اس کا سوزِ دروں
عجب تھا بڑا اس کا عشق و جنوں

جنازہ محبت کا جا بھی چکا
اجل کا فرشتہ اب آ بھی چکا

کہا پھر صبا نے ہے حافظ خدا
اگر ہم ملیں گے اے جانِ وفا!

بہشت بریں میں رہیں گے سدا　　یہی رب سے ہے میرے دل کی دعا
یہ کہہ کر نگاہوں سے وہ گم ہوئی　　ہر اک شخص کے دل میں وحشت ہوئی
گھڑی بھر میں وہ بن گیا اک پہاڑ　　جسے آج کہتے ہیں مڑ یا پہاڑ
زمین پر تو سارا بدن جم گیا　　مگر ایک مورت سا سر بن گیا
کوئی آج جب دیکھتا ہے اسے　　بہت یاد آتے ہیں دونوں اسے
پٹڑ بوتہ بھی اس کو کہتے ہیں لوگ　　اسی نام سے یاد کرتے ہیں لوگ

شاہ نوازؔ خاں سواتی

غزل

میں شامِ غم کا مسافر وہ اک ستارا ہے　　جو تیرگی کے سفر میں مرا سہارا ہے
پھر اس کے بعد غمِ ہجر بھی گوارا ہے　　بس ایک بار یہ کہہ دے کہ تو ہمارا ہے
اک ایک لمحہ قیامت سے کم نہیں گزرا　　جو وقت میں نے ترے ہجر میں گزارا ہے
قریب جا کے کھُلے گا یہ راز تاروں کا　　یہ دور دور سے منظر بہت پیارا ہے
ستم کہ جس نے دیا زخمِ دل نوازؔ مجھے　　اُسی کو درد کے عالم میں بھی پکارا ہے

شاہ نواز خان سواتی

غزل

عرشا اب ہمسفر کوئی نہیں ہے — بچھڑ جانے کا ڈر کوئی نہیں ہے

لزرتی خوب ہے دشتِ جنوں میں — کہ تا حدِ نظر کوئی نہیں ہے

کسے پہنائیں دستارِ فضیلت — کھڑے ہیں جسم سر کوئی نہیں ہے

نگاہیں بے ارادہ اُٹھ رہی ہیں — مگر اب بام پر کوئی نہیں ہے

مجھے اے چشمِ تر بہلائے رکھنا — شبِ غم کی سحر کوئی نہیں ہے

زاروں مرتبہ ٹوٹا گیا دل — یہاں دیوار و در کوئی نہیں ہے

نوازؔ اس کو سناتے ہو فسانہ

جسے اپنی خبر کوئی نہیں ہے

گُل حمید بیگن

آزاد مارشس

خون پسینے سے آزادی ملی ہے — صدیوں کی غلامی سے آزادی ملی ہے

ٹوٹ گئیں غلامی کی زنجیریں — پہلو میں مچلنے لگیں نئی اُمنگیں

دور ہوا رنج و الم — بلند ہوا ہمارا قومی پرچم

پربت پربت، بستی بستی اور نگری نگری — پہ چھا گئی ہے عجیب سی مستی

گلی گلی دوڑی ہے خوشی کی لہر — گلشن کی خوشبو سے مہکا ہے شہر

فلک پہ لہرایا آزادی کا جھنڈا — آزادی نے دور کیا غلامی کا دھندا

آزاد ہوا ہے، آزاد ہے گگن — پُرنور فضا میں ہم ہیں مگن

آؤ ایک قوم نئی بنائیں — آؤ زندگی نئی بسائیں

ہر ایک کو دیس ہو پیارا — چلو اسے بنائیں سب سے نیارا

ہندو، مسلم، چینی، عیسائی — ہر ایک کو سمجھیں اپنا بھائی

پیارے وطن اے پیارے وطن — سدا سدا کریں گے ہم تیرا جتن

سعید میاں جان

غزل

تقدیر سو گئی ہے ستاروں کے درمیاں
جیسے خزاں چھپی ہو بہاروں کے درمیاں

محفل کو جا نہ چھوڑ کے مجھ سے ملے بغیر
کچھ تو لحاظ کر مرا یاروں کے درمیاں

پہلے زمین کتنی کشادہ سی تھی مگر
دیوار اُٹھ گئی ہے دیاروں کے درمیاں

بچتے رہو ادا و لب و چشم و زلف سے
برباد ہم تو ہو گئے چاروں کے درمیاں

اُجڑے چمن میں آئے وہ گل رو تو یوں لگے
جیسے کوئی گلاب ہو خاروں کے درمیاں

بتلا دے راہِ منزلِ جاناں کوئی مجھے
بھٹکا ہوا ہوں راہ گزاروں کے درمیاں

مانا وہ بے وفا ہے گریزاں نہ ہو سعید
خود جی رہا ہوں ایسے ہزاروں کے درمیاں

سالانہ قیمت
۳۰ روپے

ماہنامہ
جامعہ

قیمت فی شمارہ
۳ روپے

جلد ۸۹	بابت ماہ نومبر ۱۹۹۲ء	شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

مجلس مشاورت

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵

طابع وناشر: عبد اللطیف اعظمی ــــ مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سیّد جمال الدین

جامعہ میں ایک ثقافتی زندگی ہوا کرتی تھی۔ اساتذہ اور طلباء کا تعلق کسی بھی ڈسپلن سے ہو وہ اس ثقافتی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ انتظامیہ سے وابستہ لوگ بھی پیچھے نہیں رہتے تھے۔ اس ثقافتی زندگی کا خاص مظاہرہ ماہ اکتوبر میں جامعہ کی "تاسیس کی تقریبات کی تیاریوں اور انعقاد کے دوران ہوا کرتا تھا۔ اکتوبر کی آمد کے ساتھ جامعہ کے اسکول کیمپس اور آرٹس انسٹی ٹیوٹ (یہ وہ جگہیں ہیں جہاں جامعہ کے یوم تاسیس کی تقریبات منعقد ہوتی تھیں) کے اطراف و جوانب میں ایک دلنواز خوشبو دل و دماغ کو مہکاتی تھی اور جامعہ والے کمر بستہ ہو جایا کرتے تھے۔ اپنی تہذیبی میراث کے نمونے پیش کرنے کے لیے ان میں ہر سال ایک نئی امنگ پیدا ہوتی تھی۔ کاروان غزل، تمثیلی مشاعرہ، ڈرامہ، مباحثے، بیت بازی، غزل سرائی، سائنس و ٹکنالوجی سے متعلق پروجیکٹ، طرح طرح کی نمائشیں، کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹال۔ ان کی ترتیب و تزئین میں تدریسی و انتظامی اسٹاف اور طلباء سب ہی شریک ہوتے تھے۔ تفریق کی جگہ آمیزش کا درس عام ہوتا۔ ایک دوسرے سے قربت بڑھتی، باہمی اعتماد قائم ہوتا، محبّت و یگانگت پیدا ہوتی۔ جامعہ میں نہ بہت سی فیکلٹیاں تھیں اور نہ ہی اتنے شعبے اور انتظامی دفاتر جتنے کہ آج نظر آرہے ہیں۔ جامعہ چھوٹی تھی لیکن ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے اس میں بڑی وسعت تھی اور اب جب کہ جامعہ بہت پھیل گئی ہے، ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی معدوم ہوگئی ہے۔

تھے جب ہم چھوٹے، بڑے لگتے تھے
بڑھے اور پھیلے، ہو گئے ہم بونے

جامعہ کو علمی سطح پر مستحکم کرنا ہمارا اوّلین نصب العین ہونا چاہیے۔ لیکن علم اور تہذیب و ثقافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ہم علم کی کسی ایک شاخ میں تخصیص پر زور دیتے ہیں اس کے علاوہ اور ہر شئے سے نابلد رہتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہماری نگاہ محدود رہتی ہے۔ اگر ہم اس نظام تعلیم کو نہیں بدل سکتے تو کم از کم ثقافت و تہذیب کو اس سے مربوط کر کے ایسی متوازن شخصیتیں پیدا کر سکتے ہیں جو تہذیب و ثقافت سے آگہی کی بنا پر معاشرہ میں زیادہ قابل قبول ہوں۔

اکتوبر کا آخری ہفتہ ہے۔ اس وقت جب ہم یہ سطریں لکھ رہے ہیں، جامعہ کو قائم ہوئے ۷۲ سال پورے ہو رہے ہیں۔ قومی تحریک کے جلو میں پیدا ہونے والا یہ قومی و ملّی ادارہ ایک طویل سفر طے کر چکا ہے۔ ہمیں دیانتداری سے محاسبہ کرنا چاہیے کہ قوم و ملّت کو ہم نے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا کیا وہ ہم پورا کر پائے ہیں یا پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جامعہ کے بانیوں اور رہنماؤں نے کہا تھا ہم مسلمان کو اچھا مسلمان اور ہندو کو اچھا ہندو بنائیں گے، اور ہر اچھا مسلمان اور ہر اچھا ہندو، اچھا انسان ہوگا۔ کیا ہم انھیں اچھا بنا رہے ہیں؟

قارئین جامعہ کو جامعہ کا یوم تاسیس مبارک۔

عبداللطیف اعظمی

نازانصاری مرحوم کچھ یادیں کچھ باتیں

نازانصاری مرحوم سے میرے دیرینہ اور مخلصانہ تعلقات تھے۔ اُس وقت سے جب وہ روزنامہ الجمعیتہ (دہلی) میں کام کرتے تھے۔ اس زمانہ میں الجمعیتہ دہلی کے ادارۂ تحریر میں میرے ایک کلاس فیلو رفیق عزیز مرحوم بھی کام کرتے تھے۔ شروع میں ان کی وجہ سے الجمعیتہ کے دفتر جایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ناز انصاری صاحب سے بھی بے تکلفی کی حد تک تعلقات استوار ہوگئے ناز صاحب نے اپنی کتاب: "اردو صحافت" میں لکھا ہے: "میں نومبر ۱۹۴۸ء میں روزنامہ الجمعیتہ کے ادارۂ تحریر میں شامل ہوا۔" اس سے پہلے ناز صاحب روزنامہ انصاری (دہلی) میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لکھا ہے: "۱۰ر مارچ ۱۹۴۷ء کو میں نے دلّی کے روزنامہ انصاری میں اسسٹنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے شرکت کی۔" اس وقت بھی ان سے ضرور ملاقات ہوئی ہوگی، کیوں کہ روزنامے کے مالک اور چیف اڈیٹر ہلال امر زبیری صاحب سے میرے گہرے تعلقات تھے، جس کی وجہ سے وہاں میرا اکثر آنا جانا رہتا تھا مگر ناز انصاری مرحوم سے صحیح معنی میں تعلقات اس وقت قائم ہوئے جب وہ الجمعیتہ میں کام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے ہمارے باہمی تعلقات کی مدت تقریباً ۴۴ سال ہے۔ بعد میں ہمارے تعلقات نے مستحکم رفاقت کی شکل اختیار کرلی۔ وہ جہاں کبھی ہوں اور جس حال میں بھی، ان سے ملاقاتیں ہوتیں۔ مجلسیں جمتیں اور ملکی مسائل سے لے کر اپنی حالات و خیالات پر بحثیں ہوتیں۔ کبھی تند و تیز اور کبھی نرم اور دوستانہ لب و لہجے میں۔

جناب عبداللطیف اعظمی، ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

میرے اور مرحوم کے سیاسی خیالات بنیادی طور پر یکساں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی جزئیات اور تفصیلات میں ہماری رایوں میں تصادم ہو جاتا۔ ورنہ میری طرح وہ بھی قوم پرور اور سیکولر تھے۔ البتہ ہم دونوں میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ وہ ایک سرگرم صحافی تھے۔ انھیں ملکی وقومی اور ملی واسلامی مسائل پر اکثر کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا تھا۔ کبھی اخبار کی مصلحت اور کبھی ملت کے دباؤ میں وہ ایسی باتیں لکھ جاتے تھے جو بظاہر قوم پروری کے خلاف معلوم ہوتیں۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ کے بعض مسائل اور معاملات میں ہم دونوں کی رائیں مختلف ہوئیں۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بحیثیت مجموعی، میرے علم اور مشاہدے کے مطابق، وہ پکے قوم پرور اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ البتہ روزنامہ الجمعیتہ کے آخری دور میں جمعیتہ العلماء کے صدر مولانا سید اسعد مدنی صاحب سے کچھ ایسے اختلافات پیدا ہو گئے، جس نے بہت ہی ناخوشگوار صورت اختیار کر لی، جس کی وجہ سے ان کے قلم کا وہ توازن اور اعتدال برقرار نہ رہ سکا جو ان کی امتیازی خصوصیت تھی اور جس کی راقم الحروف ہمیشہ تعریف کیا کرتا تھا۔ اس اختلاف کی وجہ سے بالآخر انتظامیہ کو بھی اخبار اور ادارے کے مفاد میں جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ یہ صورت حال ناز صاحب کے مخلص دوستوں کے لیے بڑی تکلیف دہ تھی۔ ناز صاحب کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ پریس کونسل میں اپنا مقدمہ لے جائیں۔ قانونی طور پر اخبارات کو آزادیِ رائے اور آزادیِ تنقید کے جو بنیادی حقوق حاصل ہیں، اس کے رو سے ناز صاحب کا مقدمہ بہت مضبوط تھا، چنانچہ وہ جیت گئے اور پورے حقوق کے ساتھ ان کی خدمات بحال ہو گئیں۔ اس کامیابی کے بعد ناز صاحب کے قلم کی تیزی اور بیباکی اور بڑھ گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبار کو بند کرنا پڑا۔ ناز صاحب نے اپنی کتاب "اردو صحافت" میں جہاں روزنامہ الجمعیتہ کا ذکر کیا ہے، اس میں اخبار کے بند ہونے کی وجہ صرف اس قدر لکھی ہے کہ: "۱۹۸۴ء میں بدانتظامی کا شکار ہو کر بند ہو گیا۔"

مجھے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اخبارات کے بارے میں نہ تو کوئی علم ہے اور نہ ہی کوئی تجربہ مگر اردو اخبارات خاص طور نجی اداروں اور اشخاص کے اخبارات کا جہاں مجھے علم اور تجربہ ہے اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی ایڈیٹر بے خوف اور نڈر ہو کر اپنے ضمیر اور بنیادی حقوق

کی روشنی میں اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ چنانچہ روزنامہ الجمعیتہ کے بعد روزنامہ مشرقی آواز (دہلی وگورکھپور) میں بھی کچھ اسی قسم کے حادثے سے ناز صاحب کو دوچار ہونا پڑا۔ ناز صاحب نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو بحیثیت چیف ایڈیٹر روزنامہ مشرقی آواز کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ جو بیک وقت دہلی اور گورکھپور سے نکلتا تھا۔ اس میں بھی اپنے قلم کی آزادی کے جوہر پیش کرنے لگے۔ مگر تابکے آخر تھا تو ایک نجی اخبار اور وہ سرکاری اشتہارات سے مستغنی ہوکر اپنے آپ کو زندہ کیوں کر رکھ سکتا تھا۔ اس کے مالک حسب معمول حکومت اتر پردیش سے اشتہارات کے لیے وزیر اعلیٰ سے ملے تو انھوں نے بڑی بردباری اور شائستگی سے شکایت کی کہ آپ جس سرکار سے اشتہارات لیتے ہیں، آپ کا اخبار اسی سرکار کی مخالفت کیا کرتا ہے۔ مالک اخبار نے ناز صاحب سے فرمائش کی کہ ذرا اپنے قلم میں نرمی اور اعتدال پیدا کیجیے، مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر وہی ہوا جو ایسے مواقع پر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۱ر ستمبر ۱۹۸۷ء کو اس سے الگ ہونا پڑا۔ اس کے بعد ایشیا جاری کیا اور نہ جانے کیوں اس کو بند کر کے اگست ۹۰ء میں روزنامہ انتباہ جدید جاری کیا جس کو تادم حیات کامیابی کے ساتھ نکالتے رہے۔ خود موصوف نے اپنی صحافتی خدمات کے بارے میں لکھا ہے:

"اردو صحافت کی مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے اس مرحلے پر پہنچا جہاں میں بھی کاروانِ صحافت میں شامل ہو جاتا ہوں.... میں اس دشت کی سیاحی یا اس کی گلگشت میں اپنی عمر عزیز کے پچاس سال گزار چکا ہوں [ان کی یہ تحریر جس کتاب میں شامل ہے وہ دسمبر ۸۵ ۱۹ء میں شائع ہوئی ہے گویا ان کے انتقال سے تقریباً سات سال پہلے لکھی گئی ہے، لہٰذا اس مدت میں اسی لحاظ سے اضافہ کر لیجیے۔ اعظمی] میری جوانی کی حسین راتیں اس دشت نوردی میں اس طرح گزاری ہیں کہ آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ہندستانی سیاست وصحافت کے صدہا واقعات پر مشتمل ایک فلم دماغ کے پردۂ سیمیں پر چلتا نظر آتا ہے [کذا] لیکن پروردگار عالم کا شکر ہے کہ کسی سعدی کو میرے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں ہوگی:

چہل سال عمرے عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

جب اس میدان میں آیا تھا تو سبزہ آغاز تھا۔ اب کہ یہ سطریں سپرد قرطاس کر رہا ہوں تو فخر و امتنان کے ساتھ یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ بال صحافت کے میدان میں یوں ہی سفید نہیں ہو گئے۔ میں نے اپنی صلاحیت و استعداد سے زیادہ نام پیدا کیا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ ع

مر جاؤں تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میں نے خود اپنے ہاتھ سے اپنی تقدیر کو سنوارا ہے اور اپنے ملک کی آزادی اور تعمیر نو میں پورا حصہ لیا ہے، تعاون کیا ہے اور صحافت کے میدان میں اپنی الگ راہ بنائی ہے۔

میرا دامن، صحافت و سیاست کے ایسے صدہا واقعات سے مالامال ہے کہ اگر کبھی وقت ملا اور وہ نوک قلم پر آئے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے مطالعے میں کوئی بے لطفی نہیں محسوس کرے گا، بلکہ اسے کچھ نئے حقائق اور انکشافات ملیں گے۔۔۔۔"

مرحوم کی ان ہی شاندار اور پُر خلوص صحافتی خدمات اور ان کی قابل قدر صلاحیت اور بے انتہا محبت کی بنا پر جامعہ ملیہ کے قابل فخر و احترام قدیم طالب علم اور اردو صحافت کی قدآور شخصیت مولانا عبدالباقی مرحوم نے ناز انصاری صاحب کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے:

"اردو صحافت میں ان کا ایک مقام ہے اور یہ مقام شبانہ روز کی محنت شاقہ اور برسوں کی کاوشوں سے حاصل کیا گیا ہے۔ ناز صاحب جس روزنامہ یا جس ہفتہ وار میں ہوں ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ یکہ و تنہا اخبار مرتب کر سکتے ہیں۔"

مرحوم کی ان ہی خصوصیات اور بے لوث خدمات کے پیش نظر ۱۹۸۳ء میں دہلی اردو اکادمی نے اور ۱۹۸۵ء میں ایوان غالب (دہلی) نے صحافت کے ایوارڈ سے نوازا۔

اس مختصر مضمون میں مرحوم کی ایک اور خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد سے بے حد عقیدت تھی، جس کا اظہار قلم اور زبان سے اکثر و بیشتر مولانا کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد کیا کرتے۔ اسی خلوص اور عقیدت کی بنا پر جب مولانا کے مرض الموت کی اطلاع ریڈیو سے ان کو ملی تو اسی وقت ان کی کوٹھی پر چلے گئے اور جنازے کے ساتھ ہی وہاں سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد اپنے اوپر یہ ذمہ داری عائد کر لی کہ مولانا کے یوم پیدائش اور یوم وفات کے مواقع پر ان کے مزار پر پابندی کے ساتھ جلسے کا انتظام کرتے، جس میں فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کے علاوہ ایوان حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار، بزرگ اور نامور رہنما اور معززین شہر شرکت فرماتے تھے۔ ان مواقع پر اکثر اپنے اخبار کا آزاد نمبر نکالتے اور اس جلسے میں مفت تقسیم کرتے۔

مولانا آزاد سے صرف عقیدت ہی نہیں تھی، ان کی زندگی کا بہت قریب سے گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ مگر افسوس کہ چھوٹے موٹے مضامین کے علاوہ ان پر کوئی کتاب نہ لکھ سکے۔ ان کی خواہش اور کوشش تو تھی۔ موضوعات اور عنوانات بھی طے کر چکے تھے، مگر ان کی صحافتی مصروفیات نے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں جب بھی ان سے ملتا تو ان کا وعدہ یاد دلاتا تو ندامت کے ساتھ معذرت کرتے ہوئے از سر نو وعدہ کرتے، مگر افسوس کہ یہ وعدہ وعدہ ہی رہا، شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

نہ جانے کیوں، مولانا آزاد کی جامع مسجد کی مشہور ترین اور مقبول ترین تقریر کے بارے میں ان کے دل و دماغ میں یہ خیال جم گیا تھا کہ یہ مروجہ تقریر وہ نہیں ہے جو مولانا نے ۲۳ر اکتوبر، ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ اس مسئلے پر میری ان سے بارہا بحثیں ہوئیں مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کے ہم وطن ظ انصاری صاحب نے اپنے ایک طویل مضمون میں پورے وثوق اور قطعیت کے ساتھ لکھ دیا کہ یہ تقریر مولانا آزاد کی نہیں ہے، بلکہ شورش کاشمیری نے اپنی طرف سے مرتب کر کے شائع کر دی ہے۔ ناز انصاری صاحب تو خیر اس جلسے میں شریک تھے، وہ اگر کچھ کہتے

تھے تو ان کو اس کا حق تھا، مگر ناظر انصاری صاحب تو اس وقت دہلی سے تیرہ چودہ سو کلومیٹر کے فاصلے پر بمبئی میں براجمان تھے، ان کو یہ سب کچھ کہنے یا لکھنے کا کیا حق تھا، خصوصاً جب ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ ان کے اس مضمون کے بعد راقم الحروف نے اس تقریر کے بارے میں تحقیق کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ ناز انصاری صاحب سے اس مسئلے پر اب تک تمام بحث و گفتگو زبانی ہو رہی تھی، مگر جب میں نے مضمون لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ تو ضروری تھا کہ ان کے خیالات تحریری شکل میں ہوں۔ چنانچہ راقم الحروف نے ایک سوال نامہ مرتب کرکے ان کی خدمت میں پیش کیا اور جواب کے لیے اصرار کیا۔ حسبِ معمول عرصے تک ٹالتے رہے، مگر بالآخر میرا اصرار غالب آیا اور انھوں نے تحریری شکل میں جواب لکھنے کی زحمت کی۔ اس مخصوص مسئلے پر ان کے خیالات سے واقفیت اور وضاحت کے لیے ذیل میں سوال و جواب کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں: میرے مضمون میں سوال و جواب الگ الگ چھپے ہیں مگر آسانی کے خیال سے نمبر وار دونوں ایک ہی ساتھ لکھ رہا ہوں۔ اور اگر کہیں مجھے اپنی رائے پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہیں اسے بھی درج کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

(۱) یہ تقریر کس دن، کس تاریخ کو اور کس وقت کی گئی؟ تقریر جمعہ کی نماز کے بعد ہوئی تھی اور نماز کے بعد مولانا کی تقریر کا اعلان کیا گیا تھا۔ حوض کے بائیں جانب جنوبی دروازے کی سمت میں تخت بچھایا گیا تھا، شامیانے لگے ہوئے تھے۔ تاریخ مجھے یاد نہیں۔

دہلی کے ایک اور مشہور اور پرانے صحافت نگار جناب سلیمان صابر صاحب بھی اس جلسے میں شریک ہوئے تھے۔ اس وقت وہ روزنامہ جنگ (دہلی) کے اڈیٹر تھے۔ ان کا خیال ہے کہ ایک روز پہلے پوری دہلی میں مشہور تھا کہ کل جمعہ بعد مولانا آزاد تقریر کرنے والے ہیں چنانچہ صابر صاحب کا بیان ہے کہ میں نے ایک روز پیشتر روزنامہ جنگ کے اداریے میں لکھا تھا کہ کل مولانا آزاد اپنی تقریر میں مسلمانوں کو کیا مشورہ دیں گے۔ تقریر کی تاریخ کسی کو یاد نہیں تھی۔ اور اب تک کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ خاکسار نے اپنے ایک مضمون میں سہ روزہ مدینہ (بجنور) کے حوالے سے اس کی تاریخ پہلی مرتبہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء لکھی۔ بعد میں لکھنؤ کے دو روزناموں ہمدم اور قومی آواز سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی۔

۲۔ کیا اس کے لیے پہلے سے اعلان کیا گیا تھا؟ مجمع اندازاً کتنا رہا ہو گا؟ جلسے کا اہتمام کس
نے کیا تھا؟ مجھے یاد نہیں، مگر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت مولانا آزاد تقریر فرمائیں گے۔ اغلب
ہے کہ جلسے کا اہتمام جمعیتہ العلماء ہند نے کیا ہو۔ میرے مضمون میں اس کا ذکر نہیں ہے، مگ
جہاں تک مجھے یاد ہے سلیمان صابر صاحب نے جلسے کے اہتمام کے سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰ
سیوہاروی صاحب ناظم جمعیتہ العلماء کا خاص طور پر نام لیا تھا۔

(۳) مولانا نے یہ تقریر اپنی خواہش سے کی تھی یا کسی کی دعوت پر؟ اگر کسی کی دعوت
پر کی تھی تو کسی شخص واحد کی دعوت پر یا کسی جماعت کی دعوت پر؟ میں نہیں کہہ سکتا۔ جا
کا نام اوپر آ گیا ہے۔ دہلی کے مشہور صحافی جناب انور دہلوی صاحب بھی اس جلسے میں شر
تھے۔ اس تقریر کے سلسلے میں ان سے بھی میں ملا تھا۔ انھوں نے خاص بات یہ فرمائی تھی
مولانا آزاد کی تقریر سے ایک دو روز پہلے گاندھی جی جامع مسجد تشریف لائے تھے ا
دلی کے مختلف علاقوں سے جو لوگ لٹ لٹا کر آئے تھے اور وہاں موجود تھے، گاندھی
نے ان سے باتیں کیں اور ان کو تسلی دی۔ دوسری خاص بات یہ بتائی کہ مولانا آزاد تقر
روزانہ دریا گنج کی کوتوالی تشریف لایا کرتے اور پولیس افسروں سے مسلم علاقوں کے حالا
معلوم کرتے اور ان کو ضروری ہدایات دیتے۔ ان کی اس بات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا
۲۴ اکتوبر کو بھی جامع مسجد میں مولانا کی تشریف آوری ان کے معمولات کا ایک حصہ تھ
اور چونکہ جمعہ کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے مولانا نے اُس رو
خصوصی طور پر ان کو خطاب کیا۔

۴۔ ہندوستان کے اخبارات میں یہ تقریر کب شائع ہوئی؟ میں نے مولانا کی تقریر
بار سنی تھی اور جیسا کہ میں نے ان کی خطابت کے بارے میں سنا تھا، ویسا ہی پایا تھا۔
کی رپورٹ میں نے انصاری اخبار میں شائع کی تھی، لیکن وہ لفظ بہ لفظ نہیں تھی۔ آج میں اس ت
کو پڑھتا ہوں تو وہ منظر میری آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو میں نے دیکھا تھا۔ ناز صاحب
طرح سلیمان صابر صاحب نے بھی یہی دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اس تقریر کی رپورٹ ا۔
اخبار روزنامہ جنگ میں شائع کی تھی۔ اسی طرح انور دہلوی صاحب نے بھی بیان کیا کہ

نے اس تقریر کو کتابچے کی شکل میں شائع کر کے مفت تقسیم کروایا تھا اور جب دہلی کے حالات کچھ بہتر ہوئے تو اپنے رسالہ بانو میں بھی شائع کیا۔ مگر یہ سب کی سب مطبوعہ تقریریں ناپید ہیں۔ البتہ مجھے یہ تقریر سہ روزہ مدینہ بابت ۲۱ نومبر ۱۹۴۷ء میں ملی۔ اور ابھی حال میں ایک دوست کی عنایت سے روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) اور روزنامہ ہمدم (لکھنؤ) کے تراشے کی فوٹو کاپیاں ملی ہیں۔ یہ دونوں تقریریں بھی آگئے پیچھے نومبر ۱۹۴۷ء ہی میں شائع ہوئی ہیں۔

(۵)۔ آغا شورش کاشمیری مرحوم کے اخبار چٹان میں یہ تقریر کب شائع ہوئی ؟ آغا شورش کا اخبار چٹان (لاہور) اس وقت شائع نہیں ہوتا تھا، وہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا۔ ناز صاحب کا یہ جواب سوال کے مطابق ضرور ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ مکمل جواب یہ ہے کہ اس وقت وہ احرار کے اخبار روزنامہ آزاد (لاہور) کے اڈیٹر تھے اور مولانا آزاد کی تقریر پاکستان میں پہلی مرتبہ اسی میں شائع ہوئی تھی۔

(۶)۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس تقریر کے الفاظ اور جملے مولانا ہی کے ہیں مگر اس موقع پر نہیں کہے گئے تھے۔ مولانا کی دوسری تقریروں اور تحریروں سے اخذ کر لیے گئے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ اگر آپ کی رائے اثبات میں ہے تو کیا مثالیں دے سکیں گے ؟۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کے الفاظ اور جملے مولانا ہی کے ہیں تو پھر یہ بات قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر تقریروں میں آسکتے ہوں گے اور آنا چاہئیں۔

(۷) کیا اس مسئلے پر کبھی آپ کی گفتگو ظ انصاری مرحوم سے ہوئی تھی ؟ ظ انصاری صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوئی ہیں مگر اس موضوع پر کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ مولانا کے سلسلے میں بھی گفتگو ہوئی مگر یہ تقریر کبھی زیر بحث نہیں آئی۔ یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ ظ صاحب سے اس مسئلے پر جب میں نے گفتگو کی تھی نوان سے سوال کیا تھا کہ جب آپ نے اس تقریر کو براہ راست نہیں سنا تو کس نے آپ کو اطلاع دی کہ یہ تقریر وہ نہیں ہے جو مولانا نے اس موقع پر کی تھی۔ جب وہ جواب دینے سے قاصر رہے تو محض

اس لیے کہ ان دونوں مرحومین کے اعتراضات میں بڑی حد تک یکسانیت تھی۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ کیا نازانصاری صاحب سے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو فوراً فرمایا جی ہاں ان ہی نے مجھے بتایا تھا۔ مگر نازانصاری صاحب نے اس سے زبانی بھی انکار کیا اور تحریری طور پر بھی۔

(۸) کیا آپ دہلی میں کسی ایسے شخص کی نشاندہی کر سکیں گے جو حیات ہوں اور مولانا کے اس جلسے میں شریک ہوئے ہوں؟ اس سوال کا ناز صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ زبانی گفتگو میں وہ پورے یقین کے ساتھ دعویٰ کرتے تھے کہ اب ان کے علاوہ کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو اس جلسے میں شریک ہوا ہو۔ ویسے تو دہلی میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے جن کا فرمانا ہے کہ وہ اس جلسے میں شریک ہوئے تھے، مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو صاحب رائے اور قابل اعتماد ہوں اور علم اور صحافت کی دنیا میں شہرت رکھتے ہوں۔ ان میں سے جن لوگوں سے میں ملا، ان کا ذکر آچکا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ایک بے تکلف دوست ابرار الرحمٰن قدوائی صاحب کی طرف میرا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ جو جامع مسجد کے قریب ہی مٹیا محل میں رہتے ہیں اور ناز صاحب کے ہم محلہ ہیں۔ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد ان کا ایک طویل خط آیا، جس سے اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے صرف دو باتوں کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ سوال نمبر ۳ کے جواب میں ناز صاحب نے فرمایا ہے کہ "جیسا کہ میں نے ان کی خطابت کے بارے میں سنا تھا، ویسا ہی پایا تھا۔" مولانا آزاد کی خطابت کی دو خوبیاں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ اس میں جوش و خروش کی فراوانی ہوتی تھی، اور وہ اس تیز رفتاری سے بولتے تھے کہ اس کو لفظ بہ لفظ نوٹ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں خاکسار نے اپنے مضمون میں مولانا آزاد کے چند معاصرین کے بیانات کے کچھ حوالے دیے تھے۔ اس سلسلے میں قدوائی صاحب لکھتے ہیں: "قاضی عدیل عباسی مرحوم کا بیان کہ وہ بے حد تیز رفتاری سے بولتے تھے، اس تقریر میں اس کی جھلک نہیں تھی۔ ایک ایک لفظ صاف صاف زور دے کر کہتے اور سمجھانے کے انداز میں کہتے تھے۔" گویا اس تقریر میں مولانا کی خطابت

کی خصوصیت موجود نہیں تھی۔ دوسری اہم بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ: "مولانا آزاد کی یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے براہ راست نشر ہوئی تھی اور میں نے ریڈیو پر یہ تقریر خود سنی تھی۔" راقم الحروف اس بیان کی تصدیق کرنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

مولانا آزاد کی اس تقریر کے بارے میں میرا تحقیقی مضمون، ناز صاحب کے انتقال سے کئی مہینے پہلے مئی ۱۹۹۲ء کے ماہنامہ ایوان اردو (دہلی) میں شائع ہو گیا تھا اور ناز صاحب کے ساتھیوں اور عزیزوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ مضمون ان کی نظر سے گزر گیا تھا۔ مگر اس زمانے میں زیادہ تر خاکسار دہلی سے باہر رہا، اس لیے ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، جس کی وجہ سے اپنے مضمون کے بارے میں ان کا ردِعمل معلوم نہ کر سکا، جس کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

مرحوم نے عمر بھر علم و ادب اور صحافت کی پُرخلوص اور بے لوث خدمت کی۔ اس راہ میں حسنِ نیت کے باوجود غیر شعوری طور پر لغزشیں ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کرے اور ان کی حسنِ خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے صلے میں اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین

حواشی:-

[۱] اردو صحافت: مطبوعہ: دہلی۔ دسمبر ۱۹۸۵ء، صفحہ ۷۵

[۲] ایضاً۔ صفحہ ۶۳۔

[۳] ایضاً۔ صفحہ ۶۳۔

[۴] ایضاً۔ صفحہ ۷۔

شفقت رضوی

مولانا حسرت موہانی کا سنہ پیدائش

(مولانا حسرت موہانی کے سنہ پیدائش کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ گذشتہ چند مہینوں میں خاص طور پر ہفتہ وار ہماری زبان (دہلی) میں اس سلسلے میں متعدد مضامین شائع ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ایک ماہر حسریات پروفیسر شفقت رضوی صاحب نے اس اختلافی مسئلے پر ایک مبسوط اور مدلّل مضمون مجھے بھیجا ہے، جسے ماہانہ رسالہ جامعہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ مضمون کے آخر میں مولانا کی تاریخ پیدائش کے بارے میں خاکسار ایک بالکل ہی نئی اطلاع پیش کرے گا جو اب تک میرے علم کے مطابق کسی کتاب یا رسالے یا اخبار میں شائع نہیں ہوئی ہے۔ عبداللطیف اعظمی رکن مجلس مشاورت، ماہنامہ جامعہ)

انجمن ترقی اردو ہند کے ہفت روزہ "ہماری زبان" کے شمارہ بابت ۸ دسمبر ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتحپوری کا مضمون "مولانا حسرت موہانی کا سنہ پیدائش ایک جدید انکشاف" پڑھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ خوشگوار اس اعتبار سے کہ آزاد فتح پوری نے مولانا حسرت موہانی کے سنہ پیدائش کے تعین کے لیے صحیح سمت میں قدم بڑھایا ہے اور ایک اہم دستاویز کا انکشاف کیا ہے جس سے تحقیق کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ روایتوں اور من گھڑت کہانیوں کی بیساکھیوں پر چلنے والے محققین اور آنکھیں بند کیے دوسروں کی انگلی تھامے بڑھنے کے عادی اہل قلم (جن کی لکھی ہوئی ادبی تاریخیں کالجوں اور جامعات میں پڑھائی جاتی ہیں) کے

جناب شفقت رضوی، بی ۵۵ حق بامو پلازہ، گلشن اقبال۔ بلاک ۱۳ سی کراچی ۷۵۳۰۰ پاکستان۔

ِخلاف تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ میں آزاد فتح پوری کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف کرتا ہوں ان کی کاوش پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

مولانا حسرت موہانی کے سنہ پیدائش کے سلسلہ میں میرے پیش نظر وہ سب حوالے رہے ہیں جن کا ذکر آزاد فتح پوری نے کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض تحریریں ہیں جن کو بوالعجبی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں ان غیر معتبر اور غیر مستند تحریروں کو موضوع بحث بنا کر وقت ضائع نہیں کروں گا البتہ موضوع کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کروں گا۔ اگر مجھے اس پر اصرار نہیں ہے کیوں کہ ابھی تحقیق کی گنجائش باقی ہے۔

میرے خیال میں ان اہل قلم حضرات کے بتلائے ہوئے سنہ پیدائش لائق عذر ہیں جن کا مولانا ان کے اہل خانہ سے ربط رہا ہے، جن کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے معلومات براہ راست حاصل کی ہوں گی۔ ان میں بلاشبہہ مولانا کی صاحبزادی نعیمہ بیگم کو سر فہرست رکھنا ہوگا۔ موصوفہ اپنی مختصر سی تالیف میں لکھتی ہیں کہ

> "تاریخ پیدائش شاید ان کو (مولانا حسرت کو) خود بھی معلوم نہ تھی لیکن اس سلسلہ میں اگر کبھی والدہ محترمہ کچھ اپنا ذکر کرنے لگتیں تو مولانا ان سے فرمایا کرتے تھے کہ تم اپنا ذکر نہ کرو۔ تم چودھویں صدی کی ہو اور میں تیرھویں صدی کا، جہاں تک معلومات کا تعلق ہے انھوں نے کسی سے سنہ پیدائش کبھی بھی بیان نہیں کیا۔"

(نعیمہ بیگم: "حسرت کی کہانی، نعیمہ کی زبانی" مطبوعہ کراچی: ۱۹۷۹: صفحہ ۲۲)

اس بیان سے یہ نتیجہ تو اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا نے تاریخ پیدائش بتلانے سے گریز کیا۔ نعیمہ بیگم کے علم کے مطابق انھوں نے کسی کو تاریخ پیدائش نہیں تبلائی لیکن یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ "تاریخ پیدائش ان کو بھی معلوم نہ تھی"۔ اپنے بیان میں "شائد" کا اضافہ کرکے نعیمہ بیگم نے گویا اقرار کیا ہے کہ "شاید معلوم تھی مگر تبلانا نہیں چاہتے تھے۔"

تقویم ہجری و عیسوی (مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی، شائع کردہ انجمن ترقی اردو، پاکستان) کے مطابق ۲ر نومبر ۱۸۸۳ء کو یکم محرم ۱۳۰۱ھ واقع ہوئی تھی۔ مولانا کے محولہ بیان سے یہ بات پایۂ ثبوت

کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کی ولادت ۲؍ نومبر ۱۸۸۳ء سے قبل اور بیگم حسرت کی اس کے بعد کی ہے۔

مولانا حسرت موہانی کی پہلی سوانح عمری "حالاتِ حسرت" کے نام سے عارف ہنسوی نے لکھی جسے ۱۳۴۷ھ میں "انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام" نے شائع کیا۔ اس میں سنہ ولادت ۱۲۹۸ھ درج ہے۔ اس سنہ کے قابل قبول نہ ہونے کے بارے میں آزاد فتح پوری کا استدلال یہ ہے کہ

"مولانا عارف ہنسوی نے مولانا حسرت کا سنہ پیدائش رقم کرتے ہوئے بیگم حسرت یا کسی اور کا حوالہ نہیں دیا۔ مزید براں یہ ضروری نہیں ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے صحیح سنہ پیدائش سے آگاہ ہوں۔ بیگم حسرت کا اس قبیل کا کوئی بیان ہوتا بھی تو بغیر سند کے قابل قبول نہ ہوتا۔"

(آزاد فتح پوری: مضمون "مولانا حسرت موہانی کا سنہ پیدائش، ایک جدید انکشاف: مشمولہ "ہماری زبان" دہلی صفحہ ۲)

اس بیان کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں کہا گیا کہ عارف ہنسوی نے بیگم حسرت یا کسی اور کے حوالہ سے تاریخ پیدائش درج نہیں کی ہے۔ اس بارے میں عرض ہے کہ کسی کتاب کے ہر ہر جملہ کے لیے حوالہ ضروری نہیں ہوتا۔ اگر متعدد جگہ ایک ہی حوالہ موجود ہے تو باقی کے لیے وہی کارآمد قرار دیا جاسکتا ہے ویسے بھی جس زمانہ میں "حالات حسرت" لکھے گئے ان جزئیات کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا اور سوانح نگاری کا فن اپنے ابتدائی مدارج میں تھا۔ اس وقت کی تحریروں کے لیے اس قدر باریک بینی قدرے زیادتی ہو گی۔

بیان کے دوسرے حصے میں کہا گیا ہے کہ زوجین کا ایک دوسرے کے صحیح سنہ پیدائش سے واقف ہونا ضروری نہیں۔ موصوف نے مولانا حسرت موہانی اور محترمہ نشاط النساء کو محض زوجین سمجھا ہے حالانکہ وہ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں ساتھ پلے بڑھے تھے۔ عام طور پر گھر کی بڑی بوڑھیاں خاندان کے لڑکے اور لڑکیوں کی عمروں اور تاریخ پیدائش کا ذکر کرتی ہیں جو گھر کی بچیوں کے کانوں میں پڑی رہتی ہیں۔ اس لیے اگر بیگم حسرت نے مولانا سے نہ بھی پوچھا ہو، خود سے تفتیش و تحقیق نہ بھی کی ہو تو بات ان کے کانوں تک پہنچنے کے امکان کو تو قطعی طور پر مسترد نہیں کیا جاسکتا۔

بیان کے تیسرے حصے میں یہ کہنا کہ بیگم حسرت کے بغیر سند کے کہہ دینا بھی قابل قبول نہیں ہے۔ ایک طرح کی زیادتی ہے۔ بیوی کے لیے شوہر اور شوہر کے لیے بیوی بہر حال سند کا درجہ رکھتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا جس زمانہ میں "حالات حسرت" لکھے گئے بصراحت ہر بات کے لیے سند دینے کا رواج نہیں تھا۔ اس صورت میں مصنف اور صاحب سوانح کے تعلق پر نظر ڈالنی پڑے گی اور مکمل پس منظر پر غور کرنا ہوگا۔ اس خصوص میں یہ امور ذہن میں رہنے ضروری ہیں۔

مولانا عارف ہنسوی اور مولانا حسرت موہانی کے درمیان دیرینہ ربط ضبط رہا ہے۔ دونوں ہم عصر، ہم خیال سیاسی کارکن تھے۔ ان کے درمیان قربت اور یگانگت کی تصدیق کے لیے ایک اخباری خبر نقل کی جاتی ہے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں ہفت روزہ تہذیب نسواں لاہور نے خبر چھاپی تھی کہ

> "۱۸ر فروری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں انجمن خدامِ خلافت کا ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں ایسے سرفروش لوگ شریک ہوئے جو خلافت اسلامی کی خاطر جیل جانے، تکلیفیں اٹھانے بلکہ جان دینے پر آمادہ ہیں۔ اس انجمن کی ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے سکریٹری مولانا حسرت موہانی، مسٹر تاج الدین اور عارف صاحب مقرر ہوئے ہیں۔"
>
> (ہفت روزہ تہذیب نسواں، لاہور: یکم مئی ۱۹۲۰ء)

یہ خبر حالات حسرت کی اشاعت کے دو سال بعد کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تحریک خلافت کے شروع ہونے سے پہلے ہی ان دونوں بزرگوں کے درمیان تعلقات موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ذہن میں رہے کہ "حالات حسرت" انجمنِ اعانتِ نظربندانِ اسلام نے لکھوائی اور اس انجمن نے شائع بھی کی تھی یہی نہیں بلکہ مولانا محمد علی جوہر اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے بارے میں بھی اسی انجمن نے کتابیں شائع کی تھیں۔ اس کا قیام اس غرض سے ہوا تھا۔ مسلمان نظربندوں اور ان کے اہل خاندان کی ہر طرح اعانت کی جائے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں جب مولانا کے سودیشی اسٹور میں چوری ہوئی اور تین ہزار کا نقصان ہوا تو انجمن کی جانب سے اس کی تلافی کی بار بار پیشکش کی گئی جسے بیگم حسرت نے قبول نہیں کیا۔

بالآخر انجمن نے مولانا کے دیوان چہارم کے حقوق اشاعت حاصل کر کے اس نقصان کی پابجائی کی سعی کی۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ "حالات حسرت" کی تصنیف کے وقت انجمن اور بیگم حسرت کے درمیان مسلسل رابطہ رہا۔ بیگم حسرت مولانا کی پی۔آر۔او کی خدمات بھی انجام دیتی رہیں۔ دوران قیدِ فرنگ ثانی جب حکومت نے ڈرامہ کیا اور یہ تاثر دیا کہ حکومت مولانا کو رہا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے توصحیح صورتِ حال قوم کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک طویل تفصیلی بیان جاری کیا تھا یہ بیان بھی اس انجمن کے توسط سے اخبارات کے لیے گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے انجمن کے ذریعے بیگم حسرت کے شائع شدہ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں خط لکھا تھا جس میں ان کے عزم و استقلال کی بے حد تعریف کی تھی۔ "انجمن خدام خلافت" کے جن سکریٹریوں کے منتخب ہونے کا ذکر ہفت روزہ تہذیب نسواں لاہور نے دیا ہے ان میں ایک نام مسٹر تاج الدین کا بھی ہے وہی انجمن کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان تمام کوائف سے قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ "حالات حسرت" کی تصنیف کے سلسلہ میں بیگم حسرتؔ کا براہ راست اور مولانا کا بالواسطہ تعاون حاصل رہا ہوگا۔ تاریخ پیدائش جیسے اہم اور بنیادی امر کے لیے مولانا عارف ہنسوی نے ذرائع و وسائل معلومات رکھنے کے باوجود محض قیاس سے کام نہ لیا ہوگا اور یقیناً اس بارے میں استفسار کیا ہوگا۔ سند کا حوالہ نہ دینا ایک کمزوری ضرور ہے لیکن جو اس زمانہ کے معیار تصنیف کے لحاظ سے غیر معمولی اور قابل گرفت بھی نہیں ہے۔

مولانا حسرت موہانی نے "حالات حسرت" اپنے رسالہ "اردوئے معلّٰی" کانپور کے شمارہ جولائی تا دسمبر ۱۹۲۶ء کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیے تھے سنہ پیدائش غلط ہونے کی صورت میں وہ لازماً اس کی تصحیح کرتے۔ یہی استدلال ڈاکٹر احمر لاری نے کیا ہے جو آزاد فتح پوری کو اس لیے قابل قبول نہیں کہ

"یہ ضروری نہیں کہ مدیر رسالہ اپنے رسالہ کے سبھی مشمولات کو من وعن پڑھے اس لیے یہ دلیل بھی قیاس و استقرائی اور ظنی ہوئی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ حسرتؔ نے اپنی پیدائش کے سنہ کی توثیق کی ہو یا کسی سنہ پیدائش

کو صحیح بتلایا ہو۔ محض سکوت علم الیقین عطا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"
معترض نے اس امر کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا کہ " حالاتِ حسرت" کی حیثیت عام مشمولات جیسی نہیں تھی۔ ایڈیٹر دوسروں کے لیے اپنے حالات وکوائف پیش کر رہا تھا۔ دوسروں کے بارے میں لکھی ہوئی باتوں کی تائید یا تردید ایڈیٹر اس لیے نہیں کرتا کہ ان کی ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہوتی ہے جب ان پر تنقید کی جاتی ہے تو مضمون نگار کے حوالے سے بات ہوتی ہے ایڈیٹر کے حوالے سے نہیں لیکن جس امر کا تعلق ایڈیٹر کی اپنی ذات سے ہو اور وہ شائع کرے تو ذمہ داری مشترکہ طور پر لکھنے والے اور ایڈیٹر پر عائد ہوتی ہے۔ یہ عام اصول ہے اور " حالاتِ حسرت" کے بطور ضمیمہ شائع کرنے پر مولانا کے رویّہ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ نامعلوم حقیقت کے بارے میں سکوت علم الیقین عطا نہیں کرتا لیکن معلوم حقیقت کے بارے میں سکوت بمنزل علم الیقین ہوتا ہے۔

اسی سنہ پیدائش (۱۲۹۸ھ) کی توثیق رحم علی الہاشمی کی کتاب "English Translations of Selected Poems of Maulana Syed Fazlul Hasan Hasrat Mohani"
سے ہوتی ہے جو مولانا کے قیدِ فرنگ ثالث کے دوران (۱۹۲۲ء) میں شائع ہوئی۔ اس پر بحیثیت مرتب بیگم حسرت کا نام درج ہے۔ رحم علی الہاشمی کا ادعا ہے کہ مسودہ کی نظرِ ثانی مولانا حسرت موہانی نے جیل میں کی تھی۔ ظاہر ہے مسودہ بہم پہنچانے کے لیے بیگم حسرت ہی کے ذریعہ رہی ہوں گی کیونکہ قیدِ فرنگ ثالث دوران مولانا سے ملاقاتوں پر سخت پابندی تھی بیگم حسرت نے بھی بمشکل تمام اجازت حاصل کی تھی۔ سنہ پیدائش غلط ہونے کی صورت میں مولانا نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا۔

۱۲۹۸ھ کی تائید میں ایک اور شہادت موجود ہے وہ ہے " اوراقِ گل" رامپور میں ایک " بزمِ سخن" قائم ہوئی تھی۔

" بزم نے پہلا قدم اٹھایا اور یہ طے کیا کہ ملک کے مشہور شعراء کو دو دو تین تین کر کے رام پور میں دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لا کر بزم کے جلسے میں اپنا منتخب کلام سنائیں اور آخر میں ایک مجموعہ شائع کیا جائے

جس میں ہر شاعر کے منتخب کلام، تصویر، سوانح اور تحریر کا عکس شامل ہو۔"
(ضمیر احمد مرتب "اوراق گل": رام پور: ۱۹۴۳: ابتدائیہ بعنوان "تقریب"
صفحہ ۹)

"اوراق گل" کے مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"حضرات شعراء سے ہماری استدعا یہ تھی کہ وہ اپنے منتخب کلام، حالات زندگی، تصویر اور تحریر کے نمونے کے ساتھ حسب ذیل سوالوں کے جواب قبل تشریف آوری روانہ فرمادیں۔" (صفحہ ز)

"اوراق گل" میں مولانا کا منتخب کلام بھی ہے۔ حالاتِ زندگی بھی ہیں، تصویر بھی ہے تحریر کا عکس بھی ہے جس پر لکھا ہے "مقام رام پور، ۷ ارنومبر ۱۸* ء فقیر حسرت موہانی بقلم خود" (قبل از صفحہ ۱۶۱) حضرات شعراء سے جو استدعا کی گئی تھی اس کی ایک ایک شق پوری ہو گئی اور حالات زندگی میں تحریر ہے کہ

"سید فضل الحسن نام اور حسرت تخلص ہے قصبہ موہان، اناؤ میں ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔" (صفحہ ۱۶۱)

ان تمام تفصیلات کے بعد بھی سند طلب کرنے کا کہ سنہ مولانا نے ہی بتلایا تھا کہ کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ انھیں حالات زندگی کے ضمن میں بتلایا گیا ہے کہ مولانا نے ایک نشست میں اپنا نظریۂ شاعری پیش کیا اور "اقسام سخن" کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ انھیں اقسام سخن کا اعادہ انھوں نے طویل نوٹ میں کیا ہے جو بحیثیت ممتحن انھوں نے ابواللیث صدیقی کی پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالہ پر لکھا تھا اور اس نوٹ کی مدد سے پرنسپل عبدالشکور نے ایک مضمون تیار کر کے اپنی کتاب "حسرت موہانی" میں شامل کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ "اوراق گل" کے مندرجات First hand knowledge پر مبنی ہیں۔ اس کے بعد بھی ہر ہر سطر اور فقرہ کے لیے سند کا مطالبہ کرنا "بحث برائے بحث" کے دائرے سے باہر نہیں۔

۱۲۹۸ھ کی تصدیق مولانا اکرام الحسن موہانی نے بھی کی ہے جس کی تفصیل خالد حسن قادری نے اپنے مضمون "غالب و حسرت کے کچھ سن و سال" مشمولہ اردو نامہ کراچی بابت مارچ

---

* سنہ ۱۸ء

(شمارہ نمبر ۴۴، ۴۵، ۴۶) درج کی ہے۔ موصوف کا تعلق بھی مولانا حسرت موہانی کے خاندان سے تھا لکھتے ہیں کہ

"حسرت کے نانا اور میری دادی آپس میں بھائی بہن تھے۔ حسرت سے دوسرا رشتہ یہ ہے کہ میرے دادا عماد الحسن اور حسرت کی والدہ شہر بانو بھائی بہن تھے اور بھی رشتے ہیں اسی وجہ سے میں بیگم حسرت مرحومہ کو ناجی بھاوج کہا کرتا تھا۔"

(اردو نامہ: مارچ ۱۹۷۳ء: صفحہ ۱۵۰)

مزید شہادت کے طور پر انھوں نے لکھا تھا کہ

"حیات الحسن صاحب ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے جو شہر بانو والدہ حسرت کے ماموں زاد بھائی تھے جو حسرت سے ایک سال بڑے تھے" (صفحہ ۱۵۱)

ان کے خطوط کے حوالے سے خالد حسن قادری نے تبلایا ہے کہ

"اکرام الحسن صاحب بتاتے ہیں کہ" میں حسرت سے چھ سال چھوٹا ہوں" اور اپنی ولادت کی تاریخ ۱۸۸۶ء م ۱۳۰۴ھ بتاتی ہے اس طرح ۱۸۸۰ء م ۱۲۹۸ھ حسرت کی تاریخ نکلتی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ میری بہن حمیدہ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئی اور وہ حسرت سے ایک سال اچھوٹی ہیں اس طرح حسرت کا سال ۱۲۹۸ھ نکلتا ہے" (صفحہ ۱۵۱)

مولانا اکرام الحسن کا کہنا ہے کہ

"دن اور تاریخ و ماہ ولادت حسرت یاد نہیں البتہ ۱۲۹۸ھ م ۱۸۸۰ء تھا" (صفحہ ۱۵۱)

مولانا اکرام الحسن رشتہ کی وجہ سے مولانا حسرت موہانی کے سال ولادت کے سلسلہ میں جن حوالوں کا ذکر کرتے ہیں وہ ثبوت اور شہادت تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے تبلائے ہوئے ہجری سال پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کیونکہ عموماً تاریخیں ہجری ماہ و سال ہی کی رائج تھیں عیسوی سے مطابق انھوں نے اپنے طور پر کی ہے اور اس بارے میں ان سے غلطی ہوئی ہے انھوں نے اپنی پیدائش کا سال ۱۳۰۴ھ م ۱۸۸۶ء تبلایا ہے جو درست ہے۔ مولانا حسرت ان سے چھ سال بڑے تھے گویا ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے عیسوی سنہ ۱۸۸۶ء میں سے

چھ سال کم کر کے ۱۲۹۸ھ کی مطابقت ۱۸۸۰ء سے کی ہے اس بارے میں نہ تو انھوں نے تقویم سے رہنمائی حاصل کی اور نہ خالد حسن قادری نے ! تقویم ہجری و عیسوی (مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی) کے مطابق یکم محرم ۱۲۹۸ھ کو ۴ دسمبر ۱۸۸۰ء تھا۔ اگر ۱۲۹۸ھ کی مطابقت ۱۸۸۰ء تسلیم کی جائے تو گویا مولانا پہلی اور ۲۷ محرم کے درمیان پیدا ہوئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مطابقت کے لیے ۱۸۸۰ء کا یہ ایک مہینہ کیوں لیا جائے۔ ۱۸۸۱ء کے گیارہ ماہ کیوں نہ لیے جائیں جو زیادہ قرین قیاس ہوں گے اس لیے اگر مولانا حسرت موہانی کا سال پیدائش ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء قرار دیا جائے تو درست ہوگا۔

جن بزرگوں کی تحریروں کے حوالے سے بات کی گئی ان سے قطع نظر صرف پرنسپل عبدالشکور اور نیاز فتح پوری رہ جاتے ہیں جن کا مولانا سے شخصی رابطہ رہا پرنسپل عبدالشکور کی کتاب "حسرت موہانی" ۱۹۴۶ء میں اس وقت شائع ہوئی جب مولانا حسرت زندہ تھے۔ سیاست اور شاعری کے حوالے سے انھوں نے مولانا سے استفسارات بھی کیے اور ان کے بیانات نقل بھی کیے ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۸ پر لکھتے ہیں کہ

"حسرت ۱۲۹۵ھ بمقام موہان پیدا ہوئے"

جب کہ صفحہ ۱۰۶ پر بتایا ہے کہ "حسرت کی عمر اب تقریباً ۶۵ سال کی ہے"[۱۲] اگر ۱۹۴۶ء میں مولانا ۶۵ برس کے تھے تو گویا ان کا سال پیدائش ۱۸۸۱ء درست ہے۔ ۱۲۹۵ھ سال پیدائش بتلاتے ہوئے وہ کوئی سند پیش نہیں کرتے۔ حالانکہ "حالات حسرت" "انگریزی ترجمہ اشعار حسرت" اور "اوراق گل" پہلے شائع ہو چکے تھے۔ "حالات حسرت" سے اقتباسات بھی ان کی کتاب میں موجود ہیں۔ اس سے اختلاف کی صورت میں وجوہ نہ بتلانا اپنے لکھے ہوئے سنہ کی سند نہ پیش کرنا اور صفحہ ۸ اور صفحہ ۱۰۶ کے بیانات میں یکسانیت کا نہ ہونا ان کی تحریر کو اعتبار کا درجہ نہیں دیتا۔ یہی حال نیاز فتح پوری کا ہے۔ ان کی مولانا سے ملاقات اس زمانہ میں ہوئی تھی جب مولانا تعلیم حاصل کرنے کے لیے فتح پور آ گئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ۔

"وہ موہان سے فتح پور آئے اور گورنمنٹ اسکول میں انگریزی تعلیم شروع کی لیکن فارغ اوقات میں مولانا سید ظہور الاسلام (مرحوم) بانی مدرسہ اسلامیہ سے

عربی اور فارسی پڑھی۔ فتح پور میں اوّل اوّل ان سے ملنے کا موقع ملا اور وہ بھی اس خصوصیت کے ساتھ کہ مجھے ان سے نسبت خواجہ تاشی حاصل تھی وہ میرے مکان سے قریب ہی شیخ شاکر علی (مرحوم) کے مردان خانے میں رہا کرتے تھے اور وہیں ہر وقت صحبتِ شعر و سخن گرم رہتی تھی۔"

(رسالہ نگار لکھنؤ: حسرت نمبر: ۱۹۵۲ء: صفحہ ۷)

نیاز فتح پوری نے خصوصیت خواجہ تاشی کے باوجود ان کا سال ولادت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی اور سنہ عمر کا تخمینہ کیا۔ حالانکہ لڑکپن میں اس نوع کے تخمینہ کا رجحان عمومیت سے ہوتا ہے۔ ان کی ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ ان کے متعدد بیانات ایک دوسرے سے مختلف رہیں۔ اس لیے ان کے بتلائے ہوئے کسی سنہ یا تخمینہ پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

ان کے علاوہ جن لوگوں نے سنہ پیدائش لکھی ہے انھوں نے تحقیق سے گریز کیا اور جو کتاب سامنے رہی اس میں درج سنہ لکھ دیا ہے ان پر تبصرہ کرنا لاحاصل ہے۔

آزاد فتح پوری کا جدید انکشاف یہ ہے کہ فتح پور ہائی اسکول میں داخلہ کے وقت سنہ ۱۸۹۴ء کو مولانا کی عمر گیارہ سال مرقوم ہے۔ اس کے حوالہ سے انھوں نے سنہ پیدائش ۱۸۸۳ء قرار دیا ہے۔ اس بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اسکول میں عمر یا سال پیدائش تحریر کرتے ہوئے بہت سے مصالح پیش نظر ہوتے رہیں اور عموماً عمر کو کم لکھانے کا رواج رہا ہے۔ دوسرے مکمل تاریخ درج نہیں صرف اندازہ سے کام لیا گیا ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے اس لیے مولانا کا سنہ پیدائش متعین کرتے ہوئے داخلہ فارم کے اندراج کو سند کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اسے دلیل بنا کر سنہ کا تعین کرنا قیاس و استقرائی اور ظنی ہوگا محض اندازہ علم الیقین عطا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ہمارے خیال میں وہ حضرات جو مولانا سے قریب رہے ہیں اور جن کے بارے میں قوی بنیادوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے سنہ پیدائش معلوم کی ہوگی اور ایسے حضرات کے بیانات میں کسی ایک سنہ پر اتفاق بھی موجود ہو تو اسے قبول کرنا دانشمندی ہوگی۔ اس طرح مولانا حسرت موہانی کا سالِ ولادت ۱۸۸۱ء م ۱۲۹۸ھ ہی ہوگا۔

استدراک: از عبد اللطیف اعظمی

اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مضمون نگار پروفیسر شفقت رضوی صاحب نے مطبوعہ مواد کی روشنی میں زیر بحث مسئلہ کا بڑی خوبی کے ساتھ تنقیدی جائزہ لیا ہے مگر مولانا کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں ایک بالکل نیا انکشاف ہوا ہے مولانا حسرت کے چھوٹے داماد، یعنی مولانا کی دوسری بیٹی خالدہ مرحومہ کے شوہر جناب نفیس احمد صدیقی صاحب (ایڈوکیٹ سپریم کورٹ) کی تحویل میں مولانا کے دو پاسپورٹ ہیں۔ پہلے کا سنہ اجرا ۱۹۳۸ء اور نمبر ۱۹۹۶۳ ہے اور دوسرے کی تاریخ اجرا ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۹ء اور نمبر ۳۴۹۱۵ ہے۔ ان دونوں پاسپورٹوں کے مطابق مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۴ر اکتوبر ۱۸۷۸ء ہے۔ امید ہے کہ اس انکشاف کے بعد یہ تنازعہ ختم ہو جائے گا۔

حواشی :-

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہمارا مضمون "حسرت کا دیوان چہارم" مطبوعہ "ماہ نو" لاہور ستمبر ۱۹۸۹ء : صفحہ ۱۱ رسالہ "سب رس" کراچی : دسمبر ۱۹۸۹ء : صفحہ ۱۱

(۲) آزاد فتح پوری نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ "پرنسپل عبدالشکور نے اپنی کتاب "حسرت موہانی" کے صفحہ ۶ پر ہجری سن ۱۲۹۵ھ کو اور صفحہ ۱۲۳ پر عیسوی سنہ ۱۸۷۵ء کو حسرت کا سنہ پیدائش بتلایا ہے"۔ میرے پیش نظر کتاب "حسرت موہانی" کا دوسرا ایڈیشن ہے اس میں ۱۲۹۵ھ صفحہ ۸ پر درج ہے۔ ۱۸۷۵ء کا حوالہ با وجود تلاش کسی صفحہ پر نہیں ملا۔ ممکن ہے پہلے ایڈیشن میں ہو یا اگر اس کا کوئی ترمیم شدہ ایڈیشن شائع ہوا ہے تو ہمارے علم میں نہیں ہے۔

ہیرلڈ لیم
عزیز احمد

چنگیز خاں۔ فاتح عالم

چوتھا باب

تموچن کے جنگجو

منگولوں کے سرخ بالوں والے خان نے پہلے گھمسان کے رن میں لڑ کر فتح حاصل کی۔ اب وہ بڑے فخر سے ہاتھی دانت یا سینگ سے مرصع جریب اپنے ہاتھ میں لیے رہتا۔ اس جریب کی شکل ایک چھوٹے سے عصا کی تھی، یہ سپہ سالار یعنی لوگوں کے سردار کا نشان تھا۔

وہ ہر وقت اسی آرزو میں گرفتار رہتا کہ اور زیادہ آدمی اس کے نوکر بنیں۔ اس کی یہ خواہش ان تکلیف کے ایام کی یادگار تھی جب بغورچی نے اس پر رحم کھایا تھا۔ اور موٹی عقل والے قسار کے تبروں نے اس کی جان بچائی تھی۔

تموچن کے نزدیک قوت کا پیمانہ سیاسی طاقت نہ تھا۔ ابھی تک اس نے سیاسی طاقت کے متعلق غور نہ کیا تھا۔ نہ قوت کا انحصار دولت پر تھا، جو کچھ زیادہ کام نہ آتی۔ چونکہ وہ مغل تھا، اس لیے وہ وہی چاہتا تھا جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کے نزدیک قوت کا انحصار انسانوں کی قوت اور تعداد پر تھا۔ جب وہ اپنے بہادروں کی تعریف کرتا تو کہتا کہ انھوں نے سخت پتھروں کو کچل کے ریت بنا دیا ہے۔ چٹانوں کو الٹ دیا ہے اور گہرے پانی کے تموج کو ٹھہرا دیا ہے۔

سب سے زیادہ وہ وفاداری کا جویا تھا۔ اہل قبائل کے نزدیک دغا ناقابل معافی گناہ تھی۔ غدار پوری کی پوری خیموں کی بستی کو تباہ و برباد کرا سکتا تھا یا پورے گروہ کو دشمن کے جال میں پھنسوا سکتا تھا۔ سب سے زیادہ پسندیدہ جو صفت تھی وہ قبیلے ... اور یہ بھی کہ لیجیے کہ

خان ۔۔۔۔ سے وفاداری کی تھی۔" ایسے آدمی کو کیا کہئے جو صبح کو وعدہ کرے اور رات کو اُسے توڑدے۔

آدمیوں کی اُسے جو تمنّا تھی اُس کا اندازہ اس کی دعا سے ہوتا ہے۔ مغل کا معمول یہ تھا کہ وہ ایک کھڑے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھا کرتا جس کو وہ تنگری کا مسکن سمجھتا۔ تنگری اوپر کی ہوا کی وہ روحیں تھیں، جو طوفان ورعد اور لامتناہی آسمان کے دوسرے خوف انگیز مظاہر کو حرکت میں لاتیں۔ وہ اپنی پیٹی کاندھے پر ڈال کے چاروں سمتوں کی ہواؤں سے یوں دعا مانگتا۔
"اے لامتناہی آسمان مجھ پر کرم کر۔ اوپر کی ہواؤں کی روحوں کو میرا دوست بنا کر بھیج لیکن زمین پر آدمیوں کو بھیج تاکہ وہ میری مدد کر سکیں۔"

اور نو یاکوں کی دموں والے جھنڈے کے نیچے آدمی بڑی تعداد میں جمع ہوتے رہے۔ گھرانا گھرانا اور دس بیس نہیں، بلکہ سیکڑوں۔ ایک آوارہ گرد قبیلہ جس سے اس کے پہلے کے خان سے دشمنی ہو گئی تھی۔ سنجیدگی سے مغلوں کے تموچن کے فضائل کے متعلق یوں رائے زنی کرتا ہے ۔ " وہ شکاری کو اجازت دیتا ہے کہ بڑے بڑے شکاروں میں جتنا شکار خود کرے خود اپنے پاس رکھے۔ لڑائی کے بعد ہر آدمی لوٹ کا وہ حصہ اپنے پاس رکھ سکتا ہے جو قاعدے سے اس کا ہو جائے۔ اس نے اکثر اپنے کندھے سے ملبوس اتار کے تحفے کے طور پر دیا ہے۔ وہ بارہا اپنے گھوڑے سے اُترا ہے اور گھوڑا ضرورت مند کو دے چکا ہے۔"
کوئی شخص جسے چیزیں جمع کرنے کا شوق ہو، نادر اشیاء کو اس شوق سے جمع نہیں کرتا تھا جیسے یہ مغل خان ان آوارہ گردوں کو۔

وہ اپنے اطراف ایک دربار اکٹھا کر رہا تھا جس میں حاجب اور مشیر نہ تھے اور جو جنگجو افراد پر مشتمل تھا۔ لڑائی میں اس کے پہلے ساتھی لبغورچی اور رفتار تو تھے ہی، ان کے علاوہ ارغون تھا جو ستار بجاتا تھا۔ جیبی نویان اور مقولی دو چالاک اور جنگ کے زخموں سے منجھے ہوئے سپہ سالار تھے، اور سوبدائی بہادر تھا جو بڑے معرکے کا تیرانداز تھا۔
ارغون اگرچہ مغنّی نہ تھا، تب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑا ہی خوش مزاج تھا۔ اس کی صرف ایک جھلک ہمیں اس موقع پر دکھائی دیتی ہے جب کہ خان سے اس نے ایک طلائی

ستار مستعار لیا اور اسے گم کر دیا۔ تیز مزاج مغل کو تاؤ آ گیا اور اس نے اپنے دو سرداروں کو ارغون کو قتل کرنے کے لیے بھیجا۔ بجائے قتل کرنے کے انھوں نے مجرم کو پکڑ کے دو مشکیزے بھر کے شراب پلادی اور پھر اسے چھپا دیا۔ دوسری صبح انھوں نے اسے نشے سے جگایا اور خان کی یورت کے دروازے تک لے گئے اور کہا۔
اے خان تیری اردو میں روشنی پھیلنے لگی ہے دروازہ کھول اور رحم کا کرشمہ دکھا۔
خاموشی کے لمحے سے فائدہ اٹھا کے ارغون نے گانا شروع کیا:۔

”وطائر گاتا ہے تنگ تانگ
آخری نوا سے پہلے اس پر شہباز جھپٹتا ہے۔
اسی طرح میرے آقا کا غضب مجھ پر نازل ہوا۔
افسوس! مجھے ساغر کی گردش سے محبت ہے، لیکن میں چور نہیں۔“

چوری کی سزا موت تھی لیکن ارغون کو معاف کر دیا گیا اور آج کے دن تک طلائی ستارہ کا معمّا حل نہ ہو پایا۔

خان کے یہ بہادر سردار گوبی کے پورے علاقے میں ”قیات“ یا ”امڈتے ہوئے دھارے“ کہلاتے تھے۔ ان میں سے دو نے ابھی جو لڑکے تھے کچھ عرصے بعد طول البلد کے نوّے درجوں میں بڑی تباہی اور بربادی پھیلائی۔ ان میں سے ایک جبی نویان (تیر شہزادہ) تھا اور دوسرا سوبدائی بہادر۔

جبی نویان منظر پر یوں نمودار ہوتا ہے کہ وہ ایک دشمن قبیلے کا نوجوان تھا اور ایک لڑائی کے بعد تعاقب میں پکڑا گیا اور تموچن کے سامنے مغل اسے لے آئے۔ اس کے پاس گھوڑا نہ تھا اس نے گھوڑا مانگا اور کہا کہ وہ مغلوں میں سے جو اس کا مقابلہ کرنا چاہے اس کا تنہا مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ تموچن نے اس کی درخواست منظور کر لی اور نوجوان جبی کو ایک تیز سفید ناک والا گھوڑا دے دیا۔ سوار ہو کے جبی مغلوں کی صف کو کاٹتا ہوا بچ کر نکل گیا۔ پھر وہ واپس آ گیا اور اس نے خان کا نوکر بننے کی خواہش ظاہر کی۔

بہت عرصے بعد جب جبی نویان، طیان شان کے پہاڑوں میں گشت لگاتا ہوا قرا ختائی کے شلوک قبیلوں کا تعاقب کر رہا تھا، اس نے ہزار سفید ناک والے گھوڑوں کا ایک گلّہ فراہم کر کے خان کو تحفے کے طور پر بھیجا یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اس واقعہ کو نہیں بھولا جس میں اس کی

جان بچائی گئی تھی۔ نوجوان جبی سے تندی میں کم، لیکن فراست میں زیادہ سوبدائی تھا جس کا تعلق شمالی آہوؤں والے قبیلے الوس اریانجی سے تھا۔ اس کی طبیعت میں بھی حصولِ مقصد کے لیے تموچن جیسی سختی اور سنگدلی کا کچھ حصہ تھا۔ تاتاریوں سے ایک لڑائی میں جھڑپ سے پہلے خان نے پوچھا کہ کون سا سردار پہلا حملہ کرے گا۔ سوبدائی آگے بڑھا۔ خان نے اس کی تعریف کی اور اس سے کہا کہ سو چنے ہوئے جنگجوؤں کو اپنی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ لے۔

سوبدائی بہادر نے کہا کہ وہ اپنے ساتھ اور کسی کو نہیں لینا چاہتا۔ وہ لشکر سے پہلے تنہا آگے جانا چاہتا تھا۔

ذرا شک کے عالم میں تموچن نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور سوبدائی تاتاریوں کے خیموں میں پہنچا، جہاں اس نے یہ بیان کیا کہ اس نے خان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور ان کے قبیلے میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اس نے انھیں یقین دلایا کہ مغلوں کا لشکر قریب میں کہیں نہیں اور جب مغلوں نے ان پر حملہ کیا تو وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ مغلوں نے انھیں تتر بتر کر دیا۔

سوبدائی نے نوجوان خان سے وعدہ کیا۔ "میں تجھے دشمنوں سے اس طرح بچاؤں گا جیسے نمدہ سرد ہوا سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں تیرے لیے یہ خدمت انجام دوں گا۔"

اُس کے سورماؤں نے اسے یقین دلایا: "جب ہم حسین عورتیں اور اعلیٰ درجے کے گھوڑے پکڑیں گے تو سب کے سب تیرے پاس لائیں گے۔ اگر ہم تیرا حکم بجا نہ لائیں یا تجھے نقصان پہنچائیں تو تو ہمیں بنجر ویرانوں میں ہلاک ہونے کے لیے اکیلا چھوڑ دیجو۔"

تموچن نے اپنے بہادروں کو یہ جواب دیا۔ "جب تم میرے پاس آئے تو میری حالت ایک خوابیدہ آدمی کی سی تھی۔ پہلے میں رنجیدہ بیٹھا تھا اور تم نے مجھے جگا دیا۔

وہ فی الحقیقت یکا مغلوں کا خان تھا اور وہ اُسے سردار مانتے تھے۔ اس نے ان سورماؤں میں سے ہر ایک کو وہ تحسین اور اعزاز بخشا جس کا وہ مستحق تھا اور ہر شخص کے کردار کے لحاظ سے۔

اس نے کہا کہ قوریلتائی (سرداروں کی مجلس مشاورت) میں بغورچی اُس سے سب کے مقابل زیادہ قریب بیٹھا کرے گا اور اس کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جنھیں خان کے تبر اور کمان کو سنبھالنے اور ساتھ رکھنے کی اجازت ہو گی۔ دو سرداں کو اس نے غذا کا ذمّہ دار مقرر کیا اور انھیں

گلّوں کی حفاظت سونپی اور دوسروں کو "کبت کوں" کا اور خادموں کا حاکم مامور کیا۔ قسار کو، جو جسمانی طور پر بڑا طاقتور تھا مگر شئے لطیف سے محروم، اس نے تیغ بردار مقرر کیا۔

اپنے نائبوں، لشکر کے سرداروں کی خدمت کے لیے تموجن نے ایسے آدمیوں کو منتخب کیا جو فہیم بھی تھے اور جری بھی۔ وہ اس ہوشیاری کی قدر و قیمت بھی جانتا تھا، جس کا تقاضا یہ ہے کہ وقت پر غصّہ کو پی جانا چاہیے اور جب مناسب وقت آجائے تو ضرب لگانی چاہیے۔ حقیقت میں مغل کردار کی اصل بنیاد ہی صبر ہے۔ جو لوگ بہادر اور بیوقوفی کی حد تک نڈر تھے، انھیں اس نے کبتکوں اور سامان رسد کی حفاظت سپرد کی، جو احمق تھے وہ گلّوں کی نگہبانی کے لیے باقی رہنے دیے گئے۔

ایک سردار کے متعلق اس نے کہا: "یسوتائی سے زیادہ جری اور کوئی نہیں۔ جیسی انوکھی خوبیاں اس میں ہیں اور کسی میں نہیں، لیکن چونکہ لمبی لمبی مسافتوں کے طے کرنے میں وہ خود نہیں تھکتا اور نہ اسے بھوک پیاس لگتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے افسر اور سپاہیوں کو بھی یہ تکلیفیں نہیں ستاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعلیٰ فوجی عہدے کے قابل نہیں۔ سپہ سالار کو چاہیے کہ وہ بھوک پیاس کا لحاظ کرے، تاکہ جو لوگ اس کے تحت ہیں، وہ ان کی تکلیفوں کو سمجھ سکے اور وہ انسانوں اور جانوروں کی طاقتوں کو وقت پر محفوظ اور مہیّا کر سکے۔

اپنے ان "زہریلے جنگجوؤں" والے دربار پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے نوجوان خان کو پوری پوری سنگدلانہ مستقل مزاجی اور بڑی متوازن منصف مزاجی کی ہمیشہ ضرورت پڑتی۔ جو سردار اس کے جھنڈے تلے جمع ہوتے وہ واٹکنگ لوگوں کی طرح سرکش تھے۔ داستان میں ذکر ہے کہ کس طرح یورنہ کا باپ اپنے ساتھیوں اور اپنے سات جوان بیٹوں کو خان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے آیا۔ تحفے دیے اور لیے گئے اور ساتوں بیٹوں کو مغلوں کے درمیان جگہ دی گئی، لیکن ان کی وجہ سے آپس میں بڑی تلخی پیدا ہوئی، خاص طور پر اس ایک کی وجہ سے جو شامان بھی تھا اور جس کا نام تب تنگری تھا، چونکہ وہ شامان تھا، اس لیے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کی روح جب چاہے جسم کو چھوڑ کے عالم ارواح میں داخل ہو سکتی ہے اسے مستقبل کی بات جاننے کا ملکہ تھا۔

اور تب تنگری میں حب جاہ بڑی خطرناک حد تک موجود تھی۔ کئی دن مختلف سرداروں کے خیموں میں بسر کرنے کے بعد ایک دن اس نے اور اس کے بھائیوں نے قسّار کو گھونسوں اور لاٹھیوں سے پیٹ ڈالا۔

قسّار نے خان تموچن سے شکایت کی۔

اس کے بھائی نے جواب دیا "تو تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ طاقت اور ہوشیاری میں کوئی تیرے برابر نہیں۔ پھر تو نے ان لوگوں سے کیسے مار کھائی؟"

اس پر قسار کو غصہ آ گیا اور وہ اور وہیں اپنے گھر چلا گیا اور تموچن کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں تب تنگری خان کے پاس پہنچا اور کہا "میری روح نے دوسرے عالم میں یہ الفاظ سنے ہیں اور یہ حقیقت مجھے خود آسمان نے بتائی ہے کہ تموچن اپنے لوگوں پر کچھ دن حکومت کرے گا، لیکن پھر قسار حکومت کرے گا، اگر تو قسار کا خاتمہ نہ کر دے گا تو تیری حکومت زیادہ دن نہ چلے گی۔"

اس جادوگر پجاری کی چالاکی کا خان پر ضرور اثر ہوا، کیونکہ وہ اسے پیشین گوئی سمجھتا تھا۔ اُس شام سوار ہو کے وہ اپنے جنگجوؤں کے ایک چھوٹے سے جتھے کو ساتھ لے کے قسّار کو گرفتار کرنے نکلا۔ اس کی اطلاع اس کی ماں اولون کو مل گئی۔ وہ جلدی سے ایک گاڑی میں تیز قدم اونٹ جتوا کے خان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔

وہ قسار کے خیموں میں پہنچی اور اُن جنگجوؤں کے درمیان سے ہو کے گزری جو ان خیموں کو گھیرے ہوئے تھے۔ خاص یورت میں جب وہ داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ تموچن، قسّار کے سامنے کھڑا ہے۔ قسّار دوزانو ہے اور اس کی ٹوپی اور اس کی پیٹی اس سے چھینی جا چکی ہے۔ خان بڑے غصے کے عالم میں تھا اور اس کے چھوٹے بھائی پر جو بڑا تیرانداز تھا، موت کا خوف غالب تھا۔

اولون ارادے کی پکی عورت تھی۔ اس نے قسار کی زنجیریں کھول دیں اور اس کی ٹوپی اور اس کی پیٹی اس کے حوالے کی۔ دوزانو ہو کے اس نے اپنا سینہ کھول دیا اور تموچن سے کہا۔ "تم دونوں نے ان چھاتیوں کا دودھ پیا ہے۔ تموچن تجھے اور بہت سے ہنر ملے ہیں، لیکن یہ

خوبی قستار ہی کو عطا ہوئی ہے کہ وہ اس طاقت اور کمال سے تیر چلائے کہ ایک بھی خطا نہ ہونے پائے۔ جب آدمیوں نے تجھ سے بغاوت کی ہے تو اس نے اپنے تیروں سے انھیں مار گرایا ہے۔"

نوجوان خان خاموشی سے سنتا رہا اور اس وقت تک ٹھہرا رہا، جب تک اس کی ماں کا غصہ نہ اُترا۔ پھر یورت سے یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ "جب میں نے یہ حرکت کی تو میں خوفزدہ تھا اور اب میں شرمندہ ہوں۔"

تب تنگری خیموں میں پھرتا رہا اور نفاق پھیلاتا رہا۔ وہ دعویٰ کرتا کہ فوق الفطری الہام اس کی ساری سازشوں کا ماخذ ہیں، اس لیے وہ مغل خان کے پہلو میں کانٹے کی طرح کھٹکتا اس نے اپنے ساتھیوں کی اچھی خاصی جماعت تیار کرلی اور اس میں حُبِّ جاہ بہت تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ نوجوان جنگجو کے اثر کو توڑ سکتا ہے۔ وہ اور اس کے ساتھی تموچن سے مقابلہ کرتے ہوئے ڈرتے تھے، لیکن انھوں نے خان کے سب سے چھوٹے بھائی تموجو کو پکڑ کے زبردستی مجبور کیا کہ وہ ان کے سامنے دوزانو ہو

رسم کے مطابق مغلوں کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ آپس کے جھگڑے ہتھیاروں سے طے کریں، لیکن شامان کی اس حرکت کے بعد تموچن نے تموجو کو بلا بھیجا اور اس سے کہا "آج جب تنگری میرے یورت میں آئے گا، جیسا تیرا جی چاہے اس کے ساتھ سلوک کر۔"

اس کی اپنی حیثیت اس جھگڑے میں بڑی نازک تھی منلیک جو ایک قبیلے کا سردار اور بورتہ کا باپ تھا، کئی جنگوں میں اس کا ساتھ دے چکا تھا اور اس لیے اسے بڑے اعزاز بخشے گئے تھے۔ تب تنگری خود شامان تھا، مستقبل کا حال جانتا تھا اور ساحر تھا۔ بحیثیت خان کے تموچن سے اس کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ لڑائی جھگڑوں میں منصف کا فرض انجام دے، نہ یہ کہ جو اس کا اپنا جی چاہے کر گزرے۔

وہ اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا آگ تاپ رہا تھا کہ منلیک اپنے ساتوں بیٹوں کے ساتھ آیا۔ اس نے انھیں مرحبا کہا اور وہ اس کے سیدھے ہاتھ کی طرف بیٹھ گئے۔ اور عین اسی وقت تموجو اندر داخل ہوا۔ قاعدہ کے مطابق سارے ہتھیار تو یورت کے دروازے پر چھوڑ دیے گئے تھے اور اس نوجوان لڑکے نے تب تنگری کے شانوں کو جکڑ لیا۔ کل تو نے مجھے اپنے سامنے دوزانو

ہونے پر مجبور کیا۔ لیکن آج میں تجھ سے طاقت آزمائی کروں گا۔"

کچھ دیر تک وہ زور آزمائی کرتے رہے اور منلیک کے دوسرے بیٹے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

تموچن نے دونوں حریفوں سے کہا۔ یہاں کشتی نہ لڑو، باہر جاؤ۔"

یورت کے باہر تین مضبوط پہلوان پہلے ہی سے منتظر تھے۔ اسی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ نہیں معلوم کہ تموجن نے انھیں وہاں مقرر کیا تھا یا خان نے۔ جیسے ہی تب تنگری باہر نکلا انھوں نے اُسے پکڑ کے اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی اور اسے ایک طرف پٹک دیا۔ وہ ایک چھکڑے کے پہیے کے قریب بے حس و حرکت گر پڑا۔

تموجن نے اپنے بھائی خان کو پکار کر کہا۔ "کل تب تنگری نے مجھے زبردستی اپنے سامنے دوزانو کیا تھا، اب جب کہ میں اس سے طاقت آزمائی کرنا چاہتا ہوں تو وہ لیٹا ہوا ہے اور مقابلے کے لیے نہیں اُٹھتا ہے۔"

منلیک اور اس کے بیٹے دروازے کی طرف گئے اور باہر دیکھا جہاں شامان کا جسم پڑا ہوا تھا۔ تب بوڑھے سردار پر صدمے کا اثر ہوا اور وہ تموچن کی طرف پلٹا۔ اے خان میں تیری خدمت کرتا رہا۔ آج کے دن تک۔"

اس کا مطلب صاف ظاہر تھا اور اس کے چھ بیٹے تیار تھے کہ مغل پر جھپٹ پڑیں۔ تموچن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا اور اس دروازے کے سوا یورت سے باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ مدد کے لیے کسی کو پکارتا اس نے سختی سے قبیلے والوں سے کہا۔ "ہٹ جاؤ۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔"

اس خلاف توقع حکم پر حیرت سے وہ ہٹ گئے اور وہ خیمے سے باہر اپنے جنگجو سنتریوں کے پاس جا پہنچا۔ ابھی تک تو یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا اور ایسے قصے اس سرخ بالوں والے خان کے اطراف آئے دن پیش آتے ہی رہتے تھے، لیکن اس کی خواہش یہ تھی کہ منلیک کے قبیلے سے خون کی دشمنی نہ پیدا ہونے پائے۔ شامان کے جسم پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گیا کہ تب تنگری مر کے ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ اس کا اپنا یورت اس طرح ہٹایا جائے کہ شامان کا جسم اس کے اندر آ جائے اور دروازے کا پردہ بند کر کے کس کے باندھ دیا گیا۔

رات آئی تو تموچن نے اپنے دو آدمیوں کو بھیجا کہ پجاری جادوگر کی لاش کو خیمے کے دودکش سے نکال لے جائیں۔ دوسرے دن جب اردو کے آدمیوں کو تشویش ہوئی کہ جادوگر کا کیا حشر ہوا تو تموچن نے دروازے کا پردہ کھول دیا اور انھیں آگاہ کیا۔

"تب تنگری میرے بھائیوں کے خلاف سازشیں کرتا تھا اور انھیں زد وکوب کرتا تھا۔ اب آسمان کی روحیں اس کی روح اور جسم دونوں کو اٹھالے گئیں۔"

لیکن اکیلے میں اس نے منلیک کو سنجیدگی سے سمجھایا۔ "تو نے اپنے بیٹوں کو اطاعت کرنا نہیں سکھایا اس کی کوشش یہ تھی کہ میری برابری کرے، اس لیے دوسروں کی طرح میں نے اس کا کام تمام کر دیا۔ رہ گیا تو تو میں نے یہ عہد کیا ہے کہ تجھے ہرگز ہلاک نہ کروں گا، اس لیے کہ اس قصّے کو ختم کریں[1]۔"

گوبی کی قبائلی لڑائیاں بہرحال کسی طرح ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ بڑے بڑے قبیلے بھیڑیوں کی طرح لڑتے، ایک دوسرے کا پیچھا کرتے، اور ایک دوسرے کا شکار کھیلتے۔ اگرچہ مغلوں کا شمار ابھی تک کمزور قوموں میں تھا مگر اب ایک لاکھ خیمے خان کے جھنڈے تلے جمع تھے۔ چالاکی سے وہ ان کی حفاظت کرتا، اپنی خوفناک شجاعت سے وہ اپنے جنگجوؤں کی ہمت بڑھاتا۔ بجائے چند خاندانوں کے اب ایک پوری قوم کی حفاظت کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ اب وہ راتوں کو آرام کی نیند سوتا۔ اس کے ریوڑ جن میں خان کے خراج کے جانور بھی شامل تھے، اطمینان سے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ اب اس کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ اس کی قوت اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس کے بیٹے اس کے ساتھ سواری کرتے اور ادھر اُدھر اپنے لیے بیویاں ڈھونڈتے، جیسے وہ خود ایک

---

[1] مغل "شا گا سانگ ست زین" کا انداز ذرا تمثیلی ہے اور اس سے کچھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گوبی میں جو واقعات پیش آئے وہ معدودے چند آدمیوں کی شجاعت یا چالاکی یا دغابازی کا نتیجہ تھے۔ حقیقت میں اس شامان کی سازش بہت دنوں تک باقی رہی اور طرفین کے حامی بڑے طاقتور گروہ تھے۔ اپنے لحاظ سے یہ کشمکش اتنی ہی اہم تھی جیسے یورپ میں شاہ د کلیسا کی وہ لڑائی جو فریڈرک ثانی اور انوسنٹ چہارم کے زمانے میں لڑائی گئی۔ یورپ کی تاریخ کا یہ واحد واقعہ چنگیز کے دور کے کچھ ہی عرصے بعد کا ہے۔

زمانے میں یسوکائی کے ساتھ میدانوں کا سفر کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا ورثہ اپنے دشمنوں سے چھینا تھا اور وہ اس پر اڑا ہوا تھا کہ اس ورثے پر قابض رہے۔

لیکن اس کے ذہن میں ایک اور بات بھی تھی۔ ایک تجویز تھی جو پوری طرح مکمل نہ ہونے پائی تھی۔ ایک آرزو تھی جس کا پوری طرح اظہار نہ ہوا تھا۔

ایک دن اس نے اپنے مشیروں کی مجلس کے سامنے بیان کیا۔ "ہمارے بزرگوں نے ہم سے ہمیشہ یہی کہا کہ الگ الگ طرح کے دل اور دماغ ایک ہی جسم میں جمع نہیں ہو سکتے، مگر میرا ارادہ ہے کہ میں یہ بھی کر دکھاؤں۔ میں اپنی حکومت اپنے ہمسایوں پر بھی پھیلاؤں گا۔"

اپنے "زہریلے جنگجوؤں" کو قبیلوں کی ایک برادری میں ڈھالنا، پرانا کینہ رکھنے والے دشمنوں پر اپنی حکومت جمانا ــــ یہ اس کا ارادہ تھا اور بڑے صبر و استقلال سے اس نے مقصد کی تکمیل کی کوشش شروع کی۔

پانچواں باب

جب کوہ جیتہ پر پرچم لہرایا

ہمیں یہاں اُن لڑائیوں سے غرض نہیں ہے جن میں خانہ بدوش قبائل تاتاری اور مغل مکریت، اور قرایت، نائیان اور الیغوران مشغول تھے اور جو مرتفع چراگاہوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ختا کی دیوار عظیم سے لے کر مغرب میں وسط ایشیا کی دور دراز پہاڑیوں تک لڑی جاتی رہیں۔ بارھویں صدی عیسوی ختم ہو رہی تھی اور تموچن اس کام کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ قبیلوں کی ایک برادری بنانا جو اس کے بزرگوں کے قول کے مطابق ناممکن تھا۔ صرف اس طرح یہ کام پورا ہو سکتا تھا کہ ایک قبیلہ اور سب قبیلوں کا سردار بن جائے۔

قوم قرایت جن کے شہر قافلوں کی اس شاہراہ پر تھے جو ختا کے شمالی دروازوں سے مغرب کی طرف جاتی تھی ایک طرح سے توازن قوت کے حامل تھے۔ طغرل کے پاس جسے پریسٹر جان بھی کہتے ہیں، تموچن اس لیے گیا کہ اس کے سامنے باہمی معاہدے کی تجویز پیش کرے۔ مغل اب اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ ایسی تجویز پیش کرنا اس کے لیے مناسب تھا۔

"اے میرے باپ بغیر تیری مدد کے میں دشمنوں کی چھیڑ سے محفوظ ہو کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور نہ تو مجھ سے پکی دوستی کیے بغیر امن سے گزر کر سکتا ہے۔ تیرے دغا باز بھائی بند تیرے علاقے پر حملہ کر کے چراگاہوں کو آپس میں بانٹ لیں گے۔ تیرا بیٹا ابھی تو اتنا عقلمند نہیں کہ یہ سمجھ سکے لیکن اگر تیرے دشمنوں نے غلبہ پا لیا تو اس کو طاقت اور جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ہم دونوں کے لیے اپنی حکومت قائم رکھنے اور جان سلامت رکھنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم ایسی دوستی اور یگانگت پر قائم رہیں جسے کوئی نہ توڑ سکے۔ اگر میں تیرا بیٹا بن جاؤں تو ہم دونوں کے لیے اس معاملے کا فیصلہ ہو جائے۔

تموچن کو تو اس کا حق پہنچتا ہی تھا کہ وہ عمر رسیدہ خان سے اس کی درخواست کرے کہ وہ اسے متبنیٰ بنالے۔ پریسٹر جان نے اس کی درخواست منظور کرلی۔ وہ بوڑھا تھا اور اس نوجوان مغل کو بہت چاہتا تھا۔

اس معاہدے پر تموچن ثابت قدم رہا۔ جب قرائیوں کو، ان کے شہروں اور ان کی زمینوں سے مغرب کے قبیلوں نے جو بیشتر بدھ مت والے یا مسلمان تھے، اور عیسائی اور شامان پرست قرایت سے مذہبی تعصب برتتے تھے، نکال باہر کیا تو اس مغل سردار نے اپنے ان امڈتے ہوئے دھاروں کو شکست خوردہ سردار کی مدد کے لیے روانہ کیا۔

اور امتحاناً بوڑھے قرایت کے حلیف کی حیثیت سے اس نے سیاست کی مشق بھی شروع کی۔ اس کے خیال میں یہ موقع بڑا اچھا تھا۔ چین کی دیوار عظیم کے اس پار ختا[1] کا شہنشاہ زریں سوتے میں ذرا چونکا اور اسے جھیل بویر نور کے تاتاری یاد آگئے، جنھوں نے اس کی سرحدوں پر کچھ چھیڑخانی کی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ بنفس نفیس دیوار کے اس پار بہت بڑے پیمانے پر فوج کشی کرے گا اور خطا کا راہل قبائل کو سزا دے گا۔ اس اعلان سے اس کی اپنی رعایا میں بڑا خوف پیدا ہوا۔ بالآخر ایک بڑے افسر کو ایک چینی فوج کے ساتھ تاتاریوں کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا، لیکن حسب معمول تاتاری بلا زخم کھائے، بلا شکست کھائے، پیچھے ہٹ کے تتر بتر ہوگئے۔ ختائی فوج جو زیادہ تر پیدل تھی، خانہ بدوشوں کو نہ پاسکی۔

اس کی اطلاع تموچن کو ملی اور جتنی تیزی سے مار مار کے ٹٹوؤں کو بھگایا جاسکتا تھا کہ اس کا پیغام میدانوں کے اس پار پہنچ جائے، اتنی ہی تیزی سے تموچن نے کام کیا۔ اس نے

---

[1] تیرھویں صدی کا چین جو اس زمانے میں چن یا شمال کے خاندانِ زریں اور جنوب میں قدیم خانوادہ سنگ کے درمیان منقسم تھے۔ "کیتھے" کا لفظ ختا سے مشتق ہے۔ یہ لفظ تاتاری چین کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس خانوادے کے لیے بھی جس کی حکومت چن خانوادے سے پہلے تھی۔ وسط ایشیا اور روس میں آج بھی چین کو ختا کہتے ہیں۔ یورپ کے اولین بحری سیاحوں نے یہ لفظ یورپ میں رائج کیا۔

اپنے سارے قبیلے والوں کو جمع کیا اور پریسٹر جان کو یہ پیغام بھیجا کہ تاتاریوں ہی کا قبیلہ وہ ہے جس نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ قرابیت نے لبیک کہا اور دونوں کے متحدہ لشکروں نے تاتاریوں پر حملہ کیا جو پیچھے اس وجہ سے نہ ہٹ سکتے تھے کہ ان کے عقب میں ختا کی فوجیں تھیں۔

اب جو جنگ ہوئی۔ اس میں تاتاریوں کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا۔ مختلف فتحمند قبیلوں کے ہاتھ بہت سے قیدی لگے اور ختا کی حملہ آور فوج کے سپہ سالار کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع مل گیا کہ فتح کا سہرا اسی کے سر ہے اور اس نے یہی دعویٰ کیا۔ اس نے پریسٹر جان کو اونگ خان (خانوں کا سردار) اور تموچن کو "باغیوں کا دشمن سالار" کا لقب دیا۔ اس ساری عزت افزائی میں ختائی سپہ سالار کو کچھ زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ اس نے صرف ایک چاندی کا جھولا، سنہرے غلاف کے ساتھ تحفتہً بھجوا دیا۔ جنگ آزمودہ مغل کو یہ لقب اور یہ تحفہ دونوں بڑے عجیب معلوم ہوئے ہوں گے۔ بہر حال یہ جھولا تو شاید پہلا جھولا تھا جو ان بنجر علاقوں میں کسی نے دیکھا اور یہ خان کے خیمے میں کئی روز تک منظرِ عام پر رکھا رہا۔

"قیات کی صفوں میں نئے نئے جنگجو شریک ہوتے گئے۔ تموچن اپنے بیٹوں کو جبی نویان (تیر شہزادے) کے ساتھ شہسواری کرتا دیکھتا۔ جبی نویان کو سموری جوتے اور رد پہلی زرہ پہنے پہنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ یہ دونوں چیزیں اس نے ایک آوارہ گرد ختائی سے لوٹی تھیں جبی نویان کو اس وقت تک چین نہ آتا جب تک وہ خود اور اس کے پیچھے پیچھے ساتھیوں کا ایک دستہ دور تک سواری کرتا ہوا نہ نکل جاتا۔ وہ تموچن کے بڑے بیٹے جوجی کا بڑا اچھا اتالیق تھا۔ اس جوجی کا نسب مبہم تھا۔ وہ ہمیشہ سوچتا رہتا، کھنچا کھنچا سا رہتا، لیکن طبیعتہً اس قدر دلیر تھا کہ خان اس سے بہت خوش تھا۔

یہ بارھویں صدی کے ختم کا زمانہ تھا۔ تموچن اپنے گھرانے کے لوگوں کو ان دریاؤں کے کنارے شکار کے لیے لے گیا تھا جو قرابیت کی زمینوں سے قریب تھے۔ شکار میں نرغے کے لیے سواروں کا حلقہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ انھوں نے نرغے میں بہت سے بارہ سنگھے، ہرن اور دوسرے چھوٹے موٹے جانور گھیر لیے تھے اور پھر وہ حلقے کو تنگ کرنے گئے اور اپنی کڑی خمدار کمانوں سے شکار کھیلتے رہے یہاں تک کہ چکنی چکنی چٹانوں کے درمیان آخری جانور تک شکار ہو گیا۔ مغلوں کا شکار تضیع اوقات نہ ہوتا تھا۔

وہ سرسبز پوش میدان میں خیمہ پوش کبت کا ئں اور اونٹ گاڑیوں میں شکاریوں کا انتظار ہو رہا تھا جیسے ہی شکاری آئے، بیل کھول دیے گئے۔ "یورتوں"، اور خیموں کی میخیں گاڑ دی گئیں اور رڑھا نچوں پر سمور چڑھا دیا گیا۔ جا بجا آگ جلائی گئی۔

شکار کا بہت سا حصہ طغرل کے لیے جو اب اونگ خان تھا، محفوظ رکھا جاتا تھا۔ قرایت مغلوں سے ذرا زیادتی کرتے تھے۔ ایسی لوٹ جو دراصل تموچن کے آدمیوں کا حصہ تھی۔ اونگ خان کے آدمیوں نے چھین لی اور مغل سردار نے اُسے برداشت کر لیا۔

قرایت کے علاقے میں اس کے دشمن بہت تھے۔ مثلاً بورچیچن کی اولاد جو اسے خان کے منصب سے معزول کرنا چاہتی تھی۔ اور قرایت سردار کی نظروں سے گرانا چاہتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے منھ بولے باپ کے پاس جا رہا تھا۔ دونوں میں یہ عہد تھا کہ اگر ان کے درمیان باہم کوئی اختلاف پیدا ہوا تو ایک دوسرے کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ بلکہ دونوں مل کے آپس میں اطمینان سے بات چیت کریں تاکہ دونوں کو اصل حقیقت کا علم ہو جائے

تموچن نے تلخ تجربے سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب اونگ خان مر جائے گا تو پھر سے آپس میں جنگ ہوگی، لیکن قرایت میں جنگجوؤں کے لیے۔ جتنے بھی تھے جو اس کے حامی تھے۔ مثلاً جو دستہ اونگ خان کی جانی حفاظت کے لیے مامور تھا، اسے مغل خان کے دشمنوں نے بہت اُکسایا تھا کہ اسے گرفتار کر لے۔ مگر اس دستہ نے انکار کر دیا۔ مغلوں کے پاس شادیوں کے پیام بھی بھیجے گئے تھے۔ سردار خاندان سے قرابتوں نے جرجی کے لیے ایک دلھن بھی انتخاب کر لی تھی۔

لیکن تموچن اپنی ہی خیمہ گاہ میں رہا۔ ہوشیاری سے قرایت کے اردوؤں سے دور اور اس کے سپاہی ہراول میں آگے آگے یہ دیکھنے گئے کہ راستہ محفوظ ہے یا نہیں۔ اس کے سوار تو واپس نہ لوٹے۔ لیکن رات کو گھوڑے چرانے والے دو چرواہے قرایت کی خبر لے کے آئے اور یہ خبر ناخوش آئند بھی تھی اور نامبارک بھی۔

مغرب میں اس کے جو دشمن تھے، جیسے چالاک جاموقہ، جرمی لکمر یتوں کا سردار توقتا بیگ اور تموچن کے اپنے چچا۔ انھوں نے اس کا کام تمام کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ انھوں نے جاموقہ

کو گور خان منتخب کر لیا تھا۔ انھوں نے بوڑھے اور پس و پیش کرنے والے اونگ خان کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی طاقت سے ان کی مدد کرے جیسا کہ تموچن کو شک تھا۔ شادی کی گفت و شنید محض ایک بہانہ، ایک چال تھی۔

اس کی سیاسی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوشش یہ تھی کہ قرایت کو مغربی ترکوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رکھے اور مشرق میں خود اپنی طاقت بڑھائے اور اونگ خان سے اس وقت تک معاہدہ اور پیمان رکھے، جب تک اس کے اپنے مشرقی قبیلے اتنے طاقتور نہ ہو جائیں کہ برابری سے قرایت کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کی حکمت عملی غلط نہ تھی، لیکن جو چال اس نے چلی تھی اس کا توڑ اس سے زیادہ چالاکی سے اور اب دغا سے کیا گیا تھا۔

دونوں چرواہوں نے اس سے بیان کیا کہ قرایت اس کے خیمہ و خرگاہ کے بہت قریب آ گئے ہیں اور ان کا ارادہ رات کو شب خون مارنے اور تیروں سے اسے اس کے اپنے خیمے میں ہلاک کر دینے کا ہے۔

صورت حال بڑی ہی تشویش ناک تھی، کیونکہ قرایت کی تعداد بہت زیادہ تھی اور تموچن پر لازم تھا کہ جہاں تک ہو سکے۔ اپنے جنگجو ساتھیوں کے گھرانوں کی حفاظت کرے۔ اس کے پاس اس وقت چھ ہزار — بعض روایتوں کے لحاظ سے تین ہزار سے بھی کم — مسلح آدمی تھے لیکن اسے اطلاع مل گئی تھی اور اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔

اس نے اپنے یورت کے محافظوں کو ساری خیمہ گاہ میں ادھر ادھر بھیجا کہ سوتے ہوؤں کو جگائیں، سرداروں کو خبردار کریں اور چرواہوں کو باہر دوڑا دیں۔ ریوڑ باہر نکال دیے گئے کہ صبح ہوتے ہوتے دور دور بھگا دیے جائیں اور منتشر کر دیے جائیں۔ اس کے سوا ان کو بچانے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ گھوڑے تو ہمیشہ پاس ہی رہتے تھے، اردو والے فوراً ان پر سوار ہو گئے اور ہلکی اونٹ گاڑیوں پر سامان کے صندوق لادے گئے اور عورتوں کو سوار کرا یا گیا۔ بلا بحث و فریاد اپنے اصلی خیمہ گاہوں کی طرف واپسی کا طول طویل سفر شروع ہوا۔

اس نے یورتوں اور بڑی بڑی بیل گاڑیوں کو ویسے ہی کھڑا رہنے دیا۔ کچھ آدمیوں کو اچھے گھوڑوں کے ساتھ پیچھے چھوڑا کہ وہ آگ جلائے رکھیں۔ پسپائی میں وہ خود اپنے چیدہ چیدہ افسروں اور منتخب اہل قبیلہ کے ساتھ سب سے آہستہ سفر کرتا رہا۔ تاکہ تعاقب کرنے والوں کا مقابلہ کر سکے۔ اب اس کا کوئی موقع نہ تھا کہ اس طوفان سے نجات پائی جائے جو تاریکی کے پردے میں اس قدر قریب نمودار ہو رہا تھا۔

وہ کوئی آٹھ یا نو میل گئے ہوں گے کہ پہاڑیوں کا ایک ایسا سلسلہ آیا، جہاں اس کا موقع تھا کہ اگر اس کے آدمی منتشر ہوں تو انھیں سایہ اور پناہ مل سکے۔ ایک ندی پار کرکے ایک تنگ سے درّے میں اس نے اپنے سواروں کو ٹھہرایا تاکہ گھوڑے تھکن سے بالکل چور نہ ہو جائیں۔

اس دوران میں قرایت صبح کے تڑکے سے پہلے ہی اس کے خالی خیمے میں گھس آئے تھے۔ خان کے سفید سمور کے خیمے کو انھوں نے تیروں سے چھلنی کر دیا، تب کہیں انھیں اندازہ ہوا کہ اس جگہ کیسی خاموشی سی طاری ہے اور نہ ریوڑوں کا پتہ ہے اور نہ پرچم کا، تھوڑی دیر کے لیے گڑبڑ میں وہ ٹھہر گئے۔ اور آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ آگ جا بجا خوب جل رہی تھی۔ انھیں یہ شبہ ہوا کہ مغل اپنی یورتوں میں ہوں گے اور جب ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ خیمے خالی ہیں اور مغل سب کچھ پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ قالین اور برتن یہاں تک کہ خالی زین اور دودھ کی تھیلیاں تو انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مغل خوف کے مارے بے ترتیبی سے بھاگ گئے ہیں۔

مشرق کی طرف جانے والوں کے نشان اتنے واضح تھے کہ اندھیرے میں بھی نہ چھپ سکتے تھے۔ قرایت قبیلوں نے فوراً ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا کے صبح ہوتے ہوتے وہ پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے، اور ان کے پیچھے گرد کا بادل سا اٹھتا رہا۔ تموجن نے ان کو آتے دیکھا اور یہ بھی دیکھ لیا کہ اس تیز سرپٹ دوڑ میں ان کی صفیں بہت پھیل گئی تھیں قبیلے منتشر ہو گئے تھے اور جو اچھے گھوڑے تھے وہ سست گھوڑوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آئے تھے۔

گھاٹی میں مزید انتظار کیے بغیر اس نے اپنے جنگجوؤں کو تنگ صفوں میں آراستہ کرکے باہر نکالا۔ ان کے گھوڑے آرام کرکے تازہ دم ہو چکے تھے۔ انھوں نے ندی پار کرکے قرایتوں کے

ہراول کو درہم برہم کر دیا اور لہلہاتی ہوئی چراگاہوں کے اس پار قرایت کے ارد گرد پیچھے ہٹنے کا راستہ روک دیا۔ اسی اثنا میں اونگ خان اور اس کے سردار بھی آ گئے۔ قرایت کی نئے سرے سے ترتیب اور تنظیم ہوئی اور مکمل نیست و نابود کرنے کی ہولناک جنگ شروع ہوئی۔

تموچن اس سے پہلے کبھی ایسی آفت میں نہ گھرا تھا۔ اس وقت اسے اپنے امڈتے دھاروں کی ذاتی شجاعت کی پوری پوری ضرورت پیش آئی۔ اس کے اپنے خاندانی قبیلوں کے استقلال اور اُرت اور منکوت قبیلوں کے بھاری مسلح سواروں سے بھی اسے بڑی مدد ملی۔ اس کے لشکر کی تعداد اتنی کم تھی کہ یہ اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ سامنے سے حملہ کرے۔ وہ مجبور تھا کہ زمین کے نشیب و فراز سے جتنا فائدہ اٹھا سکے اٹھا لے اور یہ مغلوں کے لیے آخری آسرا تھا جب شام ہوئی اور معلوم ہوتا تھا کہ شکست مقدر ہو چکی ہے تو اس نے اپنے ایک مُنہ بولے بھائی گلدار کو جو اس کا علم بردار تھا اور منکوت قبیلوں کا سردار تھا۔ یہ حکم دیا کہ وہ قرایت کی صفوں کا چکر کاٹ کے ان کے پیچھے بائیں جانب کی ایک پہاڑی پر قبضہ کر لے اور اس پر قبضہ جمائے رکھے۔ اس پہاڑی کا نام جیتہ تھا۔

تھکے ماندے گلدار نے جواب دیا "اے خان، میرے بھائی، میں اپنے سب سے اچھے گھوڑے پر سوار ہوں گا اور جو میرا مقابلہ کرنے آئیں گے ان کی صفوں کو چیر کر گزر جاؤں گا۔ میں تیرا یاک کی دموں والا پرچم جیتہ پر نصب کر دوں گا۔ میں تجھے اپنی بہادری دکھاؤں گا۔ اور اگر میں مارا گیا تو میرے بچوں کو پال پوس لینا۔ میرے لیے سب برابر ہے کہ میرا خاتمہ کب ہو گا۔"

یہ چکر کاٹ کے بڑھنے کی ترکیب مغلوں کی پسندیدہ جنگی چال تھی۔ اس کو وہ "تولغمہ" یا پرچم کی یورش کہتے تھے، جس سے وہ دشمن کی ایک جانب سے ہوتے ہوئے اس کے عقب میں پہنچ جاتے تھے۔ اب تموچن کے قبیلے بری طرح پٹ چکے تھے قرایت اس کی صفوں میں گھسے چلے آ رہے تھے اور یہ ترکیب جان پر کھیل کے مقابلے کی آخری کوشش تھی۔ لیکن قوی ہیکل گلدار اس پہاڑی پر پہنچ ہی گیا۔ وہاں پر پرچم نصب کیا اور اس پہاڑی پر ڈٹا رہا۔ اس کی وجہ سے قرایت رکے رہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ اونگ خان کا بیٹا چہرے پر ایک تیر کھا کے زخمی ہو گیا

تھا۔

جب آفتاب غروب ہوا تو میدان سے مغل نہیں بلکہ قرایت ذرا ہٹ گئے تھے۔ تموجن نے صرف اتنی دیر انتظار کیا کہ گلدار حفاظت سے واپس پہنچ جائے اور زخمی بہادر اکٹھا ہو جائیں۔ زخمیوں میں اس کے دو بیٹے بھی شامل تھے۔ زخمی سردار دشمن سے چھینے ہوئے گھوڑوں پر واپس آ رہے تھے اور کبھی کبھی تو ایک ایک گھوڑے پر دو دو آدمی۔ پھر وہ مشرق کی طرف بھاگ نکلا اور قرایت نے دوسرے دن پھر سے تعاقب شروع کیا۔

یہ تموجن کی سب سے زیادہ کٹھن لڑائی تھی اور اس میں اسے شکست ہوئی، لیکن اس نے اپنے قبیلے والوں کے بنیادی عناصر کو سلامت رکھا۔ خود زندہ بچا رہا اور اپنے اردو کو محفوظ رکھا۔

اونگ خاں نے کہا، "ہم نے ایک ایسے آدمی سے جنگ کی، جس سے ہمیں ہرگز لڑائی مول نہ لینی چاہیے تھی۔"

مغل داستانوں میں اب بھی یہ واقعہ دہرا دہرا کے بیان کیا جاتا ہے کہ گلدار نے کیونکر چینتہ پر پرچم لہرایا۔

طول طویل پسپائی میں، اس بنجر سرزمین کا تقاضا یہ تھا کہ یہ جنگجو جو ابھی "اپنے زخم چاٹ رہے تھے،" اپنے تھکے ماندے گھوڑوں پر پھر شکار کے لیے ایک حلقے میں پھیل جائیں، تاکہ بارہ سنگھے اور ہرن اور جو کچھ اپنے تیروں سے مار سکیں، مار لیں، یہ شکار کا شوق نہ تھا، کسی نہ کسی طرح اردو کے لیے غذا فراہم کرنی تھی۔

مصنف رام برکش بینی پوری
ترجمہ: عطاء اللہ

گیہوں بنام گلاب

گیہوں ہم کھاتے ہیں، گلاب سونگھتے ہیں! ایک سے جسم کو طاقت ملتی ہے اور دوسرے سے ہمارا دماغ آسودہ ہوتا ہے۔

گیہوں بڑا ہے یا گلاب؟ ہم کیا چاہتے ہیں۔ طاقتور جسم یا آسودہ دماغ۔

جب انسان زمین پر آیا، بھوک لے کر۔ بھوک، بھوک، پیاس پیاس، کیا کھائے کیا پیے؟ ماں کی چھاتیوں کو نچوڑا، پیڑوں کو جھنجھوڑا۔ کیڑے مکوڑے، پیڑ، پودے، کچھ نہ بچ پائے اس سے۔

گیہوں ——— اس کی بھوک کا قافلہ آج گیہوں پر ٹوٹ پڑا ہے۔ گیہوں اگاؤ، گیہوں اگاؤ، گیہوں اگاؤ!

میدان میں ہل چلائے جا رہے ہیں، باغ اجاڑے جا رہے ہیں ——— گیہوں کے لیے! بیچارا گلاب ——— بھری جوانی میں کہیں سسکیاں لے رہا ہے۔

جسم کی ضرورت نے، دماغ کی خواہشات کو کہیں کونے میں ڈال رکھا ہے، دبا رکھا ہے۔

لیکن، چاہے کچا چبائیں یا پکا کر کھائیں ——— گیہوں کے معاملے میں جانور اور انسان میں کیا فرق؟ آدمی کو انسان بنایا گلاب نے! آدمی انسان تب بنا جب اس نے جسم کی ضرورتوں پر دماغ کی خواہشات کو ترجیح دی! یہی نہیں جب اس کی آنتیں بھوک

مصنف کا تعارف مضمون کے اختتام پر ملاحظہ فرمائیے۔

سے بل کھا رہی تھیں، تب بھی اس کی آنکھیں گلاب پر لگی تھیں۔

اس کا پہلا نغمہ تب نکلا جب اس کی بیٹیاں اور عورتیں گیہوں کو اوکھلی اور چکّی میں کوٹ پیس رہی تھیں۔ جانوروں کو مار کر اور رکھا کر ہی وہ آسودہ نہیں ہوا بلکہ ان کی کھال سے بنایا ڈھول اور ان کے سینگ سے تراشی ترہی۔ مچھلی پکڑنے کے لیے جب وہ اپنی ناؤ میں پتوار کے پَر لگائے پانی پر اُڑا جا رہا تھا، تب اس کے ہلکوروں میں اسے سُر اور تال پائے اور اس نے ترانے چھیڑے! بانس سے اس نے لاٹھی ہی نہیں بنائی، بانسری بھی بجائی۔

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دور ہوا، اسے سکون ملا صرف اس لیے نہیں کہ اب شکم کی آگ بجھانے میں اسے آسانی ہوگی مگر اسے قلبی خوشی ملی سورج کی سرخی سے، نو مولود سورج کی سنہری کرنوں سے چم چم چمکنے والی بے شمار شبنم کے قطروں سے۔ آسمان میں جب بادل امڈے تب زمین پر پودے لگا کر ہی وہ خوش نہیں ہوا۔ اس کے جمالیاتی ذوق نے اس کے دل کو خوشی سے ناچنے پر مجبور کیا — قوس و قزح نے اس کے دل کو بھی سات رنگوں میں رنگ دیا۔

انسانی جسم میں پیٹ کا مقام نیچے ہے۔ دل کا اوپر اور دماغ کا سب سے اوپر۔ جانوروں کی طرح اس کا دماغ اور پیٹ متوازی خط میں نہیں ہے۔ جس دن وہ سیدھے تن کر کھڑا ہوا، دماغ نے اس کے شکم پر فتح کا اعلان کر دیا۔

گیہوں کی ضرورت اسے ہے، مگر اس کی کوشش رہی ہے گیہوں پر فتح پانے کی۔ پرانے زمانے میں بھوکے رہنا، روزے یا برت رکھنا، جنگلوں اور پہاڑوں میں رہ کر عبادت وغیرہ اسی کوشش کی مختلف شکلیں رہی ہیں۔

جب تک انسان کی زندگی میں توازن قائم رہا، وہ ہنسی خوشی آرام سے رہا۔

وہ کماتے ہوا گاتا تھا اور گاتے ہوئے کماتا تھا۔ اس کی محنت کے ساتھ موسیقی بندھی ہوئی تھی اور موسیقی کے ساتھ محنت۔

اس کا کرشن دن میں گائیں چراتا اور رات میں گوپیوں کے ساتھ جشن مناتا تھا ۔ زمین پر چلتا ہوا وہ آسمان کو نہیں بھولا تھا اور جب وہ آسمان پر نظریں گاڑے ہوئے تھا تو اسے یاد تھا کہ اس کے پیر مٹّی پر ہیں ۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ توازن ٹوٹ گیا ۔

اب گیہوں علامت بن گیا اعضاء شکن تھکن اور بے پناہ اذیت اور جہنمی والی محنت کا ——— اس محنت کا جو شکم کی آگ بھی ٹھنڈی نہ کر سکے ۔

اور گلاب علامت بن گیا عیش و عشرت کی ——— بدعنوانی کی، گندگی اور غلاظت کی ۔ وہ عیش و عشرت جو جسم کو برباد کرتی ہے اور دماغ کو بھی ۔

اب اس کے کرشن نے ہاتھ میں شنکھ اور چکر اٹھا لیے، نتیجہ ——— مہا بھارت اور لوگوں کی مکمل بربادی !

وہ رسم چلی آ رہی ہے ۔ آج چاروں طرف مہا بھارت ہے، خانہ جنگی ہے ——— مکمل بربادی ہے، قیامت ہے ۔

گیہوں سر دھن رہا ہے کھیتوں میں، گلاب رو رہا ہے باغیچوں میں ——— دونوں اپنے پالنے والوں کی قسمت پر، بدقسمتی پر آنسو بہا رہے ہیں ۔

چلو، پیچھے لوٹیں، گیہوں اور گلاب میں ہم ایک بار پھر توازن لائیں ۔

لیکن انسان کیا پیچھے مڑا ہے، مڑ سکتا ہے ۔ یہ مسافر اعظم آگے بڑھتا رہا ہے آگے بڑھتا رہے گا ۔“

اور کیا نیا توازن ہمیشہ کے لیے پائیدار ہو سکے گا ؟ کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی ؟

نہیں انسان کو پیچھے لوٹانے کی کوشش نہ کرو ۔

اب گلاب اور گیہوں میں پھر سے توازن لانے کی کوشش میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں ہے ۔

اب گلاب گیہوں پر فتح حاصل کرے ۔

گیہوں پر گلاب کی فتح ——— لافانی فتح ۔ اب نئے انسان کی یہ نئی خواہش ہو !

کیا یہ ممکن ہے؟

بالکل سو فیصدی ممکن ہے۔

سائنس نے بتادیا ہے ـــــ یہ گیہوں کیا ہے؟ اور اس نے یہ بھی سمجھادیا ہے کہ انسان میں یہ مستقل بھوک کیوں ہے۔

گیہوں کا گیہوں پن کیا ہے، ہم جان گئے ہیں۔ یہ گیہوں پن اس میں آتا کہاں سے ہے، ہم سے یہ بھی چھپا نہیں ہے۔

آسمان و زمین کے کچھ عناصر ایک خاص عمل سے پودوں کی بالیوں میں جمع ہو کر گیہوں بن جاتے ہیں۔ انھیں عناصر کی کمی، ہمارے جسم میں، بھوک کا نام پاتی ہے۔

کیوں زمین کی منت، گڑگڑاہٹ۔ کیوں آسمان کی دہائی۔ ہم زمین اور آسمان سے اُن عناصر کو سیدھے کیوں نہ حاصل کریں؟

یہ تو ناممکن ہے ـــــ یوٹوپیا، یوٹوپیا!

ہاں، یہ ناممکن بات یوٹوپیا تب تک مبنی رہے گی، جب تک سائنس قتل عام کے لیے آسمان زمین ایک کرتی رہے گی جیسے ہی اس نے زندگی کے مسائل کی طرف توجہ دی۔ ایسا کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔

اور، سائنس کو اس طرف آنا ہے، نہیں تو انسان کیا ساری کائنات کا خاتمہ یقینی ہے۔

سائنس دھیرے دھیرے اس طرف قدم بڑھا بھی رہی ہے۔

کم سے کم وہ اتنا تو فوری طور پر کر ہی دے گی کہ گیہوں اتنا پیدا ہو کہ زندگی کی دوسری ضروری چیزوں ـــــ ہوا، پانی کی طرح اس کی افراط ہو جائے۔ بیج، کھاد، آب پاشی اور زمین جوتنے کے ایسے طریقے نکلتے ہی جارہے ہیں، جو گیہوں کے مسئلے کو حل کر دیں۔

افراط ـــــ جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے والے ذرائع کی افراط کی طرف آج کا انسان تیزی سے دوڑ رہا ہے۔

لیکن کیا صرف افراط انسان کو امن اور چین دے سکتی ہے؟

'ہمارا سونے کا ہندستان' ـــــ یہ گیت گائیے، مگر یہ نہ بھولیے کہ سونے کے شہر میں شیطانیت

قیام کرسکتی ہے۔

شیطانیت ـــــ جو خون پیتی ہے، غلاظت کھاتی ہے، جسے دوسروں کا نقصان کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔

گیہوں بڑا طاقت ور ہے ـــــ وہ بہت دنوں تک ہمیں جسم کا غلام بناکر رکھنا چاہے گا۔ شکم کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد بھی سو بہانوں سے بھی اپنے آپ کو بہت دنوں تک تباہ کرنا چاہے گا۔

تو افراط میں شیطانیت نہ آئے، اس کے لیے کیا کیا جائے؟ - اپنی خواہشات پر قابو پانے کے لیے آج کا علم نفسیات دو طریقے بتاتا ہے۔ نفس پر کنٹرول اور خواہشات کی بلندی۔ نفس پر کنٹرول کا درس ہمارے رشی منی دیتے آئے ہیں۔ لیکن اس کے برے نتیجے بھی ہمارے سامنے ہیں۔ آج بھی دیکھیے۔ گاندھی جی کے تیس سال کے ارشادات واحکامات پر چلنے والے پرہیزگار کدھر جارہے ہیں۔

اس کا صرف ایک علاج ہے ـــــ خواہشات کی بلندی! خواہشات کو خود غرضی کے علاقہ سے اوپر اٹھاکر جذباتیت کی طرف گامزن کیجیے۔

جسم پر دماغ کی مکمل حکومت قائم ہو ـــــ گیہوں پر گلاب کی۔ گیہوں کے بعد گلاب۔ بیچ میں کوئی مقام نہیں، منزل نہیں۔

رام برکش بینی پوری، پیدائش جنوری ۱۹۰۲ء، بمقام بینی پور گاؤں، ضلع مظفر پور۔ ۱۹۲۰ء میں میٹرک میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ترک موالات کی تحریک میں حصہ لینے کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ان کی ادبی تخلیقات میں قیدی کی بیٹی، سنتر نگا دھفش، ماٹی کی مورتیں، گیہوں اور گلاب، پردں میں پنکھ باندھ کر اور زنجیریں اور دیواریں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ پیش خدمت مضمون میں انھوں نے بھوک اور دل کے آپسی رشتے کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ اس ہندی مضمون کا اردو ترجمہ جناب عطاء اللہ صاحب استاد جامعہ مڈل اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کیا ہے۔ (ادارہ)

ماہنامہ

جامعہ

سالانہ قیمت ۳۰ روپے

قیمت فی شمارہ ۳ روپے

جلد ۸۹ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۹۲ء | شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

(ادارہ کا مضمون نگار حضرات کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

مجلس مشاورت

ماہنامہ "جامعہ"

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی — مطبوعہ: لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲۔۰۰۰۱۱

کتابت: محمد حسین رامپوری

شذرات

سید جمال الدین

"اکبر پاکستان میں"، اس عنوان کے تحت مبارک علی کا ایک مختصر مضمون انگریزی روزنامہ پائنیر (جمعہ ۱۳ر نومبر ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوا ہے۔ پڑھ کر تاثر ملا کہ اکبر پاکستان میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ لیکن پاکستان میں اکبر کا نہ ہونا، نہ پڑھایا جانا، تحقیق سے خارج رہنا سمجھ میں آتا ہے۔ خود مضمون نگار نے واضح کر دیا ہے کہ پاکستان میں اکبر دو قومی نظریہ سے میل نہیں کھاتا بلکہ وہ تو مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو پامال کیے دیتا تھا۔ ہندوؤں سے رشتۂ اتحاد بڑھاتا تھا، اس کی سخاوت اور رواداری کی وجہ سے راجپوتوں کو عروج حاصل ہوا۔ اور وہ تہذیب سے آشنا ہوئے۔ اکبر کا ہاتھ اگر سر پر نہ ہوتا تو راجپوت سردار مثلاً راجہ مان سنگھ اور راجہ بھگوان داس تاریخ میں گمنام رہتے۔ حکومت میں راجپوتوں کی شمولیت کی بنا پر مسلمان امرا اکبر سے ناراض رہے، اور انھوں نے سمجھ لیا کہ مغلیہ حکومت اسلامی نہیں رہی۔ مبارک علی لکھتے ہیں کہ پاکستان میں نصابی اور علمی و تحقیقی کتابوں میں اکبر کو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کر کے ایک قوم کا تصوّر قائم کرنا چاہ رہا تھا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے علیحدہ تشخص خطرے میں پڑتا تھا۔ پاکستانی دانشوروں نے دو قومی نظریے کے ڈانڈے مجدد الف ثانیؒ سے ملائے ہیں اور انھیں اکبر کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی دانشور مجدد الف ثانیؒ کو اکبر کے خلاف کھڑا کر کے خود حضرت مجددؒ کی شخصیت اور ان کی فکر کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ دراصل مجدد الف ثانیؒ کو ان کے عہد کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ کوتاہ فکری کے فریم ورک

ہیں مقید کر کے پاکستانی دانشور حضرت مجددؒ کی توقیر نہیں کر رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ (بالفرض ہم یہ مان بھی لیں کہ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اکبر کے حریف ہیں) مجدد الف ثانیؒ اپنے عہد کے تمام ہی مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک زاویہ نگاہ پیش کرتے ہیں جو ان کے اپنے ذاتی مطالعے، تجربے اور مشاہدہ پر مبنی تھا لیکن کیا ہم ان کے دیگر ہم عصر علماء و مشائخ کو نظرانداز کردیں گے؟ کیا ہم شیخ سلیم چشتیؒ کو نظرانداز کردیں گے جنھوں نے اکبر کے لیے اولادِ نرینہ کی دعا کی؟ مذہبی ذہن (جس کی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کوئی کمی نہیں) اس سے اتفاق کرے گا کہ نہ دعا کی جاتی نہ ایک خدا رسیدہ متقی و پرہیزگار کی دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوتا اور نہ اکبر کے ہاں اولاد نرینہ ہوتی جو حضرت شیخ کا نام پا کر تاریخ میں نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ کا لقب اختیار کر کے اکبر کی سیکولر وراثت سنبھالنے کے لیے پیدا ہوتی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ شیخ سلیم چشتیؒ کے اہل خاندان تو مغلیہ سلطنت کے سرگرم معاون بھی رہے۔ اور پھر مجدد الف ثانیؒ کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی تو ایک مستند عالم اور شیخ طریقت با کمال بزرگ تھے، یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ اکبر کی طرح نہیں تو یہ ماننے میں کیا تامل ہے کہ وہ مجدد الف ثانیؒ کی طرح بھی نہیں۔ دونوں کی فکر جدا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ کی وراثت اورنگ زیب کے حصّے میں آئی اور محدث دہلویؒ کی وراثت دارا شکوہ کے حصّے میں۔ ایک ہی دور میں متضاد رجحانات مل سکتے ہیں۔ آخر کس کسوٹی پر پرکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسبتاً مجدد الف ثانیؒ کی طرف مسلمانوں کا زیادہ میلان تھا، اور محدث دہلویؒ کی طرف کم۔ ان مسائل کی بڑے پیمانے پر تحقیق اور تدقیق کی ضرورت ہے۔

تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے۔ وہ یہاں عزت و وقار کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ انھیں کشیدگی اور خطرات کا سامنا بھی رہتا ہے لیکن قرآن کریم سے انھیں حوصلہ مل رہا ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران: ۱۳۹)

اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔

لہٰذا بات یہی ہے کہ "اگر تم مومن ہو"

مومن کون ہے" اس تصوّر کی تجسیم برصغیر ہند و پاک میں صوفیائے کرام نے ہمیشہ کی جو بے جان چیزوں میں بھی ان سے پرہیز کرتے تھے جو تفریق کا باعث ہوں۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے ایک مرتبہ حاضرین مجلس سے پوچھا کہ "جب کنگھی تلہ دانی میں رکھی جائے تو پہلے کس طرف سے رکھی جائے؟" پھر خود ہی فرمایا۔ "دندانوں کی طرف سے پہلے رکھنا چاہیے کہ وہ باعث تفریق بالوں کا ہے۔ پس جو باعث تفریق ہوا اسے دو رڈالنا مناسب ہے۔" صوفیائے کرام کا نصب العین اتحاد و یکجہتی تھا، تفریق نہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ عہد وسطیٰ کے سلاطین اور بادشاہوں کو رواداری کی پالیسی کے لیے نظریاتی حمایت صوفیانہ فکر و عمل سے ملی تھی۔ اکبر کے "سیکولرازم" کی اساس بھی صوفی بھگتی فکر پر رکھی گئی تھی، لہٰذا جو دانشور اکبر کو تاریخ میں جگہ نہیں دینا چاہتے انھیں برصغیر کی تاریخ سے صوفیائے کرام کے باب کو بھی ختم کرنا ہوگا۔ دراصل مومن وہی ہے جو سب کو قبول ہو، سب میں مقبول ہو اس میں بھی تشخص ہے لیکن یہ تشخص ٹکراؤ کی طرف نہیں، اتحاد و اتفاق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

پاکستان میں اکبر کا خارج از مطالعہ رہنا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہ دو قومی نظریے یا "اسلامی جمہوریت" کے تصوّر سے میل نہیں کھاتا۔ لیکن ہم تو خود شرمسار ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی جب افرادی وسائل کے فروغ کی مرکزی وزارت کی جانب سے اکبر کے چار سو پچاس ویں یوم پیدائش کی مناسبت سے مذاکرے، سیمنار، تصویری نمائشیں یا ثقافتی پروگرام منعقد کرنے کا منصوبہ قوم کے سامنے پیش ہوا تو اچانک یہ عقدہ کھلا کہ خود ہمارے ملک میں بھی ایسے دانشور موجود ہیں جو اکبر کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بھدّی مثل ہے لیکن نوکِ قلم پر آرہی ہے۔ اکبر لونہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ چنانچہ افرادی وسائل کے فروغ کی مرکزی وزارت کا منصوبہ جو بڑے طمطراق سے قومی اخباروں میں شائع ہوا اب سرد خانہ میں چلا گیا ہے۔ باہر گرمی زیادہ ہے اور اسے گرم رکھنے کے لیے اکبر کو سرد خانہ ہی میں رہنا ہوگا۔ ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ تنگ نظری اور کشادہ ذہنی کی کشمکش میں کشادہ ذہنی ہی کو پسپا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے تمھارے حق میں یہی ہے کہ تنگ نظری سے اس کی عائد کردہ شرائط

پر سمجھوتہ کر لو۔ کیا یہ سمجھوتے ہمارے مقدّر بن گئے ہیں۔؟

سب کچھ تاریک نہیں ہے یہ ٹھوس حقائق کا صحیح ادراک فکر و نظر کو مثبت رخ دے دیتا ہے۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۲ء کو اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (ایس۔ آئی۔ او) کا سہ روزہ اجلاس سرزمین دکن پر حیدرآباد میں اختتام پذیر ہوا۔ اختتامی جلسہ کی کارروائی کی ایک رپورٹ پائنیرز (دہلی، بدھ ۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء) میں شائع ہوئی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اختتامی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے کہ آل انڈیا جماعت اسلامی کے نائب صدر مولانا عبدالعزیز صاحب نے ملک میں رائج جمہوریت کو بیش قیمت اور لائق احترام بتایا۔ انھوں نے فرمایا کہ جماعت کی سرگرمیاں اور عوام کی مذہبی آزادی جمہوری نظام کی مرہونِ منّت ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ یہ جماعت فرقہ وارانہ اور فسطائی جماعتوں کے خلاف غیر فرقہ ورانہ اور سیکولر قوتوں کی حمایت کرے گی۔ مولانا نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان کا سیکولر اور جمہوری کردار برقرار رکھنے کے لیے سخت کوشش کریں اور ملک کو متحد رکھیں کیونکہ سیکولر جمہوری نظام ہی اُن کے حقوق کا ضامن ہو سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے سربراہ مولانا سراج الحسن صاحب نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا اور جماعت کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جماعت فرقہ واریت کے خلاف اس لیے آواز نہیں اٹھا رہی ہے کہ مسلمان اس کا نشانہ ہیں اور مسلمانوں کو اس کے خلاف جنگ کرنے کی ضرورت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ فرقہ واریت سے ملک کے اتحاد و یکجہتی کو سنگین خطرہ ہے۔

جماعت اسلامی کا سیاسی فلسفہ اب تک جو رہا ہے اس سے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ اب جب کہ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے سیکولر جمہوری نظام اور ملک میں اتحاد و یکجہتی کی بات کی جا رہی ہے تو ہم موجودہ حالات کے پیشِ نظر اسے ملک کی ایک بڑی مذہبی جماعت کی سیاسی فکر میں ایک خوش آئند تبدیلی کہیں گے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی و سماجی پس منظر میں جماعتِ اسلامی نے متحدہ قومیت کی جو تفہیم پیش کی ہے صوفیائے کرام ہندوستان میں اسی تفہیم کو عام کرتے رہے تھے۔ اتحاد و یکجہتی۔ اکبر کا بھی یہی نصب العین تھا۔

خدا کرے ملک میں امن و امان قائم رہے۔ آمین۔

عظیم الشان صدیقی

تیکھے لب و لہجہ کی شاعرہ

شاہجہاں جعفری حجاب

ادب کی کسی بوطیقا نے اگرچہ شاعری کو عورت اور مرد کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا ہے لیکن ان دونوں کے درمیان زبان و بیان موضوع و مواد اور اظہار کی سطح پر واضح طور پر فرق نظر آتا ہے۔ لیکن سماج میں چونکہ عورت کو اپنے جذبات و خیالات کے برجستہ اظہار کی آزادی حاصل نہیں رہی ہے اس لیے ادب میں خواتین شعرا کی کوئی مستحکم روایت قائم نہیں ہو سکی ہے لیکن اب عورت ان قیود کو توڑ دینا چاہتی ہے۔ اس کی اس خواہش کو اگرچہ سماج نے اب بھی تسلیم نہیں کیا ہے لیکن اس جدوجہد اور کوشش نے اس کی شناخت ضرور قائم کر دی ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں میں خواتین شعراء کے جو نام چند ابھر کر منظر عام پر آئے ہیں ان میں ایک نام شاہجہاں جعفری حجاب کا بھی ہے۔

حجاب کا خاندان اگرچہ مغربی اتر پردیش کے مردم خیز شہر امروہہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن حجاب کی پیدائش بمبئی میں ہوئی جو نہ صرف جدید تہذیب اور صنعت کا ایک اہم مرکز ہے بلکہ ابلاغ عامہ کے فروغ کے لیے بھی دنیا میں مشہور ہے۔ حجاب کے والد سید محمد جعفری اگرچہ مہاراشٹر پولیس کے معزز عہدے پر فائز تھے لیکن حجاب کی تعلیم و تربیت کو بمبئی کا

ڈاکٹر عظیم الدین صدیقی، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔

ماحول حاصل رہا۔ یہیں انھوں نے سن شعور کی منزلیں طے کیں اور وہ درد دل پایا جس کی کسک آج بھی ان کی شاعری میں موجود ہے۔ زندگی کے سفر میں انھوں نے ایک فلسطینی لبنانی سے رشتہ ازدواج قائم کیا جو اپنی حریت پسندی اور جدوجہد کے لیے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ کویت ریڈیو کی اردو سروس سے ان کا تعلق غالباً اسی تحریک سے دلچسپی کا نتیجہ تھا جس نے انھیں فکر و نظر کے ساتھ وسیع تجربے اور مشاہدے سے آشنا کرایا اور ان کی شاعری کو جوش و ولولہ اور شدت جذبات عطا کیے لیکن جہاں تک ان کی شاعری کے ابتدائی محرکات کا تعلق ہے انھیں یہ جذبہ شوق اور دیوانگی گھر اور کالج کی چہار دیواری سے حاصل ہوئی جس کا اظہار انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام تکلم کے گونگے گھر کے مقدمہ میں اس طرح کیا ہے۔

> " والد صاحب سید محمد جعفری خود بہت اچھے شاعر ہیں۔ اس لیے یہ خاندانی جراثیم میرے اندر موجود ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ گھر میں اکثر شعر و ادب کی محفلیں جمتیں۔ میں چھپ چھپ کر شعر سنتی اور خود بھی کہتی۔ اس وقت صرف میری تنہائیاں میرے اس راز سے آشنا تھیں کیونکہ ایک روایتی سید گھرانے میں لڑکی کا شاعر ہونا کسی گناہ عظیم سے کم نہ تھا۔ ایک عرصے تک میں نے اپنے اندر کی شاعرہ کو اپنے ذہن اور جسم میں ایسے قید رکھا جیسے کسی مجرم کو غیر قانونی پناہ دی گئی ہو۔
>
> اسکول کا زمانہ ختم ہوا اور کالج کا دور شروع ہوا، یہاں آکر گویا زندگی نے اپنا چولا یکسر بدل لیا۔ دن رات شعر و ادب کی محفلیں جمتیں، مقابلے ہوتے۔ کالج کے وال پیپر پر نظمیں اور غزلیں چھپتیں۔ اسی دوران کالج کا سالانہ میگزین چھپا جس میں میری غزل شائع ہوئی تھی۔ یہ کوئی چھپنے والی بات نہ تھی۔ میگزین گھر تک پہنچ گیا۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے سہما اور سکڑا ہوا دن تھا۔ ایک مجرم کی طرح والد صاحب کے سامنے میری پیشی ہوئی۔ لیکن میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب والد صاحب

نے بجائے سرزنش کے میری ہمت افزائی کی اور کہا کہ مشق سخن جاری رکھو۔
اس طرح میری غیر قانونی شاعری باقاعدہ قانونی طور پر شروع ہوگئی۔"
(مقدمہ۔ گونگے تکلم کے گھر)

ماحول کے یہ اثرات حجاب کی روح اور شاعری میں اس طرح سرایت کر گئے ہیں کہ اس میں بیک وقت روایت و بغاوت، ضبط نفس کے ساتھ کھلے پن کا احساس اور شوخی و شرارت اور کھلنڈرے پن کے ساتھ سنجیدہ فکر کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ حجاب کی شاعری میں قید، مجرم، جزا و سزا، قانونی اور غیر قانونی، پناہ و پیشی وغیرہ جیسے الفاظ کا کثرت استعمال اسی ماحول کا نتیجہ ہے۔

حجاب کی شاعری کو اگر ابتدائی تحریک گھر سے ملی اور کالج کے ماحول نے اسے سجایا و سنوارا، اسے خواب اور دھڑکنیں عطا کیں تو ان کی شاعری کو پر و پرواز وطن سے کوسوں دور ایک ایسے اجنبی ماحول نے بخشی جہاں کی فضا بمبئی سے نہ صرف مختلف تھی بلکہ جہاں زیادہ تر وقت کمرے میں بند رہ کر خود سے لڑنے اور الجھنے میں گزرتا تھا۔ ایسی صورت میں انقباضی کیفیات جھنجھلاہٹ کا پیدا ہونا، یا اپنے باطن میں جھانکنا، خیالوں اور خوابوں میں عمر رفتہ کی محفلیں سجانا اور تخیل کے ذریعہ منقطع رشتوں کی بازیافت کی خواہش کرنا اور نازک لمحوں میں ڈوبتی ہوئی نبضوں کے دوران ان سے تقویت حاصل کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ حجاب کی شاعری بنیادی طور پر اسی احساس تنہائی کا نتیجہ ہے جس میں دھیمے رنگوں اور دھندلی پرچھائیوں کے ساتھ شوخ رنگ، خودشناسی اور خود احتسابی کے پہلو بھی شامل ہیں جس نے ان کی شاعری کو، مایوسی اور محرومی، درد و کسک کے ساتھ جرأت و بے باکی اور حقیقت پسندی سے آشنا کرایا ہے۔ جسے سچی اور کھری شاعری کی پہچان تسلیم کیا جاتا ہے۔

یوں تو ہر فن کار جتنا ظاہر کرتا ہے اس سے زیادہ چھپانا چاہتا ہے لیکن عورت کی فطرت اور نفسیات میں یہ عنصر کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اس لیے رمز، کنایے اور استعاروں کا کثرت استعمال طبقہ نسواں کی شاعری کی مخصوص پہچان ہے۔ حجاب کی شاعری پر بھی ایسے ہی پردے پڑے ہوئے ہیں جس نے ان کے اشعار کے لطف و کیفیت میں اضافہ

توکیا ہے لیکن انھیں چیستان بننے نہیں دیا ہے۔ لیکن یہ صرف حجاب کا کمال نہیں ہے بلکہ طبقۂ نسواں کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت بھی ہے۔ عورت اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور ماحول وسماج کے مقابلے میں مجبور نظر آتی ہے لیکن وہ مرد کے مقابلہ میں کہیں زیادہ رجائی، معروضی اور حقیقت پسند ہوتی ہے اور خوابوں کی گرانباری نیز تخیل کی بلند پروازی کے باوجود زمین سے اس کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شاعری حقیقت اور خواب کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ حجابؔ کی شاعری میں بھی یہ امتیازات موجود ہیں جس نے ان کی شاعری کے حسن اور تاثیر میں اضافہ کردیا ہے اور جس میں ذات اور غیر ذات دونوں کے حوالے موجود ہیں۔

حجابؔ نے اپنے ماحول سے جو کچھ حاصل کیا ہے، اور جو کچھ دیکھا پرکھا، سنا اور محسوس کیا ہے۔ مطالعہ اور فکر رسانے جہاں تک رسائی پائی ہے، قلب پر جو واردات گزری ہیں ان کو ذات کے حوالے سے برجستہ و برمحل انداز میں اس طرح شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کردیا ہے کہ کہیں تکلف و تصنع اور آورد کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں اگر مبالغہ آمیزی ہے تو صرف اتنی، جتنی فن کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار اپنے حسن، سادگی اور تازگی کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے۔ حجاب کی شاعری میں خاصا تنوع موجود ہے۔ اس میں درد دل، خواب اور آرزوؤں کے علاوہ مختلف رشتوں کے پس منظر میں ذہنی وجذباتی کیفیات، سیاسی، سماجی صورتِ حال اور انسانی مسائل وغیرہ سب کا عکس نظر آتا ہے۔ شاعری کا ایک اہم موضوع حسن وعشق بھی ہے جو کسی خاص صنف کے ساتھ وابستہ نہیں ہے لیکن عورت کی شرم وحیا جہاں اس کے برملا اظہار میں مانع ہے وہاں وہ جنس مخالف کے حسن اور اعضا کی تعریف وتوصیف کی بھی اجازت نہیں دیتی ہے اور ہم جنس کی اوصاف ظاہری کی تعریف میں ہمیشہ اس کا جذبۂ رقابت حائل ہوجاتا ہے چنانچہ خواتین شعرا کے یہاں محاسن حسن اور سراپا نگاری کو ہمیشہ خارج از بحث تصور کیا جاتا ہے۔ حجاب کی شاعری میں اس کے شواہد نہیں ملتے ہیں۔ اور جہاں تک جذبۂ عشق کا سوال ہے عورت کا عشق

شدت جذبات کے باوجود جنوں انگیز نہیں ہوتا ہے بلکہ ابتدا ہی سے وہ کئی حصّوں اور وفاداریوں میں منقسم رہتا ہے پھر بھی سن شعور کی منزل پر پہنچنے سے قبل ابتدائی نقوش کچھ اتنے گہرے اور جان لیوا ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ان کی تازگی اور کسک باقی رہتی ہے۔ ہر فرد کی طرح ہر لڑکی کے بھی کچھ خواب اور کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں جن کی تعبیر وہ اپنی حدود میں رہ کر اپنے قریب ترین ماحول میں تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے اور بعض اوقات یہ جذبہ یک طرفہ ہی ہوتا ہے لیکن اگر مخالف سمت سے اس کو حوصلہ افزا جواب بھی ملے تو اس کے خلوص وصداقت کا تجزیہ کرنا جذبات کے سیلاب میں ممکن نہیں ہوتا ہے۔ یہی وہ نازک لمحے ہوتے ہیں جب دل ٹوٹتے اور جڑتے ہیں لیکن اس کی صدا کہیں سنائی نہیں دیتی لیکن یہ غبار آنسوؤں اور شعروں میں ڈھل کر بے پناہ بن جاتا ہے۔ حجاب کی شاعری جہاں اس کمسن اور الھڑ جذبۂ عشق کا اظہار کرتی ہے وہاں وہ عورت کی نفسیات کے مطالعہ کے لیے بھی مواد فراہم کرتی ہے جو اگر جنس مخالف سے محبت کرتی ہے تو رنگ ونسل، ذات پات اور دولت کی تمام قیود کو نظرانداز کر دیتی ہے اور اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اس کے دل ودماغ پر اس طرح چھا جانا چاہتی ہے کہ تصوّر وتخیّل کو کہیں بھٹکنے کا موقع نہ مل سکے لیکن جب وہ اپنے ہی پسندیدہ معیاروں پر ٹھکرا دی جاتی ہے یا اسے کھلونا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر اس کے تیور بھی بدل جاتے ہیں جس میں رشک وحسد، بغاوت و انتقام، مایوسی ومحرومی، کرب واضطراب اور مظلومیت وغیرہ سب طرح کے جذبات شامل ہیں۔ لیکن ان جذبات وکیفیات کا برملا اظہار نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ادب وسماج اس کی اجازت دیتا ہے ایسی صورت میں یہ جذبے اپنے اظہار کی راہ نہ پا کر ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح تعفّن پیدا کرتے ہیں یا پھر شعر کے قالب میں ڈھل کر اپنے لیے تطہیر کے مواقع ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ خواتین شعرا کے یہاں اگرچہ ان دونوں طرح کے جذبات کا اظہار ملتا ہے لیکن حجاب نے اپنے لیے جذبوں کی طہارت کو مقدم تصوّر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری سطحی جذبات کے اظہار سے پاک ہے جس میں صنفِ نازک کے جذبات واحساسات، فطرت ونفسیات، واردات قلب، کرب و اضطراب، محرومی ومایوسی کی فراوانی تو ہے لیکن ان سب کو لطیف وشائستہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

حجاب کی شاعری واردات حسن و عشق کے مختلف مراحل کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔
جس کی ابتدائی منزل اگر ان خواب اور خیالوں کی آمیزش سے عبارت ہے جو سرتاپا نشاطیہ
کیفیت سے معمور ہوتے ہیں۔ اس کیف آگیں اور مستی بھرے سفر میں اگرچہ امید و بیم خوف
اور رسوائی کے کئی پڑاؤ آتے ہیں لیکن انجانے اور ان مانے جذبے شوق کے پر لگا کر تمام فاصلوں
کو ایک ہی جست میں طے کرلینا چاہتے ہیں۔ یہاں چڑھتے ہوئے جذبوں کا سیلاب اس کا
موقع ہی نہیں دیتا کہ ہوش و خرد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جاسکے اور خمار آگیں سائے،
رنگین پرچھائیاں اس طرح گھیر لیتی ہیں کہ یہ احساس ہی باقی نہیں رہتا کہ سورج کب سوا
نیزے پر آیا اور کب عشق کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا چاہتا ہے جہاں جذبے اپنی صداقت کا
ثبوت طلب کرنے لگتے ہیں اور جن کی کسوٹی محض جذبات نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس میزان و معیار
میں افکار و اقدار اور زر کی جھنکار بھی سنائی دینے لگتی ہے اور پھر ایک ہی چھناکے کے ساتھ
سب کچھ بکھرتا ہوا نظر آتا ہے اور وہ منزل آجاتی ہے جہاں رنگین سایوں اور نشاط انگیز فضا
کے صرف چند قطرے ہی دھندلی یادوں، ناچتی پرچھائیوں کی شکل میں باقی رہ جاتے ہیں۔ جن
کی تخیلی بازیافت سہانی تو لگتی ہے لیکن کثرت تکرار سے دل امنڈنے اور دماغ الجھنے لگتا ہے
یا پھر نئے رشتے زخم دِل کے لیے مرہم بن جاتے ہیں۔ حجاب کی شاعری میں بھی عشق کے ان
تمام منازل اور اس کے مختلف پہلو اور کیفیات کا عکس اور آنچ موجود ہے جس نے ان کی شاعری
کو اس طرح فطری بنا دیا ہے کہ اس میں جذبات کا اتار اور چڑھاؤ، ان کی شدت اور دھیمے پن
کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں بھرپور
نشاطیہ کیفیت موجود ہے ؎

اس کی آنکھوں میں بارہا میں نے خود کو ہنستا ہوا سا پایا ہے
اس کی آواز کی کھنک میں کبھی میرا لہجہ سا گنگنایا ہے
میری زلفیں کھلیں تو وہ مہکا، ہنٹ اس کے ہلے تو میں بولی
میری سرگوشیوں میں بھی اکثر ذکر بن کر وہ مسکرایا ہے

میں نے سوچا جو اس کے بارے میں ڈھل گیا خود وہ میرے پیکر میں
جب پکارا ہے اس کو گھبرا کر وہ میری دھڑکنوں تک آیا ہے

ان اجنبی آہٹوں کے صدقے، ہوئی ہے مانوس جن سے خلوت
میرے تکلم کے گونگے گھر میں جو لفظ و معنی سجا رہی ہیں
ہیں کس قدر بے حجاب موسم کی شوخ و گستاخ یہ نگاہیں
بدن کے بے نقش پیرہن میں نئے شگوفے کھلا رہی ہیں

یوں تو کہنے کو کہاں تجھ کو بھی دیکھا ہم نے — پھر بھی جس سمت نظر کی تجھے دیکھا ہم نے
جن دنوں تھا تری محفل میں ہمارا بھی گزر — چاند اُگتا تھا ترے کان کا ہالہ بن کر
تیرے خط آج بھی محفوظ ہیں تکیوں کے تلے — حرف حرف جاگتا ہے شب میں اجالا بن کر

اس جذبہ سرور و نشاط میں اگرچہ کہیں کہیں شعور و ادراک کے سنگ ریزے بھی موجود ہیں۔ لیکن ان اشعار میں جذب، بے ساختگی، برجستگی اور جرأت کے وہ عناصر شامل ہیں جو کیف و آہنگ کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ ان میں مختلف کیفیات کے اظہار اور رنگوں کے تضاد کے ساتھ وہ شائستہ بیباکی موجود ہے جو بیشتر خواتین شعرا کے یہاں شاذ و نادر ہی پائی جاتی ہے جس نے انھیں اپنے معاصروں میں ممتاز کر دیا ہے۔ نظم کا یہ ٹکڑا بھی ایسے ہی رنگ سے عبارت ہے ؎

موضوعِ گفتگو ہیں ہمیں خاص و عام میں
رسوائیاں بھی مل گئیں اب اپنے نام میں
ہم کو کسی کا ڈر نہیں سرشار دل ہے اب
کہتا رہے زمانہ ہمیں اس کی فکر کیا
معراج پا گئے ہیں محبت کی آج ہم
بدنام گر ہوئے تو ہوئے نام تو ہوا (معراجِ محبت)

زندگی کے اس سفر میں کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی رسوائیاں منزل کا نشان بن پاتی ہیں۔ اور جذبہ عشق چٹکی ہوئی دھوپ میں خورشید کی تمازت کے سامنے ٹھہر پاتا ہے۔

حجاب زندگی کے اس اہم تجربے سے واقف نظر آتی ہیں جہاں ابتدائی مسرتوں کے بعد خواب حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں اور اپنے پیچھے ان پہاڑی ندی نالوں کی سی خاموشی چھوڑ جاتے ہیں جو بظاہر پرسکون نظر آتی ہے لیکن اس کے باطن میں لاتعداد دراڑیں، گڑ واہٹیں، آہیں دردا ور ٹیسیں دفن ہوتی رہیں۔ حجاب نے اسی ناکام عشق کے پس منظر میں عورت کے ان ہی جذبات کو حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے ؎

دل جو ٹوٹا تو بہت دور تک آواز گئی
اس قدر درد کہ امبر کا جہاں گونج گیا
دور ماتھے سے ستاروں سے لپسینہ ٹپکا
چاند کی آنکھ سے چنگاریاں بہہ بہہ نکلیں
رات کی اوڑھنی جگنو کی نگاہیں بن کر
صبح تک درد کے اشکوں کی نگہبان رہی
ہونٹ ساکت رہے آنکھوں نے بھرم کھول دیا
لفظ خاموش تھے اشکوں کی زباں بول اٹھی
میری بربادی کا افسانہ تو مشہور ہوا
تیری خوش بختیاں لیکن نہ کسی نے دیکھیں
میرے رونے پہ ہر اک شخص کی آنکھیں نم ہیں
تیرے ہنسنے پہ تیرا دل بھی پشیمان رہا۔ (دل جو ٹوٹا)

شکستِ دل کی صورت میں اگرچہ مرد اور عورت دونوں کا ردِّ عمل یکساں ہوتا ہے لیکن جذبات اور اظہار کی نوعیت مختلف ہوتی ہے اور یہ انفرادیت مذکورہ اقتباس میں موجود ہے۔ لیکن حکایت دل کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں یہاں فاصلے جتنے بڑھتے ہیں اسی قدر قربت کا احساس بیدار ہوتا ہے اور واقعات کی ناخوشگواری کے باوجود یہ دردِ دل زندگی کا سرمایہ اور تنہائیوں کا رفیق بن جاتا ہے جس میں حرف و حکایت"

شکوہ و شکایت، وفا و بے وفائی کا الزام ابتدائی مراحل کی حیثیت رکھتے ہیں اور باقی زندگی وہم و گمان اور احتساب میں گزر جاتی ہے۔ حجاب کے کلام میں بھی عشق کے مختلف مراحل اور عورت کے فطری اور حقیقی جذبات و احساسات کا عکس نظر آتا ہے جس میں شدت اور گہرائی دونوں موجود ہیں۔ حجابؔ نے ان نازک و لطیف جذبات کو پیش کرتے ہوئے جہاں اچھوتی تشبیہات کا استعمال کیا ہے اور شائستہ لب و لہجہ اختیار کیا ہے وہاں جذبات کو بھی تطہیر کا موقع فراہم کیا ہے جس کی وجہ سے اشعار کے حسن و تاثیر میں اضافہ ہو گیا ہے یہ چند متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے۔

آج اس خام خیالی کا بھرم ٹوٹ گیا
دل کو دل ہی کا مکیں آج صنم لوٹ گیا

تو فقط میرا نہیں، بھول یہ ساری تھی مری
مجھ سے جو کچھ تھا، محض وقت گزاری تھی تیری

گر یہ سچ ہے کہ تجھے مجھ سے سروکار نہیں
میری الفت سے ترے دل کا بگڑتا نہیں

میری آنکھوں میں ذرا جھانک کے کہہ دے ایک بار ق
مجھ سے نفرت ہے تجھے، مجھ سے تجھے پیار نہیں

چاہتوں میں شعور ہے کتنا، نسبتیں ہیں غیور کس درجہ
جب ہوئی شرمسار میں، اس کی چشم تر میں حجاب آیا ہے

وہ ایک نام جو تا عمر میرے ساتھ چلا
ڈھلا جو پیکر خاکی میں کیوں نہ ساتھ چلا

کوئی رشتہ، کوئی ناتہ، کوئی بندھن، کوئی نام
میں نے اس آنکھ سے دیکھا نہیں تیری جانب

پیاسے صحراؤں میں پانی کے گماں جیسا تھا
ہاں وہ دشمن جو حبیب دل و جاں جیسا تھا

زندگی جس کی تمنا میں گزاری تھی حجابؔ
حیف مر کر بھی نہ اس کوچے کے پیوند ہوئے

میرے احساس کی رگوں میں کہیں
نام بھولا سا موجزن ہے ابھی

تجھ کو ان ڈوبتی نبضوں کی قسم کہہ دینا
تو نے سچ مچ مجھے چاہا تھا محبت کی تھی

حجابؔ نے نسوانی جذبات کے اظہار کے لیے غزل کے مقابلہ میں نظم کے فارم کو زیادہ بہتر طور پر استعمال کیا ہے جن میں شدت اور روانی دونوں موجود ہیں جنھیں طوالت کی وجہ سے یہاں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ رقیبانہ جذبوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہاں دو نظموں سے مختصر اقتباس پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) کل تیرے شہر میں میلے تھے لگے سنتے ہیں
رات محفل میں تری جمع تھے سب بیگانے
جشن شادی تھا رقیبوںؔ کی پذیرائی تھی
مجھ کو تڑپانے کی خاطر تیرے احباب نے بھی
کس قدر دھوم مچائی تھی چراغاں کرکے

میرے گھر میں تھے مگر شام سے کتنے سائے

بن گیا چیز نمائش کی تو لیکن ہیں تو
اب بھی سمٹی ہوں فقط تیری ہی یادوں میں صنم
کوئی شکوہ ہے مجھے تجھ سے نہ ہے کوئی گلہ
تجھ کو چاہا ہے اگر ہم نے تو اے جان جہاں
بے وفائی بھی تری ہم کو گوارا ہے صنم (بے وفائی بھی گوارا ہے)

(۲)

بہت خوش تھے تم اپنے چاہنے والوں کی محفل میں
قدم تھے لڑکھڑاتے، آنکھ بہکی بہکی جاتی تھی
حسینوں کی طرف جب دیکھ کر تم مسکراتے تھے
دیے لاکھوں تمھارے لب پہ گویا جگمگاتے تھے
بچھے جاتے تھے تم غیروں کے آگے بادہ مستی میں
سمٹتی جا رہی تھی میں مگر اپنی ہی ہستی میں (شکایت)

یہاں حجابؔ کی دو مختصر نظمیں پیش کرنا بھی بے محل نہ ہوگا جن سے نہ صرف مختصر نظم پر حجاب کے قدرتِ فن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے بلکہ تجدید ملاقات کے اس منظر کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جس کو جذبوں کی آنچ دے کر شعر کے قالب میں ڈھالنا ایک مشکل مرحلہ ہے۔ لیکن حجابؔ ان محسوسات کو بخوبی پیش کر سکی ہیں۔ پہلی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

آج مدت کے بعد جب وہ ملا
اپنے احساس کی رگوں میں رچا
زہر فرقت نچوڑتی میں رہی
اک نظر اس کو دیکھ کر آنکھیں
جھک گئیں خود بخود نجانے کیوں
اور وہ میرے سامنے بیٹھا
میری پلکوں سے کچھ ذرا اوپر
عرق آلود سی جبیں پہ لکھے
ہجر کی زندگی کے روز و شب
دیر تک دم بخود رہا پڑھتا

دوسری نظم "کشمکش" جذبوں اور رشتوں کی شکست وریخت کے بعد نئے دور کے آغاز اور اس کشمکش سے تعلق رکھتی ہے جس میں سب کچھ پیچھے رہ جانے کے بعد بھی قطع تعلق کو دل گوارا نہیں کرتا ہے۔ عشق اول زمانی اعتبار سے کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو لیکن ذہنی وجذباتی اعتبار سے یہ سفر کس قدر طویل، صبر آزما، کرب انگیز اور حیات بخش ہوتا ہے کہ ترک تعلقات کے لیے فیصلہ کرنے میں آگ کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے اور یہی پہلی محبت کا وہ جادو ہے جو رشتوں کی گرفت سے نکل کر خود کو سدا بہار گلشن میں تبدیل کر لیتا ہے لیکن زندگی بسر کرنے کے لیے دل کو وقت اور حقیقت کے سامنے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔ ان نازک لمحوں کے ہیجان انگیز جذبات واحساسات اور خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنا مشکل کام ہے لیکن حجابؔ "کشمکش" میں انھیں لفظوں کا پیکر دینے میں کامیاب نظر آتی ہیں ؎

شیشۂ زندگی شکستہ ہوا،
کرچیوں میں بٹ گئی ہستی
ریزہ ریزہ بکھر گئی دنیا

تارِ سازِ حیات کے ٹوٹے
نغمگی رو رہی ہے منھ ڈھانپے
زخمی حالات کی ندی ہے رواں
فرض اور دل ہیں دو کنارے سے
اور میں آنسوؤں کے پُل پہ کھڑی
سوچتی ہوں کہ کس طرف جاؤں

حجابؔ کی شاعری عورت کے فطری جذبات و احساسات اور تجربات کا حقیقت پسندانہ اور شاعرانہ اظہار ہے۔ اور ان ہی کے ساتھ بتدریج ارتقائی منازل طے کرتی ہے نوجوانی کی رومانیت اور کشمکش اگر اس کی پہلی منزل ہے تو زندگی سے مصالحت، حالات سے سمجھوتہ اور تکمیل کی خواہش اس کی دوسری منزل ہے جس کے ساتھ حق و اختیار، خود اعتمادی اور شعور کی بیداری کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ حجابؔ کا شعری اسلوب بھی اس سے متاثر نظر آتا ہے۔ کھلا ڈلا انداز، نازک اور لطیف جذبات کو گرفت میں لے کر پرتیں اتارنے کی کوشش، شعور کی پختگی اور لب و لہجہ میں تبدیلی اس کے ایسے پہلو ہیں جس کی وجہ سے وہ جنسِ مخالف کی شاعری سے ممتاز نظر آتی ہے اور جس کا عکس حجابؔ کی اس چھوٹی سی نظم "تکمیل" میں بھی موجود ہے جو مخصوص تجربے اور احساس کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب نظر آتی ہے ؎

میری ہستی تھی ادھوری کتنی
کتنا چھوٹا تھا سراپا میرا
جسم میرا تھا ادھورا کتنا
تو نے ہولے سے چھوا جب مجھ کو
اک اک عضو پھول بن کے کھلا
آج میں ہو گئی مکمل تو
خود ہی حیرت زدہ سی ہوں کتنی (تکمیل)

تکمیل کے اس احساس کے بعد ہی وہ گھڑیاں شروع ہوتی ہیں جس میں عورت خود کو سجاتی اور سنوارتی ہے اور اپنے انگ انگ میں زندگی کی تمام تازگی، خوشیوں اور رنگوں کو سمیٹ لینا چاہتی ہے۔ حجابؔ نے اپنی نظموں میں عورت کے ان جذبات کی بھرپور اور حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ جس کی ایک مثال یہ نظم "آہٹ" بھی ہے ؎

حجابؔ کس کی ہے آوازِ پا کی آہٹ
کہ جسم و جان بنے میرے رہ گزر اس کی
اتر گئی مری تنہائیوں میں کیسی لے
کہ جیسے دور سے آتا ہو کارواں کوئی
حدی کی لے پہ مچلتی ہوں گھنٹیاں جیسے
سنور سنور کے سراپے نے لی جو انگڑائی
ٹپک ٹپک گئی آنکھوں سے دل کی بے تابی
ہنسی رہیں آج میری خلوتیں ایک عرصے بعد
خود آئینہ بھی لگا مسکرانے میرے ساتھ
یہ کیسی آہٹیں جاگی ہیں روح میں میری
کہ گنگناتی نظر آ رہی ہے تنہائی (آہٹ)

حجابؔ کی حقیقت پسندی، جرأت اور بیباکی خوابوں اور خواہشوں کی تعمیر و تکمیل تک ہی محدود نہیں رہتی ہے بلکہ ان شوخیوں اور لطیف احساس کو بھی شعر کا قالب عطا کرتی ہے جن کے صنفِ نازک کی طرف سے اظہار پر تہذیب اور سماج قدغن لگاتا رہا ہے لیکن اگر جائز رشتوں اور جائز وسیلوں کے ذریعہ اس کا اظہار کیا جائے تو یہ عیب نہیں بلکہ ہنر بن جاتا ہے۔ حجابؔ کی غزلوں اور نظموں میں ایسے شواہد موجود ہیں جو ازدواجی زندگی کی پرلطف مسرتوں کے اظہار کو جائز تصور کرتے ہیں۔ یہاں طوالت سے بچنے کے لیے غزل کے چند اشعار اور ایک چھوٹی سی نظم پر اکتفا کیا گیا ہے ؎

میرے ہونٹوں پہ اس کے لب نے جانے کیا لکھا تھا کل   کہ وہ الفاظ اب تک رینگنے لگتے ہیں تن من میں
ق
اترتے جا رہے ہیں جانے کیسے روح میں میری   نجانے کیوں ہے اتنی روشنی اب دل کے آنگن میں
سوتی جاگتی آنکھوں نے اس درجہ تجھ کو دیکھا ہے   ان آنکھوں کی پتلی میں تصویر ابھر آئی ہے تیری
میری آنکھوں میں جھانکنے والے میرے دل کی طرف بھی دیکھ ذرا   صرف فصلیں نہارنے والے گیلی مٹی کو چھو کے دیکھ ذرا
بولتے جسم نہیں سنگ بھی گا سکتے ہیں   چھو کے آواز کے ہاتھوں سے جگائے کوئی
جسم کے ہر مسام پر یا رب   آنکھ رکھ دے کہ اس کو دیکھا کروں
مرے جسم پہ تیری آنکھوں نے دلبر   لکھا اس طرح جا بجا نام اپنا
کہ میرا وجود ناتواں اب   ترے نام لکھا فسانہ ہوا
اب آ بھی جاؤ کہ تنہائی مجھ پہ ہنستی ہے   تصنع ہو گیا ہے بے جا حجابؔ تم ہو کہاں

پھر میں چپکے سے قریب آؤنگی
اپنے آنچل کی کروں گی چلمن
اور تمھاری سلگتی پلکوں پہ
شبنمی ہونٹ اپنے رکھ دوں گی
بانہہ میں جب بھروگے تم مجھ کو
دھڑکنیں موم بن کے پگھلیں گی
قطرہ قطرہ ناصبور بدن
دھیرے دھیرے ٹپکتا جائے گا

حجابؔ نے اپنے اشعار میں کیف، مستی، اور سرشاری کے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ نئے نہیں ہیں لیکن ان کے اسلوب و انداز میں نیا پن ضرور ہے۔ جو یہ احساس دلاتا ہے کہ حقیقی جذبات کا حقیقت پسندانہ اظہار شعر کی کشش و تاثیر میں کس طرح اضافہ کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو کی بیشتر شاعری یک رخ پن کا شکار رہی ہے اس میں مردوں کے جذبات تو موجود ہیں لیکن عورت کے فطری جذبات مفقود ہیں۔ اس میں عورتوں کے جذبات و محسوسات کو نہ صرف مردوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے بلکہ جہاں

عورت کو اظہار کے مواقع ملے بھی ہیں وہاں بھی رسم و رواج نے انھیں اظہار کی آزادی نہیں دی ہیں۔ خود حجابؔ شعر تو کہتی رہی ہیں لیکن ان کو شائع کرانے کی جرأت زندگی کا ایک حصہ گزر جانے کے بعد ہی کر سکی ہیں جن کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ خواتین شعرا ازدواجی زندگی کے حوالے سے کس طرح حسن و عشق کو نئی سمت و رفتار اور شاعری کو نئے موضوعات اور تازگی عطا کر سکتی ہیں۔

تنہائی، انتظار، آسودگی، خواب اور حقیقت کا تصادم، قول و فعل کا تضاد، روزمرہ کی زندگی میں جذبات کا اتار چڑھاؤ وغیرہ اگرچہ عام موضوعات ہیں لیکن انھیں اگر ازدواجی زندگی کے حوالے سے بیان کیا جائے تو نہ صرف ان کی معنویت بدل جاتی ہے بلکہ یہ ایسا آئینہ بن جاتے ہیں جس میں کھرے کھوٹے جذبات و کردار کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اور عورت کی ازدواجی زندگی کے لمحات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

انتظار کے لمحے جب طویل اور جذبے آسودگی کا رس پی کر جب سرد ہونے لگتے ہیں۔ تو اس کھٹی میٹھی دھوپ چھاؤں کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں کبھی دیر سے آنے کا شکوہ، کبھی وعدہ خلافی کی شکایت، کبھی بہانوں پر طنز، کبھی وفاشعاری پر شبہ، کبھی تغافل، سرد مہری اور بے اعتنائی پر جھنجھلاہٹ، کبھی روٹھنے اور منانے کی خواہش، کبھی محبت و نفرت کا ملا جلا اظہار، کبھی خوش نصیبی پر اظہار تشکر اور کبھی اپنے فیصلہ پر پشیمانی وغیرہ روزمرہ کی زندگی کے وہ پہلو ہیں جن سے مخصوص دور کے ذہنی و جذباتی ردعمل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خواتین شعرا میں حجابؔ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے عورت کی زندگی کے ان پہلوؤں کو کمال خوبی اور جزئیات کے ساتھ اپنے اشعار اور نظموں میں پیش کر دیا ہے۔ حجابؔ کے یہ چند اشعار اور ایک مختصر سی نظم ملاحظہ کیجیے ؎

وہ شخص بھی ایک عام سا انسان ہے پر اس میں	کیا فن ہے کہ خود مجھ کو چرا لیتا ہے مجھ سے
میں اس کے چہرے پہ اپنے نقوش ڈھونڈتی ہوں	ہر ایک بار جو چہرہ بدل کے ملتا ہے
ظالم ہو تم اتنی تو خبر تھی مجھے لیکن	ہرجائی بھی ہوگے کہاں سوچا تھا یہ میں نے
فرض ہی گر تجھے نبھانا ہے اس کو پورا نبھا تو بات ہے	تو نے سر پر ردا تو ڈالی ہے پا برہنہ ہوں یہ بھی دیکھ ذرا

تم سمجھتے ہو مجھے روٹھنا آتا ہی نہیں
روٹھ جاؤں تو نہ بولوں گی کبھی بھی تم سے
شرط اتنی ہے منانے کا کرو تم وعدہ ۔ (شائستہ)

— — — — — — — —

وہ جھوٹا ہے فریبی ہے، وفادشمن ہے، قاتل ہے
ہمیشہ جھوٹے وعدوں سے مرا دل توڑ جاتا ہے
کبھی آتا ہے تھوڑی دیر کو خوشبو کی صورت وہ
تو دو ہی پل میں اٹھ کر بھاگتا ہے "کام ہے" کہہ کر
جو کہتا ہے کہ آؤں گا، نہیں آتا کئی دن تک
میں جھنجھلا کر قسم کھاتی ہوں پھر ترک تعلق کی
میں دل میں ٹھانتی ہوں اب نہ بولوں گی کبھی اس سے
اسے بھی یوں ستاؤں گی کہ جیسے وہ ستاتا ہے
مگر جب سامنے آتا ہے وہ میرے تو جانے کیوں
میں یکسر ٹوٹتی جاتی ہوں اندر اور باہر سے
جو چاہوں بھی تو اس سے روٹھنا ممکن نہیں رہتا (وفادشمن)

یہ جذبات اگرچہ عام اور صحت مند زندگی کا حصہ ہیں اور اردو تنقید نے انھیں اگرچہ گھر آنگن کی شاعری میں محدود کر دیا ہے لیکن یہ نہ صرف فرضی عاشقانہ جذبات اور فلسفہ کے مقابلہ میں زیادہ پرلطف محسوس ہوتے ہیں بلکہ زندگی کی تفہیم میں رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ عورت کی زندگی میں ان ہی تلخیوں اور کڑواہٹوں کی دھند سے روشنی کی ایک نئی کرن بیدار ہوتی ہے جسے اس کے تیسرے عشق یا زندگی کی تیسری منزل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تخلیقی تجربے سے گزرنے کی وہ امید ہے جس کے ساتھ فخر و تکمیل کا احساس بیدار ہونے لگتا ہے۔ اس اچھوتے موضوع اور احساس کو حجاب نے کس طرح شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے ۔

میں تمہاری امانت لیے میری جاں
در بدر پھر رہی ہوں بہ شکل ہوا
ایک ایفائے وعدہ کی شکل میں
میں نے مرمر کے کتنے جنم لے لیے
لمحے، ایام، ہفتے، مہینے، برس
کتنے قرنوں تلک میں رہی منتظر

حجاب نے دو خوبصورت نظمیں "تیری آمد" اور "تاج محل" بیٹا اور بیٹی کی پیدائش کے حوالے سے بھی کہی ہیں۔ جو نہ صرف موضوع و مواد کے اعتبار سے منفرد ہیں بلکہ ماں کی حیثیت سے عورت کے جذبات و احساسات کا بھرپور شاعرانہ اظہار کا ایسا مظہر بھی رہیں جس میں پیار، ممتا، فخر، تکمیل کا احساس یا س میں اس کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور جن کی سادگی ہی ان کے شاعرانہ حسن کی علامت ہے۔

میرے آنگن کی سونی بیری پر
ایک پنچھی کہیں سے آ بیٹھا
میں تھی کھوئی ہوئی خیالوں میں
اس کی آہٹ کی کچھ خبر نہ ہوئی
دیر تک مجھ کو دیکھتا وہ رہا
جھک کے پھر بولا میرے کانوں میں
کس لیے اس قدر اداس ہے تو
ناامیدی نہیں بھلی اتنی!
کچھ تو ہمت سے کام لے اپنی
روک لے آنسوؤں کی آندھی کو
بھیگی پلکوں کو تو اٹھا تو ذرا

—

دیکھ تیرے اُجاڑ آنگن میں
زندگی بن کے صبح آئی ہے
میں نے دیکھا تو سونی بیری پر
ایک ننھا سا غنچہ منہ کھولے
میری آنکھوں میں جھانکتا سا لگا (نیری آمد)

دوسری نظم کا بھی ایک بند ملاحظہ کر لیجیے جو پہلی نظم سے بھی زیادہ خوبصورت اور پرکار ہے۔

عقل حیران تھی یہ نور کا پیکر کیا ہے
حسن کی کثرت ایجاد! یہ آخر کیا ہے
تو نے مسکرا کے کہا کس لیے حیران ہے تو
مجھ کو پہچان، تیرے جسم کا حصّہ ہوں میں
میں ترا چاند ہوں ماں، تیری امیدوں کا کنول
میں تیرے خواب کی تعبیر، تیرا تاج محل (تاج محل)

زندگی کی بھی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ تکمیل کی وہ خواہش جو برسوں عورت کو تلاش میں مبتلا رکھتی ہے وہ ہی اس کے جذبات و احساس کو منقسم بھی کر دیتی ہے۔ یہ دو نیم شخصیت کس کو چاہے اور کس کو ترجیح دے۔ حجاب نے عورت کی اس کش مکش کو حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی ایک نظم میں اس طرح پیش کیا ہے۔

مرے ہشام! مرے دل کی دھڑکنوں کے امیں
میں تجھ کو چاہتی ہوں جسم وجاں کی حد سے پرے
مگر یہ سچ ہے کہ اک تو ہی میرا پیار نہیں
ہے کوئی اور بھی میں جس سے پیار کرتی ہوں
وہ آدمی کہ تجھے جس نے مجھ کو بخشا ہے
ہے اس کا نام بھی شامل مری وفاؤں میں

ترے لیے میں کئی بار مر کے جی لوں گی !
جو چاہے وہ تو میں اک ساتھ کتنے جنم جیوں
میں تیرے واسطے راتوں کو جاگتی ہوں مگر
میں اس کے واسطے اک عمر جاگ سکتی ہوں
یہ اعتراف ہے مجھ کو کہ تم ہی دونوں میں
میں بٹ گئی ہوں ادھر اور ادھر ادھوری سی
تجھے یہ حق ہے کہے بے مہر کہ حرجائی
ہے اختیار اسے تجھ کو بے وفا کہہ لے
میں تجھ کو دیکھ کے جیتی ہوں میری جان مگر
مگر اُسے بھی نہ دیکھوں تو بے حیات رہوں
تری طرف جو اٹھے چشم بد تو لرزاں ہوں
اسے بھی دیکھ لے کوئی تو تلملاتی ہوں
میں تیرے نام پہ مرتی ہوں میرے ہمنشیں
پر اس کے نام پہ جی اٹھتی ہوں نجانے کیوں
میری وفاؤں کا محور تیری طرح وہ ہے
میں لمحہ لمحہ اسے پوجتی ہوں مثل خدا
یہ اور بات کہ اس کو نہیں خبر کچھ بھی (اعتراف)

چاہتوں اور رشتوں کے سفر میں ہر فن کار کی طرح عورت کو بھی اچانک بے خبری میں شدت سے یہ سوال ستانے لگتا ہے کہ یہ سب کچھ اس نے کتنی گراں قیمت دے کر حاصل کیا ہے۔ فرض اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دب کر، شوہر اور اولاد کے درمیان بٹنے جڑنے بکھرنے اور سمٹنے کے عمل میں وہ خود کو نہ جانے کہاں گم کر چکی ہے۔ اس کی اپنی ذات اور شخصیت کہاں ہے۔ اور یہ سوال جب بار بار خود کو دہرانے لگتا ہے تو جو تھے عشق کا آغاز ہوتا ہے جسے خود اپنی ذات سے عشق، یا انا پرستی اور نرگسیت بھی کہہ سکتے

ہیں۔ یوں تو ہر جذبے، ہر خیال، ہر اظہار اور ہر بیان میں ذات ہمیشہ ہی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتی ہے لیکن اس کا مرکز محور ذات نہیں غیر از ذات ہوتا ہے۔ اب وہ نہ صرف اپنے لیے جینا چاہتی ہے بلکہ دوسروں کی چاہت کا مرکز بھی بننا چاہتی ہے۔ اس کا یہ سفر اگر خود شناسی، خود احتسابی اور توازن و خود اعتمادی کی طرف لے جاتا ہے تو خود نمائی اور خود پرستی کی راہ بھی دکھاتا ہے جہاں تنہائی محرومی اور مایوسی کا احساس اور ذہنی انتشار رفیق زندگی بن جاتے ہیں۔ انسان کی انا میں یہ دونوں قوتیں اور جذبے بیک وقت موجود رہتے ہیں اور ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جو ان دونوں کے درمیان توازن قائم رکھ پاتے ہیں۔ حجاب کی شاعری بھی اسی توازن سے عبارت ہے۔ انھوں نے اختر الایمان کی نظم "لڑکا" کے انداز میں "وہ آنکھیں" اور "تعارف" جیسی نظمیں کہی ہیں جن میں خود شناسی اور خود احتسابی کا احساس موجود ہے۔ ان کے علاوہ بعض دیگر نظموں میں بھی انھوں نے ماضی کے حوالے سے خود کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسی کے ساتھ ان کی خود نمائی، خود پرستی اور نمود و نمائش نے انھیں تنہائی، تشنگی، خلا اور ادھورے پن کا احساس بھی عطا کیا ہے جس نے ان کی شاعری میں درد و غم، سوز و ساز اور ترحم پسندی کو تقویت پہنچائی ہے۔

"مدفن"، "ماضی"، "ادھورے خواب" اور "مرگ آرزو" حجاب کی ایسی نظمیں ہیں جن میں درد کی لے خاصی تیز ہے اور غموں کے بوجھ، لہجہ کی یاسیت، درد و سوز میں ڈوبی ہوئی فضا نے رجائیت کے تمام دروازے بند کر دیے ہیں۔ یہ درد و غم کچھ ان کے اپنے ہیں۔ کچھ حالات اور زمانے نے انھیں دیے ہیں۔ اسی غم دوراں نے ان سے فسادات کے موضوع پر "نئی زمین" اور "نوحۂ میرٹھ" جیسی نظمیں لکھوائی ہیں۔ انھوں نے لبنان میں صیہونیت کے شکار فلسطینیوں کے نام "ہماری عید"، صبرا اور شاتیلہ کیمپ کے مظلوموں اور شہیدوں کے نام "وہ صبح اُگے" اور سری لنکا کی خانہ جنگی پر "لنکا"، بنگلہ دیش کے شرنارتھیوں کے مصائب پر "تو ہر تغیر کا ایمان ہے"، افغان بچوں کی شہادت پر "جو کھلونوں کی چاہت میں مارے گئے" جیسی نظمیں بھی کہی ہیں جو ظلم و بربریت، جنگ و افلاس کے خلاف نفرت اور انسان دوستی کے جذبات اور محبت و اخوت کے احساس سے معمور ہیں۔ حجاب نے وطن دوستی

کے گیت بھی گائے ہیں۔ "جنم بھومی" اور "مادرِ وطن" جیسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ بھرا ہوا ہے۔ ان کے مجموعے میں کچھ مذہبی نظمیں بھی شامل ہیں اور "انسان اور بھگوان" نیز "جواں رادھائیں" جیسی نظمیں بھی موجود ہیں جن میں فرد و سماج اور سیاسی و معاشی نظام کو طنز و تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

حجاب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ غزل اگر تہذیب نفس کا مطالبہ کرتی ہے تو نظم خیالات کی وضاحت اور بتدریج ارتقا کی طالب ہے۔ انھوں نے اگرچہ غزل کے مزاج کو سمجھا ہے اور اس کو نبھانے کی کوشش بھی کی ہے لیکن ان کا فن غزل کے مقابلہ میں نظم میں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے جس میں زور اور جوش دونوں موجود ہیں البتہ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ جذبات کی شدت اور خیالات کی رو میں بہہ کر نظم کے تقاضوں کو فراموش کر بیٹھی ہیں جس کی وجہ سے ان کی طویل نظمیں بتدریج ارتقائی منازل طے نہیں کر پاتی ہیں اور تکرار کا شکار ہو جاتی ہیں البتہ مختصر نظموں میں وہ زیادہ کامیاب نظر آتی ہیں جن کی پرکاری اور وحدت تاثر گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

حجاب نے روایت کی تقلید بھی کی ہے اور اس سے انحراف بھی، انھوں نے دوسرے شعرا کے اثرات بھی قبول کیے ہیں لیکن نسوانی جذبات و احساسات اور خیالات کے اظہار میں وہ اپنی ہم عصر شاعرات سے ممتاز نظر آتی ہیں جسے ان کے فن کا کمال اور اسلوب کی انفرادیت کہا جا سکتا ہے۔

عزیز احمد

چنگیز خاں : فاتح عالم

چھٹا باب

پریسٹر جون (طغرل اونگ خاں) کی موت

قوم قرایت کی فتح کا فوری نتیجہ یہ تھا کہ تموچن کے مخالفین کا محاذ طاقت پکڑ گیا۔ خانہ بدوشوں کے سرداروں کا ہمیشہ یہ رجحان ہوتا کہ بڑھتی ہوئی طاقت کا ساتھ دیں۔ اس سے ان کی اپنی حفاظت بھی ہوتی اور زیادہ دولت پیدا کرنے کا موقع ملتا۔

غصے کے عالم میں مغل نے اونگ خان کو ملامت کی۔

" اے خان! اے میرے باپ، جب دشمن تیرا پیچھا کر رہے تھے تو کیا میں نے چار بہادروں کو تیری مدد کے لیے نہ بھیجا؟ تو میرے پاس اندھے گھوڑے پر سوار آیا، تیرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور ایک بھیڑ کے گوشت کے سوا تیرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کیا میں نے افراط سے بھیڑیں اور گھوڑے تیری نذر نہیں کیے۔

گزرے دنوں میں تیرے آدمیوں نے لڑائی کی لوٹ کا وہ سامان اپنے پاس رکھ لیا تھا جو قاعدے کے لحاظ سے میرا تھا۔ پھر یہ سب سامان تیرے دشمنوں نے تجھ سے چھین لیا۔ میرے بہادروں نے پھر سے اس سامان پر قبضہ کر کے اسے تیرے حوالے کیا۔ پھر دریائے قراسو کے کنارے ہم دونوں نے قسم کھائی کہ ہم پھوٹ ڈالنے والوں کی چغلیوں کو نہیں سنیں گے، بلکہ کوئی بات ہو گی تو اس کے متعلق مل کر آپس میں بات چیت کر لیں گے۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا، مجھے کم حصہ ملا ہے، مجھے زیادہ ملنا چاہیے۔

"جب بیل گاڑی کا ایک پہیا ٹوٹ جاتا ہے تو بیل آگے نہیں بڑھ پاتے۔ کیا میں تیرے کبت کا ایک پہیا نہیں؟ تو مجھ سے کس لیے ناراض ہے؟ تو مجھ پر کیوں حملہ کر رہا ہے۔"

اس پیغام میں ایک طرح کی حقارت بھی نظر آتی ہے۔ یہ ملامت ایک ایسے آدمی کو کی گئی تھی جو خود لبیں دبیش کے عالم میں ہوا ور یہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتا ہو کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے۔ طغرل ایک اندھے گھوڑے پر سواری کیا کرتا تھا۔

غیر متزلزل ارادے کے ساتھ تموچن نے ان حالات میں جو کچھ وہ کر سکتا تھا کیا۔ قریب کے قبیلوں کو قاصد دوڑائے۔ بہت جلد اس کے اپنے علاقے کے خان اور ان کے ہمسائے مغل سردار کی سفید گھوڑے کی چمڑے والی مسند کے دائیں بائیں آکے دوزانو ہو گئے۔ ان کے لانبے لانبے لبادے مرصع کمر بندوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے پیتل جیسے چہرے جن پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں، یورت کی آگ کے دھوئیں میں آگے کی طرف نمایاں گھور رہے تھے۔ یہ خانوں کی قرولتائی (مجلس مشاورت) تھی۔

بورجیجن یا بھوری آنکھوں والوں میں سے ہر ایک نے باری باری سے بات چیت کی۔ ان میں سے کئی تموچن کے ہاتھوں شکست کھا چکے تھے۔ بعض کی تجویز یہ تھی کہ قرابت کی اطاعت کر لی جائے اور اونگ خان اور اس کے بیٹے کو آقا مان لیا جائے جو زیادہ بہادر تھے۔ انھوں نے جنگ کا نعرہ لگایا اور تموچن کو آقا بنانے کی تجویز کی۔ اس دوسری تجویز کو قبول کیا گیا۔

جب تموچن نے سرداری کا عصا قبول کیا تو ساتھ ہی اعلان کیا کہ سب قبیلوں میں اس کے حکم کی تعمیل ہوا ور اسے حق ہوگا کہ جس کو مناسب سمجھے سزا دے۔ "شروع سے میں تم سے کہتا آیا ہوں کہ تینوں دریاؤں کے درمیان کی زمینوں کا ایک آقا ہونا چاہیے۔ یہ پہلے تمھاری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب جب کہ تمھیں یہ ڈر ہے کہ اونگ خاں تم سے بھی وہی سلوک کرے گا جو اس نے مجھ سے کیا ہے تو تم نے مجھے اپنا سردار انتخاب کیا ہے۔ میں نے تمھیں تبیدی، عورتیں، یورت اور ریوڑ عطا کیے ہیں۔ اب میں تمھارے لیے زمینوں اور اپنے آباد اجداد کے بنائے ہوئے قاعدوں کی حفاظت کروں گا۔"

جاڑوں میں گوبی کا سارا علاقہ دو حریف جماعتوں میں بٹ گیا۔ جھیل بیکال کے مشرق

ں رہنے والے لوگ مغربی حلیفوں کے مقابلے کے لیے کمربستہ ہونے لگے۔ اس مرتبہ تموچن میدان میں پہلے یا۔ وادیوں میں برف پگھلنے سے پہلے، اپنے نئے حلیفوں کے ساتھ چپ چاپ اس نے اونگ خان کے خیمہ و خرگاہ کی جانب پیش قدمی شروع کی۔

داستان میں ان خانہ بدوشوں کی چالاکی کی بڑی دلچسپ جھلک نظر آتی ہے۔ تموچن نے دشمنوں کی صفوں میں پہلے ایک مغل کو بھیجا کہ وہ تموچن کی بدسلوکی کی شکایت کرے اور یہ اطلاع دے کہ مغلوں کا لشکر ابھی خیمہ گاہ سے بہت فاصلے پر ہے۔ قرایت نے جو ایسے زیادہ زود یقین نہ تھے کئی سواروں کو اس مغل جنگجو کے ساتھ بھیجا کہ ادھر ادھر کھوج لگا کر دیکھیں کہ واقعہ کیا ہے۔

اکیلا مغل جنگجو جو ان لوگوں کے ساتھ تھا اور جس کی نظر بڑی چوکنی تھی، اس نے قرایت کی خیمہ گاہ کے پاس ہی تموچن کے قبیلیوں کا پرچم اس ٹیلے کی دوسری جانب دیکھا، بس پھر ادھر سے وہ خود بڑھ چڑھ رہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے نگراں بڑے اچھے گھوڑوں پر سوار ہیں اور اگر کہیں انھوں نے پرچم کو دیکھ لیا تو اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا کے صاف بچ کے نکل جائیں گے، اس لیے وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور اپنے گھوڑے کو دیکھنا شروع کیا۔ جب ان لوگوں نے پوچھا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو اس نے کہا۔

"ایک سُم میں پتھر آگیا ہے۔"

جتنی دیر زیرک مغل نے اپنے گھوڑے کے سُم سے فرضی پتھر نکالنے میں لگائی، اتنی دیر میں تموچن کا ہراول ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ گیا اور قرایت کو قید کر لیا۔ اونگ خاں کی خیمہ گاہ پر حملہ شروع ہوا اور بڑی تلخ لڑائی چھڑ گئی۔

شام ہوتے ہوتے قرایت کو شکست ہوئی۔ اونگ خاں اور اس کا بیٹا دونوں زخمی ہو کے بھاگ نکلے۔ تموچن اپنے گھوڑے پر سوار مفتوح خیمہ گاہ میں داخل ہوا اور قرایت کی دولت اپنے آدمیوں کے حوالے کی۔ گھوڑوں کی زینیں جن پر رنگین ریشم اور سرخ نرم چمڑا چڑھا ہوا تھا، پتلی بڑی اچھی صیقل کی ہوئی تلواریں، چاندی کی رکابیاں اور ساغر۔ یہ چیزیں اس [illegible] دی تھیں۔ اونگ خاں کا خیمہ جس کا استر زریں اطلس کا تھا، اس نے پورے

کا پورا اُن چرواہوں کو بخش دیا، جنھوں نے اس پہلی رات کو وہ جینسہ کے قریب اسے قرایت کی یورش کی اطلاع دی تھی۔

پھر اُس نے قرایت لشکر کے قلب کو گھیر لیا۔ اور ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ہتھیار ڈال دیں تو ان کی جان بخشی کی جائے گی جس طرح تم اپنے آقا کی ملازمت میں لڑے، بہادروں کے شایانِ شان تھا۔ اب تم میرے آدمی بنو، اور میرے لشکر میں شامل ہو جاؤ۔"

باقی ماندہ قرایت اس کے پرچم تلے آ گئے اور اس نے ان کے شہر قراقرم کی طرف پیش قدمی کی جو صحرا میں واقع تھا۔

کچھ عرصے بعد اس کے رشتے کا بھائی جاقومہ بھی پکڑ لیا گیا اور اس کے سامنے لایا گیا۔

تموچن نے اس سے پوچھا۔ "تجھے کس طرح کے سلوک کی توقع ہے؟"

بلا پس و پیش کے جاقومہ نے جواب دیا۔ "وہی سلوک جو میں تیرے ساتھ کرتا اگر میں نے تجھے گرفتار کیا ہوتا۔ آہستہ آہستہ عذاب کی موت۔"

اس کا مطلب تھا عذاب کی وہ موت جو چین کے لوگ اس طرح دیا کرتے تھے کہ یکے بعد دیگرے جسم کے سب اعضاء کاٹ ڈالتے۔ پہلے دن چھنگلیا کا ایک پور کاٹتے اور اس کے بعد روزانہ ایک ایک جوڑ کے حساب سے سارے اعضاء کاٹ ڈالتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورچجن کی اولاد میں جرأت کی کمی نہ تھی۔ تموچن نے بہر حال اپنی قوم کی رسم کی پابندی کی جس کے لحاظ سے کسی عالی نسب سردار کا خون بہانے کی ممانعت تھی۔ اس نے حکم دیا کہ جاقومہ کو ریشم کے پھندے سے پھانسی دی جائے یا بھاری نمدوں کے درمیان دبا دیا جائے تاکہ دم گھٹ کے مر جائے۔

اونگ خان جو اس لڑائی میں اپنی مرضی کے خلاف شریک ہوا تھا، ناامیدی کے عالم میں اپنے علاقے سے باہر بھاگ نکلا۔ اور ایک ترک قبیلے کے دو جنگجوؤں نے اس کا کام تمام کر دیا داستان بیان کرتی ہے کہ اس کا کاسۂ سر چاندی سے مرصّع کیا گیا اور اس سردار کے خیمے میں بڑی عزّت سے رکھا گیا۔ اس کا بیٹا بھی اسی حالت میں مارا گیا۔

کوئی اور خانہ بدوش سردار ہوتا تو اس فتح کے بعد مطمئن ہو جاتا۔ خانہ بدوشوں کی فتح کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ مالِ غنیمت لوٹ کر جمع کیا گیا، پھر بیکاری یا بیزاری۔ پھر آپس کے

جھگڑے اور آوارہ گردوں کے درمیان اٹکل پچو سلطنت کی تقسیم۔

لیکن تموچن کی تعمیر دوسری طرح کے عناصر سے ہوئی تھی۔ اب اس کی سلطنت کا مرکز قرابت کا علاقہ تھا جو زمین کی کاشت کرتے تھے اور شہروں کی تعمیر کرتے تھے۔ ان کے نہر گارے اور پھونس کے ہی سہی مگر یہ مستقل اقامت کے مقامات تھے۔ اس نے پوری کوشش کی کہ قرابت کو اسی طرح آباد اور خوش رکھے اور پھر ذرا بھی توقف کیے بغیر اس نے اپنے لشکروں کو نئی فتوحات کے لیے آگے بڑھایا۔

اس نے اپنے بیٹوں سے کہا۔ " کام کی خوبی یہ ہے کہ اسے اتمام کو پہنچایا جائے۔

گوبی پر قبضہ کرانے والی جنگ کے بعد تین سال کے اندر اندر اس کے آزمودہ کار سوار مغربی ترکوں اور نائیمانوں اور الیغوروں کی وادیوں میں گھس آئے۔ ان لوگوں کا تمدن اعلیٰ پیمانے کا تھا۔ وہ اونگ خاں کے دشمن تھے اور اس کا امکان تھا کہ تموچن کے مقابلے کے لیے وہ باہم اکٹھے ہوجاتے۔ لیکن تموچن نے یہ اندازہ کرنے کا موقع ہی نہ دیا کہ ان پر کیا مصیبت پڑنے والی ہے۔ شمال کے سفید برف پوش پہاڑوں کے سلسلے سے لے کر جنوب میں دیوارِ چین کی پوری لمبائی تک، بیش بالیغ اور ختن کے پرانے شہروں کے درمیان اس کے افسر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے پھرتے۔

یہاں مارکوپولو نے تموچن کے متعلق ایک فقرہ لکھا ہے:۔

" جب وہ کوئی صوبہ فتح کرتا تو وہاں کے باشندوں یا ان کی جائداد کو نقصان نہ پہنچاتا۔ صرف یہ کرتا کہ ان کے درمیان اپنے کچھ لوگوں کو آباد کر دیتا اور باقی کو ساتھ لے کے اور صوبوں کو فتح کرنے کے لیے آگے بڑھ جاتا۔ جب مفتوحوں کو اس کا اندازہ ہوجاتا کہ وہ ان کی حفاظت کتنی اچھی طرح کرتا ہے اور انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تو ان کو پتہ چلتا کہ وہ کیسا شریف سردار ہے۔ دل و جان سے وہ اس کے ساتھ ہوجاتے اور وفاداری سے اس کی خدمت کرتے اور جب اس نے اتنا جم غفیر اکٹھا کرلیا جو معلوم ہوتا تھا کہ ٹڈی دل کی طرح ساری دنیا پر چھا جائے گا، تب اس نے دنیا کے بہت بڑے حصے کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔"

دراصل اس کے پرانے دشمنوں کے نصیب اتنے اچھے نہ تھے جب وہ کسی دشمن قبیلے

کی جنگی طاقت توڑ چکتا تو یہ مغل حکمراں خاندان کے تمام آدمیوں کا تعاقب کرتا اور انھیں موت کے گھاٹ اتارتا۔ دشمن قبیلے کے لڑنے والے مرد وفادار قبیلوں میں لڑائی کے لیے تقسیم کر دیے جاتے۔ جو عورتیں زیادہ حسین ہوتیں وہ جنگجوؤں کی بیویاں بنالی جاتیں، باقی عورتیں بنائی جاتیں۔ مغل مائیں آوارہ گرد بچوں کو پال لیتیں اور شکست خوردہ قبیلے کی چراگاہیں اور اس کے ریوڑ نئے مالکوں کے تصرف میں آجاتے۔

ابھی تک تموچن کی زندگی کی تشکیل اس کے دشمنوں نے کی تھی۔ مصیبت نے اس کے جسم کو طاقت بخشی تھی۔ اسے بھیڑیوں کی سی فراست عطا کی تھی کہ وہ جبلّی طور پہ بالکل ٹھیک عمل کرتا۔ اب وہ اتنا طاقت ور ہوگیا تھا کہ اپنی مرضی کے مطابق فتوحات کا سلسلہ شروع کرے اور ان لوگوں کی شکست کے بعد جو ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کرتے وہ باقی ماندہ لوگوں سے مہربانی کا سلوک کرتا۔[1]

اب وہ دنیا کے نئے علاقوں میں داخل ہو رہا تھا۔ جہاں سے بڑے بڑے پرانے قافلوں کے راستے گزرتے تھے اور جہاں وسط ایشیا کے شہر آباد تھے۔ اس کے دل میں بڑا تجسس پیدا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے قیدیوں میں بہت سے ایسے بلند و بالا اور خوش پوش آدمی ہیں جو سپاہی نہیں۔ اسے پتہ چلا کہ یہ عالم و فاضل ہیں۔ ان میں بعض ہئیت و نجوم کے ماہر ہیں۔ بعض طبیب ہیں جو پیوند چینی اور جڑی بوٹیوں کے استعمال کا ہنر جانتے ہیں اور عورتوں کی بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد ایک ایغوری شخص لایا گیا جو ایک شکست خوردہ سردار کی ملازمت کر چکا تھا اور وہ اب بھی سونے کے ایک عجیب زیور کو بڑی حفاظت سے اپنے پنجے میں لیے ہوئے تھا۔

مغل نے اس سے پوچھا "تو اس طرح اس زیور کی حفاظت کیوں کرتا ہے؟"

اس شخص نے جو شکست خوردہ سردار کا وفادار وزیر تھا، جواب دیا "میں چاہتا ہوں کہ

---

[1] گوبی وسط ایشیا، اور چین کی حد تک یہ صحیح ہے، لیکن خوارزم اور اسلامی سرزمینوں میں چنگیز خاں اور اس کے مغلوں کا سلوک شروع سے آخر تک حد درجہ سفاکی کا رہا۔

جب تک وہ زندہ ہے جس نے یہ میرے سپرد کیا ہے میں اس کی حفاظت کرتا رہوں۔"

خان نے اقبال کیا "تو وفادار نوکر ہے مگر وہ تو مر چکا اور اس کی ساری زمین، ساری ملکیت اب میرے قبضے میں ہے۔ مجھے بتا کہ یہ زیور کس چیز کا نشان ہے اور کس کام کا ہے؟"

"جب میرا آقا چاندی یا غلہ اکٹھا کرتا تو یہ کام اپنی رعایا میں سے کسی کو تفویض کرتا اس مہر سے اس کے احکامات پر نشان لگایا جاتا تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ در حقیقت شاہی فرمان ہے۔"

تموچن نے حکم دیا کہ اس کے لیے بھی فوراً ایک مہر بنائی جائے اور سبز جیڈ کی ایک مہر تیار کی گئی۔ اس نے قیدی ایغور کو معاف کر دیا۔ اپنے دربار میں اسے عہدہ دیا اور حکم دیا کہ اس کے لڑکوں کو ایغوری زبان میں لکھنا پڑھنا سکھائے۔ ایغوری دراصل ایک طرح کی شامی زبان تھی جو غالباً کسی زمانے میں نسطوری راہبوں نے اس علاقے میں سکھائی ہوگی۔ اب یہ راہب مر کھپ چکے تھے۔

لیکن سب سے بڑا انعام اس کے ان بہادروں کو ملا جنھوں نے کسی شدید مصیبت میں خان کی مدد کی تھی۔ انھیں ترخان کا لقب دیا گیا اور ان کا مرتبہ اوروں سے اونچا قرار دیا گیا۔ انھیں اس کی اجازت تھی کہ بے تکلف جب چاہیں شاہی شامیانے میں چلے آئیں۔ ہر جنگ میں لوٹ کے حصوں میں ان کا حق تھا کہ پہلے جو حصہ وہ چاہیں لے لیں اور انھیں ہر طرح کے خراج سے معافی دی گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی کوئی خطا خطا نہ سمجھی جاتی تھی۔ موت کی سزا ان کو نو مرتبہ معاف تھی۔ جو زمینیں وہ چاہتے انھیں بخش دی جاتیں اور نو پشتوں تک ان کی اولاد کو بھی یہی حقوق بخشے گئے۔

اس کے خانہ بدوشوں کی بڑی آرزو یہی تھی کہ ترخانوں میں سے کسی کی نوکری کریں۔ فتوحات اور تین سال تک نئے علاقوں میں تگ و تاز نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ صرف مغل خان کا ڈر ایک حد تک انھیں روکے رکھتا۔

لیکن اس فاتح کی شخصیت کے اطراف سارے ایشیا کے بگڑے دل جمع تھے۔ سارے ترک اور مغل جنگجو جو سمندر اور طیان شان کے سلسلۂ کوہ کے درمیان رہتے تھے اور طیان شان کے

پہاڑوں میں قراختائی کے علاقے پر کوشلوک کی حکومت تھی۔ کچھ عرصے کے لیے قبیلوں کی باہمی رقابتیں بھلائی جاچکی تھیں۔ شیطان پرست سامان بدھ مت والے مسلمان نسطوری عیسائی سب بھائیوں کی طرح بیٹھے حالات کا انتظار کر رہے تھے۔

اس وقت جو پیش آ جاتا عجب نہ تھا۔ جو پیش آیا یہ تھا کہ مغل خان اپنے آباء و اجداد کی حدود سے بہت اونچا ہوکر اٹھا اور سر بلند ہوا۔ اس نے خانوں کی مجلس مشاورت یا قرولطائی طلب کی کہ وہ ایشیائے بلند کی تمام قوموں پر حکومت کرنے کے لیے ایک فرد واحد ایک شہنشاہ کا انتخاب کریں۔

اس نے انھیں سمجھایا کہ وہ اپنوں میں سے ایک ایسے آدمی کا انتخاب کریں جس کی حکومت اور سب پر مسلّم ہو۔ قدرتی طور پر گذشتہ تین سال کے واقعات کے بعد قرولتائی نے تموچن ہی کو انتخاب کیا۔ اس کے علاوہ قرولتائی نے یہ بھی طے کیا کہ اسے ایک موزوں خطاب دیا جائے۔ مجلس میں ایک پیشین گوئی کرنے والا بھی تھا جو آگے بڑھا اور جس نے اعلان کیا کہ اس کا نیا نام چنگیز خاں ہوگا۔ چنگیز خاں سرداروں کا سردار، سارے عالم کا شہنشاہ۔

مجلس خوش تھی۔ خانوں کے متفقہ اصرار پر تموچن نے یہ نیا خطاب قبول کرلیا۔

ساتواں باب

یاسا

یہ قوریلتائی ۱۲۰۶ء میں منعقد ہوئی اور اسی سال اس چینی عہدہ دار نے جو مغربی سرحدوں کا نگہبان تھا اور جس کا فرض یہ تھا کہ دیوارِ چین کے باہر کے وحشیوں پر نظر رکھے اور ان سے خراج وصول کرے، یہ اطلاع لکھی کہ دور دراز کی ریاستوں میں کامل امن ہے۔ جب سے ترک اور مغل قوموں نے چنگیز خاں کو اپنا مالک انتخاب کیا تھا کئی صدیوں کے بعد پہلی بار انھیں متحد ہونے کا موقع ملا تھا۔

جوشِ عقیدت میں وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ چنگیز خاں فی الحقیقت بوگدو تھا۔ بوگدو دیوتاؤں کا بھیجا ہوا ہوتا تھا اور اعلیٰ آسمان کی ساری قوت اس کو عطا ہوتی تھی۔ لیکن محض جوش و خروش، ان قانون سے ناآشنا لشکروں کی روک تھام کے لیے کافی نہ تھا۔ بہت عرصے سے وہ ان قبائلی رسموں کے پابند رہے تھے اور رسوم میں اتنا ہی اختلاف ہوتا ہے جتنا انسانی طبائع میں۔

ان کی روک تھام کے لیے چنگیز خاں کے پاس اپنے مغلوں کا فوجی نظام تو تھا ہی، اور اب ان مغلوں میں سے زیادہ تر بڑے کارآزمودہ دیرینہ سپاہی بن چکے تھے۔ لیکن اس نے یہ اعلان کیا کہ ان پر حکومت کرنے کے لیے اس نے یاسا کو وضع کیا ہے۔ یہ یاسا اس کے قوانین کا مجموعہ تھا جن میں سے بعض اس نے خود وضع کیے تھے اور بعض کارآمد قبائلی رسوم تھے۔

اس نے یہ واضح کر دیا کہ چوری اور زنا سے خاص طور ناپسند ہیں اور ان کی سزا موت ہے۔ اگر کوئی کسی کا گھوڑا چرا لے تو اس چوری کی سزا موت ہے۔ اس نے کہا کہ اسے یہ سن کے غصہ آتا ہے کہ بیٹا اپنے والدین کی یا چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی نافرمانی کرے، شوہر اپنی بیوی پر اعتبار نہ کرے یا بیوی شوہر کی فرماں برداری نہ کرے، امیر غریبوں کی مدد نہ کریں، یا کمتر درجے کے لوگ سرداروں کی عزت نہ کریں۔

نشہ مغلوں کی بڑی خاص علّت تھی، اس کے متعلق اس نے کہا جو آدمی نشہ پیے ہوتا ہے اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی نے سر پر چوٹ کھائی ہو۔ عقل اور ہنر اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ مہینے میں صرف تین مرتبہ نشہ سے مدہوش ہونے کی اجازت ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ مدہوشی پیدا ہی نہ ہونے پائے لیکن قطعی نشہ سے پرہیز کون کرسکتا ہے؟"

مغلوں کی ایک اور کمزوری یہ تھی کہ وہ رعد سے ڈرتے تھے۔ گوبی کے سخت طوفانوں میں اس خوف سے وہ اس درجہ مرعوب ہو جاتے کہ جھیلوں اور دریاؤں میں ڈوب جاتے تاکہ آسمانوں کے قہر سے محفوظ رہ سکیں ـــــ کم سے کم فرار وبری کوئیں جیسے محترم مسافر نے یہی لکھا ہے۔ یاسا میں نہانے کی ممانعت تھی۔ رعد و برق کے طوفان میں پانی کو چھونا بھی منع تھا۔

وہ خود بہت مغضوب الغضب تھا لیکن چنگیز خاں نے اپنے ساتھیوں کو اسی غیظ و غضب کی عام عادت سے محروم کردیا۔ یاسا نے مغلوں پر آپس میں لڑائی جھگڑا حرام کردیا۔ ایک اور بڑا اہم اور اٹل نکتہ یہ تھا کہ اس کے سوا اور چنگیز خان نہیں ہوسکتا، اس کا نام اور اس کے بیٹوں کے نام یا تو سنہرے حرفوں میں لکھے جاتے یا پھر ان کا لکھنا ممنوع تھا۔ اس نئے شہنشاہ کی رعایا آسانی سے اس کا نام زبان پر نہ لاتی۔

وہ خود دین فطرت کا پابند تھا اور اس کی پرورش گوبی کے شکستہ حال، چالاک شامانوں کی صحبت میں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا قانون مذہبی معاملات میں نرم تھا۔ دوسرے فرقوں کے امام، پیر، مسجدوں کے موذّن عام الزاموں سے بری سمجھے جاتے تھے۔ مغل خیمہ و خرگاہ کے پیچھے پیچھے رنگ رنگ کے پجاری جوق در جوق چلے جاتے ـــــ زرد پوش اور سرخ پوش آوارہ گرد لاما چکردار مالا جپتے ہوئے اور بقول فرار و بری کوئیس۔ رنگین لبادے پہنے جن میں وہ عیسائیوں کے اصل شیطان سے مشابہ معلوم ہوتے تھے۔ مارکو پولو کا بیان ہے کہ ہر لڑائی سے پہلے چنگیز خاں نجومیوں سے فال نکلواتا۔ مسلمان نجومیوں کی پیشین گوئی کوئی تسلی بخش نہیں نکلی، لیکن نسطوری عیسائی زیادہ کامیاب رہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے پاس دو چھڑیاں ہوتیں جن پر دونوں حریف سرداروں کے نام نقش ہوتے۔ زبور کا ورد کیا جاتا اور یہ چھڑیاں ایک دوسرے پر گر پڑتیں۔

چنگیز خاں نجومیوں کی سن تو لیتا ــــ اور معلوم ہوتا ہے کہ آخری زمانے میں ایک ختائی نجومی کے انتباہوں پر اسے بہت اعتقاد تھا ــــ لیکن وہ اپنے کسی منصوبے سے ان نجومیوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے کبھی نہیں پلٹا۔

یاسا میں جاسوسی، اغلام، جھوٹی گواہی اور کالے جادو کی بڑی سادہ سزا تجویز کی گئی تھی۔ سزا سزائے موت تھی۔

یاسا کا پہلا قانون قابل غور ہے۔ "حکم دیا جاتا ہے کہ سارے انسان ایک خدا پر یقین کریں، جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے، جو اکیلا امیری یا غریبی، زندگی یا موت اپنی مرضی کے مطابق عطا کرتا ہے جس کی طاقت اور حکومت ہر شے اور ہر شخص پر کامل اور مکمل ہے۔" یہ ابتدائی نسطوری عیسائیوں کی تعلیمات کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ چنگیز خاں یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی رعایا کے درمیان کہیں خط امتیاز کھینچے یا فرقہ وارانہ مخالفت کی دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دے۔

ماہر نفسیات یہ بتائے گا کہ یاسا کے تین مقاصد تھے۔ چنگیز خاں کی اطاعت، خانہ بدوش قبیلوں میں اتحاد و اتفاق اور غلطیوں کی سخت سزا، یاسا کا تعلق انسانوں سے تھا، جائدادوں سے نہیں۔ اور کوئی آدمی اس وقت تک خطا کار نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ وہ خود اقبال نہ کرے یا جرم کرتا ہوا پکڑا نہ جائے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان پڑھ مغلوں میں انسان کی زبان کو بہت وقیع سمجھا جاتا تھا۔

زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ جب کسی خانہ بدوش پر کسی جرم کا الزام لگایا جاتا تو اگر وہ سچ مچ مجرم ہوتا تو اقبال کر لیتا۔ ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں کہ بعض مجرم خود خان کے پاس آئے اور سزا پانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔

خان کی زندگی کے آخری زمانے میں اس کی اطاعت کامل اور قطعی طور پر واجب تھی۔ اگر کوئی معمولی سا قاصد فرمان لے کے پہنچتا تو دربار سے ہزار میل کے فاصلے پر کسی فوج کا سپہ سالار خان کے حکم کی تعمیل میں فوراً اپنے عہدے سے دستبردار ہو جاتا۔

فرا بہ اندام پادری کارپینی لکھتا ہے "دوسری قوموں کے مقابل وہ اپنے سرداروں کے

بڑے فرمانبردار ہیں۔ ان کی بڑی تعظیم کرتے ہیں اور کبھی لفظاً یا عملاً انھیں دھوکا نہیں دیتے۔ آپس میں وہ شاذونادر ہی لڑتے ہیں اور جھگڑتے، زخم خوری یا قتل کی واردا تیں شاذونادر ہی پیش آتی ہیں۔ کہیں چور اور ڈاکو نہیں، اس لیے ان کے مکان اور ان کے چھکڑے جن میں ان کا سارا اسامان اور مال و دولت رہتی ہے، کھلے پڑے رہتے ہیں۔ کبھی بند یا مقفّل نہیں کیے جاتے۔ ان کے ریوڑوں میں سے کوئی جانور اگر کہیں بھٹک جاتا ہے تو سے پانے والا اسے ان افسروں کے پاس چھوڑ جاتا ہے، جن کے ذمے گمشدہ جانوروں کی حفاظت ہے۔ آپس میں ایک دوسرے سے وہ اخلاق سے ملتے ہیں اور اگرچہ کھانے پینے کی چیزیں کم ہیں، مگر وہ کھانے پینے میں ایک دوسرے کو اکثر شریک کرتے رہتے ہیں۔ تکلیف میں وہ بڑا صبر و استقلال دکھاتے ہیں اور ایک دو دن کا فاقہ ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح گاتے بجاتے رہتے ہیں۔ سفر میں گرمی یا سردی برداشت کر لیتے ہیں اور شکایت نہیں کرتے آپس میں لڑتے بہت کم ہیں اور اگرچہ نشے کے بہت شوقین ہیں، نشے کے عالم میں بھی نہیں جھگڑتے۔

(اس پر یورپ کے اس مسافر کو معلوم ہوتا ہے کہ کافی حیرت تھی۔)

"ان کے نزدیک نشہ بڑی عزّت کی چیز ہے۔ جب کوئی بہت پی جاتا ہے تو قے کر کے پھر سے پینے لگتا ہے۔ دوسری قوموں سے وہ بہت غرور اور نخوت سے پیش آتے ہیں اور دوسرے آدمی خواہ کتنے ہی معزز کیوں نہ ہوں، انھیں وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے دربار میں روس کے بڑے ڈیوک کو، شاہ جرجستان کے شہزادے کو، بہت سے سلطانوں اور دوسرے بہت سے معززین کو دیکھا جن کی کوئی عزّت یا حرمت نہیں کی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ تاتاری جوان کی خدمت گزاری پر مامور تھے، کتنے ہی کم مرتبہ سہی ان عالی نسب قیدیوں سے زیادہ رتبے کے مستحق سمجھے جاتے تھے اور دربار میں ان کے مقابلے میں زیادہ اچھی نشستیں ملتی تھیں۔

دوسری قوموں سے وہ خشم و نخوت سے پیش آتے ہیں اور ناقابل یقین حد تک دغابازی کر گزرتے ہیں۔ جو دغا یا فریب کرنا ہوتا ہے وہ اسے بڑی ہوشیاری سے چھپاتے

ہیں کہ اس سے کوئی بچاؤ نہ کر پائے۔ دوسری قوموں کا قتل عام ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔"

ایک دوسرے کی امداد ـــــ اور دوسری قوموں کو نیست و نابود کرنا" یہ یاسا کی صدائے بازگشت ہے۔ یہ اہل قبائل جو لڑائی کے بھوکے اور پرانی رقابتوں کے زخم خوردہ تھے صرف ایک ہی طریقے پر متحد رکھے جا سکتے تھے۔ اگر انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ بہت جلد باہمی خانہ جنگی اور تباہ کاری کا پرانا کھیل کھیلنا شروع کر دیتے اور لوٹ اور چراگاہوں کے لیے آپس میں لڑنا شروع کر دیتے۔ سرخ بالوں والے خان نے باد تند کی کاشت کی تھی اور طوفان کی فصل پک کر تیار ہو رہی تھی۔

اس کا اسے احساس تھا۔ اس کے بعد کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس کا خوب احساس تھا۔ وہ خانہ بدوشوں میں پلا بڑھا تھا اور جانتا تھا کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے اگر ان خانہ بدوشوں کو روکنا ہے تو اس کی یہی ایک صورت ہے کہ انھیں اور کہیں جنگ میں الجھا کر رکھا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طوفان پر اپنی لگام اور زین کسے، اور اسے گوبی سے باہر دوڑا لے جائے۔

داستان اس کی اس زمانے کی تصویر کی ہمیں ایک جھلک دکھاتی ہے جب کہ قرولتائی کا طویل جشن ختم نہ ہونے پایا تھا۔ دولن بلداق، یعنی اس پہاڑ کے دامن میں جس کا سایہ اس کی پیدائشی سرزمین پر پڑتا ہے، اپنے نویاکوں کی دموں والے مانوس پرچم کے تلے کھڑے ہو کے اس نے بورچیجن اور اپنے حلیف سرداروں کو یوں مخاطب کیا۔

"یہ لوگ جو مستقبل میں راحت اور مصیبت میں میرا ساتھ دیں گے، جن کی وفاداری آئینے کی طرح صاف و شفاف ہے ان سب کو میں منغلوں کا لقب دیتا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ یہ اس دنیا کے تمام جانداروں سے زیادہ طاقتور ہوں اور سب پر حکومت کریں۔"

اسے وہ قوتِ تخیل عطا ہوئی تھی کہ وہ اس بے لگام مجمع کو ایک منظم اور متحد لشکر بنتا دیکھ سکتا تھا۔ عقلمند اور پراسرار النیوری، تنومند قرایت، جفاکش پکا منغل خونخوار

تاتاری جری مرکبت برفانی آبادیوں کے خاموش، اور بڑی قوت برداشت رکھنے والے باشندے شکاری، ایشیائے بلند کے تمام شہسوار سب ایک واحد عظیم الشان قبیلے میں مجتمع ہو رہے تھے جس کا وہ خود سردار تھا۔

اس سے پہلے بھی کچھ عرصے کے لیے وہ ہی انگ نو بادشاہوں کی سرکردگی میں متحد ہوئے تھے، اور چین میں قتل و غارت مچائی تھی، یہاں تک کہ ان کی روک کے لیے چین کی دیوارِ عظیم تعمیر کی گئی۔ چنگیز خاں میں وہ قوت بیان بھی تھی کہ جوان کے دیرینہ جذبات کو متحرک کر سکے اور اسے اپنی صلاحیت پر کامل اعتماد تھا کہ وہ ان کی قیادت کر سکے گا۔

اُس نے ان کی آنکھوں کو نامعلوم سرزمینوں کی فتح کا خواب دکھایا، اور خود انتہائی جفاکشی سے اس نئے لشکر کی توسیع و تنظیم کی۔ اس نے یاسا کا حوالہ دیا۔

جنگجو پر حرام تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ دس سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا ابتدائی گروہ ہوتا تھا۔ اس دس کے گروہ پر یہ حرام تھا کہ وہ اپنوں میں سے کسی کو زخمی چھوڑ کے آگے بڑھ جائیں۔ اسی طرح لشکر کے ہر سپاہی پر اس وقت تک پیچھے ہٹنا یا بھاگنا حرام تھا، جب تک کہ پرچم لڑائی کے میدان سے ہٹا نہ لیا جائے۔ اس وقت تک لڑائی کو چھوڑ کے لوٹ کھسوٹ کرنا منع تھا جب تک کہ کمان کرنے والا افسر اس کی اجازت نہ دے۔

دسپاہیوں میں لوٹنے کی جو جبلی خواہش تھی، اس کے مدِّ نظر اس کی اجازت تھی کہ افسر مانے یا نہ مانے لوٹ میں انھیں جو کچھ مل جائے وہ ان کی اپنی ملکیت ہو جاتی تھی۔)

پادری کارپینی جو مشاہدے میں تیز تھا اس کی مستند گواہی دیتا ہے کہ چنگیز خاں نے یاسا کے اس حصہ پر پابندی سے عمل کرایا۔ وہ کہتا ہے کہ مغل اس وقت تک میدانِ جنگ سے نہ ہٹتے جب تک کہ ان کا پرچم بلند رہتا۔ اگر گرفتار ہو جاتے تو کبھی پناہ نہ مانگتے اور کسی دشمن کو زندہ نہ چھوڑتے۔

یہ لشکر اب قبیلوں کا بے ترتیب مجمع نہ تھا۔ رومتہ الکبریٰ کے عسکر کی طرح اس کی تنظیم اور ترتیب مستقل تھی۔ دس دس کی وحدتیں، دس ہزار کے تومانوں پر منتہی ہوتیں۔ ایک تومان سوار فوج کا مکتفی دستہ سمجھا جاتا۔ فوجوں کے سردار ارخان تھے جو خان کے سپہ سالار تھے۔ ان کی جملہ تعداد گیارہ تھی اور ان میں سوبدائی بہادر شامل تھا جس نے کبھی کسی غلطی کا ارتکاب نہ کیا، ان میں کہن سال اور تجربہ کار معقول بہادر بھی تھا اور آتشیں جبی نویان بھی۔

لشکر کے ہتھیار ـــــ یا کم از کم نیزے، وزنی زرہیں اور ڈھالیں ـــــ بعض افسروں کے زیر نگرانی اسلحہ خانہ میں رکھے رہتے، جہاں ان کی حفاظت اور صفائی کا اہتمام ہوتا اور جب کسی حملہ کے لیے جنگجوؤں کو طلب کیا جاتا تو ان میں یہ ہتھیار تقسیم کیے جاتے۔ سپاہی انھیں پہن کے صف آراء ہوتے ارخان ان کا معائنہ کرتے۔ عقلمند مغل یہ نہ چاہتا تھا کہ کئی لاکھ آدمی آزادا ور پوری طرح سے مسلح ایک لاکھ مربع میل کے میدانی اور پہاڑی علاقے میں پھیلے رہیں۔

اپنے لشکر کی طاقت اور توجہ ہٹانے کے لیے یاسا کا حکم تھا کہ موسم سرما میں پہلی سخت برف باری، اور بہار میں گھاس کی پتیوں کی پہلی نمود کے درمیان بڑے پیمانے پر شکار ہوا کرے، اور بارہ سنگھوں، ہرنوں اور بارہ پاگورخروں کا پیچھا کیا جائے۔

اس نے اعلان کیا کہ بہار میں قرولتائی کے جشن ہوں گے۔ اور تمام اعلیٰ افسروں سے توقع تھی کہ وہ ضرور شریک ہوں گے، جو میرے احکام سننے کے لیے میرے پاس نہ آئے گا اور اپنے رقبے میں ہی رہے گا، اس کی حالت اس پتھر کی سی ہوگی جو گہرے پانی میں پھینک دیا جائے یا اس تیر کی سی ہوگی جو لمبی گھاس میں چلایا جائے ـــــ وہ لاپتا ہو جائے گا"

اس میں کوئی شک نہیں کہ چنگیز خاں نے آبا و اجداد کی روایات سے بہت کچھ سیکھا تھا اور مروجہ رسوم سے اس نے بہت فائدہ اٹھایا، لیکن یہ ایک مستقل فوجی

تنظیم کی حیثیت سے لشکر کی تشکیل اسی کا اپنا کارنامہ تھی۔ اس پر یاسا کا راج تھا۔ اٹل قوت اور طاقت کے چابک سے اسے یکجا کیا گیا تھا اور یکجا رکھا گیا۔ اب چنگیز خاں کے ہاتھ میں ایک نئی طرح کی جنگی طاقت تھی۔ بھاری منظم مسلح سوار فوج جو ہر طرح کی زمین پر بہت تیزی سے حرکت کر سکتی تھی۔ اس کے دور سے پہلے ایرانیوں اور پارتھیوں کے پاس بھی شاید اتنی ہی کثیر سوار فوج تھی، لیکن تیر اندازی، وحشیانہ جرأت اور نیست و نابود کر دینے کے ہنر میں وہ مغلوں کے ہمسر نہ تھے۔

یہ لشکر ایک ایسا ہتھیار تھا کہ اگر اسے ٹھیک طرح پر استعمال کیا جائے اور اس کی حسب ضرورت روک تھام کی جائے تو اس سے بہت بڑے پیمانے پر تباہی اور بربادی پھیلائی جا سکتی تھی۔ اور اس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اسے دیوار چین کے اس پار ختا کی قدیم اور بے بدل سلطنت کے خلاف استعمال کیا جائے۔

سانحۂ ارتحال بیگم محمد سلیم (مرحوم)

محمد سلیم مرحوم جو ذاکر صاحب اور پروفیسر محمد مجیب سابق شیخ الجامعہ کے زمانہ میں طویل عرصہ تک جامعہ کی ملازمت سے وابستہ رہ چکے تھے ان کی اہلیہ اور محترمہ ڈاکٹر کشور سلیم، ریڈر شعبۂ کیمسٹری کی والدہ کا ۲۸ نومبر ۲۰۰۹ء (سنیچر) کی رات میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی تدفین دوسرے روز عصر کے بعد جامعہ کے قبرستان میں ہوئی۔ ادارہ مرحومہ کے لیے دعاء مغفرت کرتا ہے اور ڈاکٹر کشور سلیم، ڈرمان سلیم اور دیگر اعزا کے غم میں شریک ہے۔ (ادارہ)

محمد ذاکر

کھولن

ایک کے ساتھ تھا دوسرا اور پھر سب کے سب یاں پہ آتے رہے۔ رات ہردم جواں ہوتی اس پیرزن کی گزرتی رہی [کیا یونہی بس گزرتی رہے گی؟] خوف سا خوف تھا کپکپی تھرتھری جس کی گلیوں کی کجیوں کی صورت میں ڈھلتی گئی اور اب میں کھڑا ہوں یہاں اک گلی کے دہانے پہ جس میں ذرا دور اک موڑ پر اک گلی چاندنی اور کھلنے لگی [تو کیا بس یہی ہے کہ جیسے سزا یافتہ کوئی اپنی رہائی کا دیدہ دلیری سے رستہ تلاشے؟ کیا ہر خیالِ حسین فکرِ تازہ ہے مفرور ملزم کہ جو اجنبی کوے و برزن میں چھپتا پھرے؟] کھڑا ہوں یہاں اور پیہم اسی سوچ میں ہوں روِش گر یہی ہے تو جنگل سے پیدا ہوئے شہرِ تہذیب میں ہر گلی در گلی در گلی کے سرے اک نہ اک دن تو صحرا ہی سے، ریت سے جا ملیں گے، جنگل تھا بس اک سرا، ریت ہے دوسرا، کون روکے اسے، کس کو یارا ہے یہ! تو کیا ساری محرابوں کو، گنبدوں کو، مِناروں کو، ذہنوں میں خوشبو کی، انگڑائیوں کو، خیالوں کی خوش رنگ معصوم کلیوں کو ہم ریت میں ملتے دیکھیں؟ میرا ہاتھ بایاں ہے پتلون کی جیب میں جس کا رنگ کبودی زمانے کی سردی سے گرمی سے بے رنگ ہونے لگا ہے، یہ ہے نوعِ انساں کی اس سرزمیں پر ضمانت کا ساماں کہ اپنی حرارت پہ، اپنی ہی حرکت پہ ہردم بھروسا کرو تم۔ تو کیا میں چلوں اور ہم سب چلیں، تم بڑھو، ہم بڑھیں — مگر کس طرف اور کہاں تک بڑھیں اور کیسے بڑھیں! تو کیا سب کے سب داہنے ہاتھ میں لال بتّی لیے ایک کو دوسرے، تیسرے

پروفیسر محمد ذاکر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵ .. ۱۱۔

سب کو جا کر یہاں آنے سے روک دیں، اسی سیلِ بے سنگ کو جو اسی پیرزن کے غضب کے لپکتے ہوئے جسم اور اس کے سحر جواں سے کبھی واقف نہیں؛ نہ جانے یہ کیسے، یہ سب قدِ آدم ملخ اور پشتے یہ کیڑے مکوڑے کوئی ان میں اژدر ہی ہوتا یہ سب کیوں یہاں پر اُمنڈنے لگے ہیں، اُمنڈتے رہے ہیں۔ تو کیا پھر یہی ہے زمیں آسماں جیسے ہوں دو سرپٹ اور کہیں سر چھُپی اک کھڑی آنکھ جیسے سمندر کھڑا اینچتا ہو، یہی کیا اذیت کا ساماں طبق در طبق موج در موج کرتی رہی ہے؛ پلوں کے گزرتے گزرتے گنہ لیکن ہم نے ہی سارے کیے ہیں۔ بہار آفرینا، گنہ ہم ہی کرتے رہیں گے؟ تو کیا ہم اسی سے بنے ہیں بنیں گے توانا؟ تو پھر کیا یہی ہے کہیں در کھُلے دفعتہً تو کھلے کے کھلے رہ گئے؛ ایک کے ساتھ تھا دوسرا تیسرا اور سب یاں پہ آتے رہے اور جاتے رہے، اور پھر اور آتے رہے اور آتے رہیں گے؟ بھلا ریت کے انتقاموں کی کس کو خبر ہے؟ خبر ہے معانی کی کس کو؟ تو پھر ہم معانی کو کیسے تلاشیں؟ کہاں تک تلاشیں؟ بس اک صور کی کوئی بے روک زنجیر آواز آئے، سبھی مرگ دیدہ کنایوں کو لفظوں کو پھر سے جِلا دے؛ الفاظ و معنی کو رشتے میں پھر سے پرو دے! نہاں خانۂ دل میں اٹھتی ہوئی اور مچلتی ہوئی اجنبی لرزشوں کو گھٹاؤں کو ہر لب کی جنبش بنا دے! روشنی کی پھواریں برسنے لگیں۔ ہر گھڑی، ہر طرف! میکال، میکال بس اِک بوند پانی کہ اب تو زباں پر پسینے کا قطرہ نہیں ہے نہ آنکھوں میں کف ہے

تبصرہ وتعارف

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں بھیجنا ضروری ہے)

کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات

مرتب وناشر: ڈاکٹر شباب الدین
صفحات: ۲۴۴، قیمت: ۱۰۰ روپے
تقسیم کار: ایجوکیشنل بک ہاؤس،
اے ایم یو مارکیٹ علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب کبیر احمد جائسی کی علمی وادبی خدمات، پروفیسر کبیر احمد جائسی صدر شعبۂ دراسات اسلامیہ کی ۳۵ سالہ علمی زندگی پر محیط ان کے ادبی وعلمی کارناموں کے مختلف پہلوؤں پر بیشتر ممتاز اور چند اُبھرتے ہوئے قلم کاروں کی مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ ہے جن میں (حسب ترتیب فہرست) ڈاکٹر ابن فرید، جناب شمس الرحمٰن فاروقی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر انور صدیقی، پروفیسر شعیب اعظمی، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری اور ڈاکٹر اجمل اجملی خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اس مجموعہ کو ڈاکٹر شہاب الدین نے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔ کتاب مرتب کے پیش لفظ کے علاوہ ۱۷ مضامین، بعض مشاہیر کے خطوط کے عکس اور جائسی صاحب کے مرتب کردہ مولانا عبدالسلام نمبر کے بارے میں مختصر تاثرات اور ان کی اب تک کی مطبوعات کی مکمل فہرست پر مشتمل ہے۔ مضامین میں پروفیسر جائسی کی طبع زاد تصانیف نقوش فانی، ذبیح اللہ صفا: حیات اور کارنامے اور سوویت لینڈ نہرو انعام یافتہ سوویتی۔ تاجیکی ادبیات کے بانی، مجموعہائے مقالات بازگشت اور انعکاس شعری مجموعے صحرا صحرا اور فارسی وانگریزی سے تراجم مثلاً تاریخی وعلمی مقالے، تاریخ ادبیات تاجیکستان، آذری، علامہ اقبال۔ مصلح ترین آخر (مع مقدمہ) اور محمد اقبال از میر سید میر شکر کے علاوہ کانفرنس گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں اُن کے تحریر کردہ اداریوں سے بھی بحث کی گئی ہے۔

یہ مندرجات ایک طرف جالسی صاحب کے عزم و حوصلہ، زندگی کے تئیں ان کے رویہ ادبی و تنقیدی شعور اور مبصرانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے ہیں تو دوسری جانب بعض ادبی مباحث پر مستند ادیبوں کے تنقیدی افکار سے بھی اُن کے وسیلے سے ہمیں آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ "کبیر احمد جالسی" کے عنوان سے ڈاکٹر ابن فرید صاحب کا مضمون علی گڑھ میں گزرے خود ان کے، جالسی صاحب کے اور ان جیسے بہت سے افراد کے شب و روز کی نہ صرف دلچسپ روداد ہے بلکہ "یارانِ تیز گام" اور بقول اُن کے غیر از علمی ذہانت سے با اختیار بن جانے والے حضرات کے چہروں سے نقاب بھی اٹھاتا ہے۔

نقوش فانی پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب شمس الرحمٰن فاروقی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور پروفیسر انور صدیقی نے اسے ایک سنجیدہ اور پر خلوص مطالعہ سے تعبیر کیا ہے جس میں بعض مزید بحث طلب سوالات اٹھائے گئے ہیں، ایک ایسی کوشش جس میں پہلی بار فانی کو روایتی یا رسمی اندازِ نظر سے ہٹ کر دیکھا گیا ہے، اور یہ کہ اس سے فانی پر مزید غور و فکر کی راہیں کھلیں گی۔

پروفیسر شعیب اعظمی اور پروفیسر نذیر احمد نے بالترتیب "کبیر احمد جالسی (باز گشت کی روشنی میں)" اور "ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے" پر ایک نظر کے عنوان سے اپنے مقالوں میں جالسی صاحب کے اخذ کردہ نتائج کو ان کی دیدہ وری، محققانہ نظر اور تنقیدی رویے کی جرأت مندانہ کوششوں کا واضح ثبوت قرار دیا ہے۔

کتابت و طباعت عمدہ ہے۔ باتصویر ٹائٹل بھی جاذب نظر ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں بعض مشہور علمی شخصیات کے ہمراہ یادگاری تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

سہیل احمد فاروقی

جبین انجم

احوال وکوائف

پہلا حکیم اجمل خاں یادگاری خطبہ

۲۸ر اکتوبر کو انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے کانفرنس ہال میں پہلے حکیم اجمل خاں یادگاری خطبہ کا اہتمام کیا گیا۔ خطبہ کی صدارت پروفیسر مجیب حسین رضوی صاحب نے فرمائی۔ مہمان مقرر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید صاحبہ (فیلو، نہرو میموریل میوزیم و لائبریری) نے "الہلال اور نئی روشنی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مشعل راہ" کے عنوان سے اپنا خطبہ پیش کیا۔

ڈاکٹر سید جمال الدین سکریٹری انجمن طلبائے قدیم نے اپنے تعارفی کلمات میں حکیم اجمل خاں صاحب کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ حکیم صاحب کی شخصیت مشرق و مغرب کا امتزاج تھی۔ ہم جن آدرش شخصیتوں کا نام لیتے ہیں ان میں ایک نمایاں نام حکیم صاحب کا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے ماحول کو دیکھتے ہوئے حکیم صاحب نے بہت پہلے ہی جدید تقاضوں کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ ذاکر صاحب کی طرح حکیم صاحب بھی مادری زبان میں تعلیم کے حامی تھے۔ حکیم صاحب پہلے شیخ الجامعہ ہوئے اور اپنے آخری وقت تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ "نئی روشنی" کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں سے روشنی لے کر وقت کی ضرورت کے مطابق خود کو ڈھال کر نئے زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلا جائے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب (ذاکر حسین چیئر) نے مہمان مقرر کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے یادگاری خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ یہ خطبہ جلد ہی "اسلام اور عصر جدید" میں شائع کیا جائے گا۔

ڈاکٹر سیدہ سیدین نے اپنے یادگاری خطبے میں فرمایا کہ حکیم اجمل خاں متحدہ ہندوستان کی ایک عظیم شخصیت، سچے خادم اور نوجوانوں کے لیے فیضان کا سرچشمہ تھے۔ حکیم صاحب بذات خود مسلمانوں کے لیے ایک مشعلِ راہ تھے۔ الہلال اور نئی روشنی کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیدین نے کہا کہ یہ دونوں اخبار ہماری قوم کے دو اہم شخصیتوں کی طرز و فکر کا نتیجہ تھے۔ جنھیں نے ملک کے حالات، بالخصوص مسلمانوں کے زوال کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اخباروں کو اپنی آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ذریعہ بنایا تھا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں اخبار کے مقاصد کا بھی ذکر کیا۔

اس موقع پر امیر جامعہ جناب سید مظفر حسین برنی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ محمد علی جوہر نے اس وقت جو بات کہی تھی وہ آج بھی صحیح ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں شکست خوردگی کا احساس بھی بڑھتا جا رہا ہے جس کا سبب تعلیم کی کمی ہے۔ امیر جامعہ نے کہا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ مشنریوں کی طرح اپنی قوم کی خدمت کریں، قربانی کا وہ عظیم جذبہ اپنے اندر پیدا کریں جس سے قوموں کی ترقی یقینی ہوتی ہے۔

صدر جلسہ پروفیسر مجیب حسین رضوی صاحب نے انجمن طلبائے قدیم جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو اپنی جانب سے تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا کہ واقعی حکیم صاحب کی شخصیت ہمیشہ زندہ و جاوید رہنے والی شخصیت ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی حکیم اجمل خاں میموریل لکچر کا اہتمام ایسی ہی خوش اسلوبی سے کیا جائے گا۔

یوم تاسیس جامعہ ۱۹۹۲ء

گذشتہ سالوں کی طرح، ۲۹ راکتوبر کو جامعہ کا ۷۲ واں یوم تاسیس روایتی جوش و خروش اور نیئے عزم و ارادے کے ساتھ منایا گیا۔ حسب معمول شیخ الجامعہ جناب بشیرالدین احمد صاحب نے جلسے کی صدارت کی اور حسب روایت مڈل اسکول کے ایک چھوٹے بچّے نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔ جامعہ کے سابق شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب، جلسہ کے مہمان خصوصی تھے۔ شیخ الجامعہ کے صدارتی کلمات سے پہلے پروفیسر مسعود حسین صاحب نے جو جامعہ کے قدیم طالب علم بھی ہیں۔ اپنی مختصر تقریر میں جامعہ کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ جامعہ کی ولادت ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں ہوئی۔ یہ علی گڑھ کا باغی بچّہ تھا۔ کچھ قومی ضرورتوں سے اور کچھ مسلمانوں کی تعلیم کے نقطۂ نظر سے اس کا قیام عمل میں آیا۔" انھوں نے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی اور دوسرے شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ مرحومین کی تعلیمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا 'علی گڑھ کی فضا جامعہ کو راس نہ آئی' اس لیے پہلے امیر جامعہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے مشورے پر اور عبدالمجید خواجہ مرحوم کی نگرانی میں علی گڑھ سے دہلی جامعہ منتقل کی گئی اور دہلی کے الگ تھلگ اور نو آباد علاقہ قرولباغ کی کرایے کی عمارتوں میں تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ چنانچہ نئے تعلیمی سال سے وہاں باقاعدہ کام شروع ہوگیا۔

جامعہ کے بنیادی اور منفرد مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمان خصوصی نے فرمایا کہ اہل جامعہ ایسے طالب علم پیدا کرنا چاہتے تھے جو بیک وقت اچھے اور سچّے مسلمان ہوں نیز اچھے اور سچے ہندوستانی ہوں۔ جو ایک مخلص شہری کی حیثیت سے اپنے وطن کی خدمت کو اپنے لیے فخر کا باعث سمجھیں اور ساتھ ہی ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے اسلام اور شریعت کی خدمت کو بھی اپنی زندگی کا ضروری جزو بنا لیں۔ جامعہ کے ممتاز بانیوں میں سے گاندھی جی کا ذکر کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ وہ چاہتے تھے کہ جامعہ

کے فارغ التحصیل طلباء قومی دھارے میں شریک ہوکر ملک کی ترقی میں دوسری قوموں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاکر کام کریں۔ انھوں نے مزید کہا: گاندھی جی کی دلی خواہش تھی کہ ملک کا اکثریتی طبقہ، ملک کے مفاد میں ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے احتراز کرے، اس کے لیے انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ کام بھی کیا، مگر افسوس کہ یہ آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اس پر بھی اظہار افسوس کیا کہ جامعہ کی اصل اور امتیازی خصوصیات اب باقی نہیں رہیں۔

پروفیسر مسعود حسین صاحب نے ۳ نومبر ۱۹۷۳ء سے ۱۵ اگست ۱۹۷۸ء تک شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کی رہنمائی کی خدمت انجام دی۔ موصوف نے اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد، اپنی پہلی تقریر میں فرمایا تھا: "لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں، میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے۔" اسی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: جامعہ ایک تعلیمی برادری تھی اور میں ایک تعلیمی برادری کی سربراہی کے لیے آیا تھا۔ اس میں مجھے کچھ کامیابی ہوئی اور کچھ ناکامی۔ البتہ مجھے خوشی ہے کہ اردو کے سلسلے میں کچھ کام کر سکا۔ میرے زمانے میں پہلی مرتبہ اردو کے پروفیسر کا تقرر ہوا۔ میں نے اپنے دور میں پوری کوشش کی کہ شعبۂ اردو کو جامعہ کے شایانِ شان ملک میں شہرت حاصل ہو۔ اس میں کسی حد تک مجھے کامیابی ہوئی۔ موصوف نے اپنی خود نوشت سوانح حیات: "ورودِ مسعود" میں ایک جگہ لکھا ہے: "جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا کھویا کیا پایا تو ذاتی طور پر کھونے کا پلّا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد، انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔ تعلیمی مصروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔" (صفحہ ۲۴۳)

شیخ الجامعہ کی تقریر

شیخ الجامعہ جناب بشیر الدین احمد صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں یوم تاسیس کے جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس کا بڑا اور اہم مقصد یہ ہے

کر ماضی کی خدمات کو یاد کیا جائے، حال کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور مستقبل کے منصوبوں پر غور کیا جائے۔ ہم اپنے مقصد میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوں گے جب تک جامعہ کے امتیازی اور انفرادی مقاصد کو سامنے رکھ کر جامعہ کی ترقی کے لیے کوشش نہ کریں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اس میں شبہہ نہیں کہ مرکزی یونیورسٹی بننے کے بعد پیسے تو آنے لگے، مگر اسی لحاظ سے تعلیم کے کاموں میں ترقی و توسیع نہیں ہوئی۔ میری خواہش اور کوشش ہے کہ جامعہ صفِ اوّل میں آئے اور ہندوستان کی بہترین یونیورسٹیوں میں اس کا شمار ہونے لگے۔ آج کل حکومت کا آٹھواں پلان چل رہا ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس عرصے میں جامعہ کو ہر لحاظ سے ترقی کرنے اور قوم و ملک کی تعلیمی خدمت کا بہترین موقع ملے گا۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اداروں کی زندگی میں کچھ اتار اور چڑھاؤ آتا ہی رہتا ہے۔ اس سے جامعہ کو مستثنیٰ سمجھنا صحیح نہیں ہوگا۔ جامعہ کی جڑوں میں کیڑا لگ گیا ہے۔ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس خرابی کو دور کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جامعہ کو بہت جلد وہ کامیابی اور شہرت حاصل ہوگی جس کو دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ مگر یہ کامیابی اسی وقت ہوگی جب اساتذہ، کارکن اور طالب علم سبھی کاندھے سے کاندھا ملاکر، پورے خلوص اور لگن کے ساتھ کام کریں۔ آج یوم تاسیس کے دن اپنے ساتھیوں سے یہی توقع ہے اور یہی میرا پیغام ہے۔

تمثیلی مشاعرہ

۲۹ را کتوبر کو انجمن طلبائے قدیم کے زیرِ اہتمام ایک تمثیلی مشاعرہ انصاری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ تمثیلی مشاعرہ کا تعارف اور حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر سید جمال الدین نے کہا کہ جامعہ کی ثقافتی و تہذیبی زندگی میں تمثیلی مشاعرہ کی تاریخی اہمیت رہی ہے۔ یہ روایت تقریباً تیس بتیس سال پرانی ہے۔ جامعہ کے شاعروں میں مشاہیر شعراء شرکت کرتے رہے ہیں۔ جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری،

مخدوم محی الدین، جان نثار اختر، اور دیگر اردو کے نامور شعراء اور شاعرات جامعہ میں اپنی آمد کو اپنے لیے قابلِ فخر تصوّر کرتے تھے۔ ان شعراء کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے جامعہ میں تمثیلی مشاعرہ کی روایت پڑی جو ہر سال یوم تاسیس کے موقع پر منعقد ہوتا تھا اور جس میں طلباء و طالبات کے علاوہ تدریسی اور انتظامی اسٹاف کے لوگ بھی مشہور شعرا کی تمثیل پیش کرتے تھے۔ کافی لمبے عرصے سے یہ روایت منقطع ہوگئی تھی۔ لیکن اس سال انجمن طلبائے طلبائے قدیم نے اس کا اعادہ کیا۔

تمثیلی مشاعرہ کے آداب یہ ہیں کہ کہیں بھی شاعر کی تمثیل پیش کرتے ہوئے اسی کی سی شکل وشباہت بنائی جائے اور اس جیسا لباس اور وضع قطع اختیار کیا جائے۔ شاعر کے لہجے کی ہو بہو نقل کی جائے اور شاعر کا کلام پیش کرتے وقت کسی خاص عادت یا جسمانی حرکت کو کسی قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ دیکھنے والوں کے ذہنوں میں تمثیل کے دوران اس کی شبیہ آجائے۔

انجمن طلبائے قدیم کے زیر اہتمام منعقد یہ تمثیلی مشاعرہ بہت کامیاب ہوا۔ مشاعرے کے شرکاء اور جن شعراء کی تمثیل پیش کی گئی ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

جناب اسد اللہ صاحب	(جگر مرادآبادی)
جناب مسعود احمد صاحب	(فراق گورکھپوری)
ڈاکٹر اشفاق محمد خاں صاحب	(حفیظ جالندھری و ساغر نظامی)
جناب انوارالحسن صاحب	(مجروح سلطان پوری)
جناب وضاحت مہدی صاحب	(روش صدیقی)
جناب اکرم فرشوری صاحب	(دلاور فگار)
محترمہ نیاز فاطمہ صاحبہ	(زہرہ نگاہ)
جناب مسعود مفتی صاحب	(واقف مرادآبادی)
جناب رحمان سلیم صاحب	(شمیم کرہانی)

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی صاحب (بیکل اتساہی و سرور بارہ بنکوی)
محترمہ ادیبہ خاتون صاحبہ (پروین شاکر)
محترمہ سیما غفران قدوائی صاحبہ (کشور ناہید)
جناب قطب الدین واحدی صاحب (ندا فاضلی)
جناب امتیاز احمد صاحب (حق کانپوری)
جناب محمد تعظیم صدیقی صاحب (افتخار عارف)
جناب مسرت علی صاحب (بشیر بدر و وسیم بریلوی)
جناب رضی احمد کمال صاحب (سلیم مکھنولوی)
جناب پرویز کمال صاحب (خمار بارہ بنکوی)
جناب حسن راشد صاحب (ساغر خیامی)

ڈاکٹر شمس الحق عثمانی صاحب (استاد شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے) وقت کے علامتی کردار کی شکل میں تمثیلی مشاعرہ کی نظامت کی۔

انصاری آڈیٹوریم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ حاضرین نے داد و تحسین کے ذریعہ مشاعرہ کو کامیابی کی منزل سے ہمکنار کیا۔ طلبائے قدیم اور ان کی انجمن قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے جامعہ کی ایک تہذیبی روایت کا اس سال یوم تاسیس کے موقع پر اچھا مظاہرہ کیا اور بڑی محنت اور کاوش سے ایک کامیاب تہذیبی و ادبی نشست منعقد کی۔

پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ
زیر اہتمام ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۲ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے "آزاد ہندوستان میں مسلمانوں سے متعلق بعض افکار" کے عنوان سے چھٹا پروفیسر محمد مجیب یادگاری خطبہ پڑھا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر

بشیر الدین احمد صاحب نے صدارت فرمائی۔

ڈاکٹر رفیق زکریا جو طویل عرصہ تک صوبہ مہاراشٹر کے وزیر کابینہ اور راجیہ سبھا کے ممبر رہے ہیں علمی حلقوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی اہم تصانیف میں "اے اسٹڈی آف نہرو" رائز آف مسلمز ان انڈین پولیٹکس" دی اسٹرگل ودان اسلام" اور "محمد اینڈ دی قرآن" کو خاصی مقبولیت حاصل ہے۔

جلسہ کا آغاز قاری محمد سلیمان صاحب کی تلاوت قرآن کریم سے ہوا جس کے بعد ڈاکٹر سید جمال الدین، ڈائرکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے پروفیسر محمد مجیب مرحوم کی یاد میں یادگاری خطبہ کے آغاز کے مقصد اور گزشتہ پانچ سالوں کے منعقدہ خطبوں کے موضوعات پر روشنی ڈالی۔ مجیب صاحب کی عالمانہ اور استاذانہ صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہ کلاس روم میں اپنے شاگردوں کی اس طرح تربیت کرتے تھے کہ مستقبل میں وہ ایک اچھے استاذ ثابت ہو سکیں۔ نیز یہ کہ کلاس میں انگریزی بولنے پر تاکید کے ساتھ وہ عام حالات میں اردو کو ترجیح دیتے تھے اور اردو کو جامعہ کی رابطہ کی زبان سمجھتے تھے۔

صدر جلسہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے مہمان مقرر کا تعارف کرتے ہوئے فرمایا کہ ۱۹۴۸ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ایک تصویر میں رفیق زکریا صاحب کو دیکھ کر وہ کافی متاثر ہوئے اور اس کے بعد سے ملک اور بیرون ملک کے مختلف جرائد میں شائع ان کی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ ان کی تحریریں واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں اور ہندوستان کے دانشور طبقہ میں انھیں اعلا مقام حاصل ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے پروفیسر مجیب مرحوم کی انگریزی تصنیف "ہندوستانی مسلمان" کو دستاویزی اہمیت کی حامل کتاب قرار دیتے ہوئے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ مجیب صاحب کی اردو دوستی کے باوجود ان کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" کا ترجمہ اب تک اردو میں نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے اپنے یادگاری خطبہ میں فرمایا کہ مسلمانوں کی

موجودہ پستی کا سبب بعض ایسے بیجا تعصبات بھی ہیں جو ان کے ذہن پر مسلط ہیں مثلاً یہ کہ مسلمانوں نے اس ملک پر کئی صدیوں تک حکومت کی یا یہ خیال کہ ملک کی تقسیم کا واحد سبب مسلمان تھے جس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایسا نظریہ ہے جس کی توثیق مسلم تاریخ نگاروں نے بھی کی ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۸ء تک ہندوستانی سیاست میں متعدد اہم واقعات اور ادوار کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش کے حوالے سے یہ انکشاف کیا کہ ملک کی تقسیم کے لیے مسلمان ذمہ دار نہیں ہیں۔ مقرر موصوف نے اس ملک کے غیر مسلم فرقوں کے اس خیال کو بھی بے بنیاد قرار دیا کہ ہندوستان کی تقسیم سے انھیں کوئی فائدہ پہنچا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی پستی کا اصل سبب ہے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان کی عدم شمولیت، ملازمتوں، تعلیم، صنعت و حرفت کے مختلف میدانوں میں درج فہرست طبقوں کے افراد کے مقابلہ میں مسلمانوں کے تناسب کے تازہ ترین اعداد و شمار فراہم کرتے ہوئے ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی حالت کافی حوصلہ شکن اور مایوس کن ہے، علاوہ ہینڈلوم کی صنعت کے جس میں ان کی شمولیت ۶۵ فیصد ہے موصوف نے اس ضرورت کی طرف توجہ دلائی کہ مسلمانوں کی پستی دور کرنے کے لیے ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے درمیان مفاہمت کی راہیں ہموار کی جائیں اور مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ نئے حالات کے مطابق لیا جائے تاکہ ایک ایسی فضا پیدا کی جائے جس سے دونوں فرقوں کے درمیان حائل دیوار گرائی جا سکے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں جامعہ مثالی کردار ادا کر سکتی ہے کیوں کہ اس کا قیام ہی ہندو مسلم دوستی کو فروغ دینے کی غرض سے عمل میں آیا تھا، اس لیے کہ ہمارے اسلاف نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیں اپنے ہم وطنوں کا ہم سخن بننا پڑے گا۔

جنید انصاری میموریل لکچر

۳۰ر اکتوبر کو شعبہ سماجیات کے زیر اہتمام کانفرنس ہال میں جنید انصاری میموریل لکچر منعقد کیا گیا جس کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے فرمائی۔ مہمان مقرر پروفیسر امتیاز احمد (سینٹر فار پولیٹیکل اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی) نے اپنا مقالہ "ہندوستان میں عبادت گاہوں کے سیاسی و معاشی پہلو" کے عنوان سے پیش کیا۔

پروفیسر بی۔ ایم نندا صدر شعبۂ سماجیات نے اپنے تعارفی کلمات میں جناب ابوالقاسم جنید انصاری کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جناب جنید انصاری نہ صرف ایک اچھے استاد تھے بلکہ وہ ایک مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جس میں تعلیمی فکر اور سماجی تشکیل کو دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

جناب پروفیسر امتیاز احمد صاحب نے اپنے مقالے "ہندوستان میں عبادت گاہوں کے سیاسی و معاشی پہلو" میں موجودہ سماج میں مذہب کے بڑھتے ہوئے رجحان کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے کہا کہ اس رجحان کے پیچھے فقط بڑھتا ہوا مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ عبادت گاہوں کی توسیع اور مذہب کے فروغ کے پیچھے معاشی و سیاسی پہلو بھی شامل رہے۔

شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں سماجی تحقیق کی اہمیت کی وضاحت کی اور امید ظاہر کی کہ مستقبل میں سماجی تحقیق سے متعلق مضامین میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ انھوں نے کہا کہ دقیانوسی خیالات، تعصب اور مذہبی جہالت دن بہ دن سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس طرح سماج میں تحقیق کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

لکچر کے آخر میں پروفیسر امتیاز احمد کے ساتھ ایک بحث و مباحثہ کی مجلس

کا انتظام کیا گیا جس میں حاضرین جلسہ، طلباء و اساتذہ کے علاوہ انتظامیہ کے کارکنان بھی شامل تھے۔

انڈین نیشنل کارٹوگرافک ایسوسی ایشن کی
بارھویں انٹرنیشنل کانفرنس کا افتتاح

ماحول اور مستحکم ترقی کی مفصل نقشہ نویسی کے عنوان پر شعبۂ جغرافیہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام منعقدہ انڈین نیشنل کارٹوگرافک ایسوسی ایشن کی بارہویں پانچ روزہ بین الاقوامی کانفرنس کا افتتاح ۴ر نومبر ۱۹۹۲ء کو انصاری آڈیٹوریم میں پروفیسر جی۔ راما ریڈی چیرمین یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے فرمایا۔ جامعہ کی روایت کے مطابق کانفرنس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر بشیر الدین احمد صاحب نے اپنے استقبالیہ کلمات میں ماحول اور مستحکم ترقی کے لیے خاکہ نگاری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے بتایا کہ خاکہ نگاری انسانی فلاح و بہبود کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر ماجد حسین صدر، شعبۂ جغرافیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ ماحول کا بڑھتا ہوا تنزل، سماج، حکومت اور تمام دنیا کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ صرف زیادہ پیداوار اور زیادہ خرچ پر ہی مستحکم ترقی نہیں ہو سکتی، بلکہ ترقی کا بہت کچھ انحصار اس بات پر بھی ہے کہ ہم اپنے استعمال شدہ مواد کو دوبارہ استعمال کے قابل کس طرح بنا سکتے ہیں اور اس سلسلے میں جغرافیہ داں اور خاکہ نگاروں کا ایک اہم حصہ ہے کہ وہ ایسے خاکے اور پلان بنائیں جو مستحکم ترقی کے لیے کارآمد ثابت ہو سکیں۔

انڈین نیشنل کارٹوگرافک ایسوسی ایشن کی طرف سے INCA پروفیسر یو۔ آر۔ راؤ، ڈاکٹر بی۔ راما راؤ (سکریٹری، ڈی۔ ایس۔ ٹی) اور پروفیسر ڈاکٹر سید ظہور قاسم کو ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کی خدمات کے سلسلے میں فیلوشپ

سے بھی نوازا گیا۔

اگلے دن کانفرنس کو دو نشستوں میں تقسیم کیا گیا۔ نشست کا ابتدائی حصہ "معلوماتی جغرافیائی طریقہ کار" اور دوسرا حصہ ماحول، سماج، اور معاشی حالات کے مطابق "خاکہ نگاری کے تعین" پر مشتمل تھا۔ کانفرنس کی دونوں نشستوں میں مختلف حضرات نے اپنے مقالے پیش کیے۔ ابتدائی نشست میں جن لوگوں نے اپنے مقالے پڑھے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

ڈاکٹر سی۔ بی بھوپے، ڈاکٹر آر۔ بی سنگھ اور ڈاکٹر کے۔ این۔ پی۔ راجو۔

اگلی نشست میں مقالہ نگار حضرات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پروفیسر افضال احمد، ڈاکٹر جھوجھر سنگھ، برگ، جے۔ ایس۔ ایس پی۔ راجو پروفیسر ارونا جارم اور دیگر حضرات۔

مندرجہ بالا حضرات نے اپنے مقالوں میں جغرافیائی معلومات میں تکنیکی نظریہ اور آلاتی طریقۂ کار کا احاطہ کیا۔

پروفیسر بی ارونا جارم کے لکچر سے کانفرنس کے تیسرے دن کا آغاز ہوا۔ کانفرنس کی پہلی نشست میں ماحولیاتی خاکہ نگاری پر کئی مقالے پڑھے گئے۔ جن میں انڈین نیشنل کارٹوگرافک ایسوسی ایشن کے انتظامی سکریٹری اور شعبۂ جغرافیہ کے سینیر ریڈر جناب ایس۔ ایم راشد نے اپنا دلچسپ مقالہ "ہندوستان میں نقشہ نگاری کی تعلیم، رکاوٹیں اور ترقیاں" کے عنوان سے پیش کیا۔ جناب راشد صاحب نے چند ایسے تعلیمی اداروں کی جانب توجہ دلائی جنھوں نے خاکہ نگاری کو جدید آلات کے ذریعے مزید بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

سات نومبر کو "ماحولیاتی آلودگی، تشخیص اور اہتمام" کے عنوان سے ایک اور نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موضوع پر بھی مختلف حضرات نے اپنے مقالے پیش کیے جن میں ڈاکٹر بھٹناگر، ڈاکٹر سنگھ، ڈاکٹر شیخ اور ڈاکٹر تیواری کے نام قابل ذکر ہیں۔ سبھی مقالہ نگار حضرات نے شہر میں بڑھتی ہوئی آلودگی کی جانب توجہ مبذول کرائی۔

ڈاکٹر سنگھ اور ڈاکٹر تیواری نے "دہلی میں ماحولیاتی آلودگی" پر اپنے مقالے پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ رہائشی علاقے کو کاروباری علاقے سے دور ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر تیواری نے کہا کہ دہلی میں ٹریفک کی زیادتی یقیناً باعثِ تشویش ہے۔ ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ٹریفک میں کمی لائی جائے۔

اس پانچ روزہ کانفرنس کا اختتام آٹھ نومبر کو شیخ الجامعہ جناب بشیرالدین احمد کی جانب سے دیے گئے ڈنر پر ہوا جس میں INCA کے سبھی ممبران اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں نے بھی شرکت کی۔

جامعہ میں پہلی بار شعبۂ جغرافیہ کے زیر اہتمام اہم موضوع پر کامیاب عالمی کانفرنس کے لیے پروفیسر ماجد حسین، پروفیسر قاضی محمد احمد، جناب سید محمد راشد اور ان کے معاون اساتذہ قابل مبارکباد ہیں۔

انٹرنیشنل فیڈریشن آف لائبریری ایسوسی ایشنز کی کانفرنس

پچھلے دنوں انٹرنیشنل فیڈریشن آف لائبریری ایسوسی ایشنز و انسٹی ٹیوشنز کی ۵۸ ویں کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں قائم اس بین الاقوامی فیڈریشن کی کسی افرو ایشیائی ملک میں پہلی بار ہونے والی اس کانفرنس میں ایک سو سے زیادہ ممالک سے تقریباً ۱۵۰۰ مندوبین شریک ہوئے۔ کانفرنس نئی دہلی کے تاج پیلس ہوٹل میں ہوئی اور اس کا افتتاح مرکزی وزیر جناب ارجن سنگھ نے سری فورٹ کے آڈیٹوریم میں کیا۔ اس موقع پر کئی قومی سطح کے اخبارات نے [illegible] ضمیمے شائع کیے اور مشہور ماہر علم کتابداری ڈاکٹر ایس۔ آر رنگاناتھن پر یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا گیا۔

اس کانفرنس کے لیے تیاریاں گذشتہ کئی برسوں سے جاری تھیں اور مرکزی انتظامی کمیٹی کے ممبران میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی نمائندگی وہاں کے لائبریرین جناب شہاب الدین انصاری نے کی جو اس کی استقبالیہ ذیلی کمیٹی کے صدر نشین بھی تھے۔ اس کمیٹی میں جناب خالد کمال فاروقی اکر کا ئیوسٹ اور جناب وی۔ کے تندہ ڈپٹی لائبریرین ان کے شریک کار رہے۔ جناب محمد مرتضیٰ انصاری (اسسٹنٹ لائبریرین) اور جناب امجد علی (میڈیا لائبریرین ایم۔ سی۔ آر سی) بحیثیت والنیٹر کانفرنس میں شریک رہے۔ کانفرنس میں زیر بحث موضوعات کا مرکزی خیال "لائبریری و انفارمیشن پالیسی کا پس منظر" تھا۔

RNI No. Del/14431/60/85
Regd. No. DL-16025/92 Vol. 89 No. 12 December, 1992
THE MONTHLY JAMIA, Jamia Nagar, New Delhi-110025